ہادی
سلطان الشان حضرت

بارگاہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ سے

ایمان اور امن کی ندا دینے والا

اور اُن کے جانشینؒ

امام المشائخ شمس العلما حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی یادگار

منادی ۱۹۲۶ء سے جاری ہے باسٹھویں جلد (۱۹۹۴ء) کا پہلا شمارہ ہے

مدیر
خواجہ حسن ثانی نظامی
معاون مدیر
خواجہ مہدی نظامی

درگاہ شریف اور منادی کے بارے میں خط و کتابت کرنے اور قیمت جمع کرانے کا پتہ
خواجہ حسن ثانی نظامی
ڈاکخانہ حضرت نظام الدین اولیاء
نئی دہلی ۱۳-۱۱

فہرست

سالانہ قیمت
ہندوستان میں
پچاس روپے
غیر ممالک سے
دس ڈالر
فی پرچہ
پانچ روپے

پرنٹر پبلشر خواجہ حسن ثانی نظامی نے خواجہ پریس جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ سے شائع کیا۔

رہنما کی ضرورت

مولانا سراج الدین حافظ بدایونی رح نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رح سے پوچھا کہ کیا یہ حدیث (شریف) ہے کہ ؟ مَنْ لَيْسَ لَهُ شَيْخٌ فَشَيْخُهُ اِبْلِيْسُ۔ جس کا کوئی پیر نہ ہو اس کا پیر شیطان ہوتا ہے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ یہ مشائخ کا قول ہے۔

مولانا سراج الدین رح نے دوبارہ پوچھا کہ کیا یہ رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی حدیث ہے کہ مَنْ لَمْ يَرَ مفلحًا لا يفلح ابدًا (جو شخص کسی فلاح پہنچانے والے کو نہیں دیکھتا وہ کبھی فلاح کو نہیں پہنچتا ؟) فرمایا کہ یہ بھی مشائخ کا قول ہے۔

اس موقعے پر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رح نے ایک درویش کا ذکر فرمایا کہ اگر وہ کسی ایسے آدمی کو دیکھتا جو کسی کا مرید نہ ہوتا تو کہتا یہ کسی کے پلّے میں نہیں بیٹھا ! حضرت خواجہ حسن علاء سجزی رح نے عرض کیا کہ گویا وہ وزن نہیں رکھتا ؟ فرمایا کہ نہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر وہ شخص جو کسی پیر کا مرید ہوتا ہے تو جو کچھ وہ مرید کرتا ہے۔ کل (قیامت کے دن) وہ عمل اس پیر کے پلّے میں ڈالا جائے گا۔ بس جو کسی کا مرید نہ ہو تو کہتے ہیں کہ فلاں کسی کے پلّے میں نہیں بیٹھا ہے۔ یعنی اس کا کوئی پیر نہیں ہے۔

(تلخیص و ترجمہ فوائدالفواد ۔ از خواجہ حسن علاء سجزی رح)

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

ہلالِ عید

اے ہلالِ عید اے اہلِ عقیدت کے امام
دیکھ کر تجھ کو سبھی دلشاد ہیں مسرور ہیں
بادۂ وحدانیت کا اک چھلکتا جام ہے
قلبِ مومن کے لیے سرچشمۂ ایمان ہے
تیرے دم سے ہے تر و تازہ عبادت کا وجود
آج کے دن تو مٹا دیتا ہے سب ناز و نیاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں سب شاہ و گدا
عید میں مفلس بھی لگتے ہیں گلے زردار کے
آج کے دن تو مٹا دیتا ہے فرقِ نسل و رنگ
آج کے دن ختم ہو جاتے ہیں سب فسق و فساد
آج کے دن تو مٹا دیتا ہے فرق این و آں
یوں تو دنیا کے ہر اک گوشے پہ ہے تیری نظر
عید کے اگلے ہی دن تک وہ سماں رہتا نہیں
یہ عقیدت، یہ مروّت، یہ رواداری، یہ میل
پھر رگِ مجبور پر خنجر وہی مختار کا
پھر وہی رشک و رقابت پھر وہی فسق و فساد
پھر وہی حفظِ مراتب، فرق محمود و ایاز
عید کے دن کا سماں قائم سدا رہتا نہیں
اے ہلالِ عید، اے عرش آشنا عالی مقام
اے ہلالِ عید اے صد راحتِ قلب و جگر
اے ہلال عید اے سیارۂ ہفت آسماں
آ تو پھر مل کر کریں خالق کی خدمت میں دعا
کرشن کے، نانک کے، عیسٰیؑ کے، محمدؐ کے خدا
اپنے بندوں کو ہدایت دے کہ سب مل کر رہیں
ظاہر و باطن ہوں یکساں سب کی نیت نیک ہو
عید کے دن ہی فقط ایسا سماں آیا تو کیا
جو نویدِ جانفزا جو مژدۂ جاوید دے

تجھ کو پہنچے ایک مجبورِ محبت کا سلام
سب کے چہرے پُر ضیا قلب و جگر پُر نور ہیں
تو وہ ساقی ہے کہ جس کا فیض سب پر عام ہے
اور پھر ایماں ہے کیا اس بات کا عرفان ہے
اُنس کا، اخلاق کا، مہر و مروّت کا وجود
دیکھ کر تجھ کو گلے ملتے ہیں محمود و ایاز
تیرے در پر آج کے دن ہیں سبھی ہم مرتبہ
اور مجبوروں پہ کھل جاتے ہیں درِ مختار کے
آج کے دن صلح میں تبدیل ہو جاتی ہے جنگ
غیریت، بیگانہ پن، مکر و ریا، بغض و عناد
سبزۂ پامال پر ہنستا نہیں سرو رواں
اے ہلالِ عید کیا تجھ کو نہیں اس کی خبر
وہ زمیں رہتی نہیں وہ آسماں رہتا نہیں
بن کے رہ جاتے ہیں سارے یہ فقط اک دن کا کھیل
پھر وہی مفلس پہ سب جور و ستم زردار کا
پھر وہی بیگانہ پن، غیبت وہی بغض و عناد
پھر وہی کبر و رعونت، پھر وہی ناز و نیاز
تو یہ سب کچھ دیکھتا ہے اور کچھ کہتا نہیں
ایک دن صرف ایک دن کے واسطے یہ اہتمام
عید کے دن کا سماں ہو اور اتنا مختصر
کر نہیں سکتا اگر تو اس فضا کو جاوداں
اے خدائے دو جہاں اے مالکِ ارض و سماں
تو صفات و ذات سے ہے ماسوا و ماوراء
جو سنیں دل سے سنیں وہ جو کہیں دل سے کہیں
راستے کتنے ہی ہوں، منزل سبھی کی ایک ہو
رہگزارِ دل پر اگر ابرِ رواں آیا تو کیا
اے خدا، میرے خدا دنیا کو ایسی عید دے

تذکرۂ فخر جہاں دہلویؒ

از

پروفیسر نثار احمد فاروقی

میاں اخلاق احمد صاحب مرحوم محبان اولیا اللہ میں سے تھے، میرے حال پر بھی نظر عنایت رکھتے تھے۔ کبھی کبھی خط لکھ کر یاد فرمایا کرتے تھے۔ میری بدقسمتی ہے کہ کبھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا اور ۱۹۸۹ء میں جب میرا لاہور جانا ہوا تو ان کے مزار پر ہی حاضری ہو سکی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور اپنی ان رحمتوں سے سرشار کرے جو اولیا اللہ کیلئے مخصوص ہیں۔

میاں صاحب نے حضرت شاہ فخر الدین نظامی محب النبی دہلویؒ[1] (وصال: ۲۷ جمادالثانی ۱۱۹۹ھ مطابق ۷ مئی ۱۷۸۵ء روز شنبہ) کے مفصل حالات و مناقب لکھنے کا ارادہ فرمایا تھا۔ اور اسے دس ابواب میں تقسیم کیا تھا کتاب کے علمی اور تحقیقی مرتبہ کا اندازہ تو اس سے ہوگا کہ تقریباً ۷۵ کتب مطبوعہ و قلمی سے استفادہ کیا گیا۔ اولیا اللہ کے حالات و ملفوظات لکھنے کے لئے صرف مورخ اور محقق ہونا کافی نہیں ہے۔ یہاں اصل کار ـــ "ورائے شاعری چیزے دگر ہست" اور وہ کیفیت نسبت باطنی کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ الحمد للہ کہ یہ نعمت مصنف مرحوم کو میسر تھی اس نے کتاب میں جو کیف و رنگ بھرا ہے وہ لفظ و بیان سے ماوراء ہے۔

اس کتاب میں حضرت فخر جہاں علیہ الرحمۃ کے خاندان، آپ کی تعلیم و تربیت، بیعت، و خلافت، مدارج سلوک کی سیر اور روحانی فیوض کے لئے سیاحت کے علاوہ آپ کا علمی مرتبہ تصانیف، خصوصیات سلسلہ، نظام خانقاہ، نیز معاصرین علماء و صوفیہ کا بھی تذکرہ شامل ہے۔

حضرت فخر جہاںؒ کے اسلاف کرام میں حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادیؒ، حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کا حال بھی شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔ علاوہ بریں حضرت کے خلفاء و مجازین و اخلاف سلسلہ میں حضرت حاجی لعل محمد چشتیؒ، مرزا بخش اللہ ولی بیگؒ، شاہ محب اللہ دہلویؒ، خواجہ میاں محمد شاہ ہوشیارپوریؒ، میاں علی محمد چشتیؒ بسیٔ شریف کے تراجم بھی تفصیل سے درج کئے ہیں۔

اس طرح حضرت فخر جہاںؒ کی حیات طیبہ اپنے پورے سیاق و سباق میں ہمارے سامنے آتی ہے اور مصنف مرحوم نے حتی الوسع کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ مجھے امید ہے کہ سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ سے وابستہ حضرات اس کتاب کو قدردانی کے ہاتھوں سے لیں گے اور میاں اخلاق احمد مرحوم کے لئے رحمت و رضوان کی دعا کریں گے۔ ر ان شاء اللہ یہ ان کے لئے توشۂ آخرت ثابت ہوگی۔

مصنف کے ساتھ ہی دو اور شخصیتیں بھی ہماری

---

[1] تکملہ سیر الاولیاء، ص ۱۲۱ کا بیان ہے کہ "وقت وصال آن حضرت آخر شب از تاریخ مذکور است"، مگر واردات فخریہ کے دیباچے میں سید بدیع الدین نے لکھا ہے: روز شنبہ یکم (کذا) پاس روز برآمدہ"۔ (ورق ۴ الف)

تعریف وتحسین اور احسان مندی کا حق رکھتی ہیں۔
یعنی حضرت حکیم محمد موسیٰ امرتسری ادام اللہ فیوضہ اور
محب گرامی سائیں نذیر فریدی صاحب جنھوں نے
اس کتاب کو مصنف مرحوم سے لکھوایا اور ان کے
سفر آخرت کے بعد اس کی اشاعت کا بندوبست کیا۔
اللہ تعالیٰ دونوں حضرات کو صحت کے ساتھ سلامت
رکھے۔

یہ نامہ سیاہ اس لائق نہیں ہے کہ ایسی پاکیزہ
شخصیت پر ایک اہل دل کی لکھی ہوئی کتاب کے
بارے میں اپنے شکستہ بستہ خیالات لکھ کر مخمل
میں ٹاٹ کا پیوند لگائے۔ مگر میرے مخدوم حکیم
محمد موسیٰ امرتسری مدظلہ العالی نے اشارہ فرمایا
اور عزیز گرامی سائیں نذیر فریدی نے بہت
محبت کے ساتھ اصرار کیا، تعلیم حکم اور تالیف
قلب کے لئے یہ چند سطریں لکھ دی گئیں۔

(۲)

حضرت مولانا فخر جہاںؒ سلسلہ چشتیہ نظامیہ
کے مجدد ہیں، ان کی ذات بابرکات سے اس
سلسلے کو نئی زندگی اور تب وتاب نصیب ہوئی۔
عوام الناس پر جتنا اثر حضرت فخر جہاںؒ کا تھا۔
اتنا اس دور میں کسی اور درویش کا نظر نہیں
آتا۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ تبلیغ وارشاد
کے لیے مادری وعلاقائی زبان کی کیا اہمیت
ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں جب حضرت شاہ
ولی اللہ دہلویؒ کے فارسی ترجمہ قرآن سے بھی
متقشف علماء کا ایک طبقہ خوش نہ تھا، مولانا فخر جہاںؒ
نے خطبۂ جمعہ کے بارے میں فرمایا:

"خطبے کا فرض ہونا وعظ کے لحاظ سے ہے
مگر چونکہ وہ عربی زبان میں ہوتا ہے اور عام لوگ اس
سے واقف نہیں اس لیے ہندی زبان (اردو)
میں اس کا ترجمہ بہتر ہے۔" (فخر الطالبین اردو ترجمہ
ص ۵۷ طبع کراچی ۱۹۶۱ء) آپ کے مشرب کی
وسعت ایسی تھی کہ غیر مسلم بھی آپ کی خدمت میں
حاضر ہو کر کسب فیض کرتے تھے اور بعض شیعہ
بھی آپ سے ارادت کا تعلق رکھتے تھے۔

قلعہ معلیٰ میں بھی چشتی نسبت کا گزر مولانا فخر جہاںؒ
کے قدوم مبارک سے ہوا۔ آپ کے دہلی تشریف
لانے سے پہلے قلعہ میں نقشبندی سلسلہ کا اثر تھا۔ یہی
سماع بھی نہیں ہوتا تھا حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی
بھی اپنے مخصوص یاران سلسلہ کے ساتھ خانقاہ
میں بند ہو کر سماع سنتے تھے:

دران آوان والی دہلی مع اعیان سلطنت بر طریقۂ
نقشبندیہ بودند، از سماع بسیار نفرت می داشتند۔
قاعدۂ مجلس حضرت شیخ این چنین بود کہ بجز اہل
طریقۂ خود، دیگر کسے را شریک نمودے۔ علاوہ
این کہ بواب از آیندگان مجلس استفسار کردندے کہ
بیعت از کدام سلسلہ است؟ اگر جواب دہد کہ من از
سلسلہ چشتیہ ہستم باو گفتے کہ درود شریف چشتیہ بخواں۔
اگر او درود خواندے باز از وے پرسیدے کہ سلوک
چقدر طے شدہ اگر بواب را مبتدی خام معلوم می شد
اندرون مجلس اجازت رفتن ندادے، گفتے کہ تو ہنوز
اہل این کار نشدی۔

اس زمانے میں بادشاہ دہلی اور امرائے سلطنت
نقشبندیہ طریقہ پر تھے اور سماع سے بہت نفرت
رکھتے تھے۔ حضرت شیخ (کلیم اللہؒ) کی مجلس کا قاعدہ
یہ تھا کہ اپنے اہل طریقہ کے سوا کسی کو (سماع میں)
شریک نہ کرتے تھے اس کے علاوہ یہ کہ دربانے
مجلس میں آنے والوں سے پوچھتے تھے کہ تمہیں
کس سلسلے میں بیعت ہے؟ اگر آنے والا کہے کہ میں
سلسلہ چشتیہ میں ہوں تو اس سے کہتے تھے کہ درود
چشتیہ پڑھو۔ اگر وہ درود پڑھ دیتا تو اب اس سے
پوچھتے کہ تم نے سلوک کتنا طے کیا ہے؟ اگر دربان

تو وہ مبتدی اور خام معلوم ہوتا تو اُسے مجلس کے
در جانے کی اجازت نہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ
بھی تم اس کام (سماع) کے لائق نہیں ہوئے ہو۔
(رسالہ در احوال خاندان فخریہ۔ ناقص۔ ورق ۲۶۔
ف، مملوکہ راقم الحروف)
یہ حضرت فخر جہاںؒ کی بدولت ہوا کہ چشتی خانقاہوں
سانئی رونق پیدا ہو گئی۔ یہ زمانہ تبلیغ وارشاد کے
لیے بھی بہت سازگار تھا، اگر کمپنی بہادر نے رخنہ
ندازی نہ کی ہوتی تو اس دور میں اتنے لوگ مشرف
اسلام ہوتے جتنے پچھلی کئی صدیوں میں نہ ہوئے
تھے۔

(۳)

حضرت فخر جہاںؒ نے ایک ذاتی بیاض میں
اپنے بعض مکشوفات و واردات سرسری طور پر
قلمبند فرمائے تھے، حضرت کے وصال کے بعد
ان کے صاحبزادے حضرت غلام قطب الدینؒ[1]
(وفات ۱۸ محرم ۱۲۳۳ھ ۲۸ ستمبر ۱۸۱۷ء بروز
جمعہ) سے وہ بیاض سید شاہ بدیع الدین (تکملہ
سیر الاولیا ص ۱۲۰) کو مستعار ملی تھی جسے انہوں
نے نقل کر لیا تھا۔ یہ بیاض خود حضرت فخر جہاںؒ
کے قلم سے تھی اور اسے انھوں نے مستور و
مخفی رکھا تھا۔ یادداشتیں بھی کبھی عربی میں،
کبھی فارسی میں، کبھی مخلوط زبان میں لکھی ہیں
اور کئی مواقع پر عبارت بھی غیر مربوط ہے ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ عجلت میں جو کچھ خیال مبارک میں آیا وہ
بطور خود قلم بند کر لیا۔ یہاں پہلی بار اس متبرک بیاض
سے چند اقتباسات بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔ آغاز
بیاض میں شاہ بدیع الدینؒ نے حضرت فخر جہاں کے چند
قطعات تاریخ وفات بھی درج کئے ہیں۔

قطعہ

آہ شاہ کہ بود فخر دین متین
بگذشت و گذاشت سینہ ہائے غمگین
تاریخ وفات او خرد گفت ہمیں
اللہ اللہ مولوی فخر الدین (۱۱۹۹ھ)

قطعہ دیگر

زہے مطلوب سلطان المشائخ
زہے منظور خاص کبریائی
باسم خاص فخر الدین محمد
رسانده فیض از مہ تا بماہی
سفر فرمود چون از دار فانی
جناب قدس آن عالم پناہی
ندا آمد ز ہر خیل ملائک
خوش اے مقبول محبوب الٰہی (۱۱۹۹ھ)

اب چند واردات و مکشوفات ملاحظہ فرمائیے:۔
(۱) رأیت فی المنام حضرت پاک پتن فی حجرۃ أن مکانا لطیفا وجلس فیہ حضرت سلطان المشائخ أیدنی اللہ تعالیٰ بلطفہ الخفی والجلی وأنا تحصیل الملازمۃ (کذا) وافعل القدمبوس۔
میں نے پاک پتن کے ایک حجرے میں خواب میں دیکھا کہ ایک بہت لطیف جگہ ہے جہاں حضرت

---

[1] حضرت فخر جہاں کا نکاح اورنگ آباد میں ہوا تھا اور آپ کے ایک ہی فرزند غلام قطب الدینؒ تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے وصال کے وقت ان کی عمر زیادہ نہیں تھی، انھوں نے مہاراں شریف جا کر حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ سے تکمیل سلوک کی اسی لیے حضرت فخر جہاںؒ کے بیشتر تبرکات اور ایک ہم عصر قلمی تصویر مہاراں شریف میں آج تک محفوظ ہے۔ مجھے ان سب تبرکات کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ الحمد للہ علی ذلک۔ حضرت خواجہ غلام قطب الدین کی تاریخ وفات حتمی طور پر معلوم نہیں ہے۔

سلطان المشائخ (خواجہ نظام الدین اولیاؒ)، اللہ ان کے
الطاف ظاہری و باطنی سے مجھے تقویت پہونچائے،
تشریف فرما ہیں اور میں نے ملازمت میں حاضر
ہو کر قدمبوسی کی ہے۔

و می اندازم سر خود را در ہر دو زانوے آنے
اعتماد دنیا و دین، و صاحب قبلہ بسیار خوش اند
و از زبان کرامت ترجمان ارشاد کردند کہ "حضرت
مخدوم صاحب کے پاس سے آئے ہیں"، درین
ضمن حضرت سلطان صاحب قبلہ یک روپیہ از
جیب مبارک گرفتہ عنایت می فرمایند۔ غلام
عرض کرد کہ حضرت صاحب استادہ عرض مے
نمایند کہ؟ "حضرت سے بہت کچھ لینا ہے، لاکھوں لینا، دین لینا، دنیا لینا"۔

اور اپنا سر دین و دنیا کے اس سہارے
کے دونوں زانوؤں میں رکھ دیا ہے صاحب قبلہ
بہت خوش ہیں اور اپنی زبان کرامت ترجمان
سے ارشاد فرماتے ہیں: "حضرت مخدوم صاحب
کے پاس سے آئے ہیں"، اس حالت میں
حضرت سلطان جی نے اپنی جیب سے نکال
کر ایک روپیہ عنایت فرمایا ہے۔ غلام نے
عرض کیا کہ حضرت سے بہت کچھ لینا ہے لاکھوں
لینا، دین لینا، دنیا لینا۔

دریں ضمن آدم غلام دو روپیہ برائے نذر
آوردہ بایں غلام داد، این غلام در دست گرفتہ
نذر گزرایند از راہ فضل قبول فرمودند۔ اتفاقاً
دران دو روپیہ یک روپیہ بسیار کلاں، یک موافق
رسم گرد و خورد، حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ اطفال
کہ نشستہ بودند بان لطف فرمودند کہ روپیہ
کلاں خواہد گرفت یا روپیہ خرد و گرد، و مزاح اطفال
می فرمودند، درین ضمن غلام یک حلہ از نظر گزرایند
قبول افتاد و میل نقرہ گزرایند فرمودند کہ خبر نقرہ است،
غلام میل جستی گزرایند فرمودند کہ نزد ما ہم ہست۔
درین ضمن غلام یک رکابی پر از شیرینی و یک نان
خمیری نظر عالی گزرایند فاتحہ عنایت کردند۔ باز
غلام یک مصلیٰ می گزرایند و پارچہ ہائے بسیار
نزدیک غلام بودند، درین میان بیدار شدم۔ روئے
خود بالائے کوئے بردم و آداب سجدہ بجناب
حضرت مخدوم شکر بار ایدنی اللہ بلطفہ الخفی والجلی
بجا آوردم۔ الحمد للہ والمنۃ فی تاریخ لیلۃ الرابع من
صفر ختم اللہ بالخیر والظفر (ورق ٤٦ب)

اسی میں غلام کا آدمی دو روپیہ نذر کے لیے
لایا اور اس غلام کو دیئے۔ غلام نے ہاتھوں پر رکھ کر
نذر گزارنی، از راہ فضل قبول فرمائی اتفاقاً ان دو
روپیوں میں ایک روپیہ بہت بڑا اور دوسرا رواج
کے مطابق گول اور چھوٹا تھا۔

حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بچوں سے
جو بیٹھے ہوئے تھے از راہ لطف فرمایا کہ بڑا روپیہ
لو گے یا گول چھوٹا والا؟ بچوں سے ہنسی مذاق فرمانے
لگے۔ اسی میں غلام نے ایک لباس پیش کیا، قبول
فرمایا، پھر چاندی کی ایک سلائی پیش کی، فرمایا،
نہیں یہ چاندی ہے: غلام نے جست کی سلائی
پیش کی تو فرمایا کہ یہ تو ہمارے پاس بھی ہے اسی
میں غلام نے ایک رکابی مٹھائی سے بھری اور
ایک خمیری روٹ نذر کی۔ آپ نے فاتحہ عنایت کی
پھر غلام نے ایک مصلیٰ نذر کیا، غلام کے پاس بہت
سے کپڑے تھے۔ اسی درمیان میں آنکھ کھل
گئی۔ میں نے اوپر گلی کا رخ کیا اور حضرت مخدوم
شکر بار (بابا فریدؒ) اللہ تعالیٰ ان کے خفی وجلی
الطاف سے قوت نصیب کرے کی بارگاہ میں سجدہ
ادب بجا لایا۔ الحمد للہ والمنۃ۔ اور یہ ۴ صفر کی شب
میں ہوا۔

(۲) حضرت شیخ خود را رضی اللہ تعالیٰ عنہ قدمبوس
حاصل نمودم، بسیار مہربانند و کلمات شفقت آمیز

فرمودند مرا از دیدن شفقت آن جناب عالی بسیار مسرت و شفقت بدست آوردہ و من کیفیت معاملات خود می گویم کہ حضرت خواجہ این کرم فرمودند و می فرمایند کہ من ہم برائے ہمی می گویم کہ حالا این ذکر را بکنید بعرض می رسانم کہ ارشاد شود چنانچہ صاحب قبلہ چار زانو نشستند از دیدن جلسۂ مبارک این غلام نشست و رگ کیماس را خواست کہ بگیرد صاحب قبلہ فرمودند کہ درین ذکر گرفتن کیماس لازم نیست، مربع نشستن است لفظ اللہ را جانب چپ ضرب دادند و سر ضرب جانب راست دادند باز این غلام موافق ارشاد ادا نمود، باز فرمودند کہ ضرب بایں قسم باید داد چنانچہ از ضرب صاحب قبلہ ایدنی اللہ بلطفہ الخفی والجلی تا آن تحریر نقش خاطر است۔ و یک کتاب اغلب است کہ نظام القلوب است می فرمایند کہ درین ہست لیکن بہ نہجے دیگر است شما این را بکنید بسیار فائدہ خواہد بخشید الحمدللہ والمنۃ۔

(رسالہ واردات تحریہ قلمی ورق ۷۔ ۸)

میں نے اپنے شیخ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قدمبوسی کا شرف حاصل کیا۔ بہت مہربان ہیں اور شفقت آمیز کلمات فرما رہے ہیں۔ مجھے جناب عالی کی شفقت دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے اور میں اپنے معاملات کی کیفیت بیان کر رہا ہوں، حضرت خواجہ کرم کر کے فرماتے ہیں کہ میں بھی تو اسی لیے کہتا ہوں کہ اب تم یہ ذکر کرو میں نے عرض کیا کہ ارشاد فرمائیں چنانچہ صاحب قبلہ چار زانو بیٹھ گئے ہیں اور آپ کی نشست دیکھ کر یہ غلام بھی اسی طرح بیٹھ گیا اور رگ کیماس کو پکڑنا چاہا تو صاحب قبلہ نے فرمایا کہ اس ذکر میں کیماس کو پکڑنا ضروری نہیں ہے، بس چار زانوں بیٹھنا ہے اللہ کے لفظ کو بائیں جانب سے اٹھایا اور داہنی جانب تین ضربیں لگائیں۔ پھر اس غلام نے ارشاد کے مطابق ادا کیا۔ پھر فرمایا کہ ضرب اس طرح لگانی چاہیئے۔

چنانچہ صاحب قبلہ کی ضرب کا انداز اس تحریر کے وقت تک دل پر نقش ہے۔ اور ایک کتاب جو غالباً نظام القلوب ہے اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس میں ہے۔ مگر دوسری طرح سے۔ تم یہ کرو اس سے بہت فائدہ ہوگا۔

الحمدللہ والمنۃ۔

(۳) فی پاک پتن رائیت فی المنام فی لیل الرابع من ربیع الاوّل أن أجئی وقال رجلٌ: اخلع نعلیک، فیقول القائل خلعت نعلیک واعطیت النعلین للرجل القائل للمحافظۃ ورأیت مسجد حریق المحبۃ کان قائمًا مقامًا صبیاً وجمیع المکان قائمًا بالمکان الاصلی الاّ أن حوضاً کبیراً مواجہۃ الباب الجنۃ لحریق المحبّۃ والنّاس یتوضأون ویذہبون قریب باب الجنۃ وکثیر من الرجال یصلوّن الی باب الجنۃ بان یسجدون الی باب فتح ومن باب الجنۃ ینظر ما فی الگنبد الشریف فی وسط الگنبد الشریف والرجال یصلون ویسجدون ویطلبون الکاتب بأن یصلی ویسجد ہ أنا أتوضاء علی الحوض الذی رأی باالمواجہۃ وأنا اتوضاء علی الحوض فعلت الوضوء تمامًا و أقصد للذہاب الی الجماعۃ الذی یصلّون ویسجدون الی الگنبد الشریف بأن یقرؤن الرجال فی حالۃ السجدۃ وجہاً للقطب والمسجد قائم مقامۃ فحصل الیقظۃ۔۔۔۔۔۔

(ورق ۹۔ ۱۰)

۴ ربیع الاول کی شب میں پاک پتن میں خواب دیکھا کہ میں آیا ہوں اور کوئی کہتا ہے اپنی

رتی اتار دو دوسرا کہتا ہے کہ جوتی اتار دی ہے
رحفاظت کے لیے سیکھنے والے شخص کو دے
ی ہیں۔ پھر میں نے حریق المحبت (بابا صاحبؒ)
لی مسجد کو دیکھا وہ اپنی جگہ پر ہے، سب عمارتیں
نی اصلی جگہ پر ہیں مگر ایک بہت بڑا حوض جنتی
روازے کے مقابلے میں ہے اور لوگ اس میں
ضو کر کے جنتی دروازے کے قریب جا رہے ہیں،
ہت سے لوگ جنتی دروازے کے قریب نماز پڑھ
ہے ہیں۔۔۔ (۹)

اور جنتی دروازے سے گنبد شریف کے اندر کا
ظر نظر آرہا ہے، لوگ نماز پڑھ رہے، سجدہ کر رہے
ں اور راقم الحروف سے بھی کہہ رہے ہیں کہ نماز
ھے اور سجدہ کرے میں نے حوض پر وضو کیا اور
عت کے لیے ادھر جانے کا ارادہ کیا جہاں
ند شریف کی طرف لوگ نماز پڑھ رہے ہیں
یکھا کہ لوگ حالت سجدہ میں قطب کی جانب
ر کے کچھ پڑھ رہے ہیں اور مسجد اپنی جگہ پر
ئم ہے اسی میں آنکھ کھل گئی۔

۱) روز رخصت شخصے مجذوبے نزدیک دروازہ
شتی روبرو حضرت حریق المحبۃ دیدہ گفت کہ "
م ہوا ہے کہ سہ نفل یک دوگانہ نذر اللہ، دوم
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، سوم
ملائک۔ لیکن بطریق شغل پاس انفاس
نت" (ورق ۱۰)

ایک دن ایک مجذوب شخص بہشتی درواز
ے سامنے ملا اور کہنے لگا "حکم ہوا ہے کہ تین
ل ایک دوگانہ نذر اللہ، دوسرا نذر محمد
ول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلم، تیسرا نذر ملائک
ن شغل پاس انفاس کے طریق پر کہا۔
") یک بار سہ روز قبل از رخصت پیش از
ز صبح در مواجہ حضرت مخدوم شکر بار ایدنی اللہ

بلطفہ الخفی والجلی نشستہ بودم، یکبارگی می بینم
کہ گویا محفل قائم است و تقسیم خرما می شود چنانچہ
خادمے یک خرما یا پنج لیکن اغلب است کہ پنج
خواہد بود بدست من داد من خود را دران جا کہ
نشستہ بودم نیافتم بلکہ نزدیک صاحب قبلہ یافتم
درین ضمن بیدار شدم ہمانجا خود را یافتم دیدم کہ
تکبیر نماز صبح شد الحمد للہ والمنۃ۔ در نماز شامل
شدم بعد ازان روز منتظر خرما بودم و حالانکہ تبرک
رسم دستار و سلاری می بود وقتے کہ اول رخصت
از صاحب سجادہ شدہ بودم و دستارے و سلاری
عنایت کردہ بودند بعد ازان توقف بمیان آمد کہ
صاحبزادہ عالی قدر طرفے تشریف فرمودہ بودند
درین ضمن پانزدہ یا شانزدہ روز راہ رفتن موقوف
شد، چون باز آمدند ہرگاہ این غلام کہ برائے ملاقا
رفت فقرائے جلالی درود کردند و نذر صاحبزادہ خرما
آوردند آن صاحبزادہ عالی قدر حوالہ خادمے کردند
چنانچہ غلام کاتب الحروف ازان خادم یک خرما طلب
کرد، بمجرد استماع صاحب سجادہ عالی قدر تمام
خرما بما عنایت کردند، شمار کردم پنج عدد
بودند معلوم کردم کہ حالا رخصت است چنانچہ در
دو سہ روز اتفاق روانہ شدن شد الحمد للہ علی ذلک
لہ (ورق ۱۱-۱۲)

ایک بار رخصت ہونے سے تین دن پہلے صبح
کی نماز سے قبل حضرت مخدوم شکر بار بابا صاحبؒ
اللہ ان کے خفی و جلی الطاف سے میری تقویت فرمائے کے
مواجہہ میں بیٹھا ہوں، اچانک دیکھتا ہوں کہ محفل
قائم ہے اور چھوارے بٹ رہے ہیں، چنانچہ ایک
خادم نے ایک چھوارہ یا پانچ غالباً پانچ تھے میرے
ہاتھ میں رکھ دیا میں نے خود کو جہاں بیٹھا تھا
وہاں نہیں پایا بلکہ صاحب قبلہ کے پاس پایا، اسی
میں آنکھ کھل گئی اور خود کو اسی جگہ دیکھا،

نماز صبح کی تکبیر ہو رہی تھی ۔ الحمد للہ والمنۃ ۔ نماز میں شریک ہوگیا ۔ اس دن کے بعد سے چھواروں کا منتظر رہا ۔ حالانکہ تبرک کی رسم دستار اور سلاری ہے ، جب پہلی بار صاحب سجادہ سے رخصت ہوا تھا تو انھوں نے دستار اور سلاری مجھے عنایت فرمائی تھی ، پھر کچھ ٹھہرنا ہوا تو صاحب سجادہ کسی جانب تشریف لے گئے ، اس طرح ۱۵ ۔ ۱۶ دن تک جانا موقوف رہا ۔ جب وہ واپس تشریف لائے اور یہ غلام ملاقات کرنے گیا تو کچھ جلالی فقرا آئے ہوئے تھے انھوں نے صاحبزادہ کو چھوہارے نذر کیے ، وہ صاحبزادے نے ایک خادم کے حوالے کردے ۔ غلام کاتب الحروف نے اس خادم سے ایک چھوہارا طلب کیا ۔ یہ سنتے ہی صاحب سجادہ نے وہ سب چھوہارے مجھے عنایت کردیئے میں نے گنے تو پورے پانچ تھے ، جان لیا کہ اب رخصت ہے ، چنانچہ دو تین دن بعد روانگی کا اتفاق ہوا ۔ الحمد للہ علی ذلک ۔

(۶) رایت فی لیل احدی عشرین من الربیع الاول[۲] سنۃ ۴ احمد شاہ این غلام الکاتب جلس مواجہۃ الشیخ کلیم اللہ ایدنی اللہ بلطفہ الخفی والجلی وحضرت شیخ کلیم اللہ یتبسم ویبتہج ویقول الکاتب رایت شغل التوجہ فی کتاب آن حضرت المسمیٰ کشکول فیقول قدس اللہ سرہ العزیز : ”کچھ تھوڑا سا باقی ہے “

میں نے ۲۱ ربیع الاول ۴ھ جلوس احمد شاہی کی شب میں خواب دیکھا کہ یہ غلام راقم الحروف حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی رح اللہ ان کے لطف خفی وجلی سے میری تائید فرمائے ، کے سامنے بیٹھا ہے اور حضرت شیخ کلیم اللہ تبسم فرما رہے ہیں اور بہت خوش ہیں ۔ یہ راقم کہہ رہا ہے کہ میں نے شغل توجہ آن حضرت کی کتاب کشکول میں دیکھا ہے حضرت قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا کچھ تھوڑا سا باقی ہے ۔

(۷) رأیت یوم العرس حضرت خواجہ بزرگ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فی تحت قدوم حضرت خواجہ شہید المحبۃ ایدنی اللہ تعالیٰ بلطفہا الخفی والجلی آن حضرت خواجہ بزرگ یأمر : ”تم نے ایک ختم ہمارا نہ کیا ، ختم چشتیہ پڑھا کرو “

(ورق ۱۲)

میں نے حضرت خواجہ بزرگ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عرس کے دن دیکھا کہ میں حضرت خواجہ شہید المحبۃ (خواجہ قطب رح) اللہ ان کے الطاف خفی وجلی سے میری تائید فرمائے کے قدموں کے نیچے بیٹھا ہوں اور خواجہ بزرگ رح فرما رہے ہیں تم نے ایک ختم ہمارا نہ کیا ، ختم چشتیہ پڑھا کرو ۔

(۸) رأیت فی حضرت پاک پتن فی اللیل الخامس من المحرّم ان اذکر ذکر الجہر ولیس یصدر الضرب منی فیقول الشخص ”کثرت کے تئیں دخل ہے “ (۱۵ ب)

میں نے پاک پتن شریف میں ۵ محرم کی رات کو دیکھا کہ میں ذکر جہر کر رہا ہوں اور میرے منہ سے ضرب نہیں نکل رہی ہے تو مجھ سے کوئی کہہ رہا ہے : ”کثرت کے تئیں دخل ہے “

---

[۱] یہ قصہ تکملہ سیر الاولیا ، ص ۱۱۲ پر بھی نقل ہوا ہے ۔

[۲] ۲۱ ربیع الاول ۱۱۶۴ھ / ۱۷ فروری ۱۷۵۱ء ۔ حضرت شاہ فخر الدین رح کے اورنگ آباد سے روانہ ہونے کا سال کسی نے ۱۱۶۰ھ اور کسی نے ۱۱۶۵ھ لکھا ہے ، مگر ان تحریروں سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے یہ سفر ۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء میں کسی وقت اختیار فرمایا

(٩) رأیت فی المنام ان شیخ الوحید[1] فعل حوالتی بقطب صاحب حضرت خواجہ قطب شہید اللہ وحضرت قطب صاحب حوالہ حضرت خواجہ خواجگاں حضرت گنج شکر رحمۃ تعالیٰ فرمودند بعد ازاں بدستور معمول در جناب مستطاب باریاب حضور شدہ در مسجد شاہ جہاں حضور آں قبلہ یعنی رکعتین سنت فجر ادا کردہ انتظار ادائے فجر می کردند یکایک از خود ربودند دیدم کہ نورے بلا جسم از گنبد شریف می آید نزدیک این غلام آمدہ ویک سبد ریوڑی کہ تبرکاً می دھند و دیگر سبد گل دادند۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ (ورق ٢٠ ب)

میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے شیخ الوحید نے مجھے قطب صاحب کے حوالے کیا اور حضرت قطب صاحب نے حضرت خواجہ خواجگاں گنج شکر رحمۃ اللہ تعالیٰ کے حوالے کیا۔

اس کے بعد معمول کے مطابق میں حضور میں باریاب ہوا اور مسجد شاہ جہاں میں آں حضور کے سامنے فجر کی دو رکعت سنتیں ادا کرکے نماز فجر ادا کرنے کا انتظار کرنے لگا اچانک مجھ پر غشی سی طاری ہوگئی اور میں نے دیکھا کہ ایک بے جسم کا نورانی ہیولیٰ گنبد شریف سے نکلا اور اس غلام کے نزدیک آیا، ایک ٹوکری میں ریوڑی جو تبرک کے طور پر دی جاتی ہے اور دوسری ٹوکری میں پھول مجھے دیئے۔

الحمد للہ ثم الحمد للہ

(١٠) رأیت فی المنام حین قصدت الزیارۃ فی مقام پانی پت انّ شخصاً صالحاً جاء و فی یدہ خم لیکن خم از شیشہ است، می گوید کہ این شراب از گنج شکر است بنوشید و بدیگراں ہم بنوشانید

والسلام علی من اتبع الہدیٰ (٢٣ ب)

جب میں نے پانی پت میں زیارت کا قصد کیا تو خواب میں دیکھا کہ ایک صالح شخص سامنے آیا جس کے ہاتھ میں ایک خم تھا، مگر وہ خم شیشے کا تھا۔ اس نے کہا یہ گنج شکر کی شراب ہے۔ تم بھی پیو اور دوں کو بھی پلاؤ۔ سلام ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی۔

(١١) رأیت فی المنام مرّۃ اُخری فی جہاں آباد ان شیخ الاسلام شہید المحبۃ قائم و فی ید شخص آخر قدح شفاف کبیر مملوء من الماء، والغلام یحذو حذو الشیخ الاسلام قال لشخص الذی فی یدہ: ''یہ بھی الفقیں کو دو''، چنانچہ بموجب ارشاد پیالہ بدست غلام داد و غلام در دست گرفت و بیدار شد'' (ورق ٢٢ ۔ الف)

ایک بار اور میں نے جہاں آباد (دہلی) میں خواب دیکھا کہ شیخ الاسلام شہید المحبۃ (خواجہ قطب صاحبؒ) کھڑے ہیں اور دوسرے ایک شخص کے ہاتھ میں ایک بڑا شفاف پیالہ پانی سے بھرا ہوا ہے۔ یہ غلام شیخ الاسلام کے قدم بقدم چل رہا ہے۔ انہوں نے اس شخص سے جس کے ہاتھ میں کٹورا ہے فرمایا: یہ بھی الفقیں کو دو۔

چنانچہ بموجب ارشاد اس شخص نے پیالہ غلام کے ہاتھ میں دے دیا، میں نے ہاتھ میں پکڑا اور آنکھ کھل گئی۔

(١٢) فی الیقظۃ فی سنہ ١ احمد شاہ بعد یوم الاربعاء فی صبح الخمیس وقت غسل المزار الشریف ذہبت للصحراء لدفع الحاجۃ البشریۃ ولما حصلت الطہارۃ

---

[1] حضرت فخر جہاں جب شیخ الوحید لکھتے ہیں تو مراد خواجہ بزرگ اجمیریؒ ہوتے ہیں۔

فاقوم تاصدا المجیئ الروضۃ الشریف اذا سمعت صوتاً من السماء من الیمین بغتۃً: غسل ہوتا ہے۔ فلہٰذہ السماع توجہت دقمت بسماع الصوت وتحیرت --- فرأیت مثل المطر یمشون افواجا افواجا ویقولون بالجہر غسل ہوتا ہے فلما سمعت مکرراً صوت الہاتف فوجہت حزیناً صمیماً وتوضأت سریعاً فجئت بروضۃ الشریفۃ للسلطان العاشقین ایدنی اللہ بلطفہ الخفی والجلی فرأیت أن الغسل یکون ولما قمت فی جناب ملاذ الغرباء فجاء الخادم نظر وأنا باکیا فقال الخادم خذ ماء الغسل والعق بالعینین واعطی الخرقۃ المتبرکۃ الحمد للہ رب العالمین حمداً کثیراً کثیراً)

(ورق ۲۴ب)

سنہ جلوس احمد شاہی لے میں بدھ کے بعد اور جمعرات کی صبح کو بیداری کی عالم میں مزار شریف کے غسل کے وقت میں حاجت بشری کی تکمیل کے لیے جنگل کی طرف نکل گیا، جب طہارت کرچکا اور روضہ شریف کی طرف جانے کے لیے اٹھا تو اپنی داہنی سمت میں آسمان کی طرف سے ایک صدا سنی: غسل ہوتا ہے یہ سنتے ہی میں آواز کی طرف متوجہ ہوا۔ اور حیران ہوگیا دیکھا کہ۔۔ بارش کی طرح فوج درفوج جارہے باآواز کہتے ہیں کہ غسل ہوتا ہے "

جب میں نے دوبارہ یہ آواز سنی تو صدق دل سے متوجہ ہوا جلدی سے وضو کیا اور روضہ شریفہ (خواجہ بزرگ) کی طرف آیا، دیکھا کہ وہاں غسل ہورہا تھا جب میں غریب نواز کی پناہ میں کھڑا ہوا تھا تو ایک خادم آیا اور اس نے مجھے روتے ہوئے دیکھا خادم نے کہا کہ غسل کا پانی لو اور آنکھوں سے لگالو۔ اس نے مجھے فرقہ متبرکہ بھی دیا۔

الحمدللہ۔ کثیراً کثیراً۔

(۱۳) مرّۃ واحدۃ رأیت أن الاصبع الاعظم لقدوۃ الاصحاب الصدیق الاکبر صلوٰۃ اللہ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ وآلہ وسلّم واصحابہ، دردہن می کردم ومی لیسم ناگاہ بیدار شدم (ورق ۲۷ب)

ایک بار میں نے دیکھا کہ حضرت صدیق اکبر (ہمارے نبی پر صلوٰۃ وسلام ہو اور آپؐ کے آل واصحاب پر) کے دست مبارک کی بڑی انگلی (وسطیٰ) منہ میں لے کر چوس رہا ہوں۔ اسی حال میں آنکھ کھل گئی۔

(۱۴) مرۃ اخریٰ رأیت فی المنام فی لیلۃ الثلاث من ربیع الثانی ان حضرت شاہ کلیم اللہ شیخی وسندی یقول أنہ سواء السبیل أنا أقرأ نکم واکثر الکتاب یطلب نفی ہذا الزمان قرأت علی حضور المبارک فبعد ہذا یقول الشیخ، آپ کے پڑھنے سے بہت خوشی ہوئی ویقول الشخص: "تمہاری نسبت کا پیغام کفایت خاں کی بیٹی سے کیا ہے "

چنانچہ صورت آں عجوزہ کفایت خاں آوردہ اندومی گویند کہ ایں صورت می دارد

(ورق ۲۸ب)

ایک بار منگل کی رات کو ربیع الثانی کے مہینے میں خواب دیکھا کہ شیخی و سندی حضرت شاہ کلیم اللہؒ فرما رہے ہیں کہ سواء السبیل میں تمہارے لیے پڑھتا ہوں اور اکثر حصہ کا پڑھنا طلب کرتے ہیں۔ اس وقت میں حضور مبارک میں پڑھتا ہوں تو شیخ فرماتے ہیں کہ: آج کے پڑھنے سے بہت خوشی ہوئی پھر کوئی شخص کہتا ہے کہ "تمہاری نسبت کا پیغام کفایت خاں کی بیٹی سے کیا ہے"

چنانچہ دختر کفایت خاں کی تصویر لائے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اس کی ایسی صورت ہے۔

(۴)

یہ مختصر رسالہ جس کا کوئی نام نہیں [۱]، سہولت کے لئے میں نے اسے "واردات فخریہ" سے موسوم کیا ہے (۴۰) صفحات کو محیط ہے ہر صفحہ میں اوسطاً (۱۲) سطریں ہیں، رسالہ کا سائز ۱۳×۱۸ سینٹی میٹر ہے، اسے سید بدیع الدین (خلیفہ حضرت فخر جہاںؒ) نے شب یکشنبہ ہفتم شعبان ۱۲۱۶ھ (۱۳ دسمبر ۱۸۰۱ء) کو نقل کیا ہے، اس نسخے سے اس کی ایک نقل کامل علی شاہ قادری ملتانی نے ۲۲ شوال ۱۳۰۸ھ (۳۱ مئی ۱۸۹۱ء) کو غالباً حیدرآباد دکن میں تیار کی۔ نسخہ کا کاتب بہت غلط نویس ہے اور بظاہر عربی زبان سے قطعاً واقف نہیں ہے اس نے نقل میں بے شمار غلطیاں کی ہیں اور بعض آسان و معمولی الفاظ کو بھی کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔ ہم نے یہ چند اقتباسات بطور نمونہ دیئے ہیں اور اس کی عبارت میں جو قواعد یا زبان کی غلطیاں ہیں انھیں بدستور باقی رکھا ہے، ایک آدھ جگہ پر معمولی سی قیاسی تصحیح کر دی ہے۔

اس رسالے سے حضرت فخر جہاںؒ کے اسفار کا حال بھی معلوم ہوتا ہے، جن شہروں کا اس میں تذکرہ ہے ان میں "اورنگ آباد، برہان پور"، اُجین، انبالہ، شاہ پور، پانی پت، پاک پٹن اجمیر، جے نگر، (جے پور) دہلی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

شخصیات میں حضرت خواجہ اجمیریؒ، حضرت خواجہ قطب شاہؒ، حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ، حضرت ابراہیم ثانیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت چراغ دہلیؒ، حضرت کمال الدین علامہؒ، حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ، حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ اور بعض دوسرے بزرگوں کے نام آتے ہیں۔

اس رسالے میں بیشتر احوال واردات کا تعلق اجمیر شریف یا پاک پٹن شریف کی حاضری کے زمانے سے ہے۔ اور ان کا زمانہ عہد احمد شاہ (آغاز ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) ہے۔ بعض مکشوفات پر سنہ جلوس احمد شاہی تاریخ دی ہے۔

اسی سے یہ علم ہوتا ہے کہ بیشتر واردات اس زمانے کی ہیں جب حضرت کا سن شریف (۴۰) سال سے کم تھا اور غالباً شادی بھی نہیں ہوئی تھی کیونکہ ایک اندراج سے معلوم ہوتا ہے

[۱] غالباً یہ رسالہ خواجہ گل محمد احمد پوری مولف تکملہ سیر الاولیا (مطبع رضوی دہلی ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء) کے سامنے رہا ہے انھوں نے حضرت فخر جہاں کے حالات میں اس کے اقتباسات صفحہ ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۴ پر دیئے ہیں اور ان عبارتوں کو "از دستنو خاص آں حضرت" بتایا ہے۔ اور کسی کتاب میں رسالہ واردات سے استفادے کا سراغ نہیں ملتا۔

کہ حضرت کی منگنی کفایت خاں کی دختر نیک اختر سے ہوئی تھی اور ان کی صورت عالم کشف میں حضرت کو دکھا دی گئی تھی۔ (ورق ۲۸ ب)

رسالہ واردات فخریہ میں تلو کے قریب مکشوفات قلم بند ہوئے ہیں۔ بعض خواب ہیں کچھ وہ ہیں جو نیم بیداری کی حالت میں پیش آئے اور کچھ احوال کا مشاہدہ جاگتے میں کیا گیا۔

حضرت فخر جہاں کا وصال ۲۷ رجب الثانیہ ۱۱۹۹ھ ۷ رمئی ۱۷۸۵ء) ہفتہ کو صبح کے وقت ہوا اور یہ رسالہ وصال سے (۱۷) سال کے بعد سید بدیع الدین رح نے نقل کیا۔ اس کی عبارت کو قابل اشاعت بنانے کے لئے بہت دیدہ ریزی و مغز پاشی کی ضرورت ہے۔

اللہ نے توفیق دی تو اسے مکمل حالت میں شائع کیا جائے گا۔

(۵)

میاں اخلاق احمد مرحوم و مغفور کی اس کتاب کے ساتھ اس رسالے کا تعارف پہلی بار شائع ہو رہا ہے اور یہ وابستگان سلسلہ چشتیہ فخریہ کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔ میری دعا ہے کہ مرحوم کی یہ کتاب مقبول ہو اور ان کیلئے سرمایۂ آخرت بنے آمین

والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

محبوبِ الٰہی نظام الدین رح

کنور مہندر سنگھ بیدی

اے نظام الدین محبوب خدا عالی مقام
ایک مجبورِ محبت کا تجھے پہنچے سلام
تیرے دروازے پہ یوں خالی نہیں آیا ہوں میں
ایک نقدِ جاں ہے جو تیرے لیے لایا ہوں میں
ہاں مگر اک التجا کرتا ہوں اے نورِ خدا
نام لیوا ہیں جو تیرے بخش انھیں صدق و صفا
آستانے پر جو تیرے آئیں وہ سب نیک ہوں
جسم میں لاکھوں ہوں لیکن روح میں سب ایک ہوں
پاس ہو ان کو بزرگوں کا وطن کا ہو خیال
ان کے چہروں سے جھلک اٹھے سعادت کا جلال
ان کے ہونٹوں پر تبسم ہو دلوں میں درد ہو
ان میں سے ایک ایک غازی ہو، جواں ہو، مرد ہو
وقت للکارے تو جاں تک سے گزرنا سیکھ لیں
دل میں جینے کی تمنا ہو تو مرنا سیکھ لیں
اک گنہگارِ محبت کا یہ ہدیہ ہو قبول
دامنِ عصیاں سہی لیکن عقیدت کے ہیں پھول

۱؎ تکملہ سیر الاولیاء سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا نکاح اورنگ آباد میں ہوا تھا اور اپنے فرزند غلام قطب الدین رح کو اپنی بڑی بہن کی نگرانی میں چھوڑ کر آئے تھے۔ اس اعتبار سے حضرت کے وصال کے وقت صاحبزادہ ۲۳ سال کے رہے ہوں گے مگر دوسرے قرائن سے اسکی تصدیق نہیں ہوتی۔ اور کسی ذریعہ سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اورنگ آباد سے ۱۱۶۰ میں آنے کے بعد تا وفات آپ ادھر دوبارہ تشریف لے گئے ہوں۔

پیغام انسانیت حافظ وارث علی شاہ صاحبؒ : دیوی شریف

(۱۲۳۸ھ تا ۱۳۲۳ھ)

ڈاکٹر صفی احمد کاکوروی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

انیسویں صدی کا دَور ہے۔ اودھ کی فضا عیش و عشرت سے معمور رہے فوجی قوتیں اور ملکی اقتدار رو بزوال ہیں۔ مگر علمائے حق اور صوفیائے پاک طینت کا فقدان نہیں ہے۔ ان صوفیائے صاف باطن نے عوام و خواص اور اپنے حاشیہ نشینوں کو انسانیت کا مفہوم سمجھایا۔ اس کی اعلیٰ اقدار اس طرح لطیف پیرائے میں ان کے ذہن نشین کرائیں کہ وہ ان کی ذات میں رَچ بَس گئیں۔ پیغمبروں، رشیوں، منیوں اور اوتاروں کی بعثت کا مقصد ہی یہی ہوتا رہا کہ آدمی کو انسانیت کا لباس پہنائیں۔ آپسی میل محبت، یکجہتی، دوسروں کے ساتھ حُسنِ سلوک و خیر خواہی اور جذبۂ ایثار و قربانی سے اپنی ذات کو مُزین کریں۔ ضلع بارہ بنکی کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں ایک بزرگ بیٹھے ہیں۔ ان کے اِرد گرد مسلم و غیر مسلم شیدائیوں کا ایک جَمِ غفیر ہے۔ ایک صاحب ایک چھوٹا سا مگر اختلافی سوال کر دیتے ہیں کہ حضور حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت تک میری امت (۷۳) تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی جس میں ایک فرقہ نجات یافتہ ہوگا اور باقی بہتر ۷۲ گمراہ، وہ نجات یافتہ فرقہ کون ہوگا؟ کسی مولوی یا دیوبندی عالم سے یہ سوال کیا جاتا تو وہ نہ معلوم کتنی لمبی چوڑی تقریر کر بیٹھتا۔ مگر وہ صوفی بزرگ بڑے اطمینان اور سکون نیز بڑے دلکش انداز سے فرماتے ہیں کہ حروف تہجی کے لحاظ سے حسَد کے اعداد جوڑو اور حساب لگا کر جوڑتے ہیں تو بہتر (۷۲) نکلتے ہیں (ح کے ۸، س کے ۶۰ اور د کے ۴۔ ۷۲)۔ فرماتے ہیں بَس جو فرقہ حسَد سے خالی ہے وہی ناجی یا نجات یافتہ ہے۔ محفل میں موجود تمام حاضرین اُسی وقت حسَد کے خیال تک سے پناہ مانگ لیتے ہیں۔ صوفیائے کرام کا یہی طریقۂ تبلیغ رہا ہے۔

آپ کو شاید یہ معلوم ہوگا کہ یہ صوفی بزرگ حضرت حاجی حافظ شاہ وارث علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور وہ بستی دیوی شریف ہے۔ اس نشست میں انسانیت کی پیغامبر ایسی ہستی کے بارہ میں مختصراً گفتگو ہوگی۔

آپ کا سلسلۂ نسب چھبیس ۲۶ واسطوں سے حضرت امام حسینؑ تک پہونچتا ہے۔

اولاد ہے یہ خاص شہِ مشرقین کی
چھبیسویں ہے پشت جناب حسینؑ کی

ان نجیب الطرفین حسینی سید کے مورث اعلیٰ سید اشرف ابو طالبؒ ہلاکو کے حملوں کے دوران نیشاپور چھوڑ کر ہندوستان آئے اور قصبہ کنتور ضلع بارہ بنکی میں اقامت پذیر ہو گئے۔ بعد ازاں تقریباً چار سو سال بعد ان کی اولاد میں سید عبد الاحد صاحب نے دیوی ضلع

بارہ بنکی کو مستقل اپنا وطن بنالیا۔ اس وقت سے ان کی
اولاد دیلوی کہلائی جانے لگی۔

حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحبؒ کے بزرگوں
نے بہت پہلے آپ کی ولادت کی پیشین گوئی فرمادی چنانچہ
رمضان المبارک ۱۲۳۸ھ میں حضرت قربان علی شاہ کے
گھر میں رشد و ہدایت کا یہ آفتاب طلوع ہوا جس کی ضیاپاشیوں
سے عوام و خواص، مسلم وغیر مسلم سبھی اپنے اپنے ظرف کے
مطابق اخذ فیض کرتے رہے ہیں۔ آپ کا نام نامی 'وارث علی'
اور عرفیت مٹھن میاں، رکھی گئی مگر عرف عام میں آپ
حاجی صاحب کے نام سے مشہور ہوئے۔

حدیث نبویؐ من سَعِدَ سَعِدَ فِی بَطْنِ
اُمِّہٖ (جو سعید و خوش بخت ہوتا ہے وہ ماں کے پیٹ
ہی سے سعید و خوش بخت ہوتا ہے) کے مصداق،
آپ کے بچپن سے ہی ولایت و بزرگی کے آثار ظاہر ہونے لگے
تھے۔ آپ تین سال کی عمر میں والد محترم کے بعد چند دنوں
میں والدۂ محترمہ کے آغوش تربیت و محبت سے محروم
ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی نس نس میں محبت کا خمار
بھر دیا تھا۔ والدین کی رحلت کے بعد آپ کی پرورش
آپ کی دادی صاحبہ نے اپنے ذمہ لے لی۔ ۵ برس کی عمر
میں مکتب میں داخل کیے گئے۔ خداداد ذہانت کی بناپر
سات برس کی عمر میں ہی قرآن مجید حفظ کرلیا تھا۔
یتیمی و یسیری تو تھی ہی سات برس کی عمر میں دادی صاحبہ
کی بھی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد آپ کے حقیقی بہنوئی
حافظ سید خادم علی شاہ اپنے ہمراہ لکھنؤ لے آئے۔ وہ
خود بڑے خداترس اور صاحب حال بزرگ تھے۔ حاجی
صاحب کی فطری صلاحیت اور استعداد اس پر بہنوئی
کی تربیت و صحبت سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی۔ انھوں
نے آپ کو تعلیم باطنی و ظاہری کے ساتھ ہی اذکار و اشغال
بھی سکھائے اور سلسلہ قادریہ چشتیہ میں نہ صرف اپنا
مرید فرمایا بلکہ اجازت و خلافت سے بھی سرفراز فرمایا
آپ کی عمر ۱۵ برس کی تھی کہ آپ کے پیرو مرشد نے وصال
فرمایا چنانچہ پیرو مرشد کے سیوم کے روز علما و مشائخ کے
مجمع میں آپ کی خرقہ پوشی ہوئی بچپن سے ہی مال دنیا
آپ کے لئے مار دنیا کے مصداق تھا۔ چنانچہ والدین کا
متروکہ اثاثہ و نقد رقم تمام کا تمام آپ نے ضرورت مند
وغربا میں تقسیم کردیا اور گویا 'اَلسَّخِیُّ حَبِیْبُ اللہِ'
(سخی اللہ کا دوست و محبوب ہوتا ہے) کا تاج پہن لیا۔
ضرورت مندوں اور ناداروں کی حاجت روائی اور اپنی
ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دینا آپ کا
عین مسلک و مشرب تھا۔

آپ نے متقدمین حضرات صوفیہ کی طرح سخت
ریاضتیں و مجاہدے کئے، سات پاپیادہ حج کئے۔ یہی نہیں
بلکہ حج بیت اللہ کے وقت جو لباس زیب تن فرمایا تو مدت العمر
اسی قسم کے لباس (احرام) میں اور برہنہ پا رہے اور پھر
کبھی پلنگ تک پر نہ آرام فرمایا بلکہ ہمیشہ زمین پر استراحت
فرماتے۔ نفس کشی کی خاطر تمام اسباب و لذات دنیوی
سے مکمل احتراز کیا اور تمام عمر مجرد رہے اور شادی نہ کی
نیز تمام زندگی کم خوردن، کم خفتن و کم گفتن پر عمل پیرا رہے۔
ایک طویل عرصہ تک مخلوق خدا کو اپنے فیض صحبت
و پیغام انسانیت سے سرفراز و فیضیاب کرکے یکم صفر ۱۳۲۳ھ
مطابق ۱۹۰۵ء کو صبح صادق کے وقت جب آفتاب
مشرق سے طلوع ہونے والا تھا یہ آفتاب انفسی
غروب ہوکر اپنے مالک حقیقی سے جا ملا اور اپنے
حسب وصیت اسی جگہ جہاں آج درگاہ شریف ہے
قیامت تک کے لئے روپوش ہوگیا۔ درگاہ شریف
آج بھی مرجع خاص و عام ہے اور ہر مذہب و ملت کے
لوگ اپنے اپنے ظرف کے مطابق آج بھی اسی طرح
فیضیاب ہوتے رہتے ہیں۔ ہر سال تاریخ وصال پر
ایک شاندار عرس اور میلہ بھی لگتا ہے۔

حاجی وارث علی شاہ صاحبؒ کی تعلیم نہایت
عام فہم، دلوں کو موہ لینے والی اور قلوب میں اتر
جانے والی ہوتی۔ عام طور پر صوفیائے کرام کی طرح

آپ کی تعلیمات کا مقصد بھی تمام انسانوں کو ایک اکائی میں
جوڑنے اور انھیں اللہ تعالیٰ کا کنبہ سمجھنے سمجھانے کا ہوتا۔
آپ کی نظر میں تمام انسانوں کی تخلیق کا ایک یہ بھی مقصد تھا
کہ وہ آپسی میل محبت اور اتحاد و اتفاق قائم رکھیں کیونکہ

صورت میں تفرقہ ہے حقیقت میں کچھ نہیں
تمام عالم عین حق ہے اس کے سوا کچھ نہیں

حضرت شاہ تراب علی قلندر کاکورویؒ کیا پیاری بات
فرماتے ہیں

جیسے موجیں عین دریا ہیں حقیقت میں تراب
ویسے عالم عین حق ہے غیر حق عالم نہیں

آپ کی تمام تر تعلیم اور تلقین کا مرکز محبت تھا۔ اسی سے
آدمی انسان بنتا ہے اور اپنے مالک اور آقا کو پہچانتا ہے
اور یہی اصل ہے۔

ملت عشق از ہمہ دینہا جدا است
عاشقاں را مذہب و ملت خدا ست

آپ کے محبت و انسانیت کے اسی درس نے
ہندو مسلمان سب کے دل ایسے موہ لئے کہ وہ آپ کے
حلقہ بگوش ہو گئے۔ ایک غیر مسلم کو کس طرح تلقین فرماتے
ہیں، عدل و انصاف کیا کرو، اپنے پیدا کرنے والے کو
محبت کے ساتھ یاد کیا کرو، پھر فرمایا "محبت ہے تو سب
کچھ ہے اور محبت نہیں تو کچھ نہیں" جیسا کہ مولانا روم
فرماتے ہیں

از محبت مردہ زندہ می شود
وز محبت شاہ بندہ می شود

(محبت وہ چیز ہے جو مردے میں جان ڈال دیتی ہے اور
بادشاہ کو بندہ بنا دیتی ہے)۔
ایک دوسرے مرید کو نصیحت فرمائی۔ اللہ کی تمام مخلوق سے
ہمدردی اور اچھا سلوک صرف اس خیال سے کیا کرو
کہ یہ اللہ کے بندے اور اس کی کاریگری کی نشانیاں
ہیں۔ تم کو اسی طرح اس کی محبت نصیب ہوگی۔ یہی
اصل طریقت ہے معلم انسانیت شیخ سعدیؒ اسی بات کو
یوں کہتے ہیں

طریقت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

(طریقت مخلوق خدا کی خدمت کے سوا کچھ نہیں نہ کہ
صرف گدڑی پہن کر اور تسبیح لے کر مصلے پر بیٹھ جایا جائے)
فرماتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ سے محبت اور اس کی
مخلوق سے الفت نہیں تو عبادت ریاضت بیکار چیزیں
ہیں

زہد میں کچھ بھی نہ حاصل ہوا نخوت کے سوا
شغل بیکار ہیں سب اُن کی محبت کے سوا

فرماتے تھے کہ انسانیت یہ ہے کہ تمام اختلافات کو
مٹا کر اور فروعی جھگڑوں سے بلند ہو کر زندگی گزاری جائے
اور آپسی اتحاد اور میل و محبت کو فروغ دیا جائے گویا
انسان کی پیدائش کا مقصد یہی ہے

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

(تمہارا مقصد پیدائش تو یہ ہے کہ تم آپسی میل و محبت کی
فضا قائم کرو خالق و مخلوق سے ناطہ جوڑو نہ کہ اختلاف
کی آڑ میں آپسی تفرقہ اور جدائی پیدا کرو)۔
آپ کا ارشاد ہے کہ مذہبی رواداری اور انسانیت کی اقدار
میں یہ چیز بھی ضروری ہے کہ کسی کا کبھی برا نہ چاہو نہ اس کو بددعا دو
اور نہ اس کے مذہب کو برا کہو کیونکہ خدا طلبی کے راستے مختلف ہیں

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

یہ تھا پیغام انسانیت کی علمبردار ایک مقدس ہستی حضرت
حاجی سید وارث علی شاہؒ کی حیات اور تعلیمات کا مختصر سا خاکہ اس
مادیت، نفسی نفسی اور اختلافات کے دور میں ان بزرگوں
کے درس انسانیت اور آفاقی پیغام پر عمل کر کے نہ معلوم اور
کتنوں کی زندگیاں نکھر اور سنور سکتی ہیں

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

خواجہ حسن ثانی نظامی کا سفرِ افریقہ و ماریشس

(مسلسل)

تیسری قسط

کالے کوس، کڑے کوس

کہانی کوزے کی

عارف رومیؒ نے کہا تھا۔ میں خود ہی کوزہ (مٹی کا پیالہ، آبخورہ) ہوں۔ خود ہی اس کوزے کو بنانے والا کمہار! خود کوزے کی مٹی۔ خود اس کوزے میں شراب پینے والا بلا نوش رند خود بازار جاکر اس کوزے کو خریدنے والا گاہک اور پھر وہ آدمی بھی میں خود ہی ہوں۔ جو اس پیالے کو توڑ تاڑ کر چل دیتا ہے!

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ ——
خود رند سبو کش
خود بر سرِ آں کوزہ خریدار بر آمد ——
بشکست و رواں شد

کوزے اور پیالے کی یہ کہانی بہت پرانی بھی ہے اور بالکل نئی بھی۔ پرانی اس لئے کہ دنیا میں شروع سے یہی سب کچھ ہوتا آیا ہے۔ اور نئی اس لحاظ سے کہ آج بھی یہی ہو رہا ہے۔

گذشتہ کل مجھے ڈربن سے دور شہر میرس پیٹرس برگ میں دل کی بیماری کے سلسلے میں معائنے اور علاج کے لئے لیجایا گیا تھا۔ لیکن وہاں مجھے مریض کے ساتھ ڈاکٹر بھی بننا پڑا۔ یعنی ایک طرف اسپتال میں امراض دل کے ماہر ڈاکٹر نے مجھے دیکھا اور دوسری طرف ایک لاعلاج مریض نے ہر طرف سے مایوس ہوکر اور مجھے روحانی معالج سمجھ کر اپنے درد کے درماں کے واسطے بلایا اور تعویذ کا طلب گار ہوا۔ اس بظاہر لاعلاج مریض کو خدا نخواستہ کچھ ہوجائے تو کہا جائے گا کہ بے وقوف نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا۔ تعویذ گنڈے میں بھلا کیا رکھا ہے۔ میں میرس پیٹرز برگ کے اسپتال میں داخل نہیں ہوا۔ نہ مجوزہ علاج کے مطابق انجیوگرافی کرائی نہ بائی پاس سرجری پر آمادگی ظاہر کی۔ اگر مرجاؤں تو کہا جائے گا کہ میں نے اپنے جسم کو جو مٹی کے روایتی کوزے کی مانند ہی ہے خود ہی توڑا پھوڑا اور دلی ہندوستان واپس جانے کی بجائے آسمان کی طرف یا جہاں بھی مرنے کے بعد روح جاتی ہے۔ چل دیا! اور جہاں تک کوزہ بنانے کی بات ہے۔ کمہار بھی مٹی کہیں سے اٹھا کر ہی لاتا۔ اسے گوندھنا۔ متھنا۔ پانی ڈالنا، چاک پر چڑھا کر چکر دینا گڑھنا بنانا بالکل اسی طرح سے ہوتا ہے جیسے مٹی کی مورت آدمی کھاتا پیتا، پڑھتا لکھتا، آپ کو پالتا پوستا سنوارتا اور پروان چڑھاتا۔

ایران کے ایک نئے شاعر نے بھی اپنی آزاد نظم میں اسی سے ملتی جلتی بات دوسرے انداز میں کہی ہے کہ

من ہمیں یک نفس از جرعۂ جانم باقیست
آخریں جرعۂ ایں جام تہی را تو بخواہ
تو بنوش!

زندگی کے گھونٹوں میں سے میرے پاس بس یہی ایک
آخری گھونٹ، آخری سانس باقی بچا ہے۔
اس خالی جام کے اس آخری گھونٹ کو بھی تم
ہی لے لو، تم ہی پی لو!

کوزے اور جام کی اس عجیب اور نہایت دلچسپ
کہانی میں موڑ توان گنت ہیں لیکن بنیادی حقیقت
ایک ہی ہے۔ مجاز سے حقیقت اور مجاہد سے شہید
تک جہاں چاہیئے اس کو فٹ کر لیجیئے۔ ایسا معلوم
ہوگا کہ یہ لباس بس اسی جسم کے لئے تیار کیا گیا تھا۔

میرس پیٹرسن برگ سے میری واپسی سرِشام
ہوئی تھی۔ اور ارادہ تھا کہ اپنی اور دوسروں کی بیماری
کو طاق پر دھروں گا اور فی الحال آرام سے پڑ کر
سوؤں گا کہ میرا کوزہ ابھی تک تو سلامت ہی ہے اور
سانس کی آرجار بتا رہی ہے کہ دُردِ تہہِ جام اور پیالے
کی تلچھٹ ہی سہی لیکن کچھ نہ کچھ باقی ضرور ہے۔ لیکن
گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ آدمی کو اللہ میاں نے پیدا تنہا ضرور
کیا ہے اور اپنے پاس بلائے گا بھی الگ الگ ہی۔ لیکن
دنیا میں الگ الگ جینا اس نے ہمارے لئے پسند نہیں
فرمایا ہے یعنی ساتھ رہنے اور دکھ درد بانٹنے کا حکم
بطور خاص دیا گیا ہے۔

ڈربن واپس آنے کے بعد اطلاع ملی کہ بھائی
عبدالمجید خاں نظامی مرحوم کی ایک بھتیجی اور حسین خاں
صاحب کی دختر اسپتال میں کئی روز سے داخل ہیں۔
میزبانوں نے خاندان کی اس بیماری کی اطلاع مجھ تک
شاید مصلحتاً نہیں پہنچائی تھی۔ مگر آج انہیں یہ اطلاع
دینی ہی پڑی کیونکہ خبر آئی تھی کہ مریضہ کی حالت تشویش ناک
ہو گئی ہے۔ رات کو کسی وقت یا کل مریضہ کی ٹانگ
گھٹنے کے پاس سے کاٹ دینی پڑے گی۔ وہ شکر کی
مریضہ ہیں سب گھر والوں کے ساتھ میں بھی انہیں
دیکھنے گیا۔ ساری دنیا کی طرح یہاں بھی مریضوں
سے ملنے کے اوقات مقرر ہیں۔ لیکن اسپتال کو بنانے
اور چلانے میں چونکہ ہندوستانیوں کو بھی خاصا دخل
رہا ہے۔ اس لئے ضابطوں پر عمل مشین کی طرح نہیں
کیا جاتا۔ مخصوص حالات میں رعایت بھی برتی جاتی ہے۔
اس لئے، ہم سب کو نا وقت مریضہ کے پاس جانے کی
اجازت دے دی گئی اسپتال نہایت صاف ستھرا اور خوش
انتظام نظر آیا۔ بتایا گیا کہ بھائی عبدالمجید خاں نظامی
مرحوم بھی اس اسپتال کی تعمیر اور ترقی میں پیش پیش
رہے تھے اور یہ یہاں کے قدیم اسپتالوں میں سے ہے۔
ہم سب نے مریضہ کی مزاج پرسی بھی کی اور صحت کی دعائیں
بھی مانگیں کہ یہ سب سے کم محنت۔ کم خرچ اور نہایت
مفید اور تیر بہدف علاج ہے۔ آگے جو خدا کی مرضی!
نہ دوا سب کچھ ہے۔ نہ دعا آخری بات۔ آخری فیصلہ
تو انہی کے ہاتھ میں ہے۔ جن کے ہاتھ میں پہلا فیصلہ
تھا۔ یعنی وہی جو دنیا میں لائے اور جو دنیا سے لیجائیں گے۔
پکارنے کے لئے انھیں جس نام سے چاہیئے پکار دیجیئے!

کوزے کی کہانی کے بیچوں بیچ

سارے جہاں سے اچھا } سے خود گذر جانے کے بعد
اگلے دن کی صبح چکروں سے نہ ہوتی تو کس چیز سے ہوتی؟
ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے خون ٹیسٹ کیا اور شکر کو
بڑھا ہوا پایا اور بتایا کہ شیرینی اکثر تلخی اور کڑواہٹ
کی بنیاد بھی بن جاتی ہے۔ شکر کی دوا ڈائمینل جو میں
روز کھاتا ہوں انھوں نے اپنے بکس میں سے نکال کر
کھلائی۔ مجھے ہر چیز میں کرید کی عادت ہے۔ دوا اور
دوا سازی کی بابت بھی ان گنت سوال کر ڈالے اور
یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ اس دوا کا ایک پتّا جو
ہندوستان میں تین روپے سے بھی کچھ کم قیمت میں
آتا ہے۔ اور جس کے دام ابھی کچھ دن پہلے تک صرف
ایک روپیہ ساٹھ پیسے کے قریب تھے اور جس میں
دس ٹکیاں ہوتی ہیں۔ اس کی قیمت افریقہ میں ایک سو
پچھتر ہندوستانی روپے کے برابر ہے۔ یعنی

یہاں پورا پتا نہیں دوا کی صرف ایک ٹکیہ ساڑھے سترہ روپے میں آتی ہے۔ اچلئے یہ کہنے کی گنجائش تو نکل کر سے
سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا!
چکر بھی اپنے محور پر گردش دے رہے تھے۔ مگر ہم نے اس چکر کو دوسرے چکر میں ڈال دیا۔ یعنی گلوب اور کرہ ارض کی طرح اپنے محور کے ساتھ اپنے مدار پر بھی گردش شروع کر دی اور ناشتے کے بعد رکتا، تھمتا، سہارے پکڑتا پہلے عبدالغنی صاحب کی دوکان سرتاج کمپنی اور پھر بھائی عبدالمجید خاں نظامی مرحوم کی پرانی دوکان تاج کمپنی پہنچ گیا۔ تاج کمپنی کی بالائی منزل پر خان صاحب مرحوم کی پرانی رہائش گاہ ہے۔ اس میں کچھ چیزیں ظاہری آنکھوں نے دکھائیں۔ کچھ تصور کی آنکھوں نے۔ یعنی بہت سی غیر مرئی چیزیں مجسم ہو کر سامنے آتی رہیں۔ خان صاحب کی بیگم صاحبہ جو ہماری پیر بہن ہیں۔ ابھی تک اسی جگہ رہتی ہیں۔ ان کی اولاد اکثر و بیشتر دور دراز نئے بنگلوں اور فلیٹوں میں منتقل ہو گئی ہے۔

ہاتھ اور سر کا مصرف } واپسی میں شہر کی سیر کی۔ برسوں پہلے ایران اور عراق کے قصبات میں یہ تماشا دیکھا تھا کہ بچے چھوٹی چھتری کے سائز کی ایک یا دو تندوری روٹیاں سر پر اس طرح رکھے لیجا رہے ہیں جیسے واقعی روٹی سے وہ کام لینا ہو جو چھتری سے لیا جاتا ہے۔ یعنی دھوپ سے بچنا۔ لیکن غور کرنے سے پتہ چلا کہ ان کا اصل مقصد دھوپ سے بچنا نہیں ہے بلکہ اپنے ہاتھوں کو دوسرے کاموں کے لئے خالی رکھنا ہے۔ ہمارے ہندوستان میں بھی دیہاتی عورتوں کو دیکھا جا سکتا ہے کہ سر پر بھاری بھاری وزن اٹھائے اور گردن کے بیلنس سے اس کو گرنے سے بچائے تیز تیز راستہ طے کر رہی ہیں ہاتھ ان کے خالی ہیں۔ کبھی بچوں کی انگلی پکڑنے کے لئے۔ کبھی راہ چلتے کسی کھیت میں سے گنا توڑ کر اسے چھیلنے اور چوسنے کے واسطے!

افریقہ کے کالے باشندے بھی ہر قسم کا چھوٹا بڑا ہلکا بھاری سامان سر پر رکھ کر چلنے کے عادی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض بہت چھوٹی چیزیں بھی جن کو آسانی سے ہاتھ میں رکھا جا سکتا ہے۔ سر پر دھری نظر آتی ہیں۔ یہ لوگ بھی اپنے ہاتھوں کو دوسرے کاموں اور شاید زیادہ اہم کاموں کے لئے خالی رکھنا چاہتے ہیں۔ ان میں سرفہرست ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے پیتے رہنا ہے پھلوں کے چھلکے اور کھانے پینے سے متعلق بچی کھچی چیزیں جن کا چبانا، نگلنا اور ہضم کرنا قطعاً ممکن نہیں ہے۔ اور جن کو منہ کے ذریعے ٹھکانے نہیں لگایا جا سکتا۔ ہاتھوں کے ذریعے اِدھر اُدھر جگہ اور بے جگہ پھینکی جاتی ہیں۔ یعنی "ماکولات" میں سے "ناماکولات" کو ہاتھوں کی منجنیقوں (CATAPULTS) کے ذریعے مسلسل یہاں وہاں اچھالا جاتا رہتا ہے!

ہر طرف کوڑا اور گندگی پھیلا کر گوری اور حاکم قوموں کی زندہ اور مردہ روحوں کو دکھ دینے اور اپنا جی خوش کرنے کا یہ ایک اچھا اور کامیاب طریقہ ہے۔ ہم دل دکھے پرانے غلام اور نئے آزاد ہندوستانی بھی کم از کم نئی دہلی میں ۱۹۴۷ء کے یوم آزادی کے بعد سے اس نسخے کو آزما رہے ہیں اور اس کے تیر بہدف ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ افریقہ کی آزادی نئی ہے کام بھی نیا ہے۔ ہمارے معیار تک پہنچتے پہنچتے انھیں کچھ وقت لگے گا اور سر کا مصرف بھی خیر سے کم ہوتا چلا جائے گا۔

کاش کہ ہم ہندوستانی اور افریقہ کے ہمارے بھائی اتنا سوچتے کہ جو سمجھدار قومیں واقعی سر سے کام لینا جانتی ہیں وہ نہایت ہوشیاری سے اپنے سر کا بوجھ ہمارے سر پر ٹکا دیتی ہیں۔ اور اپنے ہاتھوں اور سر دونوں کو آزاد اور خالی رکھتی ہیں!

ہاتھ خالی رکھنے کی ایک وجہ شاید اور بھی ہو اور وہ یہ کہ افریقیوں کا ذوق رقص انھیں سر کے اس استعمال کی ترغیب دیتا ہو!

ہندوستان میں گھڑے سر پر رکھ کر رقص کرنے کی شروعات شاید پنگھٹ کی رومانی فضائے سے ہوئی ہوگی لیکن سر پر دھری چیز کو گرنے سے اسی صورت بچایا جا سکتا ہے کہ گردن کو خاص قسم کے بیلنس اور حرکات و سکنات پر آمادہ و تیار کیا جائے اور ہاتھ توازن میں مدد دیں۔ یہ بیلنس خود رقص کی ایک خام اور ابتدائی شکل ہے مگر افریقہ میں اسے اچھوتے انداز میں ترقی دی گئی ہے۔

ڈربن سے دور جوہانس برگ اور بوٹسوانا کے راستے میں ایک پٹرول پمپ پر گاڑی روک کر ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے شہر سے باہر نکلنے کا راستہ پوچھا تو پٹرول دینے والے نوجوان حبشی نے بلامبالغہ بڑے ناز و انداز کے ساتھ دس بل کھائے۔ کم از کم مجھے یہ غلط فہمی ہوئی کہ اس بے چارے پر کوئی دورہ پڑا ہے۔ اور سنبھلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن وہ سنبھلا تو اس طرح سنبھلا کہ پاس کھڑی ہوئی ملازم حبشی لڑکی سے بغل گیر ہو کر ایک دو جھونٹے کسی مغربی طرز کے رقص کے لئے اور جھومنے جھامنے کے دوران ہی ہمیں مطلع فرمایا کہ بالکل سیدھے چلے جاؤ اور پہلے دائیں مڑجانا اور پھر بائیں مڑ جانا اور پھر دائیں مڑجانا اور پھر بائیں۔ یعنی دائیں بائیں مڑنے اور سیدھے جانے کا سارا ہدایت نامہ نرت میں تلقین ہوا!

مزید مزے داری یہ کہ نہ اس ملازمہ کے چہرے سے کسی تامل اور ناگواری کا اظہار ہوا جس کو بغیر نوٹس دیئے پٹرول دینے والے نوجوان نے رقص کا پارٹنر بنایا تھا۔ نہ سروس اسٹیشن کے دوسرے ملازموں نے جو دور کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے کسی قسم کے اچھے برے تاثر کو ظاہر کیا۔ گویا جو کچھ ہوا روٹین میں ہوا۔ روز مرہ کے معمول کے مطابق ہوا!

دارالقضاء } اگلے وقتوں میں عدالت اور کورٹ کچہری کو دارالقضاء کہتے تھے۔ جج قاضی کہلاتے تھے لوگ انصاف مانگنے اور جھگڑے طے کرانے ان کے پاس جاتے تھے۔ پھر قاضی کا کام نکاح تک محدود ہو گیا اور اب زمانے نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ قاضی صاحبان کھانا کھلانے کے کام کو بطور فرض منصبی اختیار کر رہے ہیں کم از کم افریقہ میں تو میں نے ایسا ہی دیکھا۔ میاں عبدالغنی اور سارہ سلیہا کے پیر و مرشد قاضی صاحب کہلاتے ہیں۔ انھوں نے حکم صادر فرمایا ہے کہ میں جب تک ڈربن میں رہوں دوپہر کا کھانا یعنی لنچ، شرط باندھ کر ان کے ساتھ کھاؤں۔ پھر دوپہر کا قیلولہ ان کے ساتھ کروں کیونکہ وہ بھی دل کے مریض ہیں۔ اور ڈاکٹر نے میری طرح انھیں بھی کھانے کے بعد آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ

خوب گذرے گی جو مل جائیں گے قیلولے دو!

لیکن ایک تیسری وجہ شاید اور بھی ہو کہ وہ اپنے مرید اور مریدہ کو کاروبار اور دوکان میں پابند رکھنا چاہتے ہوں اور انھیں مہمان کے ساتھ گھر بر رہنے کی زحمت سے بچانا چاہتے ہوں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو اس سے میرے پیر و مرشد شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی رحہ کی روح سب سے زیادہ خوش ہوئی ہوگی۔ کیونکہ وہ دست بہ کار دل بہ یار کے سب سے زیادہ قایل تھے۔ اور رات دن محنت کرنے اور حلال کی روزی حاصل کرنے کو مسلمانوں کی بنیادی ضرورت سمجھتے تھے۔ مگر یہ کام قاضی صاحب اور ان کی اہلیہ کو زحمت دیئے بغیر بھی ممکن تھا میاں عبدالغنی اور قاضی صاحب دونوں کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ میں نے ایران اور عراق دو ملکوں کا خاصا بڑا دورہ اکیلے اور تن تنہا کیا تھا اور اس وقت اندازہ ہوا تھا کہ جیسی سیر اور واقفیت اکیلے گھومنے پھرنے

اور کبھی پیدل۔ کبھی بس۔ کبھی ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوتی ہے۔ ویسی سیر اپنی موٹر اور میزبانوں کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ایران اور عراق کی سیر اور زیارتیں آتش کی جوانی میں ہوئی تھیں اور اب بڑھاپے کا زمانہ ہے۔ نیز اس وقت میں شکر اور دل کا مریض نہیں تھا۔ اب شکر اور دل کا مریض ہوں۔ تاہم بڑھاپے اور شکر اور دل کے مرض کی رعایت کے ساتھ بھی پروگرام بنائے جا سکتے ہیں۔ نیز میرے میزبانوں کو چاہئے تھا کہ یہ بات مجھے خاص طور پر سکھاتے کہ کم کھا کر زیادہ کام کس طرح کیا جاتا ہے۔ افریقہ میں سب اس کے عادی ہیں۔ اور مجھے دوسرے بہت سے ہندوستانیوں کی طرح اس عادت کو سیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ دونوں چیزیں بڑھاپے شکر اور دل کی بیماری کے لئے بھی مفید ہیں۔

ذکری قالین } قاضی صاحب مولوی ہیں۔ پیر ہیں۔ لیکن یہاں کے اور سب مولویوں پیروں اور اماموں کی طرح نہایت شائستہ مہذب اور موڈرن زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں زمین کی نشست صرف نماز اور عبادت کے کمرے میں ہے۔ اٹھنے بیٹھنے رہنے سہنے سونے اور کھانے کے کمرے جدید ترین فرنیچر سے آراستہ ہیں۔ ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم ایک ہی بڑے ہال کے دو حصوں میں ہے۔ ذکر شغل کے وقت صوفے کرسیاں اور میزیں دیواروں کی طرف سرکا دی جاتی ہیں اور ایک بڑا قالین جو گول لپٹا ہوا گویا قطب[1] شمالی میں آرام فرما رہتا ہے۔ آسانی سے کھول کر خط سرطان[2]، خط استوی[3]، اور خط جدی[4] کے اوپر سے گذار کر قطب جنوبی[5] تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اور سب ذکر کرنے والے جوتے اتار کر زمین کے اس فرش پر جنوب سے شمال اور مشرق سے مغرب تک بیٹھ جاتے ہیں۔ اپنے آرام کے اوقات میں گول لپٹا رہنے کی وجہ سے کسی کے جوتے چپل اس ذکری قالین پر نہیں پڑنے پاتے اور وہ پاک صاف رہتا ہے! ہر جگہ کمروں میں برآمدوں میں سیڑھیوں پر یہاں تک کہ بعض بعض گھروں کے غسل خانوں اور ٹوائلٹس میں بھی یوروپ اور امریکہ کی طرح قالین کے فرش کا رواج ہے۔ مشینوں کے ذریعے ان کی صفائی ہوتی رہتی ہے۔

ڈربن میں میرٹھ اور دلّی } قاضی صاحب کی بیگم صاحبہ حضرت عبدالعلیم میرٹھیؒ اور حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ سے خاندانی نسبت رکھتی ہیں۔ غالباً ان دونوں بزرگوں میں سے کسی ایک کی نواسی اور ایک کی پوتی ہوتی ہیں۔ یہ دونوں اسمائے گرامی مذہبی لوگوں اور اہل تصوف کے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ ہر شخص ان کی عظمت سے واقف ہے۔

پنج کریز پر بیٹھتے ہی محسوس ہوا کر دلی یا میرٹھ میں ہوں خاص طور پر تندوری چپاتی اور دہی بڑے۔ جوں کے توں اس طرح یوپی اور دلی سے اٹھ کر ڈربن آ گئے تھے جیسے یہ دونوں جگہیں ڈربن کے پڑوس میں بالکل ایک دیوار بیچ واقع ہوں۔

موئے مبارکؐ } قاضی صاحب نے تو اپنے بیڈروم میں قیلولہ فرمایا ہوگا۔ مجھے نماز کے کمرے کے برابر والے کمرے میں۔ جو قاضی صاحب کے چھوٹے صاحبزادے کا کمرہ محسوس ہوا قیلولے کے لئے بھیجا گیا۔ کمرے میں گدے دار پلنگ موجود تھا۔ مگر میں اپنے آپ کو اس تک پہنچانے کے لئے تیار نہیں ہوا کیونکہ نماز والے کمرے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موئے مبارکؐ موجود تھے۔ قیلولے والے کمرے میں تو زیادہ سے زیادہ جرأت بس یہ کی جا سکتی تھی جو میں نے کی کہ موئے مبارکؐ کی طرف سر کر لیا جائے اور زمین پر لیٹتے وقت آنکھیں بند کر کے حضرت امیر خسروؒ کے اس شعر کا دھیان جمایا جائے۔

نخفت خسرو مسکیں ازیں ہوس شب ہا
کہ دیدہ بر کف پایت نہد بخواب شود!

(1) NORTH POLE (2) TROPIC OF CANCER (3) EQUATOR (4) TROPIC OF CAPRICORN (5) SOUTH POLE

بے چارہ خسرو رح اس ہوس میں خبر نہیں کتنی راتوں سے
نہیں سویا ہے کہ آپ کے پیروں کے تلووں پر آنکھیں
رکھے اور غافل ہو جائے !

سچ پوچھئے تو ہم جیسوں کے لئے ان تلوؤں تک
آنکھیں پہنچانے کی بات سوچنا بھی سخت بے ادبی تھی۔
کیونکہ (بلاتشبیہ) حقیقت یہ ہے کہ

برتنِ شیریں نظرہم ہست بار از نازکی !

جسم اطہر کی نازکی کا تو یہ عالم ہے کہ نظر بھی اس کے لئے بار
ہے اور بوجھ ہے ! اور حضورؐ کو زحمت دینے کی مجال
بھلا کس میں ہو سکتی ہے !

قیلولے کے بعد حضرت قاضی صاحب نے چائے
بھی پلائی اور پچیس کیلومیٹر دور اپنے ایک مرید ڈاکٹر
صاحب کی موٹر میں قیام گاہ تک بھی پہنچوایا۔

حدیث شریف | حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رح نے ایک حدیث شریف
کی روایت فرمائی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
فرماتے ہیں۔

من زار حیاً ولم یذق منه شیئاً فکانما
زار میتاً۔

جس نے کسی زندہ کی زیارت کی اور اُس کے پاس
کچھ چکھا نہیں اس نے گویا (زندہ کی نہیں) مُردے
کی زیارت کی !

واقعی زندہ آدمی ہی کسی کو کچھ چکھا سکتا ہے۔
کچھ کھلا پلا سکتا ہے۔ مردہ آدمی کو یہ قدرت نہیں ہوتی۔
مجھے بھی قاضی صاحب قبلہ کے ہاں موئے مبارکؐ کی
زیارت کے بعد کھانا ملا چکھنے کے لئے نہیں چکھنے
اور سیر ہونے کے لئے۔ کھانے کے لئے۔ پینے کے لئے نمکین
چیزیں۔ میٹھی چیزیں۔ پاک چیزیں۔ جائز چیزیں۔ سب
ہی کچھ تھا۔ اور پھر جسمانی کھانا ہی نہیں۔ روحانی کھانا بھی۔
قیلولے کی سنت بھی اور یہ راحت بھی کہ جان جاناں اور جان جہاں
کی چوکھٹ پر ہی نہیں۔ سرور کائنات ؐ کے آگے سرزمین پر
رکھ کر آنکھیں بند کی جا رہی ہیں ! دیوار پیچھے دوسرے
کمرے کی دوری بھلا کوئی دوری ہوتی ہے !

ڈاکٹر شبیر | حضرت قاضی صاحب کے مرید ڈاکٹر شبیر نے جو ڈینٹسٹ ہیں مجھے
اپنی موٹر میں قیام گاہ پہنچایا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا
کیا اور کہا کہ آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔ یہاں تو
سب کامی لوگ بستے ہیں مجھے پہنچانے اور خود واپس
گھر یا کلینک تک جانے میں جو وقت لگے گا۔ وہ ایک
طرح سے ضائع ہی جائے گا۔ بولے نہیں ایسا نہیں ہے۔
حضرت قاضی صاحب کے تو بہت مرید ہیں اور ان میں
سے یقیناً کتنے ہی لوگ ایسے ہوں گے۔ جو پیر و مرشد کے
حکم پر آپ کی خدمت کرنے کو سعادت اور خوش نصیبی
جانیں گے۔ میں نے تو خود درخواست کر کے یہ کام اپنے
ذمے لیا ہے تاکہ آپ کو لانے لیجانے کے دوران بات چیت
کرنے اور آپ سے استفادے کا موقع ملے۔ میں نے
عرض کیا کہ آپ کے پیر و مرشد ایسے لائق اور فائق ہیں
کہ آپ کے لئے صرف ان کی صحبت اور تعلیم کافی ہے۔
میں بے علم آپ کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہوں تاہم یہ ضرور
ہے کہ آپ کے ساتھ کچھ دیر رہنے سے شاید افریقہ
کے بارے میں میری معلومات بڑھے۔ اور واقعی
ایسا ہی رہا۔ ایک بات تو مجھے تفصیل سے یہ معلوم ہوئی کہ
یورپ امریکہ اور ایشیا کی طرح افریقہ کے نوجوانوں
کے ذہنوں میں بھی مذہبی عقاید اور اعمال کے بارے
میں نہایت دلچسپ اور اچھوتے سوالات ہیں۔ ان میں
سے بعض سوال جدید سائنسی علوم اور ایجادات کی وجہ
سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور بعض اس وجہ سے کہ آنکھ بند
کر کے تقلید کرنے اور ایک ہی ڈھرّے پر چلتے رہنے
کا زمانہ ختم ہو رہا ہے۔ اور لوگ نئی منزلوں اور نئے
راستوں کے طلب گار ہیں۔ ان سوالات کا جواب قدیم
اور رواجی انداز میں دینا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ جو لوگ
پرانے طریقوں سے نئے ذہنوں کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں

انھیں کامیابی بھی پوری طرح نہیں ملتی۔ میری کوشش یہ رہتی ہے کہ اول تو سب کو یہ بتاؤں کہ جن منزلوں کی طرف لوگ آخری منزلیں سمجھ کر جانا چاہتے ہیں وہ دراصل آخری نہیں، درمیانی منزلیں ہیں۔ آخری منزل تو ایک ہی ہو سکتی ہے اور ایک ہی ہے بھی۔ دوسری بات یہ کہ میں خود اپنے ذہن میں اسی طرح کے سوال موجود پاتا ہوں جس طرح کے سوال بالکل نوجوان ذہنوں میں ہیں۔ اس لئے وہ مجھے ریڈی میڈ جواب فراہم کرنے والا گمان نہ کریں بلکہ یہ سمجھیں کہ مجھے اور انھیں مشترکہ طور پر ان سوالات کے جواب ڈھونڈنے ہیں۔ پرانے زمانے کا ہونے کی وجہ سے شاید کچھ بات میں جانتا ہوں اور نئے زمانے کا ہونے کی وجہ سے کچھ نئی باتیں نئی نسل جانتی ہے۔ اس لئے ہم دونوں کیوں نہ ساتھ مل کر اور آپس میں ایک دوسرے کو اپنی اپنی معلومات کا شریک بنا کر آگے بڑھیں اور ان سوالات کے جوابات تک رسائی حاصل کریں میں نے محسوس کیا کہ یہ رویہ نئی نسل کو اپیل کرتا ہے اور اس کا سب سے پہلا نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ وہ ہر پرانی چیز سے وحشت کرنا اور دور بھاگنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اور سنجیدگی سے ہر چیز کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ڈاکٹر شبیر بھی نئے ذہن کے مالک نوجوان ہیں مگر بحمداللہ کھلا ذہن رکھتے ہیں۔ راستے بھر ان سے دلچسپ گفتگو ہوئی اگرچہ میرا انگریزی زبان پر پوری طرح قدرت نہ رکھنا اور ان کا اردو زبان کو اچھی طرح نہ جاننا رکاوٹیں پیدا کرتا رہا۔ مگر دل سے دل کو راہ بھی ملی۔

رات کو بھائی عبدالمجید خاں نظامی کے دونوں برادران خورد عثمان خاں صاحب اور حسین خاں صاحب کے گھروں پر بھی حاضر ہوا۔ دونوں تبلیغی جماعت کے سرگرم کارکن ہیں۔ مجھ سے بھی بڑی محبت سے ملتے ہیں رواج کے مطابق خاطر تواضع بھی کی۔ گھر واپس آیا تو خاں صاحب مرحوم کی چاروں بیٹیاں اور ان کے شوہر بچے سب ملنے آئے۔ روز کی طرح آدھی رات تک محفل گرم رہی۔ ڈاکٹر عبدالخالق موسم اور ان کی بیوی زہرہ سلمہا مذہبی احساس ہی کے نہیں۔ مذہبی عمل کے بھی مالک ہیں۔ ان کے دونوں بیٹے ماشاءاللہ سیانی عمر کے ہیں۔ اس عمر میں انھیں یا تو جدید تعلیم میں لگا ہوا ہونا چاہیئے تھا جو دنیوی فائدے پہنچائے یا کسی کاروبار میں۔ لیکن نئی تعلیم کے ساتھ ایک قرآن مجید حفظ کر رہے ہیں اور دوسرے بھی دینی تعلیم کے حصول میں مصروف ہیں۔ دین کی طرف اس طرح کی توجہ جنوبی افریقہ کے اکثر ہندوستانی مسلمان گھرانوں میں عام ہے۔

(باقی آئندہ)

سالانہ عرس

۱۔ حضرت شیخ شیوخ العالم بابا فریدالدین شکر گنج رحؒ کے بھائی، خلیفہ، ابدال وقت اور مشہور بزرگ حضرت مخدوم شیخ نجیب الدین متوکل کا سالانہ عرس انشاءاللہ ۸، ۹، رمضان المبارک کو حضرت کی درگاہ واقع موضع ادھ چنی مہرولی روڈ دہلی میں منعقد ہوگا۔

۲۔ شہدائے بدر کی سالانہ فاتحہ اور نیاز انشاءاللہ ۱۴۔ ۱۵، رمضان المبارک کو درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رحؒ میں ہوگی۔

۳۔ سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی رحؒ کے جانشین حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی رحؒ کا سالانہ عرس مبارک انشاءاللہ حضرت رحؒ کی درگاہ میں ۱۷، ۱۸ رمضان المبارک کو ہوگا۔

۴۔ مولائے کائنات، امام اول پیروں کے پیر سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا سالانہ عرس مبارک حضرت محبوب الٰہی رحؒ کی درگاہ میں ۲۰، ۲۱، رمضان ۱۴۱۴ھ کو ہوگا۔

مدیر
خواجہ حسن ثانی نظامی
معاونِ مدیر
خواجہ مہدی نظامی

مُنادیاً یُنادی للایمان

بارگاہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہیؒ سے

ایمان اور امن کی ندا دینے والا

اور اُن کے جانشین

امام المشائخ شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی یادگار

ماہنامہ منادی نئی دہلی

منادی ۱۹۲۶ء سے جاری ہے یہ انسٹھویں جلد (۱۹۹۴ء) کا دوسرا شمارہ ہے

درگاہ شریف اور منادی کے بارے میں خط وکتابت کرنے اور قیمت جمع کرانے کا پتہ
خواجہ حسن ثانی نظامی
ڈاکخانہ حضرت نظام الدین اولیاء
نئے دہلی ۱۱۰۰۱۳

فہرست

سالانہ قیمت
ہندوستان میں
پچاس روپے
غیر ممالک سے
دس ڈالر
فی پرچہ
پانچ روپے

پرنٹر پبلشر خواجہ حسن ثانی نظامی نے خواجہ پریس جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ سے شائع کیا۔

حضرت سلطان المشائخ رحؒ کے ملفوظات

فوائد الفواد کا علمی مقام

حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی

۱۹۸۴ء کا واقعہ ہے کہ یہ ناچیز سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء علیہ الرحمہ کے ملفوظات فوائد الفواد کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اس میں صَدَقہ اور صُدُقہ (خیرات اور مہر) کی حکیمانہ تحقیق پر شیخ علیہ الرحمہ کی تقریر نظر سے گذری اور یہ زمانہ مسلم پرسنل لاء کی تحریک کا تھا۔

حضرت شیخ رحؒ نے ان دونوں لفظوں کے اصل مادہ صدق (سچائی) کے لحاظ سے عورت کے مہر دین کو مرد و عورت کے ازدواجی رشتے کی سچائی اور خلوص کا نشان اور محبت و مودت کی علامت قرار دے کر عورت کے اخلاقی مقام کی اہمیت واضح کی ہے۔

یہ بحث فوائد جلد اوّل کی (۳۳) ویں مجلس میں کی گئی ہے۔

اس تحقیق دقیق کو اس ناچیز نے حضرتؒ کے حوالے سے شائع کیا اور اسے اہل علم نے بہت پسند کیا اور کچھ لوگوں کو حیرت بھی ہوئی کہ جس ہستی کو عام طور پر ایک روحانی شیخ و صوفی کے طور پر جانا جاتا ہے، اس کے کلام میں شرعی مسائل کی ایسی حکیمانہ علمی بصیرت موجود ہے۔

اسی دوران شیخ رحؒ کے ارشادات عالیہ کے ساتھ عقیدت کے سبب اس خاکسار کو خواب میں شیخ علیہ الرحمہ کی زیارت نصیب ہوئی ؎

دیدار کے قابل تو کہاں میری نظر ہے
یہ تیری عنایت ہے کہ رُخ تیرا ادھر ہے

شیخ علیہ الرحمہ ایک دیہاتی جھونپڑے میں قیام فرما ہیں، نہایت پرفضا و خوشگوار ماحول ہے، ایک نہایت حسین اور دل ربا شخصیت ہے۔

کافی دیر تک یہ ناچیز آپ کی خدمت میں حاضر رہا، حضرت شیخ رحؒ نے ایک پیالے میں سے پہلے خود نوش فرمایا اور اس کے بعد اس ناچیز کو عطا فرمایا جسے اس گناہ گار نے پی لیا۔

آنکھ کھل گئی، صبح کی اذان ہو رہی تھی، کافی دیر تک طبیعت پر اثر رہا، یہ احساس و یقین دل کے اندر موجود تھا کہ یہ محبوب الٰہیؒ تھے جن کی خواب میں زیارت نصیب ہوئی۔

راقم نے اس خواب کا تذکرہ اپنے یادگار خوابوں میں کیا ہے۔ جو خود نوشت یادداشت کی

صورت میں میرے مجموعہ مقالات (خطبات دہلی) کے ساتھ سن ۱۹۹۰ء میں چھپی ہے۔

اس مبارک منامی بشارت کے آٹھ سال کے بعد اس کی تعبیر آج میرے سامنے ہے اور میں حضرت شیخ رح کے ملفوظات گرامی کی تشریح اور توضیح پر یہ کتاب پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

حسنِ کلام کھینچے کیوں کر نہ دامنِ دل
اس کام کو ہم آخر محبوب کر چکے ہیں،

دیوبندی مکتب فکر کے مشائخ صوفیہ اگرچہ چاروں سلسلوں میں بیعت کرتے ہیں لیکن ہمارے شیخ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ فرماتے تھے کہ ہمارے اکابر پر چشتی نسبت غالب ہے۔

چنانچہ تفسیر و حدیث، فقہ و کلام کی اعلیٰ تعلیم و تدریس اور تحریک آزادی کی مجاہدانہ قیادت اور اس کے نتیجے میں قید فرنگ اور اسارت مالٹا کی قربانیاں کے ساتھ چشتی سلوک و تصوف (محبت خلق اور صبر و رضا) کی راہ میں ان حضرات کرام کو جو بلند مرتبت حاصل ہوئی وہ اسلامی ہند کی تاریخ کا روشن باب ہے۔

حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح کے مصنف جناب ڈاکٹر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے۔

"کشف المحجوب کی سطریں جن ہاتھوں نے لکھی ہیں اور فوائدالفواد کے جملے جس زبان سے بولے گئے ہیں، ان کے عظیم المرتبت (عالم) ہونے میں شبہ کرنا علم و دیانت کے خلاف ہے، فوائدالفواد پڑھتے وقت تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علم حدیث کا ایک ناپیدا کنار سمندر موجیں مار رہا ہے" (صفحہ ۴۸)

اور یہ ایک حقیقت ہے لیکن فوائدالفواد کو صرف ایک حکایات کی کتاب سمجھ کر پڑھنے والے اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔

یہ کام اہل علم کا تھا لیکن بعض نزاعی مسائل اور بعض خانقاہی رسوم میں دونوں طرف سے انتہا پسندانہ جذبات کی فراوانی نے اہل علم کو فوائدالفواد جیسی اہم کتاب سے دلچسپی نہیں لینے دی۔

حالانکہ حضرت محبوب الٰہی علیہ الرحمہ نے انسانی قلوب کے تزکیہ اور تخلیہ (صفائی اور سنوار) کے عظیم مشن کی انجام دہی کے ساتھ جو تاریخی کام انجام دیا وہ شریعت اور طریقت کے درمیان پیدا کی گئی دوری کو ختم کرنے کا کام تھا۔

اور یہ وہ عظیم کام تھا جو دوسری صدی ہجری میں مشہور جلیل القدر امام حدیث امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے انجام دیا تھا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تصوف اور علم باطن کے لطائف و اشارات پر سب سے پہلے دوسری صدی ہجری کے مشہور صوفی حارث ابن اسد المحاسبی نے قلم اٹھایا اور چند کتابیں تصنیف کیں۔

اگرچہ المحاسبی رح سے پہلے بڑے بڑے جلیل المرتبہ صوفی گذر چکے تھے جن میں حبیب عجمی، فضیل ابن عیاض ابراہیم ابن ادہم شفیق بلخی اور ذوالنون مصری رح جیسے اکابر شامل ہیں، مگر تصوف کے مسائل کو باقاعدہ کتابوں میں ظاہر کرنے والے المحاسبی رح تھے۔

ان کتابوں سے پہلے اہل علم کی طرف سے حضرات صوفیہ کے خیالات اور اعمال پر صرف اشاروں اور کنایوں میں نکتہ چینی ہوتی تھی لیکن جب المحاسبی رح کی کتابیں بازار میں آئیں اور مسلمانوں میں ان کتابوں کو قبول عام حاصل ہوا، تو اب صوفیت پر کھلے عام سخت تنقیدیں شروع ہوگئیں۔

حد یہ ہے کہ المحاسبی رح کے ہم عصر امام المحدثین حافظ ابوذرعہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کتابوں کے بارے میں یہ فرمایا:

ھذا کتب بدع وضلالات۔

(تاریخ خطیب بغدادی جلد ۸ صفحہ ۲۱۵)
یہ کتابیں بدعت و گمراہی کی ہیں۔
حافظ ابو زرعہ کی علمی جلالت شان کا یہ حال تھا کہ امام احمد ابن حنبل رحمہ فرمایا کرتے تھے کہ بغداد کے پل سے گذرنے والوں میں حافظ ابو زرعہ سے بڑا حافظ الحدیث کوئی نہیں، انھیں چھ لاکھ حدیثیں زبانی یاد تھیں۔
حارث محاسبی کے بارے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ حافظ ابو زرعہ محدث کی رائے سے متاثر معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ شیخ محدث، ___ محدث ہونے کے ساتھ صاحب دل صوفی بھی تھے۔ شیخ محدث اہل فلسفہ کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
وحارث محاسبی کہ از متقدمین فقہاء ومشائخ طریقت بود، در وے تصنیف کرد وامام احمد ابن حنبل از وے جہت این تصنیف وفتح باب وجدال وتوسیع دائرہ قیل وقال نفارے پیدا کرد وترک صحبت وے دارد، (مرج البحرین صفحہ ۲۲)
یعنی حارث محاسبی جو قدمائے فقہاء اور مشائخ طریقت میں سے تھا اس نے فلسفیانہ بحث ومباحثہ میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کیا اور اس وجہ سے امام احمد ابن حنبل نے اس سے دوری اختیار کرلی۔
لیکن اکثر سلف کی رائے حارث کے بارے میں یہ ہے کہ:
حارث محاسبی رحمہ نہ صرف تحریری تصوف کے امام تھے بلکہ صاحب حال اور صاحب اثر صوفی بھی تھے، حضرت جنید بغدادی رحمہ محاسبی کی مجلسوں کے فیض یافتہ تھے۔
محاسبی علیہ الرحمہ کی شہرت سن کر امام احمد ابن حنبل رحمہ نے اسماعیل ابن اسحاق نیشاپوری سے کہا کہ تم ایسا انتظام کرو کہ محاسبی رحمہ کو دعوت دو اور مجھے ایسی جگہ بٹھا دو جہاں سے میں ان کی باتیں سن سکوں مگر نظر نہ آؤں۔
اسماعیل ابن اسحاق خود ایک بلند پایہ محدث اور امام احمد کے شاگردوں میں سے تھے اور المحاسبی رحمہ سے بھی ان کا تعلق تھا۔
چنانچہ ایک مجلس کا اہتمام ہوا اور امام احمد رحمہ نے حارث محاسبی کی زبان سے محبت، روحانیت اور باطنی اخلاق کے رموز ولطائف پر ان کی پر اثر تقریر سنی۔
اسماعیل کہتے ہیں کہ حارث اخلاق وروحانیت پر گفتگو فرما رہے تھے، اہل مجلس پر رقت طاری تھی یہاں تک کہ آدھی رات ہو گئی۔
اب میں نے اوپر جاکر امام احمد کو دیکھا تو وہ روتے روتے بے ہوش ہو چکے تھے۔ میں پھر نیچے آگیا یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔
فصعدت الی ابی عبداللہ وھو متغیر الحال (صفحہ ۲۱۵)
پھر میں اوپر گیا تو میں نے ابو عبداللہ احمد ابن حنبل کو بدلی ہوئی حالت میں پایا۔ میں نے پوچھا، اے ابو عبداللہ! آپ نے ان لوگوں کو کیسا پایا تو وہ بولے:
ما اعلم انی رایت مثل ھؤلاء القوم ولا سمعت علم الحقائق مثل کلام ھذا الرجل۔
میں نہیں جانتا کہ میں نے اس قسم کے لوگوں کو کبھی دیکھا ہے اور نہ میں نے علم الحقائق پر ایسی گفتگو کبھی سنی ہے جو اس شخص سے سنی ہے۔
اس وقت امام احمد ابن حنبل رحمہ کو خلافت عباسیہ کے ہاتھوں خلق قرآن اور کلام الٰہی کی محبت پر ظلم وستم برداشت کرنے کے بعد مسلمانوں میں جو قبول عام اور محبت حاصل ہو گئی تھی اس کی مثال

ائمہ دین میں کم ہی نظر آتی ہے۔

جس میدان میں امام کی نماز جنازہ ادا کی گئی اس کی پیمائش کر کے یہ لکھا گیا ہے کہ اس میں تیرہ لاکھ آدمی سما سکتے ہیں ـــ یہ میدان نمازیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور ان میں مسلمانوں کے علاوہ یہود، نصاریٰ اور مجوسی بھی شریک تھے، جن میں سے چودہ ہزار نومسلموں نے اسلام قبول کیا، (حلیۃ الاولیاء جلد ۹ صفحہ ۱)

اس مقبول عام ہستی نے جب صوفیاء کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا اور اس طبقہ کی صداقت پر کھل کر اظہار خیال فرمایا تو فضاء بدل گئی، تشدد اور انتہا پسندی اعتدال اور توازن میں تبدیل ہوگئی۔

پھر کون تھا جو اس جلیل المرتبت امام حدیث و فقہ کی تردید کرتا؟

پھر تاریخ کا لب و لہجہ ان الفاظ میں سامنے آیا۔

”حارث محاسبی رح ان پانچ عظیم ہستیوں میں سے ہیں جو علم ظاہر اور علم باطن دونوں قسم کے علوم کی جامع تھیں اور یہ پانچوں ایک ہی وقت میں جمع ہوگئے تھے۔ یعنی ابوالقاسم، جنید بغدادی، ابومحمد رویم ابوالعباس ابن عطا، اور عمر بن عثمان مکی علیہم الرحمہ“

(تاریخ بغداد)

شیخ المشائخ محبوب الٰہی علیہ الرحمہ کی علمی اور روحانی شخصیت نے مولوی اور صوفی کے درمیان اتحاد اور اعتدال پیدا کرنے کی وہی جدوجہد کی جو دوسری صدی میں امام احمد ابن حنبل رح کی طرف سے وقوع میں آئی تھی۔

اور اس ناچیز کے خیال میں شیخ علیہ الرحمہ کے ملفوظات عالیہ کا یہ خاص افادی پہلو ہے۔

شریعت اور طریقت کے درمیان فرق پیدا کرنے اور اہل شریعت کو اہل طریقت کے خلاف غم و غصہ کے اظہار کا موقعہ اس دور میں جن بزرگ کے افادات سے ملا، وہ شیخ محی الدین ابن عربی علیہ الرحمہ ہیں۔

شیخ ابن عربی کی ولادت ۵۶۰ ہجری ہے اور فتوحات مکیہ شیخ کی آخری تصنیف (۶۳۸ھ) ہے، اس کے تین سال کے بعد شیخ کا وصال ہوگیا ہے ـــ اور حضرت محبوب الٰہی رح کی ولادت ۶۳۶ھ اور وفات ۷۲۵ھ ہے اسی دوران شیخ رح کے افادات کا سلسلہ جاری ہوا۔

یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ شیخ ابن عربی رح کے مجمل کلام اور مبہم اشارات کے خلاف جو طوفان اٹھا اور علامہ ابن تیمیہ رح کی سخت ترین تنقیدات نے سونے پر سہاگہ کا کام انجام دیا اس سے حضرت محبوب الٰہی رح ہندوستان میں بیٹھ کر بے خبر ہوتے۔

شیخ علیہ الرحمہ کا یہ مزاج و مذاق تھا جو ایک عملی صوفی کا ہونا چاہیے کہ آپ نے ہر غلط فہمی کا ازالہ فرمایا مگر اشارے اور کنائے سے بھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ آپ کسی کے تصور کی تردید کر رہے ہیں۔

حضرت محبوب الٰہی رح اور ان کے مشائخ کبار اور جانشینان کرام تصوف کے نازک ترین مسئلے وحدۃ الوجود کو زبان پر لانا غلط سمجھتے تھے اور ایک نازک حال کو قال میں لاکر عام لوگوں کو الجھن میں ڈالنا ان حضرات کے نزدیک درست نہیں تھا۔

شیخ ابن عربی وحدۃ الوجودی صوفی ہیں اور نازک حقائق کو ایسی اصطلاحوں میں عام لوگوں کے سامنے رکھتے ہیں جن کا سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں۔

شیخ علیہ الرحمہ شیخ ابن عربی کا تذکرہ کرنے سے بھی گریز فرماتے ہیں ـــ اور تصوف و احسان کے مسائل کو براہ راست احادیث نبویؐ اور آثار صحابہ اور اقوال مشائخ کبار کی روشنی میں بیان کرتے ہیں۔

تاریخ تصوف ہند پر نظر رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ مشہور چشتی بزرگ حضرت سید محمد گیسو دراز علیہ الرحمہ جو حضرت محبوب الٰہی رح کے خلیفہ حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی رح کے خلیفہ ارشد ہیں وحدۃ الوجود کے خلاف کتنا سخت نظریہ رکھتے ہیں ؟

شیخ محبوب الٰہی رح کے دو سو سال کے بعد علامہ ابن عبد الوہاب شعرانی رح نے الیواقیت والجواہر (تالیف ۹۵۵ ھ) لکھی اور اس میں شیخ اکبر کے بعض افادات سے پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو خود شیخ اکبر کی فتوحات کی تصریحات کے ذریعہ واضح کیا اور شیخ اکبر کے معترضین کو جواب دینے کی کوشش کی ۔

لیکن ایک عملی صوفی جو اپنے اعلیٰ اخلاق، حسنِ عبادت اور حسنِ خدمت کے ذریعہ مقبول عوام و خواص تھا، اس کی زبان فیض ترجمان سے تصوف و طریقت کا چہرہ گرد و غبار سے جس طرح صاف ہوا وہ صرف کتابی تردید و توضیح سے ممکن نہیں تھا ۔

لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ شریعت اور تصوف کی اس مرج البحرین کو نہ صرف عوام تک بلکہ خواص تک پہنچانے کی بھی پوری کوشش نہیں کی گئی ۔

حالانکہ پچھلے سات سو برس کے اندر بقول محدث ہند حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ خاندان چشتیہ کے اس اہم دستور العمل کو اس کے علمی اور روحانی دونوں پہلوؤں کی تشریح اور توضیح کے ساتھ مختلف زبانوں میں شائع کیا جانا چاہیے تھا ۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا ۔

آج جبکہ ہندوستان کا جارحیت پسند طبقہ صوفیائے ہند کے خلاف بدگمانی پھیلانے میں مصروف ہے اور ہندوستان کے عقیدت پسند غیر مسلم عوام کو درگاہوں سے دور کرنے کی مہم میں لگا ہوا ہے ۔ اس غفلت کا احساس ہونا چاہیے ۔

کیا ہمارے پاس ہندوستان کی مختلف مقامی زبانوں میں مشائخ ہند کی انسانی محبت، خدمت خلق اور وطن دوستی کے عظیم کارناموں پر ضروری لٹریچر موجود ہے ؟

پھر یہ بات اور بھی زیادہ افسوسناک ہے کہ مسلمان اہل علم کا ایک طبقہ صوفیائے کبار کے خلاف ایسے حالات میں گمراہ کن پروپیگنڈے میں لگا ہوا ہے ، اور یہاں تک لکھا جا رہا ہے کہ صوفیائے کبار کے ذریعے ہندوستان میں تبلیغ اسلام کا پروپیگنڈہ انگریزوں کی اس ڈپلومیسی کا حصہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر سے قربانی اور جہاد کا جذبہ ختم کر دیا جائے ۔

اور ڈاکٹر آرنلڈ کی پریچنگ آف اسلام کو اسی برطانوی ڈپلومیسی کی کتاب بتایا جا رہا ہے کیونکہ اس انگریز مصنف نے ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کا سہرا صوفیائے کبار کے سر باندھا ہے ۔

اس پڑھے لکھے گروہ کو صوفیائے ربانی کی کرامات کی مخالفت کے جوش میں یہ بھی نظر نہیں آتا کہ اس کتاب کی ترتیب و اشاعت میں سرسید علیہ الرحمہ کی کوششوں کا بڑا دخل تھا اور سرسید رح کرامات اولیاء تو کجا، معجزات انبیاء کو بھی تسلیم نہیں کرتے تھے ۔

بہرحال ہمیں شکرگذار ہونا چاہیے جناب خواجہ حسن ثانی صاحب کا کہ انہوں نے اپنے مرحوم والد حضرت خواجہ حسن نظامی رح کی وصیت کے مطابق فوائد الفواد کا نہایت عمدہ اردو ترجمہ مع فارسی متن کے بڑے سلیقے و احتیاط کے ساتھ مسلمانوں تک پہنچایا ۔ اور اسی کی مدد

سے یہ ناچیز شیخ علیہ الرحمہ کے ملفوظات گرامی کے علمی اور تفسیری اور حدیثی پہلوؤں کی تشریح پر یہ کتاب پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ کی (۱۸۸) مجلسوں میں سے ہر مجلس ایسی ہے جس میں حضرت شیخ رح نے اپنی فصیح و بلیغ فارسی زبان میں قرآن کریم اور احادیث نبوی ؐ کے مطالب کو کہیں تفصیل کے ساتھ اور کہیں اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مفصل احادیث کو چھوڑ کر اگر مختصر حدیثی اشارات کو بالاستیعاب لیا جائے اور ان کی تشریح کی جائے اور ان کے ماخذ واضح کیے جائیں تو اس سے اصل کتاب کے مقابلے میں کئی ضخیم تر کتابیں وجود میں آجائیں۔

اس لئے اس ناچیز نے تشریح و توضیح کے لیے ان خاص خاص مقامات کا انتخاب کیا ہے جن میں احادیث نبوی ؐ اور تفسیر قرآن کریم کے اہم نکات و لطائف مضمر اور پوشیدہ ہیں اور ان سے شریعت و طریقت کے درمیان فرق کرنے والے تصورات کی تردید ہوتی ہے۔

اور اسی کے ساتھ بالاختصار شیخ علیہ الرحمہ کی تعلیمات کے عنوان سے شیخ رح کی ان نصیحتوں کو ترتیب دے دیا ہے جو عام مسلمانوں کے لیے مفید ہیں۔

تاکہ پیش نظر مجموعہ اہل علم، اہل تصوف اور عام مسلمانوں کے مطالعے اور استفادے کے لیے آسان ہو جائے۔

جہاں تک فوائد الفواد کے معتبر و مستند ہونے کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں ناچیز نے ایک مستقل عنوان کے تحت مفصل بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ صوفیائے کبار کی کتابوں اور ملفوظات میں تحریف والحاق کی جو مثالیں پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے اپنی کتاب تاریخ تصوف میں دی ہیں، ان میں چشتی صاحب کو فوائد الفواد کا صرف ایک فقرہ ایسا ملا ہے جو مولانا نور ترک رح کی تعریف میں ہے اور اس ایک فقرے کو چشتی صاحب نے طبقات ناصری پر اعتماد کر کے قابل اعتراض قرار دیا ہے۔

اس اعتراض کی مدلل تردید تو زیر بحث عنوان میں دیکھی جائے، یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ تصوف کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں فوائد الفواد کی تعلیمات اور نظریات اس درجہ قرآن کریم اور احادیث نبوی کے مطابق ہیں کہ ان پر چشتی صاحب جیسے ناقد کو بھی کوئی معقول گرفت کرنے کا موقعہ نہیں مل سکا۔

جس طرح انہیں دوسری کتابوں پر گرفت کا موقعہ ملا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض مسائل (دو تین ہی ہوں گے) فقہائے شریعت اور صوفیائے طریقت کے درمیان شروع ہی سے مختلف فیہ چلے آرہے ہیں۔ ان مسائل کی تشریح میں اس ناچیز نے شیخ علیہ الرحمہ کے سنجیدہ اور اعتدال پسندانہ اسلوب و پیرایے کے مطابق قلم اٹھایا ہے اور منطقی مناظرہ اور مباحثے کا رنگ عبارت کے اندر پیدا نہیں ہونے دیا ہے۔ تاکہ اہل تصوف اور حضرات مشائخ کی خانقاہوں سے وابستہ طبقہ ان مسائل کا مطالعہ کرتے ہوئے کسی قسم کا تکدر محسوس نہ کرے۔

اور جو اصل مقصد فوائد الفواد کا اس ناچیز نے اوپر بیان کیا ہے، وہ قائم رہے اور دھندلا ہو۔

میں امید کرتا ہوں کہ اس محتاط انداز و اسلوب میں لکھی جانے والی یہ تشریح کتاب فوائد الفواد کے مقصد کا مضامین کا انشاء اللہ خلاصہ ثابت ہوگی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

(۳ رجب المرجب ۱۴۱۳ھ مطابق ۲۸ دسمبر ۱۹۹۲ء)

اُردو گُلستاں

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا منتخب روزنامچہ

۱۰ رجمادی الاول ۱۳۴۹ھ مطابق ۴ راکتوبر ۱۹۳۰ء
یوم شنبہ مقام دہلی

سیاسی } کئی مقامات سے گولیاں چلنے کی خبریں آئی ہیں تشدد غرّاتا ہے تو عدم تشدد بھی آستین چڑھا کر سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ آثار مقصد فوت ہو جانے کے ہیں۔

ڈاکٹر مونجے ہندو مہاسبھا کے سب سے بڑے لیڈر اور مسلمانوں کے مشہور مخالف ہیں۔ ہندوؤں کا بچہ بچہ ان کا شیفتہ تھا۔ مگر گول میز کانفرنس کی دعوت قبول کر لینے کی وجہ سے سی پی اور صوبۂ بمبئی و مدراس میں ہندو قوم ان کی نہایت سخت مخالفت کر رہی ہے۔ ایسے ہی مسٹر جیکر اور سر سپرو کی مخالفت بھی ہو رہی ہے اور وہ سب ہندوؤں کی نظروں سے گر رہے ہیں۔ آج وائسرائے ہند نامی جہاز سے یہ سب لندن جانے والے ہیں اور بمبئی میں ان کی مخالفت کا بہت زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔

قومی } مسٹر جناح اور علی برادران کی بھی مخالفت مسلمان قوم میں بڑھ رہی ہے کہ وہ لندن کیوں جاتے ہیں۔ مسٹر جناح نے معقول دلائل اپنے سفر کی ایک جلسہ میں بیان کیں۔ مگر علی برادران نے اعلان شائع کرائے ہیں کہ ہم سفر لندن کو جہاد اکبر سمجھتے ہیں۔ اگر کسی نے ہمارے سفر میں رکاوٹ ڈالی تو ہم سے بُرا کوئی نہیں۔ گویا دھمکی دی ہے۔ آج ان دونوں بھائیوں کی روانگی بھی مقرر ہے اور آج کے اخبار ان دونوں کی ملامت سے لبریز شائع ہوئے ہیں۔ اور ان کو سرکاری خوشامدی اور جاسوس لکھا جا رہا ہے۔

یہ دونوں وہ ہیں جو دوسروں کو جاسوس بتاتے تھے۔ انھوں نے جو کنواں دوسروں کے لئے کھودا تھا آج خود اس کے اندر گر پڑے۔ بمبئی کے مسلمانوں میں ان کے خلاف بہت جوش پھیل رہا ہے۔ ان دونوں کو یہ رنج ہے کہ ان کو چاء کی دعوت میں نہیں بلایا تھا۔

آج خان بہادر عبدالعزیز صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس پنجاب پر حملہ کی خبر شائع ہوئی ہے۔ کسی نے ان پہ گولی چلائی تھی اور ڈرائیور زخمی ہوا مگر وہ بچ گئے یہ بہت مستعد اور کارشناس مسلمان افسر ہیں۔ انگریز افسر بھی ان کی سی اعلیٰ حکمت اور طریق عمل کی خوبی سے محروم ہیں۔

تلقین حیات } ہر اقتدار صداقت اور پابندی عہد کا

دشمن ہے۔ جب تم کو کسی قسم کا اقتدار حاصل ہو تو تم ماتم کی مجلس منعقد کرو کہ اب تم وعدہ کی پابندی اور سچ بولنے سے محروم ہو جاؤ گے کیونکہ ہر اقتدار کو موجودہ زمانہ میں خلاف بیانی اور وعدہ شکنی کی ضرورت ہے۔

حمید کا حلیہ } میرا مرید اور نوکر ہے بچپن سے میرے ہاں رہتا ہے ۲۲ سال کی عمر ہے۔ لمبا قد ہے۔ دُبلا بدن ہے۔ اس کی شادی بھی کر دی ہے دونوں میاں بیوی میرے گھر میں رہتے ہیں اور بہت محنت اور وفاداری سے کام کرتے ہیں۔

مجیؔ } مرزا سہراب شاہ نام ہے۔ ۲۴ سال کی عمر ہے۔ بہادر شاہ بادشاہ کا پڑپوتا ہے بچپن سے میرے ہاں رہتا ہے۔ بورڈنگ ہاؤس اسکول کا کام اس کے سپرد ہے۔ شادی کر دی ہے۔

پیارے میاں } پشاور کے رہنے والے ہیں۔ ساٹھ سال سے زیادہ عمر ہے آنکھوں سے معذور ہو گئے ہیں۔ پندرہ سال سے میرے ساتھ رہتے ہیں۔ بھاری جسم ہے۔ سفید لمبی ڈاڑھی ہے۔ شب بیدار اور تہجد گزار ہیں۔ سالہا سال درگاہ شریف کے مسافروں کی خدمت کر چکے ہیں۔

ذاتی } مجلس تلقین کا مضمون روز لکھ دیتا ہوں۔ آج بھی پہلے وہی لکھا۔ پھر بہرہ شہزادہ کے عنوان سے رسالہ ہمایوں لاہور کے لئے سولہ صفحہ کا ایک مضمون لکھا۔ پھر خطوط کے جوابات لکھوائے گئے۔ پھر تجارتی مضامین تیار کئے۔ دو بجے دہلی گیا۔ آج خواجہ باقر حسن انصاری چلے گئے واحدی صاحب کے ہاں پروفیسر شمشاد علی صاحب ملنے آئے۔ مولانا دائم جلالی صاحب نظامی ریاست رامپور سے ملنے آئے۔ بازار بھی گیا اور تجارتی سامان خرید کر لایا۔ شام کو کھانا واحدی صاحب کے ہاں کھایا۔ نیازی صاحب نے تین دن کی رخصت لی ہے اب سارا کام مجھ ہی کو کرنا پڑے گا۔ مغرب کے بعد گھر میں واپس آیا۔ رات کو نو بجے

جمال محمد فاروقی اجمیر شریف سے آئے۔ ان کی مستورات اور بچہ بھی ساتھ تھا۔ زید منزل میں ٹھیرے۔

روحہ نے خواجہ گرل اسکول میں کھانا پکانا سیکھنا شروع کیا ہے۔ ان کے ہاتھ کی روٹی اور دال میں نے بھی کھائی۔ پلاؤ قورمہ سے زیادہ لطف آیا کہ میری مقبول خدا لڑکی کے ہاتھ کا کھانا تھا۔

روحہ بہت دُبلی ہو گئی ہے۔ موسمی بیماریوں کا اثر ہے۔ دبلا ہونا تو باپ کی سنت ہے موٹی ہوتی تو علی برادران کی مقلد بن جاتی۔

رات کو مستری عشقی نظامی حسب معمول خدمت کرتے رہے۔ دس بجے سویا۔ تین بجے بیدار ہوا۔ سردی بہت تھی ختم پڑھ کر چہل قدمی کی پھر لکھنا شروع کر دیا۔ یکایک درگاہ شریف کی حاضری کا شوق غالب ہوا۔ کام چھوڑ کر غلام آقا کے پاس گیا۔ اس کو کشش کہتے ہیں۔ جب بلاؤ ہوتی ہے میں اسی وقت حاضر ہوتا ہوں۔ پارہ آج بھی ۴۳ درجہ پر ہے۔ جوہیٹ ناٹال افریقہ سے مسٹر ایچ ملانے ۲۳ روپے مسجد سے جمع کر کے بھیجے ہیں۔

۱۱ جمادی الاول ۱۳۴۹ھ مطابق ۵ اکتوبر ۱۹۳۰ء

یوم یکشنبہ مقام دہلی

سیاسی } سر جان مالکم ہیلی گورنر یوپی لندن جا رہے ہیں۔ ان کی جگہ ایک انگریز کو عارضی گورنر بنانے کی تجویز ہے۔ اگر کسی ہندوستانی کو گورنر بنا دیا جاتا تو معلوم ہوتا کہ انگریز سیاست کو خوب جانتے ہیں مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

قومی } آج شائع ہوا ہے کہ آنریبل نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب یوپی کے ہوم ممبر بنائے جائیں گے۔ نواب حاجی سر احمد سعید خاں صاحب رئیس چھتاری پہلے عارضی گورنر بنائے گئے تھے پھر ہوم ممبر بنائے گئے تھے اور ان کے یہ دونوں زمانے نہایت کامیاب ہوئے تھے اور جس وقت نواب صاحب گورنری شان کے ساتھ مسجد میں

نماز کے لئے آتے تھے تو ایک عجیب اثر ہندو مسلمانوں پر ہوتا تھا۔ اب اگر نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب کو عارضی گورنر بنا دیا جاتا تو تمام مسلمان قوم پر بہت اچھا اثر ہوتا کیونکہ نواب صاحب نے ساری عمر علی گڈھ کالج وغیرہ قومی کاموں میں بسر کی ہے۔ وہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں ہر دل عزیز ہیں۔ مگر انگریز تو اپنی ہی عقل پر بھروسہ کرتے ہیں۔ بہر حال اگر نواب صاحب کو ہوم ممبر بنایا گیا تو گورنمنٹ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کیسی عمدگی سے کام کرتے ہیں۔ میرے خیال میں ہندوستان کے مسلمانوں میں اب دو چار آدمی ایسے ہیں جو انگریزی بھی جانتے ہیں اور مشرقی علوم میں بھی کامل ہیں اور ان میں علمی و سیاسی قوتیں بھی بہت اعلیٰ ہیں۔ نواب صاحب کے مخالف بھی ان کی تمام صفات کو تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ ایک جماعت کو یہ شکایت ہمیشہ رہتی ہے کہ نواب صاحب کی حکمت عملی سر سید کی مقلد ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ گورنمنٹ کی تائید و حمایت کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اب ہندوستان کا ہر شخص بدل گیا ہے اور ہر ایک کے حالات و خیالات میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔

عزیز محمد خاں کا حلیہ } میرے موجودہ محرروں میں سب سے قدیمی محرر ہیں حسن پور ضلع مرادآباد کے شرفا میں ہیں لمبا قد ہے چھریرہ بدن ہے گورا رنگ ہے۔ عمر تیس سال سے زیادہ ہے۔ فوج میں بھی نوکری کی ہے۔ میرے سفر میں بھی اکثر وہ ہی ساتھ جاتے ہیں اور مجھے بہت آرام پہنچاتے ہیں اٹھارہ سال سے میری رفاقت میں ہیں۔ جب پٹھانوں کا جذبہ پیدا ہوتا ہے نوکری چھوڑ کر چلے جاتے ہیں جب ولیوں کا جذبہ پیدا ہوتا ہے پھر چلے آتے ہیں۔ کسی نے کہا تھا۔ پٹھان کا پوت گھڑی میں اولیا گھڑی میں بھوت مگر اب زمانہ کے تجربے نے اُن کے پٹھانی جذبہ کو ختم کر دیا ہے۔ میں ہمیشہ ان پر پورا اعتماد رکھتا ہوں۔

تلقین حیات } جو لوگ بے ضرورت بلند آواز سے بات کرتے ہیں وہ بھی اور جو ضرورت سے زیادہ دھیمی آواز سے بولتے ہیں وہ بھی خدا کی دی ہوئی آواز کے ناقدردان ہیں۔

ذاتی } نیازی صاحب کل شام کو چلے گئے تھے آج صبح بورڈنگ ہاؤس میں میں نے سب تحریری کام اپنے ہاتھ سے کیا۔ بول کر لکھواتا ہوں تو تسکان نہیں ہوتی۔ اپنے ہاتھ سے لکھتا ہوں تو خون کی کمی کی وجہ سے داہنے ہاتھ کے عصاب دکھنے لگتے ہیں اور جلدی تھک جاتا ہوں۔ بارہ بجے نئی دہلی کے کچھ لوگ ملنے آئے، پھر واحدی صاحب کے ہمراہ ایک بجے کوچہ پنڈت میں مسلم ہائی اسکول دیکھنے گیا جو قدوسی صاحب نے جاری کیا ہے۔ خاں صاحب طفیل محمد خاں پریسیڈنٹ اور دوسرے اراکین بھی موجود تھے ابھی ابتدا ہے مگر اسکول ہونہار معلوم ہوتا ہے مغرب سے پہلے گھر میں واپس آیا۔ آج حسین کو بہت بخار ہے مجھے بھی رات بھر بخار چڑھا رہا۔ صبح تک بے چینی رہی سر میں اور جسم میں درد بہت تھا۔ آج لالہ منولال صاحب بینکر بھی ملنے آئے تھے دو گھنٹے ساتھ رہے۔

۱۲ر جمادی الاول ۱۳۴۹ھ مطابق ۶ر اکتوبر ۱۹۳۰ء
یوم دوشنبہ مقام دہلی

سیاسی } آج دو سیاسی آدمیوں کے مضمون پڑھے۔ مہاتما گاندھی نے جیل خانہ سے کسی دوست کو خط لکھا ہے جس میں نہایت لطافت کے ساتھ دنیا کو مذہب اور خدا کی طرف متوجہ ہونے کی رغبت دلائی ہے اور ہر اہل مذہب کو دوسرے مذاہب کی عزت کرنی سکھائی ہے۔

دوسرا مضمون محمد علی صاحب کا ہے۔ جو انھوں نے ۴ر اکتوبر کو لندن کا سفر شروع کرنے سے پہلے اخباروں میں شائع کرایا ہے۔ اس خط میں یہ ہے کہ میں نے سب مسلمانوں کو سول نافرمانی میں شریک ہونے سے

بچایا اور میں ہی مسلمانوں کا اصلی نمایندہ ہوں اس لئے باوجود علالت کے مجبوراً لندن جارہا ہوں۔

دوسیاسی دماغوں کی کیفیت ایک ہی وقت میں سامنے آئی، غیر مسلم کہتا ہے خدا کی طرف جاتا ہوں۔ مسلم کہتا ہے دنیا کی طرف جاتا ہوں۔ دیر تک اس بجو بہ نے غرق تصور رکھا۔

قومی } دہلی کے کئی مسلمانوں کی گرفتاریاں ہوئی ہیں جن کا شہر میں بہت چرچا ہوگیا ہے۔

تلقین حیات } اُون جانوروں کے جسم کی اترن ہے اور روئی قدرت کا عطیہ ہے۔ جہاں برف باری اور بارش زیادہ ہو وہاں اونی کپڑہ استعمال کرنا ضروری ہے ورنہ روئی، بمقابلہ اون سستی بھی زیادہ ہے اور گرم بھی۔ روئی کا لحاف ہراونی کمبل سے زیادہ گرم ہوتا ہے۔

نیازی صاحب کا حلیہ } سید ظفر سعید نام ہے نیازی لقب ہے ہاپوڑ ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ تیس کے قریب عمر ہے گورے ہیں۔ دُبلے ہیں۔ کئی سال سے میرے ساتھ کام کرتے ہیں۔ بہت محنتی اور بہت مستعد آدمی ہیں۔ اب میں اپنے سب مضامین اور خطوط انہی سے لکھواتا ہوں بہت تیز لکھتے ہیں۔ میں مسلسل بولتا رہتا ہوں بہت کم وقفہ میری تقریر میں ہوتا ہے اور نہایت روانی کے ساتھ لکھتے رہتے ہیں۔

ذاتی } رات کے بخار نے مجھے ایسا ناتوان کردیا جیسے روشنی کا پروانہ سورج نکلنے کے بعد بے حس و حرکت ہوکر دن بھر کسی کونہ میں پڑا رہتا ہے۔ نو بجے تک واحدی منزل میں پڑا رہا وہیں لیٹے لیٹے مجلس تلقین اور روزنامچہ لکھوایا۔ پھر زنانہ میں چلا گیا۔ ہردوا گنج ضلع علی گڈھ سے ایک کارخانہ کے مسلمان انجینیر صاحب ملنے آئے تھے ان سے کسی مجذوب صاحب نے کہا تھا کہ درگاہ میں جاؤ اور وہاں کتابیں چھاپنے والے کو ایک روپیہ دے آؤ۔

شام تک زنانہ میں نڈھال پڑا رہا۔ حسین بھی بخار میں مبتلا ہے۔ اس کا پلنگ بھی میرے برابر تھا میں نے اس سے کہا آج صبح مستری محمد خاں مجھے دیکھنے آئے تھے۔ میں روزنامچہ لکھوا رہا تھا وہ بازار میں گئے وہاں لوگ جمع ہوگئے اور میرا حال پوچھا۔ محمد خاں نے کہا کیا بتاؤں سوکھتے چلے جاتے ہیں۔ مگر جب دیکھو یہی کہتے رہتے ہیں یہ لکھو وہ لکھو پھر یہ بھی لکھو اور وہ بھی لکھوان کا لکھوانا نہ صبح ختم ہوتا ہے نہ شام کو نہ دن کو نہ رات کو نہ تندرستی میں نہ بیماری میں۔ آج بہت سخت بیمار ہیں مگر لکھنا بند نہیں ہوا۔ برابر لکھوا رہے ہیں۔

میں نے خاں صاحب کی باتیں حسین کو سنائیں تو وہ خوب ہنسا خواجہ بانو بھی ہنسیں۔ میں نے کہا خاں صاحب کی ہمدردی سچی ہے مگر وہ میرے لکھنے کی بڑی ضرورت کو نہیں جانتے میرا تو جب آخری سانس سینے میں آجائے گا تب بھی کچھ نہ کچھ لکھواؤں گا اور کچھ نہیں تو یہی کہ زیادہ لکھنا مرنے سے بچا لیتا ہے۔ حضرت عزرائیل کئی دفعہ میری جان نکالنے آئے مگر مجھ کو کام میں مصروف دیکھ کر چلے گئے۔ اور فرشتوں سے کہا ایسے آدمی کو یہاں لانا مناسب نہیں ہے ورنہ سب کاہل وجود اور بے کار بیٹھی ہوئی ارواح میں کام کرنے کی ہلچل پڑ جائے گی۔

رات کو ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر میں کچھ نسوانی تکلیف پیش آئی تھی خواجہ بانو گھر کے کاموں کو چھوڑ کر فوراً ان کی امداد کے لئے جی منزل میں گئیں۔ حالانکہ ان کے لڑکے کو بھی بہت سخت بخار تھا اور آج دن کو بھی کئی گھنٹہ مریضہ مذکورہ کے پاس رہیں واپس آئیں تو میں نے کہا تمہاری یہ خدمت خلق پیغمبروں میں اور اولیااللہ میں اور سب فرشتوں میں مشہور ہوگی اور خدا کے سامنے یہ سب ملکوتی لوگ تمہاری تعریف کا ریزولیوشن پیش کریں گے۔ خواجہ بانو ہنسیں اور انھوں نے کہا وہ پردیس میں ہیں اور ہمارے اسکول کی وجہ سے

مجبوراً یہاں اکیلی ہیں اگر میں ان کی خبر گیری نہ کرتی تو بڑی سنگ دلی ہوتی۔ میں نے کہا میں کسی کو ولی بنا سکتا تو آج اس خدمت خلق کے عوض تم کو ولی بنا دیتا۔

شام کو شلغم کی بھجیہ سے ایک چپاتی کھائی تھوڑی بھوک باقی تھی کھانے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ پھر دل سے کہا وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہوگا۔ اچھا کھانا اور اچھی بھوک موجود ہو اور پھر تھوڑی سی بھوک باقی رکھ کر کھانے سے ہاتھ اٹھا لیا جائے یہ طاقت رستم پہلوان میں بھی نہ تھی۔ اگر سب کمزور اور بیمار لوگ تھوڑی سی بھوک چھوڑ کر کھانے سے ہاتھ اٹھا لیا کریں تو پھر کبھی بیمار ہی نہ ہوں اور ہمیشہ سچی بھوک سے کھانا کھایا کریں۔

بعد مغرب خاں صاحب محمد حسین ریلوے افسر اور چھپرہ صوبہ بہار کے ایک سب جج ملنے آئے۔ بیمار پرسی کرنے والے بھی رات تک آتے رہے۔ حسین کا بخار کم ہوگیا ہے مگر ابھی بالکل اچھا نہیں ہوا ہے۔ آج ہم دونوں بیماروں نے سول اسپتال کے مریضوں کی طرح آپس میں خوب ہی باتیں کیں۔ باپ بیٹے کا امتیاز نہ تھا بیماری نے فرق مراتب کو دور کر دیا تھا رات کو نیند بھی اچھی آئی۔ روحہ نے ہم دونوں بیماروں کی بہت خدمت کی خدا اس کو ہمیشہ خوش رکھے گا۔

۱۴ رجمادی الاول ۱۳۴۹ھ مطابق ۷ راکتوبر ۱۹۳۰ء

یوم سہ شنبہ مقام دہلی

سیاسی } لاہور کے مشہور سازشی مقدمہ میں تین کو پھانسی سات کو عمر قید اور دو کو پانچ اور سات سال کی سزا ہوئی۔

آفریدیوں نے صلح کی شرط میں درہ خیبر طلب کیا ہے۔ وہ اگر سارا ہندوستان مانگ لیتے تو ان کی زبان کون پکڑ لیتا۔

قومی } خبر آئی ہے کہ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب یوپی کے ہوم ممبر مقرر ہوگئے مسلمانوں میں اس خبر سے بہت زیادہ خوشی پیدا ہوگئی ہے۔

تلقین حیات } راتیں بڑی ہوگئیں۔ اب پچھلی رات کو عبادت کرنی آسان ہے۔ عبادت نہ ہو تو دنیا کا کوئی کام ہی کرو۔ اس سے دل اور زبان کی قوت بڑھ جاتی ہے۔

غلام رسول کا حلیہ } میوات کا باشندہ ہے۔ فقیر قوم کا ہے۔ میرے ہاں پندرہ سال سے نوکر ہے۔ چھوٹا قد ہے گورکھوں کی شکل ہے۔ بہت محنتی اور دیانتدار اور وفادار ہے۔ جب مجھ پر حملہ ہوا اور گولی چلی تو سب سے پہلے یہی میری امداد کے لئے پہنچا تھا میرے گھروں میں آگ لگائی گئی تو یہ پانی لے کر آگ میں گھس گیا۔ اس کی عمر تیس برس کے قریب ہے۔

بھولا کا حلیہ } میواتی قوم کا ہے۔ مجھ سے بھی زیادہ لمبا قد ہے۔ عمر تیس کے قریب ہے جب مجھ پر گولی چلی اس زمانہ سے میری حفاظت کے لئے نوکر ہے۔ بہت دلیر اور بہادر قوم کا ہے۔ رات دن میرے مکان پر رہتا ہے۔

امید خاں کا حلیہ } امید خاں نظامی میرے مرید ہیں۔ ضلع سلطان پور اودھ کے رہنے والے ہیں۔ میرے ہاں سات برس سے پہرہ دینے کا کام کرتے ہیں۔ احمد آباد میں مرید ہوئے تھے۔ پٹہ بازی اور لکڑی چلانے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ اسکول کے بچوں کو آج کل یہ فن سکھاتے ہیں۔ بہت لمبی ڈاڑھی ہے۔ بہت نیک اور دیانت دار آدمی ہیں۔

ذاتی } بھوک چھوڑ کر کھانا کھانے سے آج میں دن بھر اچھا رہا اور رات کو بھی آرام سے سویا۔ دفتر میں جاکر کام بھی کیا۔ دہلی بھی گیا۔ واحدی صاحب کے ماموں سید ضمانت علی صاحب دانا پور گھگول سے دہلی میں آئے ہوئے ہیں میرے لئے ہمیشہ ایک نوڈ یگ لاتے ہیں۔ آج بھی لائے ہیں۔ پرانی وضع کے شریف مسلمان ہیں

تین بجے دہلی گیا اور بعد مغرب واپس آیا۔ احمد آباد
سے چاند میاں نظامی آئے ہیں۔ زید منزل میں ٹھیرے ہیں
گھر میں آکر کھانا کھایا۔ امام علی شاہ نظامی جو درگاہ حضرت
میاں میر صاحب کے پیرزادہ ہیں اور یہاں درگاہ کی بستی
میں کچھ عرصہ سے رہتے ہیں ملنے آئے میرے مرید ہیں۔ میں نے
ان کو آج اعمال اور وظائف اور اشغال کا فرق بتایا اور
ایک خاص چیز کی تعلیم بھی کی۔

آج خدا کے فضل سے سب اچھے ہیں نو بجے سو یا۔
تین بجے بیدار ہوا۔ چودھویں رات کے چاند کی خوب
بہار تھی۔ حوض کوثر میں فوارہ چلایا اور چاندنی میں پانی
کی بہار دیکھی۔ پھر کام شروع کیا۔

۱۴ر جمادی الاول ۱۳۴۹ھ مطابق ۸ر اکتوبر ۱۹۳ء
یوم چہارشنبہ مقام دہلی

سیاسی } آج دہلی میں ہڑتال ہے۔ کیونکہ لاہور سے سازشی
ملزموں کی پھانسیوں اور قید کی خبریں آئی ہیں۔
آج صبح دہلی کے چیف کمشنر سر جان طامسن صاحب لندن
کے سفر سے واپس آگئے۔

قومی } آج شہر میں مولانا کفایت اللہ صاحب صدر
جمعیۃ علمائے ہند کی گرفتاری کا چرچہ بھی ہو رہا
ہے اور لوگ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں میں اس
تحریک کا اثر مسلمانوں کی گرفتاریوں سے بڑھ رہا ہے
اگر گورنمنٹ مسلمانوں کو گرفتار نہ کرتی تو مسلمان
زیادہ کانگریس میں شریک نہ ہوتے۔

تلقین حیات } ایک ہندو عورت دہلی میں ایک
مندر کے دروازہ پر بیٹھ کر روزانہ
اصلاح معاشرت کی تقریریں کرتی ہے اور بہت سے
ہندو عورت مرد کھڑے ہو کر اس کو سنتے ہیں۔ بولنے
کی طاقت ہر قوم کے عورت مرد میں ہے۔ لیکن وہ مشق
سے بڑھتی ہے مشق نہ ہو تو مسلمان عورتوں کی طرح
سب عورتیں بے زبان معلوم ہوں۔

انور علی نظامی کا حلیہ } چرخی دادری ریاست جیند
کے رہنے والے ہیں۔ میرے
مرید ہیں اور میری موٹر کے ڈرائیور ہیں۔ لمبا قد ہے۔ گورا
رنگ ہے۔ عمر تیس کے قریب ہے۔ سپاہیانہ وضع رکھتے
ہیں۔ بہت خیر خواہ اور مستعد اور محنتی آدمی ہیں۔ میرے
ساتھ کبھی کبھی سفر میں بھی جاتے ہیں۔ میرے مہمانوں کی خدمت
بھی کرتے ہیں۔

یونس کا حلیہ } ایک یتیم لڑکا ہے۔ کئی سال سے زنانہ
مکان میں رہتا ہے۔ ٹیلیفون میں بات
کرنے کا بہت شوق ہے۔ کانوں سے کم سنتا ہے۔
بہت نیک اور ہونہار بچہ ہے۔ بارہ سال کی عمر ہے۔
مجھ کو اور خواجہ بانو کو اس سے بہت محبت ہے۔

منگت کا حلیہ } درگاہ کی بستی کا حلال خور ہے۔ ماں
باپ مر گئے ہیں۔ سوتیلی ماں کے پاس
رہتا ہے۔ بارہ سال کی عمر ہے۔ میں نے اس کو بورڈنگ
ہاؤس کی صفائی کے لئے رکھ لیا ہے۔ صاف کپڑے پہناتا
ہوں، اور ہر وقت صفائی کی تاکید کرتا رہتا ہوں۔
پھر بھی اپنی جبلی عادت کی وجہ سے بے تکلف میلی زمین
پر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ اس بات سے بہت خوش ہے کہ
میں اس کی قومیت کی وجہ سے پرہیز نہیں کرتا۔ میرے
بچوں کو گود میں لیتا ہے اور سب چیزوں کو ہاتھ لگاتا
ہے۔ اگرچہ عرصہ تک میرے گھر والے اس سے پرہیز
کرتے رہے لیکن رفتہ رفتہ ان کا پرہیز بھی جاتا رہا۔
ادنیٰ اقوام کی خصلت سمجھنے کے لئے میں اکثر اس کی مختلف
حرکتوں پر غور کرتا رہتا ہوں۔

ذاتی } صبح ساڑھے پانچ بجے دہلی گیا۔ راستہ میں
بقائی صاحب اور عزالی خاں بھی مل گئے اور
واحدی صاحب بھی آگئے۔ ان سب کے ساتھ اسٹیشن
پر گیا۔ دہلی کے سب انگریز اور ہندو مسلمان حکام
اور افسر بھی موجود تھے۔ سر جان طامسن صاحب چیف
کمشنر کے خیر مقدم کے لئے یہ سب آئے ہیں۔

پونے سات بجے بمبئی سے گاڑی آئی۔ اور رطامسن صاحب اپنی میم صاحب کے ساتھ گاڑی سے اترے اور سب لوگوں سے مل کر اپنی کوٹھی پر چلے گئے۔ میں یہاں سے حضرت بی بی نور صاحبہؒ کی درگاہ میں گیا جو دہلی سے دس میل کے فاصلہ پر ہے وہاں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے بھائی حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ اور صاحبزادی صاحبہؓ کا مزار ہے۔ حضرت بابا صاحبؒ کی صاحبزادی حضرت بی بی فاطمہؓ میری دادی تھیں۔ میں اُنہی کے صاحبزادہ مولانا خواجہ سید محمد امامؒ کی اولاد میں ہوں۔ ان کی درگاہ بہت شکستہ ہو گئی ہے اور میں نے بنوانے کا ارادہ کیا ہے۔ مزار اور درگاہ کی سب حالتیں دیکھ کر گھر میں واپس آیا۔ کھانا کھایا۔ پھر ایک بجے تک بورڈنگ ہاؤس میں تحریری کام کیا۔ پھر دہلی گیا۔ اور واحدی صاحب کے ہمراہ بڑے ڈاک خانہ میں ہو کر دہلی کلاتھ مل میں گیا۔ وہاں سے نیشنل بینک میں آیا۔ ہرتال کی وجہ سے بازار بند ہیں۔ واحدی صاحب کے ہاں واپس آیا۔ اور پانچ بجے تک کام کیا۔ پھر میڈن ہوٹل میں ڈپٹی کمشنر صاحب کی پارٹی میں شریک ہو کر گھر میں واپس آیا۔ توکل شاہ کو بخار ہے۔ صوفی حبیب اللہ پٹیالہ سے اور محمد شریف نظامی سیالکوٹ سے آئے ہیں۔ ۲ بجے بیدار ہوا۔ پارہ صبح ۷۵ درجہ پر تھا۔

۱۵ر جمادی الاول ۱۳۴۹ھ مطابق ۹ر اکتوبر ۱۹۳۰ء
یوم پنجشنبہ مقام دہلی

سیاسی } انگریزوں کا ایک بڑا ہوائی جہاز تباہ ہو گیا۔ جس میں بہت بڑے بڑے نامور انگریز تھے اور وہ سب جل کر مر گئے۔ ٹیٹانک جہاز کی غرقابی کے بعد انگریز قوم نے یہ ایک دوسرا اتنا ہی بڑا صدمہ دیکھا اور برداشت کیا۔ انگریزوں کے اخبار لکھ رہے ہیں کہ اس حادثہ اور نقصان کی وجہ سے ہوائی جہازوں کے کام کو بند نہ کرنا چاہیئے بلکہ اور مستعدی کے ساتھ اس کو ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ یہ انگریزوں کی اعلیٰ سیاست اور حوصلہ مندی کا ثبوت ہے۔

قومی } آج پرنس محمد ظاہر خاں دہلی سے گزر کر افغانستان گئے۔ غازی نادر شاہ بادشاہ کے ولی عہد ہیں۔ پیرس میں تعلیم پاتے تھے۔ کئی سال کے بعد وطن جا رہے ہیں۔ ۱۶ر اکتوبر کو ان کے والد کا جشن تاجپوشی ہے اس میں شریک ہوں گے۔ میں نے ان سے دیر تک باتیں کیں سولہ سترہ برس کی عمر معلوم ہوتی ہے نہایت خوبصورت جوان ہیں۔ چہرہ پر اقبال مندی کے آثار ہیں پیشانی اور آنکھوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اس بچہ کو کوئی بہت بڑا کام کرنے کے لئے دنیا میں بھیجا ہے۔ جب اس کا نام ظاہر خاں رکھا گیا ہوگا۔ اس وقت کسی کو یہ خیال بھی نہ ہوگا کہ یہ بچہ کسی زمانہ میں افغانستان کا ولی عہد ہوگا اور آج میں نے ظاہر خاں سے بات چیت کرنے اور ان کے قیافہ اور دماغ اور پیشانی اور آنکھوں کو نظر قیافہ شناسی سے دیکھنے کے بعد یہ معلوم کیا کہ آج سب کچھ اس بچہ کے چہرہ پر جس کا نام ظاہر خاں ہے ظاہر ہو رہا ہے اور چند ہی سال کے بعد دنیا سن لے گی کہ ظاہر خاں کا ظہور ہو گیا۔[۱]

واحدی صاحب کے اہل و عیال دتیا گئے ہیں جہاں ان کی اہلیہ کے عزیز رہتے ہیں واحدی صاحب اپنے بچوں

---

[۱] روزنامچہ کی یہ عبارت پڑھ کر افغانستان کے بادشاہ اور ظاہر شاہ کے باپ نادر شاہ مرحوم نے بڑے اصرار سے حضرت خواجہ صاحب کو کابل بلایا اور ملاقات کے وقت پہلی بات یہ پوچھی کہ کیا آپ کو روحانی کشف سے معلوم ہوا ہے کہ میں مرنے والا ہوں اور میرا بیٹا جلدی بادشاہ ہونے والا ہے۔ خواجہ صاحب یہ مختصر جواب دے کر خاموش ہو گئے کہ غیب کا حال میں نہیں جانتا لیکن نادر شاہ واقعی جلدی انتقال کر گئے۔ (ایڈیٹر)

کی محبت کی وجہ سے کچھ ملول معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ بچوں سے الگ رہنے کے عادی نہیں ہیں۔

توکلی شاہ کا حلیہ } میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ عرصہ دراز سے برما میں رہتے ہیں گورا رنگ ہے درمیانہ قد ہے۔ ڈاڑھی میں سفید بال آرہے ہیں۔ عمر پچاس کے قریب ہے۔ پہلے خانساماں کا کام کرتے تھے۔ اپنے کام میں پورے ماہر اور کامل ہیں۔ میں برما گیا تو مرید ہوئے اور میں نے ان کے اندر کچھ دیکھا تو خلافت دی رات دن خدمت خلق اور یاد خدا میں مصروف رہتے ہیں۔ بہت کم سخن اور نیک آدمی ہیں اب برما میں ایک نظامیہ خانقاہ بنانے کی تجویز کر رہے ہیں۔

مولانا سیفی کا حلیہ } پنجاب کے رہنے والے ہیں بچپن سے دہلی میں رہتے ہیں مدرسہ حسین بخش دہلی سے تعلیم عربی پوری کرکے مولویت کی اعلیٰ سند حاصل کی ہے۔ حافظ نہیں ہیں مگر قاری بہت اچھے ہیں۔ مولانا حکیم مسعود احمد صاحب فرزند و جانشین حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی کے بعد مولانا سیفی کی تلاوت اور قرأت سن کر اصلی لذت قرآن مجید کی آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جبرئیلؑ آسمان زمین کے بیچ میں کھڑے ہو کر ایک امتی مسلمان کی زبان پر قرآنی نزول کی توجہ ڈال رہے ہیں۔ ان کے پڑھنے کی خصوصیت یہ ہے کہ مصری قاریوں یا دوسرے خوش الحانی کی امداد سے قرأت کرنے والوں کی طرح یہ نہیں پڑھتے بلکہ قرآن مجید کے معانی اور مطالب کے موافق الگ الگ فقرے ادا کرتے ہیں۔ آواز بھی اچھی ہے اور اس میں ایک انداز حکم اور موثر گرج ہے۔ عمر ۲۵ سے زیادہ نہیں ہے۔ سانولا رنگ ہے۔ موثر آنکھیں ہیں۔ ہر وقت ہنستے رہتے ہیں اور ان کی ہنسی ہر قسم کے قانون ظاہر و باطن سے آزاد ہے۔ میرے اسکول میں ناظم دینیات اور بورڈنگ ہاؤس کے بچوں کے معلم خصوصی ہیں۔ بعض اوقات ان کی طبیعت میں مجذوبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر وہ مجذوبیت پاس بیٹھنے والے کو شگفتہ اور سالک بنا دیتی ہے۔ میں سالہا سال سے ان کی قرأت اور تلاوت کا فریفتہ ہوں وہ کالے خاں کی مسجد میں قرآن سناتے تھے تو میں ہندو مسلمان راہ گیروں کے ساتھ سڑک پر کھڑا ہو کر ان کی قرأت سنتا تھا۔ اور ہندوؤں سے پوچھتا تھا کہ تم کیوں سنتے ہو وہ کہتے تھے یہ تو ہم کو بھی معلوم نہیں۔ کہ ایسی چیز جو سمجھ میں نہیں آتی اس نے کیوں ہم کو راہ چلنے سے روک لیا۔ اس کے بعد واحدی صاحب کے ہاں وہ آنے جانے لگے اور جب وہ اپنے جذبات عقل سے اونچے ہو جاتے تھے اس وقت میں بھی ان سے باتیں کر لیتا تھا۔ اب وہ میرے ساتھ ہیں اور مجھے امید ہے کہ قبر میں جانے تک وہ میرے ساتھ رہیں گے اور اگر وہ رہنا نہ چاہیں تو کم از کم میں ان کے ساتھ رہوں گا۔ اپنے فرض کو جو ان کے سپرد کر دیا جائے لکیر کے فقیر بن کر ادا کرتے رہتے ہیں۔

ذاتی } صبح سے نو بجے تک بورڈنگ ہاؤس میں کام کیا۔ واحدی صاحب اور ان کے ماموں مولوی سید ضمانت علی صاحب اور غزالی خاں نو بجے کے بعد آئے اور میں نے ان کے ساتھ حبیب منزل میں کھانا کھایا۔ پھر ماموں جان کو خواجہ گرل اسکول اور نظام الاسلام مڈل اسکول وغیرہ کی سیر کرائی۔ پھر انہی کے ہمراہ دہلی گیا۔ کچھ دیر واحدی صاحب کے ہاں کام کیا۔ پھر واحدی صاحب اور غزالی خاں اور بقائی صاحب کے ہمراہ ولی عہد افغانستان سے ملنے گیا جو بمبئی سے آئے ہیں اور افغانستان جا رہے ہیں۔ کچھ دیر ریل میں باتیں کرکے حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبرآبادی کے مکان پر گیا۔ ان کے بچہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اظہار تعزیت کے لئے گیا تھا۔ پھر واحدی صاحب کے ہاں آیا اور بقیہ کام پورا کرکے گھر میں آگیا۔ طبیعت پر تکان کا اثر تھا۔ زنانہ میں جا کر لیٹ گیا اور ڈاک

پڑھی۔ ہشام کو ایک مرید کا قصہ پیش آیا جو ملازم بھی ہیں کہ انھوں نے ایک دوسرے مرید سے جو دولت مند ہیں میری اطلاع کے بغیر کچھ رقم مانگی تھی۔ میں نے بہت سخت ناراضی ظاہر کی۔ مجھے زیادہ ملال اس کا تھا کہ آج دوپہر کو واحدی صاحب کے ماموں جان کے سامنے انھوں نے یہ کہا کہ بالکل غلط الزام ہے اور میں نے کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ مگر شام کو اپنے جرم کا اقبال کیا اور مجھ سے معافی مانگی۔ میں نے معاف کر دیا اور یہ کہا کہ جب میں کسی مرید سے ایک پیسہ کی خواہش نہیں کرتا تو میرے ملازموں کو بھی نہ کرنی چاہیئے۔ اس سے مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے آج رات کو خواجہ بانو کو بہت سخت بخار تھا۔ روحہ نے ان کا سر دابا۔ میں نے دعائیں دم کیں مجھے ساری رات خوب نیند آئی۔ پانچ بجے بیدار ہوا۔ پارہ ۷۵ درجہ پر تھا۔ گرمی کم ہونے سے انکار کرتی ہے۔

۱۶ ؍ جمادی الاول ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۰ ؍ اکتوبر ۱۹۳۰ء
یوم جمعہ مقام دہلی

سیاسی } آج کے اخباروں میں لاہوری سازش کے مقدمہ کے فیصلہ کا خلاصہ شائع ہوا ہے اور اس پر ہر جگہ رائے زنی ہو رہی ہے۔ فیصلہ کرنے والے جج دو انگریز تھے اور ایک سر عبد القادر تھے۔ بعض لوگ ججوں کو برا کہتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی ناسمجھی ہے۔

قومی } خبر آئی ہے کہ نواب سر عبد القیوم خاں صاحب بھی آج گول میز کانفرنس کی شرکت کے لئے بمبئی سے روانہ ہو گئے۔ یہ بہت دانشمند اور لائق اور عملی مسلمان ہیں۔ صوبہ سرحد کے مسلمان ان کی قابلیت پر بھروسہ کرتے ہیں۔

تلقین جہان } یورپ و امریکہ کی ترقیوں کا ایک راز یہ بھی ہے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے لئے ایک کام مخصوص کر لیتا ہے اور پھر اس میں پوری محنت اور رات دن کی جد و جہد سے کمال حاصل کر کے اس کام کا ماہر بن جاتا ہے۔

ماسٹر عبد الکریم کا حلیہ } مدراس کے رہنے والے ہیں چھوٹا قد ہے، پچیس سے زیادہ عمر ہے۔ انگریزی بہت اچھی جانتے ہیں۔ دھیمی آواز سے بولتے ہیں۔ گول چہرہ ہے۔ سنجیدہ اور شریف طبیعت ہیں۔ بورڈنگ ہاؤس کے بچوں کو انگریزی پڑھاتے ہیں اور دفتر میں میرے ذاتی خطوط انگریزی میں لکھتے ہیں۔ ٹائپ بھی جانتے ہیں۔ مدراس کے سب ہی لوگوں پر انگریزی زبان قابض ہو گئی ہے ان پر بھی ہے۔ ان کی قومی زبان اردو کبھی کبھی ان کے پاس آتی ہے ورنہ دور کھڑی رہتی ہے تاہم میرا مطلب اچھی طرح سمجھ کر انگریزی میں ترجمہ کر دیتے ہیں۔

علی محمد صاحب کا حلیہ } چودھری علی محمد صاحب پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ چھوٹا قد ہے پچیس سال کے قریب عمر ہے۔ گورا رنگ ہے۔ باتیں کم کرتے ہیں۔ کام کا شوق زیادہ ہے۔ نظام الاسلام مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔ انتظام اور عمل کی قوت زیادہ ہے۔ تجربہ کم ہے لیکن بڑے تجربہ کار لوگوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ طبیعت میں ہمدردی کا مادہ پایا جاتا ہے۔ میں ان کی عملی قوت پر اعتماد کرتا ہوں۔

ناطق علی صاحب کا حلیہ } نظام الاسلام اسکول کے سکینڈ ماسٹر ہیں۔ عمر بیس سے زیادہ ہے۔ ملنسار ہیں اور خندہ پیشانی رکھتے ہیں۔ پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ بہت محنت سے پڑھاتے ہیں۔ آنکھوں میں نیکی اور محبت کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

علی نواز صاحب کا حلیہ } یہ بھی پنجاب کے رہنے والے ہیں اور میرے اسکول میں ماسٹر ہیں۔ بہت دبلے پتلے اور محنتی آدمی ہیں۔ ذرا جلدی بولتے ہیں۔ ابھی حال میں تعلیمی سند لے کر آئے ہیں۔ اطاعت شعاری کا مادہ رکھتے ہیں اپنے فرائض کے پابند ہیں۔

سید عبد الواحد صاحب کا حلیہ } درگاہ حضرت

خواجہ قطب صاحبؒ کے پیرزادہ ہیں۔ عرصہ دراز سے میرے اسکول میں تعلیم دیتے ہیں۔ عمر بیس سال سے زیادہ ہے لمبا قد ہے۔ سپاہیانہ مزاج ہے۔ بچوں کو اسکاؤٹنگ کی تعلیم بھی دیتے ہیں میل جول کی عادت نہیں ہے اور اپنے غصہ پر بھی بہت کم قابو رکھتے ہیں۔

ذاتی } آج میں دہلی نہیں گیا۔ صبح سے جمعہ کی نماز کے وقت تک بورڈنگ ہاؤس میں کام کرتا رہا۔ جمعہ کی نماز درگاہ شریف میں پڑھی۔ آج نمازیوں کی چار صفیں تھیں۔ اب دن بدن نمازی بڑھ رہے ہیں۔ نماز کے بعد پھر بورڈنگ میں آیا اور تین بجے تک کام کرتا رہا اس کے بعد سید ابن عربی اور بورڈنگ کے بچوں کو لے کر درگاہ حضرت بی بی نور صاحبہؒ میں گیا۔ جہاں میری دادی یعنی حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی صاحبزادی وغیرہ کے مزارات ہیں اور جن کی مرمت کرا رہا ہوں۔ مزارات کے قریب تین چار درخت جال کے ہیں جن کی جڑوں نے تمام مزارات کو شق کر دیا ہے۔ میں نے کہا یہ سب درخت کاٹ دئے جائیں۔ سید ابن عربی اور خواجہ بانو نے اس سے اختلاف کیا۔ میں نے کہا میں درخت پرستی کا قائل نہیں ہوں۔ ان درختوں سے مزارات پٹاؤ تک شق ہوگئے ہیں اور اندیشہ ہے کہ اگر ان کو نہ کاٹا گیا تو مزارات کا پردہ فاش ہوگا۔ اس واسطے ان کا کاٹنا ضروری ہے خواجہ بانو نے کہا ابن سعود نے مزارات مسمار کر دئے۔ لیکن چونکہ وہ مزارات کے ادب کا قائل نہ تھا اس واسطے اسے کچھ نقصان نہ پہنچا مگر ہم تو مزارات کے قائل ہیں ایسا نہ ہو ہمیں کوئی نقصان پہنچے۔ میں نے کہا یہ کام تو مزارات کی سلامتی اور مضبوطی اور عزت قائم رکھنے کے لئے ہے پھر کیوں نقصان پہنچے گا بلکہ ہمارے عقیدہ کے موافق کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوگا۔ میں ان درختوں کو ضرور کٹواؤنگا خواجہ بانو اس جواب سے آزردہ ہو کر خاموش ہوگئیں۔

مگر میرے دل کو اطمینان ہے کہ میں یہ کام بہت اچھا کر رہا ہوں۔ میرے بعد ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ لوگ آثار قدیم کو بھول جائیں گے اس واسطے میں نے ہزارہا روپے خرچ کرکے مختلف بزرگوں کے مزارات بنوائے ہیں اور ان پر کتبے لگوائے ہیں اور یہاں تو میری دادی کا مزار ہے۔ اس معاملہ میں جن لوگوں کی عقل کم ہے یا وہ مہمل درخت پرستی میں مبتلا ہیں۔ میں ان کا لحاظ کرکے ایک اچھے عمل سے باز نہیں رہ سکتا۔

آج توکلی شاہ کو بہت زیادہ بخار ہے وہ کہتے ہیں مجھے بہت خوشی ہے کہ یہاں مر جاؤں اور پیر کے پائین دفن ہوں میں نے کہا وہ ابھی نہیں مریں گے ان کو بہت دن زندہ رہنا ہے۔

آج حور بانو کو بھی بخار ہوگیا ہے اور حسن الدین نظامی کو بھی رات کے وقت ہلکا سا بخار ہوگیا تھا۔ خواجہ بانو کو آرام ہے اور سب مجھ سمیت اچھے ہیں۔

خواجہ بانو نے کہا تم نے علی کو موٹا لکھ دیا اس کو نظر لگ جائے گی اور وہ دبلا ہو جائے گا کوثر کو نان پاؤ لکھ دیا تھا تو وہ دبلی ہوگئی۔ میں نے کہا دبلا ہو جانا تو بہت اچھا ہے۔ بشرطیکہ تندرستی ٹھیک رہے۔ کیونکہ موٹا ہونا تو ایک مرض ہے۔

کوثر نے چند اشعار یاد کرلئے ہیں اقبال کے ترانہ کا پہلا شعر بھی پڑھتی پھرتی ہے اور اس کی توتلی زبان سے یہ چیزیں بہت پیاری معلوم ہوتی ہیں۔ شام کو مغرب کی نماز میں شریک ہوتی ہے اور اس کی حرکتوں سے دوسرے بچوں کو ہنسی آتی ہے۔ میں نے کہا تم الگ نماز پڑھا کرو۔ بولی کیوں؟ اور سب بھی پڑھتے ہیں میں بھی پڑھوں گی۔ نماز کے بعد شیر بنتی ہے اور شیر کی طرح سے کبڑی ہو کر چلتی ہے اس نے شاید کسی عجائب خانہ میں شیر کو بہت غور سے دیکھا ہے۔ ہو بہو شیر کی رفتار بنا لیتی ہے۔

زید توکلی شاہ سے بہت مانوس ہوگیا ہے دن بھر ان کے پاس رہتا ہے اور کہتا ہے میں تو ان کے ساتھ

رنگون جاؤں گا۔ توکل شاہ بھی زید سے بہت محبت کرتے
ہیں۔ میں نے کہا لو دیکھ لو۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔
اس کا عملی ثبوت دیکھ لو۔ رات کو ساڑھے آٹھ بجے سویا
تین بجے بیدار ہوا۔ پڑوس میں دہلی کے گھوسی رہتے
ہیں۔ جن کے پاس بہت سی بھینس ہیں۔ چالیس چور
بھینس لینے آئے تھے۔ گھوسیوں نے جمع ہو کر مقابلہ کیا۔
میں نے بھی فلک منزل کے اوپر جاکر گھوسیوں کو آواز
دی کہ گھبرانا نہیں میں امداد بھیجتا ہوں۔ چور بھاگ
گئے اور گھوسیوں کا کچھ نقصان نہیں ہوا۔ پارہ صبح
۶۷ درجہ پر تھا۔

۱۷ جمادی الاول ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۰ء
یوم شنبہ مقام دہلی

سیاسی } بمبئی سے خبر آئی ہے کہ وہاں بھی دو انگریز عورتوں اور مردوں پر رات کے وقت
گولیاں چلائی گئیں اور دونوں عورت مرد زخمی ہوگئے۔
یہ وبا بنگال میں پیدا ہوئی تھی۔ پنجاب تک اس کا اثر
پہنچ گیا۔

آج وائسرائے نے ایک نیا حکم جاری کیا ہے کہ
خلاف قانون کام کرنے والوں یا ان کے معاونین کی
جائداد بھی ضبط کر لی جائے گی۔ اس اعلان نے بہت
ہلچل پیدا کر دی ہے۔ اس کے عمل میں اندیشہ ہے کہ
بعض شرارت طبع لوگ بے گناہوں پر بھی ظلم کر سکیں گے۔
اگرچہ وائسرائے کی یہ نیت نہیں معلوم ہوتی اور انھوں
نے اپنے بیان میں اس کی پوری تشریح کر دی ہے۔
لارڈ اروِن نے جو تمہید اس نئے حکم کے ساتھ لکھی ہے
وہ بہت طویل اور بہت موثر ہے لیکن ایک نیک دل
اور نرم طبع حاکم ہی ایسا لکھ سکتا ہے ورنہ جابر لوگ
تو جبر کرنا چاہتے ہیں تو نادر شاہ کی طرح بس ایک
لفظ بولتے ہیں جیسا کہ اس نے دہلی کے قتل عام کا
حکم دیتے وقت کہا تھا ”تا سگ نہ گزارید“
ایک کتے کو بھی زندہ نہ چھوڑو۔ . . . . . .

. . . .

قومی } آج صبح پانچ بجے مولانا کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علمائے ہند کو بھی گرفتار کر لیا گیا
پولیس کی بہت بڑی جمعیت آئی تھی اور اس نے سب
راستوں کی ناکہ بندی کر دی تھی۔ مولانا نہایت اطمینان
کے ساتھ جیل خانہ چلے گئے۔ ان کی زندگی میں یہ پہلا موقع
ہے۔ وہ بہت لائق اور نہایت سمجھدار اور سنجیدہ عالم
ہیں۔ طبیعت میں سادگی زیادہ ہے۔ ان کی وضع قطع
دیکھ کر کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ عالم ہیں۔

مہدی حسن صاحب کا حلیہ } نظام الاسلام اسکول کے ماسٹر ہیں۔ دبلے
پتلے نوجوان ہیں۔ درویشانہ انکساری رکھتے ہیں۔ ابھی
حال میں تعلیم کی سند حاصل کی ہے بہت محنت سے
پڑھاتے ہیں۔ قابلیت بھی اچھی ہے۔ ضلع میرٹھ کے
رہنے والے ہیں۔ ان کے علاقہ میں شدھی اور تبلیغ کا
میدان جنگ قائم ہو چکا ہے۔

سراج الحق صاحب کا حلیہ } یہ بھی میرے اسکول کے ماسٹر ہیں۔ پہلے اس
اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ بیمار ہو کر چلے گئے تھے۔ حافظِ
قرآن ہیں اور بہت نیک اور کم سخن مسلمان ہیں اپنے
فرائض کو نہایت عمدگی سے ادا کرتے ہیں۔

منصب علی کا حلیہ } اسکول کا چپراسی ہے۔ چالیس سال سے زیادہ عمر ہے بہت محنتی اور
مستعد مسلمان ہے۔ ایک بڑا کنبہ رکھتا ہے اور نہایت
صبر و قناعت سے گذر اوقات کرتا ہے۔ اپنے فرائض
کا پورا پابند ہے۔

محمود خاں صاحب کا حلیہ } میرے اسکول میں لڑکوں کو قواعد سکھاتے ہیں
آٹھویں دن آتے ہیں اپنے کام میں خوب ماہر اور ہوشیار
ہیں۔ قومی اسکول کے ساتھ ذاتی ہمدردی اور خلوص رکھتے ہیں۔

ہت محنت سے سکھاتے ہیں۔

میر حامد علی کا حلیہ } نگینہ ضلع بجنور کے رہنے والے ہیں۔ ساٹھ برس سے زیادہ عمر ہے۔ پینتالیس برس سے اس درگاہ میں آتے ہیں۔ حضرت صاحب تونسوی کے مرید ہیں۔ میں نے اپنے گھر میں ہوش سنبھالتے ہی ان کو آتے جاتے دیکھا۔ نو برس کی عمر میں میرے والد مجھے تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خاں لے گئے تو اس سفر میں یہ بھی ساتھ تھے۔ سیّد ہیں۔ سالک ہیں۔ مگر کبھی کبھی مجذوبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ احمد آباد منزل میں رہتے ہیں۔

تلقین حیات } بڑا بدنصیب وہ ہے جس کو بے سبب اور بے فائدہ جھوٹ بولنے کی عادت پڑ گئی ہو اور اس سے بھی بڑا بدنصیب وہ ہے۔ جو سچ میں جھوٹ ملا دیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ وہ جھوٹ سچ معلوم ہو۔

ذاتی } دو بجے تک بورڈنگ ہاؤس میں کام کیا۔ پھر دہلی گیا۔ ایک ہندو دوست سے مل کر بازار میں گیا۔ مزارات کے لئے پتھر دیکھے پھر واحدی صاحب کے ہاں آیا۔ یہاں بھی بہت سے ملنے والے جمع تھے۔ موگہ سے حکیم امام الدین صاحب بھی آئے تھے۔ ان سے باتیں کیں۔ کھانا واحدی صاحب کے ہاں کھایا۔ کھانا ان کی بڑی لڑکی زاہدہ خاتون نے پکایا تھا۔ بہت مزہ دار کھانا تھا۔ عورت کے لئے عمدہ کھانا پکانا۔ اچھا کپڑا سینا اور سلیقہ شعاری سب سے زیادہ عمدہ صفات ہیں۔ بعد مغرب گھر میں واپس آیا۔ آج حسن الدین نظامی احمد آبادی کو ایک سو پونے چھ درجے تک بخار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر صاحب کا علاج ہے۔ شام کو بخار اتر گیا۔ رات کو حسن الدین آرام سے رہا۔ خواجہ بانو نے حقیقی اولاد کی طرح اس کی خدمت کی۔ سب مرید ہم دونوں کی اولاد ہیں۔ مستری عشقی نظامی کے دونوں بچے اپنے وطن گئے ہیں۔ آج رات کو مجھے نیند بہت زیادہ آئی۔ صبح پانچ بجے بمشکل آنکھ کھلی۔ گرمی بڑھ رہی ہے حالانکہ زمانہ سردی کے بڑھنے کا ہے۔ آج پارہ ۷۶ درجہ پر تھا۔ صبح نماز کے بعد پارہ کو دیکھتا ہوں۔ جو انتہائی خنکی کا وقت ہوتا ہے۔

بقیہ صـ۳۲

(شاگرد قائم چاندپوری) اللہ یار خاں اور مرتضیٰ خاں چونکہ کم سن تھے اس لیے علی محمد خاں کی ریاست حافظ رحمت خاں (ولادت ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء) کی تحویل میں دے دی گئی تھی۔ جو بعد کو تین حصوں میں تقسیم کی گئی۔ ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء میں عبداللہ خاں اور فیض اللہ خاں قندھار سے رہائی پا گئے تو تقسیم اس طرح ہوئی کہ دو بھائیوں کو ایک علاقہ دیا گیا۔

عبداللہ خاں و مرتضیٰ خاں کو آنولہ، منورہ، بدایوں، اسبیت اور کوٹ۔

فیض اللہ خاں و محمد یار خاں کو	بریلی، اہرانتو وغیرہ
سعد اللہ خاں و اللہ یار خاں کو	مراد آباد وغیرہ

ان میں سے ہر علاقہ تقریباً ۱۳ لاکھ سالانہ محاصل کا تھا۔ یہ تقسیم ۱۱۶۶ھ میں ہوئی تھی۔ اسی سال عبداللہ خاں جلاوطن کیے گئے اور محمد یار خاں بھی ان کے ساتھ چلے گئے تو ان کا علاقہ سعد اللہ خاں کی نگرانی میں آگیا۔ ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۴ء میں یہ ملک دوبارہ تقسیم ہوا جس کے نتیجے میں مراد آباد، بجنور، سنبھل، امروہہ، کاشی پور، ٹھاکر دوارہ وغیرہ نواب دوندے خاں کو دے دیے گئے انھوں نے بسولی کو اپنا صدر مقام بنایا۔

معذرت

منادی کے کاتب صاحب کی مسلسل رخصت کی وجہ سے اس شمارے میں ۱۶ صفحات کم ہیں۔ جس کے لیے ادارہ منادی معذرت خواہ ہے۔ انشاء اللہ آئندہ اس کی کمی پوری کر دی جائے گی۔ (ادارہ)

گذشتہ سے پیوستہ

مفتاح الخزاین

حالات وملفوظات حضرت خواجہ شاہ عبدالہادی چشتی امروہوی قدس سرہٗ

(۷)

تالیف : سید نثار علی بخاری بریلوی علیہ الرحمۃ
ترجمہ وحواشی: پروفیسر نثار احمد فاروقی

نواب رفیع الدین خاں کے لیے سفارش } اس کے بعد جب شاہ عالم نے اس ضلع میں کچھ فوج بھرتی کرلی اور بعض امرا نے بھی اپنی طاعت وفرمانبرداری کا اظہار کیا، تو نواب میرن نے جو عظیم آباد (پٹنہ) کے بڑے امرا میں سے تھا سرکشی کی، جنگ کرنے کو آمادہ ہوا، بے ادبی کرنے لگا اور فتنہ وفساد برپا کرنے کی ٹھان لی۔ بادشاہ کو اس کی جانب سے دل میں تشویش تھی، اس نے دوسری بار دعا اور ہمت طلبی کے لیے آں حضرت رح کی خدمت میں خط لکھا۔ جواب میں اِس طرف سے یہ تحریر کیا گیا کہ میرن کی جانب سے دل میں کوئی خدشہ نہ رکھیں، اُسے آسمانی فوج ہلاک کرے گی۔ چنانچہ تھوڑی مدّت میں ہی یہ ظاہر ہوگیا کہ اس کی زندگی کے کھلیان پر بجلی گری اور وہ اُس سے بھسم کرگئی۔ سلطنت کے خیرخواہوں کو روز افزوں ترقی اور طرح طرح کی فتوحات نصیب ہوئیں، اور مملکت میں کساد بازاری کے باوجود کچھ رونق اور چہل پہل پیدا ہوئی۔ دولت خواہ، خریدار اور بادشاہ کے اقبال کی دعا کرنے والے خدمت میں جمع ہوگئے۔ اسی اثنا میں مرزا مذکور (اکبر علی خاں) بھی حضور شاہ میں روانہ ہوگئے۔ آں حضرت رح (شاہ عبدالہادی رح) نے رفیع الدین خاں رح کے بارے میں ــــ جو بڑے عالی خاندان سے تھے۔ اور مولوی غلام کاکی کے لیے سفارش تحریر فرمائی، اس کے ساتھ ہی پند ونصیحت کی وہ باتیں جو تقاضائے وقت کے مطابق تھیں بطور ضمیمہ درج کیں۔ مرزا مذکور کو اس کا موقع نہ ملا کہ (وہ خط) بادشاہ کے حضور میں گذاریں۔ مدّت تک آں حضرت رح کا آدمی (جو خط لے کر گیا تھا) جواب کا منتظر رہا۔ آخر جواب ملا، مرزا اکبر علی خاں نے خود عریضہ لکھ کر اسی شخص کے ہاتھ روانہ کیا، اور بادشاہ سلامت کو فرصت نہ ہونے کا حال لکھا۔ آں حضرت رح نے جب یہ غفلت دیکھی جو بدبختی کی اصل (ہوتی) ہے تو فوراً (اکبر علی خاں) کو لکھا کہ اب (میرے) ان خطوط کا (حضور شاہ میں) گذارنا موقوف رکھیں، جب پوری طرح فراغت ہوجائے گی تب کوئی مضائقہ نہیں۔ چوں کہ تقدیر الٰہی تو یہ ہوچکی تھی کہ سلطنت کے اعضاء میں ضعف اور نقاہت پیدا ہو، تھوڑے

سے عیش و عشرت نے (بادشاہ کو) اتنی سی فرصت نہ دی کہ ان نصیحتوں پر توجہ کر سکے، یہاں تک کہ وہ خطوط بھی مطالعے میں نہ آئے۔ دوسرا خط جو (پہلے خط کے بعد بھیجا گیا تھا مرزا مذکور کے پاس بجنسہ بطور امانت رکھا رہا۔ اس مدت میں، جو فوج اور جمعیت فراہم ہوئی تھی، سب تتر بتر ہو گئی، تب شاہِ عشرت پناہ کو فقیروں کی دعا اور توجہ کا خیال آیا اور حضرتؒ کی نصیحتوں کا احوال بھی یاد آیا۔ مرزا اکبر علی خاں سے اس کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے حضرت کے وہ دونوں خط (بادشاہ کی) نظر سے گذارے۔ شاہِ عالم پناہ نے اس کا جواب لکھ کر سیادت مآب سید شہامت علی خاں کے ہاتھ روانہ کیا۔

چوں کہ وقت گذر جانے والا ہے، گیا وقت اور کمان سے نکلا ہوا تیر پھر ہاتھ نہیں آیا کرتا اور اس طائفہ عالیہ و گروہ نامدار (فقراء) کی توجہات کا ہر وقت ایک ہی وضع پر رہنا دشوار بلکہ محال ہے۔ وہ خطوط جو شاہ عالم بادشاہ نے آں حضرتؒ کو جواب میں لکھے تھے یہ ہیں:

شاہ عالم ثانی کا پہلا خط

} محرمِ اسرارِ ربانی، واقفِ رموزِ سبحانی، حقائق و معارف آگاہ، خیر خواہ خلق اللہ شاہ ہادی سلمہ اللہ۔

بعد شرحِ اشتیاق، مشہودِ رائے مودت پیرائے می دارد کہ نصیحت نامۂ توجہ شمامہ مصحوبِ عرضیِ فدویِ خاص اکبر علی خان، از نظرِ مبارک گذشت، حرف بحرف بمطالعۂ اقدس درآمد۔ توجہ ایشان در حق خود تائیدِ الٰہی دانستم۔ ان شاء اللہ تعالیٰ آنچہ در بابِ عدل و انصاف و رفاہِ خلق اللہ مرقوم گردید زیادہ ازان پیش نہادِ ہمت والا است۔ حقائقِ این جا، یعنی داخل شدن بہ قلعۂ عظیم آباد، از خارج مسموع شدہ باشد۔ در بابِ استقلالِ واقعی وقتِ دعا است و در حق این نیاز مندِ درگاہِ الٰہی توجہ قلبی لازم و تا دست دادِ ملاقاتِ بہجت آیات کہ آرزوے دل مشتاق است، ہمیشہ حقائق نگارِ خیریت خود باشند۔

علم ربانی کے محرمِ اسرار، رموز سبحانی کے واقف، حقائق و معارف آگاہ، خلق اللہ کے خیر خواہ شاہ ہادی سلمہ اللہ۔

اظہارِ اشتیاق کے بعد (آپ کی) محبت بھری رائے پر واضح کیا جاتا ہے کہ آپ کا توجہ سے مہکتا ہوا محبت نامہ، فدوی خاص اکبر علی خاں کی عرضی کے ساتھ نظرِ مبارک سے گذرا، اور حرف بہ حرف مطالعۂ اقدس میں آیا۔ اپنے حق میں آپ کی توجہ کو اللہ کی تائید سمجھا۔ آپ نے عدل و انصاف اور خلق اللہ کی بہبودی کے بارے میں جو (نصیحتیں) لکھی ہیں ان شاء اللہ اس سے زیادہ ہمتِ والا کے پیش نظر ہے۔

یہاں کے حقائق یعنی قلعہ عظیم آباد میں (ہمارا) داخل ہونا وغیرہ (آپ نے) خارجی ذرائع سے سنا ہی ہوگا استقلال واقعی کے بارے میں یہ دعا کا وقت ہے اور درگاہِ الٰہی کے اس نیاز مند کے حق میں قلبی توجہ لازم ہے جب تک مسرت بھری ملاقات حاصل نہیں ہوتی جو اس دل مشتاق کی آرزو ہے، آپ ہمیشہ اپنی خیر و عافیت کی حقیقت لکھتے رہیں۔

شاہ عالم ثانی کا دوسرا خط

} حقائق و معارف آگاہا:

دعا نامۂ مرسلہ معرفت اکبر علی خان بہادر باحسن الوقت از نظرِ مبارک گذشت۔ الحمد للہ کہ قلوبِ اہل اللہ متوجہِ حالِ این نیاز مندِ درگاہِ الٰہی است۔ توجہ دلی و دعاے خیرِ ایشان در حقِ خود، زبانیِ خانِ مذکور مکرر شامل حال دانستہ، توقع کہ حالا چنین توجہ فرمایند کہ دشمنان و بدخواہانِ دولتِ خداداد منکوب و مخذول شوند و سلطنت رونق گیرد و بند و بستِ مملکت بدستورِ اسلاف استحکام پذیرد۔

والسلام۔

حقائق ومعارف آگاہ:
مرزا اکبر علی خاں کی معرفت آپ کا بھیجا ہوا دعا نامہ بہترین اوقات میں نظر مبارک سے گذرا اللہ کا شکر ہے کہ اہل اللہ کے دل درگاہ الٰہی کے اس نیازمند کے حال کی طرف متوجہ ہیں۔ خان مذکور کی زبانی آپ کی دعائے خیر اور توجہ دلی کو مکرر اپنے شامل حال جان کر یہ توقع ہے کہ اب یہ دعا فرمائیں کہ سلطنت کے دشمن اور بدخواہ مغلوب اور ذلیل ہوں اور سلطنت کو رونق ملے، ملک کا انتظام اسلاف کے طریقے پر استحکام حاصل کرے۔ والسلام۔

شاہ عالم ثانی کا تیسرا خط } تاجدار ملک حقیقت، تخت نشین

اقالیم طریقت رموز دان کونی والٰہی حضرت کرم گستر،
پیوستہ در یادِ ربانی بودہ مشغول بدعوات نیازمندان باشند۔
ازاں جا کہ بفضل لایزال افتتاح ابوابِ مقصودِ دارین، ومفتاحِ بہبودِ کونین بیدِ قدرتِ کاملہ وحکمتِ بالغۂ درویشانِ عالمیان داشتہ است، لہذا مستدعیِ دعوات دارین ولا شہامت مرتبت سید شہامت علی خان را بہ خدمت کیمیا خاصیت فرستادہ متفضلے بدعوات این نیازمندِ درگاہ الٰہی قسمے مبذول شود کہ بتوجہ عالی بمقصودِ خود کامیاب گردد، وتفضل نامہ کہ مرحمت شدہ بود تا حالت تحریر رقیمۂ نیاز ورود کرامت نفرمودہ است، ہرگاہ کہ ورود خواہد فرمود موافقِ آن بہ عمل خواہد درآمد زیادہ والسلام۔
ملک حقیقت کے تاجدار، طریقت کی اقلیموں کے تخت نشین کونی اورالٰہی رموز کے جاننے والے حضرت کرم گستر۔
ہمیشہ یاد الٰہی میں رہتے ہوئے (ہم) نیازمندوں کے لیے دعا میں مشغول رہیں۔
چوں کہ (خدائے) لایزال کے فضل سے مقاصدِ دارین کے دروازوں کا کھلنا اور کونین کی بھلائی کی کنجیاں دنیا کے درویشوں کی حکمتِ بالغہ اور قدرتِ کاملہ کے ہاتھوں میں رکھی گئی ہے، لہذا دعاؤں کا یہ خواستگار اِس وقت شہامت مرتبت سید شہامت علی خاں کو آپ کی صحبتِ کیمیا خاصیت میں بھیج کر چاہتا ہے کہ دعاؤں کی نوازش اِس نیازمندِ درگاہِ الٰہی کے حق میں اِس طرح مبذول ہو کہ آپ کی توجہ عالی سے (راقم بادشاہ) اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔ اور عنایت نامہ جو مرحمت ہوا تھا وہ اِس رقیمہ نیاز کی تحریر کے وقت تک نہیں ملا ہے، جب آئے گا تو اُس کے موافق عمل کیا جائے گا۔ زیادہ والسلام۔

جنگ شکرتال } شاہ عالم پناہ اِن خطوط کو بھیجنے کے بعد ملکِ بنگالہ سے نکل کر

الہ آباد میں داخل ہوئے اور کچھ مدت وہاں بسر کرنے کے بعد چکلہ کوڑا (جہان آباد) کی جانب عنانِ عزیمت موڑی آں حضرتؒ نے دوندے خاں سے، جو روہیلہ سرداروں میں مستقل مزاج (شخص) تھا دریافت فرمایا کہ اگر تم بادشاہ کا ساتھ دو تو دارالخلافہ شاہ جہان آباد میں (شاہ عالم) بادشاہ کے طلب کیے جانے کے بارے میں (بادشاہ کو) کچھ لکھا جائے دوندے خاں نے حالات کو دیکھتے ہوئے آں حضرتؒ کا مشورہ قبول کر لیا۔ آپ نے بادشاہ کو لکھا کہ دارالخلافہ (دہلی) کا ارادہ کرنا مبارک ہے۔ بادشاہ شاہ جہان آباد (دہلی) کی جانب سفر کر رہا تھا کہ اسی زمانے میں مرہٹوں کی فوج نے نواب نجیب الدولہ کے فرزند ضابطہ خاں کے خلاف جنگ چھیڑ دی، اور بادشاہ بھی اپنے سارے لاؤ لشکر کے ساتھ مرہٹوں کی فوج میں شامل ہو گیا۔ کارگزارانِ قضاوقدر کی مشیت سے اُسی زمانے میں نواب دوندے خاں اِس ملک فانی کی حکومت چھوڑ کر ملک جاودانی کو

ت کر گئے۔ ان کے بیٹوں میں سے کسی میں بھی ریاست
اہلیت، تمیز اور مردم شناسی نہیں تھی کہ وہ خان مرحوم
جگہ بیٹھ سکیں۔ سید اسد اللہ خاں (میر کلوؒ) نے (حضرتؒ
) عرض کیا کہ اب بادشاہ کو کچھ نہ لکھنا چاہیے کیونکہ
میں سے کوئی بھی اعتماد کے قابل نہیں ہے۔ آں حضرتؒ
بھی اس طرف سے تغافل اختیار کر لیا۔ جب
بیٹوں نے اس ملک کو خوب لوٹا کھسوٹا تو غریبوں
حرمت و ناموس کے خیال نے آں حضرتؒ کو اس پر
ور کیا کہ (یہ احوال) شاہ کی خدمت میں ظاہر کر کے
بلا کو ملک سے دفع کیا جائے۔ اس بار پھر ایک
لاف نامہ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ بادشاہ نے آپ کے
لا کے) خیر خواہی سے بھرپور مضمون کو ملاحظہ فرما کر
ر الخلافہ (دہلی) کی جانب کوچ کیا، اور رأس حفظ کا جواب
ہلی سے تحریر کر کے بھیجا۔ مگر حضرتؒ کے نصیحت آمیز
ات پر استقامت کے ساتھ عمل نہ کرنے کے باعث
لطنت کا کاروبار حسب مراد صورت اختیار نہ کر سکا۔

فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست

یَفْعَلُ اللہُ مَا یَشَاءُ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ (اللہ
چاہتا ہے وہی کرتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے ویسا
حکم دیتا ہے)

سولی میں درویشوں کا جمگھٹ روایت ہے کہ جب آں حضرتؒ
سولی میں تشریف فرما تھے، چاروں طرف سے بہت
ے مشائخ اور درویش اپنی مراد حاصل کرنے
ر اسباب معاش فراہم کرنے کی امید پر وہاں
ئے ہوئے تھے اور (نواب سے) ملاقات اور بات
نیت کے وقت ہر ایک دُون کی لیتا تھا اور اپنی
زرگی کی دھاک جمانے کی دھن میں لگا ہوا تھا۔ مگر
دوندے) خاں کے دل میں کسی کے لیے التفات اور
عتقاد کا نقش نہیں بیٹھتا تھا، اس لیے ان
رویشوں کے دلوں میں کدورت اور رنجش پیدا
ہو چکی تھی۔ آں حضرتؒ نے بھی ملاقات نہ کرنا ہی غنیمت جانا۔
اسی زمانے میں نواب دوندے خاں کو دورے پڑنے لگے۔
(غشی کی) یہ کیفیت دو تین ماہ میں کبھی ہو جایا کرتی تھی۔
تمام طبیبوں نے علاج معالجے میں اپنی جالینوسی حذاقت
اور افلاطونی مہارت صرف کر دی، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ
نے اس بیماری کو مرض الموت بنا دیا تھا، کسی کی ایک تدبیر
بھی کارگر نہ ہوئی، کیونکہ طب کی کسی کتاب میں موت کا علاج
نہیں ہے۔ فقیروں کی جماعت بھی دن رات دعائے صحت و عافیت
میں مصروف تھی۔ جب خان نے اس بارے میں آں حضرتؒ
سے رجوع کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ فقیر بھی دعائے خیر سے
غافل اور بے پروا نہیں ہے، اگر حکیم علی الاطلاق جلّت
حکمتہٗ (یعنی اللہ تعالیٰ) کا فضل شامل حال ہے تو ضرور
شفا ہو گی مگر تقدیر الٰہی اس کے خلاف یہ ہو چکی تھی کہ
دعا اور دوا دونوں بے اثر ہو جائیں، اس لیے کسی کا کوئی
اثر ظاہر نہ ہوا، اور وہاں دوروں پر دورے پڑتے
رہے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ خان مذکور نے اقلیم فنا
کی طرف (کوچ کی) نوبت بجادی اور درویشوں نے
آں حضرت (شاہ عبدالہادیؒ) کے بارے میں طعن و تشنیع
کے کلمات کہنے شروع کر دیے۔ انھوں نے حضرت کے
بارے میں بعض بہت گھٹیا باتیں کہیں، یہ بھی کہا کہ چونکہ
(دوندے) خان نے (دعا کے لیے) ہم سے رجوع نہیں کیا
اس لیے ایسا ہوا (کہ موت واقع ہو گئی)۔ آں حضرتؒ
نے فرمایا کہ صرف ہم ہی تنہا دعائے صحت میں مصروف
تھے اور تم سب (درویشوں کی جماعت) بارگاہ مجیب الدعوات
میں اس کے خلاف درخواست کر رہے تھے، اس لیے
تمہاری دعائیں قبول ہو گئیں۔ غرض ہر شخص بے مزگی اور
سفلہ پن کی باتیں زبان پر لانے لگا۔

بسولی سے واپسی آں حضرتؒ نے وہاں (بسولی) کا قیام ترک
کر دینا ہی مناسب سمجھا اور بلاری کی جانب تشریف
لے گئے۔ آپ کی زبان مبارک سے نکلا: "بس اب تم

سب بسولی میں ہی رہ گئے"۔ اتفاق ایسا ہوا کہ دو سال یا کچھ کم و بیش کے بعد مرہٹوں نے اس ملک پر چڑھائی کی اور وہ ساری جمعیت تتر بتر ہو گئی۔ ہر شخص کا حضورِ قلب پریشانی و پراگندگی میں بدل گیا۔ ہر ایک نے کسی نہ کسی طرف بھاگ کر پناہ ڈھونڈی۔ یہاں تک کہ جب اس تباہی اور انتشار کے چند روز اس ملک کے حاکموں کے کارخانے پر گذرے، تو جامع کمالاتِ صوری و معنوی مولوی محمد احسن خاں، جو بریلی کے بڑے رئیسوں میں سے تھے، اور وہی بریلی میں آں حضرت کی تشریف آوری کا سبب بنے تھے، اس کا تذکرہ اپنے موقع پر تفصیل سے کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ انھوں نے گہرے قلبی تعلق اور اعتقاد کی بنا، پر، جو انھیں آں حضرت سے تھا، اس پریشان حال قوم کی سفارش کا دل میں خیال کر کے آں حضرت کی خدمت میں بہت مبالغے کے ساتھ التجا کرتے ہوئے لکھا کہ اب ان نااہلوں کی غلطیوں کو معاف اور صفحۂ خاطر سے صاف کر دیا جائے، اور اپنی ہمتِ عالی کو روہیلوں کی آبادی اور اس ملک میں اُن کے اقتدار کی بحالی کی جانب مبذول فرمائیں۔ آں حضرتؒ نے ان کی التجا کے سبب سے اُن ساری (پچھلی) باتوں کو صفحۂ خاطر سے محو کر دیا اور ان لوگوں (روہیلوں) کی واپسی کی دعا میں مصروف ہوئے چنانچہ سب روہیلہ سردار دامنِ کوہ (ہمالیہ) کو چھوڑ کر (پھر) اپنے وطنِ مالوف میں آ گئے اس کے بعد پھر درویشوں کی وہ پراگندہ ٹولی اپنی فقیری کا دعویٰ لے کر بسولی میں جمع نہ ہوئی۔

بلاری میں قیام } روایت ہے کہ جب آں حضرت موضع بلاری میں رونق افزا ہوئے تو بہادر خاں، جو نواب علی محمد خاں کے متوسلین میں سے تھے ان کے اہل و عیال نے حضرت کی خدمت گذاری کو اپنی سعادت کا سرمایہ سمجھ کر اپنی کمرِ ہمت مضبوطی سے باندھ لی۔ اسی موضع میں ایک ایک افغان جشان خان نامی نے ریاست پیدا کر لی تھی اور بہت سا مال و منال اور اسباب معیشت فراہم کر لیا تھا۔ اس نے سود خوری کو اپنی دولت مندی اور زر اندوزی کا وسیلہ بنا رکھا تھا، اپنی ساری کوشش وہ اس بارے میں صرف کرتا تھا جو فی الحقیقت گادھری جوہڑ کا حکم رکھتی تھی۔ جب وہ آں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو (آپ کی) کچھ خدمت کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ آں حضرتؒ پہلے ہی اس کا سب احوال اچھی طرح سن چکے تھے آپ نے اس کے مالِ حرام میں سے اپنے لیے کچھ لینا قبول نہ کیا۔ جب اس نے بہت ہی گڑگڑا کر التجا کی، اور بہت ہی عاجزی و نیازمندی کا اظہار کیا تو آں حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنے لیے حرام مال لینا جائز نہیں سمجھتا اور تم نے اس ڈھنگ سے یہ سب دولت جمع کی ہے۔ آپ کی زبانِ مبارک کی تاثیر نے اسے توبہ کی توفیق بخشی، اُس نے اپنی پچھلی حرکتوں سے استغفار کیا۔ اس کے باوجود حضرت کی زبانِ مبارک سے نکلا کہ جو کچھ دھن تم نے جوڑ رکھا ہے اس میں سے کچھ بھی تمہارے پاس رہے گا نہیں، سب برباد ہو جائے گا۔ جشان خان نے یہ اشارہ سمجھ لیا اور آپ کی خدمت گذاری میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ دن رات خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ یہاں تک کہ عالمِ مثال میں، جو حسنِ شہود کا عالم، اور واقعات کے پرتوِ ورود کا محل ہے، مرہٹوں کی فوج کا آنا اور روہیلوں کا تباہ و برباد ہونا حضرت ارشاد پناہی (شاہ عبد الہادیؒ) کو از روئے کشف معلوم ہوا۔ آپ نے اطلاع دینے کے لیے جشان خاں سے فرمایا کہ اِس ملک پر بھاری فوج چڑھائی کرنے والی ہے، مصلحت یہ ہے کہ تم یہاں سے بچ کر نکل جاؤ اور کسی ایسی جگہ جا کر جہاں تمہاری قوم کے لوگ (زیادہ) بس رہے ہوں، اُن کے شریکِ رفاقت ہو جاؤ۔

روہیلوں کی تباہی } اس نے کہا، کہ حضرت کی

ذاتِ مبارک کی توجہ سے مجھے اسی جگہ بلاؤں سے حفاظت مل جائے گی۔ آپ نے فرمایا کہ نزولِ بلا کا باعث اسی موضع میں ہے، جس کے ہاتھ سے ایک زمیندار کا قتل ہوگیا تھا آں حضرت کی ہدایت اور صلاح پر کاربند نہ ہوکر وہ (جمشان خاں) وہیں مقیم رہا، اور اس بات کو سہل سمجھ کر کسی دوسری جگہ چلے جانے کا ارادہ نہ کیا۔ تین ماہ کی مدت گذرنے کے بعد نواب ضابطہ خاں نے مرہٹوں سے، جن کا شریک شاہ عالم بادشاہ بھی ہوگیا تھا، شکست کھا کر دامنِ کوہ (ہمالیہ) میں پناہ لینے کا ارادہ کیا۔ تمام روہیلہ سرداروں نے اور وضیع و شریف افغانوں نے صلاح وقت اسی میں دیکھی کہ دامنِ کوہ میں پناہ لیں، چنانچہ ایسا ہی کیا۔ اس وقت جمشان خان خوابِ غفلت سے بیدار ہوا اور اپنے بارے میں آں حضرتؒ سے صلاح طلب کی۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارے متعلقین کو سنبھل پہنچا دیا جائے گا، تم خود دامنِ کوہ کی جانب روانہ ہوجاؤ اور اپنی قوم سے جاملو۔ آپ نے ایک تعویذ لکھ کر اُسے دیا کہ اسے اپنی پگڑی میں رکھو تاکہ تمہیں کسی سے کوئی گزند نہ پہنچے۔ مگر جاتے ہوئے چالیس قدم تک پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا، اور اگر کوئی راہ زن تمہارا راستہ روکے اور دامن گیر ہو تو تلوار سونت کر اس کے مقابل ہوجانا۔ جمشان خاں نے اس حرزِ جاں (تعویذ) کو چوما سر پر رکھا اور حضرتؒ کی ہدایت پر کاربند ہوکر دامنِ کوہ کا رخ کیا، جو بھی اس کے راستے میں آیا وہ موت کے گھاٹ اترا، یہ بغیر کسی روک ٹوک کے سلامتی سے نکل گیا۔ اس کے متعلقین کو سنبھل بھیج دیا گیا۔

شہامت علی خاں منقول ہے کہ سید شہامت علی خاں جو سرسی کے معزز سادات میں سے تھے اپنے بچپن کے زمانے سے ہی آں حضرت کی خدمت سے مستفید ہوتے رہے تھے۔ ان کی انتہائی تمنا تھی کہ حضرت کی عنایت والطاف کی نسیم، اور نوازش و توجہ کی آبیاری سے اُن کی حالت کا پودا سرسبز و شاداب ہوجائے، اس میں فراغت اور خوش حالی کے پھل آجائیں۔ انھیں شاہ عالم بادشاہ۔ انار اللہ برہانہٗ۔ کی سرکار سے نوکری کا پروانہ اور پرگنہ مذکور (سرسی) کی جاگیر مل جائے۔ اس کے بعد کرامت خاں کی وساطت سے۔ جو حضرتؒ کے خاص خادموں میں سے تھے۔ یہ درخواست خدمتِ اقدس میں گذارتے رہتے تھے، اس درخواست کے ساتھ یہ وعدہ بھی درمیان میں تھا کہ اگر یہ مرادیں حاصل ہوگئیں اور ان توقعات نے صورتِ وقوعی اختیار کرلی، تو موضع براہی، جو آں حضرت کا محلِ قیام ہے، خادمانِ حضور کے مصارف کے لیے وقف کردیا جائے گا۔

کلہاڑی کا قصّہ چونکہ اہل اللہ کی توجہات کی قوتِ نامیہ اشجارِ توقعات کی نرتی و سرسبزی میں معاون ہوتی ہے، چند ہی روز میں سید مذکور کی شاخسارِ مراد میں پھل آگئے، اور تمنا کا پھول کھل گیا یعنی پرگنہ سرسی انھیں بادشاہِ وقت کی نوکری کے ضمن میں بطورِ جاگیر مل گیا، اور آں حضرت کی دعا کارگر ہوئی۔ مگر وہ جو وعدہ درمیان میں تھا اُسے سرد مہری کے ہجوم اور مشاغل کی کثرت نے خزاں رسیدہ پتے کی طرح ان کے درختِ خیال سے گرادیا، وہ ساری حاضرباشی اور خلوص ارادت کم خدمتی اور حاضری کی قلت میں تبدیل ہوگیا۔ اس سے قطع نظر، ایک نیا گُل یہ کھلا کہ جب باغبانِ حقیقی نے چاہا کہ ان کے نہالِ اقبال کو ادبار کی آندھی سے نقصان پہنچائے اور ان کی حشمت و اجلال کے ثمردار درخت کو نکبت اور ذلت کی کلہاڑی سے کاٹ ڈالے تو اتفاقاً سید مذکور کے نوکروں میں سے کوئی براہی کے باشندے ایک بڑھئی کی کلہاڑی ظلم اور دھونس کے ساتھ چھین کر لے گیا۔ کرامت خاں نے یہ سوچ کر کہ سید (شہامت علی خاں) کو حضرت سے عقیدت

و نیازمندی کا جو تعلق ہے اس کی کچھ اصل ہے، بڑھئی کی مدد کرنے کے خیال سے، بطور سفارش سید موصوف کے پاس جاکر یہ ماجرا بیان کیا۔ مگر اس دو روزہ قوت وحشمت کے بل پر جو محض فرعی ہے، اس نے یہ بات گوشِ ہوش سے نہ سنی اور ایسا (کڑوا) جواب دیا جس میں (حضرت کی شان میں) گستاخی کا پہلو بھی تھا کرامت خاں نہایت بدمزہ ہوکر اور اپنا سامنہ لے کر وہاں سے واپس آگئے، اور یہ سب احوال آں حضرتؒ کی خدمت میں گزارش کیا۔ آپ کی زبان مبارک سے نکلا کہ "اس کلہاڑی کی واپسی کی درخواست نہ کرنی چاہیئے، اُسے وہیں (شہامت علی خاں کے پاس) رہنے دیا جائے، کیونکہ کلہاڑی کاٹنے اور ڈھانے کا آلہ ہے، یہ اُن کی دولت (کے درخت) کی جڑ کاٹنے اور ثروت کی بنیاد کھودنے کے لیے ان کے گھر گئی ہے"

اتفاق ایسا ہوا کہ اُسی زمانے میں نواب کی تمام جاگیر اور سب گھریلو ساز و سامان ضبط کر لیا گیا، اور وہ بیک بینی و دو گوش نوکری سے نکال دیئے گئے، حتیٰ کہ ان کے گھر میں اس کلہاڑی کے سوا اور کوئی چیز باقی نہ بچی۔ سید مذکور نے اِس حالت میں کہ نہایت غم زدہ و دل شکستہ ہو رہے تھے اور سینہ غم سے فگار تھا، خارستانِ فنا کی راہ لی۔ وہ کلہاڑی کسی سلسلے میں اُن کے گھر سے بدھو خاں کے گھر گئی جو اُس پرگنہ (سرسی) کے عامل تھے، وہاں اس کی دولت کی بیخ کنی کا سبب بھی یہی کلہاڑی بنی۔ چنانچہ اس کلہاڑی کا قصہ اس علاقے میں خاص و عام کی زبان پر ہے۔ اس سے سنگ دل لوگوں کو عبرت ہوتی ہے اور اہل عقیدت کی نیازمندی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

دیدۂ کور کو کیا آئے نظر } منقول ہے اس زمانے میں جب سید شہامت علی خاں کی جانب سے آپ کے دل میں ملال اور گرانی تھی، ایک دن سید مذکور محمود پور کے دروازے سے نکلے۔ آں حضرتؒ بھی اس روز وہاں سید داؤد کے مقبرے میں فروکش تھے، جو وہیں (محمود پور میں) واقع ہے۔ اُن (شہامت علی خاں) کے آنے کی خبر پاکر آں حضرتؒ اپنی جگہ سے اُٹھے اور صحرا کی طرف چل دیئے، اگرچہ سید مذکور قریب ہی (کھڑے) تھے لیکن آں حضرتؒ کے (روحانی) تصرف سے ان کی بصارت پر ایسا پردہ پڑ گیا کہ انھوں نے (حضرت کو) ہرگز نہ دیکھا۔ اپنے نوکروں سے پوچھا کہ حضرتؒ کہاں تشریف رکھتے ہیں؟ ملازم نے کہا کہ وہ سامنے کھڑے ہیں، نواب ہرچند آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا مگر بصارت کام نہ کرتی تھی، کیونکہ مستورانِ حجابِ الٰہی کو بدبین لوگوں کی نگاہیں دیکھ نہیں سکتیں وہ اپنا مقصود حاصل کیے بنا اپنے گھر کو لوٹ گیا۔ اس خرقِ عادت کے ظہور سے آں حضرت کے روحانی تصرف کا پورا ثبوت مل گیا۔ الحمدللہ علیٰ ذالک

آئی موج فقیر کی } منقول ہے، اور اس بات کی تائید شاہ حسینؒ کے قصے سے بھی ہوتی ہے۔ جو ولایت افغاناں (افغانستان) کے سادات اور بڑے لوگوں میں سے تھے، افغانوں کے تمام سردار شاہ مذکور کو اپنا پیر و مرشد مانتے تھے اور شاہ حسین کو آں جناب (حضرت شاہ عبدالہادیؒ) سے بیعت و ارادت کی نسبت تھی۔ کمال تقویٰ و طہارت اور باطنی قوت سے موصوف تھے۔ ادب کے زیور سے ایسے آراستہ تھے اور ان کے اوقات ایسے گذرتے تھے کہ آں حضرت جس سمت میں ہوتے تھے وہ ہرگز اُس طرف اپنی پشت نہ کرتے تھے، اور جو کوئی آں حضرتؒ کی خدمت میں نیازمندی اور عقیدت سے پیش آتا تھا، اس سے سید مذکور انتہائی خوش ہوتے تھے۔ آں حضرتؒ نے اِس فرقے (روہیلوں) کے معاملات کا انتظام اور بندوبست ان کے سپرد کر رکھا تھا کہ اہلِ باطن کو اس بارے میں دخل و تصرف ہوتا ہے، انھیں ظاہری حاکموں اور اہل مجاز کے عزل و نصب کرنے کے لیے بھی مطلق اجازت

ے رکھی تھی۔

ایک دن کوئی بات معمول کے خلاف ہوئی اور
رداران بسولی میں سے کسی نے ترکِ ادب کیا شاہ حسین
ں حالت جذب وغضب پیدا ہوگئی اور وہ اپنا لباس
ھونک دینے پر تُل گئے۔ ہر چند آں حضرتؒ نے منع
کیا، مگر انھیں ایسا غصہ چڑھا ہوا تھا کہ انھوں نے
ں حضرت کی بات بھی نہ سنی اور اپنے خرقہ ولباس
غیرہ کو دوندے خاں کی حویلی کے دروازے پر رکھ کر
جلا دیا۔ اسی حالت میں اپنی ولایت (افغانستان)
کی جانب، جو ان کا وطن بھی تھا، روانہ ہوگئے۔ انھوں
نے (افغانوں کے) اس ملک سے نکالے جانے کی بددعا
بھی دی۔

کہتے ہیں کہ کڈھو نام
دُربَل بامہن مت لوٹو} کا ایک ہندو موضع
کیسرپور کا رہنے والا تھا، اُسے نصرت خاں نے جو
نواب فیض اللہ خاںؒ کی طرف سے پرگنہ شاہ آباد
علاقہ رام پور کا حاکم تھا، مال گذاری کے حساب میں
خورد برد کرنے کے الزام میں قید بامشقت میں
ڈال دیا۔ بظاہر اس قید سے اس کی رہائی دشوار
بلکہ محال معلوم ہوتی تھی۔ چوں کہ جن کے کام بند ہوں
اُن کے گرہ کشا (اللہ) نے ان بند تالوں کی کنجی اپنے
اولیاء کی دعاؤں سے وابستہ کر دی ہے، اُس قیدی
کا بیٹا جس کا نام بدھی چند تھا آپ کے تصرفات اور
خرقِ عادات کی شہرت سن کر اپنے عقدۂ مشکل کا حل
تلاش کرنے کے لیے بریلی آیا اور کرامت خاں کے
وسیلے سے اپنی بے چارگی و درماندگی کا حال آپ کے
حضور میں بیان کیا اور آپ کے گوشۂ چشم عنایت سے
امداد واعانت کی التجا کی۔ اس کے عجز والحاح کو دیکھ کر
آں حضرت کی بخشایش کا سمندر جوش میں آگیا
اور اس لاچاروں کی مشکل آسان کرنے والے (حضرت)
کی زبان مبارک سے نکلا: "اسی وقت اپنے گھر جاؤ
اور کارسازِ حقیقی کی قدرت کا تماشا اپنی آنکھ سے دیکھو۔"

بدھی چند یہ بشارت بھرا اشارہ پاکر اپنے گھر
کو واپس آیا تو دیکھا کہ اس کا باپ شاداں وفرحاں
اپنے گھر پہنچ چکا ہے۔ اس نے اپنی خلاصی اور رہائی کا
حال، جو کچھ گذرا تھا وہ سنایا کہ آدھی رات کو دفعۃً پانو
میں پڑی ہوئی بیڑیاں خود بخود نکل گئیں۔ میں نے یہ
حال دیکھ کر جان لیا کہ کسی صاحب کمال (درویش)
کی توجہ میرے حال پر ہوئی ہے۔ علی الصباح نصرت خاں
خود جیل کے دروازے پر آیا اور آواز دے کر مجھے باہر
نکلوایا، پھر نہایت مہربانی اور الطاف سے مالا مال
وسرفراز کیا اور مجھے اسی وقت گھر جانے کے لیے رخصت
دے دی۔

اس (داستان کو سننے) کے بعد اس کے بیٹے
نے آں حضرت کی دعا کی حقیقت بیان کی اس کے باپ
نے اور دوسرے رشتہ داروں نے آپ سے عقیدت
و نیازمندی کی زُنّار اپنی جان ودل کی کمر میں باندھ لی۔
دوسری بار پھر، کچھ زمانہ گذرنے کے بعد، وہ ہندو قید
کر لیا گیا۔ بدھی چند پھر آں حضرت کی عنایت کی اُمید
لے کر خدمت میں حاضر ہوا کہ اس سے بہتر پناہ گاہ
اور جائے امن اُس کے لیے کوئی نہ تھی۔ حضور میں آکر
(باپ کے دوبارہ) قید ہونے کا ماجرا بیان۔ اس بار
اس کے آنے سے پہلے ہی حضرت کے خاطر مبارک میں
اس کا خیال گذرا تھا اور آپ نے اس کے حق میں
دعا فرمائی تھی (اس بار)۔ یہی ارشاد ہوا کہ میں نے
ابھی ابھی اس کے لیے دعا کی ہے اور آپ نے ہندی زبان
میں کچھ دوہے لکھ کر دیے کہ ان کا ورد کرنا چاہیے
ان شاء اللہ اثر ظاہر ہوگا۔ بیٹے نے اُس پر عمل کیا۔
اللہ تعالیٰ نے اُن کلمات کی برکت سے اُسے دوسری بار
بھی قید سے رہائی دے دی۔ وہ کلمات یہ ہیں۔ (ہندی):

پربھو دُربَل بامہن مت لوٹو رے
پھاٹ پَدَر یا، میلی دھوتی، ہاتھ کھپر پھوٹو رے

چنکی چوُن، ماٹی کا ٹیکا، سکت جنیو توڑرے
آئی پڑی جب جم جی سینتن ہادی کب جی چھوڑرے

منقول ہے کہ نصرت خاں آپ کے

تبرّک کی برکت } بابرکت حالات سن کر حاضر ہونے
اور استفادہ کرنے کا بہت مشتاق تھا اور اکثر اوقات
اس کی تمنا کرتا تھا کہ حضرتؒ کے پاک قدموں کی دھول
کو اپنی حرماں دیدہ آنکھوں کا سرمہ بنائے، اس لیے
آں حضرت کی توجہ اور عزیمت کے لیے بارہا کرامت خاں
کے پاس پیغام بھیجتا تھا اور کرامت خاں اُس کے
اشتیاق و تمنا کا تذکرہ حضور پُرنور سے کیا کرتے
تھے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ اس کے حسنِ نیت اور
صفائے عقیدت نے کام کیا کہ آں حضرت کا گذر اس
کے گھر کی طرف سے ہوا۔ وہ نہایت نیازمندی،
عاجزی اور ادب و انکسار کے ساتھ پیش آیا، اور
جتن شاہ کے وسیلے سے جو حضرت کے خدّام میں سے
تھے، یہ عرض کیا کہ اس آرزومند کے دل میں اولاد
کی تمنا کروٹیں لیتی ہے اگر اس خوشی سے بھرپور
دولت کے حصول کے لیے (حضرت) توجہ فرمائیں اور
دعا کریں تو بقیہ عمر حضرت کے آستانے پر بندگی
میں گذاروں گا۔ آں حضرت نے اُسے کوئی چیز دی اور
فرمایا کہ اِس کو اپنے پاس محفوظ رکھو، کارسازِ حقیقی
تمھیں اولاد کے وجود سے عزت بخشے گا۔ اللہ کی عنایت
اور رموزِ سرمدی سے واقف اِس (ولی اللہ) کی
توجہ سے اُس کے دو بیٹے پیدا ہوئے، ایک کا نام
شجاعت خاں اور دوسرے کا فیض محمد خاں رکھا۔
انھیں جو خدم و حشم، جاہ و ثروت، آپ کے
فیض رساں قدموں کی بدولت حاصل ہوئی اُس کا
کیا بیان ہوسکتا ہے۔ جو چیز آں حضرت نے بطور
تبرّک عطا فرمائی تھی وہ اِسی طرح ان کے گھر میں
امانت تھی اور اُس کی برکت سے وہ مدت العمر
آفات و حادثات سے محفوظ و مامون رہے۔ نواب

فیض اللہ خاں کی وفات کے بعد جب ان کے فرزندوں
میں کشت و خون ہوا، اور نواب آصف الدّولہ نواب
(فیض اللہ خاں) مرحوم کے بیٹے غلام محمد کی تنبیہ کے لیے خود اس
ملک میں آئے، جنھوں نے ریاست (حاصل کرنے) کے لیے
ناحق اپنے بڑے بھائی محمد علی خاں کو قتل کردیا تھا، تو
روہیلوں کی جمعیت میں بہت پریشانی اور تباہی مچی۔
اسی زمانے میں وہ تبرّک نصرت خاں کے بیٹوں کے گھر
سے غائب ہوگیا اور اب ان کی خوش حالی اور
فلاح کے اس وسیلے کے گم ہوجانے کے بعد ان کے حالات
بہت تکلیف اور ادبار میں گذر رہے ہیں۔
مَاشَاءَ اللّٰہ کانَ۔

منقول ہے کہ

پنّاں نام کی نوبت باجے } حافظ غلام نام
مراد آباد کے نمایاں لوگوں میں سے تھے۔ ابتدائے حال میں
ترک و تجرید اور ذوق وجدان اُن پر غالب تھا۔ اپنے
رشتہ داروں میں کسی سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔
اُن کی روزی کا ذریعہ اناج پیسنے کی مزدوری تھی۔ جو بھی
گیہوں لاتا تھا اُسے آٹا پیس کر دے دیتے تھے اور
مزدوری میں بس ایک پیسہ لیتے تھے، اُسے اپنے کھانے
میں خرچ کرتے تھے، اور لباس میں بس اس پر اکتفاء
کرلیا تھا کہ سر کے اوپر کچھ بہت پرانے چیتھڑے
بطور دستار لپیٹ لیتے تھے اور اسی طرح کمر پر بھی باندھ
لیتے تھے۔ انھوں نے لباسِ عریانی سے موافقت کرلی
تھی اور خود کو اس لباسِ بے لباسی میں چھپائے رکھتے
تھے۔ وہ اربابِ نشاط میں سے ایک عورت پنّاں نامی
پر عاشق ہوگئے، وہ اِن کی طرف ہرگز التفات نہ کرتی تھی
بلکہ ان سے نفرت کرتی تھی۔ حافظ مذکور آں حضرت کی
خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے
پنّاں کی جانب اپنے میلانِ خاطر کا تذکرہ کیا اور حضرت
سے درخواست کی کہ پنّاں کا التفات اُن کی جانب
ہوجائے۔ آں حضرتؒ نے ہندی کے یہ چند کلمات

حافظ مذکور سے ارشاد فرمائے اور کہا کہ انھیں گا کر پڑھو، دلوں کو پلٹنے والا (اللہ) اس کے قلب کو تمہاری طرف مائل کر دے گا۔ حافظ مذکور فن موسیقی میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے، انھوں نے ان کلمات کی دھن بنا کر اپنا ورد کر لیا، چند دنوں کے بعد حضرت کے ارشاد کی تاثیر ظاہر ہوئی کہ پنّاں ان کی نہایت مطیع و تابعدار ہوگئی، اور حافظ مذکور بقیہ عمر "حافظ پنّاں" کے نام سے مشہور رہے۔ حضرت کے ارشاد کیے ہوئے وہ کلمات یہ ہیں:

ھندی

پنّاں نام کی نوبت باجے: جھانکڑ جھانکڑ
اِس دنیا میں دو میوے، اِک املی ایک گنّاں
وہ شکر وہ پاکی اِملی، ملیں تو ہووے پنّاں
ناہیں کون کہے گا پنّاں!

(جاری ہے)

حواشی

لہ نواب حاجی فریدالدین خاں فاروقی مرادآبادی (ولادت ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۲ء) بن نواب فریدالدین خاں بن نواب عظمت اللہ خاں فاروقی، (وفات ۱۱۶۵ھ) حضرت شاہ عبدالہادی کے نہایت عقیدت مند اور غالباً ان سے چشتی سلسلے میں بیعت کی نسبت بھی رکھتے تھے۔ قادری سلسلے میں حضرت شاہ محمد غوث قادری (متوفی ۱۱۵۲ھ/ ۱۷) کے مرید تھے۔ انھیں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی) سے تلمذ کا شرف بھی حاصل تھا۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں دہلوی سے بھی گہرے مخلصانہ و نیاز مندانہ تعلقات تھے مرزا صاحب مرادآباد میں انھیں کے مہمان ہوتے تھے۔

حدیث، تفسیر، فقہ، تصوف، تاریخ وغیرہ علوم میں ماہرانہ دستگاہ حاصل تھی۔ ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء میں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تھے یکم ربیع الثانی ۱۲۰۳ھ/ ۳۰ دسمبر ۱۷۸۸ء کو دو سال، دو ماہ، دو ہفتے کے بعد واپسی ہوئی تھی انھوں نے اپنا سفرنامہ حرمین بھی فارسی زبان میں لکھا تھا جس کا اردو ترجمہ ضروری حواشی کے ساتھ حضرت مولانا نسیم احمد فریدی علیہ الرحمۃ (متوفی اکتوبر ۱۹۸۸ء) نے "ہندوستان کا سب سے پہلا سفرنامہ حجاز" کے عنوان سے اپریل ۱۹۶۱ء میں مکتبہ الفرقان لکھنؤ سے شائع کرایا تھا۔ حاجی رفیع الدین خاں کی ایک اور نہایت گراں قدر تالیف "تذکرۃ المشائخ" تھی جس سے صوفی محمد حسین مرادآبادی علیہ الرحمۃ نے اپنی تالیف "انوار العارفین" میں استفادہ کیا ہے مگر افسوس ہے کہ اب تذکرۃ المشائخ نایاب ہے۔

دوسری تصانیف میں قصر الآمال بذکر الحال والمآل، (۲) سلوۃ الکئیب بذکر الحبیب (سیرۃ) (۳) شرح الاربعین (۴) کنز الحساب (۵) تذکرۃ الملوک، (تاریخ ہندوستان) (۶) تاریخ الافاغنہ (روہیلوں کی تاریخ) (۷) کتاب الاذکار (۸) ترجمہ عین العلم (۹) شرح غنیۃ الطالبین (۱۰) افادات عزیزیہ (حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے سوالات اور ان کے جوابات۔ اس کا نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہے)

حاجی رفیع الدین خاں نے ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۲۳ھ ۳۱ جنوری ۱۸۰۹ء کو ۸۹ سال کی عمر پا کر مرض استسقاء PLURISY میں انتقال کیا۔ مرادآباد ہی میں مدفون ہیں۔

مراجع: سفرنامہ حجاز مرتبہ حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدی علیہ الرحمۃ
صوفی محمد حسین مرادآبادی: انوار العارفین

لہ غلام کاکی شاہ مراد اللہ انصاری قادری نقشبندی

نبھل کی عرفیت ہے۔ یہ سنبھل کے مشہور انصاری خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کی ایک شاخ علمائے فرنگی محل کا خاندان بھی ہے۔

شاہ مراد اللہ عرف غلام کاکی حضرت میرزا مظہر جان جاناںؒ (شہادت ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۱ء) کے مرید اور خلیفہ تھے یہ بنگال کی طرف چلے گئے تھے اور وہاں اصلاح و تبلیغ کا کام بڑے پیمانے پر کیا۔ ان کے تربیت یافتہ اصحاب میں محمد غوث، محمد دانش اور محمد درویش وغیرہ اس علاقے کی ممتاز شخصیات تھیں۔

شاہ مراد اللہ انصاری علوم معقول و منقول کے بلند پایہ عالم تھے، شاعری کا ذوق بھی تھا۔ انھوں نے قرآن کریم کے آخری پارے کی تفسیر لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی اور بار بار چھپ چکی ہے۔ سب سے پہلے یہ ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء میں ہوگلی (بنگال) سے چھپی تھی پھر سید عبداللہ کے چھاپے خانے سے طبع ہوئی۔ ایک ایڈیشن ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء میں مطبع کریمی بمبئی سے بھی نکلا تھا برطانوی حکومت نے اس کتاب کی اشاعت پر پابندی بھی لگادی تھی۔ اس کے قلمی نسخے بھی حیدرآباد دکن لاہور وغیرہ کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ کتاب کا نام "خدا کی نعمت" عرف تفسیر مرادیہ ہے، وہ خود لکھتے ہیں:

"یہ تفسیر محرم کے مہینے کی چوبیس تاریخ جمعہ کے دن
گیارہ سو چوراسی برس ہجری تمام ہوکر پچاسی
شروع ہوا تھا جو تمام ہوئی"

"خدا کی نعمت" اس کا تاریخی نام ہے۔ اس کے بعد بھی وہ اردو میں تفسیر قرآن کا کام جاری رکھنا چاہتے تھے مگر مقامات مظہری سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت میرزا مظہر جان جاناں نے اس سے منع فرمادیا تھا۔ تفسیر مرادیہ کی زبان بہت صاف ہے۔ اس کے بارے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ "اس کتاب کی زبان بارہویں صدی کے اواخر کی زبان کا اچھا نمونہ ہے"۔

مولوی غلام کاکی کے فرزند ثناء اللہ انصاری بھی میرزا مظہرؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ مولوی مراد اللہ کا سنبھل ہی میں انتقال ہوا۔ سال وفات تحقیق طلب ہے۔

مراجع: محمد ایوب قادری: اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۸۸ء۔
محمد اقبال مجددی: مقامات مظہری (اردو ترجمہ) لاہور
سید حمید شطاری: قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر۔ حیدرآباد ۱۹۸۲ء

۳ھ جادو ناتھ سرکار کی کتاب "زوال سلطنت مغلیہ" کی رو سے شاہ عالم ۶ / جنوری ۱۷۷۲ء کو دہلی میں داخل ہوا (زوال ۳ : ۱) گیارہ دن کے بعد لونی، باغپت، غوث گڑھ چاند پور (رڑکی سے ۱۵ میل مشرق) ہوتا ہوا سکرتال پہنچا۔ اس سفر میں رائے بہادر سنگھ کے ساتھ میر تقی میر بھی سکرتال تک گئے تھے (میر کی آپ بیتی طبع اول ۱۶۱) ضابطہ خاں بغیر جنگ کئے فرار ہوگیا جس کی تاریخ مرزا رفیع سودا نے یوں کہی ہے:

یہ ۲۳ فروری ۱۷۷۲ء کا قصہ ہے (زوال ۳ : ۳۶)
میر کا بیان ہے کہ مرہٹوں نے ضابطہ خاں کے "اموال و اسباب اور جایداد پر قبضہ کرلیا بادشاہ کو سوائے دو سو مریل گھوڑوں اور چند پھٹے پرانے خیموں کے کچھ نہ دیا" (میر کی آپ بیتی : ۱۶۱)

ضابطہ خاں کی شکست کے بعد یکم مارچ ۱۷۷۲ء کو شاہ عالم سکرتال پہنچا۔ اس لشکر میں سعادت یار خاں رنگین کا باپ طہماسپ خاں مسکین بھی تھا۔ اموال غنیمت کی تقسیم پر مرہٹوں کے سفیر اور بادشاہ کے درمیان تلخ کلامی بھی ہوئی، مگر مرہٹوں کی دھاندلی کے آگے بادشاہ بے بس تھا۔ بقول میر: "دکھنیوں کے پاس طاقت تھی اور یہاں نہ زور تھا نہ زر" (آپ بیتی : ۱۶۱)

سرکار نے ضابطہ خاں کے قلعہ پتھر گڑھ کی لوٹ کے یہ اعداد و شمار دیئے ہیں (زوال ۳ / ۴۰) زر و سیم (۱۰) لاکھ۔
گھوڑے (۲۲۹۸) ان میں سے (۱۰۴۳) شاہ عالم کو

دیے گئے۔ بڑی توپیں (۳۱) زنبورک (سات)
گولہ مار (۱۸۴۲) راکٹ (۱۰۰) بارود (۵۴۰ من)۔

ضابطہ خاں کی جاگیر ضبط کرکے سہارن پور فخرالدین خاں پسر قمرالدین خاں کو اور انوپ شہر و کرنال کے علاقے سیندھیا کو دے دیے گئے تھے۔

سکرتال سے واپسی میں شاہ عالم نجیب آباد، نہٹور، شیر کوٹ، سیوہارہ، سلیم پور، امروہہ سے گذرا۔ گنگا عبور کرکے بکسر ہاپوڑ ہوتا ہوا ۹ جولائی ۱۷۷۲ء کو دہلی پہنچا (زوال ۳/۳۴) مرہٹوں نے سارے روہیل کھنڈ میں لوٹ مچا دی صرف امروہہ بچ گیا جسے سادات امروہہ نے ساٹھ ہزار روپے تاوان جنگ دے کر نجف خاں کی معرفت بچا لیا۔ عبرت نامہ میں یہ رقم (۸۰) ہزار لکھی ہے۔

حضرت شاہ عبدالہادی قدس سرہ نے شاہ عالم کو مرہٹوں کا ساتھ چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا یہ خط مارچ ۱۷۷۲ء کے بعد ہی لکھا گیا ہوگا۔

سکہ داؤد خاں نامی روہیلہ علاقہ روہ (افغانستان) سے ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء میں ہندستان آیا تھا اور دامن کوہ ہمالیہ کے قریبی علاقوں میں جمعیت فراہم کرکے رفتہ رفتہ اپنے قدم جمالیے تھے اس نے ۱۱۳۹ھ / ۱۷۲۶ء میں انتقال کیا۔ صلبی اولاد نہیں تھی۔ موضع بانکولی پرگنہ بہیرڑی ضلع بریلی میں اسے ایک بچہ ملا تھا جسے اپنا بیٹا بنا کر پرورش کیا، علی محمد خاں (ولادت ۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۶ء) اس کا نام رکھا۔ وہی داؤد خاں کا وارث ہوا۔

دوندے خاں بن حسن خاں برادر کلاں شاہ عالم خاں اس کی فوج کے سپہ سالار اور سردار خاں بخشی تھے۔

محمد شاہ بادشاہ نے ۴ محرم ۱۱۵۸ھ جمعہ / ۲۵ فروری ۱۷۴۵ء کو ایک لاکھ لشکر کے ساتھ دہلی سے نکل کر علی محمد خاں پر چڑھائی کی۔ شاہی لشکر میں خان آرزو، آنند رام مخلص، عبدالواسع ہانسوی وغیرہ بھی شریک تھے۔ اس لشکر کشی کی روداد آنند رام مخلص نے لکھی ہے جو رضا لائبریری رام پور سے شائع ہو چکی ہے۔

علی محمد خاں نے آنولہ چھوڑ کر بن گڑھ عرف یوسف نگر میں پناہ لی تھی۔ یہ قلعہ پرگنہ بدایوں میں آنولے اور بدایوں کے درمیان واقع ہے۔

۸ ربیع الثانی ۱۱۵۸ھ / ۹ مئی ۱۷۴۵ء کو پایندہ خاں، فتح خاں اور سید شاہ معصوم وغیرہ نواب علی محمد خاں کی طرف سے صلح کی بات چیت کے لیے شاہی لشکر میں آئے تھے۔

۱۸ ربیع الثانی ۱۱۵۸ھ / ۱۹ مئی ۱۷۴۵ء کو شاہی فوج نے دوندے خاں کا علاقہ بسولی خوب لوٹا۔ ۵ جمادی الاولی ۱۱۵۸ھ / ۴ جون ۱۷۴۵ء کو بادشاہ نے شاہی فوج کی واپسی کا حکم دے دیا اور سلخ جمادی الاولی ۱۱۵۸ھ / ۲۹ جون ۱۷۴۵ء کو یہ فوج دہلی واپس آگئی۔

علی محمد روہیلہ کو بھی دہلی لے آئے۔ اسے خانی کا خطاب اور ریاست روہیل کھنڈ کا پروانہ دے دیا گیا تھا۔ دہلی میں پانچ مہینے رکھنے کے بعد علی محمد خاں کو سرہند کا چکلہ دار بنا کر بھیج دیا گیا کیونکہ اس طرف احمد شاہ ابدالی کے حملے ہو رہے تھے۔ ڈھائی برس تک علی محمد خاں سرہند میں رہے ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہوا تو انھیں وہاں سے ہٹا کر روہیل کھنڈ بھیج دیا گیا۔ علی محمد خاں کی حکومت "از گنگ تا سنگ" یعنی گنگا کے مشرقی کنارے سے دامن ہمالیہ تک تھی اس میں مرادآباد، امروہہ، سنبھل، دارانگر، دھام پور، نگینہ، شیر کوٹ، آنولہ، منونہ، بریلی، شاہ جہاں پور، پیلی بھیت وغیرہ علاقے شامل تھے۔

علی محمد خاں نے استسقاء کے مرض میں مبتلا ہو کر ۳ شوال ۱۱۶۲ھ / ۱۴ ستمبر ۱۷۴۹ء کو ۴۴ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اپنے صدر مقام آنولہ میں دفن ہوئے۔ چھ بیٹے یادگار چھوڑے تھے ان میں فیض اللہ خاں اور عبداللہ خاں بڑے تھے انھیں احمد شاہ ابدالی یرغمال بنا کر اپنے ساتھ قندھار لے گیا تھا۔ سعداللہ خاں محمد یار خاں امیر

باقی ص۱۹۱ پر

صوفی ازم اور ہندو مسٹی سزم

خواجہ حسن ثانی نظامی

صوفی ازم اور HINDU MYSTICISM پر کچھ عرض کرنا دراصل شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ اور ر شنکر اچاریہ کی قلمرو میں داخل ہونا ہے۔ مجھ جیسا عامی اور کوچہ و بازار کا آدمی اس کا پروانۂ راہداری کہاں سے لائے؟ میں ایران کلچر ہاؤس کے لائق صد احترام ذمے داروں کا شکر گزار تو ہوں کہ ان کی بدولت اہل علم کے ایک مجمعے میں حاضری کی سعادت مل رہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حیران و پریشان بھی ہوں کہ اس مشکل کام کا حق کسی طرح ادا کر سکوں گا

صوفی ازم اور ہندو مسٹی سزم HINDU MYSTICISM مغرب اور انگریزی زبان کی ایسی اصطلاحیں ہیں جن سے اسلامی تصوف اور ہندو روحانی فلسفوں کی وضاحت میرے ناچیز خیال میں ان معنوں بھی پوری طرح نہیں ہوتی جن معنوں محدود تعریفوں کے ذریعے ان کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش ہوتی رہی ہے۔

اسلامی تصوف کو صوفی ازم کہنا دراصل اسے شخصیتوں تک محدود کر دینا ہے۔ یہ ایسی ہی غلطی ہے جیسی غلطی مومن اور مسلم یا مسلمان کو محمڈن MOHAMMADAN کہنے میں ہے۔ اہل مغرب میں ان کے سارے علمی ذوق و شوق کے باوجود ایک غیر علمی اور حقیقت پسندی سے دور رویہ یہ رہا ہے کہ وہ اپنے گھر کے سلے سلائے چھوٹے بڑے کپڑے زبردستی باہر والوں کو پہنانا چاہتے ہیں۔ اور اس کوشش میں جو مضحکہ خیز صورت ان کی آنکھوں کے سامنے آتی ہے اسی کو باہر والوں کی اصلی شبیہہ اور چھبی بتاتے رہتے ہیں۔ کم از کم ہم لوگوں کو اس معاملے میں ان کا ساتھ نہیں دینا چاہیے۔

برصغیر ہندوستان کی روحانی وراثت بھی ایک عظیم وراثت ہے۔ اس میں قدامت بھی ہے گہرائی بھی۔ اور رنگارنگی بھی۔ سچ پوچھئے تو اس کو بھی HINDU MYSTICISM کی اصطلاح کی چھوٹی سی رسّی سے لکڑیوں کے گٹھڑ کی طرح گھیر اور باندھا نہیں جا سکتا۔ جہاں کے مذہبوں نے انکار اور اقرار دونوں کو اپنی پکڑ میں لے رکھا ہو۔ جہا روحانیت اور مادّیت کی حکمرانی ایک ساتھ رہ چکی ہو۔ جہاں دنیا و آخرت سب کے تصورات موجو ہوں۔ جس دیس میں بیرون بھی جگمگا رہا ہو اور اندر بھی روشن ہو۔ جہاں ترک و تیاگ بھی روحانیت کے نام پر ہو اور زندگی سے بھرپور فائدہ اٹھانا روحانی شکل اختیار کرے اس کا بیان MYSTICISM کے پراسرار لفظ اور اصطلاح تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ یہاں تو ایک ایک چیز کے ان گنت روپ ہیں اور ہر روپ کے ہزاروں ہزار رنگ!

اگر میں موضوع کو ظاہر کرنے والے دیئے گئے
الفاظ کا پابند نہ بھی بنوں تب بھی ایک مشکل بدستور رہے
گی کہ ہندو اور مسلم روحانیت میں کس کا مقابلہ اور
موازنہ کس سے کروں؟ اتحاد اور اختلاف، زنگیِ
وبے زنگی خود ہندو روحانی فلسفوں ہی کے درمیان
نہیں پائے جاتے توحید کے علم بردار اور نقیب کہلانے
والے مسلمان روحانیان بھی خیر سے وحدت الوجود
اور وحدت الشہود کے نام پر الگ الگ کیمپ لگائے
ہوئے ہیں۔ غرضیکہ رات تھوڑی ہے اور راماین بہت!

یہ بات صحیح ہے کہ اسلام کے قرن اول میں تصوف
پر کتابیں نہیں لکھی گئیں۔ اس کو فلسفہ بنا کر پیش نہیں
کیا گیا۔ اس کی حیثیت عرصے تک ایک ایسی حقیقت
کی سی رہی جو بے لفظ ہو۔ لیکن پھر جیسے جیسے وقت
گزرتا گیا اور حقیقت سے دوری ہوتی گئی۔ لفظ کے
ضرورت پیش آئی۔ خانقاہ کی ضرورت کو محسوس کیا گیا
لفظ معنی و مفہوم کو پہنچاتے کا کام ہی نہیں کرتے۔
معنی و مفہوم کو محفوظ بھی رکھتے ہیں۔ خانقاہ روحانیت
کا گرین ہاؤس اور نرسری بنی جس نے بادشاہ گردی
کے طوفانوں اور آندھیوں میں نازک روحانی
پودوں کو سلامت اور قائم رکھا۔ لیکن جہاں
لفظ ناکام ہو گئے وہ دوسرا مقام تھا۔

تصوف اسلامی کی جتنی بھی تعریفیں اب تک کی
گئی ہیں۔ وہ کم و بیش محدود تعریفیں ہیں۔ ان میں
سے شاید کسی تعریف نے بھی تصوف کو سمجھنے اور
سمجھانے کا پورا حق ادا نہیں کیا ہے۔ اس طرح
کی کسی تعریف میں تصوف کی سمائی پوری طرح ہو بھی
نہیں سکتی تھی کیونکہ اسلامی تصوف کا تعلق بھی ہندوستانی
تصوف کی طرح ــــ بشرطیکہ اسے تصوف کہا
جا سکے ــــ "حد" ــــ "بے حد" اور
"آنْ حد" سب ہی سے ہے۔ لفظی تعریف کو لے
بھی ہو۔ "حد" تک تو جا سکتی ہے۔ لیکن "بے حد"
اور "آنْ حد" تک اس کی رسائی پوری طرح ممکن نہیں
ہے۔ کیونکہ لفظوں کی تراش خراش میں وقت نے کتنی
ہی صدیاں کیوں نہ بتائی ہوں۔ لفظ بہرحال محدود ہوتے
ہیں۔ اصطلاح میں لفظوں کے معنی وسیع اور مخصوص
کرنے کے لئے وضع کی جاتی ہیں۔ لیکن ان کی پہنچ
بھی تیر کے فاصلے کی طرح ناپی جا سکتی ہے اور بس!
جب کہ مذہب ہزاروں ہزار سال پہلے یہ حقیقت دریافت
کر چکا ہے کہ جو کچھ موجود ہے وہ لامحدود ہے۔ ناپیدا
کنار ہے۔ نہ اس کی ابتداء کو ناپا جا سکتا ہے نہ انتہا کو!
مذہب کی یہ دریافت کوئی معمولی دریافت نہیں ہے۔
اس دریافت نے ہمارے سفر کو ختم نہیں ہونے دیا
ہے۔ مسلمانوں کے ہاں۔ اہل تصوف کے ہاں
آخرت کا تصور ہے۔ دوسری زندگی اور اس کی ہمیشگی
کا تصور ہے۔ ہندو فلسفوں نے آواگون اور تناسخ کا
نظریہ پیش کیا ہے۔ زندگی قالب بدلتی ہے۔ ادنیٰ سے
اعلیٰ اور اعلیٰ سے ادنیٰ کا روپ دھارتی ہے۔ تعینات
اور تنزلات سے گزرتی ہے۔ یہاں تک کہ عمل اور
کرم کے ٹوٹے ہوئے ستارے فضاؤں کے لامتناہی
مس سے فنا ہو کر خلاؤں کی گمشدگی میں نجات
اور مکتی پا لیتے ہیں۔ لیکن نئی زندگیوں کا پیدا ہونا تھمتا
نہیں ہے۔ سکوت اور سکون محض کا سناٹا لمحہ بھی نہیں
ہر لمحے کے ان گنت چھوٹے چھوٹے شنشڑوں میں بھی
ٹوٹتا ہی رہتا ہے۔ نئے نئے جنم ہوتے ہیں۔ نئی نئی زندگیاں
وجود میں آتی ہیں۔ اور دنیا کا ہوش ربا کارخانہ بند ہونے
کا نام نہیں لیتا۔ اور افراد چاہے گم ہوتے اور فنا
کے ذریعے مکتی اور نجات حاصل کرتے نظر آتے
ہوں لیکن خود حیات اور زندگی کا آخری کنارہ نگاہوں
سے اوجھل ہی رہتا ہے۔

تصوف ظاہری اسلام کی کسی خفیہ تعلیم
کا نام ہرگز نہیں ہے۔ اس کا کام صرف اتنا ہے
کہ توحید کے عقیدے اور نظریے کی وہ وسعتیں

جو پیغمبر اسلام کی حیات ظاہر میں کھلی آنکھوں نظر آتی اور محسوس ہوتی تھیں اور جن کو لوگ بھولنے لگے تھے انہیں پھر یاد دلایا جائے۔ تصوف میرے نزدیک آدمی کو اور خاص طور پر مسلمان کو چار دیواری سے باہر نکالنے اور ''حد،، سے بے حد کی طرف لے جانے کا نام ہے۔ مگر ''بے حد'' کی طرف لیجانے کو افراط و تفریط نہ سمجھا جائے۔ نہ اسے انارکی سے تعبیر کیا جائے۔ یہ تو شاید ایک خاص سائنسی رویہ ہے جو سدا کھوج میں لگا رہتا ہے۔ یہ کھوج بڑے منظم طریقے سے ہوتی ہے۔ کھوجی پہلے ''حد،، سے ''بے حد،، کی طرف جاتا ہے اور پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر جب ''ان حد،، کے میدان میں پہنچتا ہے تو وہاں بھی نیند کا ماتا بن کر سو نہیں رہتا نیند سے تازہ دم ہو کر پھر اٹھتا ہے۔ کبیر نے بھی ان حد کے میدان کی جس نیند کا ذکر کیا ہے وہ بے عملی کے سکوت اور سکون محض کی نیند نہیں ہے بلکہ اس عالم اور اُس عالم زندگا اور آخرت کے کھیل میں دنیا چھوکر واپس آنے کا نام ہے۔ سالک یعنی روحانیت کا راستہ چلنے والا بھی ''ان حد،، کے نئے عرفان اور گیان سے مالامال اور رلیس ہو کر پھر ''بے حد،، اور ''حد،، کی طرف پلٹتا ہے۔ کیونکہ اس کو معلوم ہو چکا ہوتا ہے۔ کہ راستہ جتنا آگے کی طرف لامحدود اور بے انتہا ہے۔ ایسا ہی پیچھے کی طرف اور دائیں طرف اور بائیں طرف اور اوپر اور نیچے اور اندر اور باہر بھی لامحدود ہے اور جن منزلوں کو وہ سر کئے ہوئے سمجھ رہا تھا دراصل ان کی بہت کچھ دریافت باقی ہے۔ وہ جان جاتا ہے کہ راستے کی ابتدائی درمیانی یا آگے کی جس منزل پر بھی وہ کھڑا ہو اس کے امکانات بھی دراصل لامحدود اور قطعاً ان گنت ہیں۔ یعنی بڑائی بزرگی اور عظمت چھوٹی سے بڑی چیز کی طرف جانے ہی میں نہیں ہے۔ بلکہ بڑی سے چھوٹی چیز کی طرف آنے میں بھی ہے۔ ایٹمی دور میں تو اس بات کو سمجھنا بہت ہی آسان ہو گیا ہے کہ دوربین ہی نہیں۔ خوردبین بھی بڑے کام کی چیز ہے۔ چیزوں میں باہمی ربط اور تعلق اور ایک دوسرے سے متاثر ہونے کی خاصیت اس درجے ہے کہ صرف آگے کی طرف بھاگتے رہنے ہی میں فائدہ نہیں ہے۔ پلٹ پلٹ کر دیکھتے رہنے اور واپس آکر آگے کی زرخیز وادیوں کی خبریں ہی نہیں سوغاتیں بھی پیچھے لانے اور پیچھے کی چھوڑی ہوئی منزلوں کے ادھ کچرے پھل اگلی منزلوں تک پہنچانے اور پک جانے پر کھانے ہی میں دوامی آنند ہے!

حق خلق کے پردے میں پوشیدہ ہو اور انسان کی حق نظر صرف خلق کو دیکھے حق کو نہ دیکھے اور حق کو خلق کا غیر سمجھے۔ اس کو صوفیوں کی اصطلاح میں فرق کہتے ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں جمع آتا ہے۔ یعنی سالک۔ راستہ چلنے والا حق کا مشاہدہ کرے اور خلق اس کی نظر سے غائب ہو جائے۔ اس طرح حق خلق کا حجاب ہو جاتا ہے۔ یہ مرتبہ فنا کا ہے۔ اس کو فنا فی اللہ بھی کہتے ہیں۔ اور خلق کو حق کے ساتھ اس طرح دیکھنا کہ حق کا مشاہدہ تمام موجودات میں ہو اور یہ دیکھا جائے کہ حق ہر جگہ ایک علیحدہ صفت اور ایک الگ شان کے ساتھ ظاہر ہوا ہے تو یہ جمع الجمع ہے اور یہ مقام بقا با اللہ کا ہے۔ اس سے اونچا اور کوئی مقام نہیں۔ کیونکہ اس میں جو شے جیسی ہے۔ ویسی ہی نظر آتی ہے۔ سالک وحدت کو کثرت میں اور کثرت کو وحدت میں دیکھتا ہے۔ اس طرح کہ نہ خلق، حق کا حجاب ہوتی ہے۔ اور نہ حق خلق کا حجاب ہوتا ہے۔

حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادیؒ نے فرمایا ہے کہ کمال یہ ہے آدمی سرحد فنا فی اللہ پر پہنچ کر خدا کی بقا سے باقی ہو جائے۔ پہلی سیر (فنا فی اللہ) کو سیر الی اللہ اور دوسری سیر (بقا با للہ) کو سیر فی اللہ کہتے ہیں۔ پہلی سیر کی انتہا ہے۔ دوسری سیر کی کوئی انتہا نہیں!

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کہتے ہیں کہ وہ انبیاء کو علیحدہ کرکے واصلوں یعنی خدا تک پہونچے ہوئے لوگوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک مشائخ صوفیا جنھوں نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری اتباع اور کامل تقلید سے وصول کا مرتبہ حاصل کیا اور اس کے بعد انھیں مخلوق کی ہدایت پر مامور کیا گیا۔ یہ لوگ کامل اور مکمل کہلاتے ہیں۔ کیونکہ وہ فضل وعنایت ازلی سے عین جمع و توحید کے دریا میں ڈوب جانے کے بعد تفرقے کے ساحل پر پہنچتے ہیں اور فنا کے بعد انھوں نے بقا حاصل کی ہے تاکہ خلق کو نجات کا راستہ بتائیں اور بلند درجات تک پہنچائیں۔ دوسرا گروہ ان واصلین کا ہے جو واصل ہونے کے بعد اس عالم کی طرف لوٹ کر نہیں آئے اور فنا فی اللہ اور بقا باللہ تک نہ پہنچے۔ شاید اسی نظریے کو اچھی طرح نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے۔ ہمارے مشہور فلسفی شاعر علامہ اقبال کو ایک صوفی بزرگ کے قول سے غلط فہمی ہوگئی تھی اور وہ تصوف کو اپنے تصور خودی کے خلاف سمجھ بیٹھے تھے بزرگ نے فرمایا تھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج ہوئی اور وہ دوبارہ انسانوں کے درمیان زمین پر واپس آگئے۔ اگر مجھے معراج ہوتی تو میں واپس نہ آتا۔ یہ ایک صوفی کا ذاتی تجربہ اور ذاتی پسند کی بات تھی۔ جس نے راہ سلوک کے ایک درمیانی مقام اور منزل کے لطف اور آنند کو پسند کیا اور وہیں رہ پڑنے کی سوچی۔ لیکن جنھیں سلوک سے پوری واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ کیفیت ایک درمیان کی منزل کی کیفیت تھی۔ منزلیں اس سے آگے اور بھی ہیں۔ اور کامل لوگ ان سب کو سر کرنے کے باوجود پھر پلٹتے ہیں۔ انبیاء کا درجہ اولیاء سے اسی لئے بلند مانا جاتا ہے کہ وہ خدا تک پہونچ کر بھی اس کی مخلوق کی ہدایت اور رہنمائی میں کوشاں رہتے ہیں۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا پہلا خلافت نامہ جو انھوں نے حضرت شمس الدین یحییٰؒ کو دیا تھا اور ہم تک پہونچا ہے اس میں تلقین کی بنیاد پیغمبر اسلام کی اس حدیث کو بنایا گیا ہے کہ

والذی نفس محمد بیدہ لئن شئتم لاقسمن لکم ان احب عباد اللہ الی اللہ الذین یحبون اللہ الی عباد اللہ ویحبون عباد اللہ الی اللہ۔

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان ہے اگر تم چاہو تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ بندگان خدا میں سب سے زیادہ خدا کے دوست وہ لوگ ہیں جو خدا کو دوست رکھتے ہیں اس کے بندوں کے ذریعے اور جو بندگان خدا کو دوست رکھتے ہیں خدا کے واسطے!

جس چیز کو HINDU MYSTICISM کہا جاتا ہے۔ اس میں کرم مارگ بھی شاید اسی طرح کی ایک بات ہے۔ لیکن ہندوستان میں پائے جانے والے روحانی فلسفوں اور اسلامی تصوف میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ قدیم ہندوستان کے اہل علم وعرفان کی اکثریت عالم کو معدوم یا فریب نظر قرار دیتی رہی ہے۔ مایا کے تصور سے سبھی واقف ہیں۔ یہاں اس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ لیکن مسلمان صوفیا عالم کو ایک ٹھوس حقیقت جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک عالم اور انسان عین حق یا مظہر حق ہے قرآن کا فرمان بھی یہی ہے کہ موجودات خارج اور ظاہر میں ہوں یا باطن میں۔ زمانی ہوں یا مکانی سب کی حقیقت اللہ ہی ہے۔

ھوالاول۔ والآخر۔ والظاھر۔ والباطن

لا الہ کا مطلب صوفیا کے اس گروہ کے نزدیک جس سے میں وابستہ ہوں یہ ہے کہ اللہ کے سوا نہ کوئی معبود ہے۔ نہ مقصود اور نہ موجود!

اللہ نور السموٰت والارض ہے اور نور کی تفسیر

اس طرح کی گئی ہے کہ النور ہوالظہور۔ والظہور ہو الموجود۔ نور کے معنی ظہور ہیں اور ظہور اور وجود ایک ہے۔ وہی ایک ذات ہر شئے کو محیط ہے۔ ہر روپ اس کا روپ ہے۔ ہر شان اس کی شان ہے۔ جو کچھ دیکھو اس سے دیکھو اس میں دیکھو اور اس کی تلاش خود اس کے کارخانہ قدرت میں کرو!

مگر اس "لاموجود الااللہ" کو سمجھنا اور سمجھانا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہ اس سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے جتنا مشکل کام کمپیوٹروں کی مدد سے خلا کے اندھیروں کو علم کے اجالے میں لانا ہے۔ کیونکہ جو کچھ خلا میں ہے وہ ہمارے اس عالم کی چیز ہے۔ ہماری اس دنیا کی طرح ہی کا ہے۔ اس پر لفظ اور نگاہ کی کمند ڈالی جاسکتی ہے۔ لیکن خدا کا عرفان اور گیان اُس ذات کا عرفان اور گیان ہے جس جیسا کچھ ہے ہی نہیں۔ بقول قرآن لیس کمثلہ شئی

اس جیسی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ اور جب اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے تو پھر ہم اسے کس طرح پہچانیں؟ اس کے رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہونے کی چیز کی تصدیق کی کیا صورت ہو؟ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے تجربے کے ذریعے ہماری رہنمائی فرمائی ہے اور ارشاد کیا ہے کہ میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے خدا کو پہچانا۔ صوفیوں کے انہی سرگروہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد یہ بھی ہے کہ "اے انسان تو اپنے کو حقیر سمجھتا ہے حالانکہ تجھ میں سب سے بڑا عالم پوشیدہ ہے۔ تو ہی وہ کتاب مبین ہے جس کے حروف سے اسرار ظاہر ہوتے ہیں۔ تو ہی عین وجود ہے۔ اور جو کچھ تجھ میں ہے۔ اس کا حصر نہیں کیا جاسکتا!"

اسلامی تصوف ہو یا اس سے کچھ کچھ ملتے جلتے ہندوستان کے روحانی فلسفے۔ ان سب میں خود اپنی کھوج اور تلاش اور دریافت اور اس ذات پاک کی کھوج اور تلاش اور دریافت کی مہم کے سوا اور کیا ہے جس میں انسان پہلے دن سے لگا ہوا ہے اور شاید آخر تک لگا رہے۔ اس کھوج کے نتائج مختلف ہیں۔ اگر نتائج مختلف نہ ہوتے تو الگ الگ مسلک اور کام کے طریقے مقرر کرنے کی ضرورت بھی نہ پڑتی لیکن اتنا ماننا پڑے گا کہ کام ایک ہی ہے۔ اور مقصد بھی دو نہیں ہیں۔ میرے لئے تو بس اتنی سی بات ہی لاموجود الااللہ خدا کے سوا کوئی موجود نہیں ہے کے عقیدے کو ماننے کے لئے کافی ہے۔

آخر میں مجھے اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس مختصر گفتگو میں نہ تصوف کے بیان کا حق ادا ہوا ہے نہ ہندوستان میں پائے جانے والے روحانی فلسفوں کا۔ بلکہ ہندوستانی فلسفوں کے تو نام تک میں نے نہیں گنائے ہیں کہ ان کی فہرست خاصی بڑی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ آج کی طرح کی نشست میں بیس منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیئے اور وہ لگ چکا۔ یعنی اس ایک ہزار ایک راتوں سے بھی بڑی داستان میں سے ایک رات پلک جھپکنے سے پہلے ہی بیت گئی ہے۔ امید ہے کہ آپ مجھے اجازت دیں گے۔ کہ باقی داستان اگلی راتوں کے لئے چھوڑ دی جائے۔ میں نہ بھی ہوا تو آئندگان رفتنی یعنی مستقبل کے آنے جانے والے یہ کہانی خدا نے چاہا سناتے رہیں گے۔

(ایران کلچر ہاؤس دہلی میں پڑھا گیا)

SUFISM AND HINDU MYSTICISM

Khwaja Hasan Sani Nizami

(Sajjada Nashin Dargah Hazrat Khwaja Nizamuddin Aulia)

New Delhi, India

TO speak of Sufism and Hindu mysticism is indeed like entering into the domains of Sheikh Mohiuddin Ibne Arabi and Shankaracharya For a layman and a commoner like me, it is not easy to obtain a visa to enter into this hallowed region; and I do not know how to justify my presence here.

The popular westernized terms of "Sufism" and "Hindu mysticism" are not capable of explicating "Islamic Tasawwuf" and "Hindu Spiritual Philosophy" even in the limited sense (of the words) through which these are generally explained and understood.

To define Islamic Tasawwuf as Sufism is in fact restricting the phenomenon to personalities. This is a kind of fallacy which is often committed in calling a Momin and a Muslim as a Mohammedan. The West, despite a strong tradition of learning and scholarship, has not been able to deviate from labelling and fitting into self-designed patterns, shapes, figures and structures of the other worlds, irrespective of their dimensions and parameters. And whatever images are thus created distorted or reverse are conceived by the Western World to be their real images.

The spiritual legacy of the Indian sub-continent is indeed an immense legacy. It is old, profound and multifarious. The term "Hindu mysticism" can neither circumscribe nor comprehend the vast panorama of Hindu spiritual legacy ! Where the different religions have held together negation and affirmation, materialism and spirituality, where the outward is dazzling and the inward is luminous, where renunciation is a state towards salvation and living a full life is also an aspect of spirituality; to limit such limitless and varied states of mind and soul by defining it merely as 'mysticism' is indeed unjust. As there are many forms of an object and every form has got various shades.

Even if I do not use the so called terms of Mysticism and Sufism to define and differentiate the Hindu Muslim spirituality, the problem still remains as I do not know what to compare with and contrast against. Agreement and disagreement and variety and lack of it are not the distinguishing features of Hindusim alone, the followers of Islamic Tasawwuf are also divided on the concepts of *Wahdatul Wujood* and *Wahdatu sh Shuhood.*

This is true that books on 'Tasawwuf' were not written in early Islamic period. 'Tasawwuf' was not philosophised and for a very long time it remained a nameless reality. As time passed and people became distant from the reality that was 'Tasawwuf' a need was felt that the phenomenon may be defined and named. The need for the 'Khanqah' was felt. Words not only help in identifying sense and meaning but

also preserve them. The Khanqah served as the nursery and green house of spiritual values that protected and nursed the fragile plants of spirituality from the storms and ravages of monarchical system. But where the words failed tells of another story.

In whatever way the 'Islamic Tasawwuf' has been defined, has generally been inadequate. No definition can be said to have explained the concept satisfactorily, as no single definition can really encompass the phenomenon of Islamic Tasawwuf as, it is, like Indian mysticism, inclusive of 'the finite', the 'infinite' and the 'limitless'. An idea could be explained only to a certain limit but the sense may not go beyond that and it may even fail to comprehend the 'infinite' No doubt it takes ages for words to acquire connotations but even these have limitations. Terms are coined to explain and specify certain connotations but even their reach is not immeasurable. It has been said by saints and seers thousands of years hence that whatever exists is limitless, immesurable and interminable. It neither has a beginning nor an end. This realisation of religion is no mean achievement. It made our journey unending. Muslims, the practitioners of Tasawwuf, believe in the life hereafter, the other life, which is eternal. The Hindu philosophers believe in the concept of 'transmigration' -- life changing forms, from lower to the higher, from higher to lower, passing through states and stages, finally merging, floating and disappearing in the cosmos -- ultimately attaining salvation. But the termination of life gives way to the creation of new lives. The suspension, void and silence slowly and steadily breaks into innumberable moments. New lives are created, the fascinating and miraculus universe never ceases to exist. Men may continue to pass away seeking salvation but life and its endless shore never disappear.

'Tasawwuf' is not a mere apparent knowledge of Islam. It's task is only to unveil the dimensions of the concept of unity of God that was perceived and understood during the life time of the Prophet of Islam and has since become remote and distant. 'Tasawwuf' in my humble view, is the way of taking the man, particularly Muslims, out of the confines, from the limited world view to the unlimited one. Let the 'unlimited' here not be misunderstood with confusion and anarchy. It may be likened to a never ending scientific exploration or discovery. The discovery is done in strictly disciplined way The seeker first travels from the 'Limited' to the 'Beyond' From then onwards, he goes to the 'Infinite'. But that is not the end of the journey as the seeker does not rest there. After a short respite, he again awakes, rejuvenated and refreshed. Kabir does not mean the idle sleep or rest per se while referring to the sleep of 'The land of the infinite'. What he actually refers to is the experience of traversing and returning.

The seeker of the way of spirituality after the realisation of the 'infinite' returns to the realm of the 'finite'. He does it out of his awareness that the way to ; beyond, outward and inward, the known, is as complex and attractive as the comprehension of the unknown. The perception of the reality by the seeker through various states and the phases that a lot more need to be understood and traversed, takes him back to the initial stage as he discovers it to be equally fascinating and complex. That is to say that distinction and greatness does not lie in going

from the small to the big but also from the big to the small. The significance of this statement need not be underscored in our age, as a microscope is now considered to be as important as a telescope. Inter-dependence and inter-relationship among various objects is so vital that it is not always imperative to look beyond, but at times to turn and retract, and draw from the reservoirs of the past is also found to be ecstatic and beneficial.

Man's incapacity in not being able to see the *Haq*, Truth, in the *Khalq*, created-world, which lies hidden in it, and consider the *Khalq*, creation, as 'The other' from *Haq*, is called *Farq* in Sufi terminology. It's opposite is *Jam'a*. That is, the seeker perceives *Haq*, Truth, without taking any note of the *Khalq*, creation. Likewise, *Haq* veils *Khalq*, the creation. This is the state of *Fana*. This is also called *Fana Fillah*. And to see the *Khalq* as a manifestation of the *Haq* in every form and object so as to perceive the attributes of *Haq* in its variety is called *Jama-ul-Jama*. This is called *Baqa Billah*. There is no stage beyond this, as here an object is seen exactly as it is. The seeker sees diversity in Unity and unity in diversity, in such a way that neither *Haq* veils *Khalq* nor *Khalq* veils *Haq*.

Sheikh Kalimullah Jahanabadi says that excellence lies in a seeker reaching the bounds of *Fana Fillah*, and becoming eternal with the eternity of God. The first journey (*Fana Fillah*) is called the journey towards God while the second journey (*Baqa Billah*) is called the journey into God. There is a specified goal of the first journey but there is no end to the other.

Sheikh Shababddin Suharwardy says that apart from the Prophets, there are two categories of those who reached God. The first category is of *Mashaikh* and *Sufis* who reached God by faithfully following the way of Prophet Mohammad (Peace Be Upon Him) and were deputed for the guidance of mankind. They are called Kamil-o-Mukammil, complete and perfect, because they are eternally blessed and graced; they went deep in the sea of *Jam'a o Tauheed* emerging safely on the shore of *Tafreqa*, and attaining 'eternity' only after merging into *fana*. These seekers attained *Baqa* so that they may perform the task of guidance of mankind. The other category is of the seekers who did not return to this world after attaining communion with God and could not experience the states of *Fana* and *Baqa*. Perhaps it was due to some confusion about this precept that the philosopher poet, Iqbal misunderstood the statement of a Sufi Saint to be the antithesis of his Secrets of the Ego. The said Sufi saint had said that the Prophet of Islam had the Mi'raj, still he came back among the human beings; if the Saint had the fortune of such an experience, he would never have come back. This should be taken as the personal experience and preference of a Sufi who chose for the mid way destination but the ultimate destination was far-away. Those who know the travails of the way to God consider such destinations as only middle stations Since the ultimate destination lies far ahead, those who seek the way to God to perfection, return to humankind again. The Prophets have a higher station than that of *Walis* because even after reaching God they are ever anxious to guide the humankind. In the first ever *Khilafatnamah* issued by Hazrat Nizamuddin Aulia to Hazrat Shamsuddin Yahya to which we have an access, he bases his guidlines on the following tradition of Prophet of

Islam: "If you like I can swear by God in whose hands is my life, that those humans are nearest to God who love humanity for the sake of God, and love God through mankind".

That, which we know as Hindu mysticism presents *Karm Marg*, in the same vein. The basic difference between Islamic Tasawwuf and other spiritual philosophies in India is that most of the scholars and seers of ancient India consider the world as only an illusion Everyone is aware of the concept of Maya It needs no elaboration. The Muslim Sufis, however, consider the phenomenal world as a tangible reality. In their view Man is Truth or the manifestation of the Truth The Quran also ordains that whatever apparantly exists, be it outward or inward, related to time or space, Allah alone is the Reality.

The sect of Sufis to which I belong considers *La Ilaha* to be the essense of the fact that there is no God except Allah, no objective except Allah and nothing exists except Allah

Allah is the light of the earth and the heavens Light has been defined as: whatever is light is manifest and whatever is manifest, exists. He alone encompasses all. Every manifestation is His. Every splendour is His splendour. Whatever you see, see through Him, into Him and search Him through His manifestation, that is, the phenomenal world But it is no easy task to comprehend the meaning of *La Maujuda illa Allah* Nothing exists except Allah. It is a much more daunting task than to transform gloom of ignorance into light of knowledge with the help of computers It is because what ever is in space is within the reach of the world of eye and ear but the comprehension and the knowledge of God is an awareness of that Being who has no parallel. As the Quran says:*Laisa Ka mithlihi Shai*.

There is nothing like Him. And when there is nothing like Him how do we perceive Him? and how to establish that He is the closest to the heart? In this regard, Hazrat Ali guides us in the light of his own experience and says : 'I comprehended God with my aspirations coming to nought' He further says : "O man, you consider yourself to be insignificant, but the world lies within you. You are the open book which reveals the secrets. You alone exist. Whatever is within you can never be called trivial "

Be it the Islamic Tasawwuf or the Indian spiritual philosophy, all are given to self-discovery and the discovery of that Being. Man has ever been engaged in this persuit and shall ever remain so. The inferences of these discoveries vary. Had they not been so, there would not have been a need for various sects and ways. All said and done, the objective is the same For me the only precept that holds good is that there does not exists, anything except Allah.

I must confess at the end that I have neither been able to define and explain Tasawwuf nor the Indian spiritual philosophy I have not even touched upon the Indian philosophies because of their immense vastness. I feel that I should not take more than 20 minutes for this presentation this evening , and that I have already taken. It is a tale spread over more than a thousand and one nights, of which, one night has passed even before the wink of an eye. I hope you will permit me to continue this tale for subsequent nights. Even if I am not there others in future shall do the job. ❑

مدیر
خواجہ حسن ثانی نظامی
معاون مدیر
خواجہ مہدی نظامی

منادی ینادی للایمان

بارگاہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی
ایمان اور امن کی ندا دینے والا
اور اُن کے جانشین
امام المشائخ شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی کی یادگار

درگاہ شریف اور منادی کے بارے میں خط و کتابت کرنے اور قیمت جمع کرانے کا پتہ
خواجہ حسن ثانی نظامی
ڈاکخانہ حضرت نظام الدین اولیاء
نئی دہلی ۱۳-۱۱

منادی ۱۹۲۶ء سے جاری ہے یہ انسٹھویں جلد (۱۹۹۴ء) کا تیسرا شمارہ ہے

فہرست

سالانہ قیمت
ہندوستان میں پچاس روپے
غیر ممالک سے دس ڈالر
فی پرچہ پانچ روپے

پرنٹر پبلشر خواجہ حسن ثانی نظامی نے خواجہ پریس جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نئی دہلی ۱۳-۱۱ سے شائع کیا۔

حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ

کے سب سے چہیتے مرید

سلطان الشعراء طوطیٔ ہند محمد کاسہ لیس

حضرت امیر خسروؒ

کے چھ سو نواسیویں (۶۸۹) ویں سالانہ عرس

عرس مبارک

کی تقریبات میں آپ کو بصد خلوص مدعو کیا جاتا ہے۔
۱۶؍ شوال ۱۴۱۴ھ سے ۲۰؍ شوال ۱۴۱۴ھ تک
انشاء اللہ پانچ رات دن۔ تلاوت قران مجید۔ فاتحہ خوانی۔ حلقہ ہائے ذکر و شغل پیش کش چادر و گل تقسیم لنگر اور حمد و نعت و منقبت نیز قوالی کی محفلیں جاری رہیں گی۔ انگریزی تاریخیں رویت ہلال کے مطابق ہوں گی۔

تشریف آوری کی تاریخ اور احباب و ہمراہیان کی تعداد سے مطلع فرمائیں۔

عرس کا خاص پروگرام انشاء اللہ ۱۷۔ ۱۸؍ شوال کو منعقد ہوگا۔

۱۷؍ شوال کی صبح حضرت محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ شریف میں فاتحہ اور قوالی۔ بعد دوپہر خواجہ ہال میں سیمینار۔ بعد عشاء محفل حمد و نعت و قوالی خدا نے چاہا ہوگی اور ۱۸؍ شوال کو صبح نو بجے حضرت امیر خسروؒ کے مزار کے پائیں حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے حجرۂ قدیم میں اور اس کے بعد ٹھیک گیارہ بجے حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار شریف کے روبرو درگاہ شریف کے صحن میں قل کا پروگرام ہے۔

باقی تفصیلات ٹیلی فون یا خط کے ذریعے دریافت کی جاسکتی ہیں۔

مخلص دعا گو
خواجہ حسن ثانی نظامی
حجرہ قدیم درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

ٹیلی فون: ۶۱۹۸۰۷۳
تار کا پتہ: خواجگان نئی دہلی

فوائد الفواد

ملفوظات سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہیؒ

از حضرت خواجہ حسن علاء سجزی رح ——— ترجمہ و تلخیص خواجہ حسن ثانی نظامی

نظم اور غزل کو محمول کرنا

نظم اور غزل وغیرہ کو محمول کرنے (کسی خاص بات سے متعلق کرنے یا سمجھنے) کا ذکر آیا۔ ارشاد ہوا کہ ہر ایک اس کو کسی خاص چیز پر محمول کرتا ہے (یعنی ہر شخص اپنی ذاتی کیفیات اور موقع و محل کی مناسبت سے شعر کو خاص معنی دیتا ہے۔ مثلاً کچھ لوگ مشاہدہ حق کا ذکر بادہ و ساغر کے الفاظ میں کرتے ہیں اور کچھ حقیقت کے بیان کو بھی مجاز کا رنگ دے کر دیکھتے ہیں مترجم)

اس کے بعد فرمایا کہ ایک دفعہ شیخ الاسلام فریدالدین قدس اللہ سرہٗ العزیز یہ شعر زبان مبارک پر لائے۔

نظامی ایں چہ اسرار است کز خاطر عیاں کردی
کسی سر-ش نمی داند زبان درکش زبان درکش

نظامی! یہ کیا اسرار ہیں جو تم اپنے نہاں خانۂ فکر سے ظاہر کر رہے ہو۔ اس کو یہاں بھلا کون سمجھے گا۔ زبان بند رکھو! زبان بند رکھو!
اس دن کے زیادہ حصے میں یہ شعر پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ مغرب کی نماز کا وقت آگیا۔ افطار کے وقت بھی یہی شعر زبان مبارک پر تھا۔ کہتے ہیں سحر کے وقت بھی یہی شعر پڑھتے تھے اور جب بھی پڑھتے تھے حالت متغیر ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے فرمایا کہ معلوم نہیں خاطر مبارک میں کیا بات تھی اور کیا چیز (یہ شعر) پڑھوا رہی تھی۔

اس کے بعد فرمایا کہ ایک دفعہ شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے گھر کے اندر ایک دروازے پر کھڑے تھے۔ ایک ہاتھ ایک کواڑ پر تھا دوسرا ہاتھ دوسرے کواڑ پر اور بار بار یہ دو مصرعے زبان مبارک پر لاتے تھے۔

کردی صنما بر سر ما یار دگر
ما ہیچ نکردیم خدا می داند!

اے صنم تو ہمارے ہوتے کسی اور کا ہوگیا۔ لیکن خدا جانتا ہے۔ ہم نے کسی اور سے دل نہیں لگایا۔
اس کے بعد خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے اپنی زبان گوہر بیان سے فرمایا معلوم نہیں ان کے خیال میں کیا بات تھی اور وہ اس (شعر) کو کس پر محمول کر رہے تھے اور مقصد کیا تھا۔

خواجہ نے فرمایا کہ میں نے آج تک جب بھی سماع سنا اور تمام صفات جو گویے سے سماع میں سنیں خرقۂ شیخ کی قسم اس کو شیخ کے اوصاف اور اخلاق پر محمول کیا۔ ایک دفعہ شیخ قدس اللہ سرہ العزیز کی حیات کے زمانے میں ایک مجلس میں تھا۔ گویے نے یہ شعر پڑھا۔

مخرام بدیں صفت مبادا
کز چشم بدت رسد گزندے

تم اس انداز سے مت چلو کہ کسی کی بری نظر لگے۔
اور مجھے اپنے پیر کے پسندیدہ اخلاق اور اوصاف اور بزرگی کا کمال اور ان کے بے انتہا فضل و لطافت یاد آگئے اور ایسا رونا آیا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ قوال چاہتا تھا کہ دوسرے شعر پڑھے مگر میں اسی کی تکرار کراتا رہا۔ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر جب اس بات پہ پہنچے تو رونے لگے اور فرمایا کہ اس کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ انھوں نے رحلت فرمائی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور تفہیم قرآن کریم

از حضرت پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، محبوب الٰہی قدس اللہ سرہ العزیز کو بچپن سے ہی قرآن کریم سے گہرا شغف رہا۔ آج کا ماحول تو دینی اعتبار سے مردہ و افسردہ ہو چکا ہے مگر اب سے ۵۰ سال پہلے تک بھی بچوں کو حرف شناسی کے لیے قاعدہ بغدادی پڑھایا جاتا تھا پھر قرآن کے تلفظ اور لہجے سے آشنا کرنے کے لیے یسرنا القرآن جیسی ابتدائی کتابوں کا درس دیتے تھے، اس کے بعد قرآن کریم ناظرہ پڑھاتے اور مختصر سورتیں زبانی یاد کراتے تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین رحہ نے بھی قرآن کریم اسی طرح پڑھا ہوگا، اس کے بعد ہی عربی فارسی زبان و ادب اور علوم دینیہ کا درس شروع کیا ہوگا۔ یہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ فقہ کی مشہور کتاب قدوری، مولانا علاء الدین اصولی بدایونی رحؒ سے پڑھتے تھے۔ قرآن کریم کو اچھی طرح پڑھنے اور سمجھ لینے کے بعد ہی مسائل فقہیہ کا سمجھنا ممکن ہے۔

بدایوں میں وہ جب تک تحصیل علم کرتے رہے ان کی توجہ فقہ اور اصول فقہ پر زیادہ رہی، اس لیے کہ آگے چل کر وہ قضا یا احتساب کے محکمے سے تعلق پیدا کرنے کی سوچ رہے تھے قاضی اور محتسب کے لیے بھی قرآن و سنت سے گہری واقفیت ضروری ہے۔ انھوں نے عربی ادبیات اور علم اللغۃ میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی، اس لیے قرآن کریم کے معانی و مطالب کا سمجھنا ان کے لیے کچھ بھی دشوار نہ رہا ہوگا۔

جب وہ دہلی آئے اور حضرت شیخ نجیب الدین متوکل علیہ الرحمہ کی صحبت اور ان کا پڑوس ملا تو شیخ نے ان کے جوہر کا اندازہ کر لیا اور قاضی بن جانے کی خواہش کو ان کے صفحۂ خاطر سے محو کر دیا اور فرمایا: ''قاضی مشو چیزے دیگر شو'' (تم قاضی مت بنو، کچھ اور بنو)[1] حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر اجودھنی قدس اللہ سرہ العزیز سے محبت و عقیدت کی تخم ریزی تو بدایوں میں ہی ہو چکی تھی[2] شیخ نجیب الدین متوکل رحؒ کی صحبت میں یہ نہال آرزو بہت سرسبز ہو گیا، اور حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضری کا اشتیاق حد سے سوا ہو گیا اُسی زمانے میں ایک دن صبح صادق کے وقت کسی نے منارۂ مسجد سے قرآن کریم کی یہ آیت بہ آواز بلند تلاوت کی:[3]

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ

---

[1] فوائد الفواد/۶۷۔ [2] فوائد الفواد/۲۵۳۔
[3] شمائل الاتقیاء۔

فقست قلوبهم ط وكثيرٌ منهم فٰسِقُونَ ۔
(سورۃ الحدید ۵۷ : ۱۶)

(ترجمہ: کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے اور جو سچا دین اس نے اتارا ہے، اس سے نرم پڑ جائیں اور تم ان لوگوں کی طرح مت بنو جنھیں (تم سے) پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ان پر (طویل) زمانہ گذر گیا اور ان کے دل سخت پڑ گئے اور (اب) ان کی اکثریت فاسق ہے) اِن الفاظ نے آتش خاموش کو شعلۂ جوالہ بنا دیا اور حضرت نے اجودھن کی حاضری کا احرام باندھ لیا[1] گویا آپ کے سفر طریقت کی ابتدا، بھی قرآن حکیم کی تحریک و تشویق سے ہوئی۔

اجودھن میں حضرت خواجہ نظام الدین رح نے حضرت بابا فرید رح سے عرض کیا: بندے کی خواہش یہ ہے کہ آپ کی خدمت میں قرآن شریف پڑھوں۔ بابا صاحب رح نے فرمایا: اچھا ہے، پڑھو۔ جمعہ کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد عصر کے وقت تک فرصت ہوتی تھی اس مدت میں آپ نے قرآن کے چھ پارے (سورۃ المائدۃ تک) بابا صاحب رح سے پڑھے۔

جب قرآن پڑھنا شروع کیا، بابا صاحب رح نے فرمایا: الحمد سے پڑھو، حضرت نے پڑھا وَلَا الضَّآلِّين پر پہنچے تو بابا صاحب رح نے ضاد کا تلفظ بتایا، اس طرح پڑھو جیسے میں پڑھتا ہوں حضرت نظام الدین رح فرماتے ہیں کہ میں نے بہت کوشش کی مگر حضرت شیخ کی طرح ضاد کا تلفظ نہ کر سکا۔ پھر فرمایا: بابا صاحب رح کی فصاحت و بلاغت کا کیا کہنا، وہ ضاد کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ ہر گز کسی شخص کو وہ بات نصیب نہیں ہو سکتی۔[2]

حضرت نظام الدین رح نے بابا صاحب رح سے قرآن کریم تبرکاً بھی پڑھا اور اس کا مقصد تجوید کا درست کرنا بھی رہا ہوگا۔

حضرت قرآن کریم کے آداب تلاوت کا بھی پورا خیال رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم و تلقین فرماتے تھے۔ ۱۰ رمضان ۱۵، ھ/۸ دسمبر ۱۳۱۵ء کی مجلس میں سورۂ اخلاص کی فضیلت کا ذکر ہوا تو آپ نے قول پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے فرمایا کہ سورۂ اخلاص ایک تہائی قرآن کی برابر ہے۔ ختم قرآن کے بعد جو تین بار سورۂ اخلاص پڑھتے ہیں اس میں حکمت یہی ہے کہ اگر ختم قرآن میں کہیں کوئی کسر رہ گئی ہو تو سورۂ اخلاص سے اس کی تکمیل ہو جائے[3] پھر فرمایا کہ ختم قرآن کے بعد الحمد پڑھتے ہیں اور سورۂ بقرہ کی چند آیتیں ۔ یہ کیا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت رسالت علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ مَنْ خیرُ النّاس؟ سب سے اچھا آدمی کون ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الحَالُّ المُرتَحِلُ یعنی منزل پر اترنے والا اور پھر چل دینے والا۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ختم قرآن کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص منزل سر کر لے، اور جب دوبارہ قرآن پڑھنا شروع کرے تو گویا وہ پھر سفر پر روانہ ہو جاتا ہے اس لیے سب سے اچھا شخص وہ ہوگا جو قرآن ختم کرے تو پھر اسے شروع سے پڑھنے لگے اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الحَالَ المرتحل فرمایا ہے[4]

حضرت خواجہ نظام الدین رح ذکر جہر پر ذکر خفی کو ترجیح دیتے تھے اسی طرح قرآن کے لیے بھی فرمایا کہ آہستہ یا اس طرح پڑھیں کہ کسی کو پتہ نہ لگے تو اچھا ہے۔ فرمایا کہ اصحاب رسول قرآن اس طرح پڑھتے تھے کہ کسی

---

[1] شمائل الاتقیاء، (مطبوعہ حیدرآباد، جون ۱۹۲۸ء) ص ۴۰۰۔
[2] فوائد الفواد: ۲۷۵، سیر الاولیاء: ۷۰۔۷۱۔
[3] فوائد الفواد : ۲۴۴۔
[4] فوائد الفواد : ۲۴۵۔

کو معلوم نہ ہوتا تھا، جب کوئی آیت سجدہ آتی تھی اور وہ سجدہ کرتے تھے تب معلوم ہوتا تھا کہ قرآن پڑھ رہے ہیں [1]

اسی طرح ۲۵ شعبان ۷۰۸ھ / فروری ۱۳۰۹ء کی مجلس میں یہ ذکر ہوا کہ شب برات میں کچھ لوگ شبینہ کرتے ہیں، رات بھر قرآن پڑھتے ہیں یا ساری رات مسجد میں جاگ کر گذارتے ہیں، امیر حسن دہلوئؒ جامع فوائد الفواد نے عرض کیا کہ اگر اپنے گھر میں ہی رہیں تو کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اگر اپنے گھر میں رہ کر ایک سیپارہ پڑھیں تو مسجد میں پورا ختم کرنے سے اچھا ہے۔ [2]

قرآن کریم کی ترتیل و تلاوت کے بھی آداب ہیں، جو اس کی تلاوت کا حق ہے وہ ادا کرنا چاہئے۔ فرمایا کہ قرآن پڑھتے ہوئے اگر کسی آیت سے ذوق اور راحت ملے تو اس کو بار بار دہرانا چاہئے [3]

قرآن کی تلاوت کرنے یا کسی کو پڑھتے ہوئے سننے میں جو سعادت حاصل ہوتی ہے اس کے تین درجے ہیں [4]

انوار — احوال — آثار

اور یہ تین عالموں سے نازل ہوتے ہیں:

ملک — جبروت — ملکوت

اور یہ سعادت تین مقامات پر اُترتی ہے:

ارواح — قلوب — جوارح

پہلے عالم ملکوت سے ارواح پر انوار نازل ہوتے ہیں، پھر جبروت سے قلوب پر احوال وارد ہوتے ہیں پھر ملک سے جوارح پر آثار کا ظہور ہوتا ہے۔

پھر اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اسی طرح سماع کی حالت میں عالم ملکوت سے ارواح پر انوار کا نزول ہوتا ہے، پھر جو کیفیت دل میں پیدا ہوتی ہے اُسے احوال کہتے ہیں یہ عالم جبروت سے قلوب پر ہوتی ہے۔ اس کے بعد جو گریہ طاری ہوتا ہے یا وجد و رقص ہوتا ہے وہ آثار ہیں جو ملک سے جوارح پر ظاہر ہوتے ہیں۔

اس تشریح سے حضرت نے تلاوت قرآن کریم اور حالت سماع دونوں کی لطیف ترین کیفیات اور رموز و دقائق و اسرار و حقائق کو نہایت سہل و دل نشیں انداز میں بیان فرما دیا یہ وہ لطیف نکات ہیں جو ایک درویش کی زبان سے ہی ادا ہو سکتے تھے اور یہی وہ باتیں ہیں جنھیں سن کر علماء کو بھی اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ "مغز اور معانی تو حضرت کے پاس ہیں ہم خالی پوست اور چھلکے لیے بیٹھے ہیں"

قرآن کریم کی تلاوت کے مراتب کا تذکرہ ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اس کی آٹھ قسمیں ہیں [5] پہلی بات یہ ہے کہ پڑھنے والے کا دل اللہ کی طرف متوجہ ہو، اگر یہ کیفیت حاصل نہ ہو سکے تو جو کچھ پڑھ رہا ہے اس کے معانی کو اپنے قلب پر وارد کرتا رہے، یہ بھی نہ ہو سکے تو تلاوت کے وقت اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کا تصور کرے۔ حاضرین میں سے کسی نے عرض کیا بظاہر یہ بھی وہی بات ہے جو حضرت نے پہلی شرط "تعلق بحق" کے بارے میں ارشاد فرمائی۔ دیکھیے یہاں بھی حضرت محبوب الٰہیؒ نے کیسا لطیف نکتہ بیان کیا جو صرف اہل اللہ ہی کہہ سکتے ہیں، وہی اس کے نازک فرق کو سمجھ سکتے ہیں اور انھیں کو اس کا تجربہ و مشاہدہ بھی ہو سکتا ہے۔ فرمایا کہ پڑھنے والے کا دل اللہ کی طرف متوجہ ہو یہ "تعلق بذاتِ حق"

---

[1] فوائد الفواد: ۳۹۰۔ [2] ایضاً: ۳۹، سیر الاولیاء: ۵۴۸۔ [3] شمائل الاتقیاء: ۸۳۔
[4] فوائد الفواد: ۵۹ — ۶۰۔ [5] فوائد الفواد: ۱۲۰۔

ہے اور وہ اللہ کی عظمت و کبریائی کا دل میں تصور کرے تو یہ "تعلق بہ صفات حق" کے ذیل میں آتا ہے۔

آداب تلاوت کا جو تھا مرتبہ یہ بیان فرمایا کہ قرآن پڑھتے وقت قاری پر حیا کا غلبہ رہے یہ سوچے کہ میں اس دولت اور اس سعادت کے لائق کہاں تھا کہ کلام الٰہی کو پڑھ سکوں یہ محض عنایت ایزدی و توفیق الٰہی ہے۔ یہ کیفیت وارد نہ ہوسکے تو یہ خیال کرے کہ تلاوت قرآن کا اجر دینے والا اللہ ہے، یقیناً وہ مجھے اپنے فضل و کرم سے نوازے گا اور اس کا اجر دے گا۔[1]

قرآن کریم کے ادب کی نگہداشت کے سلسلے میں فرمایا کہ سلطان محمود غزنوی کو اس کی وفات کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا اور اس سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اس نے کہا کہ ایک رات کو میں کسی مکان میں تھا وہاں طاق میں قرآن کریم رکھا ہوا تھا، میں نے دل میں سوچا کہ یہاں تو قرآن کریم رکھا ہوا ہے میں کیسے سوؤں گا، پھر سوچا کہ قرآن کو یہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل کر دوں، پھر خیال آیا کہ صرف اپنے آرام کے لیے قرآن کو یہاں سے کیوں باہر نکالوں، غرض اسی ادھیڑبن میں ساری رات بیٹھے بیٹھے گذار دی، جب میری وفات ہوئی تو قرآن کا ادب کرنے کے طفیل میں مجھے بخش دیا گیا۔[2]

امیر حسن علاء دہلوی جامع فوائد الفواد نے عرض کیا کہ فوج میں قرآن کریم کیسے لے جایا جائے اس کی حفاظت کرنا دشوار ہوتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ ضرور لے جانا چاہیئے اسلام کے ابتدائی زمانے میں قرآن کریم کو لشکر میں نہیں لے جاتے تھے اندیشہ یہ تھا کہ اگر شکست ہوگئی تو یہ دشمنوں کے ہاتھ لگ جائے گا۔ جب اسلام کو قوت اور اقتدار نصیب ہو گیا اور لشکر بھی بھاری ہونے لگا تو قرآن بھی لے جانے لگے تھے امیر حسن نے کہا کہ خیمے میں قرآن شریف کا رکھنا دشوار ہوتا ہے، مراد یہ کہ زمین پر رکھنا پڑتا ہے تو حضرت نے فرمایا کہ اسے اپنے سرہانے رکھ لینا چاہیئے۔[3]

ایک اور موقع پر امیر حسن نے دریافت کیا کہ بعض قبروں پر قرآن کی آیات یا کوئی دعا لکھ دی جاتی ہے، یہ کیسا ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ نہیں لکھنا چاہیئے اور کفن کے کپڑے پر بھی لکھنا مناسب نہیں۔[4]

قرآن حکیم میں جو موضوعات و مضامین آئے ہیں ان کو بھی حضرت نے ایسے ایجاز کے ساتھ بیان کر دیا جسے اعجاز ہی کہا جا سکتا ہے۔

فرمایا کہ سارے قرآن میں جو موضوعات ہیں وہ سورۃ فاتحہ میں موجود ہیں۔ قرآن میں (۱۰) مضامین ہیں، ان میں سے (۸) فاتحہ میں موجود ہیں۔ قرآن کے موضوعات یہ ہیں:

ذات۔ صفات۔ افعال۔ ذکر معاد، تزکیہ۔ تخلیہ ذکر اعداء۔ ذکر اولیاء۔ محاربہ کفار۔ احکام شرع۔

ان میں سے آٹھ موضوعات کا احاطہ سورۂ فاتحہ کرتی ہے اس کی تشریح آپ نے یوں فرمائی کہ الحمد للہ میں ذات، رب العالمین میں افعال، الرحمٰن الرحیم میں صفات، ملک یوم الدین میں ذکر آخرت، ایاک نعبد تزکیہ، ایاک نستعین تخلیہ اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم ذکر اولیاء، غیر المغضوب علیھم ولا الضالین میں ذکر اعداء ہے۔

بس دو موضوعات جو قرآن میں ہیں سورۂ فاتحہ میں نہیں ہیں وہ ہیں محاربہ کفار اور احکام شرع[5] سورۂ فاتحہ کی فضیلت کے بارے میں فرمایا کہ

---

[1] فوائد الفواد: ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ [2] فوائد الفواد: ۲۸۱۔ [3] ایضاً۔
[4] فوائد الفواد: ۴۰۵۔ [5] فوائد الفواد: ۱۲۷۔

اگر کسی کو کوئی مشکل پیش آئے کسی دشوار مہم کا سامنا ہو تو سورۂ فاتحہ اس طرح پڑھے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی میم کو الحمد للہ کے لام میں ملا دے یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیمِ الحَمدُ للہ جب الرحمٰن الرحیم تک پہنچے تو اسے تین بار ادا کرے اور سورہ کے آخر میں تین بار آمین کہے اللہ تعالیٰ اس کی حاجت پوری کر دے گا۔[1]

ایک مجلس میں حضرت نے مسبعات عشر کی فضیلت بیان کی اور فرمایا کہ ایک شخص ہمیشہ مسبعات عشر پڑھا کرتا تھا۔ ایک بار وہ ایسے راستے سے گذرا جہاں رہزنوں کی ٹولی نے اسے پکڑ لیا اور ہلاک کرنا چاہا، اسی اثنا میں دس سوار ظاہر ہوئے جن کے پاس ہتھیار بھی تھے انھوں نے اس شخص کو رہزنوں کے چنگل سے چھڑا دیا۔ وہ دسوں سوار ننگے سر تھے اس شخص نے ان سے پوچھا آپ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا: ہم مسبعات عشر ہیں جو تم ہر روز سات بار پڑھا کرتے ہو۔ اس شخص نے کہا: آپ ننگے سر کیوں ہیں؟ انھوں نے کہا: اس لیے کہ تم ہر دعا کے شروع میں بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم نہیں پڑھتے ہو۔[2]

حضرت قرآن کریم سے فال بھی لیتے تھے۔ امیر حسن دہلوی رح نے حضرت سے پوچھا کہ قرآن سے فال نکالنا کہیں آیا ہے؟ فرمایا کہ ہاں، اور اس کے بارے میں ایک حدیث بھی آئی ہے۔ پھر فرمایا کہ قرآن کریم کو فال کے لیے کھولیں تو داہنا ہاتھ استعمال کریں اس کے ساتھ بایاں ہاتھ نہ ملائیں۔ پھر آپ نے حضرت بدرالدین غزنوی رح کا قصہ بیان کیا، انھوں نے کہا کہ میں غزنین سے لاہور آیا، اس وقت لاہور خوب بھرا پُرا اور آباد تھا، کچھ دنوں وہاں رہا، پھر وہاں سے سفر کا ارادہ کیا، ایک خیال تو یہ ہوا کہ دہلی کی طرف جاؤں، دوسرا دل کہتا تھا کہ غزنین کو واپس ہو جاؤں اسی شش و پنج میں تھا اور زیادہ کشش غزنین کی جانب محسوس کرتا تھا کیونکہ ماں باپ، رشتہ دار اور دوست وہیں تھے دہلی میں صرف ایک داماد تھا۔ غرض میں نے یہ نیت کی کہ قرآن شریف سے فال دیکھوں، ایک بزرگ کی خدمت میں گیا۔ پہلے غزنین کی نیت سے فال دیکھی تو عذاب کی آیت نکلی، پھر دہلی کی نیت سے دیکھی تو ایسی آیت نکلی جس میں بہشت اور اس کی نہروں کا اور جنت کی صفات کا ذکر تھا۔ اگرچہ میرا دل غزنین کی جانب مائل تھا مگر میں نے قرآنی فال پر عمل کرتے ہوئے دہلی کا سفر اختیار کیا۔ جب دہلی آیا تو معلوم ہوا کہ یہاں میرا داماد قید خانے میں ہے میں شاہی محل کی ڈیوڑھی پر گیا تاکہ داماد کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ دیکھا تو وہ شاہی محل کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا اور ایک ہمیانی اس کے ہاتھ میں تھی اس میں خاصی رقم تھی، مجھے دیکھ کر لپٹ گیا اور بہت خوش ہوا مجھے اپنے گھر لے گیا وہ تھیلی میرے سامنے رکھ دی اس میں رقم دیکھ کر مجھے اطمینان حاصل ہوا اسی زمانے میں کچھ دنوں کے بعد غزنین سے خبر آئی کہ مغلوں نے اس شہر پر حملہ کیا اور میرے ماں باپ نیز تمام دوسرے رشتہ داروں کو قتل کر دیا۔[3]

قرآن کریم سے اتنا گہرا شغف ہو تو یہ ممکن نہیں کہ اسے حفظ کرنے کا ولولہ پیدا نہ ہو کثرت سے تلاوت کرنے والے کو قرآن کریم کا بڑا حصہ تو یاد

---

[1] فوائد الفواد: ۱۳۶۔ [2] فوائد الفواد: ۳۸۱ درر نظامی: ۱۱۶۔
[3] ایضاً: ۱۲۴ - ۱۲۵ -

بھی ازبر ہو جاتا ہے، حضرت کو بھی بچپن ہی میں بہت سی سورتیں خصوصاً آخری سیپارہ یاد ہو گیا ہوگا۔ اولیاء اللہ کا تو یہ حال ہے کہ اگر وہ اُمّی بھی ہوں تو قرآن کے انوار کو آسمان سے زمین تک پھیلا ہوا دیکھ لیتے ہیں۔

ایک درویش حسن افغان کا قصہ حضرت نے بیان فرمایا کہ وہ قطعاً ناخواندہ تھے، لوگ ان کے پاس کاغذ یا تختی لے کر آتے جس میں کچھ نظم کچھ نثر، کچھ عربی کچھ فارسی متفرق عبارتیں لکھی ہوتیں، انھیں میں بعض قرآنی آیات بھی ملا دیتے تھے پھر ان سے پوچھتے تھے کہ ان میں قرآنی آیت کون سی ہے؟ وہ اُسی پر اپنی انگلی رکھ دیتے تھے۔ لوگوں نے کہا: آپ نے قرآن تو پڑھا نہیں پھر کیسے پہچان لیتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ جو نور میں اس آیت والی سطر میں دیکھ رہا ہوں وہ دوسری سطروں میں نہیں ہے۔[1]

حضرت کو بھی قرآن کریم حفظ کرنے کا اشتیاق تھا۔ چشتی مشائخ میں سے بیشتر حضرات نے قرآن حفظ کیا ہے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہ نے تو بالکل آخری زمانے میں حفظ کیا تھا، جب پورا قرآن حفظ ہو گیا تب آپ کا وصال ہوا۔[2]

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے حافظ قرآن ہونے کی کوئی تحریری سند تو نظر سے ابھی تک نہیں گذری، مگر یہ معلوم ہے کہ وہ فن تجوید میں پوری مہارت رکھتے تھے، غالب گمان یہی ہے کہ حافظ بھی ہوں گے۔ بابا صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ جسے قرآن حفظ کرنے کی تمنا ہو وہ پہلے سورہ یوسف یاد کر لے اس کی برکت سے اللہ پورا قرآن حفظ کرنے کی توفیق عطا فرما دیتا ہے۔[3] حضرت خواجہ نظام الدینؒ نے بدایوں کے ایک قاری کا تذکرہ کیا ان کا نام شادی تھا۔ ساتوں قراءتوں میں قرآن پڑھتے تھے نہایت متقی، پرہیزگار اور صاحب کرامت بزرگ تھے یہ ایک ہندی غلام تھے۔ ان کی ایک کرامت یہ تھی کہ جو کوئی ان سے قرآن کریم کا ایک جزو پڑھ لیتا تھا اُسے پورا قرآن حفظ ہو جاتا تھا۔ حضرت نے بھی ان کی خدمت میں رہ کر ایک سیپارہ پڑھا تھا۔ یہ حضرت کی تعلیم کا ابتدائی دور تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ اس ایک سیپارہ پڑھنے کی برکت سے مجھے پورا قرآن یاد ہو گیا۔[4]

مگر حفظ قرآن کی یہ سعادت دہلی آنے کے بعد بلکہ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ سے بیعت کرنے کے بعد ملی۔ یہ ۶۸۶ھ سے قبل کا زمانہ تھا جب آپ شہر دہلی میں رہتے تھے اور غیاث پور میں سکونت اختیار نہیں کی تھی۔ ۶۶۹ھ میں خلافت لینے کے بعد آپ نے سند حدیث ۶۷۹ھ میں حاصل کی غالباً اس کے بعد حفظ کیا۔ حوض رانی کے پاس باغ جسرتھ ایک خوبصورت تفریح گاہ تھی وہاں جا کر کبھی نوافل پڑھتے تھے کبھی چہل قدمی کرتے ہوئے قرآن کریم یاد کیا کرتے تھے۔[5]

فوائد الفواد میں قرآن کریم سے متعلق گفتگو (۲۴) مواقع پر آئی ہے اور قرآن کی (۲۱) آیات کے حوالے ملتے ہیں۔ حضرت نے قرآن کی بعض آیات یا الفاظ کے معانی بتائے ہیں یا ان کی تفسیر و تشریح کی ہے یا تاویل و توجیہہ بیان فرمائی ہے یا ان کی تاثیر اور فضیلت کا ذکر کیا ہے۔

تذکرہ یہ تھا کہ شیخ جلال الدین تبریزیؒ سے کسی نے پوچھا اگر کوئی شخص سحری کھائے اور روزہ

---

[1] فوائد الفواد: ۱۵ — ۱۶۔ سیر العارفین: ۲۷ — ۲۶۔
[2] فوائد الفواد: ۱۳۵۔ [3] فوائد الفواد: ۱۱۰ درر نظامی: ۱۰۲۔
[4] فوائد الفواد: ۲۶۲۔ [5] فوائد الفواد: ۲۶۲۔ فوائد الفواد: ۲۴۲۔ سیر العارفین: ۱۲۲۔

(فقل) نہ رکھے تو کیسا ہے؟ انھوں نے کہا: سحری بھی کھائے، دن میں بھی کھائے، شام کو بھی کھائے اس سے بدن کو جو طاقت حاصل ہو وہ اللہ کی عبادت میں خرچ کرے اور کوئی گناہ نہ کرے اس پر امیر حسن نے قرآنی آیت کی طرف اشارہ کیا کلوا من الطیبٰت۔ حضرت نے آیت کو پورا پڑھ دیا: کلوا مِنَ الطَّیِّبٰتِ واعملوا صَالِحًا۔ اس پر امیر حسن نے عرض کیا: اصحاب کہف نے جو ازکیٰ طعاما کہا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: وہ ایسا کھانا چاہتے تھے جس کی طرف طبیعت کو رغبت ہوتی ہے پھر فرمایا کہ بعض کا قول ہے کہ اس سے ان کی مراد چاول کا بنا ہوا کھانا تھی [1]

۱۱ ذی الحجہ ۷۱۶ھ / ۲۵ جنوری ۱۳۱۷ء

ایام تشریق تھے، خلق کا ہجوم تھا، لنگر جاری تھا، بار بار کھانا لایا جا رہا تھا حضرت نے بطور خوش طبعی فرمایا کہ کسی درویش سے پوچھا گیا کہ تمہیں کلام اللہ کی کون سی آیت سب سے زیادہ پسند ہے؟ اس نے کہا: أُكُلُهَا دَائِمٌ (اس کے میوے سدا بہار ہیں)۔ پھر فرمایا کہ ایک لفظ اُکُلٌ ہے، ایک اکلۃٌ ہے ایک اُکلۃٌ ہے پھر چاروں کی تشریح کی کہ اکل مصدر ہے یعنی کھانا، اُکل وہ چیز ہے جو کھائیں، اُکلۃٌ ایک ہی بار میں کھا لینا ہے اور اُکلۃٌ کے معنی ہیں لقمہ [2]

یہ تذکرہ ہوا کہ ایک دینی رشتہ ہوتا ہے، ایک نسبی ہوتا ہے۔ ان میں دینی رشتہ زیادہ مضبوط ہے۔ برادران طریقت کی باہمی محبت قوی تر ہوتی ہے۔ فرمایا کہ مومن بھائی کی میراث کافر بھائی کو نہیں پہنچتی، دینی بھائی کا رشتہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ قائم رہتا ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی الأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ۔

فرمایا جن دوستوں کی دوستی کی بنیاد فسق و فجور پر ہوتی ہے کل قیامت کے دن وہ ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے

اولیا، وابدال و اوتاد کی جگہ اگر خالی ہو تو اس کے پُر کرنے کا سوال تھا کسی نے کہا کہ اولیا ۴۰۰ ہیں ان میں جو کم ہو جاتا ہے اس کی جگہ خالی رہ جاتی ہے کیونکہ ولایت کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ یہ مسئلہ امیر حسن نے پیش کیا تو پوری گفتگو سن کر حضرت نے فرمایا ایسا نہیں ہے ولایت کی دو قسمیں ہیں۔ ولایت ایمان اور ولایت احسان۔ ولایت ایمان یہ ہے کہ جو بھی مومن ہو وہ ولی ہو سکتا ہے آپ نے تائید میں یہ آیت پڑھی اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّوْرِ (قرآن ۳۹: ۹)

البتہ ولایت احسان یہ ہے کہ کسی کو کشف و کرامت اور روحانی مرتبہ عالی نصیب [3] ہو جائے۔

عدل اور ظلم کا ذکر ہو رہا تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ سارا عالم اللہ کی ملک ہے۔ اگر کوئی اپنی ملک میں تصرف کرے تو اسے ظلم نہیں کہتے، ظلم یہ ہے کہ دوسروں کے مال میں تصرف کرے۔ اشعریوں کا مذہب یہی ہے کہ اللہ چاہے تو مومن کو دوزخ میں ڈال دے اور ہمیشہ وہیں رکھے اور ایک کافر کو جنت میں بھیج دے اور ہمیشہ وہیں رکھے کیونکہ اس طرح وہ اپنی ملکیت میں تصرف کرے گا، اس کو ظلم نہیں کہا جا سکتا۔

حضرت نے فرمایا کہ ہمارا مذہب یہ نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ ۝ (۶: ۵۰ سورۃ الانعام)

نادان دانا کے برابر نہیں، نابینا بینا کے برابر نہیں، اسی طرح کی چند مثالیں دی ہیں۔ اب اس کی

[1] فوائد الفواد: ۳۶۰ [2] فوائد الفواد: ۲۹۴ [3] فوائد الفواد: ۱۳۹ درر نظامی (باب ۲۹) [4] فوائد الفواد: ۳۰۴

حکمت کے لیے یہ واجب ہے کہ مومن کو بہشت میں لے جائے اور کافر کو دوزخ میں رکھے کیوں کہ وہ حکیم ہے، حکمت کے اقتضا کے مطابق کام کرتا ہے جیسے اگر کسی شخص کے پاس مال ہو وہ اُسے جس طرح چاہے خرچ کرے، لیکن اگر وہ اپنے مال کو لے جاکر کنوئیں میں جھونک دے تو یہ حکمت نہیں کہلائے گی [1]

امیر حسن دہلوی نے عرض کیا: آپ کی زبان مبارک سے بارہا سنا ہے کہ قرآن کی تلاوت کو شعر گوئی پر غالب رہنا چاہیے، آپ کے ارشاد کی برکت سے بندہ اب ہر روز قرآن پڑھتا ہے اور یہ امید کرتا ہے کہ جو کچھ اب تک کہا ہے یا آئندہ کہا جائے گا اس سے توبہ نصیب ہو جائے گی حضرت نے اس التماس پر پسندیدگی کا اظہار کیا تو امیر حسن نے پھر عرض کیا کہ وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ [2] کے معنی تو یہ معلوم ہوتے ہیں کہ شعراء کی متابعت کرنے والے گمراہ لوگ ہیں اور آپ کی زبان مبارک سے بارہا یہ بھی سنا ہے کہ إِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً [3] حدیث ہے۔ تو اگر شعر کہنے والے اہل حکمت ہیں ان کا اتباع کرنے والے گمراہ کیسے ہو سکتے ہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ جو شعراء ہزل گو اور ہجو گو ہیں یہ آیت ان کا اتباع کرنے والوں کے بارے میں ہے ورنہ صحابہ کرام نے بھی شعر کہے ہیں، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے اصحاب نے کہے ہیں [4]

نصِ قرآن سے فقہی مسئلے کا استخراج کرنے کے بارے میں حضرت نے ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک شخص امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ میں نے چھ ماہ قبل ایک عورت سے نکاح کیا تھا، آج اس نے ایک بچے کو جنم دیا ہے اس بارے میں کیا حکم ہے؟ حضرت عمر نے اس عورت کو سنگسار کیے جانے کا حکم دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس وقت موجود تھے انھوں نے اس میں تامل کیا تو حضرت عمر نے ان سے پوچھا: آپ کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ قرآن میں ہے وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا [5] یعنی مدت حمل اور مدت شیر خوارگی ۳۰ مہینے بتائی ہے دو سال شیر خوارگی کی مدت ہوتی ہے تو لامحالہ حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ قرار پائے گی۔ حضرت عمر نے اپنا حکم واپس لے لیا اور فرمایا لَوْلَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ (اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا)۔

ایک مجلس میں توکل اور رزق کا تذکرہ تھا حضرت نے فرمایا کہ رزق کی چار قسمیں ہیں رزق مضمون، رزق مقسوم، رزق مملوک اور رزق موعود۔

رزق مضمون وہ ہے جس کی ضمانت دی گئی ہے۔ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا [6] اسی کے بارے میں ہے۔ رزق مقسوم وہ ہے ازل سے قسمت میں لکھ دیا گیا ہے رزق مملوک وہ روپیہ پیسہ یا سامان وغیرہ ہے جو انسان اپنے لیے جوڑ کر رکھتا ہے۔ رزق موعود کا اللہ نے اپنے صالح بندوں کے لیے وعدہ کیا ہے جس کا اشارہ اس آیت میں موجود ہے: وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ

---

[1] فوائد : ۱۹۱ — ۱۹۰ ۔ [2] القرآن ۲۲۴ : ۲۶ فوائد الفواد : ۲۲۳ ۔
[3] صحیح بخاری عن ابی بن کعب، فیض القدیر للمناوی ج ۲ : ۵۲۴ ۔ ۵۲۵ وروی ابوداؤد عن بریدۃ اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا و اِنَّ مِنَ الْعِلْمِ جَہْلًا و ان من الشعر حکمًا (الجامع الصغیر مع شرح الفیض القدیر ۲ : ۵۲۴) [4] فوائد : ۲۲۳ ۔ [5] القرآن ۱۵ : ۴۶ فوائد الفواد : ۲۲۴ ۔
[6] القرآن ۶ : ۱۱ ۔

حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ [۱]

اس تشریح کے بعد حضرت نے فرمایا کہ توکل کا تعلق رزق مضمون یعنی جس رزق کی ضمانت دی گئی ہے اسی سے ہے۔ دوسری قسموں کے رزق میں توکل نہیں ہے۔ جو رزق قسمت میں لکھا جا چکا ہے اس میں توکل کیا کرنا؟ جو ذخیرہ اپنی ملکیت میں ہے اس میں بھی توکل کی ضرورت نہیں اور جس رزق کا وعدہ ہے وہ بھی ضرور پہنچے گا توکل کرے یا نہ کرے۔ لہذا توکل صرف رزق مضمون سے متعلق ہے [۲]

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اصول تفسیر سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ تفسیر و تاویل کے فرق و امتیاز کو جانتے تھے۔ ناسخ و منسوخ کے احکام کے شناسا تھے، تفسیر ماثور اور تفسیر بالرائے کی باریکیوں سے بھی آشنا تھے۔

فوائد الفواد میں تفسیر کی ۴ کتابوں کے نام ملتے ہیں یعنی تفسیر امام ناصری اور تفسیر کشاف۔ ایجاز اور عمدہ۔ تفسیر امام ناصری دوشنبہ ۷۔ ذی قعدہ ۷۱۰ھ/ ۲۸ / مارچ ۱۳۱۱ء کی مجلس میں حضرت کے سامنے رکھی تھی [۳] اس کے مصنف کا نام فوائد الفواد کے ایک اور نسخے میں ناصر الدین بشتی ملتا ہے اور درر نظامی میں نام ناصر نسفی لکھا ہے [۴] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مفسر نخشب کے رہنے والے تھے۔ ان کے زندہ در گور ہو جانے اور سورہ یٰسین کی تلاوت کی برکت سے قبر سے برآمد ہونے کا قصہ بھی حضرت نے بیان کیا ہے

تفسیر کشاف کا پورا نام الکشاف عَنْ حَقَائِقِ غَوَامِضِ التَّنْزِیْلِ وَعُیُوْنِ الْاَقَاوِیْلِ فِیْ وُجُوْہِ التَّاوِیْلِ ہے یہ بارہا چھپی ہے، مگر سب سے پہلے ۱۸۵۶ء ۱۲۷۳ھ میں مستشرق NASSAU LEES نے دو جلدوں میں کلکتہ سے شائع کی تھی۔

تفسیر کشاف کے مصنف ابوالقاسم محمود بن عمر بن محمد بن عمر الزمخشری ہیں جنھیں جار اللہ الزمخشری بھی کہا جاتا ہے [۵] یہ ۲۷/ رجب ۴۶۷ھ/ ۱۹/ مارچ ۱۰۷۵ء کو زمخشر میں پیدا ہوئے ۵۳۸ھ/ ۴۴-۱۱۴۳ء میں وفات پائی۔ زمخشری اپنے مسلک میں حنفی معتزلی ہیں اور ان کی تفسیر تفسیر بالرائے کا سب سے ممتاز نمونہ ہے۔ انھوں نے اپنی تفسیر رجب ۵۲۸ھ میں مکہ مکرمہ میں بیٹھ کر تمام کی۔ اس پر حافظ شیرازی (متوفی ۷۹۲ھ/ ۸۹-۱۳۹۰) نے حواشی بھی لکھے تھے

صاحب کشاف سخت معتزلی اور صوفیہ کا منکر ہے۔ حضرت نے فرمایا افسوس ہے کہ اتنا بڑا عالم ہونے کے باوجود باطل عقیدہ رکھتا تھا۔ پھر فرمایا کہ ایک تو کفر ہے دوسرے بدعت ہے تیسرے معصیت ہے بدعت معصیت سے بالاتر یعنی زیادہ ہے اور کفر بدعت سے زیادہ ہے لہذا بدعت کفر سے نزدیک تر ہے۔ گویا الزمخشری کو ان کے عقائد کی وجہ سے حضرت نظام الدین اولیاء بدعتی سمجھتے تھے [۶]

حضرت نے کشاف کے تذکرے میں ایک واقعہ بھی بیان کیا جس سے زمخشری کے بارے میں صوفیہ کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ فرمایا کہ میں نے مولانا صدر الدین کو نوی [۷] سے سنا ہے وہ کہتے تھے کہ ایک

---

[۱] القرآن ۲ : ۶۵ [۲] فوائد الفواد : ۱۷۶۔ [۳] فوائد : ۱۷۶۔ [۴] فوائد الفواد : ۱۰۱۔
[۵] درر نظامی : ۱۰۳۔ [۶] فوائد الفواد ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ [۷] فوائد : ۱۸۶۔
[۸] فوائد الفواد کے مطبوعہ متن میں صدر الدین قونیوی لکھا ہے، یہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے خلیفہ ہیں، میں انتقال کیا، دمشق میں مدفون ہیں۔ ان سے حضرت نظام الدین رح کی ملاقات خارج از امکان ہے۔ ایک اور نسخے میں "کولی" لکھا ہے یہاں "کولوی" (کول = علی گڑھ) ہوگا جسے کسی نے قونیوی لکھ دیا۔

میں مولانا نجم الدین سنامی کے پاس تھا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا: کس کام میں مشغول رہتے ہو؟ میں نے کہا، مطالعہ تفسیر کرتا ہوں۔ پوچھا: کون سی تفسیر پڑھتے ہو؟ میں نے کہا: کشاف اور عمدہ اور ایجاز۔ مولانا نجم الدین نے کہا: کشاف اور ایجاز کو جلا ڈالو بس عمدہ ہی پڑھو۔ مولانا صدر الدین نے کہا مجھے یہ بات ناگوار ہوئی میں نے کہا: آپ ایسا کیوں کہتے ہیں؟ فرمایا: شیخ بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ نے ایسا ہی کہا ہے۔ مولانا صدر الدین کہتے ہیں: مجھے یہ بات بھی گراں گذری۔ جب رات ہوئی تو میں یہ تینوں کتابیں چراغ کے سامنے رکھ کر پڑھ رہا تھا ایجاز اور کشاف نیچے رکھی تھیں اور تفسیر عمدہ ان دونوں کتابوں کے اوپر تھی۔ اسی دوران میں مجھے نیند آگئی۔ اچانک ایک شعلہ بھڑکا میری آنکھ کھل گئی۔ کشاف اور ایجاز جو دونوں نیچے رکھی تھیں جل چکی تھیں اور عمدہ صحیح سلامت رکھی تھی۔[1]

الزمخشری مفسر ہی نہیں بہت بڑے نحوی اور علم اللغہ کے ماہر بھی ہیں ان کی ایک تالیف المفصّل فی صَنَاعَةِ الاعراب ہے۔ صوفیہ اس کا پڑھنا بھی پسند نہ کرتے تھے حالانکہ اس کا تفسیر سے کچھ علاقہ نہیں نحو کی کتاب ہے۔ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے فرزند شیخ صدر الدین نے المفصل پڑھنے کا ارادہ کیا اور اپنے والد ماجد سے اس خیال کا اظہار کیا تو انھوں نے فرمایا: آج کی رات صبر کرو، کل بتاتا۔ رات کو شیخ صدر الدین نے خواب دیکھا کہ کسی کو زنجیروں میں جکڑ کر لے جا رہے ہیں۔ پوچھا: یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا، مفصّل کا مصنف زمخشری ہے اسے ہم دوزخ میں ڈالنے کو لے جا رہے ہیں[2]

الزمخشری کی ایک ٹانگ کاٹ دی گئی تھی اور لکڑی کی ٹانگ لگا دی تھی۔ مولانا روم نے اسی کی جانب اشارہ کیا ہے:

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

(ترجمہ: منطقیوں کے پاؤں لکڑی کے ہوتے ہیں اور لکڑی کے پاؤں تو سخت کمزور ہوتے ہیں)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، تفسیر بالرائے کو بدعت اور بدعت کو کفر سے قریب تر سمجھتے تھے اس کا اندازہ تو الزمخشری اور اس کی تصانیف کے بارے میں حضرت کے خیالات سے ہو جاتا ہے کہ آپ تفسیر بالماثور کو راجح سمجھتے تھے اس کی مثال یہ ہے کہ آیت قرآن:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ (۵۶:۵۱) کے بارے میں آپ نے فرمایا حضرت عبداللہ بن عباس کا قول ہے: اِلَّا لِيُوَحِّدُوْنِ یعنی جن و انس کو موحد بننے کے لیے پیدا کیا ہے، جو اس دنیا میں موحد ہے اس کا ایمان ایمان بالغیب ہے۔ کل قیامت میں عذاب دیکھ کر جو ایمان کا اقرار کرے گا وہ معتبر نہ ہوگا اس لیے لِيُوَحِّدُوْنَ تفسیر درست ہے[3]

اختلاف قرأت پر بھی حضرت کی نظر رہتی تھی اس کی ایک مثال ۴ر شوال ۷۱۹ھ کی مجلس میں ہے حضرت نے فرمایا یہ دو نکتے میں نے ایک کتاب میں دیکھے دوسری جگہ کم دیکھے آیت وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا (۲۰:۷۶)۔ یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ مَلِكًا كَبِيْرًا پڑھتے تھے[4] دوسری آیت:

لَقَدْ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (۹:۱۲۸)

---

[1] فوائد: ۱۸۸۔ [2] سیر العارفین (اردو ترجمہ) ۱۶۱ - ۱۶۲۔
[3] فوائد: ۱۱۹ درر نظامی: ۴۸۔ [4] فوائد الفواد: ۳۷۹۔

میں اَنفسکم کو بعض نے اَنفَسکم بھی پڑھا ہے۔
انفس نفیس کا افعل التفضیل ہے یعنی تم میں سب سے زیادہ نفیس ہیں۔[1]

○

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء قدس اللہ سرہ العزیز کی ذات گرامی شریعت، طریقت، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تصوف، معقولات، ادب، شعر، اخلاقیات، اصول عقائد ہر میدان میں یگانہ ہے۔ بقول شاعر:

سراپا میں جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر اپنی بسر کیجیے

حضرت کی مبارک زندگی، تعلیمات، ملفوظات، عقائد اور علوم کے بارے میں ابھی تک جو کچھ بھی کام ہوا ہے وہ بے شائبہ تمثیل ایسا ہے کہ سمندر کے کنارے سے سیپیاں اٹھائی جا رہی ہیں، نہ سمندر کی تہ کا اندازہ ہے نہ ان موتیوں تک رسائی کا حوصلہ ہے۔

حضرت کے علوم قرآنیہ سے شغف اور تفہیم قرآن کریم پر کچھ لکھنے کو قلم اٹھایا تو اندازہ ہوا کہ یہ موضوع خود ایک بڑی بھرپور کتاب میں بھی مشکل سے سمائے گا۔

یہاں سارے مآخذ سے رجوع بھی نہیں کیا گیا اور بیشتر مباحث کی تفصیل میں جانے سے قصداً احتراز کیا ہے، تب بھی اس موضوع کے بہت سے ذیلی عنوانوں کو نظر انداز کرتے ہوئے گزرنا پڑا۔ کاش اسلامک اسٹڈیز کا کوئی طالب علم اس موضوع کو اپنی ریسرچ کے لیے منتخب کر کے اس کا حق کسی قدر ادا کر سکے۔

○

---

[1] فوائد الفواد: ۳۸۰۔

(حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی مدظلہ کی فرمائش پر حضرت بی بی فاطمہ سام اور حضرت خواجہ بانو نظامی رحمۃ اللہ علیہا کے عرس پر خواجہ ہال میں "قرآن فہمی" کے زیر عنوان مجلس میں پڑھا گیا۔ ۱۷۔ شعبان ۱۴۱۴ھ مطابق ۳۰۔ جنوری ۱۹۹۴ء یکشنبہ)

فوائد الفواد

عبادت لازمی اور عبادت متعدی کا فرق

حضرت، شیخ (نظام الدین) علیہ الرحمہ کی محدثانہ فقاہت

حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی

شیخ علیہ الرحمہ نے ایک مجلس میں عبادت کی دو قسمیں کیں۔ ایک عبادت لازمی ـــــ دوسری عبادت متعدی۔ اور دونوں قسم کی عبادات کے درمیان ایک نہایت حکیمانہ فرق بیان کیا ـــــ فرمایا

لازمی اطاعت وہ ہے۔ جس کا فائدہ اطاعت گزار کی ذات کو پہنچتا ہے اور یہ نماز، روزہ، حج اور ذکر الٰہی ہے۔ اور متعدی اطاعت وہ ہے جس کا فائدہ دوسروں کو پہنچے، خدا کی راہ میں انفاق اور صدقہ کرنے سے اور جہاں تک ممکن ہو دوسروں کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے کام کرنے سے۔

لازمی اطاعت میں اخلاص ضروری ہے اور متعدی عبادت جس طرح ادا کی جائے اس کا اجر و ثواب ملتا ہے۔ (جلد اول مجلس ۱۳، ص۲۲۶)

شیخ علیہ الرحمہ نے بخاری شریف کی جس حدیث سے اور اس کی شرح کرتے ہوئے شارح بخاری علامہ عینی نے جو کلام کیا ہے اس کلام سے استنباط کرتے ہوئے جو اوپر والا فرق دونوں قسم کی عبادتوں میں کیا ہے ـــــ پہلے اسے دیکھئے۔

امام بخاری نے کتاب المزارعۃ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے ما من مسلم یغرس غرسا او یزرع زرعًا فیاکل منه طیرٌ او انسان او بهیمة الا کان له به صدقة

(جلد اول ص۳۱۲)

جو مسلمان کوئی پودا لگاتا ہے یا کھیتی کرتا ہے اور پرندہ یا انسان یا کوئی مویشی اسے کھاتا ہے تو وہ اس کے لئے صدقہ کرنے کے حکم میں ہے۔

علامہ عینی نے الفاظ حدیث کے عموم کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے ـــــ علماء اسلام نے کہا ہے کہ کھیتی کرنے والا اجر و ثواب کی نیت کرے یا نہ کرے ہر حالت میں اسے آخرت کا اجر ملے گا کیونکہ ـــــ لوسعتم علی الناس فی اقواتهم ـــــ اس کے اس عمل سے مخلوق خدا کی روزی میں اضافہ ہوتا ہے۔

(عینی جلد ۵ ص۱۱۱)

اس حدیث پر فقہاء اسلام نے کہا ہے کہ کھیتی ایسا عمل خیر ہے جس پر مسلمان اور غیر مسلم دونوں کو ثواب ملتا ہے۔ (المبسوط العلامہ سرخسی جلد ۲۳ کتاب المزارعۃ)

شیخ علیہ الرحمہ نے کھیتی اور باغبانی پر قیاس کر کے ہر ایسے عمل خیر کے لئے یہ حکم لگا دیا ہے جس عمل خیر سے خدا کی مخلوق کو فائدہ پہنچتا ہے ـــــ شیخ علیہ الرحمہ کا یہ فقہی اجتہاد الہامی حکمت اور شرعی فہم و بصیرت کا

نتیجہ ہے ــــ یہ حکمت کتاب الٰہی کے ساتھ۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی خفی نازل ہوئی اور آپ کے نائبین (علماء حق واہل اللہ) پر بذریعہ القاء والہام نازل ہوتی ہے۔

یہ حکمت وہ فہم وبصیرت ہے جس کے ذریعہ کتاب الٰہی کے احکام کو موقعہ ومحل اور احوال وظروف کی رعایت سے پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت شیخ علیہ الرحمہ کو آپ کے مشن (محبت کی راہ سے حق کی اشاعت) کے تعلق سے یہ حکیمانہ تعبیر سکھائی گئی۔

قرآن کریم نے اعمال حسنہ کی قبولیت کے لئے اخلاص اور رضاء الٰہی کے جذبہ کی شرط لگائی وما امروا الا لیعبدو اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء (البینہ ۵)

اور ان کو یہی حکم ہوا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، مخلص ہوکر اور یکسو ہوکر۔

احادیث میں آتا ہے کہ جن تین شخصوں سے جہنم کے عذاب کی ابتداء کی جائے گی یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے تلاوت قرآن، جہاد فی سبیل اللہ اور انفاق (زکوٰۃ) ادا کرنے میں دکھاوا کیا ہوگا۔

ایک حدیث میں واضح طور پر دکھاوے کو شرک قرار دیا گیا۔ (مشکوٰۃ ۴۵۶)

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان عبادات لازمہ کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ میرا حق صرف میری خوشنودی کے لئے ادا کیا جائے۔

اس عبادت سے میری کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی، اس کا فائدہ پلٹ کر عبادت گذار بندہ ہی پہنچتا ہے لیکن جب میرے بندے میری رضاء کے ساتھ مخلوق کی رضاء کو پیش نظر رکھتے ہیں تو یہ شرک فی الرضاء ہے جو خدا تعالیٰ کو کسی حالت میں پسند نہیں۔

رہی بات عبادت متعدی کی ــــ جو ضرورتمندوں کی مالی امداد سے اور ان کے ساتھ اچھے سلوک اور اچھے اخلاق کے ذریعہ ادا کی جاتی ہے۔ اور یہ حقوق العباد کہلاتے ہیں تو ان کا مقصد مخلوق کی احتیاج پوری کرنا ہے ــــ وہ ہر صورت میں پوری ہوتی ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ کے اس اجتہاد کی تائید رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ نے ایماندار اور سچے تاجر کو آخرت میں حضرات انبیاء وصدیقین کے ساتھ رفاقت کی خوش خبری دی ہے اور فرمایا: التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین

مطلب یہ ہوا کہ تجارت ایک عبادت متعدی ہے جس پر ہر حال میں آخرت کا اجر مرتب ہوگا۔ نیت کچھ بھی ہو البتہ ظاہری امانت اور دیانت کے ساتھ ہو۔

ایک حدیث پاک میں حضرت سعد رضی سے حضور نے فرمایا۔

سعد! تم نے اگر کسی وقت اپنی اہلیہ کے منہ میں محبت کے ساتھ نوالہ بھی دیا ہے تو وہ بھی تمہارے نیک اعمال میں شامل ہے ــــ پھر تم آخرت کا اتنا فکر کیوں کر رہے ہو؟ ــــ سعد بیماری کی حالت میں آخرت کی طرف سے فکرمند تھے ــــ یہ عمل بھی سعد رضی کا عبادت متعدی میں شامل تھا۔

عبادت متعدی (خدمت خلق) کی اہمیت کے بارے میں امام بخاریؒ نے دو حدیثیں نقل کی ہیں ایک حدیث یہ ہے کہ پچھلی امتوں میں ایک بازاری عورت تھی جو پیاسے کتے کو پانی پلانے جنت کی مستحق قرار دیدی گئی اور ایک عورت کو اس عمل پر داخل جہنم کر دیا گیا کہ اس نے!

بلی کو تمام رات باندھے رکھا اور وہ پیاس سے ہلاک ہو گئی۔

حضرت عمرؓ کو حضرت ابن عباس نے خواب میں دیکھا اور پوچھا، کس عمل پر آپ کی بخشش ہوئی؟ — تو انہوں نے فرمایا اس عمل پر کہ میں نے ایک بچے کے ہاتھ سے ایک درہم دے کر چڑیا کو آزاد کرایا تھا۔

امام غزالی نے خواب میں فرمایا — میری قلم پر لکھنے کے وقت ایک مکھی آ بیٹھی، میں نے اپنا ہاتھ روک لیا تاکہ وہ قلم کے خط پر لگی ہوئی سیاہی سے اپنی پیاس بجھالے۔ وہ مکھی جب اڑ گئی تب میں نے قلم کو حرکت دی۔ پس میرے مولا کو اس عمل پر پیار آ گیا اور مجھے بخش دیا گیا۔

عبادات لازمہ (نماز روزہ) میں بھی دکھاوے کا ایک پہلو دوسروں کو ترغیب دینا اور شوق دلانا ہے، اس پہلو سے دکھاوے کو ایک حدیث میں موجب اجر و ثواب قرار دیا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضؓ نے حضور ﷺ سے عرض کیا حضور! ایک دن میں گھر میں نماز ادا کر رہا تھا کہ ایک صاحب آ گئے، ان کے آنے سے میں خوش ہو گیا کہ انھوں نے مجھے نماز کی حالت میں دیکھا، آپ نے فرمایا۔

رحمک اللہ یا اباھریرۃ! لک اجران، اجر السرّ واجر العلانیہ۔ اے ابو ہریرہ! خدا تجھ پر رحم کرے تیرے لئے دوہرا ثواب ہے۔ ایک ثواب خفیہ عبادت کا اور ایک ثواب علانیہ عبادت کا۔ (مشکوٰۃ ص ۴۵۴)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضؓ کی خوشی کو مذموم ریاکاری پر محمول نہیں کیا بلکہ اس پہلو پر محمول کیا کہ وہ آنے والا مجھے نماز کی حالت میں اور وہ بھی گھر کے اندر دیکھ کر میری پیروی کرے گا اور نماز پڑھا کرے گا۔

رسول پاک ﷺ کی جگہ اگر کوئی سطحی نظر رکھنے والا مفتی ہوتا تو وہ ابو ہریرہ کی خوشی کو ریاکاری اور نمائش پسندی قرار دے کر ان کی مذمت کرتا۔

یہ بھی واضح رہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضؓ کی یہ نماز فرائض کے علاوہ سنن و نوافل تھے کیونکہ فرض نمازوں کے لئے مساجد میں باجماعت نماز ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے البتہ سنن اور نفل نمازوں کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے — ھٰذہٖ صلوٰۃ البیوت — (عن کعب ابن عجرہ مشکوٰۃ ص۱۰۵ بحوالہ ابوداؤد و ترمذی) یہ گھر میں پڑھنے کی نماز ہے — فرمایا۔

یہ آپ نے اس موقعہ پر فرمایا جب بنی اشہل کی مسجد میں مغرب کے وقت لوگوں کو مغرب کے بعد کی سنتوں میں مشغول ہوتے دیکھا۔

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کا مطلب واضح ہو گیا، یعنی ابو ہریرہ رضؓ کی نماز گھر میں — یہ خفیہ اور سری عبادت ہوئی اور آنے والے کو اس نماز سے ترغیب ہوئی اس پہلو سے یہ نماز علانیہ اور جہری عبادت بن گئی —،

حضرت شیخ علیہ الرحمہ کے ارشاد گرامی میں ایک علمی نزاکت یہ ہے کہ آپ نے لازمی عبادات میں ارکان خمسہ کے اندر زکوٰۃ کو شامل نہیں کیا۔ کیونکہ زکوٰۃ فرائض دین میں شامل ہے۔ اور فرائض میں رضائے حق کی طلب لازمی ہے، اس میں ریاکاری شرک کے خطرہ سے دوچار کر دیتی ہے، اور فرائض دین کے تقدس کا احترام یہی تقاضا کرتا ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ کی نظر سورہ بقرہ کی آیات (۲۶۴) اور (۲۷۲) پر بھی ہے۔ جن آیات میں انفاق فرض (زکوٰۃ) کے لئے ابتغاء مرضات اللہ اور الاابتغاء وجہ اللہ کی شرط لگی ہوئی ہے —

شیخ علیہ الرحمہ نہایت نازک مسئلہ پر گفتگو فرمارہے ہیں، جس میں ذراسی لغزش سے بھی فقہاء کو اعتراض کرنے کا موقعہ مل سکتا تھا۔

اس لئے آپ نے اطاعت متعدیہ میں نفلی انفاق و صدقہ کا ذکر فرمایا، شیخ علیہ الرحمہ نے مخلوق خدا کی مالی اور اخلاقی اعانت کو اخلاص کی شرط سے مستثنیٰ کرکے اور اس میں عموم واطلاق پیدا کرکے مسلمانوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ جس طرح ہوسکے بندگان خدا کی مدد کریں۔

اس تاویل و تعبیر میں تصوف و احسان کے بنیادی تقاضے کی جھلک ہے اور اس تالیف قلب کی اہمیت کا اظہار ہے جو دعوتِ حق کے لئے ضروری ہے۔

آج ایک طبقہ کتاب و سنت کی خالص پیروی کے نام پر تصوف و احسان کی مخالفت میں یہ کہتا ہے۔ تبلیغ اسلام تصوف کے مقاصد میں داخل نہیں ہے اس لئے اشاعت اسلام کی داستانوں کو صوفیاء کرام کی طرف منسوب کرنا غلط ہے (تحقیقات اسلامی سہ ماہی ۸۵ء، علی گڑھ)۔

لیکن کیا اس طرز فکر سے تعلق رکھنے والے حضرات یہ بتائیں گے کہ پچھلے پچاس ساٹھ سال کے اندر مسلم دنیا کے جن جن حصوں میں تحریک اسلامی برپا ہوئی اس کے نتیجہ میں کس ملک کے اندر اسلامی حکومت (کتاب و سنت کی قانونی فرماں روائی) قائم ہوئی۔؟

ابھی حال میں پاکستان کے مشہور مفکر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ترکی کا دورہ کیا ہے اور (ندا لاہور ستمبر ۹۲ء) میں اس کی رپورٹ شائع ہوئی ہے ڈاکٹر صاحب تحریک اسلامی اور تحریک خلافت کے رہنما و امیر ہیں۔ موصوف نے اس روداد سفر میں تسلیم کیا ہے کہ ترکی میں اسلامی احیاء کے لئے باقاعدہ کوئی منظم کام نہیں ہو رہا، البتہ یہ دیکھ کر تعجب کرنا پڑا کہ بعض صوفی حلقے اپنے صوفیانہ طور و طریق کے ساتھ نہایت خاموشی سے سرگرم ہیں اور اس سرگرمی میں نہ صرف عمر رسیدہ ترکی مسلمان شامل ہیں بلکہ نوجوان ترک بھی اسلامی ہیئت کے ساتھ ذکر و شغل کے حلقوں میں شامل ہوتے ہیں۔

ایک مرعوب اور رگھٹے ہوئے ماحول میں دینِ حق کے احیاء و قیام کی جو حکمتِ عملی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تیرہ سالہ مکی زندگی میں نظر آتی ہے اصل تصوف اسی حکمتِ عملی کا عکس ہے۔

بعض خانقاہی رسموں میں جو افراط و تفریط پیدا ہوگئی ہے اس سے اختلاف رکھنا الگ بات ہے اور صوفیاء ربانی کی کامیاب دعوتی جدوجہد پر پانی پھیر دینا ایک الگ بات ہے جو کسی طرح درست نہیں کہی جاسکتی۔

اعلان بحکم پریس رجسٹرار حکومت ہند

فارم ۴ رول ۸
بابت ماہ نامہ منادی
۱۔ مقام اشاعت: درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نئی دہلی
۲۔ وقفہ اشاعت: ماہانہ
۳۔۴۔۵۔ پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر کا نام: خواجہ حسن ثانی نظامی
۶۔ شہریت: ہندوستانی
پتہ: درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نئی دہلی ۱۳
ملکیت: خواجہ اولاد کتاب گھر۔ درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین نئی دہلی
میں خواجہ حسن ثانی نظامی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا معلومات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔
(دستخط) حسن ثانی نظامی
مارچ ۱۹۹۴ء

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور روزہ

خواجہ حسن ثانی نظامی

صوم ، برت ، اُپواس ، فاسٹنگ، تھوڑے
فرق کے ساتھ روزے ہی کی مختلف شکلیں اور
الگ نام ہیں۔ لیکن ان سب کا خلاصہ مطلب
مقصد ایک ہی ہے کہ کسی خاص مدت اور پیریڈ
دوران ، کھانے پینے ، میاں بیوی کے تعلق یا
ت بولنے سے پرہیز کیا جائے۔ آخر الذکر کو
برت یا چپ کا روزہ کہا جاتا ہے۔ روزے
ن شکلوں اور ناموں کو آجکل سب ہی جانتے
لیکن اس کا ایک نام اور بھی تھا۔ جو آج سے
آٹھ سو برس پہلے رائج تھا اور ہندوستان
صوفیوں کو یہی لفظ اور نام سب سے زیادہ
تھا۔ میری مراد لفظ "لنگھن" سے ہے۔ اس کا
تعلق شاید پرانی پنجابی زبان سے ہے۔
نگھنا" اور "پھلانگھنا" آج بھی جمپ کر جانے اور
چیز کو بیچ میں چھوڑ کر اوپر سے یعنی بالا ہی بالا
جانے کو کہتے ہیں۔ روزے کے معنی میں اس
س لئے استعمال کیا گیا کہ روزے میں بھی
نے پینے۔ جنسی تعلق اور بول چال کو لانگھ
ہیں۔

مشہور صوفی بزرگ حضرت خواجہ نظام الدین
محبوب الٰہی رحؒ کے ملفوظات میں فارسی زبان
شعر نقل ہوا ہے۔ جس میں یہ لفظ ایسی خوبی
سے استعمال کیا گیا ہے کہ صرف روزے کا مفہوم
ہی نہیں بلکہ اس کے بارے میں صوفیوں کا تصور
بھی پوری طرح سامنے آجاتا ہے۔ شعر ہے۔

لنگھنت گر تراکند فربہ
سیر خوردن تراز لنگھن بہ

کھانے پینے کو لانگھ جانا۔ چھوڑ دینا یا کم کر دینا
اگر تجھے موٹا کر دے تو اس سے بہتر بات یہ رہےگی
کہ تو پیٹ بھر کر کھانا کھالے۔ یعنی اپنے بدن کو،
اپنے نفس کو موٹا نہ ہونے دینا۔ اپنے حیوانی اور
شہوانی جذبات پر قابو روزے کا اصل مقصد ہے
جب یہی حاصل نہ ہوا تو محض کھانا پینا چھوڑنے
سے کیا فائدہ ؟

روزے کے عام فائدے کم یا زیادہ سب
ہی معلوم ہیں لیکن ایک صوفی کی نظر اس کے لطیف
پہلوؤں اور باریک نکات کی طرف بھی جاتی ہے۔
مثلاً یہی کہ مسلمانوں کے ہاں جہاں رمضان کے
پورے مہینے روزے رکھنے کا حکم ہے۔ وہاں
اسی شدت کے ساتھ دونوں عیدوں اور
ایام تشریق میں روزہ نہ رکھنے کا حکم بھی آیا ہے۔
یعنی خود ترک وتیاگ ایسی چیزیں ہیں جنھیں
کسی خاص وقت ترک کر دینے اور چھوڑ دینے
کی ضرورت ہے۔ جس طرح روزے کا فائدہ ہے۔

اسی طرح روزے کو چھوڑنے اور ترک کر دینے کا فائدہ بھی ہے۔ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ اپنے دنیا کے حصے کو نہ بھولو۔ یعنی جائز حد تک دنیا داری میں لگنا، کھانا پینا، بولنا چالنا۔ جنسی تعلق رکھنا جائز ہی نہیں ضروری اور مفید ہے۔ صوفی اصطلاح میں اسے ترکِ ترک کہا جاتا ہے۔

صوفیا رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ بھی پورے سال کے دنوں میں نفل روزوں کو پسند کرتے ہیں۔ ایسے روزے دار صوفی صائم الدھر یعنی بارہ ماسی روزے دار کہلاتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی ایک نئے نکتے کی طرف صوفیوں کا خیال گیا ہے۔ عیدوں کے دن روزے رکھنا تو خیر منع ہے ہی۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے بارہ ماسی روزے داروں کے لئے داؤدی نفل روزے کو زیادہ پسند کیا ہے۔ بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام سے منسوب طریقے میں نفل روزہ اس طرح رکھا جاتا ہے کہ ایک روز روزہ رکھا اگلے دن ناغہ کر دیا اس سے اگلے دن پھر رکھ لیا۔ یعنی ایک دن بیچ کرکے اور ایک ایک دن کے وقفے سے روزے رکھے جائیں۔ اس طرح روزے کی عادت سی پڑ کر نہیں رہ جاتی ہے۔ روزے کا احساس اور شعور باقی رہتا ہے۔ اور کسی قدر تکلیف اور زحمت بھی ہوتی ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس مشہور حدیث کے ایک خاص نکتے کی طرف بھی ہم کو توجہ دلائی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ روزے دار کے لئے دو فرحتیں ہیں۔ ایک افطار یعنی روزہ کھولنے کی فرحت دوسری پروردگار کے دیدار کی فرحت۔ کیونکہ روزے کے انعام میں دیدار الٰہی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے کہ افطار کی فرحت صرف بھوک پیاس میں کھانے پینے کی فرحت نہیں ہوتی ایک مشن کے کامیابی کے ساتھ پورا ہونے کی فرحت اور ایک فرض کی ادائیگی کی فرحت بھی ہوتی ہے۔ حضرت خواجہ نے داؤدی روزے کو بھی شاید اسی لئے ترجیح دی کہ تکلیف اور زحمت اور کوشش اور دھیان ہو تو یہ بھی دیدار اور درشن سے کچھ کم بات نہیں ہے۔ آج کل مکتوب نگاری اور دو تعلق والوں میں خط و کتابت کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے خط و کتابت کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو۔ اس میں سارا سارا دن نہیں لگا کرتا۔ روزہ تو دن بھر کا ہوتا ہے۔ اور بارہ ماسی روزے دار ہو تو برس بھر کا ہوتا ہے۔ اور یاد اور دھیان ہی کو روزے کی روح اور جان سمجھا جائے تو روزہ رکھنا اور روزہ چھوڑنا دونوں ہی یاد اور دھیان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ایک مشہور شاعر تمین امروہوی نے کہا ہے کہ؎

تمہاری یاد سے روشن ضمیر ہوتے ہیں

اس مصرعے نے شاید حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مقصد کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔

یعنی یاد ایک ایسی چیز ہے جو ضمیر کے آئینے کو صاف اور اجلا کر دیتی ہے۔ آئینے پر جما ہوا میل کچیل خاک مٹی، یاد کے ذریعے صاف ہو جاتے ہیں اور پھر جو صورت ہم اس آئینے میں دیکھنا چاہتے ہیں صاف صاف دکھائی دینے لگتی ہے۔ اگرچہ عام آدمی کی آنکھ بیچاری اس قابل نہیں کہ دیدار الٰہی کی تاب لاسکے۔ لیکن دیدار کا دھیان ہی جم جائے تو یہ کیا کم بات ہے۔ جس نے یہ دھیان جما لیا اس کی دنیا بھی سدھر گئی اور آخرت بھی سنور گئی۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ کے حوالے سے فرماتے تھے کہ

آدھا ایمان ہے اور روزہ آدھا صبر! پھر خود
ے صبر کی تشریح اس طرح کرتے کہ کچھ چیزیں
ں ہیں جو خواہشیں پیدا کرتی ہیں۔ خواہشات
لام بناتی ہیں۔ حق سے توڑتی ہیں۔ اور کچھ چیزیں
ہشات کو قابو میں رکھتی ہیں۔ حق کو غالب کرتی
۔ خواہشات کی بنیاد دراصل دو چیزیں ہیں۔ یعنی
ں، غصہ اور شہوت۔ کام اور کرودھ۔ روزہ
رت۔ یعنی کام کو کنٹرول میں لے آتا ہے۔ اس لئے
ے آدھا صبر کہنا چاہیئے!

ایک دفعہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ
اپنے کسی مرید سے خواب میں فرمایا کہ دل کا
زہ رکھو۔ پیر و مرشد دنیا سے پردہ کر چکے
۔ مرید کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دل کا روزہ کیسے
تے ہیں۔ اور اس خواب کی تعبیر کس سے پوچھوں
پیر و مرشد کے جانشین حضرت خواجہ نصیرالدین
غ دہلیؒ سے جاکر معلوم کیا کہ میرے خواب کا کیا
لب ہوسکتا ہے۔ انھوں نے کہا تمہیں پیر و مرشد
مراقبے کا حکم دیا ہے۔ مراقبہ دھیان جماکر بیٹھنے
کہتے ہیں۔

صوم، لنگھن، برت، روزہ، فاسٹنگ
ں کسی دھرم سے بھی تعلق رکھنے والا روزہ ہو
ں میں اندر اور باہر دھیان ہی کی فرماں روائی
ائے گی۔ روزہ شروع بھی نیت اور دھیان
ے ہوتا ہے جاری بھی دھیان کے ساتھ رہتا
ے۔ پورا اور ختم بھی دھیان کے ساتھ ہوتا۔
ین دلچسپ بات یہ ہے کہ صوفیوں کا روزہ
فطار کے ساتھ پورا اور ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن
کا دھیان کبھی نہیں ٹوٹتا۔ ایک شاعر نے کسی
ر بیک گراونڈ میں اپنی بات کہی ہے لیکن جوڑ
ں کا صوفیوں کے اس روزے سے بھی ملتا
ہے۔ سے

مطرباں رفتند و صوفی در سماع
عشق را آغاز ہست انجام نیست

قوال چلے گئے لیکن صوفی قوال اس کے بعد بھی
سنے چلا جارہا ہے۔ شاید اس لئے کہ اس کے نزدیک
محبت کی شروعات تو ہے۔ لیکن خاتمہ اور
انجام نہیں ہے!

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو نیشنل چینل)

اُردو گلستاں

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا منتخب روزنامچہ

۱۸ر جمادی الاول ۱۳۴۹ھ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۳۰ء
یکشنبہ مقام دہلی

سیاسی} عیسائیوں کی دعائیں جو وہ روزانہ مانگتے ہیں ان میں ایک فقرہ یہ بھی ہے کہ "اے خدا آج کی روٹی آج ہی دے"۔ یہ ایک قسم کی سیاسی دعا ہے۔ کیونکہ بندہ اپنے خدا سے اپنے رزق کا فوری مطالبہ کرتا ہے۔ اسی طرح ہندوستانی اپنے بادشاہ سے اپنی روزی بہت جلدی مانگتے ہیں اور کل کے وعدہ کا یقین نہیں کرتے اور کہتے ہیں جو کچھ دینا ہے آج ہی دو۔ درحقیقت ہر سیاست کی بنیاد شکم پروری ہے۔

قومی} آج تمام دہلی میں ہرتال ہے۔ ہندو مسلمان اس ہرتال میں متحد ہیں۔ کیونکہ مولانا کفایت اللہ صاحب کے لیے کی گئی ہے مگر لوگ روز روز کی ہرتالوں سے عاجز آگئے ہیں اور اب غالباً کانگریسی لیڈر آئندہ ہرتال کبھی نہیں کریں گے کیونکہ اس سے حکام کو تو کچھ تکلیف نہیں ہوتی اپنے ہی ملک والوں کا نقصان ہوتا ہے۔

تلقین حیات} مالی قینچی سے درختوں کی شاخیں کاٹ رہا تھا۔ میں نے کہا یہ ظلم کیوں کرتا ہے اس نے کہا درختوں کی زندگی اس سے بڑھتی ہے۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے ہنسی کا ایک شعر بھی کہا تھا ؎

جو وقت ختنہ میں چیخا تو نائی نے کہا ہنس کر
مسلمانی میں طاقت خون ہی بہنے سے آتی ہے

فلسفہ یہ ہے کہ انسان ہو یا حیوان یا نباتات سب ہی تکلیف اور نقصان اور قربانی سے ترقی حیات حاصل کرتے ہیں۔

ذکی حسن کا حلیہ} امروہہ کے سید اور پیرزادہ ہیں۔ بیس سال سے زیادہ عمر ہے۔ گورا رنگ ہے۔ درمیانہ قد ہے۔ کاپی نویسی کرتے ہیں ان کے والد سید ممتاز حسن صاحب میرے ہاں پندرہ سال سے زیادہ ملازم رہے اور یہیں انتقال ہوا اور میرے ہی قبرستان میں دفن ہوئے۔ ذکی حسن بھی اپنے والد کے قدم بہ قدم اور بہت نیک اور سعادت مند نوجوان ہیں۔

سیّد الطاف حسین کا حلیہ} میرے قرابتدار ہیں۔ تیس کے قریب عمر ہے۔ لمبا قد۔ دبلا بدن۔ بڑی ڈاڑھی۔ بچپن میں مجھ سے پڑھتے تھے۔ پھر میرے دفتر میں سالہا سال کام کیا۔ ان کی والدہ کے نام حضور نظام نے پچاس روپے ماہوار جاری کئے تھے اب پچیس روپے والدہ کے انتقال کے بعد ان کو بھی ملتے ہیں۔ بہت محنتی وفادار اور مخلص آدمی ہیں۔ میری والدہ نے مجھے ان کی والدہ کی نسبت

ر ایک اور عزیز کی نسبت وصیت کی تھی کہ ان کے ساتھ
بشہ بھلائی کرنا۔

ند خاں کا حلیہ } معماری کا کام کرتے ہیں۔ درگاہ کی بستی میں ان کی کئی نسلیں گذر چکی
) میرے ہاں تعمیرات کے کام میں مصروف رہتے ہیں
ں سے زیادہ عمر ہے۔ درمیانہ قد ہے سانولا رنگ
ہے۔ میری ذات کے بہت خیر خواہ ہیں۔

ول خاں کا حلیہ } میواتی قوم میں ہیں۔ ان کے بڑے بھی اسی بستی میں رہتے
۔ یہ شروع سے سید الطاف حسین کے ہاں رہتے ہیں۔
ری کرتے ہیں۔ میری ذات کے ہمیشہ سے مخلص اور
خواہ ہیں۔ چالیس سے زیادہ عمر ہے۔

حسین کا حلیہ } میری بستی کے ایک دکاندار ہیں ستر کے قریب عمر ہے۔ چھوٹا قد
ید ڈاڑھی۔ نماز کے پابند۔ پہلے شہزادہ میرزا
یت شاہ کے ہاں نوکر تھے۔ میں ان کے سامنے
ے بڑا ہوا ہوں اور یہ ہمیشہ سے میرے ساتھ
ں رکھتے ہیں۔

دیا کا حلیہ } سانولا رنگ ہے۔ مضبوط جسم ہے۔ لمبا قد ہے۔ تیس سے
ہ عمر ہے۔ میری پالنے والی جلّو کا چھوٹا بیٹا ہے۔ میرے
نے بہت چھوٹا سا کھیلتا پھرتا تھا۔ بچپن کا بڑا حصہ
ے گھر میں گذرا ہے۔ اس کی ماں جلّو نے مجھ کو اور
ے بچوں کو پالا تھا۔ اس واسطے میں اس کو بھی اپنا
سمجھتا ہوں۔ میواتی قوم کا ہے۔

ی سید عاشق حسین کا حلیہ } مراد آباد کے رہنے والے ہیں۔ ساٹھ
یادہ عمر ہے اعلیٰ درجہ کے انجینیر ہیں۔ اپنے فن میں
ل ہیں اور عبادت گزاری میں بھی پکے مسلمان
بند ماہ سے یہاں رہتے ہیں۔ ان کے ایک لڑکے
بین میرے مرید ہیں۔

درگاہ کے موذن کا حلیہ } آج کل درگاہ شریف میں اذان دیتے ہیں۔
پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ لمبا قد ہے پچاس سے زیادہ عمر
ہے۔ کبھی جذبہ طاری ہوتا ہے تو اولیاء اللہ کے باطنی احکام
مجھ کو سناتے ہیں۔ میں کہہ دیتا ہوں جب تک مجھے حکم
نہ ملے میں تمہارے ذریعہ کا حکم قبول نہیں کر سکتا۔ غرض
بہت دلچسپ باتیں ان کی ہوتی ہیں۔ آواز میں کیفیت
نہیں ہے۔ صبح کی اذان اچھی آواز والا کہے تو دل پر بہت
اثر ہوتا ہے اور درگاہ شریف کی مسجد چونکہ گونجتی ہے
اس واسطے یہاں کی اذان میں اگر آواز اچھی ہو تو بہت
زیادہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

صوفی صاحب اجمیری کا حلیہ } درگاہ شریف میں سالہا سال سے رہتے
ہیں۔ میرے مکان پر بھی عرصہ تک رہے ہیں۔ خوب
شعر کہتے ہیں اور خوب لحن سے ہکلا ہکلا کر پڑھتے
ہیں۔ چالیس سے زیادہ عمر ہے۔ سانولا رنگ ہے۔ توکل
پر بسر اوقات ہے۔ زبان میں لکنت ہے۔

ذاتی } صبح نو بجے تک تحریری کام کیا۔ پھر باقر علی صاحب اور اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ درگاہ حضرت
بی بی نور صاحبہؒ میں گیا۔ جہاں کے مزارات کی مرمت
کرا رہا ہوں۔ مزدور کام کر رہے تھے نئی تعمیر کی
پیمائش کرائی۔ ایک گھنٹہ کے بعد گھر میں واپس آیا۔
کھانا کھا کر ڈاک پڑھی۔ نیند آنے لگی۔ میں نے کہا جو
سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔ جو جاگتا ہے وہ پاتا ہے۔ دن کا
سونا موجودہ موسم میں بہت برا ہے۔ نفس نے کہا سات
دن جاگنا ہو تو آج چھٹی کے دن ضرور سونا چاہیئے۔ میں
نے کہا یہ تیرا مغالطہ ہے تو رنڈیوں کے گھر بھی یہی
کہہ کر آباد کراتا ہے۔ نوجوان لوگ تھوڑی سی
تفریح کے لئے وہاں جاتے ہیں اور ساری زندگی کی
تفریح برباد کر ڈالتے ہیں۔ مگر مجھ کو نفس نے پچھاڑ دیا
اور میں مغلوب ہو کر سو گیا۔ ایک گھنٹہ کے بعد اٹھا۔

نزلہ ہوگیا تھا۔ طبیعت بھاری تھی۔ نواب سید مہر شاہ صاحب ممبر کونسل آف اسٹیٹ کے آدمی ایک خط لے کر آئے تھے۔ ان سے بات کر کے چہل قدمی کی۔ بعد مغرب سیٹھ حاجی عثمان عبدالغنی صاحب ہی پی رنگون سے آئے۔ زید منزل میں ٹھہرے۔ رات کو ان سے باتیں بھی کیں۔ توکلی شاہ کو اب بخار نہیں ہے حسن الدین کو بھی آرام ہوگیا۔ اور بھی سب بال بچے اچھے ہیں۔ میں ساڑھے نو بجے سویا۔ ڈیڑھ بجے بیدار ہوا۔ پھر سوگیا۔ ڈھائی بجے اٹھا۔ گاتے کی چادر اوڑھ کر قبرستان میں گیا۔ چاند کا چہرہ اداس تھا میں نے کہا کیوں میاں کیا حال ہے؟ بولا بڑھاپا آگیا۔ میں نے کہا بڑھاپا تو ایک بڑی نعمت ہے کیونکہ عقل اور تجربہ کی دولت اسی عمر میں حاصل ہوتی ہے۔ جوانی تو ایک جنون ہے۔ چاند کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس نے کہا مجھے عقل سے کیا سروکار؟ ختم پڑھے چہل قدمی کی یہودی معلوم ہوئی پھر ذرا لیٹ گیا۔ صبح کی اذان ہوئی اُٹھ بیٹھا۔ چاند کو پھر کچھ دیر دیکھا۔ بورڈنگ ہاؤس میں آیا۔ پارہ آج بھی ۷۶ درجہ پر تھا۔ ہم سب آج کل سیاسی انقلاب میں ہیں مگر موسم کچھ مستقل مزاج سا ہوگیا ہے۔

۱۹ر جمادی الاول ۱۳۴۹ھ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۳۰ء
دوشنبہ مقام دہلی

سیاسی } آج سرحدی انتظام کا گورنمنٹ نے ایک بیان شائع کیا ہے۔ آزاد اخبارات لکھ رہے ہیں کہ گورنمنٹ آزاد قبائل کے علاقہ میں مداخلت کرنی چاہتی ہے۔ مگر میں اس کو درست نہیں سمجھتا۔ کیونکہ گورنمنٹ واقف ہے کہ آزاد قبائل کے علاقہ میں قبضہ کرنا مفت کا دردسر مول لینا ہے۔ آج پنڈت جواہر لال نہرو رہا ہوگئے۔

قومی } پانیر نے لکھا ہے کہ سر علی امام کو گول میز کانفرنس میں اس واسطے مدعو نہیں کیا گیا کہ وہ کانگریسی خیالات رکھتے ہیں۔ اس پر اخبارات نے لکھا ہے تو پھر گورنمنٹ کا یہ کہنا کہ کانگریس والوں نے خود گول میز کانفرنس کو بائیکاٹ کر دیا محض سنانے کی ایک بات ہے۔ اصلیت کچھ نہیں ہے۔

تلقین حیات } قرآن شریف میں غصہ کو ضبط کرنے اور لوگوں کو معافی دینے کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ فلسفہ طبائع سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اپنے غصہ پر قابو رکھتا ہے اور لوگوں کی خطاؤں کو معاف کر دیتا ہے وہ دلوں کا محبوب بن جاتا ہے۔

لکڑی کا حلیہ } حلیہ نامہ میں میری لکڑیوں کا حلیہ نہ آئے تو شاید ان لکڑیوں کو مجھ سے شکایت ہوگی۔ میں نے پندرہ برس تک بید کی ایک موٹی لکڑی اپنے ہاتھ میں رکھی جس پر چاندی کی ایک شام ہے اور حافظ نور احمد صاحب چاندی والے نے وہ شام بنا کر نذر کی تھی۔ میں سفر مصر و شام و حجاز میں بھی اس لکڑی کو ساتھ لے گیا تھا۔ اب وہ لکڑی میں نے احتیاط سے رکھدی ہے اور وصیت کر دی ہے کہ جب میں مرجاؤں تو میری قبر میں اس کو دفن کر دیا جائے۔

آج کل میرے ہاتھ میں ایک لکڑی رہتی ہے جو پہاڑی جنگل کی ہے اور اس کے نیچے ایک برچھی سی لگی ہوئی ہے۔ یہ لکڑی ۱۹۲۷ء سے میرے پاس ہے گویا تین برس ہوچکے ہیں۔ جس وقت مجھ پر پستول کی گولیاں چلیں تو یہ لکڑی میرے ہاتھ میں تھی اور میں نے اس لکڑی کی برچھی سے قاتل پر حملہ بھی کیا تھا۔ میں اس کو بہت عزیز رکھتا ہوں اور جب اکیلا بیٹھتا ہوں اور یہ لکڑی میرے ہاتھ میں ہوتی ہے تو صادق شہید کو یاد کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھ پر اپنی جان قربان کر دی اور پھر مجھے اپنی قوم کے حالات پر

ینے سے بڑی عبرت ہوتی ہے اور یقین آجاتا ہے کہ
میں حضرت مسلمؓ اور حضرت امام حسینؑ یقیناً بہت
ں اور بے بس تھے اور یہ دنیا مظلوموں کی حامی نہیں
لمہ ظالموں اور غاصبوں کی حامی ہے۔ میری یہ لکڑی
میری زندگی تک وفادار رہے گی۔ مگر میں اس کے
بر میں دفن ہونے کی وصیت نہیں کروں گا کیونکہ
رٹی کے لئے وصیت کر چکا ہوں البتہ یہ لکڑی
اولاد کے پاس یادگار رہے گی۔

آج طبیعت کمزور معلوم ہوتی ہے۔ تاہم کام
اچھا ہوگیا۔ ۶۴ صفحے دو کتابوں کے لکھے۔
مچہ اور مجلس تلقین اور خطوط کے جواب اس کام
یادہ ہیں۔ تین بجے یہ کام ختم ہوگیا مگر تکان بہت
ہ تھی۔ حاجی عثمان عبدالغنی صاحب بھی میرے
ر دہلی گئے۔ آج زید نے توکلی شاہ سے کہا میرے
ؤ۔ میں تمہیں ایک بڑی بات سناؤں۔ توکلی شاہ
ے پاس گئے تو اس نے کہا سنو! سب تاروں کا
شاہ چاند ہے اور سب جانوروں کا بادشاہ
ہے اور سب مریدوں کا بادشاہ پیر ہے زید
ن باتوں کا توکلی شاہ اور سب گھر والوں پر بہت
وا۔ میں نے سنا تو بہت خوشی ہوئی حاجی صاحب
یا یہ بچہ ہر چیز کو بہت غور سے دیکھتا ہے اور یہ
پاکہ زید نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ رنگوں میں
ں آپ کا پیر بھی بن جاؤں گا۔ اب نہیں۔

شام کے پانچ بجے تک واحدی صاحب کے
ام کیا۔ حاجی صاحب مزارات کی زیارتوں سے
ہو کر واپس آئے۔ اُن کے ساتھ میں بھی آیا۔
ب کی جماعت میں شریک ہوا۔ جو عرصہ سے
خانہ کی چھت پر ہوتی ہے۔ بعد مغرب کھانا
۔ حاجی صاحب اور توکلی شاہ سے باتیں کیں۔
یں حمید ملازم نے مجلس کی تھی۔ خاندان کے
پڑھنے والے بھی جمع ہوئے تھے۔ ماسٹر محمد حفیظ صاحب

رنگون والوں نے بھی بہت عمدہ مرثئے پڑھے۔ انھوں
نے کل بھی مرثئے پڑھے تھے دس بجے تک میں بھی
شریک رہا۔ پھر سو گیا۔ نیند بہت اچھی آئی۔ چار بجے
بیدار ہوا۔ نزلہ کا اثر ابھی تک موجود ہے۔ دوا پی
رہا ہوں۔ ٹوہانہ سے نورالحسن خاں صاحب آئے ہیں
احمد آباد منزل میں ٹھہرے ہیں۔

اہلیہ آغا احمد میرزا صاحب تحصیلدار قلعہ سیف اللہ
بلوچستان نے روحہ کے لئے پانچ روپے بھیجے ہیں۔
شام کو میں نے روحہ سے کہا۔ یہ روپے دنیا ہیں اور
دنیا بہت ناپاک ہوتی ہے۔ یہ روپے تم مجھ کو دے دو۔
ناپاک دنیا کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ اس نے ہنس کر کہا کہ اس
ناپاک دنیا کو میرے رومال میں باندھ دیجئے۔ میں
اس کو الگ لٹکا کر لے جاؤں گی۔ اور اپنی صندوقچی
میں بند کر دوں گی۔ اور جب مجھے کتابوں کی ضرورت
ہوگی تو اس ناپاک دنیا کو بازار بھیج دوں گی، مگر ہاتھ
نہیں لگاؤں گی۔ آپ کو اس دنیا سے بچنا چاہیئے۔ آپ
اس کو اپنی جیب میں کیوں ڈالتے ہیں؟ مجھے روحہ کی باتوں
سے بہت ہی ہنسی آئی۔ روحہ اور حسین جب ہنسی کی
باتیں کرتے ہیں تو خود نہیں ہنستے اپنا چہرہ سنجیدہ بنالیتے
ہیں اور لطف اسی ہنسی کا ہوتا ہے جس میں ہنسانے
والا خود نہ ہنسے۔ آج رات کو خنکی ذرا زیادہ تھی پارہ
صبح ۶۴ درجہ پر تھا۔ گرمی دو درجہ کم ہوگئی۔

۲۰ جمادی الاول ۱۳۴۹ھ ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۰ء

سہ شنبہ مقام دہلی

سیاسی رات کو روشنی کے سامنے ہزاروں کیڑے جمع
ہو جاتے ہیں اور ان کیڑوں کے شکاری
چھپکلیاں اور مینڈک بھی بہت سے آجاتے ہیں اور ان
کیڑوں کو کھا کر پیٹ بھرتے ہیں۔ دنیا کی سیاست
اسی دور فنا و بقا کی بنیاد پر ہے کہ ہر ایک طاقتور
کمزور کو فنا کر ڈالتا ہے تاکہ خود باقی رہے اس لئے

ہر وجود کو اپنے اندر طاقت پیدا کرنی چاہیئے۔

قومی } مسلمان لیڈر ہندوؤں سے کہتے ہیں کہ ہم سے سمجھوتہ کر لو مگر یہ نہیں سوچتے کہ ایک غلام قوم دوسری غلام قوم سے اگر سمجھوتہ کر بھی لے تو اس سمجھوتہ کی شرائط پورا کرانے کی طاقت کس میں ہوگی ہر وجود کے لئے اصلی سمجھوتہ اس کی اپنی طاقت ہے۔

تلقین حیات } زندگی اس قوم کی کامیاب ہوگی جس کی قوت فیصلہ مضبوط ہو۔ جب کسی قوم میں زوال آتا ہے تو اس کی قوت فیصلہ کمزور ہو جاتی ہے۔ آج کل سب سے زیادہ مسلمانوں میں قوت فیصلہ کی کمی ہے اس کے بعد ہندوؤں میں اور اس کے بعد انگریزوں۔ انگریزوں میں بھی آج کل فیصلہ کی قوت کم ہو گئی ہے۔

باقر علی صاحب کا حلیہ } گورا رنگ ہے۔ چھریرہ بدن۔ لمبا قد۔ ضلع سہارنپور کے رہنے والے ہیں۔ تیس کے قریب عمر ہے۔ کچھ عرصہ سے درگاہ کی بستی میں رہتے ہیں۔ نئی دہلی میں بہت زمانہ تک اوورسیر رہ چکے ہیں۔ اب بھی تعمیرات کا کام کرتے ہیں۔ بہت سمجھدار اور دانشمند اور دیانت دار مسلمان ہیں۔ اپنے کام کی سمجھ بہت اچھی رکھتے ہیں۔ چہرہ کی بناوٹ سے معلوم ہوتا ہے نامور ترقی کرنے والوں میں ہوں گے۔

سید امام علی شاہ کا حلیہ } لاہور کے رہنے والے ہیں۔ حضرت میاں میر صاحبؒ کی درگاہ کے پیرزادہ ہیں۔ لمبا قد ہے۔ مضبوط و ورزشی جسم ہے۔ عمر تیس کے قریب ہے۔ چہرہ کی وجاہت بہت شاندار ہے۔ نئی دہلی کے انگریزوں کو ایک انگریزی کھیل سکھاتے ہیں۔ میرے مرید ہیں اور کچھ عرصہ سے درگاہ کی بستی میں رہتے ہیں۔ یاد الٰہی کا شوق بھی ہے۔ اکثر شام کو میرے پاس آکر بیٹھتے ہیں۔

ذاتی } نو بجے تک تحریری کام کر کے حاجی عثمان عبدالغنی صاحب پی پی کے ہمراہ دہلی گیا۔ سر جان طامسن صاحب چیف کمشنر صوبہ دہلی سے ملنا تھا۔ چونکہ وہ ابھی انگلستان سے واپس آئے ہیں۔ اس واسطے آج شہر کے سب حکام اور ہندو مسلمان عمائد ملاقات کے لئے جمع تھے اور دو دو منٹ کی ملاقات ہو رہی تھی۔ میں گیا تو میز پر چیف کمشنر صاحب کے سامنے میری لکھی ہوئی سیرت نبوی م موجود تھی۔ انھوں نے کہا۔ میں نے اس کتاب کو جہاز میں شروع سے آخر تک پڑھا۔ میرے خیال میں یہ بہت ہی اچھی اور مکمل کتاب ہے۔

ساڑھے گیارہ بجے دہلی سے واپس آیا۔ کھانا کھا کر کام شروع کیا۔ ایک کتاب نفس مطمئن جنوری ۱۹۲۷ء میں لکھنی شروع کی تھی اور اس کا بہت سا حصہ لکھ لیا تھا۔ آج امانت کے کاغذات دیکھے تو ان میں کئی مکمل اور غیر مکمل کتابیں میری لکھی ہوئی نکلیں۔ جن میں نفس مطمئن کتاب کو میں نے فوراً مکمل کر کے شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ حزب البحر کا دوسرا حصہ ہے۔ دیباچہ میں اس کے ۲۱ نام لکھ کر نفس مطمئن نام کا انتخاب کیا تھا۔ مگر آج نام بدل دیا اور کتاب تسلی نام رکھ دیا ایک ہفتہ میں خدا نے چاہا یہ کتاب مکمل ہو کر چھاپہ خانہ میں چلی جائے گی۔ آج کل کتابوں کی بکری بہت کم ہے اس واسطے میں نئی کتابیں نہیں چھپواتا۔ اور میں کیا سب ہی تاجران کتب کا یہی حال ہے اور بہت نقصان میں ہیں۔ تحریک سول نافرمانی کا ہر تجارت پر برا اثر پڑ رہا ہے۔

چار بجے حاجی عثمان عبدالغنی صاحب اور توکلی شاہ نظامی اور زید اور کوثر کے ساتھ حضرت بی بی نور صاحبہؒ کی درگاہ میں گیا اور مزارات کی مرمت کا حال دیکھ کر درگاہ حضرت قطب صاحب میں حاضر ہوا۔ زیارت کی۔ عصر کی نماز وہیں پڑھی۔

مغرب سے پہلے گھر میں واپس آگیا۔ حاجی عثمان عبدالغنی صاحب اجمیر شریف چلے گئے۔ رات کو نو بجے سویا۔ نیند بہت اچھی آئی ۳ بجے بیدار ہوا۔ خنکی آج بھی زیادہ تھی۔ صبح پارہ آج بھی ۶۰ درجہ پر تھا۔ اب گرمی آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے آج ہیڈ ماسٹر صاحب کو بہت بخار تھا بچوں کے امتحان ہو رہے ہیں۔ معلوم ہوا حسین اور علی کے پرچے بہت اچھے ہوئے ہیں۔ آج چیف کمشنر صاحب کے ہاں چودھری عبدالحمید صاحب سے ملاقات ہوئی تھی جو دہلی میں ڈپٹی ہو کر آئے ہیں۔ ایم۔ اے۔ ال۔ ال بی ہیں اور چہرہ سے بہت نو عمر معلوم ہوتے ہیں۔ سنجیدہ اور مضبوط و توانا نوجوان ہیں۔

۲۱ رجمادی الاول ۱۳۴۹ھ ۱۵ ر اکتوبر ۱۹۳۰ء
چہارشنبہ مقام دہلی

سیاسی } خبریں آئی ہیں کہ سرحدی مہم میں بیس کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔ انگلستان کی لیبر گورنمنٹ نے بھی اس مہم کی اجازت دے دی ہے۔ ٹائمز آف لندن اخبار نے لکھا ہے ہندوستان میں کوئی گورنمنٹ بھی ہو اس کو اپنی سرحد کا انتظام کرنا ضروری ہوگا۔ یہ سچ ہے مسلمان سلطنت کے زمانہ میں بھی سرحدی شورش کا یہی حال تھا۔ اکبر کا محبوب مصاحب راجہ بیربل اسی شورش سرحد میں کام آیا تھا۔ لیکن مجھے یقین نہیں ہے کہ صرف بیس کروڑ روپے خرچ کرنے سے یہ شورش ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیگی۔ بہر حال رموز مملکت خویش خسرواں دانند۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے رہا ہوتے ہی کانگریس کا کام شروع کر دیا۔ آج ان کی نہایت دلچسپ تقریر شائع ہوئی ہے وہ کہتے ہیں ہمارے کام کا ایک حصہ ختم ہوگیا۔ اب دوسرا حصہ شروع ہوگا۔ کاش ان سے کوئی کہتا کہ ہندوستانی تجارت بھی پہلے ہی حصہ میں زیر و زبر ہو گئی ہے۔ دوسرا حصہ خبر نہیں کیا رنگ دکھائے گا۔

قومی } مسٹر محمد علی کے نام میں نے ایک خط لکھا ہے جو اردو اور انگریزی میں ہے آج وہ دونوں چھاپے خانے میں چھپنے چلے گئے۔ اس خط میں ان کی علالت کا ذکر ہے اور خواہش کی گئی ہے کہ وہ اپنے جسم پر رحم کریں۔

تلقین حیات } ہندوستان کی اچھوت قومیں خود اپنے آپ کو ذلیل و کمین سمجھتی ہیں۔ جب تک انسان خود اپنی عزت نہیں کرتا دوسرے بھی اس کی عزت نہیں کریں گے اور وہ کبھی انسانیت کے عروج تک نہیں پہنچ سکے گا۔

میری چادر کا حلیہ } ایک ریشمی ہے اور ایک کھدر کی ہے۔ ریشمی چادر دو برس سے استعمال کرتا ہوں۔ سیٹھ ہاشم محمد بھروچہ رنگون والوں نے نذر کی تھی۔ ایک رخ نیلے ریشم کا ہے دوسرا رخ بادامی ریشم کا ہے۔ بہت ہی خوبصورت اور بہت نرم ہے ہلکی سردی میں اوڑھتا ہوں۔ جو چیز بارہ گھنٹے میرے جسم سے ملی رہے اس سے میں کیونکر محبت نہ کروں۔ میں تو کفن کو بھی بہت پیار کرتا ہوں جو مرنے کے بعد عرصہ دراز تک میرے جسم کے ساتھ رہے گا۔ کھدر کی چادر مولوی فضل حق نظامی ساکن بڑست ضلع کرنال کی بیوی نے چرخہ کات کر اپنے ہاتھ کے سوت سے تیار کی ہے۔ اب عرصہ سے میں اسی کو اوڑھتا ہوں اور پچھلی رات کے دورۂ قبرستان میں یہی چادر میرے جسم پر ہوتی ہے۔ تہجد اور ختم خوانی کے وقت جب اس کو اپنے اوپر دیکھتا ہوں تو بڑی عاجزی اور انکساری پیدا ہوتی ہے۔ ریشمی چادر سے یہ بات پیدا نہ ہوتی تھی بلکہ اس کے برعکس اثر ہوتا تھا۔

ذاتی } آج میں دہلی نہیں گیا۔ دن بھر بورڈنگ ہاؤس میں کام کرتا رہا۔ میری کتاب اعمال حزب البحر میں عربی دعا کا ترجمہ نہیں تھا۔ اب

دوسرے حصہ کتاب تسلی کے لئے آج میں نے دعا مذکور کا اردو ترجمہ بھی کر دیا اور غدر کے افسانے، کتاب کا ایک اعلیٰ اڈیشن بھی لکھنے کے لئے دیدیا۔ افسانوں کا انتخاب کیا ہے۔ کیونکہ ان میں بہت سے افسانے ایسے تھے جو اعلیٰ اڈیشن کی شان کے موافق نہ تھے۔

یہ اعلیٰ اڈیشن سر سید کے پوتے نواب مسعود جنگ کی فرمائش سے تیار کرایا ہے۔ وہ میری اس کتاب کو بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ اڈیشن باتصویر ہوگا اور کاغذ اور لکھائی چھپائی اور جلد بھی اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔

آج بہت سے خطوط کا جواب بھی پورا ہوگیا۔

تین بجے زنانہ میں گیا۔ بچے اور خواجہ بانو وغیرہ سب جمع ہوگئے۔ میں نے کہا آج رہ بنگال سے خبر آئی ہے کہ محمد اسرائیل خاں نظامی کی دکان میں چوری ہوگئی۔ گھر والوں کو یہ خبر سن کر بہت افسوس ہوا۔ آج روحہ نے اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر مجھے بھیجا تھا۔ ہر چیز مزہ دار تھی۔ میں نے روحہ سے کہا تم نے دو تین دن کے اندر کھانا پکانا سیکھ لیا۔ تمہاری استانی مس پلاطس بہت ہی لائق معلوم ہوتی ہیں۔ روحہ اس تعریف سے بہت خوش ہوئی۔ مگر یہ تعریف ایک واقعی تعریف تھی۔ علی اور حسین کی نسبت آج معلوم ہوا کہ انھوں نے امتحان میں بہت اچھے پرچے کئے ہیں۔ میں نے کہا اگر تم دونوں اول نمبر آئے تو میں تمہیں انعام بھی دوں گا۔ اور اخبار میں تمہارا ذکر لکھوں گا۔ علی سے کہا کہ تم کو کھانا پکانے کا شوق ہے۔ توکلی شاہ سے انگریزی کھانے اور کیک بنانے سیکھ لو۔ میں تم کو اسکول سے تین چار دن کی چھٹی دلوا دوں گا۔ توکلی شاہ اپنے اس فن میں بھی بہت بڑے ماہر ہیں۔ ہر چیز نہایت ہی عمدہ بناتے ہیں۔ ایک کمال ان میں یہ ہے کہ سب بچے ان سے مانوس ہوگئے ہیں۔ کوثر۔ زبیدہ۔ صادقہ ہر وقت ان کے پاس رہتے ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ جب توکلی شاہ برما جائیں گے تو یہ بچے ان کو بہت یاد کریں گے۔ نو بجے سویا۔ ڈھائی بجے بیدار ہوا۔ گھر کا سب بال بچے اچھے ہیں۔ اسکول کے بچے بھی اچھے ہیں۔ پارہ صبح ۷۴ درجہ پر تھا۔

۲۲ / جمادی الاول ۱۳۴۹ھ ۱۶ / اکتوبر ۱۹۳۰ء

پنجشنبہ مقام دہلی

سیاسی } پنڈت جواہر لال صاحب نہرو نے ملک کا دورہ شروع کر دیا ہے۔ پنڈت موتی لال نہرو بہت سخت بیمار ہیں۔ بمبئی میں گورنمنٹ نے کانگریس کو پوری طرح دبا دینے کا کام شروع کر دیا ہے۔ خبریں شائع ہوئی ہیں کہ سر مالکم ہیلی گورنر یو پی آئندہ وائسرائے ہوں گے۔ وہ بہت واقف کار اور دانشمند منتظم انگریز ہیں۔

قومی } مولانا کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب کو چھ چھ مہینے قید محض کی سزا دی گئی ہے۔ ہندوستان کے کئی بڑے بڑے شہروں میں مولانا کفایت اللہ صاحب کی گرفتاری کی وجہ سے ہڑتالیں ہوئیں۔

تلقین حیات } اگر کوئی شخص بچپن سے اپنے ناخن کتر کتر کر جمع کرنے شروع کرے تو بڑھاپے تک ان کی مقدار انسان کے جسمانی وزن سے بھی بڑھ جائے گی۔ یا سر کے بال کتر کتر کر بچپن سے بڑھاپے تک جمع کئے جائیں تو وہ بھی انسانی وزن سے بہت بڑھ جائیں گے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے جسم سے جو چیزیں یا قوتیں خارج ہوتی رہتی ہیں۔ ان سے جسم میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اس لئے ترقی حیات کے لئے اپنی جسمانی قوت کو اعتدال کے ساتھ ضروری اور مفید کاموں میں خرچ کرنا چاہئے۔

صادقہ کا حلیہ } ۳۰ / جنوری ۱۹۲۸ء کی صبح کو پیدا ہوئی تھی اور اسی شام

اس کے دادا صادق شہید پستول کی گولی سے شہید ہوئے تھے۔ خواجہ بانو کے حقیقی بھائی سید ابن عربی کی لڑکی ہے۔ دادا یعنی صادق شہید کو اپنے اکلوتے فرزند کی اس پہلی لڑکی کی ولادت سے بہت ہی خوشی ہوئی تھی۔ اور میں نے اس کا نام صادق شہید کے نام پر صادقہ رکھا تھا۔

ڈھائی سال کی عمر ہے۔ خوب گورا رنگ ہے دوہرا جسم ہے مگر بچوں کی سی پھرتی اور تیزی نہیں ہے۔ میری چھوٹی لڑکی کوثر صادقہ سے ایک مہینے چھوٹی ہے مگر خوب بولتی ہے اور خوب دوڑتی پھرتی ہے اور صادقہ نہ زیادہ بولتی ہے نہ زیادہ دوڑتی ہے۔ غالباً اس کے دماغی اعصاب زیادہ مضبوط نہیں ہیں۔ لیکن اس کی سمجھ بہت اچھی ہے۔

صادق عربی کا حلیہ } سید ابن عربی کا بیٹا ہے۔ صادقہ کا چھوٹا بھائی ہے۔ ایک سال کی عمر ہے۔ ماشاء اللہ بہت ہی گورا اور بہت ہی خوبصورت ہے۔ اپنے باپ اور دادا کی صورتوں سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ سر کے بال سرخی مائل بھورے ہیں اور بہت خوشنما ہیں۔ نہایت تیز اور بہت شریر اور ہر وقت خوش رہنے والا بچہ ہے۔ مجھے اپنے بچوں سے بھی زیادہ پیارا معلوم ہوتا ہے سب ہی اس سے محبت کرتے ہیں اس کی تیزی اور شگفتگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کے فضل سے اس کے اعصاب درست ہیں۔

ذاتی } بارہ بجے تک بورڈنگ ہاؤس میں تحریری کام کرتا رہا۔ پھر حضرت بی بی نور صاحبہؒ کی درگاہ میں گیا۔ جہاں مزارات کی مرمت ہو رہی ہے اور پونے چھ بجے تک وہاں رہا۔ پھر دہلی گیا۔ واحدی صاحب کے ہاں بہت سے ملنے والے جمع تھے۔ تعویذ لینے والے بھی آئے تھے۔ ان سب سے فارغ ہو کر بھیا اور واحدی صاحب اور غزالی خاں کے ہمراہ سفارتخانہ افغانستان میں گیا۔ جہاں غازی نادر شاہ کے جشن تاج پوشی کی خوشی میں گارڈن پارٹی تھی دہلی کے سب ہندو مسلمان سکھ عمائد اور دیسی افسران موجود تھے۔ ہز ایکسیلنسی کانسل جنرل صاحب افغانستان نہایت اخلاق کے ساتھ سب مہمانوں سے مل رہے تھے۔ انگریزوں میں سوائے سول سرجن صاحب کے اور کوئی نظر نہیں آیا۔

چھ بجے گھر میں پہنچا۔ کھانا کھا کر چہل قدمی کی۔ پنڈت چشتی ناتھ صاحب اور مولینا بشیر الدین احمد دہلوی کے صاحبزادے ملنے آئے۔ گارڈن پارٹی میں معلوم ہوا کہ رائے بہادر لالہ پارس داس صاحب وغیرہ ہندو مسلمان عمائد کی کوشش سے طبیہ کالج کی ہڑتال آج شام کو ختم ہو گئی۔ اور سب جھگڑے دور ہو گئے۔ رات کو میرے پاس حاجی عثمان عبدالغنی صاحب پی پی اور حاجی روشن صاحب کے تار اجمیر شریف سے آئے کہ طبیہ کالج کو تباہی سے بچاؤ۔

آج زید توکلی شاہ سے کہہ رہا تھا میرے پاس دو موکل ہیں جن کے چہرے شیر کے سے ہیں مستری عشقی نے حسب معمول آج بھی خدمت کی۔ میں نو بجے سویا۔ تین بجے بیدار ہوا۔ پچھلی رات کو ابر آیا۔ تیز ہوا چلی اور سردی بڑھ گئی۔ مگر پارہ صبح ۵۰ درجہ سے بھی زیادہ تھا۔ شاید بارش ہوگی۔

۲۳؍ جمادی الاول ۱۳۴۹ھ ۱۷؍ اکتوبر ۱۹۳۰ء
جمعہ مقام دہلی

سیاسی } سنا ہے آج مولینا حسین احمد صاحب مدنی قائم مقام مولانا کفایت اللہ صاحب نے دہلی کی جامع مسجد میں بہت موثر تقریر کی۔ مولانا بہت مشہور عالم ہیں۔ قید بھی ہو چکے ہیں مسلمانوں پر ان کا بہت زیادہ اثر ہے۔

قومی } ایک مسلمان صاحب ملنے آئے تھے جو کانگریس کو ہمیشہ گالیاں دیتے ہیں۔ کہتے تھے کہ مولانا حسین احمد نے مولانا اشرف علی صاحب کے فتوے

کی تردید کی اور مجھ پر مولانا حسین احمد کی تقریر کا بہت اثر ہوا۔

تلقین حیات } قرآن شریف میں ہے کہ بعض تقریروں میں جادو ہوتا ہے۔ کامیاب آدمی وہی ہے جو فن تقریر میں کمال حاصل کرے۔ جنگل میں جا کر تنہائی میں تقریر کی مشق کرنی چاہیئے۔ اس سے بولنے کی جرات پیدا ہو جاتی ہے۔

حسن الدین نظامی کاملی } بدر الدین برحقی نظامی احمد آبادی کے بیٹے ہیں۔ میرے بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہیں۔ لمبا قد ہے دبلا بدن ہے۔ سولہ کے قریب عمر ہے۔ بہت نیک طبیعت اور پڑھنے کے شوقین ہیں ان کے دادا بھی کفایت شعار تھے اور والد بھی کفایت شعار ہیں اور میں کوشش کرتا ہوں کہ ان میں بھی کفایت شعاری پیدا ہو اگرچہ ان کی طبیعت دوسری طرف جا رہی ہے۔

ذاتی } آج میں دہلی نہیں گیا۔ دن بھر بورڈنگ ہاؤس میں کام کرتا رہا رودولی شریف کے مصطفےٰ حسین صاحب اپنے بھائی کے ساتھ ملنے آئے۔ جیم خانہ کلب دہلی میں ٹھہرے ہیں۔ دونوں فقیر دوست اور نیک طبیعت کے ہیں۔ چار بجے گھر میں گیا۔ وحید نظامی حیدرآبادی کو بخار ہو گیا ہے۔ خواجہ بانو نے ان کو زنانہ میں بلا لیا تاکہ نگہداشت ہو سکے۔ بورڈنگ کے بچے حسین خانہ کی چھت پر پٹہ بازی کرتے ہیں میں نے روحہ سے کہا تم بھی یہ ہنر سیکھو۔ روحہ خاموش ہو گئی۔ میں نے کہا تم سیدانی ہو اور تمہارے بزرگ عورت مرد سب ہی جنگی ہنر سیکھتے تھے۔ ہندو عورتوں اور بچوں کو دیکھو ہزارہا کی تعداد کانگریس کا کام کر رہی ہیں اور جیل خانہ جا رہی ہیں۔ حالانکہ ایسا جذبہ پہلے مسلمان عورتوں میں ہوتا تھا۔ خواجہ بانو نے بھی عورتوں کے متعلق کچھ سوالات کئے اور میں نے ان کو مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ سنائی۔ آج رات کو میرے گھر میں مولود شریف کی مجلس ہوئی تھی۔ مستری عشقی نے پڑھا تھا۔ آج زید کہہ رہا تھا۔ غدر میں پہلے انگریز بھاگ گئے۔ پھر وہ توپیں لائے تو ہم بھاگ گئے۔ میں نے کہا تم نے یہ کہاں سنا؟ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا کہ خاموش ہو جاؤ۔ آج یکایک سردی بڑھ گئی۔ میں نے گرم کرتہ پہنا۔ کل صبح پارہ ۵۵ درجہ تھا۔ آج پانچ درجہ سردی بڑھی اور پارہ ۵۰ درجہ پر آ گیا۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کا سفر افریقہ و ماریشس (مسلسل)

چوتھی قسط

کالے کوس، کڑے کوس

موج خرام یار } ۱۱ اگست ۱۹۹۳ء بدھ کو صبح سے دوپہر تک کا وقت غنی میاں کی چشتی منزل میں اس طرح گزرا جیسے کسی خانقاہ میں اعتکاف اور مراقبہ کیا جائے اور اس سے ذہنی انتشار اس طرح دب جائے اور غائب ہو جائے جیسے برسات کی پہلی پھوار گرد و غبار کو ناپید کر دے۔ شاید اسی لئے جب غنی میاں گھر سے اپنے دفتر اور دوکان سرتاج کمپنی لے کر چلے تو وہ علاقہ جس میں ابھی کل تک گورے یورپین رہتے تھے اور کسی کالے بھورے پرندے تک کو پر مارنے کی مجال اور اجازت نہ تھی۔ معمول سے کچھ زیادہ ہی خوبصورت نظر آیا۔ دولت کے ساتھ اگر خوش مذاقی بھی اللہ میاں کسی کو عطا کر دیں تو ان کی ایسی شان نظر آتی ہے کہ زبان پر سبحان اللہ سبحان اللہ ہی آتا رہے کالے افریقہ کے یورپین گوروں کو خدا نے دولت اور ذوق دونوں سے نواز رکھا تھا!

ڈربن کے جس علاقے سے ہم لوگ گذرے اس کو گوروں نے تقریباً خالی ہی کر دیا ہے۔ کہیں کوئی اکا دکا آدمی نظر بھی آتا ہے تو عمر رسیدہ! جوان اور نوجوان شاید سب کے سب ہی یورپ اور امریکہ سدھار گئے۔ لیکن ان کے مکانات اور مکانوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے باغیچے۔ خوبصورت لان۔ صاف ستھری چمکتی ہوئی سڑکیں سب گویا اردو شاعر کے اس مصرعے کا مصداق نظر آتی ہیں کہ

موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی!

اردو کم جاننے والوں کے لئے اس فارسی نما اردو مصرعے کا ترجمہ یہ ہوگا کہ محبوب کے گذرنے سے راستے کی مٹی پر قدموں کے جو نشان بنے ہیں وہ ایسے خوبصورت ہیں جیسے پیارے کے پیروں سے پھول بن گئے ہوں!

ممکن ہے بعض لوگوں کو اعتراض ہو کہ میں نے ان گوروں کو "یار" کیوں کہا جنھوں نے صدیوں غلام بنا کر رکھا اور ظلم ڈھائے تو عرض ہے کہ دشمن کو یار اور دوست بنانا صوفیوں کا شیوہ ہے۔ اور یار کو دشمن کہنا اردو فارسی شاعروں کا شعار! اور اول الذکر سے مجھے دلی عقیدت ہے۔ اور آخر الذکر سے تعلق رکھے بغیر نہ لٹریچر میں کچھ لطف ہے۔ نہ زندگی میں کچھ مزا! غالب نے بھی اپنے مشہور شعر

دوست دار دشمن ہے اعتماد دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

میں دشمن یار ہی کو کہا تھا!

جہاں جائیے گا ہمیں پائیے گا } زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان خوبصورت گورے علاقوں میں بھی کہیں کہیں مسجدوں کے مینار سر اٹھاتے اور مندروں کی گھنٹیاں آسن جماتی نظر آجاتی ہیں۔ اوم کے جھنڈے اور بجرنگ بلی کی لنگوٹی سمیت! لیکن جھنڈا اور لنگوٹی یہاں بھی ہندوستان پیارے کی طرح مندروں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے پرائیوٹ گھروں تک پہنچ گئے ہیں۔

مسلمانوں نے اوّل اوّل جھنڈے اور علم کو صرف میدان جنگ اور قافلوں تک محدود رکھا تھا۔ ہندوستان آئے اور جھنڈے کو سکۂ رائج الوقت پایا تو کہیں غوث پاک رح کے نام نامی پر اور کہیں خواجۂ اجمیر رح کے اسم گرامی پر اپنی اپنی اونچی اٹریا کو زینت بخشنے کے لئے اس کا استعمال کیا البتہ یہ بات اپنی اپنی نیت اور ارادے پر منحصر تھی کہ کس کے پیش نظر اٹریا زیادہ ہے اور کس کو جھنڈا اور اس کی نسبت پیاری ہے۔ لیکن ہندوستانی حضرات آج سے صدی ڈیڑھ صدی پہلے افریقہ آئے ہوں گے تو اپنی پوٹلیوں اور بکسوں میں جھنڈا کسی قسم کا غالباً نہ لائے ہوں گے۔ لنگوٹی بھی پاس ہوگی تو خری بجرنگ بلی ہنومان جی مہاراج سے نسبت رکھنے والی نہیں۔ خود اپنا تن ڈھکنے والی رہی ہوگی یا مارواڑیوں کی روایتی لنگیا کا قایم مقام! مگر اب تو یہاں جو کچھ ہے تازہ بتازہ امپورٹیڈ مال ہے۔ جس کو بمبئی مدراس سے بھی ڈیوٹی فری مال کے بطور بھیجا گیا ہوگا۔ اور یہاں سمجھدار گوروں نے بھی یہ سمجھ کر ڈیوٹی فری درآمد کی اجازت دی ہوگی کہ ہمارا اس سے کیا بگڑتا ہے!

رشک } دوپہر کا کھانا معمول کے مطابق حضرت قاضی صاحب کے ہاں کھایا۔ قیلولے کے وقت حضرت نے ایک بالکل نئی کتاب "نام و نسب" عنایت کی۔ میں نے اب تک اسے نہیں دیکھا تھا۔ نہ نام سنا تھا۔ حالانکہ میرے پیرزادۂ محترم حضرت سید غلام نصیر الدین گیلانی چشتی قادری مدظلہ العالی کی تصنیف ہے۔ اور وہ میرے دادا پیر حضرت مہر علی شاہ گیلانی نور اللہ مرقدہ کے پڑپوتے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے خاندانی حالات کو یکجا فرمایا ہے۔ تصویریں بھی متعدد ہیں۔ ایسی کتاب ہاتھ آنے کے بعد سونا اور قیلولہ کرنا بھلا کہاں ممکن تھا۔ بقول غالب ع نبنداس کی ہے دماغ اس کا ہے . . . . ! والا معاملہ رہا۔ یہ خوشی بھی ہوئی کہ حضرت قاضی صاحب سلیمانی حافظی جیبی رح ہوتے ہوئے سلیمانی سیالوی مہری رح لٹریچر بھی اپنے پاس رکھتے ہیں اور ایسا تازہ بتازہ کہ مجھ جیسے براہ راست وابستۂ سرکار دربار تک کو اس کی خوشبو ابھی نہ پہنچی ہو! جی چاہا کہ فوراً گولڑہ شریف خط لکھوں اور اس کے سوا اور کچھ نہ لکھوں کہ

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف اور ثمر بھی
اے خانہ براندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی!

مگر پھر گولڑہ شریف سے اتنی دور افریقہ میں بھی جیسے کسی نے مسکراتے ہوئے ہاتھ پکڑ لیا ہو اور کہتے ہوں قاضی صاحب تو خریدار بنے ہیں! تم تو اس بازار تک میں نہیں آئے!

بسیرا } شام کو جس طرح پرندے بسیرے کے لئے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف پرواز کرتے ہیں۔ میں بھی ڈاکٹر شبیر صاحب کے ساتھ ان کی موٹر میں چشتی منزل پہنچ گیا۔ وہ آج بھی راستے بھر سوالات کرتے رہے۔ رات کا کھانا غنی میاں کے چھوٹے بھائی اور عبدالمجید خاں نظامی صاحب مرحوم کے چھوٹے داماد ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کے ہاں ہوا۔ ان کی اہلیہ نے نہایت پر تکلف انگریزی ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ میرس پیٹرس برگ والے کارڈیالوجسٹ اور سرجن

ڈاکٹر الیاس صاحب کے والد محترم بھی تھے۔ کاش کہ ڈاکٹر صاحب بھی ہوتے اور میں کہتا کہ آپ نے تو میرا سینہ چاک کرنے اور بائی پاس سرجری کے لئے چھری چاقو تیز کر ہی لئے تھے۔ لیکن قسمت ان چھریوں کی زیادہ تیز معلوم ہوتی ہے۔ جو آج کھانے کی میز پر چلیں گی!

والدی و مرشدی حضرت خواجہ حسن نظامیؒ ۱۹۱۱ء میں فلسطین و لبنان وغیرہ گئے اور امریکن یونیورسٹی میں یہودی اور عیسائی حضرات نے انھیں ڈنر دیا تو خواجہ صاحب نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ یہ وہ علاقہ ہے۔ جہاں صلیبی جنگوں کے نام پر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان برسہا برس چھریاں چلتی رہیں مگر یہ نہ سمجھے کہ ان کا چلنا بند ہو گیا ہے۔ پہلے دشمنی سے چلتی تھیں آج دوستی سے چلی ہیں کہ ہم سب نے ابھی چھری کانٹے سے کھانا کھایا ہے!

چھاؤنی ۱۲ اگست جمعرات کو صبح کا ناشتہ گھر ہی میں کیا۔ جو ناشتہ روز ہوتا ہے وہ کم و بیش انگریزی ذوق ہی کا ہوتا ہے۔ لیکن کل کے انگریزی ڈنر نے ایسی چھاونی چھائی کہ اس کی چھاپ یا چھاپہ آج صبح قیام گاہ کے ناشتے تک پر پڑا۔ بیگم ڈاکٹر عبدالخالق فاطمہ بی بی کے بنائے ہوئے بادامی بسکٹ بھی تھے۔ غالب نے تو کہا تھا کہ

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

لیکن وہ شاعری کی اور خیالی دنیا کی بات تھی غالباً اسی لئے ہر شاعر التفات کی تمنا اپنے ساتھ قبر میں لے جاتا ہے۔ عملی دنیا کی بات یہ ہے کہ منہ سے بولو تو کچھ ملتا ہے۔ مدتیں ہو گئیں اپنے ایک سفرنامے میں بھنڈی کے سالن کی تعریف کی تھی اور سچی تعریف کی تھی۔ سو آج تک کم از کم ہندوستان میں ہر اس گھر میں بھنڈی گوشت کے پلے جاتے ہیں، جہاں سفرنامے کو توجہ اور دلچسپی سے پڑھا گیا تھا افریقہ والے کے قائل ہیں۔ یہاں کا سفرنامہ نہ اس وقت تک لکھا گیا تھا۔ نہ چھپا تھا نہ کسی نے پڑھا تھا بسکٹوں کی بس زبانی تعریف کی تھی اور یہ تعریف بھی سچی تعریف تھی کہ بادامی بسکٹ تازہ بتازہ کرارے کرارے اوون OWEN سے نکلے اور چائے کی ہر پیالی کے ساتھ اس طرح لفٹ رائٹ کرتے اڑنے لگے۔ جیسے آرمی بیرکس سے فوجی سپاہی کڑی کمان کے تیروں کی طرح نکل رہے ہوں!

دوپہر ہوئی شام ہوئی آج بعد نماز عشاء حضرت قاضی صاحب کے ہاں ذکر کا ہفتے وار حلقہ تھا۔ دوپہر سے رات تک کا وقت انہی کی خدمت میں گذرا۔ آج پھر کتاب "نام و نسب" نے نیند اڑائی اور بعد مغرب حلقے کا وقت آیا اور مجھ سے تقریر کا تقاضا ہوا تو پتہ چلا کہ لاریب غالب بالکل سچا آدمی تھا۔ واقعی نیند کے ساتھ میرا دماغ بھی غائب تھا۔ روز روز کی بدپرہیزی سے شکر بھی بڑھی ہوگی۔ ایک بات کہتا تھا اور بھول جاتا تھا کہ کیا کہا تھا اور اگلی بات سے اس کا جوڑ کس طرح ملاؤں۔ حلقے کے شرکا، ہمارے ادب کے نماز کے مقتدیوں کی طرح لقمہ دینے سے بھی پرہیز کرتے۔ مجبوراً مجھے امام ہوتے ہوئے بھی خود ہی لقمہ مانگنا پڑا تاکہ کہو میں نے کیا کہا؟ مگر دلی والے حضرت خواجہ میر دردؔ اس اٹھے وقت مدد کو آئے اور انھوں نے اپنا یہ شعر یاد دلایا کہ

طریق ذکر تو ہے دردؔ یاد عالم کو
طرح بتایئے کچھ اپنے تئیں بھلانے کی!

پھر دادا پیر حضرت مہر علی شاہؒ کے پیر و مرشد حضرت خواجہ شمس الدین سیالویؒ نے استعانت فرمائی۔ معلوم نہیں کس طرح اس بھول کے عالم میں بھی ان کا یہ واقعہ یاد آگیا کہ ایک بڑے مولوی صاحب جو علم و

سلوک کی تکمیل کر و بیٹھ خود ہی کر چکے تھے۔ اور شاید
رسم ادا کرنے کو حضرت سیالوی ؒ سے بیعت ہوئے
تھے۔ انھوں نے حضرت کا بتایا ہوا ایک چھوٹا سا
اور بظاہر معمولی وظیفہ شروع کیا تو محسوس ہوا کہ
جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا۔
یعنی جو محنت انھوں نے سلوک کی خاطر برسہا برس کی
تھی وہ اس طرح مٹ گئی اور غائب ہو گئی جیسے کسی نے
سلیٹ پر چاک سے لکھی ہوئی کسی تحریر کو گیلے کپڑے
سے مٹا دیا ہو! بہت پریشان ہوئے اور رسمی کر
رسمی مرید بننے سے فائدے کی جگہ نقصان ہوا کہ ان کے
اپنے پندار کے مطابق جو پرانی کمائی تھی وہ بھی ہاتھ
سے گئی۔ پھر اپنے ایک دوست کے مشورے پر
شکایت لے کر حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی ؒ
کی خدمت میں آئے۔ حضرت ان کی پریشانی دیکھ کر
پریشان نہیں ہوئے بلکہ ایک خاص ادا سے مسکرائے
اور پنجابی زبان میں بس اتنا کہا

اک جائے تے دوجا آئے

جب ایک چلا جائے گا۔ تب ہی تو دوسرا آئے گا۔ یعنی
جگہ تو بس ایک کی ہے۔ اگر وہاں کوئی غیر بیٹھا ہو
تو اپنا کہاں سے سمائے۔ غیر کو نکالو جب اپنے کی
گنجائش نکلے۔ اللہ کے غیر کی نفی کی جائے تب اللہ
کا اثبات ممکن ہو۔ تمہارا کام تو اس چھوٹے سے
وظیفے ہی نے کر دیا کہ ماسوا کے نقش کو سلیٹ پر
سے چاک کی تحریر کی طرح گیلے کپڑے سے مٹا دیا۔
اب باقی کام اثبات کا رہ گیا ہے۔ سو وہ انشاءاللہ
اب ہوگا۔

خدا معلوم بھول کے اس عالم میں ذکر سے متعلق
حضرت خواجہ میر دردؔ کے شعر کا مفہوم اور حضرت
سیالوی ؒ کے تذکرے کی معنویت کو میں سمجھا سکا
یا نہیں!

حضرت قاضی صاحب کے صاحبزادے بہت
خوش الحان قاری ہیں۔ مدرسے میں پڑھاتے ہیں۔ ذ
وقت انھوں نے قرأت بھی فرمائی۔ ذکر، خفی
جلی دونوں طرح کا تھا اور بہت باکیف تھا۔
یہاں کے ذکر میں کیفیت نہ ہو تو لوگ ایسی
سے اس میں شریک نہ ہوں جیسی باقاعدگی
شریک ہوتے ہیں۔ ذکر اور کھانے کے بعد حا
کے صاحبزادے بھی ہوتے۔ صاحبزادی دا
بچے سب ملے۔ زیادہ خوشی اس سے ہوئی
میں سے کوئی بھی پیرزادگی پر مطمئن اور قانع
ہے۔ سب کے سب پڑھنے لکھنے خود اپنے
پر کھڑے ہوئے اور کام دھندوں میں مصرو
بہو کیپ ٹاؤن کی ہیں۔ نجوم اور علم الید یعنی
اور پامسٹری بھی جانتی ہیں۔

ماڈرن تبرک

ذکر کے بعد خواجگان
اور فاتحہ چاکلیٹ پ
نیازمیں بسکٹ تو ہندوستان میں بھی رکھے جانے
افریقہ کی چاکلیٹ ایک نیا اضافہ ہے۔ ممکن ہے چا
کو یہ اعزاز یورپ وامریکہ میں بھی حاصل ہو!

ہمارے جنوبی ہندوستان میں پھلوں پر
دلانے کا رواج ہے۔ شاید اس لئے کہ اسے بہ
اعتبار تبرک سمجھا جاتا ہے۔ مٹھائی مسلمان حلوا
ہاں سے بھی آئے تو کوئی کارنامہ نہیں کہ اس کے کا
اور برتنوں کو بھی کتے نے نہ چاٹا ہو یا ملازم
خود بھی پاکی اور طہارت کے مسائل سے واقف
تعجب ہے شمالی ہند میں پھل صرف کسی موت
فاتحہ میں رکھے جاتے ہیں۔ جیسے سوئم یا چہلم۔
دوسری نیازوں میں موت کے ڈر سے پھل اس
ہوتے ہوں۔ مغل حکومت کے آخری دور اور
کے توہمات تحت شعور میں موجود ہوں تو ک
شاہی خاندان کے افراد مرنے کو گھر کے در
سے باہر نہیں لے جاتے تھے۔ گھر کی کوئی دہ

جنازہ نکلا کرتا تھا کہ کہیں موت گھر نہ دیکھ لے اور پھر آجائے۔ عقلمند اتنا نہ سوچتے کہ موت تو پہلے ہی سے ہر گھر کا سے واقف ہے جب ہی تو ان کے ہاں بھی پہنچی تھی!

ایک وجہ پھلوں کو نیاز میں نہ رکھنے کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شمال والے پھلوں کے چھلکوں اور بیجوں میں فاتحہ کے سرایت اور حلول کر جانے کا گمان کرتے ہوں اور ظاہر ہے کہ چھلکے اور بیج پھل کھانے کے بعد گندی جگہوں پر بھی پھینک دیئے جاتے ہیں۔ تبرک کی بے حرمتی کسی کو بھی گوارا نہیں ہو سکتی مگر یہ سب اس خاکسار راقم الحروف کی خیال آرائیاں ہیں۔ افریقہ والے الحمدللہ ان سب اندیشہ ہائے دور دراز سے بے نیاز ہیں۔ چاکلیٹ کے کاغذ اور ریپر بے جھجک پھینک دیتے ہیں یعنی سمجھ دار اور ہوش مند ہیں۔

بچوں کے لئے چاکلیٹ کا تبرک بہت پرکشش ہوتا ہے۔ اور بوڑھے تو بچے ہوتے ہی ہیں۔ خاص طور پر مجھ جیسے بوڑھے جو شکر کے مریض بھی ہوں کچھ زیادہ ہی بچے بن جاتے ہیں۔ چنانچہ مجھے چاکلیٹ کا ڈبل ڈبل تبرک وی آئی پی مہمان ہونے کے ناطے ملا تو اسے بے تامل جیب میں رکھا۔ اب اللہ جانے یہ تماشا میزبانوں نے دیکھ لیا یا وہ صاحبانِ کشف ہیں کہ میں قیام گاہ پر واپس آیا اور چائے کافی کے دور کے بعد خواب گاہ میں جا کر روشنی کا سوئچ کھولا تو پلنگ کے پاس چھوٹی میز پر لیمپ تلے ایک نہایت خوبصورت ڈبہ خشک میووں کو چاکلیٹ کے لبادے بلکہ لبادوں میں لپیٹے اور چھپائے اطمینان سے براجمان نظر آیا!

دوسرا جمعہ } مجھے افریقہ آئے جمعہ جمعہ پورے آٹھ دن ہو گئے مگر سچ پوچھئے تو ابھی

یہاں کچھ بھی نہیں دیکھا۔ صبح حضرت صوفی غلام محمد حبیبیؒ اور ان کی اہلیہ کی درگاہ میں حاضری دی۔ دہلی سے لائی ہوئی چادریں چڑھائیں۔ حضرت قاضی صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ وہ واپس چلے گئے اور ہم لوگ جمعے کی نماز کے لیے درگاہ شریف ہی میں ٹھیر گئے۔ بڑا اچھا وقت گذرا۔ نماز درگاہ کی نئی تعمیر شدہ مسجد میں پڑھی۔ خطبے کے علاوہ انگریزی میں تقریر بھی ہوئی۔ اُجلی مسجد۔ ستھرا ماحول۔ پڑھے لکھے، مہذب نمازی۔ جنت میں جو کچھ ملنا ہے ملتا رہے گا۔ فی الحال تو اس درگاہ اور مسجد کا ماحول ہی جنت کا ماحول لگا۔ مسجد سے باہر پارکنگ کی ساری جگہ موٹروں سے بھر گئی تھی۔ اس محلے میں مسلمانوں کی مستقل آبادی کم ہے۔ سارے نمازی دور کے علاقوں سے آتے ہیں۔ جمعے کے علاوہ بھی ہر نماز میں لوگ شریک ہوتے ہیں۔

نماز کے بعد سمندر کے کنارے کی سیر کی۔ پانی بہت صاف ہے۔ بیچ بھی صاف ستھری ہے۔ ساحل پر جھاڑیاں اس طرح قایم اور باقی رکھی گئی ہیں کہ کنارہ بالکل قدرتی معلوم ہو۔

دوپہر کا کھانا تاج کمپنی میں بیگم صاحبہ حضرت عبدالمجید الف خاں نظامی مرحوم کے ہاں کھایا۔ ان کے بڑے صاحبزادے عبدالمجید خاں نظامی، بہو شریفہ بی نظامی عبدالعزیز نظامی ان کی دلہن پوتے اور پوتی بہو صاحبزادی صغراء اور دوسرے افرادِ خاندان کے علاوہ مولانا ابراہیم خوشتر اور مولانا فاروق قادری بھی موجود تھے۔ دونوں حضرات بریلوی جماعت کے سرگرم رکن ہیں۔ اول الذکر انگلستان میں رہتے ہیں۔ دوسرے ڈربن کے سنّی سینٹر کے نگراں ہیں۔

خاں صاحب مرحوم کا معمول تھا کہ جمعے کی نماز کے بعد احباب کے ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے۔

اور جمعے کے کھانے کا خاص مینو حلیم۔ مچھلی۔ قبولی اور زعفرانی حلوہ ہوا کرتا تھا۔ وہ آج بھی تھا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کا پہلا عرس ہوا تھا تو قوالوں نے یہ شعر بھی گایا تھا اور سرکار کی حالت غیر ہو گئی تھی۔

محفل یار ہمانست ولے یار کجا

دوست کی محفل اسی طرح آراستہ ہے۔ مگر دوست کہاں؟ وہ باتیں بڑے لوگوں کی باتیں تھیں۔ تاج کمپنی میں جب تک رہا۔ ضبط کرتا رہا مگر چار بجے قیام گاہ پر آیا تو میری حالت بھی غیر ہوئی سینے میں شدت کا درد اٹھا۔ دوا کھا کر لیٹا رہا۔ شام کو حضرت احمد رضا خاں صاحبؒ کے عرس میں بھی شریک نہ ہو سکا جس کا آج ڈربن میں اہتمام کیا گیا ہے۔ جمعے کے بعد دوسرا ہفتہ بھی آ گیا۔

دوسرا ہفتہ یعنی سنیچر کا دن بھی آیا۔ اور دوسرے ہفتے کی شروعات بھی ہوئی۔ ڈربن میں عبدالمجید خاں صاحب کے خاص دوستوں میں ایک نمایاں شخصیت جناب یوسف ہانسا صاحب کی بھی ہے جنوبی افریقہ کے سربرآوردہ حضرات میں ہیں۔ پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ دہلی بھی کئی دفعہ آ چکے ہیں۔ حکیم عبدالحمید صاحب چانسلر ہمدرد یونی ورسٹی سے بھی ان کے خاص مراسم ہیں۔ میری نالائقی کہ ان کو اپنی آمد کی اطلاع نہیں دے سکا۔ نہ خود ان کے پاس حاضر ہو سکا اور ان کی نوازش کہ میری آمد سے آگاہ ہوتے ہی ٹیلی فون کیا۔ خود تشریف لائے۔ سارے ڈربن کی سیر کرائی۔ یونی ورسٹی دکھائی۔ اپنے گھر پر بہت مزیدار لنچ کھلایا۔ تحائف سے لادا۔ ڈربن کے اکابر سے ملایا۔ اور جب تک دوبارہ ملنے اور آنے کا وعدہ نہیں لے لیا رخصت کی اجازت نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا کرے۔ ان کے ہاں عباس صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جو یہاں کے بااثر تاجروں میں ہیں۔

یوسف ہانسا صاحب کو قومی اور دینی خدمت کا خاص ذوق ہے اور اپنے کاروبار کے اوقات میں سے وقت نکال کر قومی کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔ ڈربن یونی ورسٹی بہت اونچی پہاڑی پر واقع ہے۔ سارا شہر اور سمندر کا ساحل یہاں سے دکھائی دیتا ہے۔ عالی شان عمارتیں ہیں۔ پاکیزہ ہے۔ یہاں آکر ایران کے قدیم مدرسے یاد آئے۔ ہم لوگ پہنچے تو پتہ چلا کہ کسی خاص وجہ سے تعطیل ہو گئی ہے اور یونی ورسٹی بند ہے۔ بہت افسوس ہوا۔ کیونکہ سن رکھا تھا کہ حضرت مولانا سلیمان ندوی کے صاحبزادے حضرت سلمان میاں صاحب مدظلہ بھی یہاں پڑھاتے ہیں مجھے یونی ورسٹی دیکھنے سے زیادہ ان کو دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ جنوبی افریقہ ہیرے مشہور ہیں مگر مجھے تلاش ایک ہندوستانی "نور نادیدہ" کی تھی۔ ہانسا صاحب نے دوبارہ یہاں لانے کا وعدہ فرمایا۔ کیمپس میں داخلہ کارڈ سے ہوتا ہے۔ اندر جاؤ تو کارڈ لے کر جاؤ۔ واپس آؤ تو کارڈ واپس دے کر جاؤ۔ یہ بات بہت اچھی لگی۔ اس سے نہ صرف یہ معلوم رہتا ہے کہ کس وقت کتنے باہر کے آدمی کیمپس میں ہیں بلکہ خواہ مخواہ کی بھیڑ بھاڑ کو بھی کنٹرول میں رکھا جا سکتا ہے۔ علم کی دنیا میں نہ فالتو آدمی کا دخل ہونا چاہیے نہ فالتو بات کا!

ایک یہ یونی ورسٹی ہے۔ ایک ہمارے ہاں کے ادارے ہیں کہ نکمے اور نہایت مفسد لوگوں کا جمگھٹ وہاں نظر آتا ہے۔ بلکہ بعض یونی ورسٹیوں میں برسہا برس ایسے آدمی ہوسٹلوں میں مقیم رہتے ہیں جن کا یونی ورسٹی یا تعلیم سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا!

خواجگان کی نیاز شام کو خواجگان چشت اہل بہشت کی نیاز عبدالمجید خاں نظامی مرحوم

خاندان کے دوسرے مرحومین کو ہدیہ پیش کرنے کے لئے
قرآن خوانی رکھی گئی تھی۔ غنی میاں نے سارے کنبے کو
جمع کیا تھا۔ ماشاء اللہ ایسا بھرا پُرا گھر ہے کہ دیکھتے
دیکھتے قران مجید ختم ہوگیا۔ خان صاحب مرحوم کے
بڑے صاحبزادے عبدالحمید خاں نظامی صاحب
کے سمدھی حافظ اسماعیل صاحب نے فاتحہ بھی دی
اور مغرب کی نماز بھی پڑھائی اور دعائیں تو ایسی مانگیں
کہ روح وجد کرنے لگی۔ حافظ صاحب ملتان کے ایک
قادری بزرگ سے بیعت ہیں۔ ڈربن سے بہت
دور جنوبی افریقہ کے کسی چھوٹے شہر میں دوکان
کرتے ہیں۔ یہاں کے اکثر دوکاندار صرف مادی
اجناس کے بیپاری ہو کر نہیں رہ گئے ہیں۔ روحانی
اور دینی دنیا کے سودے سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔
اور دونوں جگہ ان کی یکساں مہارت ظاہر ہوتی ہے۔
نیاز کا کھانا سارے خاندان نے مل کر پکایا
تھا۔ اور بہت پر تکلف تھا۔ آج کے اس اجتماع
میں باقاعدہ میرے استقبال کی رسم بھی ادا ہوئی۔
مجھے خبر نہیں تھی کہ خاں صاحب مرحوم کی منجھلی
صاحبزادی صغرا بی بی شعر بھی کہتی ہیں۔ آج انھوں
نے بھی اپنا کمال دکھایا اور اپنی ہر طرح سے آزاد
یہ نظم استقبال میں پڑھی۔

خواجہ حسن ثانی نظامی اہلاً و سہلاً مرحبا مرحبا
چشتی نظامی سلسلے کے سجادہ نشین ہمارے مہمان بن کر آئے
اس خاندان کا نصیب جاگا
مرحبا مرحبا قلم تو لکھتا جا !
ساؤتھ افریقہ کی تاریخی زمین پر آنا تمہیں مبارک ہو
ہمارا خوش نما شہر غزل سرا ہے
تمہارے استقبال کو !
مرحبا مرحبا۔
خواجہ حسن نظامی رح کی دعائیں اثر دکھاتی ہیں
شادمانی اور مسرت کی حد نہیں
مرحبا مرحبا۔
قلم تو لکھتا جا۔
منادی پہچان ہے صوفیوں کی اولیاء اللہ کی
اسلام کا پرچم اس میگزین کے ہاتھ میں ہے
دہلوی قلم نے اردو کو بلندی بخشی۔ پروان چڑھایا
خواجہ حسن نظامیؒ کی قلمی شان دیکھو !
مرحبا مرحبا۔
قلم تو لکھتا جا!
ہماری خاطر، ہماری تواضع پسند خاطر ہو
تمنا ہے۔
دہلوی مہمان نوازی کی یادیں تازہ ہیں
سنا ہے تمہارا کشمیر جنت سے کم نہیں
مگر تم مانو گے ہرا بھرا ناٹال بھی جنت ہے۔
التجا ہے اپنا ویزا بڑھا دو
خوشی کے بادل جھوم اٹھیں گے
میری امی اور پھوپی شاید جدائی کا غم نہ سہہ پائیں
مرحبا مرحبا
قلم تو لکھتا جا !

صغرا بی بی کی مادری زبان گجراتی ہے۔ اور روزمرہ
گھر کی بول چال کی زبان انگریزی۔ اردو انھیں عبدالحمید
خاں نظامی صاحبؒ نے پیر کی زبان اور پیر خانے کی زبان
ہونے کی وجہ سے سکھائی۔ صغرا کے ایک بھائی عبدالحفیظ
خاں سلمہ جن کی تعلیم دہلی میں ہوئی ہے اور جو آجکل کینیڈا
میں بس گئے ہیں۔ کہا کرتے تھے کہ والد نے ہم بھائی بہنوں
کو نہ صرف اردو سکھائی بلکہ اردو سکھانے میں خاصے
جبر سے بھی کام لیا! منادی بھی گھر میں سبقاً سبقاً پڑھایا
جاتا تھا! لیکن جو زبان جبراً سکھائی جائے اس کو نہ
تو کوئی ٹھیک ڈھنگ سے سیکھ سکتا ہے۔ نہ یاد رکھ
سکتا ہے۔ صغرا سلمہا نے اردو سے اتنی واقفیت
حاصل کر لی۔ یہی ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ان کی آزاد
استقبالیہ نظم میں میری ایسی تعریف ہے کہ مجھے اسے سفرنامے

میں درج نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن اس سے ان کی دلچسپی بھی ہوتی اور باہر والوں کو یہ پتہ بھی نہ چلتا کہ اپنے وطن ہندوستان سے دیس نکالے کے باوجود اردو کو باہر جاکر بس جانے والے ہندوستانیوں نے کس طرح زندہ رکھا ہے۔ اور آج بھی اس کے قیام اور بقا کے لئے کیسی کوششیں کر رہے ہیں۔

صغرا بی بی کی اردو دانی پر گفتگو کے دوران ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ گجرات سے آکر افریقہ میں بسنے والے لوگ اپنی مادری زبان کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ کاروباری لین دین کے دوران اگر دونوں فریق گجراتی بولیں تو ہر فریق جھکتا ہے اور سامنے والے کے ساتھ رعایت برتتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اردو میں گفتگو کی جائے یا انگریزی بولی جائے تو بس کاروباری بنیاد پر سودا ہوتا ہے رعایت کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے! اپنی مادری زبان سے محبت کرنے اور پردیس میں اس کو قایم رکھنے کا یہ ایک نہایت عمدہ اور عملی طریقہ ہے۔ گجراتیوں کو اس پر داد ملنی چاہیئے۔ لیکن انھوں نے انگریزی کے ساتھ اردو کو خواہ مخواہ اجنبیت اور بے مروتی کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ اردو بھی گجرات کی اور ولی گجراتی جیسے لوگوں کی زبان ہے۔ اس کو انھوں نے پرایا کیوں سمجھ لیا؟

ڈربن میں چیسٹ ویتھ
سنی رضوی سوسائٹی } نامی ایک محلہ ہے۔ جس کو انڈین ٹاؤن شپ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ وہاں سنی رضوی سوسائٹی کے نام سے بریلوی حضرات نے ایک سنٹر قایم کر رکھا ہے۔ کل حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحبؒ کے عرس میں تو میں علالت کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکا تھا۔ آج وہاں نعتیہ مشاعرہ تھا۔ اس میں تھوڑی دیر کے لئے گیا تھا۔ مشاعرے کا انتظام ایک شامیانے کے نیچے تھا۔ بچوں کی نشست تھی۔ شرکا سب کے سب بریلوی عقیدے سے تعلق رکھنے والے ہی معلوم ہوتے تھے۔ خدا معلوم دوسرے عقاید کے لوگوں کو بلایا ہی نہیں گیا تھا۔ یا وہ بلاوے کے باوجود نہیں آئے تھے۔ ہندوستان پاکستان میں جو نعتیہ مشاعرے ہوتے ہیں ان میں عام طور پر ہر مسلک کے مسلمان شریک ہوتے ہیں۔ اور نعت تو چیز ہی ایسی ہے جس پر سب کو جمع ہو جانا چاہیئے۔

میرس پیٹرس برگ
دوبارہ میرس پیٹرس برگ } کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ۱۵ ر اگست اتوار کو وہاں پھر جانا ہوا۔ ناشتہ ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کے ہاں تھا۔ مجھے دلی یاد آتی رہی کیونکہ آج ہمارے ہاں یوم آزادی کی تقریبات ہو رہی ہوں گی۔ اور وزیر اعظم لال قلعے کے دروازے سے تقریر کر رہے ہوں گے۔

اس شہر میں دوبارہ اس وجہ سے آنا پڑا کہ عبدالغنی صاحب کی بڑی صاحبزادی فاطمہ سلمہا اور داماد کے نئے مکان کا باقاعدہ رسمی طور پر افتتاح ہونا تھا۔ ڈربن سے کنبے کے افراد اور احباب کا ایک بڑا قافلہ میرس پیٹرس برگ پہنچا۔ مقامی حضرات بھی تھے قرآن خوانی اور ختم خواجگان کے بعد غنی میاں کے پیر و مرشد حضرت قاضی صاحب اور میں نے دعائیں مانگیں اللہ تعالےٰ اس گھر کو آباد اور گھر والوں کو شاد رکھے۔ ڈاکٹر حسن صاحب جو صاحبزادی کے والد ہیں حسب معمول اردو اشعار سے محفل کو باغ و بہار بناتے رہے۔ مکان کی تعمیر میں ایک نئی بات دیکھی اور بہت اچھی معلوم ہوئی کہ مغربی طرز کے غسل خانوں کے ساتھ ایک طہارت خانہ خالص مشرقی طرز کا بھی بنایا گیا ہے۔ حضرت قاضی صاحب کے گھر اور بعض مسجدوں کے علاوہ اور کسی مکان میں اس طرح کے طہارت خانے میں نے یہاں نہیں دیکھے

ان طہارت خانوں میں ناپاک چھینٹیں جسم پر پڑنے
کا امکان کم سے کم ہوتا ہے۔

شام کو میرٹس بیٹرس برگ سے ڈربن واپسی
ہوئی۔ آج بھی حضرت قاضی صاحب کے ہاں ذکر
اور ختم کا حلقہ تھا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء
محبوب الٰہی رح کے لئے ایصال ثواب ہوا۔ مجھ سے
تقریر بھی کرائی گئی۔

آج میاں عبدالغنی اور سارہ سلطانہ
میاں اسلم پرویز} کا ورکنگ ڈے تھا۔ یعنی انہیں
کل اتوار کی چھٹی کے بعد آج اپنے دفتر اور
دوکان کو دیکھنا تھا۔ مگر انھوں نے تین آدمیوں
کے کام کو ایک آدمی یعنی اپنے اکلوتے صاحبزادے
میاں اسلم پرویز سلمہٗ کے حوالے کر دیا اور مجھے
ڈربن کی سیر کرانے لے گئے۔

میاں اسلم پرویز میرے لئے بڑی تاریخی
شخصیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کی دنیا میں
تشریف آوری کو میری والدہ ماجدہ حضرت سیدہ
محمودہ خواجہ بانو نظامی رح کی دعا کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔
میاں عبدالغنی اور سارہ سلطانہ کو اللہ تعالیٰ نے
بیٹیاں تو کئی عنایت فرمائی ہیں۔ لیکن ان کے ہاں
بیٹا کوئی نہیں تھا۔ ۶ جولائی ۱۹۷۱ء کو میری والدہ
نے انہیں ایک خط لکھا جس میں چار لڑکوں
کے نام درج تھے۔ جن میں سے دو نام تو اس کنبے
کے دوسرے ناموں سے ملتے جلتے تھے۔ اور دو نام
ہمارے دور کے دو مشہور اردو والوں کے نام
تھے ایک "خلیق انجم" یعنی انجمن ترقی اردو ہند
کے موجودہ جنرل سکریٹری اور دوسرا "اسلم پرویز"
یعنی جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں اردو کے
استاد! یہ دونوں حضرات آپس میں جگری
دوست ہونے کے ساتھ سالے بہنوئی کے رشتے
میں بھی منسلک ہیں۔

حضرت خواجہ بانو نے میاں عبدالغنی اور سارہ سلطانہ
کو اپنے مذکورہ بالا خط میں ہدایت کی تھی کہ ان چار
ناموں میں سے کوئی ایک نام پسند کر لو۔ اور اسے
ایک کاغذ پر لکھو۔ اور اس کاغذ کو کسی قرآن مجید
میں رکھ دو۔ انشاء اللہ اسی سال تمہارے ہاں
بیٹا ہو جائے گا اگر ایسا ہو تو اس کا نام وہی رکھنا
جسے تم نے منتخب کر کے قرآن مجید میں رکھا ہو۔ اور
وہ قرآن مجید جس میں یہ نام لکھ کر رکھا جائے
اس کے ہم وزن دودھ کی بنی ہوئی کوئی مٹھائی تیار
کرنا اور اس پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی
نیاز دلا کر چھوٹے بچوں کو کھلا دینا!

چنانچہ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ واقعی اسی سال ان
میاں اسلم پرویز نے بغیر کسی آواگون کے دلی کے
ساتھ ساتھ جہاں وہ پروفیسر اسلم پرویز کی حیثیت
سے موجود ہی تھے ڈربن میں بھی نزول اجلال فرمایا!
یعنی پیدا ہو گئے! اور اب ماشاء اللہ ۲۱ برس کے
کڑیل جوان صالح ہیں! اور اللہ نظر بد سے بچائے
تین آدمیوں کا کام اکیلے سنبھالنے کے قابل ہیں!

عبدالغنی صاحب نے میری والدہ کے تاریخی خط کو
بڑی حفاظت کے ساتھ فریم کرا رکھا ہے۔ میں نے
ان سے کہا کہ اس کی فوٹو کاپی مجھے بھی دے دیجئے تاکہ میں
اسے دہلی لے جا کر بھائی ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر اسلم پرویز
کو دکھاؤں بڑی حیرت اس بات پر ہے کہ یہ دو نام
بیک وقت میری والدہ کے ذہن میں کیسے آئے؟ اتنا
میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ والدہ کو یہ بات ہرگز ہرگز
معلوم نہ تھی کہ خلیق انجم صاحب اور اسلم پرویز صاحب
ایک دوسرے کے گہرے دوست اور سالے بہنوئی ہیں
ممکن ہے اسی زمانے میں ان دونوں قلم کاروں کے
مضامین والدہ نے ایک ساتھ کسی کتاب یا اخبار
رسالے میں پڑھے ہوں اور مضامین ایسے پسند
آئے ہوں کہ لکھنے والوں کے نام ذہن میں رہ گئے ہوں

اور میاں عبدالغنی کے ہونے والے بیٹے کا نام تجویز کرتے وقت سامنے آگئے ہوں! مجھے یاد پڑتا ہے کہ غالبا اسی زمانے میں ان دونوں حضرات نے کسی سمینار میں حضرت خواجہ حسن نظامیؒ پر بحیثیت روزنامچہ نویس اور انشاء نگار مضمون پڑھے تھے۔ ممکن ہے یہی دونوں مضمون ان دونوں میاں بیوی اردو قلم کاروں یعنی حضرت خواجہ صاحب اور ان کی اہلیہ کو پسند آئے ہوں! اور بیٹا ہونے میں اس پسند اور روحانیت نے بھی کچھ کرشمہ دکھایا ہو! یا پھر یہ کام اکیلے مصورِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامیؒ ہی نے فرمایا ہو! ان کا وصال تو ۱۹۵۵ء میں ہو چکا تھا۔ یعنی اسلم پرویز سلمہٗ کی پیدائش سے سولہ سترہ برس قبل۔ لیکن ہمارے عقیدے کے مطابق تو وہ اللہ کے نیک اور مقبول بندے کی حیثیت سے زندہ ہی ہیں۔ اور یہ قدرت انھیں حاصل ہے کہ کسی مضمون پر اپنی پسندیدگی اور داد کو اس طرح ظاہر فرمائیں کہ اپنی شریک حیات اور رفیق تحریر خواجہ بانو کے قلم سے اسے املا DICTATE کرادیں! عبدالغنی صاحب اور سارہ سلمہا کے ہاں اسی سال بیٹے کا ہو جانا جس سال خواجہ بانو نے خط لکھا خود اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ اس معاملے میں روحانیت اور دعا کا خاص دخل رہا ہے!

حضرت محبوب الٰہیؒ
نے فرمایا:
جو شخص ہر فرض نماز کے فوراً
بعد آیت الکرسی پڑھتا ہے۔ حق تعالیٰ
اس کی روح بغیر ملک الموت کے واسطے
کے قبض کرتا ہے۔
اردو ترجمہ سیر الاولیاء ملفوظ ۱۵۹

ناظرین منادی سے

التماس

منادی کے منتظمین اس کی قیمت بڑھاتے بڑھاتے تھک گئے ہیں۔
منادی کے ناظرین زیادہ قیمت ادا کرتے کرتے اس سے زیادہ تھکے ہوں گے۔
لیکن ہمارے ارباب اختیار مہنگائی بڑھاتے بڑھاتے ہرگز نہیں تھکے ہیں۔
نہ غالبا مستقبل میں تھکیں گے۔
کیونکہ وہ اتنے زیادہ خوشحال ہیں
اور ایسے پیٹ بھرے ہیں
کہ قیامت تک بھی
بدحالی
اور خالی پیٹ
سے ہونے والی
کسی تکلیف کا اندازہ نہیں کر سکتے۔
اس لئے صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔
تاہم ناظرین منادی کی سالانہ قیمت وقت پر ادا کرتے رہیں تو اس سے کچھ نہ کچھ سہولت انشاء اللہ ضرور ہوگی۔
قیمت بھیجتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ دیں یہ نمبر آپ کے پتے کے ساتھ درج ہوتا ہے۔ اس حوالے کے بغیر آپ کی قیمت آپ کے کھاتے میں جمع نہیں ہو سکتی۔

منیجر

مُنَادِیًا یُّنَادِی لِلْاِیْمَانِ

بارگاہ سُلطان المشائخ حضرت خواجہ نظامُ الدّین اولیا محبوبِ الٰہیؒ سے

ایمانؔ اور امنؔ کی ندا دینے والا

اور اُن کے جانشینؒ

امام المشائخ شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی یادگار

ماہنامہ

منادی

نئی دہلی

منادِی ۱۹۲۶ء سے جاری ہے یہ اُنہترویں جلد (۱۹۹۴ء) کا چوتھا شمارہ ہے

مدیر

خواجہ حسن ثانی نظامی

مُعاوِن مُدیر

خواجہ مہدی نظامی

درگاہ

[…]یف اور منادی کے بارے میں
[…] و کتابت کرنے اور قیمت
جمع کرانے کا پتہ
خواجہ حسن ثانی نظامی
[…]ار حضرت نظام الدین اولیاء
نئی دہلی ۱۳-۱۱

سالانہ قیمت
ہندوستان میں
پچاس روپے
غیر ممالک سے
دس ڈالر
فی پرچہ
پانچ روپے

فہرست

پرنٹر پبلشر خواجہ حسن ثانی نظامی نے [illegible] پریس جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نئی دہلی ۱۳-۱۱ سے شائع کیا

محبوبِ حضرت محبوب الٰہیؒ

امام المشائخ، شمس العلماء، مصور فطرت
حضرت خواجہ حسن نظامیؒ دہلوی
کا سالانہ عرس مبارک

حسبِ معمول انشاء اللہ

۱۷ تا ۱۹ ماہ حج ۱۴۱۳ھ حضرت کی درگاہ شریف بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نئی دہلی منعقد ہوگا۔

خاص پروگرام

(۱) ۱۷، ماہ حج کو صبح بعد نماز فجر حلقہ بسم اللہ شریف تلاوت قرآن مجید اور شجرہ خوانی
(۲) صبح سات بجے جلوس چادر از مزار حضرت محبوب الٰہیؒ بہ مزار حضرت خواجہ صاحبؒ
(۳) بعد نماز عصر خواجہ ہال میں علمی مذاکرہ بعنوان

"حضرت خواجہ حسن نظامیؒ —— حیات، کمالات اور خدمات"

(۴) بعد نماز عشاء فاتحہ اور محفل سماع

---

(۱) ۱۸، ماہ حج کو صبح بعد نماز فجر حلقہ ذکر جہر تلاوت قرآن مجید
(۲) صبح نو بجے فاتحہ اور قوالی
(۳) دن کو گیارہ بجے درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ میں اٹھارویں شریف کا ماہانہ قل
(۴) بعد نماز مغرب محفل سماع

۱۹، ماہ حج کو صبح بعد نماز فجر حلقہ ذکر جہر تعلیم و تلقین

تینوں روز انشاء اللہ تقسیم لنگر و دیگر معمولات عرس ہمیشہ کی طرح ہوں گے۔

تشریف آوری اور ہمراہیوں کی تعداد سے مطلع فرمائیں تاکہ انتظامات میں سہولت ہو۔

تار کا پتہ: خاجگان نئی دہلی
ٹیلی فون: ۳۶۱۹۸۰۷

خط و کتابت کا پتہ
خواجہ حسن ثانی نظامی
درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

خواجہ حسن ثانی نظامی
خواجہ سید مہدی نظامی
خواجہ سید نوید پاشا نظامی
خواجہ سید محمد نظامی

اُردو گلستاں

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا منتخب روزنامچہ

۲۱ جمادی الاوّل ۹ ۱۳۴۹ھ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۰ء

سشنبہ دہلی۔

سیاسی } تجارت بزدل کر دیتی ہے۔ ملازمت سے جرأت جاتی رہتی ہے سیاست ے رحم بنا دیتی ہے۔ بس آج یہی سیاسی تذکرہ ہے۔

ومی } دہلی میں قاضی عبدالرشید صاحب قاتل سوامی شردھانند کا عرس کیا گیا تھا اور ہور میں علم الدین صاحب قاتل راجپال کی یادگار ں اخبار سیاست لاہور نے ایک خاص نمبر شائع یا ہے۔ کانگریسی مسلمان ان دونوں کاموں کے نت خلاف ہیں۔ دہلی میں کانگریسی مسلمانوں نے ایک جلسہ میں بھی اس کے خلاف خیالات ظاہر کیئے۔

قین حیات کیلئے نفرت سے کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ محبت جسم اور روح اور قوائے حیات رقی کرتے ہیں۔ حماقتوں میں مبتلا ہونا اور پھر ان کی ادکرنا دنیا میں تجربہ کاری سکھاتا ہے۔

سید اکبر علی کا حلیہ } میرے ہم جد بھائی ہیں۔ میرے پردادا اور ان کے پردادا یک تھے۔ سانولا رنگ ہے درمیانہ قد ہے عمر چالیس کے قریب ہے۔ بہت خاموش اور درویش صفت سید ہیں۔ درگاہ شریف کے ایک گوشے میں سب سے الگ بیٹھے رہتے ہیں۔ جب میرے خاندان نے ۱۹۰۸ء میں میرے خلاف ایک محضر تیار کیا تھا اس پر چار آدمیوں نے دستخط نہیں کئے تھے۔ ایک صادق شہید نے۔ دوسرے سید واجد علی مرحوم نے۔ تیسرے سید اکبر علی نے۔ چوتھے سید صمصام الدین نے۔ اور میں ہمیشہ اس بات کو یاد رکھتا ہوں جنھوں نے میرے ساتھ برائیاں کیں ان کو بھول جاتا ہوں یا بھلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر جنھوں نے بھلائی کی ہے۔ ان کو بھولنا احسان فراموشی ہے سید اکبر علی کا یہ کام میری اولاد کو بھی یاد رہے گا۔ اور مجھ کو بھی یاد ہے۔ اگرچہ اس محضر نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا لیکن اس کا مقصد مجھ کو درگاہ کی سکونت سے نیست و نابود کر دینا تھا۔

سید صمصام الدین کا حلیہ } یہ بھی میرے خاندان میں ہیں۔ چالیس کے قریب عمر ہے۔ گورا رنگ ہے۔ درویشانہ صفت ہے لمبا کرتہ پہنتے ہیں۔ درگاہ کے جھگڑوں سے الگ رہتے ہیں۔ دکانداری کرتے ہیں۔ بہت سمجھدار اور معاملہ فہم ہیں انھوں نے بھی میرے مخالفانہ محضر پر دستخط نہیں کیئے تھے اور اب بھی میرے ساتھ نہایت سچا اور اصل خلوص رکھتے ہیں۔ میرے سامنے

سب ہی لوگ اچھی باتیں کرتے ہیں۔ مگر میری غیبت میں
اچھے الفاظ سے یاد کرنے والے صرف چند آدمی ہیں اور
ان میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ ان کے بچے میرے اسکول
میں پڑھتے ہیں۔ بڑا لڑکا سید رکن الدین بہت
ہونہار ہے۔

ذاتی } نو بجے کام ختم کردیا۔ پھر خواجہ بانو اور
سید ابن عربی کے ہمراہ حضرت بی بی نور
صاحبہ کی درگاہ میں گیا۔ خواجہ بانو نے بھی مرمت
کے کام دیکھا۔ پھر دہلی گیا۔ خواجہ بانو خان صاحب
ڈاکٹر محمد بشیر صاحب کی اہلیہ سے ملنے گئیں اور
میں سرکاری خزانہ میں گیا۔ راستہ میں تعلیم کے محکمہ
میں بھی ٹھہرا، محمد عسکری صاحب نے اسکول کی گرانٹ
کے کاغذات کی نسبت مفید امداد دی۔ جس سے
میں واقف نہ تھا۔ سرکاری خزانہ سے گرانٹ کا روپیہ
لینا تھا۔ وہاں شہزادہ میرزا احمد شاہ سے ملاقات
ہوئی جو عرصہ دراز سے اس دفتر میں کام کرتے ہیں۔
بہادر شاہ بادشاہ کے ولی عہد میرزا فخرو کے پوتے
ہیں۔ شہزادہ فرخندہ جمال مرحوم کے صاحبزادہ ہیں۔
میرے سامنے پیدا ہوئے تھے۔ میں ان کو گود میں لئے
پھرتا تھا۔ آج دیکھا بڈھے ہوگئے ہیں۔ بیماریوں
نے کمزور کردیا ہے۔ حالانکہ بہت خوبصورت جوان
تھے۔ میں چپ چاپ بیٹھا ہوا دل کے آنسوؤں سے
رو رہا تھا۔ شہنشاہ ہند کا پوتا ایک دفتر میں کام کر رہا تھا۔
میں نے دیکھا میرزا احمد شاہ اپنے کام میں بہت مستعد
اور بہت ملنسار اور بہت محنتی ہیں۔ ایران کے پچاس
گیدی عورت مرد دفتر میں جمع تھے۔ ان کو بھی روپیہ
لینا تھا۔ ان کی دلچسپ فارسی اور ٹانگ ٹوٹی اردو
اور ان کی عورتوں کا غل وشور خوب تماشہ تھا۔
یہاں سے فارغ ہوکر خواجہ بانو کے ساتھ سبزی منڈی
میں گیا۔ جن بوا کی بہن خالہ شمسا عرصہ سے بیمار ہیں۔
ہم دونوں دیر تک ان کے پاس بیٹھے رہے۔ ان کو
انکو کا مرض ہے۔ ایک رخسار بالکل ضائع ہوگیا ہے۔
روٹی تو کیا پانی بھی نہیں پی سکتی۔ ان کو یقین ہے
کہ یہ مرض لاعلاج ہے اور میرا وقت آخر ہے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

تعویذ گنڈے والی عورتیں بھی جمع ہوگئیں۔ دو گھنٹے
ٹھہر کر واحدی صاحب کے ہاں واپس آیا۔ خواجہ بانو
گھر چلی گئیں۔ واحدی صاحب کے ہاں بھی بہت لوگ
جمع تھے۔ صبح سے کھانا نہ کھایا تھا۔ یہاں آکر کچھ پھل
کھائے۔ علی گڑھ کے ایک ایم۔ اے کے طالب علم
مذہبی بحث کرتے رہے۔ عصر کے بعد ماسٹر حفیظ صاحب
کی اہلیہ سے ملنے گیا۔ تو کشفی منزل سے اٹھ کر دہلی
چلی گئی ہیں اور بیمار ہیں۔ پھر امام صاحب جامع مسجد
سے ملا۔ پھر واحدی صاحب کے ہاں آکر کھانا کھایا۔
بعد مغرب غزالی خاں اور ان کی اہلیہ کے ساتھ گھر میں
آیا۔ بچوں کی پٹہ بازی دیکھی۔ نو بجے سویا تین بجے
بیدار ہوا۔ وحید نظامی حیدرآبادی کو آج بھی بخار
ہے پارہ صبح ۱۰۱ درجہ پر تھا مگر سردی رات کو زیادہ
تھی۔

۲۵ر جمادی الاول ۱۳۴۹ھ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۳۰ء

یکشنبہ دہلی

سیاسی } فتح۔ فتح۔ ہر مجسٹی موسم سرما کی فتح۔
گرمی بھاگ رہی ہے۔ برساتی کیڑے
بہت سے مرگئے۔ باقی بھی مرجائیں گے اور رات کی
روشنی میں آزادی کے ساتھ لکھنا پڑھنا آسان ہوجائیگا
اور یہی انسان کا اصلی سوراج ہے اور جنت ہے۔
کھانا بھی جلدی خراب نہ ہوگا۔ تندرستی بھی اچھی
رہے گی۔

قومی } آج کل کے مسلمان عجائب خانہ میں رکھنے کے
قابل ہیں۔ جو کام کرتے ہیں الٹا ہی کرتے ہیں

ہیں جو لوگ بڑے عہدوں پر پہنچ جاتے ہیں وہ چھوٹو
تی کرنا اور ان کی امداد سے گھبرانا اپنی بڑائی سمجھتے ہیں
۔ چھوٹے اپنے بڑوں کی نافرمانی ہنر جانتے ہیں۔ خدا
ں قوم کو ہدایت دے۔ جس نے اسلام کے نام
بٹہ لگا رکھا ہے۔

قین حیات } پردہ پوشی مذہب کی ضروری تعلیم ہے۔ دنیا میں بھی دوسرں
عیب کو چھپانا درحقیقت اپنے عیب کو دوسروں
ں تلاشں سے مخفی رکھنا ہے۔ پردہ پوشی کی زندگی
بشہ کامیاب رہتی ہے۔

حید نظامی کا حلیہ } میرے اسکول کے بورڈر ہیں۔ حیدرآباد کے رہنے
الے ہیں۔ سید ہیں۔ مدراس کے نوائطی خاندان سے
علق ہے۔ لمبا قد ہے عمر سولہ کے قریب ہے۔ کتابی چہرہ
ہے گندمی رنگ ہے۔ تصور کی قوت رکھتے ہیں۔
قاشی کا مادہ طبیعت میں زیادہ ہے۔ ادب و تہذیب
ا ندانی ورثہ ہے۔ پڑھنے میں بھی محنت کرتے ہیں۔
ن کا سارا گھر میرا مرید ہے۔

ذاتی } نو بجے تک کام کیا۔ پھر غزالی خاں کے ہمراہ دہلی گیا۔ بارہ بجے تک واحدی صاحب
کے ہاں رہا۔ پھر واحدی صاحب کے ہمراہ بازار گیا۔
مزارات کے لئے ٹائیلس خریدے۔ اس کے بعد
دفتر ریاست میں گیا۔ کچھ انگریزی کام چھپوایا ہے۔
اس کو دیکھ درگاہ حضرت بی بی نور صاحبہؒ میں گیا۔
مزارات کی مرمت دیکھی۔ پھر دہلی گیا اور مغرب سے
پہلے گھر میں واپس آگیا۔ وحید کا بخار کم ہے۔
نواب صاحب رامپور کا تار آیا ہے۔ رامپور میں بلایا
ہے۔

شمس الدین نظامی بیانہ بھرتپور سے آئے
ہیں۔ زید منزل میں ٹھہرے ہیں۔ نو بجے سویا۔ تین بجے
بیدار ہوا۔ پانچ بجے بورڈنگ ہاؤس میں آیا۔

زمین آسمان پر آخری چاند چمک رہا تھا۔ پارہ ۴۳ درجہ
پر تھا۔ اگرچہ سردی بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ بجلی کی
روشنی چار بجکر بیس منٹ پر صبح بند ہوجاتی ہے تاکہ
نمازی لوگوں کو آرام نہ پہنچ جائے۔

۲۶ جمادی الاول ۱۳۴۹ھ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۰ء

دوشنبہ دہلی اور اٹاوہ

سیاسی } نئی تہذیب والوں کو ہندوستان میں نئی روشنی والے اور عرب متنورین
کہتے ہیں۔ مگر جس تہذیب سے دل تاریک ہو اور
اطمینان غائب ہوجائے وہ نئی روشنی نہیں بلکہ
نئی تاریکی ہے۔

قومی } اٹاوہ میں صوبہ یوپی کی تعلیمی کانفرنس قرار پائی ہے۔ آج۔ کل۔ پرسوں۔ اترسوں
جلسے ہوں گے۔ میں نے بھی شرکت کا وعدہ کر لیا
ہے۔ کیونکہ خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب
سے ان کے بڑھاپے میں ملنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

تلقین حیات } ریل پر آدھ گھنٹہ پہلے سے جانا ہمیشہ انسان کو مطمئن رکھتا
ہے۔ یہ آدھ گھنٹہ فضول نہیں جاتا۔

بوا کر بگا کا حلیہ } میرے لڑکے زید کی انا ہیں۔ سالہا سال سے میرے مکان پر
رہتی ہیں۔ نومسلمہ ہیں۔ چالیس سے زیادہ عمر ہے۔
اعلیٰ ہندو خاندان سے ہیں۔ بہت مستعد اور
خدمت گزار اور خیر خواہ اور وفادار عورت ہیں۔

ذاتی } آٹھ بجے تک بورڈنگ ہاؤس میں تحریری کام کرتا رہا۔ پھر کھانا اور بستر ساتھ لیکر
اٹاوہ کے سفر کے لئے گھر سے روانہ ہوا۔ عزیز حسن علی
اور سید ابن عربی اور باقر علی صاحب اور سیر
ساتھ گئے۔ ریل پر واحدی صاحب اور غزالی خاں
اور مفتی شوکت صاحب فہمی اور سردار حلوان سنگھ

صاحب اور محمد انوار صاحب ہاشمی اور عبدالستار صاحب پہنچانے آئے۔ لالہ چرنجیت لال صاحب ایڈوکیٹ وزیر آباد بھی آج صبح پنجاب سے ملنے آئے ہیں۔ وہ بھی ریل پر تھے۔

ساڑھے نو بجے ٹرین روانہ ہوئی۔ لکشمی بیمہ کمپنی کے سکریٹری صاحب رفیق سفر ہیں۔ میں نے کھانا کھایا۔ پھر کچھ دیر آرام کیا۔ پھر ٹونڈلہ تک مضامین لکھے۔ اور آج کا سب کام ختم کرکے ٹونڈلہ سے مضامین دہلی بھیجدیئے۔ علی گڑھ اسٹیشن پر بہت ہجوم تھا۔ آنربیل نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب ہوم ممبر گورنمنٹ یوپی اٹاوہ کانفرنس کی صدارت کے لئے جارہے ہیں۔ ان کے لئے سب لوگ جمع ہوئے تھے پلیٹ فارم بھرا ہوا تھا۔ بینڈ باجہ بھی تھا۔ نواب صدر یار جنگ بہادر بھی اسی ٹرین میں سوار ہوئے آگرہ کے مشہور سرکاری وکیل اختر عالم صاحب میرے درجہ میں ہیں۔ ان سے خوب باتیں ہوئیں۔

تین بجے کے بعد ٹرین اٹاوہ پہنچی۔ یہاں بھی بہت بڑا ہجوم تھا اور بینڈ باجہ بھی تھا۔ نواب صاحب کو اسکول کی طرف سے ایڈریس دیا گیا۔ پھر نواب صاحب کا جلوس میونسپل کمیٹی میں گیا وہاں بھی ان کو ایڈریس دیا گیا۔ اٹاوہ کے کلکٹر صاحب ایک ہندو ہیں وہ بھی اسٹیشن پر موجود تھے۔ اور بھی سب دیسی حکام استقبال کے لئے آئے تھے۔ میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب سی آئی ای کے بنگلہ پر گیا۔ حشمت علی صاحب سابق دیوان ریاست چرکھاری آج کل اٹاوہ میں ڈپٹی کلکٹر ہیں انھوں نے مجھکو اپنے مکان پر لیجانے کا اصرار کیا۔ مگر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب راضی نہیں ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کا بنگلہ بہت بڑا ہے پھر بھی انھوں نے خیمے لگائے ہیں۔ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں اور نواب صدر یار جنگ اور مولانا محمد یعقوب صاحب سابق صدر اسمبلی اور میرے لئے الگ الگ خیمے ہیں۔

جب نواب صاحب کا جلوس ڈاکٹر صاحب کے بنگلہ پر پہنچا تو گارڈن پارٹی کی تقریب ہوئی جو ڈاکٹر صاحب کی طرف سے تھی اس میں بہت سے ہندو مسلمان عمائد شریک تھے۔ کلکٹر صاحب اور دوسرے حکام بھی تھے نواب سر محمد مزمل اللہ خاں کی بذلہ سنجیاں ہو رہی تھیں۔ وہ اگر اور بہت سی صفات اپنے اندر نہ رکھتے ہوتے تو ہندوستان میں ان کی معلومات اور ان کے حافظہ اور ان کی لطیفہ آمیز بذلہ سنجی سب سے بہتر مانی جاتی۔

مین پوری کے کلکٹر صاحب بھی آئے ہیں اور اسی بنگلہ میں ٹھہرے ہیں۔ رام پور کے پٹھان ہیں۔ بہت سنجیدہ اور شائستہ اور تجربہ کار افسر معلوم ہوتے ہیں۔ مقصود علی خاں نام ہے۔ خان بہادر بشیر الدین احمد صاحب بانی اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ سے آج بہت دیر باتیں ہوئیں۔ انھوں نے قرآن مجید کے ۲۱ اردو ترجمے جمع کئے ہیں۔ وہ قرآن مجید کے متن کو ہندی حروف میں چھپوانے کے بہت بڑے حامی ہیں اور آج اسی کی نسبت وہ مجھ سے دیر تک گفتگو کرتے رہے بعد مغرب جلسہ گاہ میں طلبہ کا مباحثہ سنا۔

عشاء کے بعد نواب صاحب اور سب مہمان اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں گئے جو بنگلہ سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں سب مہمانوں نے فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کاکوری کے احتشام علی صاحب بھی آئے ہیں۔ اور بھی بہت سے نامور مسلمانوں سے ملاقاتیں ہوئیں جو دور دور سے کانفرنس کے لئے آئے ہیں۔ جونپور سے بھی ایک زمیندار صاحب آئے ہیں۔ جو میرے خیمہ میں ٹھہرے ہیں۔

کھانا بہت اچھا تھا مگر انتظام بہت برا تھا۔
ے گلاس ہر شخص کے سامنے تھے۔ پھر بھی میلے
۔ معلوم ہوتا ہے انتظامی قابلیت یہاں کے اراکین
لم ہے اور یا جن لوگوں کو منتظم بنایا گیا تھا وہ
فرض سے ناواقف ہیں۔ میں دیر تک نہایت
نظر سے اس ابتری کو دیکھتا رہا کہ کھانا بھی افراط
ہے۔ کئی قسمیں ہیں اور بہت عمدہ پکا ہے۔ لیکن نظم
خرابی سے ہر شخص بے لطف ہے۔ البتہ مساوات کی
ن ہے کہ سب چھوٹے بڑے ایک دسترخوان پر
ہیں۔ میں سال میں دو دفعہ ان سے بہت زیادہ
بیوں کو عرس کے زمانہ میں کئی رات دن کھانا کھلاتا
ں اور صرف پانچ چھ آدمی منتظم ہوتے ہیں اور
ں خواجہ بانو انتظام کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھتی
اور کوئی خرابی نظم میں نہیں ہوتی۔ میرے دل میں
تمام مسلمانوں کے دل میں خان بہادر بشیر الدین
حب کی بہت بڑی عزت ہے کہ انھوں نے تمام
رگی مسلمانوں کی تعلیمی خدمت میں بسر کر دی
ہ اور ان کے ساتھی انتظامی معاملات میں کامل نہیں
ورنہ ان کے اسکول کے لڑکے بہت اچھا انتظام
سکتے تھے۔ دسترخوان پر بڑے بڑے نواب
ر کلکٹر اور ڈپٹی کلکٹر اور بیرسٹر بھی موجود تھے۔
پر ہماری مشرقی تہذیب کا بہت برا اثر ہوا
ر انھوں نے نئی تہذیب کو اپنے دلوں میں زور
ر سے مرحبا کہا ہوگا۔ مجھ کو تو بس اس کی تکلیف
یادہ تھی کہ تہذیب قدیم شرمار ہی ہے اور تہذیب
ید یاد کی جا رہی ہے۔ دس بجے بنگلہ پر واپس گیا۔
لی سے ایک تعلیم یافتہ دوست بھی میرے ساتھ
ے ہیں۔ اور میرے خیمہ میں ٹھہرے ہیں۔ گیارہ بجے
و یا ساڑھے پانچ بجے بیدار ہوا۔

۲ رجمادی الاول ۹ ۴ ۱۳ ھ ۲۱ راکتوبر ۱۹۳۰ء

سہ شنبہ۔ اٹاوہ

سیاسی } دہلی میں پنڈت جواہر لال نہرو کی دوبارہ گرفتاری کی خبر سن لی تھی۔ آج یہاں دیر تک اس کا چرچا سُنا۔ ایک صاحب نے کہا مراد آباد میں تحریک ایسی ختم ہو گئی جیسے دودھ کا اُبال ٹھنڈے پانی کے ڈالنے سے دب جاتا ہے۔

قومی } نواب صدر یار جنگ بہادر تین میل پیدل چلتے ہیں۔ آج سفر میں بھی انھوں نے یہ عادت پوری کی۔ ہر چھوٹے بڑے کو یہ عادت اختیار کرنی چاہیئے۔

تلقین حیات } آج آگرہ کے ایک صاحب کہتے تھے وہاں دو لیڈر آئے اور ان کا بہت بڑا جلوس نکالا گیا۔ انھوں نے جلوس کے بعد میزبانوں سے کہا کہ ہم کو تو روپیہ درکار ہے۔ میزبان کہتے تھے کہ روپیہ کا نام سننے ہی ان کی عزت سب کے دلوں سے جاتی رہی۔ میں نے یہ سن کر کہا۔ بن مانگے موتی ملیں اور مانگے ملے نہ بھیک۔ استغنا زندگی کی کامیابیوں کے لئے اور عزت نفس کے لئے بہت ہی ضروری اور مفید ہے۔

سفر کا حلیہ } ہر شخص اگر سفر کے قابل ہو تو سفر کرتا ہے۔ ادنیٰ ہو یا اعلےٰ سفر میں جانے کے بعد اس کے حلیہ اور اس کی سیرت اور اس کے امتیاز میں فرق پڑ جاتا ہے۔ سفر بصورت سقر بھی مشہور ہے اور سفر وسیلۂ ظفر بھی کہلاتا ہے۔ بعض مسافر سفر میں اعلےٰ ہو جاتے ہیں اور گھر پر معمولی آدمی سمجھے جاتے ہیں اور یہ بات میں خود ذاتی تجربے سے کہتا ہوں۔ لیکن سب ہی کامیاب اور ناکام مسافر سفر میں وہ راحت حاصل نہیں کر سکتے جو اپنے گھر میں ادنےٰ سے ادنیٰ آدمی کو میسر ہوتی ہے۔ جب پرنس آف ویلز جب ہندوستان میں آئے تو دہلی کیمپ میں میرے ایک دوست منتظم تھے۔ ان سے پرنس نے ایک دن کہا۔ میں اس سفر کو غلامی سے بدتر

سمجھتا ہوں مجھے پروگرام کی پابندیوں نے تھکا دیا ہے اور مجھے ایک منٹ بھی اپنی مرضی کی آزادی کا میسر نہیں آتا۔

پس ہر مسافر اپنے سفر کا حلیہ جب چاہے یہ عبارت پڑھنے کے بعد دیکھ سکتا ہے کہ وہ بگڑ گیا ہے۔ بدل گیا ہے اور سفر نے اپنی جہنمی شکل مسافر کے دل اور دماغ اور راحت اور اطمینان پر طاری کر دی ہے۔

ذاتی

صبح چہل قدمی اور ناشتہ سے فارغ ہو کر خان بہادر بشیر الدین صاحب کے پاس گیا۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھے ایک میلا سا حقہ پی رہے تھے۔ وہ بہت سادی طبیعت کے آدمی ہیں۔ انھوں نے جھونپڑیوں میں اسکول شروع کیا تھا اور آج لاکھوں روپے کی تین چار عمارتیں ہر شخص کے سامنے کھڑی ہیں اور ایک معمولی مسلمان کی ہمتوں اور کوششوں اور خلوص کا نمونہ دکھا رہی ہیں۔ خان بہادر صاحب نے مجھ کو قرآن مجید کے ۲۱ اردو ترجمے دکھائے۔ جو انھوں نے نہایت محنت سے جمع کئے ہیں۔ پھر خود ساتھ ہو کر اسکول کی سب عمارتیں دکھائیں۔ وہ میری انگلی پکڑے ہوئے بچوں کی طرح گھسیٹے جاتے تھے ان کا چھوٹا سا قد دبلا بدن لمبی سفید ڈاڑھی آنکھوں پر عینک اور میرا اتنا لمبا قد مگر میں کشاں کشاں ان کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ وہ بہت تیز اور پارہ کی طرح بے قرار ہیں۔ میں نے یہ سب کچھ دکھا دیا مگر میں نوبیت الخلا اور غسل خانے دیکھنے چاہتا ہوں۔ انھوں نے وہ بھی دکھائے۔ اور مجھے خوشی ہوئی کہ وہ روشن اور ہوادار اور صاف تھے۔ انھوں نے قلمی کتابیں اور پرانے فرمان اور کاغذات بھی جمع کئے ہیں اور ان کا ایک بہت عمدہ ذخیرہ موجود ہے۔ مگر ایسے تاریک کمرہ میں ان کو رکھا ہے۔ جیسے ظالم حاکم کا دل ہوتا ہے۔ مگر وہ ان نایاب چیزوں کو ایک محفوظ اور اچھے کمرہ میں منتقل کرنے والے ہیں۔ ان کے والد ہمیشہ میرے پاس ٹھہرا کرتے تھے۔ یہ ذکر پچیس تیس برس کا ہے وہ روزنامچہ لکھتے تھے اور میں نے روزنامچہ لکھنا انہی سے سیکھا ہے۔ ان کے والد صابر یہ خاندان کے بہت اچھے درویش تھے مگر یہ پرانے وہابی ہیں اور اس کے بعد عرصہ تک نیچری بھی رہے اور اب بقول نواب سر محمد مزمل اللہ خاں کے وہ نہ وہابی ہیں نہ نیچری ہیں بلکہ کچھ بھی نہیں ہیں یعنی انھوں نے اسکول میں اپنی ہر چیز کو فنا کر دیا ہے۔ کانوں سے کم سنتے ہیں۔ اور اب آنکھوں سے بھی کم دیکھتے ہیں۔ لکھنا پڑھنا چھوٹ گیا ہے۔ پچھتر برس کی عمر ہے میری ان کی ملاقات ان کے والد کی ملاقات سے بھی پہلی ہے۔ مگر مجھے ان کے والد کے انتقال تک یہ معلوم نہ ہوا کہ یہ میرے صوفی دوست کے بیٹے ہیں اور بدقسمتی سے وہابی اور نیچری ہیں۔ مگر میں ایسے عملی وہابی کو اپنے سے اچھا سمجھتا ہوں۔

نو بجے جلسہ گاہ میں آیا۔ بہت لوگ جمع تھے۔ دس بجے نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب تشریف لائے۔ پہلے استقبالیہ کمیٹی کے صدر نے خطبہ سنایا۔ جس سے معلوم ہوا کہ اٹاوہ بڑی تاریخی جگہ ہے۔ یہاں پرتھی راج کا ایک قلعہ بھی ہے اور شہاب الدین غوری کی ایک بڑی لڑائی پرتھی راج سے یہاں ہوئی تھی مگر یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ شہاب الدین کے کسی فوجی سردار کی لڑائی ہوئی ہوگی۔ شہاب الدین کی پرتھی راج سے صرف دو لڑائیاں تھانیسر کے میدان میں ہوئی ہیں۔ جناب صدر نے زبانی خطبہ سنایا۔ لکھا ہوا اور چھپا ہوا نہیں تھا۔ ان کی تقریر دو گھنٹے رہی حاضرین چاہتے تھے کہ نواب صاحب شام تک بولتے رہیں کیونکہ ان کی تقریر نہایت دلچسپ اور بہت مدلل اور لطایف سے لبریز تھی۔ تعلیمی تجربوں کا ایک سمندر اس تقریر میں بھرا ہوا تھا۔ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کو کالج بنانے کی تجویز کے متعلق نواب صاحب نے نہایت عمدہ تجربہ کی باتیں کہیں۔ اور آخر میں یہ کہا کہ

ہ لاکھ روپے کی ضرورت کالج بنانے کے لئے پیش کی گئی
ہ اگر آپ لوگ پچھتر ہزار روپے دوسری جگہ سے جمع کرلیں
، پچیس ہزار میں دیدوں گا۔
نواب صاحب دیسی کپڑے کے لباس میں تھے
، بہت کم قیمت اور سادہ تھا۔ ان کے اندر نہایت
لطیف شگفتگی پائی جاتی ہے۔ وہ ہر بڑی سے بڑی
خصیت کو اپنی عالمانہ اور دلیرانہ گفتگو سے مرعوب
غلوب کرلیتے ہیں۔ ان کی زبانی تقریر لکھے ہوئے
ڈریس سے بہت زیادہ موثر اور مفید ہوتی ہے
ج حاضرین جلسہ اس قدر متاثر ہوئے کہ میں نے ایسا
ثر پہلے کبھی کسی جلسہ میں نہیں دیکھا تھا۔
بارہ بجے جلسہ سے فارغ ہو کر بنگلہ پر آیا۔ ڈاکٹر
ا حب نے سب مہمانوں کو لنچ کی دعوت دی تھی
ھانا انگریزی اور دیسی دونوں قسم کا تھا۔ کھانے
ے بعد خان بہادر بشیر الدین اور ڈاکٹر ضیاء الدین
ا جبان نے نواب صاحب کا جام صحت تجویز کرتے
ہوئے نہایت لطیف تقریریں کیں۔ البشیر صاحب
ے کہا میں غیر مقلد ہوں اور انگریزوں کے اس دستور
ی تقلید بھی نہیں کرتا۔ البتہ اس کے مقصد سے مجھے
نفاق ہے اس لئے میں نواب صاحب کی سلامتی کی
عا کرتا ہوں اور سب سے آمین چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر
ا حب نے کہا۔ آج نواب صاحب نے اپنی تقریر
یں فرمایا تھا کہ علی گڑھ میں میری کوٹھی افیون والی
وٹھی کہلاتی تھی اور اٹاوہ کی کوٹھی بھی جس میں آجکل
ہتا ہوں اور جہاں ہم سب جمع ہیں افیون والی
کوٹھی کہلاتی ہے۔ علی گڑھ میں میں نے جو خدمت
یونیورسٹی اور کالج کی انجام دی۔ نواب صاحب
سمجھتے ہیں کہ اٹاوہ میں بھی افیون کی کوٹھی میں رہنے
سے میں ویسا ہی کام کر سکوں گا۔ میں اس کی نسبت
عرض کرتا ہوں کہ علی گڑھ کی افیون والی کوٹھی اب
شاہجہاد مسز مل سے ہے اور اٹاوہ کی افیون والی

کوٹھی بھی خدا نے چاہا بہت جلد "مزمل کالج" بن
جائے گی۔
ان تقریروں کے بعد ڈاکٹر صاحب اور
البشیر صاحب نے مجھ سے بھی تقریر کی فرمائش کی۔
میں نے کہا سنتے تھے پٹھانوں میں کوئی ولی نہیں ہوتا
مگر نواب صاحب کی اعلیٰ خدمات اور اعلیٰ صفات کو
دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ولی آج کل پٹھانوں ہی
میں ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ پانچ لاکھ آدمیوں
کی ہسٹری جانتا ہوں مگر نواب صاحب کے حافظہ
اور معلومات کو دیکھ کر میں بھی حیران ہو گیا۔ میں
صرف اپنے ملنے والوں کی صورت اور بہت تھوڑی
حالت سے واقف ہوتا ہوں مگر نواب صاحب
ہر شخص کی گذشتہ حالتوں کی تفصیل بھی بتا دیتے ہیں۔
اگر انسائیکلوپیڈیا لکھنے والوں کو اس عجیب شخصیت
کا علم ہو جائے تو وہ آیندہ انسائیکلوپیڈیا چھاپنی بند
کر دیں گے اور دنیا میں اطلاعیں دیدیں گے کہ نواب
سر محمد مزمل اللہ خاں مجسم انسائیکلوپیڈیا ہیں۔
خان بہادر بشیر الدین صاحب کے والد نے
مجھے روزنامچہ لکھنا سکھایا تھا اور آج ان کی غیر مقلدی
نے مجھے یہ سکھایا کہ جام صحت سلامتی کی ایک دعا ہے
اور ہم ہندوستانیوں کو اگر یہ طریقہ اختیار کرنا ہے
تو صرف دعا کر لیا کریں۔
شام کو کلکٹر صاحب نے اپنے بنگلہ پر گارڈن
پارٹی دی تھی اور سب مہمانوں کو بلایا تھا۔ وہاں
اور بھی بہت سے یوروپین اور ہندو مسلمان
جمع تھے۔ مغرب کے وقت واپسی ہوئی اور بعد مغرب
پھر جلسہ گاہ میں گیا۔ میری صدارت میں جلسہ ہوا
اور ایک گھنٹہ تک نواب صدر یار جنگ بہادر نے
تعلیم اور اتحاد پر نہایت ہی عمدہ اور موثر اور مدلل تقریر
کی۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ تک میں نے اس تقریر پر تبصرہ
کیا۔ چونکہ آج کے جلسہ میں ہندو بھی بہت سے آئے تھے

اس واسطے میں نے دیوالی کی تاریخ بھی بیان کی اور ہندو بزرگوں کے اقوال بھی علم اور اتحاد کی تائید میں پیش کئے۔ جلسہ میں آج دن سے بھی زیادہ مجمع تھا۔ نو بجے جلسہ ختم ہوا اور بورڈنگ ہاؤس میں جاکر سب کے ساتھ کھانا کھایا۔ آج کل کی نسبت انتظام درست تھا۔ میرٹھ سے خان بہادر بھیا شیخ وحید الدین صاحب بھی آئے ہیں۔ اور نواب صدر یار جنگ بہادر کے صاحبزادے خان بہادر مولوی عبید الرحمان خاں صاحب بھی آئے ہیں اور بھی بہت سے ممتاز مہمان آج شام کو پہنچے ہیں۔ کھانے کے بعد اسکول کے پرانے طالب علموں کا ایک جلسہ ہوا۔ کل رات کو ان طلبا کا ایک مباحثہ بھی جلسہ گاہ میں ہوا تھا مگر سب لڑکوں نے یاد کی ہوئی تقریریں کیں اس سے مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ کیونکہ رٹ لینے سے اور دوسروں کی لکھی ہوئی تقریریں بیان کرنے سے نوجوانوں میں ذاتی لیاقت پیدا نہیں ہوتی۔ مگر آج کے جلسہ میں پرانے طلباء کی تقریریں نہایت عمدہ ہوئیں اور کالج کے لئے چندہ بھی ہوا۔ گیارہ بجے یہاں سے رخصت ہوکر بنگلہ پر آیا اور اسباب لے کر اسٹیشن پر پہنچا ساڑھے بارہ بجے ٹرین اٹاوہ سے دہلی کی طرف روانہ ہوئی۔ جگہ اچھی مل گئی۔ میں آرام سے سویا۔

میری قیام گاہ میں جواد بخش صاحب قادری بدایونی بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ جو علی گڑھ کے مشہور بیرسٹر قادری صاحب کے صاحبزادہ ہیں۔ میں بدایوں شریف میں ان کے مکان پر ٹھہر چکا ہوں نہایت ہونہار اور ذہین اور شائستہ نوجوان ہیں۔ آج کانپور سے مولانا حسرت موہانی صاحب بھی آئے ہیں نیز میری حبیب اللہ صاحب جنت سے بھی خوب باتیں ہوئیں اور نواب محسن الملک بہادر کے ایک عزیز بھی ملے جن کا نام عزیز الحسن ہے۔ پرانے زمانہ کے بزرگ ہیں ان کی صورت دیکھ کر گزشتہ زمانہ کی ہمارے ہاتھوں سے چھنی ہوئی تہذیب سامنے آگئی۔ میرزا نعیم اللہ بیگ صاحب دہلوی وکیل ہمیرپور بھی ملے۔ واحدی صاحب کے پرانے دوستوں میں ہیں۔ کہتے تھے آپ کی تقریر سن کر ہندو سامعین نے کہا ہم تو بڑے دھوکہ میں تھے یہ شخص تو بڑا محب وطن ہے اور بھی بہت لوگوں نے میرے تبصرہ کی تعریف کی۔ مگر میں نے اپنے دل سے تعریف نہیں سنی کیونکہ وہ تو نواب صدر یار جنگ بہادر کی تقریر کی تفسیر تھی۔ صبح ساڑھے چھ بجے دہلی پہنچ گیا۔

۲۸ جمادی الاول ۱۳۴۹ھ ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۰ء

چہار شنبہ دہلی

سیاسی } ظہیر الدین احسن انصاری نظامی نے صوبہ بہار سے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے لئے کانگریس میں شریک ہونا بڑا ہے۔ ان کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو قوم کے گذشتہ طرز عمل نے ان کو کانگریس سے مایوس کر دیا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مسلمان کانگریس سے علیحدہ ہوکر اپنے طور پر کیا کرتے ہیں۔ کیا کانگریس کے ساتھ وہ سیاست کو بھی چھوڑ بیٹھیں گے۔ ان کا جمود کانگریس کی شرکت سے زیادہ خطرناک ہے۔ دائرہ قانون کے اندر رہ کر انہیں کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے۔ بدقسمتی سے دنیا میں جو تحریک اٹھتی ہے وہ مسلمانوں میں ایک نیا تفرقہ پیدا کر دیتی ہے۔ موجودہ تحریک سول نافرمانی نے بھی اگر ہندوؤں کو متحد کر دیا ہے تو مسلمانوں کا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔ نہ سب مسلمان کانگریس کے شریک ہیں نہ سب مسلمان کانگریس سے الگ۔ ایک عجیب افراتفری پڑی ہوئی ہے۔ کاش مسلمان کوئی ایک پالیسی بنا سکتے۔ لیکن ہاں انھوں نے ایک پالیسی بنا رکھی ہے کہ کبھی آپس میں متحد نہ ہوں گے۔ مسلمانوں

معلوم ہونا چاہیے کہ اب ہندوؤں کا ہر ہر فرد خواہ اس کا ظاہری عمل کیسا ہی ہو ایک اور صرف ایک رنگ میں سرشار ہے۔

قومی } ایک تعلیم یافتہ مسلمان جناب سید تصدق حسین صاحب بی اے نے لکھا ہے کہ ان کے قصبہ میں مسلمانوں کی معقول آبادی ہے اور وہ سب تجارت پیشہ ہیں مگر یہاں کوئی مسلمان ڈاکٹر نہیں ہے اگر کوئی تجربہ کار مسلمان ڈاکٹر یہاں مطب جاری کرے تو اس کو بہت فائدہ ہو میں بھی سید صاحب کی تائید کرتا ہوں مسلمان ڈاکٹر سے مجھ سے خط وکتابت کریں۔ میں ان کو اس مقام کا پتہ بتا دوں گا

تلقین حیات } زندگی کا راز وہ سمجھتا ہے جو اپنی جسمانی اور ذاتی ضرورتوں کے پورا کرنے کی سمجھ رکھتا ہے۔ جو لوگ اپنی ضرورت سے بے خبر اور غافل ہو کر دوسروں کی ضرورتوں کا خیال کرتے ہیں وہ یا تو ریاکار ہیں اور یا راز زندگی سے بے خبر ہیں۔

واحدی صاحب کا حلیہ } سید محمد ارتضےٰ نام ہے۔ واحدی میرا دیا ہوا لقب ہے۔ ان کا خاندان شاہجہاں بادشاہ کے زمانہ سے دہلی میں آباد ہے۔ امام صاحب جامع مسجد کا خاندان اور واحدی صاحب کا خاندان سیادت کے اعتبار سے بہت مستند سمجھا جاتا ہے کیونکہ شاہ جہاں نے خاص تحقیقات کر کے ان خاندانوں کو عرب سے بلایا تھا تاکہ نماز میں بادشاہ کے آگے سید کھڑا ہو اور جب بادشاہ ہاتھی پر بیٹھیں تو فیلبان کی پشت بادشاہ کی طرف نہ ہو بلکہ سید کی پشت ہو۔ واحدی صاحب کے جد اعلیٰ فیلبان اور بادشاہ کے بیچ میں بادشاہ کی طرف پشت کر کے بیٹھتے تھے۔ واحدی صاحب کی عمر اکتالیس سال ہے۔ درمیانہ قد ہے۔ گندمی رنگ ہے دوہرا اور مضبوط جسم ہے۔ شاندار چہرہ ہے۔ [illegible] اور وقار اور [illegible] کے آثار ہیں۔ ان کی رفتار و گفتار میں ایک وقار پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے اصول اور وقت کے بہت پابند ہیں طبیعت میں مذہبیت زیادہ ہے۔ بچپن سے عقیل و فہیم ہیں اب تجربے نے عقل و دانش میں اضافہ کر دیا ہے۔ روزانہ صبح سات میل پیدل پھرتے ہیں اور آج کا کام آج ہی پورا کر لیتے ہیں ۱۹۰۸ء سے میرا ان کا تعلق شروع ہوا اور میں نے ان کی شرکت میں سب سے پہلا رسالہ نظام المشائخ جاری کیا جو اب بھی جاری ہے۔ میری ان کی زندگی اس طرح ساتھ رہی ہے جس طرح جسم کے ساتھ دو سانس ہوتے ہیں۔ میں ان کے ہاں مدتوں رہا ہوں اور اب بھی روزانہ ان کے پاس جاتا ہوں اور میری اد.ی کامیابی کے وہ اور بھیا احسان دو مستحکم ستون ہیں۔ پہلے واحدی صاحب پر غصہ غالب رہتا تھا اور اب وہ غصہ پر غالب رہتے ہیں۔ یہ غلبہ تجربہ کے ہتھیاروں سے حاصل ہوا ہے۔

ذاتی } صبح ساڑھے چھ بجے اٹاوہ سے دہلی پہنچا۔ اسٹیشن پر موٹر موجود تھی۔ پہلے درگاہ حضرت بی بی نور صاحبہؒ میں گیا۔ مزارات کی مرمت دیکھی۔ پھر گھر میں آیا۔ غسل کر کے۔ بورڈنگ ہاؤس میں گیا۔ ڈاک دیکھی۔ دو دن کا روزنامچہ لکھوایا۔ بارہ بجے کھانا کھایا۔ پھر عصر کے وقت تک کام کرتا رہا عصر کے بعد زنانہ میں گیا اور مغرب کے وقت تک وہاں رہا۔ بعد مغرب کھانا کھایا۔ غزالی خاں دہلی سے آگئے ان سے باتیں کیں۔ مستری عشق سے بھی باتیں ہوئیں وہ روز آتے ہیں۔ آج انھوں نے درویشانہ عمامہ باندھا تھا مجھے بہت اچھا معلوم ہوا۔ طبیعت پر سفر کی تکان ہے۔ ساڑھے نو بجے سویا۔ سوا [illegible] بیدار ہوا۔ مستری عشق نے وضو کا اہتمام کیا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ بادل گرج رہے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی

تیز ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ٹھنڈا پانی تیر و نشتر معلوم ہوا۔ چند روز پہلے برف کی ضرورت پڑتی تھی۔ آج میں نے ادبی دنیا لاہور کے لئے "پچکی پر تشدید" ایک مضمون لکھا۔ عنوان بھی نیا ہے اور مضمون بھی پُرا ثر ہے۔ یہ چیزیں میں نہیں لکھتا کبھی کبھی خود بخود قلم پر آجاتی ہیں۔ پارہ ۳، ۷ درجہ پر تھا۔

۲۹ جمادی الاول ۱۳۴۹ھ ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۰ء

پنجشنبہ دہلی

سیاسی } غلام محمد نامی ایک لڑکے کو پھانسی کا حکم ہوگیا ہے۔ آج دہلی کے چند بڑے بڑے مسلمان چیف کمشنر صاحب دہلی کے پاس یہ کہنے گئے تھے کہ غلام محمد کی عمر سترہ سال کی ہے اس پر رحم کیا جائے۔ خان بہادر شیخ عزیز الدین۔ خان بہادر حافظ محمد یوسف۔ خاں صاحب حکیم سراج الدین۔ نواب فرید الدین۔ شیخ شجاع الرحمان۔ حکیم اجمل علی۔ مفتی شوکت فہمی۔ محمد انوار ہاشمی اور حسن نظامی نو آدمی گئے تھے۔

چیف کمشنر صاحب نے ڈیپوٹیشن کا وقت مقرر نہ ہونے کے سبب صرف مجھے اندر بلا کر بات کی اور کہا کہ اس کا ثبوت پیش کیا جائے کہ غلام محمد کی عمر ۱۷ سال کی ہے۔ راولپنڈی سے سند ولادت منگائی گئی ہے۔

قومی } آج حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی زلیخاؒ کا سالانہ عرس ہے۔ جوق جوق زائرین جا رہے ہیں۔ حضرت خواجہ الہ بخش صاحبؒ تونسوی کا بھی سالانہ عرس میاں عبدالصمد صاحب نے کیا ہے۔

تلقین حیات } جو اپنی زندگی میں اپنے مرنے والے بزرگوں کو یاد رکھتا ہے اس کی اولاد بھی اس کو مرنے کے بعد اپنی زندگی میں یاد رکھتی ہے۔

واحدی صاحب کا بڑا لڑکا ہے۔

احمد مجتبیٰ کا حلیہ } ماشاءاللہ مضبوط جسم ہے بڑا سر ہے۔ مزاج میں ظرافت کا مادہ ابھی سے ہے۔ عام بچوں سے زیادہ ذہانت اور ہونہاری کی باتیں کرتا ہے۔ پیدا ہوا تو میرے بڑے لڑکے حسین کی طرح بہت بدصورت معلوم ہوتا تھا جیسے کبوتر کے بچے بدصورت ہوتے ہیں مگر اب وہ بدصورتی نہ حسین میں ہے نہ مجتبیٰ میں۔

ذاتی } آٹھ بجے تک کام کر کے دہلی گیا۔ امام صاحب جامع مسجد سے ملا جو اسلامی ڈیپوٹیشن میں جانے والے تھے مگر وہ آج سخت علیل تھے۔ میں نواب فرید الدین صاحب کے ہمراہ چیف کمشنر صاحب کے ہاں گیا اور بھی عمائد جمع تھے۔ صاحب سے مل کر گیارہ بجے واپس آیا۔

کوچہ پنڈت میں میاں عبدالصمد صاحب کے مکان پر حضرت خواجہ الہ بخش صاحب تونسوی کا سالانہ عرس تھا۔ ایک گھنٹہ مجلس سماع میں شریک رہا۔ پھر گھر میں واپس آیا اور چار بجے تک تحریری کام کرتا رہا۔ پھر بچوں کے ساتھ حضرت بی بی نور صاحبہؒ کے عرس میں گیا۔ راستہ میں بارش آگئی۔ تھوڑی دیر رہ کر واپس چلا آیا۔ تمام راستہ میں بارش ہوتی رہی۔

آج چیف کمشنر صاحب کہتے تھے۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ اتنا زیادہ کیونکر لکھ سکتے ہیں۔ سرجان تھامس اردو زبان کے بڑے فاضل ہیں۔ میری سب کتابیں ان کے پاس ہیں۔ وہ اردو زبان کی خوبی اور خامی پر رائے بھی دے سکتے ہیں۔

رات بھر ابر گھرا رہا۔ میں نے اسبغول پانی سے پھانکا تھا اس لئے نیند زیادہ آئی۔ معلوم ہوتا ہے جب رطوبت معدہ میں بڑھ جاتی ہے تو نیند زیادہ آتی ہے اور اسبغول رطوبت پیدا کرتا ہے۔

آج میرے بڑے لڑکے حسین کی سالگرہ ہے۔ کل سے وہ چودہ سال ختم کر کے پندرہویں سال میں قدم رکھے گا۔ اگر میرے پہلے لڑکے زندہ ہوتے تو آج ایک ۲۵ برس کا ہوتا اور دوسرا ۲۳ برس کا۔

میں نے آج رات کو ختم پڑھنے کے بعد حسین کے لئے دعائیں مانگیں کہ وہ صاحب عمر صاحب اقبال اور دین و ملت کا خادم ہو۔ رات بھر ابر گھرا رہا۔

یکم جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۰ء
جمعہ دہلی

سیاسی } حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے ہر انسان حکمران ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کی باز پرس ہوگی۔ گو یا ہر شخص سیاسی ہے اور اپنی سیاست کا جواب دہ ہے۔ میں سب سے زیادہ ہندوستان کے شوہروں کو جواب دہ سمجھتا ہوں جو اپنی بیویوں کے حکمران ہیں اور ان کے ہاتھوں سے بیویوں پر ظلم ہوتے ہیں۔

قومی } اگر کسی کو مسلمان قوم کی خدمت کرنی ہے تو وہ سب سے زیادہ ان کی بیکاری اور مفلسی دور کرنے کی کوشش کرے کہ یہی بیکاری سب خرابیوں کی بنیاد ہے۔

تلقین حیات } قرض محبت کی قینچی مشہور ہے مگر موجودہ زمانہ کی تجارت بغیر قرض کے نہیں چل سکتی تجارتی قرض اور ذاتی قرض میں زمین آسمان کا فرق ہے اس کا سمجھنا اور سمجھ کر قرض کا کام کرنا ترقی حیات کا موجب ہے۔

علی مقتدی کا حلیہ } واحدی صاحب کا چھوٹا لڑکا ہے۔ بڑے لڑکے کا نام احمد مجتبیٰ چھوٹے کا نام علی مقتدی۔ اس کی عمر چار سال کی ہے احمد مجتبیٰ سے زیادہ گورا ہے اور ذہانت بھی اس کی بڑے بھائی سے بڑھی ہوئی ہے۔ دماغ اور چہرے کی بناوٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے کام کرے گا۔ ہر وقت خوش اور بشاش رہتا ہے اور جب رونا شروع کرتا ہے تو دنیا کے سب باشندے اور آسمان و زمین کے سب عناصر پناہ مانگنے لگتے ہیں۔

ذاتی } صبح آٹھ بجے حضرت بی بی نور صاحبہؒ کی درگاہ میں گیا۔ سب بچے بھی ساتھ تھے۔ دہلی کے اور خاندان کے بھی بہت سے زائرین جمع تھے۔ دادی کے مزار پر نو بجے ختم ہوا۔ قوالی بھی ہوئی۔ یہاں سے رخصت ہو کر قطب صاحب گیا قطب مینار کے نیچے باغ میں بیٹھ کر سب بچوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ توکلی شاہ بھی ساتھ تھے۔ جمعہ سے پہلے گھر میں واپس آ گیا۔ درگاہ شریف میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ پھر دہلی گیا۔ سبزی منڈی میں ایک دوست سے مل کر واحدی صاحب کے مکان پر آیا۔ پھر رائے سینا میں ایک صاحب سے ملنے گیا۔ ساڑھے سات بجے گھر میں آیا۔ کھانا کھا کر چہل قدمی کی۔ اخبارات پڑھے۔ نو بجے سو یا۔ رات کو طبیعت خراب تھی نیند بے چین رہی۔ پارہ صبح ۶۹ درجہ پر تھا۔ سردی یکایک ۶ درجہ بڑھ گئی۔ بارش کا اثر ہے۔

۲ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۰ء
شنبہ دہلی

سیاسی } انگریز کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہے میں کہتا ہوں ضرورت ہر سیاست کی ماں بھی ہے ہر چیز جب انسان کو درکار ہوتی ہے تب وہ مختلف طریقوں سے اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انہی طریقوں کو سیاست کہتے ہیں۔ سیاست وہبی بھی ہوتی ہے اور کسبی بھی۔

قومی } مسٹر محمد علی کے نام میرا اگر دو خط اخبارات کے پاس چلا گیا اور دہلی کے بعض اخبارات نے آج اس کا خلاصہ شائع بھی کر دیا۔ یہ خط در حقیقت مسلمانوں کے قومی فائدے اور حقوق کی حفاظت کی

نیت سے لکھا گیا ہے۔ اس میں ذاتی اختلافات کا کوئی دخل نہیں ہے حدیث شریف میں آیا ہے کہ حق بات کہنے کے موقع محل پر خاموش رہنا انسان کو گونگا شیطان بنا دیتا ہے۔ اس واسطے میں نے مسلمانوں کی عین ضرورت کے وقت یہ خط شائع کیا ہے۔

تلقین حیات } زندگی کا صحیح راستہ اسی کو حاصل ہوتا ہے جو ٹھیک وقت پر محل اور موقع کو پہچان کر کام شروع کر دیتا ہے۔ پس و پیش کرنے والے اور وقت کے بعد کام کرنے والے ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔

رابعہ کا حلیہ } واحدی صاحب کی منجھلی لڑکی ہے۔ نو دس سال کی عمر ہے۔ پیدا ہوئی تو اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اور واحدی صاحب نے نہایت محنت اور غیر معمولی جفاکشی کے ساتھ اس کو پالا۔ لڑکیوں کی طرح زیادہ باتون نہیں ہے مگر بہت سمجھدار ہے۔ اپنی بڑی بہن زاہدہ خاتون کی طرح پڑھنے کی شوقین تو نہیں ہے لیکن دوسری لڑکیوں کی بہ نسبت محنت اور رغبت سے پڑھتی ہے۔

ذاتی } ساڑھے بارہ بجے تک کام کر کے دہلی گیا۔ واحدی صاحب کے ہاں شام تک کام میں مصروف رہا۔ بہت سے احباب ملنے آئے۔ بعد مغرب واحدی صاحب اور رعزالی خاں کے ہمراہ کھانا کھایا۔ مولانا عبدالسلام صاحب بھی تشریف لائے۔ پھر رات کو بھیا فقیر عشقی کے مکان پر گیا۔ ڈاکٹر محمد عمر صاحب اور میرزا محبوب بیگ صاحب اور رجالی صاحب اور جمیل احمد صاحب اشرفی وغیرہ احباب جمع ہوئے۔ بارہ بجے سو رہا۔ سردی بڑھ گئی ہے۔ عشقی بانو نے میری راحت و آسائش کا بہت اچھا انتظام کر دیا تھا۔

---

۳ / جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ / ۲۶ / اکتوبر ۱۹۳۰ء

یکشنبہ دہلی

سیاسی } یورپ و امریکہ کی سیاست اس لئے کامیاب ہے کہ وہاں سیاسی اختلافات ذاتیات تک نہیں جاتے۔ میں نے بھی مسٹر محمد علی کے نام جو اردو اور انگریزی خط شائع کیا ہے اور اس خط میں جو نکتہ چینی کی ہے وہ محض خود مسٹر محمد علی کے ذاتی فائدہ کی نیت سے اور ہندوستان کے مسلمانوں اور دوسری قوموں کو سیاسی نقصان سے بچانے کے ارادہ سے شائع کیا ہے۔ ذاتی اختلافات کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

قومی } آج کے ڈاک میں مصر کے عربی اخبارات آئے ہیں۔ قاہرہ کے اخبار میں دیکھا کہ مولانا شوکت علی صاحب چند گھنٹے کے لئے قاہرہ میں گئے تھے اور انھوں نے مصر کے چند نامور لیڈروں سے ملاقات بھی کی تھی اور ان لیڈروں نے ہندوستان کے اور مسلمانوں کے اور ہندوؤں کے اور انگریزوں کے باہمی معاملات پر شوکت علی صاحب سے بحث بھی کی تھی معلوم ہوتا ہے مصر کے لیڈر علی برادران کے خلاف ہیں اور وہ ہندو مسلمانوں کا اتحاد ہندوستان کی آزادی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔

تلقین حیات } خدا نے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں چھوٹی بڑی بنائی ہیں۔ مگر کھانے کے وقت جب ہاتھ کی انگلیاں نوالہ منہ میں لے جاتی ہیں تو سب ایک ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی معاش کے معاملہ میں اتحاد عمل سب چھوٹے بڑوں کو ضروری ہے خصوصاً مسلمان قوم کو موجودہ زمانہ میں بہت زیادہ متحد ہونا چاہیئے۔

شاکرہ کا حلیہ } واحدی صاحب کی سنجھلی لڑکی ہے۔ دو سال کی عمر ہے۔ بڑی پیاری

حرکتیں کرتی ہے۔ جب وہ مسکراکر اور دانت نکال کر اپنی گردن ہلاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کے اسرار جذبات محبت سے معانقہ کرکے وجد کر رہے ہیں۔ اس کا رنگ خوب گورا ہے اور قیافہ بھی اس کی ذہانت اور خوش اقبالی کو ظاہر کرتا ہے۔

ذاتی } صبح بھیا کے ہاں سب احباب کے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر واحدی صاحب وغیرہ کے ہمراہ چند دوستوں سے ملنے گیا۔ ایک بجے گھر میں آیا اور تین بجے تک تحریری کام کیا۔ پھر زنانہ میں جاکر کچھ دیر لیٹا اور اخبار پڑھے۔ بعد مغرب دہلی گیا۔ سیرت نبوی ؐ کا جلسہ تھا۔ آٹھ بجے سے رات کے بارہ بجے تک اس کی صدارت کی۔ ہزارہا ہندو مسلمان جمع تھے۔ ہندوؤں کی نظم و نثر تقریریں بھی نہایت عمدہ ہوئیں۔ ایک بجے رات کو گھر میں واپس آیا۔

آج میرے اسکول میں بھی سیرت نبوی کا بہت عمدہ جلسہ ہوا تھا۔ رات کے جلسہ کی کامیابی ہر شخص نے تسلیم کی اور ہندو مقرریں نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ آنحضرت ؐ کی نسبت خیالات ظاہر کیے۔ پارہ صبح ۷ درجہ پر تھا۔ رات کو نواب صاحب رام پور کا تار آیا۔ مجھے رام پور بلایا ہے۔

گذشتہ سے پیوستہ

مفتاح الخزائن

(حالات وملفوظات حضرت خواجہ شاہ عبدالہادی چشتی امروہوی قدس سرّہٗ)

(۸)

تالیف : سید نثار علی بخاری بریلوی علیہ الرحمۃ
ترجمہ وحواشی : نثار احمد فاروقی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

باب چہارم

آں حضرتؒ کی ضلع بریلی میں تشریف آوری مولوی محمد احسن خاں کے باغ میں قیام اور وہاں سے موضع کھائی کھیڑا جانا۔

بریلی کا سفر جب اللہ کی حکمت کاملہ اور (بندوں پر) اُس کی بے پناہ مہربانی یہ چاہتی ہے کہ کسی صاحبِ کمال کے بہت زیادہ فیض پہنچانے والے وجود سے مخلوق زیادہ سے زیادہ برکتیں حاصل کرے، اور آسمانِ ولایت کے خورشید کی ذات کے انوار سے خاک نشین ذرّات سعادت کی شعاعیں حاصل کریں، تو اپنی درگاہ کے مقبول بندوں میں سے کسی ایک کو اُن پر مقرر کر دیتا ہے، تاکہ وہ اُس کی فوائد سے بھری صحبت پاکر شاہراہِ ہدایت پر پہنچیں، اور اِس طرح ذاتِ اَحدیت کی مضبوط رسّی کا سہارا اور وسیلہ پاکر اپنے ظاہر و باطن کے معاملات اور دونوں جہان کی بھلائی کے لیے اُس (خدا) کی طرف سے مدد اور اعانت طلب کریں۔ اِسی طرح فیضِ الٰہی نے شہر بریلی کی جانب آں حضرت (شاہ عبدالہادیؒ) کی توجہ ہونے میں کام کیا۔ اِس سعادت اور قدم رنجہ فرمانے کا سبب صاحبِ فضیلت وکمالات مولوی محمد احسن خاں ہوئے جو شہر مذکور (بریلی) کے معزز لوگوں میں سے تھے۔ آں حضرتؒ سے اُن کی ملاقات کی ابتدا، اِس طرح ہوا کہ ڈھبارسی جو سنبھل کے قریب ایک قصبہ ہے وہاں کے باشندوں میں سے شیخ محمد علی، حضرت شاہ عضدالدین قدس سرّہٗ کے مرید تھے، اور مولوی (محمد احسن) صاحب کی سرکار میں ملازمت کا تعلق رکھتے تھے، شیخ محمد علی مذکور، آں حضرتؒ کے حالات اور کرامات کا تذکرہ کرکے اُن کی سماعت کو سعادت سے ہمکنار کیا کرتے تھے، وہ بھی نہایت شوق اور عقیدت سے سنا کرتے تھے، اور ان کا اشتیاق روز بروز بڑھتا جاتا تھا، یہاں تک کہ وہ دارالخلافہ (دہلی) سے بریلی کی طرف عازم ہوئے، اور حضرتؒ سے ملاقات کرنے کا اپنے دل میں پکّا ارادہ کرلیا، چنانچہ اِسی ارادے سے براہی میں وارد ہوئے، شیخ (محمد علی) مرحوم کی

وساطت سے اپنی دلی تمنا حاصل کی، اور آں حضرتؒ کی ملاقات سے مشرف اور محظوظ ہوئے۔ باطنی اشتیاق کا انجام ظاہری ملاقات پر ہوا۔ آں حضرتؒ کو بھی مولوی صاحب سے بہت محبت اور تعلق خاطر پیدا ہوگیا۔ مولوی صاحب نے نہایت عاجزی اور الحاح کے ساتھ درخواست کی کہ حضرتؒ اُس علاقے (بریلی) میں قدم رنجہ فرمائیں۔ حضرتؒ نے منظور فرمایا۔ کچھ زمانے کے بعد، اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے، اور مولوی صاحب سے ملاقات کی خاطر بریلی میں تشریف لائے۔ چونکہ آں حضرتؒ کو صحرا اور گوشہ نشینی سے طبعی اُنس تھا اس لیے مولوی صاحب کے باغ میں قیام فرمایا، کچھ دنوں یہاں رونق افزا رہ کر پھر براہی کی طرف کوچ کیا۔

اُس کے بعد دونوں جانب سے ملاقات کے لیے دل میں کشش ہوتی تھی تو ایک دو سال میں اِس طرف آنے کا اتفاق ہوجاتا تھا، اور مولوی صاحب کے باغ میں ہی قیام رہتا تھا، کبھی لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے، جو طبع والا کو بہت ناگوار تھا، موضع اَسپور میں تشریف لے جاتے تھے، جو مولوی صاحب کی جاگیر میں تھا، اور پھر براہی واپس آجاتے تھے۔ اس آمد و رفت سے اُس علاقے کے بہت سے لوگ آپ کی بابرکت دعاؤں سے اپنے مقاصد اور مرادوں میں کامیاب ہوئے۔

رام کشن پر توجہ باطنی } روایت ہے کہ آنحضرتؒ کے تصرفات میں سے ایک یہ ہے کہ بریلی میں قیام کے زمانے میں مولوی صاحب کے باغ کا باغبان جس کا نام رام کشن تھا، حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور نہایت نیازمندی سے عرض کرتا تھا کہ میرے حال پر بھی حضرت کی ایک نظر ہوجائے۔ آں حضرتؒ نے اُس کو کچھ (وظیفہ) بتادیا، چند روز اُس کا ورد کرنے کے بعد اُس پر جذب کی حالت طاری ہوگئی، خواطر (دل میں گذرنے والی باتیں) جاننے اور (از رُوئے کشف) نام بجھنے کا ملکہ حاصل ہوگیا، وہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر آں حضرتؒ کے آستانِ فیض نشان کا مجاور بن گیا اکثر اوقات مجذوبانہ کلمات کہتا تھا کہ "افغانوں کو اِس ملک سے نکال دوں گا اور پورب سے فوج بلواؤں گا، اُن کے خیمے اِس میدان میں گاڑے جائیں گے اور بہت بھاری لاؤ لشکر ان میں آکر اُترے گا۔" چنانچہ کچھ ہی دنوں میں یہ دیکھا گیا کہ افغانوں کو شکست ہوگئی اور نواب وزیر شجاع الدولہ بہادر نے اُسی میدان میں اپنے خیمے نصب کیے جس کی طرف اُس (رام کشن) نے اشارہ کیا تھا اور وہاں (نواب کی) فوجیں اتریں۔[1]

مردم دیدہ را روشنائی } روایت ہے کہ جن دنوں آں حضرتؒ علاقہ بریلی میں تشریف فرما تھے ایک نابینا بھانڈ (نقال) آں حضرتؒ کے کمالات اور خرقِ عادات کا شہرہ سن کر اپنی بینائی کے حصول کی اُمید لے کر حاضرِ خدمت ہوا۔ آں حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ "پہلے فقیروں کی نقل کر کے دکھاؤ"۔ اُس حاجت مند نے اوّل تو ازراہِ ادب اس بارے میں جسارت نہیں کی، پھر چونکہ اس نقل میں حضور کا تقاضا اصل کی طرف رجوع کرانا تھا، اُس نے پہلے وضو کیا، پھر مُصلیٰ بچھا کر نقل کی کہ ایک اندھا کسی درویش کی خدمت میں اپنی بصارت حاصل ہونے کی دعا کرانے کے لیے آتا ہے، درویش اُسے دو رکعت نفل پڑھنے کا حکم دیتے ہیں، جب وہ نماز ختم کر کے دعا کرنے لگا اور حکیم علی الاطلاق (اللہ تعالیٰ) کی جناب میں اپنی بینائی واپس ملنے کی التجا کی، تو چونکہ اُس درویش کی دعائیں قبول ہوتی تھیں، یہ دعا بھی مرتبۂ اجابت کو پہنچی۔

اِس نقل کے بعد آں حضرتؒ نے فرمایا کہ اب بینائے برحق (خدا) کی بارگاہ سے اپنی آنکھوں کے لیے

بینائی طلب کر۔ جیسے ہی اُس نے اجابت کی امید میں التجا کے
ہاتھ اُٹھائے، حضرتؒ نے فرمایا: ''آنکھیں کھول دے۔''
اُسی وقت اُسے تازہ بینائی مل گئی اور آنکھیں روشن
ہوگئیں اِس کرامت کا ظہور ایک ایسے راز پر مشتمل
ہے جو اہلِ کمال اور اربابِ ذوق و حال کو میسّر
ہوتا ہے۔

منشی کیدارناتھ کہتے ہیں کہ خان سعادت و مغفرت نشان حافظ الملک
حافظ رحمت خان بہادر نے تین لاکھ روپے بطور
نذرانہ و پیش کش بادشاہ جم جاہ احمد شاہ درّانی
والیِ قندھار و کابل کی خدمت میں بھیجے، اور یہ رقم
منشی کیدار ناتھ کے حوالے کی، جو خان ممدوح کی سرکار
میں ملازم تھے اس بھاری رقم کا اس معتمد شخص کے
ہمراہ بھیجنا طے کیا گیا۔ بادشاہ درّانی کے حضور میں
پہنچنے کے بعد اور وہاں (تبادلہ زر کا جو حساب رائج
تھا اُسے) جان کر اندازہ ہوا کہ یہاں کے ۳۵ ہزار
روپے وہاں کے ایک لاکھ روپے ہوتے ہیں، اُس
(منشی کیدار ناتھ) نے اِسی معروف قاعدے کے
مطابق شاہ کے سرکاری خزانے میں ایک لاکھ
پانچ ہزار (ہندوستانی) روپے جمع کر دیے اور
تین لاکھ (افغانی) روپیوں کی رسید لے کر ہندوستان
کو واپس ہوگیا اِس طرح کھلی خیانت اور غبن کر کے
اُس طے شدہ رقم کو شیرِ مادر جان کر ہضم کر لیا
اور نچنت ہو کر بیٹھ رہا۔ کچھ عرصے کے بعد
معتبر ایلچیوں کے ذریعے سے یہ بھانڈا پھوٹ گیا اور
اُس کی چوری و بد دیانتی خان مذکور (حافظ رحمت
خاں) اور اُن کے دیوان راؤ بہادر سنگھ پر ظاہر
ہوگئی، جو خان کے مزاج میں پورا دخل رکھتا تھا،
اُس بد دیانت شخص کی طرف سے رنج اور غصہ
اُس کے دل میں تھا ہی، اب یہ بات ثابت اور
متحقق ہوگئی۔

اس خیانت پیشہ سے یہ رقم وصول کرنے کے
لیے سخت احکام جاری ہوئے۔ چونکہ اُس نے
آں حضرتؒ کے کمالات کی شہرت سن رکھی تھی،
حضرت کی خدمت میں پناہ لینے کو آیا، اور عرض کی
کہ اگر حضرت والا کی دعا سے مجھے اِس ہلاکت سے
نجات مل جائے تو عین کرم اور محض مرحمت ہوگی چ
اُسے دیوان (راؤ بہادر سنگھ) کی جانب سے سخت
اندیشہ تھا اِس لیے یہ بھی التجا کی کہ (حضرت کی
دعا سے) وہ دیوان خانۂ فنا (موت) کی طرف چلا
جائے۔ آں حضرتؒ نے فرمایا کہ ''سانپ کا زہر ج
مضرت اور نقصان کا باعث ہوتا ہے اگر نکل جا
تو وہ مینڈک اور مچھلی جیسا ہی (بے ضرر) ہو جا
ہے، اِسی طرح تیرے معاملے میں اُس کا وجو
اور ہلاکت کا سبب نہ بنے گا پھر اُس کی موت ما
کی کیا ضرورت ہے؟'' اتفاق ایسا ہوا کہ اِس معا
کو تین سال کی مدّت گزر گئی، اور جس دن سے
حضرتؒ نے دعا کی تھی، اِس وقت تک سرکار میں
کوئی شخص بھی اُس بیگانہ وضع (کیدار ناتھ)
حال سے آشنا نہ ہوا، نہ وہ رقم کسی کو یاد آئی۔
نے اس معاملے میں (اس کے) رجوع کرنے سے
دو چار محتاجوں کی اُس سے سفارش کی تھی او
اشارہ فرمایا تھا کہ یہ (محتاج لوگ) تیرے دشمن
کی مضرت سے تجھے بچانے کے لیے دعا کریں گے
اُس ناعاقبت اندیش نے اس مدّت میں ایک
کوڑی سے بھی کسی کی مدد نہیں کی، اور جب سر
کی طرف سے طلب اور تقاضا بھی توقف میں پڑ
تو اُس نے (حضرت کی خدمت میں) آنا جانا ا
حالات بیان کرنا بھی موقوف کر دیا۔ ایک دن آ
نے اُن محتاجوں سے برسبیلِ تذکرہ پوچھا کہ اِ
مدّت میں تمھیں اُس کے ہاتھ سے کوئی چیز م
ہے یا نہیں؟ اُنھوں نے جو واقعہ تھا بیان

آں حضرتؒ نے ان (محتاجوں) سے فرمایا کہ منشی مذکور سے جاکر کہہ دو کہ "ہم نے بہت دعا کی مگر وہ قبول نہ ہوسکی"۔ قضارا اسی عرصے میں اس معاملے کے ذمہ دار یعنی دیوان (راؤ بہادر سنگھ) مذکور کو وہ غبن کی ہوئی رقم بھریا دآگئی۔ اُس نے خان (حافظ رحمت خاں) کی خدمت میں عرض کیا کہ کئی سال گذر گئے اُس نمک حرام نے جو خیانت کرنے والوں میں ضرب المثل بن گیا ہے، سرکاری روپیہ ادا نہیں کیا، اس کی سرکشی اور خیانت کا سکہ جم گیا ہے، جب تک اس پر مار نہیں پڑے گی یہ رقم آسانی سے ملنے والی نہیں ہے۔ غرض سپاہی تعینات کر دیے گئے اور وہ خائن اپنے گھر بار کی خرابی اور نہایت بے عزتی کے بعد خان کی سرکار میں کچھ رقم جمع کرنے پر مجبور ہوا، اور اپنے اعمال کی سزا پائی۔ اُس زمانے میں پھر اُں حضرتؒ کی خدمت میں التجالے کر حاضر ہوا، مگر اس کی بد دیانتی کی وجہ سے کوئی درخواست حضرتؒ نے منظور نہ فرمائی کیونکہ اس مدت میں اس کی وعدہ خلافی اور کوتاہ بینی اچھی طرح دیکھی جا چکی تھی۔ فالحکم للہ۔

مولوی غلام عمر } روایت ہے کہ جب آں حضرتؒ بریلی میں رونق افروز تھے، شہر کے ممتاز لوگوں میں سے ہر ایک حضرت کی خدمت سے فیض اٹھانے کی سعادت حاصل کر رہا تھا۔ مولوی غلام عمر صاحب جو اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر (اچھی باتوں کا حکم دینے اور ناجائز کاموں سے روکنے) کے زیور سے آراستہ و پیراستہ تھے اور اس بارے میں بہت شہرت رکھتے تھے، اس کے باوجود فقر و فنا اور ترک و تجرید میں نامزد تھے اور انھیں شہر کے معاملات و قضایا میں بھی پورا دخل تھا، آں حضرتؒ کے کمالات سن کر ملاقات کے مشتاق ہوئے، چونکہ آں حضرتؒ کا

قیام مولوی محمد احسن خاں کے باغ میں تھا، اور سید غلام عمر صاحب کو بعض باتوں کی وجہ سے مولوی صاحب موصوف سے کسی قدر رنجش اور کشیدگی تھی، اس لیے (باغ تک) جانے کو نامناسب جان کر اپنے خادم کی زبانی یہ کہلا بھیجا کہ فقیر آپ کی خدمت میں حاضر ہونے سے قاصر ہے، سبب یہ کہ آپ فلاں صاحب (مولوی محمد احسن خاں) کے باغ میں تشریف رکھتے ہیں اس لیے وہاں آنے کا عذر اور ملاقات کا اشتیاق جان و جگر کے لیے دست و گریباں ہوگئے ہیں۔ آں حضرتؒ نے اُن کی اس صاف گوئی کے سبب سے فرمایا کہ فقیر خود (آپ کی خدمت میں) حاضر ہوگا۔ چنانچہ ایک دن آپ مولوی صاحب (غلام عمر) کے مکان پر تشریف لے گئے۔ مولوی صاحب نہایت اخلاق اور تواضع سے پیش آئے، بات چیت کے دوران میں وہی عذر اُنھوں نے پھر بیان کیا کہ میں اس مدت میں اسی سبب سے حاضر خدمت نہ ہوسکا، اسی گفتگو میں اُنھوں نے مولوی محمد احسن خاں کی کچھ شکایت بھی کی۔ آں حضرتؒ نے فرمایا: عجیب اتفاق ہے کہ مولوی (محمد احسن) صاحب نے کبھی ناخوشی کا کوئی ایسا کلمہ مجھ سے نہیں کہا جس میں آپ کا گلہ ہو، یا اُن کی بد مزاجی کا اظہار ہو، آپ کو تو فقر (درویشی) سے بھی مناسبت ہے، پھر بھی اس معاملے میں اتنی لمبی چوڑی شکایت کر رہے ہیں، بہت تعجب کی بات ہے۔ اگر مولوی صاحب شہر کے معاملات میں کچھ دخل دیتے ہیں تو بجا ہے، اس لیے کہ وہ شہر کے رئیس ہیں منصب قضا اُن کے پاس ہے، اُس سے متعلق دوسرے اعزازات بھی رکھتے ہیں۔ آپ تو یہاں تازہ وارد ہیں، یہ آپ کا وطنِ اصلی بھی نہیں، آپ کا دخل دینا بے جا ہے"۔ مولوی (غلام عمر) متنبہ ہوئے اور عرض کیا: حضرت

کا ارشاد بالکل درست ہے، آیندہ کسی معاملے میں اُن سے معارضہ نہ کروں گا اسی مجلس میں مولوی (غلام عمر) صاحب کی زبان سے یہ بھی نکلا کہ "فقیر کا اپنے موقف پر اٹل رہنا عوام کو تکلیف سے بچانے کے لیے ایک دیوار ہے۔" اُں حضرتؒ نے فرمایا کہ "یہ دیوار سنتِ نبوی کے خلاف ہے۔" اس کے بعد حضرت نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ بہت جلد آپ کی ملاقات مولوی (محمد احسن) صاحب سے واقع ہوگی اور ساری کلفت وکدورت صفائی میں بدل جائے گی۔

اتفاق سے اُسی زمانے میں محلہ قاضی ٹولہ کے باشندوں کا دوسرے محلے والوں سے کچھ جھگڑا ہوگیا۔ سارے شہر کے لوگ جمع ہوگئے تاکہ تصفیہ کرادیں۔ مولوی صاحب بھی اس جھگڑے کو رفع دفع کرنے کے لیے اس ہنگامے میں پہنچ گئے، وہیں مولوی غلام عمر صاحب بھی آگئے۔ دونوں بزرگواروں کی ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی اور وہ پچھلے حجابات دور ہوگئے، حضرتؒ نے جو ارشاد فرمایا تھا اُس کا تصرف ظاہر ہوگیا۔

اپنے نفس کے بُت توڑو } اسی زمانے میں مولوی غلام عمر نے، اِس بنا پر کہ عالمانِ باعمل کے لیے اپنی شان دکھانا بھی ضروری ہے، ایک عورت کو ستی ہونے سے بچا کر اپنے پاس روک رکھا تھا، بُت شکنی اور ستی کی مخالفت کو اپنے لیے امرِ معروف (نیک کام کی تبلیغ) بنا رکھا تھا، کسی موقع پر یہ بات بھی آں حضرتؒ کے سامنے بیان ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ "فقیر کو اپنے (نفس کے) بُت توڑنے چاہئیں، دوسروں کے نہیں۔"

توجہ باطنی کے مدارج } منقول ہے کہ ایک دن آنحضرت نے زبان مبارک سے ارشاد فرمایا کہ فقیر کی برکات تمام اوقات میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ کبھی ذرا سی دلی توجہ بگڑا ہوا کام بن جاتا ہے، یعنی خاموشی کی زبان ہی کا کرجاتی ہے، بسا اوقات زبان سے کام لینے (دعا مانگ) کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لیے بار بار التجا کرنا ہوتی ہے، کبھی ایک نگاہ کام کر جاتی ہے، کبھی ہاتھ پاتو ہلانے کی ضرورت پڑتی ہے، اور حرکت کر سے مقصود کا حصول متصور ہوتا ہے۔

چنانچہ اس کے مطابق آپ نے ایک حکایت بیان فرمائی کہ بریلی میں قیام کے زمانے میں، مولوی محمد احسن خاں کے بیٹوں میں سے کوئی بیمار ہوا ہر چند سارے طبیبوں نے علاج معالجے میں اپنی افلاطونی حکمت کا زور لگایا، کوئی فائدہ نہ ہوا۔

"مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔"

مولوی صاحب کو حضرتؒ سے جو اتحاد و ارتباط تھا، گھبرائے ہوئے باغ میں پہنچے اور بچے کی شفا کے لیے دعا کی درخواست کی۔ "فقیر نے ہر چند دعا قبول نہ ہوئی۔ ناچار بریلی سے اَن کے گانو موضع آ... میں چلا گیا وہاں ایک نخلستان تھا، اُس میں رہ کر توجہ میں مشغول ہوا، اُس وقت جو صورت میں اپنے خیال میں باندھی تھی وہ یہ تھی گویا ایک عورت اوپر آسمان سے نیچے آئی ہے اُس کے ہاتھ میں ایک لکڑی ہے جس پر عورتیں اپنا دھاگا (سوت) لپیٹتی ہیں، اس (عورت) نے بیمار کے منھ کو اُس اٹیر سے کھولا ہے، اور اپنے پستان سے اُس کے منھ میں دودھ دیا ہے۔ یہ تصور فوراً صحیح بیٹھ گیا، ادھر یہاں اس (لڑکے) کو صحت وشفا نصیب ہوگئی۔ مولوی (محمد احسن) نے فوراً اپنا آدمی رامپور بھیجا کہ اللہ کے فضل وکرم اور ولایت پناہ (حضرت شاہ عبدالہادیؒ) کی توجہ سے صحت حاصل ہوگئی ہے۔ سچ ہے کہ اِس گروہ (درویشاں) کی توجہ ہر حال میں ایک نیا روپ رکھتی ہے۔

اصلی دولت منقول ہے کہ بریلی میں قیام کے اسی زمانے میں حضرت کے صاحبزادے شیخ ظہور اللہ صاحبؒ تشریف لائے، اُن کے دل میں یہ خیال تھا کہ اِس بار حضرت کے سامنے اپنے معاش کی فراغت کے لیے اظہار کریں گے کہ سادات کی نوکری کے تعلق سے اپنی ضروریات کے مطابق آمدنی نہیں ہوتی۔ مگر اس سے پہلے کہ اپنا خیال حضرت کے سامنے ظاہر کریں، آں حضرتؒ نے فرمایا کہ عجب اتفاق ہے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ شوکت و حشمت، رُتبے اور دنیوی ساز و سامان میں حافظ رحمت خاں اور دوندے خاں اور دوسرے بڑے سرداروں کے برابر ہو جائے۔ محتاجوں اور درماندہ لوگوں کی تکلیف دیکھ کر، جو اُس سے بہت زیادہ محتاج ہیں، اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا، اپنے بارے میں خود یہ انصاف نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اُن کی ضروریات (پوری ہونے) کا کچھ سامان کر رکھا ہے۔ دولت اور جمعیتِ خاطر، فارغ البالی اصل میں یہ ہے کہ صحت و تندرستی ہو، عزت و آبرو ہو، اولاد ہو، ایمان ہو۔" نصیحت کے یہ کلمات سن کر شیخ (ظہور اللہ) صاحب خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد خود آں حضرتؒ نے اِن سے دریافت فرمایا کہ پورے سال میں کتنی رقم سے تمہیں فارغ البالی حاصل ہو سکتی ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ پانچ سو روپے میں دل جمعی اور کشادہ دستی کے ساتھ اپنے اخراجات پورے کر سکتا ہوں۔ اس کے جواب میں حضرتؒ خاموش ہو گئے کچھ نہیں فرمایا اور اُن کی درخواست پر دل میں توجہ فرمائی۔ اس کے بعد اللہ کے فضل سے اور ولایت پناہ (حضرت شاہ عبدالہادیؒ) کی توجہ (کی برکت) سے، اسی کام سے جو وہ کر رہے تھے، سال تمام میں پانچ سو روپے کی آمدنی ہونے لگی، جو ان کی ضروریات اور حوائج میں صرف ہوتی تھی۔ بلکہ کبھی اس سے زیادہ اگر کچھ مل جاتا تھا، تو وہ خسارے میں تلف ہو جاتا تھا۔ ابھی تک جنابِ باری عزَّ اِسمُہٗ کی عنایت سے اِس دعا کی برکت باقی ہے۔

ایک دن اُسی زمانے میں شیخ (ظہور اللہ) صاحب نے عرض کیا کہ ہمارا رہائشی مکان کچّا اور چھپّر دار ہے، اگر آپ کا حکم ہو تو اپنی حیثیت اور استطاعت کے مطابق پکّا مکان بنوا لیا جائے۔ فرمایا کہ اس تھوڑی سی تعمیر کے لیے تکلیف اُٹھانا کیا ضروری ہے، جب وقت آئے گا تو بڑی بڑی عمارتیں بن جائیں گی۔ چنانچہ اِس وقت اُس ارشاد کی برکت سے نہایت وسیع مکانات اور عالی شان عمارتیں اُن (شیخ ظہور اللہ) کے ہاتھوں بنوائی ہوئی اُن کی پائدار نشانیاں موجود ہیں۔ اور اس خاندانِ عالی شان میں (تعمیر کا) یہ کام برابر ہو رہا ہے، مسجد، خانقاہ اور مقبرۂ شریفہ کی تعمیر ہو چکی ہے، جس کی پختگی، بلندی اور شان بُروجِ آسمانی کو پیغام دے رہی ہے۔

کھائی کھیڑا میں قیام کہتے ہیں چونکہ آں حضرتؒ کو قدیم زمانے سے صحرا میں گوشہ نشین اور خلقِ خدا سے دور رہنا مرغوب تھا، لوگوں کے ہجوم سے بچنے کے لیے کنارہ ڈھونڈتے تھے، آں حضرت کو موضع کھائی کھیڑا کی فضا کا وصف معلوم ہوا جس کے اطراف میں گھنے جنگل تھے، اور وہ ایک دریا کے کنارے واقع تھا، اِس سراسر برکت سفر کا باعث قاضی صدر الشریعت اور مولوی شیخ الاسلام صاحبان ہوئے۔ آخر آں حضرتؒ نے اپنے مبارک قدموں سے اُس موضع کو سرفراز فرمایا۔ اکثر آپ روزانہ صحرا کی سیر کرنے تشریف لے جاتے تھے اور رات کو اپنی قیام گاہ پر واپس آ جاتے تھے اُس زمانے میں بریلی وغیرہ مقامات کے علما، فقرا، اور رؤسا حضرت کے کمالات

اور خرقِ عادات کو سن کر خدمت با برکت میں حاضر ہوتے تھے اور صحبتِ کیمیا خاصیت کو مغتنمات میں سے جانتے تھے۔

کہتے ہیں کہ ایک بار مولوی شیخ نور صاحب جو خطِ نسخ کے خوشنویس میاں شیخ میر لاہوری کے بڑے بھائی تھے، حضرتؒ کے مناقب وفضائل سن کر مونسع کھائی کھیڑا میں آئے۔ وہ صلاح وتقویٰ کے زیور سے آراستہ تھے اور معاملاتِ شریعت میں بھی سرگرم تھے۔ اتفاق سے اُس وقت آں حضرت نمازِ عصر کے لیے وضو کرنے میں مشغول تھے، اور حضرت کی کیفیت بہت دنوں سے یہ تھی کہ دن کے آخری حصے میں مزاج پر جذب اور کیفیت کی حالت طاری ہو جایا کرتی تھی، مگر فرائض کی ادائیگی میں پوری کوشش کرتے تھے، اور اسے ہرگز ترک نہ فرماتے تھے۔ جس وقت مولوی (شیخ نور) پہنچے اور حضرت کو وضو کرتے ہوئے دیکھا تو ایک طرف بیٹھ گئے۔ حضرتؒ کو وجد وجذب کے غلبے کی وجہ سے وضو کی ترتیب میں کچھ خلل واقع ہو گیا۔ مولوی نے حضرت کے وضو (کی بے ترتیبی کو) دیکھا تو دل میں انکار اور شک پیدا ہوا، اور وضو کی بے ترتیبی کو فقر میں دخل دیا، مگر زبان پر کچھ نہ لائے۔ اس کے بعد جب نماز سے فراغت ہوئی تو ایک لمحے کے بعد وہ رخصت ہو کر پیلی بھیت جانے کے ارادے سے حافظ گنج کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات کو اُن پر ایسی واردات ظاہر ہوئی جو اُن کے (دل میں) چھپے ہوئے شک کا جواب تھی، مولوی اُسی وقت آدھی رات کو حافظ گنج سے جو ایک کوس کے فاصلے پر تھا حضور میں واپس آئے اور اپنے اس خطرہ سے توبہ کی، معافی کے خواستگار ہوئے آں حضرتؒ نے اُن پر بہت مہربانی فرمائی۔

شاہ نزہت علی صاحبؒ کہتے ہیں کہ اگرچہ میں اس وقت حاضر تھا مگر مفصل طور پر یہ معلوم اور منکشف نہ ہو سکا کہ اُن پر کیا حالت گذری اور کیا معاملہ پیش آیا۔ جو اسی وقت واپس ہوئے اور نہایت عاجزی ونیازمندی کے ساتھ پیش آئے۔ واللہ اعلم والعلم عند اللہ۔

خاکِ صحرائے محبت کہتے ہیں کہ ایک بار مولوی شیخ نور کو حضرت کے آستانۂ عالیہ پر حاضری کا اتفاق ہوا۔ بات چیت کے دوران میں مولوی کی نظر ایک خط کے لفافے پر پڑی جو زمین میں پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُسے ہاتھ میں اُٹھالیا، سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا اور حضرت کو ایک قصہ سنایا کہ کسی گنہ گار شخص نے راستے میں ایک کاغذ پڑا دیکھا جس میں اللہ عزّ اِسمہٗ کا نام لکھا ہوا تھا۔ اُسے اپنی آنکھوں سے لگایا اور نہایت عزّت واحترام کے ساتھ محفوظ رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے اِس تعظیم وتکریم کی برکت سے جو اُس نے کی تھی اُسے گناہوں کے بھنور سے نکال کر اپنی بخشش کے ساحل تک پہنچا دیا۔ اس لیے کاغذ کی تعظیم کرنا واجبات میں سے ہے کہ اس میں کسی زبان میں اللہ سبحانہٗ جلّ شانہٗ کا نام ہے۔ جب مولوی نے اس گفتگو میں بہت مبالغہ کیا اور تعلیم ونصیحت کرنے لگے تو آں حضرتؒ نے عالمِ ذوق کے کسی سیاح کا یہ شعر پڑھا:

خاکِ صحرائے محبت سُرمہ در چشمت نکرد
ورنہ ہر زشتے کہ بینی یوسفے در پردہ است

(محبت کے صحرا کی دھول تمہاری آنکھوں کا سرمہ نہیں بنی۔ ورنہ جو بھی بُری شکل تم دیکھتے ہو وہ در پردہ (اپنے حسن میں) یوسف (علیہ السلام) کی مثال ہے۔)

مولوی پر یہ شعر سن کر وجد اور رقت کی حالت طاری ہو گئی، بے تاب ہو کر اُٹھ کھڑے

ہوئے اور حضرت کے گرد رقص کرنے لگے، اس کعبۂ مقصود کا طواف کیا، اور یہ شعر لکھ کر اپنے بازوئے شوق کا تعویذ بنا لیا۔ اُن کا اعتقاد اور محبت روز بروز ترقی پانے لگا۔

وحدت الوجود } کہتے ہیں کہ ایک بار مولوی غلام عمر صاحب آں حضرت سے ملاقات کے لیے موضع کھائی کھیڑا میں آئے۔ آں حضرتؒ اپنا لباس دھونے میں مشغول تھے، مولوی صاحب کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا، کچھ دیر کے بعد خادم نے ظاہر کیا کہ مولوی صاحب کا ارادہ آج ہی شہر کو واپس جانے کا ہے اور دن تھوڑا سا باقی ہے۔ آں حضرت اُٹھ کر مولوی صاحب سے گفتگو میں مشغول ہوئے مولوی صاحب نے اِس بات چیت میں مسئلہ وحدت وجود کو چھیڑ دیا۔ آں حضرتؒ نے فرمایا کہ اس بات سے توبہ کرنی چاہیئے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے تین بار اپنی زبان سے توبہ کے کلمات ادا کیے۔ پھر آں حضرتؒ نے فرمایا کہ جب تک یہ حالت طاری نہ ہو جائے اور یہ حال منکشف نہ ہو جائے ان کلمات کا ادا کرنا محض کفر و زندیقی ہے۔ مولوی صاحب نے یہ بات تسلیم کی اور رخصت ہو کر بریلی کی طرف واپس ہوئے۔

شریعت اور طریقت } کہتے ہیں کہ آں حضرتؒ فرماتے تھے ابتدائے سلوک میں یہ خطرہ دل میں گذرتا تھا کہ شریعت و طریقت کے احکام میں مغایرت ہے، اور یہ خیال دل میں اسی طرح جما ہوا تھا یہاں تک کہ ایک بار قحط کے زمانے میں ایک بڑھیا جو محتاج تھی، ہمارے پاس آئی اُس کی غریبی کو دیکھتے ہوئے میں نے اُسے اجازت دے دی کہ اُس ایکھ سے جو میری ملکیت تھی، اپنی بھوک دفع کر لیا کرے۔ وہ بڑھیا اکثر اوقات اُس ایکھ سے گنے کھاتی تھی اور ان سے اپنی غذا حاصل کرتی تھی، اِس کے ساتھ ہی لوگوں کو سخت تاکید بھی تھی کہ وہ کھیت کی رکھوالی کریں۔ ایک دن وہ اُس عورت کو پکڑ کر (میرے پاس) لائے۔ چونکہ اُن دونوں کو ہی ہمارا حکم تھا اس لیے میں کسی کو بھی نہ روک سکا۔ اُس وقت وہ خطرہ جو مدّت سے دل میں بیٹھا ہوا تھا، دور ہو گیا، اور معلوم ہوا کہ دونوں طریق کے حاکم حق تعالیٰ ہی ہیں، اور جو مغایرت ہے وہ محض اعتباری ہے حقیقی نہیں ہے۔

توکّل کی لذّت } منقول ہے کہ ایک بار قناعت کی بات نکلی۔ آں حضرت نے ایک حکایت بیان فرمائی کہ ایک بزرگ کسی درویش کے گھر میں وارد ہوئے۔ فقیر نے سوکھی روٹی جو موجود تھی اُن کے سامنے رکھ دی اُس سوکھی روٹی میں نمک بھی نہیں تھا۔ اُس مسافر (درویش) کو نمک کی سخت آرزو ہوئی، شیخ کو اشارہ کیا، شیخ گھر کے اندر گئے۔ اور اپنی بیٹی سے پوچھا کہ نمک موجود ہے؟ جب نہیں ملا تو اپنے وضو کا لوٹا جو گھر کے سامان اور مالیت میں واحد صحیح سالم چیز تھی ایک بقّال کی دکان پر گروی رکھ کر نمک لائے، اور درویش کی خدمت میں پیش کیا۔ اُس فقیر مہمان کی زبان سے نکلا کہ بس (ہمارا) توکّل یہی ہے کہ سوکھی روٹی اور نمک کی ڈلیوں پر قناعت کر لی ہے۔ وہ (فقیر کی) بیٹی ہنسی اور کہنے لگی کہ اے شیخ اگر قناعت کے مزے اور توکّل کی لذّت سے تم آشنا ہوتے تو ہمارا لوٹا بنیے کی دکان پر نہ جاتا۔ شیخ نے (شرمندگی سے) اپنا سر جھکا لیا۔

آدابِ درویشی } روایت ہے کہ ایک دن کم بولنے کی راحت کا ذکر ہو رہا تھا آں حضرت نے ایک قصّہ سنایا کہ کوئی بزرگ سفرِ حج کا ارادہ رکھتے تھے اور انھیں ایک ایسے خادم کی ضرورت تھی جو سفر کے تمام معاملات سے واقف، منزل سے باخبر اور

مختار کار ہو، کسی بات یا مصلحت میں (مجھ سے) مشورہ کرنے کا محتاج نہ ہو، بس طہارت کے لیے پانی میرے پاس رکھ دیا کرے۔ لوگوں نے ایک ایسے شخص کی تلاش کرکے جو حسنِ ادب سے آراستہ، اچھی طرح خدمت کرنے والا مہذب اور بزرگوں کی صحبت کے لائق، دانا و ہوشیار تھا، شیخ کی خدمت میں پیش کیا۔ اِس سفر میں کبھی اُس سے گفتگو کرنے کا اتفاق نہ ہوا۔

چند سال کے بعد جب اُس سفر سے واپسی ہوئی، تو ایک دن راستے میں (شیخ نے) اُس سے پوچھا: کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟ وہ شیخ کی خاموشی سے اتنی طویل مدت میں اُوب چکا تھا، عرض کیا: ''میری شادی ہو چکی ہے بلکہ اُس کے نتیجے میں ایک بیٹی بھی ہے، بیوی بھی ہنوز زندہ ہے۔''

شیخ پھر خاموش ہو گئے، اور کوئی بات نہیں کی، یہاں تک کہ واپس اپنے گھر پہنچ گئے۔ لوگوں نے اُن کے قدمبوسی کی سعادت حاصل کرنے کے بعد اُس خادم کا حال معلوم کیا کہ مبادا اس سے کوئی بات (شیخ کی) مرضی کے خلاف سرزد ہوئی ہو۔

فرمایا کہ یہ شخص اچھا ہے اور ہر صفت سے موصوف ہے، مگر اس میں ایک عیب ہے، باتیں زیادہ کرتا ہے! ایک بات پوچھو تو جواب میں دو باتیں کہتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ درویشوں کی مجلس کے تربیت یافتہ لوگوں کے لیے کمالِ ادب کا مرتبہ یہ ہے کہ جتنا سوال ہو، اتنا ہی اُس کا جواب دیا جائے اس پر اپنی رائے سے اور کسی بات کا اضافہ نہ کریں کہ یہ ترکِ ادب ہے۔

فقیر کی دعا کے مدارج } روایت ہے: آں حضرتؒ کے ملفوظات میں سے ایک یہ ہے کہ فقیر کی دعا تین خاصیتیں رکھتی ہے۔ پہلی خاصیت تخم (بیج) کی، دوسری خاصیت درخت کی، تیسری پھل کی۔

یعنی فقیر کی دعا کا ظہور تین صورتوں میں ہوتا ہے، جو دعا بیج کی طرح ہے اُس کا ظہور کچھ زمانہ گذرنے کے بعد ہوگا، جیسے کوئی بیج ایک مدت کے بعد نشو و نما پاکر درخت بنتا ہے۔ دوسری درخت کی خاصیت والی دعا کے اثر سے قریب کے زمانے میں ثمرات حاصل ہونے کی اُمید ہوتی ہے، تیسری وہ دعا جو پھل کے مانند ہے، وہ ہے جس کا نتیجہ فوراً حاصل ہو جاتا ہے۔ ان تینوں قسموں کو تین اوقات پر تقسیم کر دینا چاہیے۔ یعنی جو دعا پھل کا حکم رکھتی ہے وہ اُسی شخص کے حق میں ہے جو دعا کی درخواست کرے اور (اللہ تعالیٰ اُس کے بارے میں (دعا) قبول فرمالے۔ جو دعا درخت سے مشابہ ہے وہ اُس شخص کے فرزندوں سے متعلق ہوتی ہے، اور کچھ زمانے کے بعد (اس کا اثر) ظاہر ہوگا۔ جو دعا تخم کی طرح ہے وہ اس کی اولاد در اولاد میں ظہور کرے گی۔ پس معلوم ہوا کہ فقیر کامل کی دعا کبھی ضائع نہیں ہوتی اور بیکار نہیں جاتی۔

لَبَّیکَ عَبْدِی } روایت ہے کہ ایک دن آں حضرتؒ غلبۂ شوق میں اور وجد و ذوق کی فراوانی کے بارے میں ارشاد فرما رہے تھے:
فقیر وہ ہے کہ جب وہ ''اے میرے رب'' پکارے اُسی وقت سعادت کے کانوں سے سن لے لَبَّیکَ عَبْدِی (ہاں میرے بندے!)۔

جوہرِ عشق } آں حضرتؒ کے کلماتِ طیبات میں سے ایک یہ ہے کہ طالب کو راہِ طلب میں عشق رہبر ہونا چاہیے تاکہ وہ اِس راہ میں جد و جہد کر سکے۔ اگر عشق کی چاشنی نہیں، اور اُسے یہ دولت خدا داد میسر نہیں، تو صرف سعی و کوشش قطعاً بے فائدہ ہے۔ اس مناسبت سے آپ نے ایک مثل بیان فرمائی کہ اگر کوئی بچہ یہ چاہے کہ

اس کا باپ مسے گرکسے آلات و اسباب اور جنگ کے ہتھیار خرید کر دے دے، اور دشمنوں کا مقابلہ کرنے کو سواری کا گھوڑا بھی لینا چاہیے تاکہ وہ سپاہیوں کے اور جنگ آوروں کے زمرے میں شامل ہو جائے تو یہ سب ہو سکتا ہے کہ سارے اسباب اپنی خواہش کے مطابق فراہم کرلے۔ لیکن اگر وہ یہ چاہے کہ مردوں کا سا دل اور شیر دل لوگوں کی سی شجاعت پیدا کرلے تو یہ ممکن نہیں کہ کسب سے مل جائے یا بازار سے خرید لائے۔ یہ ذاتی جوہر ہے جو حق تعالیٰ اُس کے دل میں پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح فقیر کو عشق اور ذوق چاہیئے جو مقامات تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ حق یہ ہے کہ اِس راہ میں ذوق و شوق اور عشق اور سوز و گداز کی ضرورت ہے۔

کارِ مرداں روشنی و گرمی است
کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است

(جواں مردوں کا کام یہ ہے کہ (روح میں) روشنی اور (دل میں) گرمی ہو۔ گھٹیا لوگوں کا مشغلہ حیلہ سازی اور بے غیرتی ہے)

چور زیادہ جاگتا ہے

منقول ہے کہ ایک دن مکار اور چالباز لوگوں کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ آں حضرت ؒ نے ایک نکتے کی بات یہ بیان فرمائی کہ مکار لوگوں کی ساری جد و جہد اُس گروہ کے لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جو راہِ راست پر چل رہے ہیں، تاکہ وہ اپنی دکان چلا سکیں، جیسے کہ صاحبِ مال و منال کے مقابلے میں چور زیادہ جاگتا ہے اور اسے زیادہ ہوشیار رہنا پڑتا ہے، تاکہ اس معاملے وہ مال و متاع کے مالک پر سبقت لے جائے اور اُس پر اپنا قبضہ جما سکے۔

دوزخ کا مشاہدہ

جناب نزہت علی شاہ ؒ صاحب کی زبانی روایت ہے کہ ایک دن جنت کے درجات کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ فقیر (نزہت علی شاہ ؒ) نے حضور میں عرض کیا کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک بہشت کی لمبائی چوڑائی سات زمینوں کی برابر ہے، تو یہ سب کہاں ہوں گی؟ آنحضرت نے مسکرا کر جو کچھ مناسب تھا وہ فرمایا۔ اتفاقاً فقیر کی زبان سے نکلا کہ کیا حضرت ؒ نے دوزخ کا معاینہ بھی فرمایا ہے؟ ارشاد ہوا کہ "جنت کو تو کبھی کبھار ہی دیکھا ہے مگر دوزخ کے دیکھنے کا اکثر اتفاق ہوا ہے"۔

اِسی گفتگو میں نماز کا وقت ہو گیا، آپ اُٹھے اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ یہ فقیر اور تین دوسرے اشخاص جماعت میں شامل تھے، آں حضرت ؒ نماز پڑھا رہے تھے۔ پہلی ہی رکعت میں آں حضرت ؒ پر ایسی حالت طاری ہوئی کہ جسمِ مبارک لرزنے لگا اور اس بے خودی کی گرمی ہم سب کو بھی محسوس ہونے لگی، جیسے بجلی کڑکنے اور اُس کے گرنے کے وقت ایک طرح کی مدہوشی اور ہراس پیدا ہو جاتا ہے، اور آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں، جب حضرت نے دوسری رکعت میں دو تین بار تعوذ کیا، پھر اٹھے اور بے خود ہو گئے تو زبانِ مبارک میں لکنت پیدا ہو گئی اور آپ کے چہرے سے عجب طرح کی ہیبت اور رعب ظاہر ہونے لگا جسے دیکھنے کی حاضرین میں تاب نہیں تھی، یہ فقیر (نزہت علی شاہ ؒ) اپنے سوال پر بہت شرمندہ ہوا۔

(جاری ہے)

حواشی

لہ، مولوی قاضی محمد حسن خاں صاحب تھے۔ [illegible] دربار شاہی سے ملا تھا نہایت عالم فاضل اور علم [illegible] میں ماہر تھے۔ دربار دہلی سے [illegible] کا [illegible]

تھا، محدث اور فقیہ تھے شہر کے ممتاز، متمول اور بااثر لوگوں میں سے تھے۔ دہلی سے آتے ہوئے براہی میں حضرت شاہ عبدالہادیؒ کی قدم بوسی کے لیے پہنچے۔ اُن کی درخواست پر حضرت نے بریلی کا سفر اختیار کیا وہیں مولوی محمد احسن خاں مرید ہوئے اور نہایت مختصر مدت میں منازلِ سلوک طے کر کے خلافت سے سرفراز ہوئے۔

اُن کی اولاد محلہ قاضی ٹولہ بریلی میں آباد تھی اور خاندانِ شاہ عبدالہادیؒ سے محبت و اعتقاد کا سلسلہ ۲۵ سال قبل تک قائم تھا۔ اب شاید اس خاندان کے افراد میں وہاں کوئی نہیں ہے ممکن ہے بعض حضرات پاکستان میں موجود ہوں۔

قاضی مولوی محمد احسن خاں نے بریلی ہی میں انتقال کیا، وہیں مدفون ہوئے۔

۲ھ نواب شجاع الدولہ وزیر اودھ اور حافظ الملک حافظ رحمت خاں والیِ بریلی کی جنگ کی طرف اشارہ ہے جو کٹرہ میران پور میں ہوئی اور ۱۶ صفر ۱۱۸۸ھ ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو حافظ رحمت خاں کی شہادت اسی کے نتیجے میں ہوئی تھی۔

۳ھ اخبار الصنادید مؤلفہ نجم الغنی خاں جلد اوّل ص ۹۶۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ الملک کے دیوان کا نام پہاڑ سنگھ تھا۔ ممکن ہے مفتاح الخزائن میں پہاڑ سنگھ کی جگہ بہادر سنگھ سہو کتابت ہو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نجم الغنی سے نام پڑھنے میں سہو ہوا ہو۔

۴ھ حضرت شاہ عبدالہادیؒ کے اکلوتے فرزند حضرت شیخ ظہور اللہ عرف شیخ کُدّو غالباً ۱۱۴۰ھ / ۱۷۲۷ء یا اس کے ایک دو سال کے بعد پیدا ہوئے۔ ۱۷ ذی قعدہ ۱۲۲۱ھ / ۲۵ جنوری ۱۸۰۷ء کو وفات ہوئی۔ درگاہ حضرت شاہ عبدالہادیؒ میں جانب مشرق اپنے والد ماجد کے پائین میں اور اپنے فرزند حضرت عبدالباری چشتی علیہ الرحمہ کے برابر مدفون ہیں۔

حضرت شیخ ظہور اللہ کے چند فرزند تھے: حضرت شاہ عبدالباریؒ (وفات ۱۱ شعبان ۱۲۲۶ھ / ۳۰ اگست ۱۸۱۱ء جمعہ) حضرت شیخ حفیظ اللہ (وفات ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۲۷ھ / یکم جنوری ۱۸۱۳ء) حضرت شیخ حمد اللہ (وفات ۱۲ محرم ۱۲۲۸ھ / ۱۴ جنوری ۱۸۱۳ء) حضرت شاہ دوست محمدؒ (وفات ۱۳ ذی قعدہ ۱۲۲۹ھ / ۲۷ اکتوبر ۱۸۱۴ء) حضرت مولانا نجیب اللہ (وفات ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۳۰ھ / ۱۵ اکتوبر ۱۸۱۵ء) اور حضرت شیخ محمد عظیم (وفات ۲۸ ربیع الثانی ۱۲۴۳ھ / ۱۷ نومبر ۱۸۲۷ء) ان میں حضرت شاہ عبدالباریؒ اپنے دادا کے سجادہ نشین ہوئے۔ شیخ حفیظ اللہ، شیخ حمد اللہ اور شاہ دوست محمدؒ نے کوئی اولاد یادگار نہیں چھوڑی۔ مولانا نجیب اللہ کے فرزند مولانا کریم اللہ (وفات ۱۸ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ / ۳ اپریل ۱۸۶۶ء) اور حکیم رحیم اللہ (۱۴ شعبان ۱۲۹۴ھ / ۲۳ اگست ۱۸۷۷ء) تھے۔ شیخ محمد عظیم سے صرف ایک دختر یادگار تھیں۔

۵ھ حضرت نزہت علی شاہ بریلوی علیہ الرحمۃ، حضرت شاہ عبدالہادیؒ کے ممتاز خلفاء اور جاں نثار مریدوں میں سے ہیں۔ یہ اُس زمانے میں (غالباً ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء کے بعد) بیعت و خلافت سے مشرف ہوئے جب حضرت شاہ عبدالہادیؒ بریلی اور کھائی کھیڑہ میں قیام فرماتھے۔ ہمہ وقت مرشد کی خدمت میں رہے، اُن کے وصال کے بعد امروہہ آ گئے اور حضرت خواجہ شاہ عبدالباری چشتیؒ (ف ۱۲۲۶ھ) علیہ الرحمہ کی صحبت میں موضع براہی پرگنہ سنبھل میں قیام رہا۔ اُنھوں نے ہی ۱۲۲۸ھ / ۱۸۱۳ء میں اُس عہد کے مشہور فارسی عالم اور انشا پرداز سیّد نثار علی بخاری بریلوی (مصنّف "انشائے دلکشا" وغیرہ) سے

خواجہ حسن ثانی نظامی کا سفرنامہ افریقہ و ماریشس (مسلسل)

پانچویں قسط

کالے کوس، کڑے کوس

جل پریاں اور تھل پریاں

"جل" ہندی میں پانی اور تری کو کہتے ہیں۔ اور اس کے مقابل کا لفظ "تھل" ہے یعنی خشکی اور زمین! بہت زیادہ بارش ہو تو کہا جاتا ہے "جل تھل ایک ہو گئے"۔ لیکن ڈربن میں عبدالغنی صاحب اور سارہ سلمہانے "جل" اور "تھل" کو کسی اور طرح ایک ہوتے دکھایا۔ وہ مجھے شہر کے "ایکویریم" (AQUA'RIUM) میں لے گئے۔ ایکویریم ہمارے ہاں بمبئی میں بھی ہے۔ مجھے شکاگو امریکہ کے ایکویریم کو دیکھنے کا اتفاق بھی ہو چکا ہے۔ لیکن ڈربن والوں نے اپنا ایکویریم اس طرح بنایا ہے کہ سمندر کو بہ نفس نفیس خشکی پر تشریف لانے کی زحمت دی ہے۔ اور دوسری طرف زمین "ملکۂ سبا"[1] سے کچھ زیادہ ہی پائینچے چڑھا کر سمندر میں اتر گئی ہے۔ عجائبات کے ساتھ تماشے بھی ایسے ایسے ہیں کہ بس کیا کہیے ؎

زباں ساکت سخن کم تر!

سمندر کا ایک جانور "سیل" اور ڈالفن مچھلیاں جن کرتبوں کے لئے ٹریننڈ کی جاتی ہیں وہ کرتب تصویروں اور فلموں میں اکثر دیکھے جاتے ہیں۔ ڈالفن ایک ایسی مچھلی ہے کہ آدمی نے خیالی "جل پری" کا تصور اس مچھلی ہی سے لیا ہوگا۔ لیکن ڈربن کے ایکویریم میں ڈالفن مچھلیوں کو نچانے والی اور کرتب کرانے والی آدم زادیاں بھی تقریباً عریاں لباس میں "تھل پریاں" بننے کی پوری پوری کوشش کرتی ہیں۔ اور وہ بے چاریاں کیا کوشش کرتی ہیں۔ انھیں تو ان کی روٹی اور ان کا پیٹ نچاتا ہے اور جسم کی نمائش پر آمادہ کرتا ہے۔ مگر وہ مرد جو مغرب میں بیٹھ کر عورت کے احترام اور آزادی کا شور مچاتے نہیں تھکتے۔ ارذل المخلوق ان مچھلیوں کے ساتھ اشرف المخلوق آدم زادیوں یعنی اپنی ہی بہنوں بیٹیوں کا تماشا بحیثیت "تھل پری" نہایت بے غیرتی اور بے حمیتی کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ تماشا

---

[1] قرآن مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا کا جو قصہ بیان ہوا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ملکۂ سبا جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی مہمان ہوئیں اور ان سے ملنے آئیں تو انھیں شیشے کے ایک حوض پر سے گذارا گیا۔ انھوں نے غالباً شیشہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شیشے کو پانی سمجھ کر اپنے پائینچے چڑھا لئے تاکہ کپڑے نہ بھیگ جائیں۔ بعد میں انھیں بتایا گیا کہ یہ پانی نہیں شیشہ ہے۔

دکھانے والی لڑکیاں تو سمندری حیوانوں کے ساتھ حیوان بننے کا پارٹ ادا کرتی ہی ہیں۔ تماشا دیکھنے والے مرد بھی ظاہری طور پر نہ سہی باطن کے نہاں خانوں میں حیوان یقیناً بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس بے غیرتی سے سب کو محفوظ رکھے۔

مجھے سب سے زیادہ دلچسپ اور متاثر کرنے والا ایکویریم کا وہ حصہ معلوم ہوا جس میں اصل سمندر کو شیشے کے ایک بہت بڑے خول نما تالاب میں زمین کے تہہ خانے تک لایا گیا ہے اور انتظام یہ ہے کہ پانی اور مچھلیاں اوپر ہوں اور تماشا دیکھنے والے اور سیر کرنے والے پہلوؤں میں اور نیچے کھڑے ہوں۔ اس خول میں آرام فرما مچھلیاں اتنے بڑے سائز کی بھی ہیں کہ ایک کیا کئی کئی آدمیوں کو حضرت یونس علیہ السلام کی طرح اپنے ہوٹل پیٹ کے کسی سوئٹ (SUITE) میں ٹھیرا لیں!

کراچی میں دیکھا تھا کہ گدھا گاڑی میں ایک گدھا تو وہ ہوتا ہے جو گاڑی کا وزن کھینچنے کے لئے جوتا جاتا ہے۔ اور دوسرا گدھا بوجھ اور کھینچنے کی مشقت سے بے تعلق محض پہلے گدھے کو کمپنی دینے کے لئے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ جیسے پخ کہتے ہیں ڈربن کے ایکویریم میں ایک بہت بڑی شارک مچھلی کے پیٹ سے اپنی پیٹھ چپکائے ایک اور خاصی بڑی مچھلی نظر آئی۔ شارک کے ساتھ یہ ایسی "پخ" لگی ہوئی تھی جو لمحہ بھر کو بھی بڑی شارک سے جدا نہیں ہوتی تھی۔ واللہ اعلم اس چھوٹی مچھلی کے لئے یہ شارک کے قاتل مونھ سے بچنے کی ترکیب تھی یا مگرمچھ کے دانتوں میں خلال کرنے والی چڑیا یا شیر کے مارے ہوئے جانور کے بچے کھچے حصے کو صاف کر جانے والے لکڑ بگھے HYAENA کی خدمات اس مچھلی نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ اور "تم مارو، ہم کھائیں" کی امید میں ساتھ لگی پھرتی تھی!

قدرت کی عجیب نیرنگی اس ایکویریم میں دکھائی دیتی ہے۔

دوپہر کا کھانا معمول کے مطابق حضرت قاضی صاحب کے ہاں کھایا۔ وہ تصوف کی گفتگو میں اور میں گیہوں کی روٹی میں مصروف رہا کہ اپنے بڑے دادا حضرت آدم علیہ السلام کو سب سے پہلا صوفی مانتا ہوں اور جانتا ہوں کہ ـــــــ نہ ہوتی روٹی ـــــــ نہ ہوتے صوفی!

بھائی عبدالمجید خاں نظامی مرحوم کے سدا بہار داماد ڈاکٹر عبدالخالق موسم کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ آج انھوں نے اور ان کی دلہن زہرہ سلمہا نے نہ صرف مجھے ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ بلکہ حضرت مولانا سلیمان ندوی مرحوم کے صاحبزادے مولانا سلمان میاں صاحب ندوی، حضرت عبدالعلیم صدیقی میرٹھی کی یادگار حضرت صفی صدیقی بمبئی کے پروفیسر بعض مقامی اردو شاعروں

حضرت گلؔ وغیرہ اور سب اہل خاندان کو بھی زحمت دی تھی۔ کھانے کے ساتھ دھوم دھام کی شعری اور ادبی نشست بھی رہی۔ حضرت سلمان میاں اور حضرت صفی دونوں بہت عمدہ شعر کہتے ہیں۔ صفی صاحب کی پیدائش بھی ڈربن کی ہے۔ لیکن شعرگوئی میں استادوں کا سا رنگ ہے۔ اور زبان پر غیر معمولی قدرت ہے۔ حضرت گلؔ کی جڑیں گجرات ہندوستان میں ہیں۔ لیکن کھِل رہے ہیں ڈربن میں! حضرت سلمان میاں صاحب کل ہی امریکہ روانہ ہونے والے ہیں۔ ڈاکٹر موسم صاحب نے ان سے ملاقات کیا کرائی تپتی دوپہر میں بارش برسائی۔ بہت لطف آیا اور ایک پرانی تمنا پوری ہوئی۔

کھانے سے پہلے عبدالمجید خاں نظامی کے منجھلے صاحبزادے عبدالنعیم خاں نظامی سلمہٗ اور ان کی اہلیہ اور بچوں سے ملنے ان کی قیام گاہ پر بھی گیا تھا۔ ان کا

بڑا اصرار تھا کہ ان کے ہاں بھی کچھ دن ٹھہروں یا کم از کم دو چار وقت کھانا کھاؤں۔ مگر میں نے ان کی محبت بھری چائے اور اس کے لوازمات کو کئی دن کے قیام اور کئی کھانوں سے تولا تو وزن چائے اور چاہ کا کچھ زیادہ ہی نکلا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ دونوں میاں بیوی میرے مرید بننے کے لئے ہزاروں میل چل کر یا اڑ کر دلی پہنچے تھے۔ پھر ان کی ہر چیز بھاری بھرکم کیوں نہ ہوتی ؟

بسنت رنگ } اس سے اگلا دن بسنتی چولا پہن کر یعنی زرد رنگ کے لباس میں آیا۔ ایک دلچسپ بات ڈربن میں یہ نوٹ کر رہا ہوں کہ یہاں کے باشندوں کو پیلے رنگ سے خاص لگاؤ ہے۔ اس رنگ کو عاشقوں کا رنگ کہا گیا ہے۔ پیر و مرشد حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی زبان مبارک پر یہ عام اور سادہ سا لیکن نہایت معنی خیز شعر اکثر آیا کرتا تھا کہ

نوشتم نامہ را بر کاغذ زرد
کہ ہجراں حال ما را ایں چنیں کرد

حضرت پہلی دفعہ حیدرآباد گئے اور میر عثمان علی خاں مرحوم نظام دکن نے اس سفر کے تاثرات دریافت کئے تو انھوں نے سابق ریاست حیدرآباد کے لیٹر بکس کے بارے میں اپنی پسندیدگی ظاہر کی۔ نظام نے اس عجیب پسند کی وجہ پوچھی تو خواجہ صاحب نے لیٹر بکس کی معنویت کے ساتھ اس کے زرد رنگ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ برٹش انڈیا کا لیٹر بکس سرخ خوں خوار ہوتا ہے آپ کے ہاں کا لیٹر بکس زرد، عاشق زار ہے۔ اور پھر مذکورہ شعر پڑھا جس کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنا خط زرد کاغذ پہ لکھتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے جدائی نے میرا یہ حال کر دیا ہے !

ڈربن کی سڑکوں پر بہت سی موٹریں زرد رنگ کی نظر آتی ہیں۔ سڑکوں کے کنارے جو درخت لگائے گئے ہیں۔ ان میں سے بھی بہت سے درختوں کے پھول زرد رنگ کے ہیں۔ آج غنی میاں یہاں کے ایک بہت بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹور میں لے گئے تو وہاں برتنوں سمیت بہت سی چیزیں زرد دکھائی دیں۔ مغرب میں زرد جرنلزم بری چیز ہے۔ خود مشرق والے بھی بعض موقعوں پر زرد رنگ کو یرقان JAUNDICE کی علامت سمجھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ یرقان ظالم کا تعلق بھی مظلوم جگر ہی سے ہے۔ اور جگر محبت اور آرٹ کی دنیا میں کس اہمیت کا حامل ہے اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔ مگر میرے لئے تو ہر موقعے پر اس کو یاد کرنا یوں بھی ضروری ہے کہ اس رنگ کو نظامی رنگ کہا جاتا ہے۔ اسٹور میں پلاسٹک کے معمولی لیکن نہایت خوبصورت اور معنوی اعتبار سے بہت ہی قیمتی برتن دیکھ کر مجھے نظامی لنگر یاد آیا اور ایسا بے اختیار یاد آیا کہ زبان اس کے ضبط سے قاصر رہ گئی۔ غنی میاں ایسے موقعوں کی جیسے تلاش میں رہتے ہیں۔ معلوم نہیں کیا کیا پیک کرا لیا۔ اور میرے سمجھائے بجھائے ان مشوروں کو بھی نظرانداز کر دیا کہ یہ سامان دلی جائے گا کیسے ؟ اور اس سونے سے زیادہ تو اس کی گڑھاؤں مہنگی ہو جائے گی یعنی کرایہ قیمت سے بھی زیادہ ہوگا۔ مگر نہ وہ مانے نہ ان کی بیوی مانیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے مانگ سہاگ کو نظامی بزرگوں کے صدقے میں قایم رکھے کہ بسنتی رنگ، زرد رنگ، ہلدی کا رنگ ہمارے ہندوستان میں خوشی، شادی اور سہاگ کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے !

چاند نکلا } منگل کا دن ختم ہوا۔ بدھ کی شام آئی تو یہ سندیسہ بھی ساتھ لائی کہ قبلہ جان و دل، عالم پناہ حضرت سلطان المشائخ

خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے یوم ولادت
کی آمد آمد ہے۔ صرف بدایوں شریف میں نہیں جسے
حضرت کے مبارک مولد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔
صرف دہلی میں نہیں۔ جہاں حضرت ہمیشہ کے لئے آرام
فرما ہیں۔ بلکہ سب جگہ۔ یہاں ڈربن تک میں وہ
مبارک دن آگیا ہے۔

چاند جب نکلتا ہے۔ تو سب ہی جگہ اس کی
ٹھنڈی روشنی پہنچتی ہے۔ جاننے والے خوب جانتے
ہیں کہ حضرت کا ارادہ دہلی میں مستقل ٹھیرنے کا
نہیں تھا۔ پھر ایک دن کوئی زرد رو زار و نزار
مرد غیب خانقاہ میں حاضر ہوا۔ حضرت نے اس کے
سامنے کھانا رکھوایا۔ اس نے کھانے کی طرف ہاتھ
نہیں بڑھایا بس یہ دو شعر پڑھے۔

آں روز کہ مہ شدی نمی دانستی
کانگشت نمائے عالمے خواہی شد
امروز کہ خلقت دلِ خلقے بربود
در گوشہ نشستن نہ دارد سود

جس روز تم چاند بنے تھے۔ بھلا کیا جانتے تھے کہ ایک
جہان کے اشارے تمہاری طرف ہوں گے۔
اور آج جبکہ تمہارے حسن اخلاق نے ساری مخلوق کے دلوں
کو اڑا لیا ہے۔ کسی کونے گوشے میں چھپ کر بیٹھنے سے
کام نہیں چلے گا!

حضرت سے زیادہ ان دو شعروں کی معنویت
کو کون جان سکتا تھا۔ حضرت سمجھ گئے کہ مرد کس کی
طرف سے آیا ہے۔ کیوں آیا ہے چاہتا کیا ہے۔ یعنی
اس کو بھیجنے والے اللہ کی مرضی کیا ہے؟ فوراً دل
میں ارادہ کیا کہ اچھا اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو یوں
ہی سہی۔ میں دلی ہی میں رہوں گا۔ ادھر یہ ارادہ
ہوا ادھر آنے والے نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

صفر کا آخری چہار شنبہ یعنی آخری بدھ
حضرت کا یوم ولادت ہے۔ عبدالمجید خاں نظامی
صاحب کے سب سے بڑے فرزند عبدالحمید خاں
نظامی اور سب سے بڑی بہو، عبدالمجید صاحب
کی بیوی شریفہ بی بی نظامی کی خواہش تھی کہ یہ
جشن ولادت ان کے گھر میں منایا جائے۔ چنانچہ
اس کا اہتمام ہوا۔ اہل خاندان کے علاوہ احباب
کی بھی کثیر تعداد کو دعوت دی گئی۔ عبدالحمید خاں صاحب
نے ایک زوردار تقریر میرے استقبال میں تیار
کی تھی مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنا اچھا لکھتے اور
بولتے ہیں لیکن سچ پوچھئے تو آج حضرت محبوب الٰہیؒ
کے ذکر خیر کے علاوہ ہر بات کو چاہے وہ ان کی چوکھٹ
سے تعلق رکھنے والے کی بات ہی کیوں نہ ہو لا الٰہ کی
ایک ضرب سے دبانے اور حضرت کی یاد کو الا اللہ کی
ایک اور ضرب سے ابھارنے کی ضرورت تھی۔ سو
میں نے اس کی بس بھر کوشش کی۔ میاں عبدالحمید
نے میری حد سے زیادہ تعریف کی تھی۔ مجھے
اس کی تردید میں وقت صرف کرنا پڑا۔ حالانکہ یہ
بات کچھ مناسب نہیں تھی کہ ایک آدمی مہمان کی
آؤ بھگت کے طور پر اس کی تعریف کر رہا ہو۔ اور
مہمان صاحب اس کی تردید فرما رہے ہوں۔ لیکن بعض
اوقات آدمی اس طرح کے کام کے لئے بھی اپنے آپ کو
مجبور پاتا ہے۔ امید ہے عبدالحمید خاں صاحب اور
ان کی اہلیہ نے اس کا برا نہ مانا ہوگا کیونکہ میں نے
جو کچھ کیا وہ اپنی غلامی کا حق ادا کرنے کے لئے کیا۔
مجھے اچھا نہیں لگا کہ آقا کے ذکر خیر کی جگہ ان کے غلام کا
ذکر ہو اور اصل ذکر تشنہ رہ جائے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کے ذکر خیر کے لئے مولانا
خوشتر صاحب اپنے نائب مولانا فاروق قادری
صاحب کو نامزد فرما گئے تھے۔ وہ تقریر کے فن سے
تو خوب واقف تھے اور ماشاء اللہ بہت اچھا بولے
لیکن حضرت محبوب الٰہیؒ کے بارے میں شاید انھیں
مطالعے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ دراصل اس کی یہاں

ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ جس گھر میں حضرتؒ کی ولادت کا جشن منایا جارہا تھا اس کا ایک ایک فرد حضور سلطان جیؒ کی غلامی کا حلقہ اپنے کان میں پہنے ہوئے تھا۔ اور حضورؒ کے ذکر کا سبق اسے پہلے ہی سے یاد تھا۔

اللہ تعالیٰ عبدالحمید خاں نظامی صاحب اور ان کے سب گھر والوں کو جزائے خیر دے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا جشن ولادت منا کر انھوں نے مجھے بھی خوش کیا اور خود اپنے لئے بھی اجر کے ڈھیر لگالئے۔ کھانا بھی خوب مزیدار تھا اور پورے خاندان اور احباب کی شرکت نے محفل کے رنگ کو دوبالا کردیا تھا۔ حضرت قاضی صاحب قبلہ بھی اہل خانہ اور مریدوں کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ ہم سب کے لئے یہ شام چاند رات کی حیثیت رکھتی تھی لیکن آج کا چاند عجیب چاند تھا۔ اس کو چاند بھی کہیئے سورج بھی کہیئے۔ سردی میں دھوپ۔ گرمی میں چھاؤں۔ دکھ میں سکھ۔ سکھ میں دوامی آنند۔ روپ سروپ میں من موہن۔ بدایوں سے دلی اور دلی سے ڈربن تک ہی کیا، تصور کی آخری حدوں سے بھی پرے تک بس جادو ہی جادو جگانے والا! عید رویت ہلال کے دوسرے دن ہوتی ہے۔ مگر یہ عید تو چاند رات سے پہلے اماوسؔ کی کالی رین ہی سے منے لگی تھی ہندوستانی عورتیں اپنے ہاتھوں کو مہندی کے رنگ سے اس اندھیری رات ہی کو رنگ لیتی ہیں جو عید سے پہلے آتی ہے۔ حضرت حافظ شیرازی کا فرمانا بھی یہی ہے کہ پیر مغاں کی غلامی کا حلقہ میرے کان میں ازل کے دن سے ہے ؎

رشتۂ پیر مغانم ز ازل در گوش است!

پیرومرشد حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے بھی اس ارادت مند، مرید ہونے کی نیت سے آنے والے نوجوان (حضرت محبوب الٰہیؒ) کو اپنی محفل میں حاضر پایا تھا تو یہ شعر پڑھا تھا ؎

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

تمہاری جدائی کی آگ نے کتنے دلوں کو کباب کررکھا ہے اور تمہارے اشتیاق کے سیلاب سے کتنی جانیں بے جان ہیں۔ (بستیاں ویران ہیں)۔

ظاہر ہے جدائی اگر ہو تو ملنے کے بعد ہی ہوتی ہے۔ ویرانی آبادی کے بعد ہی آتی ہے یہ کہانی تو ازل کے دن ہی سے شروع ہوئی ہوگی۔ دنیا کا ظہور تو دوسرا ظہور تھا جب ہی تو درمیانی مدت کو فراق اور جدائی سے تعبیر کیا گیا۔ اور ازل کے ظہور اول سے قبل جو کچھ تھا اسے اماوس کی کالی رین مانیئے تو ہماری یہ عید بھی سچ پوچھیے انہی وقتوں سے من رہی ہے! جمعے کی خبر جمعرات ہی لاتی ہے۔ اور دھوم مچاتی آتی ہے۔ میاں عبدالحمید خاں نظامی تو راستے کے کسی مقام پر سواری باد بہاری کے انتظار میں ہار پھول اور ربل پان لے کر کھڑے ہوئے ہیں۔ اور ہم جیسے تماشائی درشن و دیدار کے ساتھ وار پھیر اور نچھاور کے امیدوار بھی بنے ہیں۔ کم ازکم میں نے تو آج کا کھانا اسی لطف کے ساتھ کھایا جس لطف سے کسی چندر مکھ پر سے اتارے کھانے کو کھایا جائے! فاتحہ کے وقت یہ کھانا اول اللہ تعالیٰ کی نذر ہوا تھا۔ پھر اس کا ثواب حضرت محبوب الٰہیؒ کو پہنچایا گیا تھا وہی محبوب الٰہیؒ جن کے بارے میں مجھ سے ناواقف وہ بے علم نے کہیں حضرت

لہ اماوس پوری طرح اندھیری رات کو کہتے ہیں۔ چاند رات سے پہلے والی رات ایسی ہی اندھیری رات ہوتی ہے۔

شاہ نیاز بے نیاز جیسے عارف کامل نے کہا تھا۔

بشکل و صورتِ انساں نمایاں ذاتِ الٰہیہ

سفر در سفر

میرے افریقہ کے سفر کی پہلی منزل ڈربن شہر تھا۔ ڈربن کے قیام کے دوران میں دوبار ایک اور شہر میریس پیٹرس برگ ہو آیا۔ اب تیسری بار پھر ڈربن ہی کو سفر کا ایک ٹھکانہ بنا کر دوسرے شہروں ہی کی طرف نہیں پڑوس کے ایک ملک "بوٹس وانا" BOTS WANA تک بھی جانا ہے۔ یہاں دور دراز کے سفر کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر تک ہوائی سروس کا بھی اعلےٰ انتظام ہے۔ اور بعض علاقوں میں ریلوے لائن بھی ہے۔ لیکن ان دونوں سے زیادہ مقبول ذریعہ موٹر اور بس کے ذریعے سڑک کے راستے سفر کا ہے۔ کیونکہ جنوبی افریقہ میں شاید سب ہی جگہ اعلےٰ معیار کی سڑکوں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے۔ باشندے اکثر و بیشتر خوش حال اور موٹر نشین ہیں۔ اور موٹریں بھی بہت سے لوگوں کے پاس ایسی اعلےٰ درجے کی ہیں کہ سفر روایتی نمونۂ سقر یعنی جہنم اور دوزخ کی بجائے نہایت راحت بخش تجربہ بن جاتا ہے۔ جن کے پاس اپنی موٹریں یا بہت اچھی موٹریں نہیں ہیں وہ بسوں میں سفر کرتے ہیں۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا جشن ولادت ماہ صفر کے آخری منگل اور بدھ کی درمیانی شب میں منایا گیا تھا۔ بدھ کے دن کا حال میں اپنی نوٹ بک میں لکھنا بھول گیا۔ روحانی نشہ جسمانی نشے کی طرح غافل کرنے والا نشہ نہیں ہوتا۔ اس بدھ کے دن کو تو مجھے پورے ہوش و حواس کے ساتھ گذارنا چاہئے تھا۔ لیکن جیسے جیسے سفر کی معروفیت بڑھتی رہی۔ ویسے ویسے یہ موقعہ بھی کم ہوتا رہا کہ سفر کی یادداشتوں اور تاثرات کو وقت کے وقت قلم بند کر لوں۔ چنانچہ اپنے سفر در سفر کے حال کو بھی کئی دن بعد نوٹ کیا اور یہ سفرنامہ تو آٹھ نو مہینے بعد لکھا جا رہا ہے۔ اس لئے اب کچھ یاد نہیں آتا کہ یہ دن کس طرح گذرا تھا۔ اللہ تعالےٰ اس دن کی خوشی دوبارہ عطا فرمائے تو پچھلی بھول کی کچھ تلافی ہو۔ بہر حال جمعرات کی صبح میں اپنے دو ہمراہیوں کے ساتھ ایک لمبے سفر کو نکلا۔ ایک ساتھی ڈربن کے خاص میزبان عبدالغنی صاحب تھے۔ دوسرے ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر عبدالخالق صاحب۔ یہ دونوں بھائی آپس میں ہم زلف بھی ہیں۔ یعنی دونوں کو بھائی عبدالمجید خاں نظامی صاحب کی دو بیٹیاں سارہ سلمہا اور فاطمہ سلمہا بیاہی ہوئی ہیں۔

لکثری اور ضرورت

اللہ تعالےٰ نے ہماری دنیا کو طرح طرح کی رنگارنگی مرحمت کی ہے۔ اسی رنگارنگی میں ایک رنگ یہ بھی ہے کہ ایک آدمی کے لئے جو چیز لکثری کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ دوسرے کے لئے بنیادی ضرورت ہے۔ ایک زمانہ تھا۔ اور زمانہ "تھا" کیا معنی اب بھی وہ زمانہ موجود ہے کہ غریب غرباء ہی نہیں مڈل کلاس کے بعض افراد کے لئے بھی ریفریجریٹر بنیادی ضرورت نہیں ہے۔ امیری کا ایک چونچلا اور لکثری ہے لیکن جیسے جیسے وقت گذر رہا ہے۔ مڈل کلاس اور غریبوں کے لئے بھی یہ لکثری بنیادی ضرورت بنتی جاتی ہے۔ معیار زندگی اونچا ہو رہا ہے۔ مہنگائی بڑھ رہی ہے سستی لیبر ناپید یا کم یاب ہے۔ کل اور پرسوں بلکہ ہفتے بھر، مہینے بھر اور بعض دفعہ اس سے بھی زیادہ مدت کے لئے کھانے پینے کے سامان کو محفوظ رکھنا ضروری ہو گیا ہے۔ یہی حال سواریوں کا بھی ہے۔ کچھ عرصے پہلے تک ہندوستان میں موٹریں اور کاریں بہت کم لوگوں کے پاس تھیں۔ اب بکثرت آدمی موٹر نشین ہیں۔ اور ان موٹر نشینوں میں بھی یہ دلچسپ درجہ بندی ہے کہ

ں لوگ دیسی کم قیمت موٹروں کو بھی لکژری
ھتے ہیں۔ بعض کی تیز رفتار اور مصروف زندگی
، غیر ملکی موٹروں یا پٹرول کم خرچ کرنے والی
ٹروں کی طلب گار ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے
، جاپانی موٹر بن بے حد مقبول ہیں۔ افریقہ میں
ہیں کسی قدر گھٹیا سمجھا جاتا ہے۔ شاید اسی لئے
ڑ عبدالخالق صاحب نے ایک شاندار جاپانی موٹر
ں بٹھانے کو شان کے خلاف سمجھا۔ ان کو کیا معلوم
مجھے ہندوستان میں اس سے بہت کم قیمت کی
ئی جاپانی موٹر بھی میسر نہیں ہے۔ میرے میزبان
ب سے میں آیا ہوں مجھے مرسیڈیز سے بھی زیادہ
ی ایک جرمن موٹر میں لئے پھرتے ہیں۔ اور اسی
، ذریعے مجھے دوسرے شہروں اور دوسرے
ب تک لے جانے کا پروگرام تھا مگر ایک روز
ناق سے ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کی جاپانی موٹر
ں بیٹھنے کے بعد میں نے اس کی بے حد تعریف کی
میزبانوں کے درمیان آنکھوں ہی آنکھوں میں
ر اشارے ہوئے جس کا صاف مطلب میں نے
ں سمجھا کہ جب مہمان کو گھٹیا موٹر پسند ہے تو
ں میں اسے بٹھاؤ! مقصد تو مہمان کو خوش کرنا
ر خوش رکھنا ہے!

بن کا ماموں ڈربن کا چچا } جنوبی افریقہ کا شاید سب سے
شہور اور سب سے بڑا شہر جو ہانس برگ
JOHANNES BURG ہے۔ ڈربن اور کیپ ٹاؤن
، ساتھ دنیا کے لوگ شاید سب سے زیادہ
ہانس برگ ہی سے واقف ہیں۔ ایک دلچسپ
ت یہ کہ جہاں جنوبی افریقہ کے شہروں کے بڑے
ے لمبے، پوری اے۔ بی۔ سی۔ ڈی ABCD
م کر دینے والے نام ہیں۔ اور ان کو چھوٹا اور مختصر
ی مخفف کر کے پکارنے کا رواج مجھے نظر نہیں آیا۔

وہاں ڈربن میں جس سے جو ہانس برگ کا نام سنا۔
"جو برگ"
سنا۔ یہ جو ہانس برگ کا مخفف تھا۔ یعنی شارٹ
فارم تھی۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ جنوبی افریقہ
والوں کو اپنا یہ سونے اور ہیروں کا شہر بے حد پیارا ہے
لکھنؤ اور رام پور کی خوش مذاقی اردو دانی اور
زبان دانی کی بڑی دھوم ہے۔ لیکن جب لکھنؤ والے
اپنے کسی پیارے کو اس کا اچھا خاصا نام بگاڑ کر
"لڈن" کی طرح کی کسی عرفیت سے اور رام پور
والے "پھُندن خان" جیسی عرفیت سے پکارتے
ہیں تو سچی بات یہ ہے کہ مجھے ناگوار محسوس ہوتا ہے۔
مگر جو ہانس برگ کا نام "جو برگ" خبر نہیں کیوں
ایسا لگا کہ بے اختیار پیار آئے!
ممکن ہے اس پیار اور پسند میں میرے اپنے
ذاتی بیک گراونڈ کو بھی کچھ دخل ہو۔ بچپن میں میں نے
دیکھا کہ میرے والد حضرت خواجہ حسن نظامی رح
جگت باوا جان ہیں۔ یعنی ہم تو اپنے باپ کو باپ ہونے
کی وجہ سے باوا جان کہتے ہیں لیکن ہمارے اطراف
دور دور تک ہر چھوٹی عمر کا آدمی انھیں باوا جان
کہہ کر یاد کرتا ہے۔ میری والدہ اسی طرح سارے جہان
کی "امّی جان" ہیں۔ اور ہمارے اکلوتے ماموں اور
شکاری ہیرو خواجہ سید ابن عربی نظامی ہمہ شما
ہر ایک کے ماموں جان ہیں۔۔ یہاں تک کہ میرے
بڑے بھائی خواجہ سید حسین نظامی مرحوم نے
دوسری جنگ عظیم کے دوران مدراس کے علاقے میں
ایک کارخانہ کھولا تو اس کے انگریز ملازمین جو
کیپٹن اور میجر اور کرنل تک کے رینک کے لوگ تھے
پہلے تو سید ابن عربی صاحب کو "ماموں جان" اور پھر
"انکل جو"
کہہ کر پکارتے تھے۔ مجھے ان غیر ملکیوں کا اپنے ماموں جان
کو "انکل جو" کہنا بہت اچھا لگتا تھا۔ پھر انگریزی

لٹریچر سے کچھ واقفیت ہوئی تو " انکل جو" کی عام مقبولیت کا کچھ اور حال کھلا ! گویا

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے !

والی بات اس طرح بھی سامنے آئی۔ ڈربن والوں کے منہ سے صبح شام " جو برگ" " جو برگ" کا وظیفہ سنا تو ایسا لگا کہ یہ شہر بھی ڈربن والوں کا ایسا ہی کوئی چچا اور ماموں ہے۔ جیسے میرے کراچی کے دور دراز بدبس میں بس جانے والے اکلوتے ماموں سید ابن عربی انکل جو ہیں ! انگریزی میں انکل ماموں اور چچا دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ میں نے اپنے اکلوتے مرحوم چچا کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ نانا نانی دادا دادی کی طرح میری پیدائش سے بہت پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ لے دے کر ایک ماموں ہی تھے اور اللہ انھیں سلامت رکھے ہیں ! جو ان سب قریبی رشتے داروں کی قائم مقامی کرتے ہیں۔ اور حسنِ اتفاق سے بڑے ماہر شکاری ہونے کی وجہ سے بچپن سے ہمارے ہیرو بھی بنے رہے ہیں۔ اس لئے " جو برگ" مجھے ڈربن کے نابیر بھائیوں اور پیر بہنوں ہی کا نہیں۔ ڈربن کے سارے باشندوں کا " انکل جو" اور خود شہر ڈربن کا چچا اور ماموں محسوس ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی کچھ اس طرح کی یگانگت بھی پائی کہ یہ شہر اور اس شہر کے رہنے والے سب اپنے ہی لوگ نہ ہوتے تو " انکل جو" مجھ میں اور ان میں مشترک کیوں ہوتا؟

جمعرات کو صبح ساڑھے آٹھ بجے ناشتے کے بعد ہی " انکل جو برگ" کی طرف سفر شروع ہوا۔

پیر لکڑ کا سلوک (سلوک تصوف کی ایک اصطلاح ہے۔ سلوک کے معنی راستہ چلنے کے ہیں)

اللہ کی راہ طے کرنا اہل تصوف کے نزدیک سلوک کہلاتا ہے۔ ڈربن سے جوہانس برگ کے سنہری شہر۔ الماسی شہر کا راستہ اور اس راستے سے گذرنا مجازی سلوک ہو یا حقیقی سلوک ! ایک دلچسپ تجربے کی حیثیت ضرور رکھتا ہے۔ سڑک اعلیٰ درجے کی ہے۔ کشادہ ہے اور ایک نئی بات۔ جو امریکہ میں بھی نہیں دیکھی تھی یہ نظر آئی کہ ایک گاڑی دوسری گاڑی سے ہر جگہ آگے نکلنے کی کوشش قانوناً نہیں کر سکتی۔ اور ٹریفک OVER TAKE کرنے کے لئے ہر تھوڑے فاصلے کے بعد کہیں کہیں سڑک کو چوڑا کر دیا گیا ہے اور شروع اور آخر میں بورڈ پر لکھ دیا گیا ہے کہ صرف اس جگہ ایک گاڑی دوسری گاڑی سے آگے نکلنے کی کوشش قانونی طور پر کر سکتی ہے۔ ہر جگہ نہیں ! نیز بڑے بڑے ٹرک اور سامان ڈھونے کی لمبی لمبی گاڑیاں جن پر پائپ لوہے کی سلاخیں۔ بھاری مشینری یا اسی طرح کا دوسروں کو نقصان پہنچا سکنے والا سامان لدا ہو تو وہ بے مہار منہ اٹھائے کہیں نہیں جا سکتیں۔ ان کے لئے غالباً خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ ایک پولیس کی گاڑی آگے چلتی ہے ایک پیچھے اور عام ٹریفک کو بار بار خبردار کیا جاتا ہے کہ سنبھل کر چلو خطرناک سامان جا رہا ہے ! اس سارے اہتمام کا اچھا نتیجہ اس طرح سامنے آتا ہے کہ مجھے اپنے طویل سفر میں کوئی سڑک کا حادثہ یا اس کے آثار شاذ و نادر ہی نظر آئے۔ حالانکہ اپنے ملک کی ہر ہائی وے پر درجنوں ایکسیڈنٹ روز نظر آتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنوبی افریقہ کے ٹریفک افسران اس سلوک کے لئے پیر لکڑ کی حیثیت رکھتے ہیں ! ——— میرے مرحوم استاذ تفسیر اور برصغیر ہند و پاک کے مشہور اہل قرآن عالم دین مولانا اسلم جیراج پوری سخت قسم کے وہابی ہونے کے باوجود پیروں کی تین قسمیں بتایا کرتے تھے۔

ایک پیر پتہ۔ دوسرے پیر پتھر۔ تیسرے پیر لکڑ۔
تفصل اس کی یوں بیان کرتے کہ کسی درخت کے پتے کو بہتے پانی میں ڈالو۔ اس پتے پر کوئی کنکر رکھو! تم دیکھوگے کہ پتے نے پلٹی کھائی۔ کنکر کو ڈبویا اور خود تیرتا رہا۔ یہ پیر پتہ ہیں۔ خود تیرتے رہتے ہیں مرید کا بیڑا غرق فرماتے ہیں۔ اب ایک پتھر لو۔ اس کے ساتھ کوئی چیز باندھو۔ پانی میں ڈال دو۔ پتھر بھی ڈوبے گا جو کچھ ساتھ بندھا ہوا تھا وہ بھی پانی کی تہہ میں پہنچ جائے گا۔ یہ پیر پتھر ہیں۔ اپنا بیڑا بھی غرق۔ مرید کا بیڑا بھی غرق! آخر میں ایک لکڑ لاؤ۔ اس سے کوئی چیز باندھو۔ پانی میں ڈالو۔ سبحان اللہ۔ لکڑ اور اس کے ساتھی دونوں کو تیرتا ہوا پاؤگے۔ یہ پیر لکڑ ہیں!

آدمی کو جنگل جانا منع ہے } جب سفر سینکڑوں کیا ہزار دو ہزار کیلو میٹر کا ہو تو راستے میں بڑے بڑے ویران علاقوں اور جنگلوں کا آنا لازمی ہوتا ہے۔ سو میرے اس سفر میں بھی ایسے علاقے آئے۔ مگر لطیفے کی بات یہ ہے کہ ان سنسان علاقوں میں بھی کسی آدمی کا جنگل جانا۔ یہاں کے رسم و رواج اور ایٹی کیٹ کے خلاف پایا گیا!

اگر کسی کی سمجھ میں اب بھی میری بات نہ آئی ہو تو ذرا اور وضاحت کر دوں۔ اردو کے دونوں ملکوں ہندوستان اور پاکستان میں جنگل جانا ایک خاص معنی رکھتا ہے۔ پاکستانی پنجاب میں تو ابھی حال حال تک اچھے اچھے باحیثیت اور تعلیم یافتہ گھرانوں تک میں بیت الخلاء بنانے اور رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ اب اس سلسلے میں اگر کچھ بہت بڑے بڑے نامور لوگوں کے نام گنا دوں تو شاید لوگ اپنے کان پکڑلیں یا مجھے علی الاعلان جھوٹا کہیں۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ ممبران اسمبلی اور کونسل کے گھروں میں بھی ۱۹۳۰ اور ۱۹۴۰ء کی دہائی تک ٹوائلٹ کم ہی ہوتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ گھر کی کھلی چھت اس کام کے لئے استعمال ہوتی اور صفائی کا کام موسم کی سختی کے حوالے کر دیا جاتا۔ حوائج ضروریہ کی تکمیل کے لئے سب آبادی سے باہر نکلتے اور جنگل جاتے! اس طریقے کے خصوصی فوائد تو انھیں لوگوں کو معلوم ہوں گے جو اس کے عادی رہے ہیں۔ لیکن بدرجۂ مجبوری جنگل جانا پورے برصغیر میں آج بھی رائج ہے۔ کسی ہائی وے پر ریلوے لائنیں کراس کرنے کے لئے پھاٹک لگا ہو تو اس کے دونوں طرف گشت کر کے دیکھ لیا جائے کہ کوئی جگہ نتائج ناشدنی و ناگفتنی سے خالی نہیں ملے گی۔ موٹروں اور بسوں کے مسافر آخر نیچر کی پکار پر کہاں جا کر حاضر جناب کہیں! ٹرین گذرنے کے لئے ہر موٹر اور بس کو پھاٹک پر رکنا ہی پڑتا ہے اور کون ہے جو ہستی کی اس فرصت کو غنیمت جان کر فائدہ نہیں اٹھاتا! شکر ہے اب کسی کسی پٹرول پمپ اور سروس اسٹیشن پر غسل خانے کا انتظام ہو گیا ہے۔ مگر بقول کسے کسے پڑی ہے جو جا کے روکے! ہماری بس یا تمہاری موٹر!

اللہ کا شکر ہے کہ راستے میں میں نے اپنی بپتا میزبانوں کو اس وقت سنا دی جب صورت حال خطرناکی سے بہت دور تھی۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف یہاں کے رسم و رواج اور ادب تہذیب سے واقف کرایا۔ بلکہ بے ضرورت ایک پٹرول پمپ پر گاڑی روک بھی لی۔ ٹوائلٹ اگرچہ صاف نہیں تھا مگر کام چل گیا! اس سے پہلے میں نماز کے لئے اپنے وضو کو سنبھال کر رکھے ہوئے تھا۔ مگر یہ سنبھال بھی ایک حد کے اندر ہی رہ سکتی تھی!

مویشی کا سڑک پر آنا بھی منع ہے } افریقہ کا کوئی اور نام مجوزہ: تجویز کرنا پڑے تو اسے چرندوں کا ملک

بھی کہا جا سکتا ہے۔ اللہ اکبر جانور سے جانور یہاں ہیں! انسانی آبادی کے علاقے میں پالتو مویشیوں اور جنگلوں میں وحشی چرندوں کی وہ کثرت ہے کہ کیا کہئے۔ ڈربن سے جو برگ تک کا علاقہ گھاس کے بڑے بڑے میدانوں کا مالک ہے۔ ہر میدان میں گھٹنوں گھٹنوں اونچی سوکھی یا ہری گھاس ہے۔ اور اس گھاس کا حق ادا کرنے والے ان گنت شا کا ہاری مویشی ہیں۔ نہایت صحت مند۔ نہایت باوقار اور نہایت مہذب : مہذب نہ ہوتے تو بھلا یہ ممکن تھا کہ وہ سڑک پر نہ آئیں۔ اور تیز رفتار سواریوں سے ارادہ بے ارادہ گلے نہ ملیں ؟ ہر چند کہ یہ بات بھی درست ہے کہ سینکڑوں میل نکل جائیے۔ کوئی جگہ ایسی نظر نہیں آئے گی جہاں سڑک کے کنارے آدمی اور مویشی کی حد فاصل تار اور باڑھ کی شکل میں موجود نہ ہو۔ لیکن ایسا بھی کیا کہ کوئی بھی البیلی چھبیلی گائے اتراتی اٹھلاتی غمزہ ترکانہ کے ساتھ اس نازک سے تار کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ یا کوئی مسٹر جان بل سانڈ بیل اپنے حرم پر رعب جمانے کے لئے اس تار یا اس کو قائم رکھنے والے چھوٹے سے کھمبے پر ٹینٹ پیگنگ TENT PEGGING کے پرانے کھیل کی مہارت ظاہر نہ کریں! واہ وا۔ یہاں کے جانور بھی عجیب، انسان بھی عجیب !

ان جانوروں کا دودھ یہاں کے گورے حاکم بھی پیتے رہے ہوں گے۔ محکوم کالے بھی اور ان دونوں کو اپنے سودوں کی چاٹ ڈالنے والے بیوپاری ہندوستانی بھی۔ پھر ان کے درمیان باہمی ٹکراؤ کیوں ہوتا ہے؟ ان میں سے ہر ایک کو اپنے ملک کی خصوصی روایات کا پاس ہونا چاہئے جب جانور ”حدِ ادب“ کے قائل ہوں تو ان کا دودھ پینے والے اور گوشت کھانے والے انسان حد سے باہر آخر کیوں نکلتے ہیں۔

انمول رتن حضرت صوفی عابد میاں ؒ

چند سو کلو میٹر چلنے کے بعد لیڈی اسمتھ نامی شہر آیا۔ مجھے اس شہر کو دیکھنے سے زیادہ اس کے ایک پرانے باسی کے مزار پر حاضر ہونے کی تمنا تھی۔ حضرت صوفی عابد میاں صاحب پچھلی صدی کے اواخر اور اس صدی کے شروع زمانے کے بزرگ تھے۔ والدی مرشدی حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے مخصوص حلقہ احباب میں شامل اور دین کا ایسا درد رکھنے والے کہ انھوں نے اف... ہی کو نہیں، پوری دنیا کو اپنی جولان گاہ بنایا اور ... کام اپنے ذمے لے لیا کہ دینی لٹریچر کو ہر زبان میں شائع کریں اور ضرورت مندوں تک پوری احتیا... اور پورے اہتمام کے ساتھ مفت پہنچائیں۔ احتیا... اور اہتمام سے مراد یہ ہے کہ فری تقسیم کیا جانے و... لٹریچر عام طور پر ناقدری کا شکار ہو جاتا ہے۔ غ... ہاتھوں میں پہنچتا ہے۔ اور کوئی اس سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھاتا۔ حضرت صوفی صاحب نے دنیا ... ہر حصے میں ایسے لوگ تلاش کر لئے تھے۔ جو کہ ... نہ کسی طرح دینی خدمت کے کام میں مصروف ہو... صوفی صاحب کا شائع کردہ فری لٹریچر ان ... حضرات کے پاس اس درخواست کے ساتھ پہنچ... تھا کہ بہت زیادہ ضرورت مند اور نادار لوگو... تک اسے پہنچا دیا جائے۔ ان کی طرف سے یہ ا... بھی ہوتا تھا کہ مذکورہ حضرات کی تصدیق کے سا... جو شخص بھی انھیں خط لکھے گا اس کو کسی علاقائی ... سے مفت کتابیں پہنچا دی جائیں گی۔ نماز کے مسا... کے سلسلے میں انھوں نے جو کتابیں تقسیم فرمائی... نہ ان کی کوئی گنتی ہے نہ ان لوگوں کی تعداد ... معلوم ہے جنھوں نے صوفی صاحب کے لٹریچر ... نماز پڑھنی سیکھی یا اپنی غلط نماز کو درست کر... حضرت نے اپنی ساری زندگی نہایت خاموشی ... ساتھ اس خدمت میں گزار دی۔ لیڈی اسمتھ ... انھوں نے ایک نہایت خوبصورت اور عالی ...

مسجد بھی تعمیر کرائی تھی۔ عبدالغنی صاحب اور ڈاکٹر عبدالخالق صاحب اس مسجد سے تو واقف تھے اور سیدھے وہیں لے گئے لیکن حضرت صوفی صاحب دفن کہاں ہیں۔ یہ ان کو معلوم نہیں تھا۔ لیکن ایسا آدمی اس بھول جانے والی دنیا میں بھلایا نہیں جاسکتا۔ بازار میں جاکر ایک راستہ چلتے آدمی سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ صوفی صاحب یہاں کے عام قبرستان میں عام مسلمانوں کے ساتھ ہی آرام فرما ہیں۔

اس اطلاع نے میرے دل میں صوفی صاحب کی عقیدت کو اور بڑھا دیا۔ قبرستان پہنچے تو صوفی صاحب کو دروازے کے قریب ہی ہمیشہ کی نیند سوتے دیکھا مگر اس عام قبرستان میں بھی ان کی قبر پر چھت تھی اطراف برآمدہ تھا۔ مزار پر چادر اور پھول تھے اور قبر پر قرآن خوانی بھی ہو رہی تھی۔ نہایت پرسکون ماحول اور راحت بخش کیفیت اس قبرستان میں تھی۔ قبرستان کی وحشت اور ہیبت کا کہیں نام تک نہ تھا۔ میں نے یہاں ظہر کی نماز پڑھی۔ یقین ہے حضرت صوفی صاحب فاتحہ خوانی کے ذریعے پہنچنے والے ثواب سے زیادہ اپنے پہلو میں کسی کو نماز پڑھتا دیکھ کر خوش ہوئے ہوں گے کہ یہ ان کے زندگی بھر کے ذوق شوق کے زندہ اور قایم رہنے کی ایک علامت تھی۔ جی تو چاہتا تھا کہ یہاں سے اٹھا ہی نہ جائے لیکن ابھی راستہ بہت باقی تھا۔

لیڈی اسمتھ کے قبرستان اہل اسلام کے قریب ہی ایک بہت اونچی مٹی اور پتھروں کی مصنوعی پہاڑی سی تھی۔ بتایا گیا کہ یہ علاقہ بھی ہیرے اور سونے کی کانوں کے لئے مشہور ہے۔ اور مٹی پتھروں کا ڈھیر کان سے نکلنے والے ملبے ہی کا ڈھیر ہے۔ سبحان اللہ پاک پروردگار کی ادائیں بھی کیسی پیاری ادائیں ہیں۔ گھٹیا ہیرے سونے کو کھدوا کھدوا کر نکلوا دیا کہ اصلی ہیرے اور قیمتی اور کھرے سونے کو اس جگہ دفن کیا جائے۔

سنا ہے دہلی میں انگریز بادشاہ نے دربار کیا اور سب راجہ نوابوں کو سرکاری ہدایت ہوئی کہ ہر راجہ اور ہر نواب اپنے زیورے قیمتی جواہرات پہن کر بادشاہ کے سامنے جائے تو سب نے اس ہدایت یا حکم کی تعمیل کی مگر نظام حیدرآباد میر محبوب علی مرحوم نے کوئی بھی زیور نہیں پہنا۔ اور جب وائسرائے نے شکایت کی تو انھوں نے اپنے نامی گرامی درباریوں اور مصاحبوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں اپنے جواہرات اور زیورات پہن کر نہیں آیا۔ ساتھ لایا ہوں۔ ان لوگوں کو دیکھ لیجئے۔ ان میں سے ہر ایک انمول رتن ہے!

حضرت صوفی صاحب جیسے انمول رتن نظام دکن کے انمول رتنوں سے کہیں زیادہ قیمتی تھے۔ اسی لئے اللہ میاں نے بہت قیمتی جگہ انھیں رکھوایا ہے!

اس قبرستان میں ہماری موجودگی کے دوران ہی ایک میت دفن کرنے کے لئے لائی گئی۔ جنازے کے ساتھ جو لوگ تھے۔ وہ تقریباً سب ہی لمبی لمبی ڈاڑھیاں رکھتے تھے اور نیچے نیچے کرتے پہنے ہوئے تھے۔ اور چہروں پر خاص قسم کا نور تھا۔

نیوکاسل لیڈی اسمتھ شہر کے بعد نیوکاسل نامی شہر آیا۔ ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کے ہاں کوئی بیٹا نہیں تھا انھوں نے ایک یتیم لڑکے کو گود لے لیا تھا۔ اب وہ بارہ تیرہ برس کا ہے اور نیوکاسل کے ایک دینی مدرسے میں پڑھتا ہے۔ ان کی ایک رشتے کی بھتیجی ہاجرہ بی بی شیخ اور ان کے شوہر محی الدین شیخ بھی یہاں رہتے ہیں۔ ان دونوں کو ہمارے آنے کی اطلاع تھی اور انھوں نے نہ صرف نہایت پر تکلف لنچ تیار کر رکھا تھا بلکہ مقامی مسجد کے امام اور خطیب صاحب اور بعض دوسرے

احباب کو بھی مدعو کیا تھا۔ انہی میں انور اسمٰعیل صاحب
نامی ایک صاحب بھی تھے جو عبدالمجید خاں نظامی صاحب
کی دوکان پر کام کیا کرتے تھے۔ اب انھوں نے نیوکاسل
میں اپنی الگ دوکان کھول لی ہے۔ حضرت خواجہ
حسن نظامیؒ کے غائبانہ عاشق ہیں۔ اپنی دوکان
پر لے جاکر خواجہ صاحب کی تصویر دیوار پر آویزاں
دکھائی اور کہا کہ روز دوکان کھولنے کے بعد میں اس
تصویر کو کچھ دیر دیکھتا ہوں۔ پھر کام شروع کرتا
ہوں۔

اسمٰعیل صاحب نے تصویر دیکھنے کا کام
عقیدت اور محبت سے شروع کیا ہے اس لئے
میں نے انھیں پہلی ہی ملاقات میں ٹوکنا مناسب
نہیں سمجھا مگر اب اس سفرنامے کے ذریعے بتانا چاہتا ہوں
کہ حضرت خواجہ صاحب نے ایک زمانے تک
اپنی کسی تصویر کو عام نہیں ہونے دیا کہ عقیدت مند
اس کا ایسا احترام شروع نہ کر دیں جو شرعاً درست
نہ ہو اور پھر تصویر چھپوائی تو اس کے نیچے یہ عبارت
لکھی کہ تصویر کی تعظیم حرام ہے۔ اسمٰعیل صاحب بھی
اگر خواجہ صاحب کے بتائے ہوئے اسلامی طریقے
پر چلیں اور تصویر کو دیکھنے کی جگہ مراقبے میں ان کا
دھیان جمائیں تو زیادہ اچھا ہو۔

نیوکاسل کی مسجد کے امام صاحب نوجوان
ہیں اور بڑی محبت کے آدمی ہیں۔ ان سے مل کر
جی خوش ہوا۔ اور شیخ صاحب اور ان کی بیگم کی
مہمان نوازی نے بڑا متاثر کیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں
شاد آباد رکھے۔

پری ٹوریا اور سویٹو

جنوبی افریقہ کی جمہوری حکومت کی راجدھانی
پری ٹوریا ہے۔ لیکن یہ کوئی بڑی آبادی کا شہر نہیں
ہے۔ اور بہت اچھا ہے کہ بڑی آبادی کا شہر نہیں
ہے۔ ورنہ حکومت کرنے والے آبادی کی کثرت
اور مسائل سے ایسے حواس باختہ ہوتے کہ ہندوستان
پیارے کے حاکموں کی طرح راج کرنا ہی بھول جاتے۔
اب وہ امن چین اور سکون کے ماحول میں رہتے ہیں
اور بہترین طریقے سے ملک کا نظام چلاتے ہیں۔

ہم لوگ پری ٹوریا کو بائی پاس کرتے ہوئے آگے
بڑھ گئے۔ دن کو دھوپ کی وجہ سے موٹر گرم رہی۔
مگر غنی میاں گاڑی کا ایرکنڈیشن کھول کر ہمیں ٹھنڈا
رکھتے رہے اور شیشے ہوا اور خاک مٹی سے بچانے
کے لئے بند رکھے۔ اس طرح آدمی لمبے سفر میں بھی تھکتا
نہیں۔ جیسے جیسے شام قریب آئی۔ سردی بھی بڑھی۔
سڑک صاف شفاف تھی۔ موٹر اعلیٰ درجے
کی۔ چلانے والے دونوں بھائی ماہر ڈرائیور۔
ہر مسافر کے پہلو میں خشک و تر میووں اور
طرح طرح کے بسکٹوں کا ڈھیر۔ اور کیا چاہئے تھا۔
نیوکاسل سے ڈاکٹر صاحب کے متبنیٰ صاحبزادے
بھی ساتھ ہو گئے تھے۔ اردو نہیں جانتے۔

مغرب کے بعد ہم لوگ انکل جوبرگ کے
مضافات میں پہنچے۔ سارے دن سفر کرنے کے باوجود
اس طرح کی تکان نہیں تھی جیسی تکان ہندوستان
میں دن بھر کے سفر کے بعد ہوتی ہے۔

جوبرگ میں سب سے پہلے سویٹو کی کالی
بستی آئی۔ جہاں رات دن ہنگامے ہوتے رہتے ہیں
اور خبریں ساری دنیا کے اخباروں میں چھپتی ہیں۔ یہ
بستی کیا ہے پورا ایک شہر ہے۔ لیکن ہم لوگ جن جن
سڑکوں پر سے گزرے وہاں بڑا اور شاندار مکان
کوئی نظر نہیں آیا۔ چھوٹے چھوٹے سائبان پوش
مکان زیادہ تھے۔ مگر صفائی ستھرائی یہاں بھی
دکھائی دی۔

ہم نے اصل شہر یعنی ڈاؤن ٹاؤن کو ایک
جانب چھوڑ دیا اور لینشیا نامی ٹاؤن کی طرف
نکل گئے۔ اس کو جوبرگ کے مضافات میں شمار

کیا جاتا ہے۔ مگر آبادی اتنی زیادہ ہے۔ اور نئی پرانی بستیاں شہر سے اس طرح آملی ہیں کہ اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اصل جو برگ کہاں ختم ہوا اور پڑوس کے چھوٹے قصبے کہاں سے شروع ہوگئے۔ خود لینشیا کی آبادی کسی بہت بڑے شہر جیسی ہے۔ خاصا اندھیرا ہوجانے کے بعد ہم قیام گاہ پہنچ سکے۔ یہاں میاں عبدالغنی کی فرم سرتاج کمپنی کی کئی دوکانیں ہیں اور انھوں نے ہر دوکان کو اپنے ایک بہن بہنوئی یا کسی اور قریبی رشتے دار کے سپرد کر رکھا ہے۔ ایسا صلۂ رحمی اور یہ کنبہ پروری بھی فی زمانہ کمیاب ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ کم یاب یہ بات کہ وہ عزیز اور رشتے دار جن کے سپرد دوکانوں کو کیا گیا ہے۔ دوکانوں کو محنت اور تن دہی سے چلاتے ہوں۔

عشاء کی نماز ہم نے محلے کی مسجد میں پڑھی۔ نئی تعمیر آراستہ پیراستہ مسجد ہے۔ وضو خانہ حسب معمول بہت اچھا۔ پوری مسجد میں قالین کا فرش۔ دیواروں سے لگی کچھ کرسیاں بھی جن پر بوڑھے اور ایسے نمازی بیٹھ کر نماز پڑھ سکیں جو گھٹنوں سے معذور ہونے کی بنا پر رکوع اور سجدہ نہیں کرسکتے یہ مسجد تبلیغی جماعت کا مرکز ہے۔

ہم لوگ غنی میاں اور خالق میاں کے ایک بہن بہنوئی کے ہاں رات کو ٹھیرے۔ صاحب خانہ نے اپنا خاص بیڈ روم میرے حوالے کیا۔ خود یقیناً تکلیف اٹھائی ہوگی۔ رات کو کھانا بھی نہایت پر تکلف کھلایا۔ دوسرے دن صبح سویرے چائے اور پھر بہت جلدی شاندار اور بھرپور ناشتہ ملا۔ اور اوّل وقت اس شہر کی طرف روانگی ہوئی جس کا نام بہت ہی لمبا ہے یعنی

BRONKHORSTSPRUIT

اس شہر میں بھائی عبدالمجید خاں نظامی مرحوم کی سب سے بڑی صاحبزادی رشیدہ بی بی اور داماد ڈاکٹر عبدالعزیز کریم رہتے ہیں۔ چھوٹا سا بے حد صاف ستھرا اور خوبصورت شہر ہے۔ پھلوں کے باغیچے ہر مکان کے ساتھ ہیں۔ مسلمانوں کے گھر گنتی کے دس بارہ ہیں۔ مگر سب ایک خاندان کی طرح رہتے ہیں۔ یہاں کے مسلمان باشندوں کو اپنی مختصر آبادی پر کسی قدر ملال تھا۔ مگر میں نے انھیں مبارکباد دی کہ اس مختصر آبادی کو اللہ کی ایک نعمت سمجھیے۔ جس دن آبادی زیادہ ہوئی آپ کے درمیان اختلافات بھی خدانخواستہ زیادہ ہوجائیں گے۔ اب تو آپ ایک خاندان کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔

یہاں جمعے کی نماز بھی ہوتی ہے حالانکہ آبادی اس کی متقاضی نہیں ہے۔ فی الحال جمعہ ایک بڑے گیراج کے سائبان میں پڑھا جاتا ہے۔ مگر ڈاکٹر عبدالعزیز کریم اپنے مطب کی پشت پر مسجد بھی تعمیر کرا رہے ہیں۔ مزدور، انجینئر سب عیسائی ہیں مگر خاص ذوق و شوق سے اللہ کا یہ گھر بنا رہے ہیں۔ یہ نعمت بھی کم آبادی کی وجہ سے اس بستی کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہاں کے ہر طبقے میں مقبول اور محبوب ہیں۔ انھوں نے مسجد کے انجینئر، کنٹریکٹر سے ملایا تو انھوں نے بڑی گرمجوشی سے ملاقات کی۔ جمعے کی نماز سے پہلے میری تقریر بھی کرائی گئی اور اس کے بعد اکثر نمازی ڈاکٹر صاحب کے ہاں کھانے کی میز پر جمع ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کی چار صاحبزادیاں ممتاز بانو۔ ارشاد بانو۔ بلقیس بانو اور مریم بانو نامی ہیں۔ ان سب نے کھانے کا بہت عمدہ انتظام کیا تھا۔ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد سب مل کر بیٹھے اور دنیا زمانے کی باتیں ہوئیں۔ گھر والوں اور پڑوسیوں سب کا بے حد اصرار تھا کہ میں ایک دو روز یہاں قیام کروں لیکن پروگرام ایسا بنا ہوا ہے کہ شام تک پھر جوہرگ پہنچنا ہے اور کل صبح ایک دوسرے ملک بوٹس وانا روانہ ہونا ہے۔

ڈاکٹر عبدالعزیز کریم صاحب کے ہاں کھانے کے بعد گفتگو کی جو نشست رہی اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگ شریک تھے کیونکہ اس شہر کی آبادی ہی بے حد مختصر ہے۔ ان لوگوں نے ہر طرح کے دلچسپ سوال کئے۔ اور غالباً جوابات کو بھی غیر دلچسپ نہیں پایا۔ اسی لئے بڑی شدت سے اصرار کیا کہ میں اپنے قیام کی مدت بڑھا دوں تاکہ رات کو سب کی فرصت کے وقت دیر تک باتیں ہوں۔ انشاء اللہ آئندہ کبھی افریقہ آنا ہوا تو اس کام کے لئے بھی وقت نکالا جائے گا۔

پھر جو برگ } شام کو مغرب سے ذرا پہلے ہم لوگ پھر "جو برگ" پہنچ گئے۔ اور غنی میاں کی بہن عائشہ بی بی اور بہنوئی غلام شہاب الدین صاحب کے ہاں قیام رہا۔ رات کو کھانے کی دعوت غنی میاں کے دوسرے بہن بہنوئی کے ہاں تھی۔ وہاں دوسرے احباب سے بھی ملاقات ہوئی۔ میرے میزبان دو روز سے مسلسل رات دن موٹر چلا رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ تھک کر چور ہو گئے ہوں گے لیکن ہمت اور مستعدی کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے سب گھر والوں کے ساتھ آدھی رات سے زیادہ دیر تک درود شریف کا حلقہ کیا اور پھر صبح سویرے اُٹھ بیٹھے البتہ میں اتنی ہمت فراہم نہیں کر سکا اور رات بھر سویا۔

جمال ہم نشیں } دوسرے دن بوٹس وانا کی طرف روانہ ہوتے وقت جو برگ کو ذرا تفصیل سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ہیرے اور سونے کی کانوں سے کھودی گئی مٹی نے ہر طرف چھوٹی بڑی پہاڑیاں سی بنا رکھی ہے۔ ابتدا، میں جب سونا بہت زیادہ تھا سونے کے ذرات مٹی میں چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ اب دوبارہ مٹی کے ان ڈھیروں کی چھان پھٹک ہو رہی ہے اور سونے کو چُنا جا رہا ہے۔ سونے کے ساتھ رہنے والی مٹی بھی تقریباً سنہری رنگ کی ہے۔۔ یعنی جمال ہم نشیں کی کارفرمائیاں صرف خوشبو کی حد تک نہیں ہوتیں۔ رنگ بھی پڑوسی کو رنگ لیتا ہے۔ اور صوفیہ میں تو یہ تک کہا جاتا ہے کہ ؎

"یار کی صورت مری صورت ہوئی"

(باقی آئندہ)

بقیہ ص ۲۶

فرمایش کر کے "مفتاح الخزاین" لکھوائی۔

حضرت شاہ دوست محمد علیہ الرحمہ کی وفات (۱۳ر ذی قعدہ ۱۱۲۹ھ / ۲۷ر اکتوبر ۱۸۱۳ء روز جمعہ) کے بعد براہی سے موضع کھائی کھیڑا چلے گئے تھے۔ وہاں بھی حضرت شاہ عبدالہادیؒ کا مزار مبارک ہے جس میں اُن کا جسدِ مبارک بطور امانت رکھا گیا تھا، اسی احاطے میں بقیہ زندگی گذاری وہیں انتقال ہوا اور اسی جگہ مدفون ہیں۔ رحمہ اللہ۔

مُنادیاً یُنادی لِلایمان

بارگاہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ سے
ایمان اور امن کی ندا دینے والا
اور اُن کے جانشین
امام المشائخ شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی یادگار

منادی ۱۹۲۶ء سے جاری ہے یہ انہترویں جلد (۱۹۹۴ء) کا پانچواں شمارہ ہے

مدیر
خواجہ حسن ثانی نظامی
معاونِ مدیر
خواجہ مہدی نظامی

درگاہ شریف اور منادی کے بارے میں خط و کتابت کرنے اور قیمت جمع کرانے کا پتہ
خواجہ حسن ثانی نظامی
ڈاکخانہ حضرت نظام الدین اولیاء
نئی دھلی ۱۳-۱۱

سالانہ قیمت
ہندوستان میں
پچاس روپے
غیر ممالک سے
دس ڈالر
فی پرچہ
پانچ روپے

فہرست

ناظرین کو حج مبارک ... حج کی عید مبارک

معارف فوائد الفواد

اکل حرام کے ساتھ عبادت کا غلبہ کیوں؟
ایک شیطانی فتنہ پر شیخ علیہ الرحمہ کی گرفت

مولانا سید اخلاق حسین قاسمی

حضرت شیخ علیہ الرحمہ اکل حلال اور اکل حرام کے درمیان ایک حکایت کے حوالہ سے بڑا عجیب وغریب فرق بیان کرتے ہیں۔ حدیث پاک میں اکل حرام کے اثرات کے بارے میں کہا گیا ہے۔

(۱) حضرت ابوبکر صدیق روایت کرتے ہیں۔

لا یدخل الجنة جسد غذی بالحرام ۔

(مشکوۃ صـ۲۴۳ بحوالہ بیہقی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ وہ جسم جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کو حرام غذاء کھلائی گئی ہو۔

(۲) حضرت عبداللہ ابن عمر فرماتے ہیں۔

من اشتدی ثوبا بعشرۃ دراھم وفیہ درھم حرام لم یقبل اللہ لہ صلوۃ مادام علیہ ثم ادخل اصبعیہ فی اذنیہ وقال صمتا ان لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سمعتہ یقولہ

(بحوالہ احمد)

حضور نے ارشاد فرمایا ـــــ جس شخص نے دس درہم کا ایک کپڑا خریدا جن میں ایک درہم حرام کا تھا تو جب تک یہ کپڑا اس کے جسم پر رہے گا اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرے گا ـــــ حضرت ابن عمر رضی نے پھر اپنے کانوں میں انگلیاں ڈالیں اور فرمایا، میرے یہ دونوں کان بہرے ہو جائیں اگر میں نے یہ ارشاد حضورؐ سے نہ سنا ہو۔

علماء کرام نے لکھا ہے کہ ایسی نماز جو حرام سے حاصل کئے ہوئے کپڑوں میں ادا کی جائے وہ قانونی اعتبار سے تو ادا ہو جائے گی لیکن عنداللہ قبول نہیں ہوگی یعنی اس کا ثواب نہیں ملے گا، ـــــ کیونکہ فقہ میں حلال کپڑوں کی شرط نہیں ہے ـــــ پاک کپڑوں کی شرط ہے۔

ان ارشادات نبویؐ سے معلوم ہوا کہ کسب حرام اور وہ پیسے جو شرعاً ناجائز ہیں یا جو کمائی جھوٹ اور دھوکہ دینے کی وجہ سے ناجائز ہو جاتی ہے اس سے پرورش پانے والا جسم گندہ اور تاریک ہے ـــــ وہ جنت جیسے پاکیزہ اور نورانی مقام میں داخل ہونے کے قابل نہیں ہے ـــــ اس جسم سے ادا کی جانے والی عبادت اخلاص اور رضاء الٰہی کے جذبے سے معمور نہیں ہو سکتی۔

پاکیزہ جسم میں پاکیزہ جذبات پیدا ہوتے ہیں گندے جسم میں گندے خیالات جنم لیتے ہیں۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا۔

اَلاَ وَاِنَّ فی الجسد مُضْغَۃً اذا صَلُحَتْ صَلُحَ الجَسَدُ کلّہٗ واذا فَسَدَتْ فسدت الجسد کلہ۔ اَلاَ وَھِیَ القلب (متفق علیہ مشکوۃ صـ۲۴)

خبردار رہو! جسم کے اندر گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جب وہ ٹھیک رہتا ہے تو سارا جسم ٹھیک رہتا ہے اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے

خبردار ! وہ قلب ہے ۔

یہ حدیث ایک تمثیل ہے ، شریعت کی اصطلاح میں قلب (دل) اور صدر (سینہ) سے باطنی قوت مراد ہے ، ـــ دو قوتوں کا نام انسان ہے ۔ ایک جسمانی قوت ، دوسری باطنی قوت ـــ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مثال دے کر بتاتے ہیں کہ اگر گوشت والا دل بیمار ہوجائے تو سارا جسم بیمار ہوجاتا ہے ـــ اسی طرح اگر انسان کی اندرونی قوت ، اس کا ارادہ ، اس کے جذبات بگڑ جاتے ہیں تو سارے جسم کے اعمال بگڑ جاتے ہیں ـــ

باطنی خیالات کی پاکیزگی ایک پاکیزہ جسم سے تعلق رکھتی ہے اور پاکیزہ جسم پاکیزہ غذاؤں سے تعلق رکھتا ہے ۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ناجائز کمائی کھانے والا انسان ایک بڑا عبادت گذار کیسے ہوسکتا ہے ـــ ؟

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شرابی ، جواری ڈھنڈاری روزہ نماز کی معمول کے مطابق عبادت گذاری کرتا ہے حالانکہ اس کے پیٹ میں لقمۂ حرام جا رہا ہے ، اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ لیکن ایسا شخص عبادت گذاری میں ولی نظر آئے ۔ ؟ ـــ یہ کیسے ہوسکتا ہے ۔ ؟

قرآن کہتا ہے ۔

ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر (عنکبوت ۴۵) نماز بے شرمی کے کاموں اور گناہوں سے روکتی ہے ۔

اور ایک شخص لقمۂ حرام میں مبتلا ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی ایک بڑا عبادت گذار بھی ہے ـــ یہ کیسے ہوا ۔ ؟

شیخ فرماتے ہیں کہ ایک نوجوان شخص حضرت ابراہیم ابن ادہم بلخی کا مرید ہوا اور پھر عبادت گذاری میں اس نے نہایت بلند مقام حاصل کرلیا ، حضرت ابراہیمؒ کو اس کی عبادت گذاری پر بڑا رشک ہوا کہ وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگے کہ میں تارک دنیا ہو کر بھی عبادت کے اس بلند مقام پر نہ پہنچ سکا ۔

بعدازاں بنور ضمیر روشن خود معلوم کرد کہ آں ہمہ شیطانی است آں جواں ہمہ لقمہ ناوجہ مے خورد و شیطان اورا براں طاعت مے داشت ـــ یعنی حضرت ابراہیم کو اپنے روشن ضمیر کے ذریعہ معلوم ہوا کہ یہ سب شیطان کی کارستانی ہے ، وہ نوجوان ناجائز کمائی کھاتا ہے اور شیطان نے اس برائی کی طرف سے غافل رکھنے کے لئے اسے نماز روزہ اور ذکر الٰہی کی طرف لگادیا ہے ، تاکہ وہ اس فعل حرام کی طرف متوجہ نہ ہو ۔

حضرت ابراہیم نے اس کا عملی علاج تجویز کیا اور اسے ہدایت کی کہ تم آج سے میرے ساتھ کھانا کھایا کرو ۔ اسے اس فعل پر زبانی تنبیہ نہیں کی ۔

ابراہیم ابن ادہم لکڑیاں فروخت کرکے گذربسر کرتے تھے ، اس نوجوان نے اپنے پیر کے ساتھ کھانا شروع کردیا ۔

آں غلبۂ طاعت بے اصل او فرونشست ، باندک عبادت باز آمد ، چنانکہ نماز فرض بحیلہ گذاردن گرفت تاکار آں جواں ساختہ شد و بصدق آمد ۔

(جلد اول مجلس ۳۴ ص ۳۱۴)

اب اس نوجوان کی بے اصل عبادت کا غلبہ ختم ہوگیا ، فرض نمازوں میں بھی سستی پیدا ہونے لگی ـــ پھر وہ اصلی حالت پر لوٹ آیا اور اس کے اندر سچائی پیدا ہوگئی ـــ

پھر شیخ علیہ الرحمہ نے شیخ کامل کی تربیت کی اہمیت کے بارے میں فرمایا ۔

ایں سر کہ سرِ ہمہ سعادتہاست بیروں داد و گفت شیخ برائے ایں کار مے باید ـــ بعدازاں ہمہ ایں معنی ایں قائمہ فرمود کہ طاعت اندک باشد گو صدق بسیار مے باید !

یہ بنیادی بات تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے کہ شیخ طریقت کی تربیت کا مقصد یہ ہے کہ وہ نفس کی کمزوریوں پر نظر رکھتا ہے اور نفسانیت کے شیطانی مکر وفریب کی باریکیاں سمجھتا ہے اور طالب و مرید کو ان سے بچاتا ہے اور اسے مقام اخلاص پر پہنچا دیتا ہے ـــــ پھر فرمایا۔

” اطاعت و عبادت تھوڑی ہو مگر اخلاص کے ساتھ ہو “

شیخ علیہ الرحمہ کی بیان کردہ حکایت میں چند باتیں قابل تشریح ہیں۔

(۱) قرآن کریم میں شیطان (سرکش ہستی) کا اطلاق شر و فساد برپا کرنے والے گمراہ جنات اور مفسد انسان دونوں پر کیا گیا ہے، گمراہ جنات برے وسوسے اور گندے خیالات دل میں ڈال کر حق سے گمراہ کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ نے انہیں وسوسہ اندازی کی قوت دی ہے ـــــ اور یہ خدا تعالیٰ کے نظام آزمائش کی مصلحت ہے ـــــ جس پر زبان کھولنا خدا تعالیٰ کی شان کبریائی میں سوء ادب ہے۔

گمراہ انسان غلط رہنمائی اور گمراہ کن مشوروں کے ذریعہ انسان کو صحیح راہ سے بھٹکاتے ہیں۔

(۲) شریعت ایک مرتب اور مربوط قانون حیات ہے، جس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد بڑی ترتیب سے نافذ کئے گئے ہیں۔

اگر ایک شخص اپنی پسند اور اپنے ذوق سے اس ترتیب کے خلاف چلتا ہے تو وہ شریعت کا مجرم ہے۔

مثال کے طور پر یہ سمجھئے کہ ہر مسلمان پر خدا کی عبادت کے لئے پانچ وقت کی نماز فرض ہے اور اس کے اوقات متعین ہیں اور اسی کے ساتھ اہل وعیال کی پرورش کے لئے معاشی جدوجہد، تجارت، حرفت اور زراعت کی ذمہ داری اس کے اوپر عائد کی گئی ہے۔

اب اگر ایک شخص محنت مزدوری کے اوقات میں نوافل گذاری شروع کر دے اور کسب حلال کے لئے ہاتھ پیر ہلانے کے بجائے ذکر الٰہی میں مشغول رہے تو شریعت اسے گناہ گار قرار دے گی۔

مولانا رومی رح فرماتے ہیں ؎

گفت پیغمبرؐ کہ بر رزق اے فتا
در فرو بست ست و بر در قفلہا
عالم اسباب ور نقے بے سبب
مے نیاید پس مہم باشد طلب

پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ رزق و روزی تالوں کے اندر بند ہے اور یہ عالم اسباب ہے، یہ بے سبب و بے محنت کے کامیابی سے ہم کنار نہیں کرتا۔

حضرت عمر فاروق رضؓ نے ایک نوجوان کو شب بیداری کے لیے کثرت سے مسجد نبوی میں آتے جاتے دیکھا ـــ آپ نے ایک روز اسے ٹوک دیا اور فرمایا۔ تم اتنی شب بیداری کے ساتھ ماں باپ اور بیوی بچوں کی کفالت کے لئے محنت مزدوری کس طرح کرتے ہو ؟

اس نوجوان نے کہا، امیر المومنین! مجھ پر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد خوف آخرت کا غلبہ ہو گیا ہے۔

قرآن کریم نے دو چیزوں کو عذاب الٰہی سے ڈھال قرار دیا ہے ـــ ایک رسول پاکؐ کی ہستی کو اور دوسرے توبہ و استغفار کو (سورہ انفعال) حضورؐ وصال فرماگئے۔ اب ایک توبہ و استغفار رہ گیا ہے، جس میں میں نے اپنے آپ کو مشغول کر دیا ہے۔

روایت اسی قدر ہے۔ لیکن امیر المومنین عمرؓ نے اس نوجوان کی خلش اور اس کے اضطراب کو دور کرنے کے لیے ضرور کسب حلال کی روحانی اور اخروی برکتوں کی طرف متوجہ کیا ہوگا ـــــ صرف ایک ہی ارشاد گرامی رسول پاکؐ کا اس بارے میں کافی ہے ـــــ فرمایا

نعم العون علی التقویٰ المال (کنز العمال)

پرہیزگاری کا بہترین معاون و مددگار مال و دولت ہے۔

(۳) شیاطین الانس اور شیاطین الجن دونوں شریعت

باقی صہ ۹ پر

آفتاب طریقت حضرت سید مہر علی شاہؒ

از :۔ الحاج ڈاکٹر سید نسیم بخاری کلیمی۔ فریدی۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ایم۔ڈی
سجادہ نشین حضرت سید جلال الدین بخاریؒ

حضرت سید مہر علی شاہ ۱۸۵۹ء میں راولپنڈی سے گیارہ میل کے فاصلہ پر قلعہ گولڑہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حضرت سید نذر شاہ کو آپ کی ولادت کی خوش خبری ایک مجذوب نے دی تھی۔ مجذوب نامعلوم علاقہ سے آیا تھا۔ اور سید مہر علی شاہ کی ولادت کے فوراً بعد آپ کی زیارت کرکے وہاں سے ایسا غائب ہوا کہ اس کا کسی کو پتہ نہ چل سکا۔

سید نذر علی شاہ فرماتے ہیں کہ جب مہر علی میرے صلب میں تھے تو مجھ پر اس قدر بیقراری طاری ہوا کرتی تھی کہ چین کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ میں ساری رات عبادت میں گذار دیتا۔ پورے قصبہ میں جتنی مساجد تھیں ان میں پانی بھر دیا کرتا تھا مگر سکون تھا کہ میرے دل سے اور دماغ سے کوسوں دور تھا۔ نوافل کی کوئی تعداد نہ تھی اور روزوں کا شمار ہی نہ تھا۔ بس عشق الٰہی کی ایک حدت تھی۔ جو نذر شاہ کو اندر ہی اندر جلا رہی تھی۔ اور یہ خدا کا عاشق اس کی طلب میں جان کو جان آفریں کے سپرد کرنے کو بے قرار تھا۔

سید مہر علی شاہؒ نے چار سال کی عمر میں ابتدائی تعلیم کا آغاز کیا۔ آپ کو عربی، فارسی صرف اور نحو کی تعلیم ہزارے کے ایک عالم مولینا غلام محی الدین صاحب نے دی تھی۔ کافیہ بھی شاہ صاحب نے مولینا غلام محی الدین صاحب سے پڑھی۔ شاہ صاحب کا حافظہ ایسا تھا کہ جو پارہ ایک روز پڑھتے اگلے روز ازبر ہوتا۔ اسی طرح آپ نے قرآن مجید بہت جلد حفظ فرما لیا۔

ایک مرتبہ مولینا غلام محی الدین صاحب نے آپ کی پیدائشی ولایت کو آزمانا چاہا۔ اور ایک ایسی کتاب جس کی کچھ عبارت کرم خوردہ تھی اس کو پڑھانا اور اس کے متعلق اندازہ لگانا عام آدمی کے لئے مشکل تھا۔ سید مہر علی شاہ کو دی اور کہا ”اگلے روز کتاب کے یہ کرم خوردہ صفحات ازبر ہونے چاہئیں ورنہ سخت سزا ملے گی“۔ شاہ صاحب نے اگلے روز وہ صفحات مولینا کو زبانی سنا دیئے۔ مولینا حیران تو ہوئے۔ مگر تصدیق کے لئے ان کو راولپنڈی جانا پڑا وہاں کتاب کے اصل اور صحیح نسخہ سے کرم خوردہ عبارت کے متعلق پڑھا اور انگشت بدنداں رہ گئے۔ کہ عبارت بالکل وہی تھی جو سید مہر علی شاہؒ نے سنائی تھی۔

اس دن کے بعد مولینا غلام محی الدین صاحب نے پیر مہر علی شاہ صاحبؒ کو تعلیم دینے سے معذرت کرتے ہوئے کہا، "عرش کی طرف پرواز کرنے والے شاہین کو معمولی سا آدمی کیا تعلیم دے سکتا ہے۔"

پیر مہر علی شاہؒ نے مولینا محمد شفیع قریشی صاحب کی درسگاہ سے منطق و نحو کی تعلیم حاصل کی۔ آپ عموماً روزے سے رہا کرتے تھے۔ اور اپنے گھر سے جو خرچ ملتا وہ آپ نادار ساتھیوں میں تقسیم کر دیا کرتے۔

ایک دفعہ قصیدہ غوثیہ کے ایک عامل۔ مولینا سلطان محمود کے درس میں تشریف لائے۔ تمام طلبا ان کی تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے مگر مہر علی شاہؒ بیٹھے رہے۔ یہ دیکھ کر عامل قصیدہ غوثیہ کو سخت غصہ آیا۔ اور مہر علی شاہؒ کو مخاطب ہو کر بولے۔ پڑھوں یا قصیدہ غوثیہ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوتے ہو۔

جواباً مہر علی شاہ بولے۔ "تم قصیدہ پڑھو اور میں قصیدے والے کو بلاتا ہوں"۔ یہ سن کر عامل کو غش آ گیا۔ مولوی سلطان محمود کو جب قصہ معلوم ہوا تو تشریف لائے۔ اور مہر علی شاہ سے کہا تم شرعی درسگاہ کے طالب علم ہو۔ شرعی حدود سے تجاوز نہ کرو۔ مہر علی شاہ نے ندامت سے سر جھکا لیا معذرت کی اور عرض کیا۔ استاد محترم آپ بھی ایسے شعبدہ بازوں کو یہاں آنے سے روکیں۔ مہر علی شاہ کو اپنے مرشد خواجہ شمس العارفین سے اتنی عقیدت اور محبت تھی کہ ایک روز خواجہ شمس العارفین (حضرت خواجہ شمس الدینؒ) سیالوی اپنے مریدوں میں تشریف فرما تھے۔ اچانک خواجہ صاحب نے اپنے مریدوں سے فرمایا جاؤ مسجد کے صحن میں۔ وہاں خضر علیہ السلام تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ان سے اپنی اپنی مشکلات کے حل معلوم کر لو۔ لوگ ایک دم مسجد کے صحن کی طرف بھاگے۔ نفسا نفسی کا سماں پیدا ہو گیا۔ مگر مہر علی شاہؒ اپنی جگہ پر جوں کہ توں بیٹھے رہے۔

آپ کی اس طرح کی بے نیازی کو خواجہ شمس العارفین نے بہت محسوس کیا اور فرمایا۔ مہر علی تم کو حضرت خضر علیہ السلام سے کچھ نہیں طلب کرنا ہے؟۔ مہر علی شاہؒ نے عرض کی "حضرت میں تو یک درگیر محکم گیر کا قائل ہوں" میرے لئے خواجہ خضر آپ ہی ہیں۔ جب ایک خضر موجود ہے تو دوسرے کے پیچھے کیا بھاگنا"۔

خواجہ شمس العارفینؒ یہ سن کر اتنے خوش ہوئے کہ مہر علی شاہ کو ظاہری و باطنی طور پر مالا مال کر دیا۔ اور لوگ حضرت خضرؑ سے اتنا کچھ حاصل نہ کر سکے جتنا مہر علی شاہؒ نے اپنے مرشد سے حاصل کیا۔

ایک مرتبہ مولینا سلطان محمود۔ جو مہر علی شاہ کے استاد محترم تھے۔ کسی سفر پر روانہ ہوئے وہ گھوڑے پر سوار تھے اور مہر علی شاہ ان کے گھوڑے کی لگام تھامے چل رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر سلطان باہوؒ کی ایک مرید خاتون جو عابدہ اور زاہدہ تھیں۔ بولیں "مولوی سلطان محمود تمہیں اس سید زادے کے مرتبہ کا علم نہیں ہے؟ ورنہ تم یوں گھوڑے پر سوار ہو کر لگام ان کے ہاتھ نہ تھماتے۔ ایک دن آئے گا جب تم اس کے گھوڑے کے پیچھے بھاگو گے۔

چنانچہ اس عفیفہ متقیہ خاتون کی پیش گوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ پیر مہر علی شاہؒ جب شمس العارفینؒ سے بیعت ہو چکے۔ اور روحانیت میں اعلےٰ مرتبے کر چکے تو ایک روز مہر علی شاہ صاحبؒ گھوڑے پر سوار عرس میں آ رہے تھے ان کو دیکھ کر مولینا سلطان محمود نے دوڑنا شروع کر دیا۔ ان کو دوڑتا دیکھ کر احتراماً مہر علی شاہ گھوڑے سے اترنے لگے تو مولینا نے ان کو سختی سے روکا اور کہا اگر تم میرے احترام کے لئے گھوڑے سے اترے تو میں تمہیں اپنی شاگردی سے خارج کر دوں گا۔ مجبوراً پیر مہر علی کو گھوڑے پر بیٹھے رہنا پڑا۔ یوں مولینا سلطان محمود نے اس واقعہ کی تلافی کی جب ان کے گھوڑے کی لگام پیر مہر علی تھام کر چلے تھے۔

حضرت مہر علی شاہؒ کان پور مولینا احمد حسن محدثؒ کے پاس حصول تعلیم کی خاطر تشریف لے لئے۔ تب شاہ صاحب کی عمر ۱۵ رسال تھی۔ مولینا ان دنوں حج کے لئے جا رہے تھے۔ لہٰذا شاہ صاحب مولانا کی استادی سے محروم رہے۔ اور علی گڈھ میں مولانا لطف اللہ کے تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ بہت عرصہ گذر جانے کے بعد جب حضرت مہر علی شاہ روحانی کمالات اور تقویٰ کی انتہائی منزل پر فروکش ہوئے تو مولینا احمد حسن محدث بہت متاسف ہوئے کہ کاش اس عالی شان انسان کی استادی کے فرائض مجھے نصیب ہوئے ہوتے تو میری بھی بخشش کا سامان ہوتا۔ اسی احساس محرومی کو لئے ایک روز مولینا بابا فرید گنج شکرؒ کے روضہ پاک پٹن شریف حاضر ہوئے وہاں حضرت مہر علی شاہ بھی تشریف فرما تھے۔ مولانا احمد حسن محدث کو دیکھ کر احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کو اپنے گھر لے گئے۔ مولینا نے حضرت مہر علی سے عرض کی کاش آپ کی استادی مجھے حاصل ہو جاتی اور میں بھی آپ کی دعاؤں اور تلطف میں شامل ہو جاتا۔ مہر علی شاہ صاحب نے جب یہ بات سنی تو اس دن سے وہ مولینا احمد حسن محدث کو اپنے حجرے میں ساتھ بیٹھایا کرتے تھے اور انتہائی محبت اور تلطف فرمایا کرتے۔ مولینا احمد حسن محدث کے وصال کے بعد بھی کثرت سے یاد کرتے اور فرماتے مولینا جیسا انسان اب دنیا میں نہیں آئے گا۔

۱۸۷۶ء میں پیر صاحب کی شادی ہوئی۔

لیکن آپ پر جذب کی کیفیت اس قدر طاری رہتی کہ آپ اکثر اوقات گھر سے باہر ہی رہا کرتے تھے۔ اس عالم میں آپ کئی کئی مہینے جنگلوں میں رہ کر ورود وظائف میں مشغول رہتے۔ آپ آگرہ دہلی، اجمیر شریف کی درگاہوں کی زیارت کے بعد حج کے سفر پر بھی گئے۔ اجمیر شریف میں رہ کر آپ کو اسرار و رموز کی تعلیم غیبی بھی ملی اور طویل سیاحت کے بعد ۱۳۰۷ھ میں آپ گولڑہ شریف واپس آگئے۔

چشتی سلسلے کے ایک بزرگ کے مرید غلام فرید نامی آپ کے عقیدت مند تھے۔ اور معماروں کا کام کیا کرتے تھے۔ ان کو اہل اللہ سے ملاقاتوں اور ان کی کرامات و دیدار کرنے کے شوق کے علاوہ ذاتی تجلی کا شوق تھا۔ انہوں نے اپنے مرشد سے تحریری اجازت لے لی کہ میں ذاتی تجلی کے لئے کسی بھی بزرگ کی خدمت میں جا سکتا ہوں اور اس معاملہ میں انھوں نے کسی صاحب ارشاد ہستی کو تلاش کرنے میں کئی سال گذار دئے۔ جنگلوں، ویرانوں، شہروں، قصبوں غرض کہ جہاں تک ان کی ہمت ہوئی انھوں نے تلاش کیا۔ حصول مقصد کی خاطر حضرت داتا گنج بخش رح کے مزار پر چلہ بھی کیا۔ اس چلہ کے دوران ایک دن عالم رویا میں ان کی ایک گیسو دراز خوش پوش بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ پھر یہی خواب غلام فرید دیکھتے رہے۔ مگر جگہ معلوم ہوتی تو خواب میں نظر آنے والے بزرگ کو ڈھونڈتے۔ حضرت داتا گنج بخش رح کے مزار پر ایک بزرگ آئے اور بتایا کہ گولڑہ میں ایک بزرگ ہیں وہ ذاتی تجلی کرانے پر قادر ہیں۔ غلام فرید اسی وقت گولڑہ کے لئے عازم سفر ہوئے۔ جب گولڑہ پہنچے تو انہوں نے شاہ صاحب کو دیکھا اور خواب میں آنے والے بزرگ سے موازنہ کیا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ یہ تو بالکل وہی ولی اللہ ہیں۔ جب پیر صاحب نے غلام فرید کو دیکھا تو ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔ خدام اٹھانے لگے کہ ہوش میں لائیں۔ آپ نے منع کیا۔ اور کہا ان کو ایسے ہی پڑا رہنے دو۔ دوسرے روز پیر صاحب کو بتلایا گیا کہ غلام فرید کی تڑپ باقی ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا غلام سے کہو اگر ورود وظائف سے تمہاری

تسلی نہیں ہوتی تو مسلسل چالیس یوم کا روزہ رکھو۔ غلام فرید نے سوچا تڑپ تو رہا ہوں اگر چالیس یوم کا روزہ رکھا تو سکون سے دم نکل جائے گا۔ اور جان کی خلاصی ہو جائے گی۔ کئی روز بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کئے ہوئے گذر گئے۔ ایک روز اچانک مہر علی شاہؒ نے اپنے خادم سے فرمایا "غلام فرید کو لاؤ" غلام فرید کو لایا گیا۔ آپ نے کہا خوشخبری، مبارک ہو۔ تمہارے پیر کے صدقے میں تمہارا کام ہوگیا۔ اب روزہ افطار کر لو"

چنانچہ غلام فرید نے روزہ کا افطار کیا۔ اس کے بعد غلام فرید نے معمول بنا لیا۔ ہر وقت شیخ کا تصور ہوتا اور ہر وقت درود وظائف میں لگے رہتے۔ اور ایک چادر میں آپ اپنے کو لپیٹے رہتے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت مہر علی شاہ نے حج پہ جانے کا حکم دیا۔ وہ حج پہ چلے گئے۔ مگر واپسی پر حضرت مہر علی شاہ کے پاس آکر رونے لگے اور کہا اے مرشد آپ یہاں بھی میرے سامنے اور وہاں بھی میرے سامنے تھے تو پھر مجھے اپنی شان دکھانے کے لئے اتنی دور کیوں بھیجا۔ اس بوڑھے کو اپنے ہی قدموں میں رہنے دیتے۔ یہ سن کر آپ مسکرائے اور غلام فرید کی جانب خصوصی توجہ دینے لگے۔

ایک مرتبہ آپ اور مولینا لطف اللہ صاحب مستورات کے ہمراہ بہلی پر سفر کو جا رہے تھے کہ راستے میں آپ کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ اور مال وزر کا مطالبہ کیا۔ آپ نے ڈاکوؤں کے سردار کو کہا تم عورتوں سے دور رہو ہم لوگ اپنا مال وزر تمہارے حوالے کئے دیتے ہیں۔ سردار رضامند ہوگیا۔ آپ نے سارے قافلہ میں جتنی عورتیں تھیں سب سے مال وزر نقد زیورات وغیرہ حسب وعدہ ڈاکوؤں کے حوالے کر دیا۔ جب ڈاکو چلے گئے تو قافلہ میں سے ایک عورت نے آپ کو بتلایا کہ میں نے کسی طرح ڈاکوؤں سے اپنے زیورات بچا لیئے۔ شاہ صاحب کو بہت افسوس ہوا انھوں نے فوراً عورت سے زیورات لے لئے اور ڈاکوؤں کا پیچھا کیا۔ اور ان تک پہنچ کر کہا وعدہ خلافی ہوئی ہے ایک عورت کا زیور رہ گیا تھا دینے آیا ہوں۔ اور وعدہ خلافی کی معذرت چاہتا ہوں۔ ڈاکوؤں کا سردار اس طرز عمل سے اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً اپنے ساتھیوں سمیت آپ کے ہاتھ پر تائب ہوگیا اور ہمیشہ کے لئے رہزنی سے کنارہ کش ہوگیا۔

شاہ صاحب اپنے حج کے احوال میں بیان فرماتے ہیں کہ وادی حمرا میں ڈاکوؤں کے خوف کی وجہ سے میں نے عشاء کی سنتیں وجہ مجبوری موقوف کر دیں اور میں نے رات کو خود کو مسجد نبویؐ میں پایا اور دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ اور مجھ کو بلاتے بھی نہیں۔ میں درخواست کرتا ہوں یا رسول اللہ میں اتنی دور سے دیدار کے لئے آیا ہوں۔ لیکن آپ نے مجھے اپنے لطف وکرم سے محروم رکھا۔ آپؐ نے فرمایا! "تم نے میری سنتیں ترک کر دی ہیں تو پھر تلطف کا مطالبہ کیسا؟" اسی دم پیر صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ فوراً دوبارہ عشاء کی نماز مکمل کی اور حضورؐ سے اس قدر عشق و محبت آپ کے دل کے اندر پیدا ہوئی کہ آپ نے اپنی مشہور نعت اسی شکر و جذب سے مغلوب ہوکر کہی ؎

کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا،
گستاخ اکھیں کتھے جا لڑیاں

آپ کا معمول تھا کہ فجر کے وقت سے دس بجے دن تک ذکر اذکار میں اپنے آپ کو مشغول رکھتے آپ کے درود وظائف اس قدر جلالی ہوا کرتے کہ حجرے کے حدود میں جو بھی آتا بے ہوش ہو جاتا۔ دس بجے کے بعد ارشاد و تلقین کا سلسلہ جاری ہوتا۔ دور دراز سے لوگ اپنی تکالیف، مسائل اور امیدلے کر

حاضر خدمت ہوتے اور دامن امید بھر کر جاتے ۔

آپ کا دستور تھا آپ کم کھاتے، کم بولتے اور کم سوتے کڑی عبادات نے آپ کو نیند سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اکثر اوقات مراقبے میں رہتے۔ خلوت ہو یا جلوت وجدانی کیفیت طاری رہتی۔ جس کو مسکرا کر دیکھ لیتے اس کی تقدیر بدل جاتی۔

آپ سے کسی نے سوال کیا شاہ صاحب آپ سید گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور آل رسول ہیں ؟ مگر بیعت آپ نے جٹ گھرانے کے مرشد سے کی۔ اس کی وجہ کیا ہے ؟ یہ سادات کی توہین کی مرادف نہیں؟

شاہ صاحب مسکرائے اور فرمایا" جٹ کے سبز کھیت اپنی ہریالی کی وجہ سے اپنی طرف کھینچ کر لے گئے۔ جٹ کے پاس کچھ تھا جب ہی تو سید نے اس کی غلامی قبول کر لی "معترض خاموش ہو گیا۔

وقت وصال آپ اٹھ کر بیٹھ گئے، قرآن مجید کی ایک آیت پڑھی جس کا ترجمہ ہے "بے شک جن لوگوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے اور اس بات پر ثابت قدم رہے ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خوف مت کرو اور غم مت کھاؤ اور بشارت سنو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا ہم دنیا میں بھی تمہارے دوست ہیں اور آخرت میں بھی اور تمہارے لئے وہ سب کچھ ہے جس کی تم خواہش کرو اور مانگو"۔

جب یہ آیت پڑھ رہے تھے آپ کا چہرہ نور الٰہی سے منور تھا اس کے بعد لیٹ گئے، منہ سے اسم ذات کا ذکر کرنا شروع کیا اور اسی ذکر میں آپ پردہ فرما گئے اور یوں اس خورشید طریقت کا وصال ہو گیا۔

بقیہ صـ۳۰

روزنامہ اخبار صحیفہ حیدرآباد دکن میں عرصہ سے سیرت نبوی نقل ہو رہی تھی۔ آج کتاب ختم ہو گئی۔ یہ اخبار بہت قدیمی اور بہت ہر دلعزیز ہے۔ آج کل اس میں شروع کا مضمون بہت مفید اور زوردار ہوتا ہے۔

بقیہ صـ۲

سے ہٹانے کے لیے فریب اور مکاری کا یہ راستہ اختیار کرتے ہیں کہ اہم فریضہ سے غافل کرنے کے لئے غیر ضروری اور بے موقعہ نیکیوں کی ترغیب دیتے ہیں۔

بے موقع اور غیر ضروری نیکیوں کو فضائل و محاسن سے مزین کر کے اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ انسان موقعہ و محل کے لحاظ سے اصل ذمہ داریوں سے غافل ہو جاتا ہے۔

علماء کرام نے وضاحت کی ہے کہ عام مسلمانوں کے سامنے جن کے اندر غریبوں کی تعداد زیادہ ہو حج بیت اللہ کے فضائل پر تقریریں نہ کی جائیں کیونکہ اس سے غریبوں کے اندر حج کا شوق پیدا ہوگا اور وہ ضروری ذمہ داریوں کو نظر انداز کر کے حج کے لئے جانے کی کوشش کریں گے۔ (حج کے احکام مفتی محمد سعید صاحب مظاہر العلوم سہارنپور)

حضرت ابراہیم ادہم رح کا خاص سلوک !

مشائخ تصوف میں سلوک (روحانی ترقی کی کوشش) کے مختلف انداز رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم ابن ادہم رح بلخی کا تاج و تخت چھوڑ کر تصوف کی راہ پر گامزن ہوئے تھے اسی لئے آپ کا سلوک اکل حلال پر زور دیتا تھا اور اسی اکل حلال سے آپ مرید کے اندر روحانی انوار پیدا کر دیا کرتے تھے۔

شیخ علیہ الرحمہ نے ایک مجلس میں فرمایا۔

لوگوں نے حضرت ابراہیم ابن ادہم سے سوال کیا کہ اسم اعظم کیا ہے۔ ؟ --- جواب دیا

معدہ را از لقمہ حرام پاک دارد و دل را از محبت دنیا خالی کن بعد ازاں بہر اسمے کہ خدائے را بخوانی آں اسم اعظم است۔

اسم اعظم یہ ہے کہ معدہ کو لقمہ حرام سے پاک رکھا جائے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب دل دنیا کی محبت سے خالی ہو، پھر جس نام سے بھی اسے پکارا جائے وہی نام اسم اعظم (خدا کا بڑا نام ہے) (جلد ۵ مجلس ۵ صـ۵۲۰)

ارکانِ دین میں زکاۃ کی اہمیت

پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی
دہلی یونیورسٹی

اسلام کے پانچ بنیادی ستون ہیں، جن پر عقیدے کی عمارت کھڑی ہے: تشہد، یعنی زبان سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا اور دل سے اُس کی تصدیق کرنا، دوسرے نماز، تیسرے زکوٰۃ چوتھے روزہ اور پانچویں نمبر پر حج۔

کلمہ پڑھنے میں تو کچھ نہ خرچ ہوتا ہے نہ محنت پڑتی ہے، نماز اور روزے کا تعلق بھی خرچ سے کچھ نہیں ہے، صرف جسمانی ورزش اور برداشت کی ضرورت ہے۔ اس میں بھی اتنی سہولت رکھی ہے کہ مریض اور مسافر روزے قضا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح نماز میں بھی حالات کے اعتبار سے رخصت و رعایت رکھی گئی ہے۔ یعنی قضا کر سکتے ہیں یا اشاروں سے پڑھ سکتے ہیں وغیرہ۔

ارکانِ اسلام میں صرف دو رکن ایسے ہیں جن کا تعلق اقتصادیات سے ہے یعنی زکوٰۃ اور حج۔ دونوں کے لیے ایک معیار مقرر کر دیا گیا ہے کہ مالی و معاشی حالت ایسی ہو تو اُسے صاحبِ نصاب کہا جائے گا اور اُس پر حج فرض ہوگا۔ اس میں اور شرطیں بھی ہیں، مثلاً حج کے لیے جائے تو کسی کا قرض واجب نہ ہو، گھر پر خاندان کے جن افراد کو چھوڑ کر جائے اُن کی تمام ضروریات کا انتظام موجود ہو، غیر شادی شدہ لڑکیاں بیٹھی ہوں تو پہلے اُن کا فرض ادا کرے، راستے پُرامن ہوں، خوف و خطر نہ ہو، وغیرہ۔

اِن سب شرطوں کا لحاظ رکھا جائے تو پورے مسلم سماج میں بہ مشکل پانچ فیصد مسلمان ہی ایسے نکل سکیں گے جن پر حج فرض ہوتا ہے۔ وہ بھی اگر کسی مجبوری سے خود نہ جا سکیں تو ایک سہولت حج بدل کی بھی رکھ دی گئی ہے۔ اب اس سے زیادہ آسان تو کوئی قاعدہ بنایا نہیں جا سکتا۔

معاشی حالات سے مربوط ایک رکن زکوٰۃ ہے، یہ ترتیب اور مرتبے کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر ہے، عام طریقے سے لوگ نماز کے بعد روزے کا درجہ سمجھتے ہیں، بلکہ بعض کو تو یہ غلط فہمی ہے کہ روزہ نماز سے بھی افضل ہے، اسی لیے سماج میں تارکِ صلوٰۃ کو اتنا طعن نہیں کرتے جتنا تارکِ صوم کو نظرِ حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ حالانکہ ارکان کی ترتیب میں سب سے افضل تشہد ہے، پھر نماز ہے پھر زکوٰۃ ہے اس کے بعد روزہ ہے۔

قرآن کریم میں زکاۃ کا حکم ۳۲ آیات میں آیا ہے اور بیشتر مواقع پر اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ایتاءِ زکاۃ کا ذکر ہوا ہے: جیسے واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکاۃ (۲: ۴۳) وغیرہ۔ اس سے ظاہر ہے کہ اللہ کی نظر میں زکاۃ روزے اور حج سے افضل ہے

اور اس کی دلیل عقلی موجود ہے: باقی چاروں ارکان عبادت لازمی کے زمرے میں آتے ہیں، یعنی ان کا جو بھی فائدہ یا ثواب ہے وہ کرنے والی کی ذات تک محدود ہے، لیکن زکاۃ ایک ایسا رکن ہے جو متعدی عبادت کے ذیل میں آتا ہے۔ اس عبادت کا فیض اور ثواب دوسروں تک بھی پہونچتا ہے۔ صوفیہ کے نزدیک لازمی عبادت کے ساتھ متعدی طاعت کی بھی بڑی فضیلت ہے طاعت لازمی کے لیے اخلاص شرط ہے، یعنی اس میں دکھاوا نہ ہو، ریاکاری اور بے دلی نہ ہو، خشوع و خضوع کے ساتھ محض اللہ کی خوشنودی کے لیے ادا کرے، ورنہ اللہ بے نیاز ہے، ایسی کھوکھلی نمایشی عبادت سے اُس کی رضا حاصل نہیں ہوتی۔ مگر طاعت متعدی اگر ریاکاری، نمود و نمایش اور جاہ پسندی و شہرت طلبی کی نیت سے بھی کی جائے تو بھی عنداللہ مقبول ہوگی۔ مثلاً بھوکوں کو کھانا کھلایا، ننگوں کو لباس پہنایا، مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیے اسکول، کالج وغیرہ کھولے، غریب مسکین بچیوں کی شادی کا انتظام کیا، یتیموں کی بیواؤں کی دیکھ بھال کے لیے کوئی ادارہ قائم کیا وغیرہ۔ یہ سب متعدی عبادات ہیں اور اگر دکھاوے کے لیے بھی کی جائیں تب بھی اچھی ہیں، اور ان کا ثواب ضائع نہیں ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں یہ "احسان" ہے اور "اللہ تعالیٰ محسنوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا" (۵۶: ۱۲ و ۳۰: ۱۸) زکاۃ کا فائدہ بھی خاندان اور سماج کے مفلس پس ماندہ اور محتاج افراد تک پہنچتا ہے۔ اسے اللہ نے فرض کیا ہے اور مستحقین و مستضعفین کا "حق" بتایا ہے (۱۹: ۵۱- اور ۲۵: ۷۰) قرآن کریم کا ارشاد ہے: "نماز قائم کرو اور زکاۃ ادا کرو، جو کچھ تم نیکی اپنے لیے کروگے اس کا اجر اللہ کے پاس پاؤگے" (۱۱۰: ۲) دوسرے موقع پر کہا ہے: "نماز قائم کرنے والے اور زکاۃ ادا کرنے والے اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لانے والے وہ ہیں جنھیں ہم اجر عظیم عطا کریں گے (۱۶۲: ۴) پھر فرمان الٰہی ہوتا ہے: "اگر تم نماز قائم کروگے اور زکاۃ ادا کروگے اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤگے اور ان کی عزت کروگے اور اللہ کو قرض حسنہ دوگے تو تمہارے گناہوں کو معاف کردوں گا" (۱۲: ۵)۔ زکاۃ دینے والوں کو متقی بتایا ہے (۱۵۶: ۷)۔ اور وہی اللہ اور اُس کے رسول کی سچی اطاعت کرنے والے ہیں (۷۱: ۹) نماز اور زکوۃ کا حکم ساری زندگی کے لیے ہے (۳۱: ۱۹) اسے "فعل خیرات" (نیکیوں کا عمل) کہا ہے (۷۳: ۲۱) زکاۃ کو اللہ "قرض حسنہ" کے طور پر قبول کرتا ہے اور قرض حسنہ وہ ہے جو مارا نہیں جاتا، وعدے پر ادا ہوتا ہے۔

زکاۃ کی اتنی تاکید اس لیے ہے کہ دولت صرف چند ہاتھوں میں ذخیرہ ہوکر نہ رہے، اس میں سے سماج کے کمزور طبقوں کا حصہ بھی نکلے، دولت گردش میں رہے۔ اسلام اس کی سخت تاکید کرتا ہے قرآن نے صاف اور صریح لفظوں میں کہا ہے کہ "تم ہرگز نیکی نہیں پاسکتے جب تک وہ چیز جو تمہیں محبوب ہے خرچ نہ کردو (۹۲: ۳) اور تاکید کرتا ہے کہ جو کچھ رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اُسے خرچ کرلو اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جب نہ تجارت ہوگی نہ کوئی کسی کا دوست ہوگا نہ کوئی سفارش کام آئے گی اور جو اس کے منکر ہوں وہ ظالم ہیں (۲۵۴: ۲)۔

اِنفاقِ اموال (یعنی مال کو خرچ کرنے) کی جتنی سخت تاکید اسلام میں ہے کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اسلام ایک خوش حال اور فارغ البال معاشرہ چاہتا ہے، وہ محض "جیو اور جینے دو" جیسے کھوکھلے نعرے نہیں دیتا، اقتصادی مساوات کو ایمان و عقیدے کی اساس بناکر پیش کرتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں نظام زکاۃ اور بیت المال کا ادارہ ایک عظیم انقلابی قدم تھا جس سے سماج کا اقتصادی توازن باقی رکھنا مقصود تھا۔ بیت المال میں مالِ غنیمت بھی آتا تھا اور زکاۃ کی رقم بھی جمع ہوتی تھی۔ پھر اس سے بیواؤں، یتیموں، مفلسوں اور اپاہجوں کی پرورش اور پرداخت ہوتی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے کے بعد چند عرب قبائل نے زکاۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور بعض قبیلے مرتد ہونے لگے، چند جھوٹے نبی بھی پیدا ہو گئے، یہ بڑا نازک وقت تھا، دشمنانِ اسلام یہ حالات دیکھ کر بغلیں بجا رہے تھے کہ اب یہ چراغ ٹمٹمانے لگا ہے، بس ایک ہی پھونک میں بجھ جائے گا۔ اُس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اہل الردۃ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا، حالانکہ مرکز زیادہ مضبوط نہیں تھا اور ردّۃ کی آگ دور دراز علاقوں تک پھیلنے لگی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: خدا کی قسم اگر کوئی ایک بکری باندھنے کی رسّی بھی زکوٰۃ میں دیتا تھا تو ابوبکرؓ وہ بھی وصول کر کے رہے گا۔" حضرت صدیق اکبرؓ نے ان باغیوں کی سرکوبی کے لیے گیارہ لشکر مختلف علاقوں میں بھیجے اور ایک سال کے اندر ہی ان فتنوں پر قابو پا لیا۔

بیت المال کے اِسی ادارے سے مسلم معاشرے کی تمام ضرورتیں پوری ہوتی تھیں۔ غازیانِ اسلام کو وظائف ملتے تھے، شہداء کے خاندانوں کو معاشی مدد دی جاتی تھی، قرآن کی تعلیم کے لیے معلّموں کو دوسرے علاقوں میں بھیجا جاتا تھا۔ وغیرہ۔

خلافتِ راشدہ کے اختتام اور ملوکیّت کے آغاز سے بیت المال کا مصرف اور مزاج بھی بدل گیا عباسی دور تک آتے آتے یہ "شاہی خزانہ" بن چکا تھا، پھر بھی کچھ نمود باقی تھی۔ مگر اب ہم نے کئی صدیوں سے اس نہایت مفید اور ضروری ادارے کو نہ صرف بند کر دیا بلکہ اِس کی رفیع الشان عمارت کی بنیادیں تک اکھاڑ پھینکیں۔ بیت المال کا بدل کسی حد تک اوقاف کا ادارہ ہو سکتا تھا، اُسے بھی خیانت اور لوٹ کھسوٹ کا گڑھ بنا کر تباہ کر دیا۔ اب مسلمانوں کی معاشی حالت عام طور پر کمزور ہے پھر بھی ہندوستان میں پانچ فی صد ایسے مسلمان ضرور ہوں گے جو صاحب نصاب ہوں اور جن پر زکوٰۃ فرض ہو۔ مگر اُن میں سے شاید نصف فی صد یا ایک فی صد باقاعدہ زکاۃ ادا کرتے ہوں۔ جو ادا کرتے ہیں اُن کا دیا ہوا سرمایہ بھی یک جا نہیں ہوتا بکھر جاتا ہے۔ بعض حالات میں مستحق افراد تک پہنچتا بھی نہیں۔

ایک اہم نکتہ یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ زکاۃ اُس فاضل سرمائے پر ہے جس پر پورا ایک سال گذر جائے یعنی ہماری سال بھر کی ضروریات پوری کرنے کے بعد جو بچ رہے، خواہ وہ نقدی یا مال تجارت کی صورت میں ہو، یا زیورات ہوں، یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ بعض لوگ زکاۃ سے بچنے کے لیے یہ حیلہ کرتے ہیں کہ سال تمام ہونے سے پہلے اس فاضل قابل زکاۃ سرمائے کو اپنی بیوی یا بیٹے یا کسی اور کے نام منتقل کر دیتے ہیں، اس طرح وہ اللہ کے ساتھ چالاکی کرتے ہیں۔ ایک واعظ کہا کرتے تھے کہ ایسے لوگوں کو اللہ بھی بوتل میں بند کر کے جہنم میں ڈالے گا اور کہے گا کہ ہم نے اِنھیں نہیں بوتل کو دوزخ کی آگ میں ڈالا ہے۔

دوسری بات یہ کہ زکاۃ جن کو دی جائے اُن کے بھی درجے مقرر کر دیے ہیں، سب سے پہلے اپنے نادار رشتہ دار (جو غیر ہاشمی ہوں، ہاشمی عزیزوں کی مدد بھی ضرور کی جائے بلکہ زیادہ اکرام کے ساتھ کی جائے مگر زکاۃ کی مد سے نہیں) پھر یتیموں کا حق ہے، ان کے بعد مساکین وفقراء کا حق ہے، اور آخر میں پردیسی مسافروں کا۔ زکوٰۃ کو اسی ترجیحی ترتیب سے ادا کرنا اللہ کی رضا کے موافق ہوگا۔

ری بات یہ کہ زکاۃ میں تملیک (یعنی مالک بنا دینے)
شرط ہے۔ اسی لیے زکاۃ کی رقم سے کسی لاوارث
ں کی تجہیز و تکفین نہیں ہوسکتی اس لیے کہ مُردے کو
شے کا مالک نہیں بنایا جا سکتا اگر کسی شخص کو
ۃ کی رقم یہ کہہ کر دی جائے کہ اس سے اپنے کپڑے
بنا، یا فلاں مریض کا علاج کرالینا وغیرہ تب
زکاۃ ادا نہیں ہوئی، اس لیے کہ آپ نے گویا
، اپنا وکیل بنا دیا کہ وہ آپ کی طرف سے آپ کی
ت کے موافق وہ روپیہ خرچ کرے۔ تملیک یہ
کہ وہ رقم اُسے یہ کہہ کر دی جائے کہ "یہ تمہاری
جیسے چاہو خرچ کرو۔"

ایک اور نازک مسئلہ بھی ہماری سنجیدہ توجّہ
تا ہے۔ بعض مدارس کے سفیر، مسافر خانوں،
خانوں یا تعلیمی اداروں کے لیے چندے وصول
نے والے بھی زکوٰۃ کی رقم بے تکلف وصول کر کے
جاتے ہیں اور اُن کا کہنا یہ ہے کہ ان اداروں میں
غریب، نادار، اور مفلوک الحال لوگ ہیں یہ روپیہ
ے کھانے پینے اور دوسری ضروریات میں کام
ہے۔ میں بہت ادب سے یہ عرض کروں گا کہ اس
ٰ زکاۃ ادا نہیں ہوتی اور ایسے حضرات کو زکاۃ
روپیہ وصول نہیں کرنا چاہیئے۔ ہاں کسی مدرسے
نادار طلبہ یا یتیم خانے کے بچوں کو فرداً فرداً مالک
ر یہ رقم دے دی جائے تو ادا ہو جائے گی۔ پھر خواہ
اُسے اپنی طرف سے مدرسہ کو بطور عطیہ ہی دے دیں۔
ـ نازک فقہی مسئلہ ہے اور اس پر ہمارے فقہاء
غور کرنا چاہیئے۔

زکاۃ کی وصولی اور تقسیم میں وکیل صرف
مان حاکم جو عادل ہو وہی ہو سکتا ہے۔ اگر کسی
اموال میں کچھ مال حلال ہے کچھ حرام ہے تو زکاۃ
ـ پر ہوگی۔ اگر کسی مال سے خراج یا عشر وغیرہ ادا
جاتا ہے تو اُس پر زکاۃ نہیں ہوگی کیونکہ شریعت
میں ایک مال پر دو حق فرض نہیں ہوتے۔ نصاب میں
$\frac{1}{2}$ ۷ تولہ سونا یا $\frac{1}{2}$ ۵۲ تولہ چاندی ہے، زکاۃ کا
حساب کرتے وقت بازار میں سونے / چاندی کا جو
بھاؤ ہوگا اُسی کی شرح سے $\frac{1}{2}$ ۲ فیصد زکاۃ
واجب ہوگی۔ مال تجارت کو بھی اسی کے نرخ سے
آنکا جائے گا۔

بعض فقہاء کا قول ہے کہ زکاۃ اپنے قریبی
عزیزوں سے باہر کے حلقے میں دینا زیادہ اچھا ہے
اسے خوشدلی سے ادا کرنا چاہیئے، منھ بنا کر اور
جبر و اکراہ سے نہیں۔ صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے
کہ زکاۃ نہ دینے والوں کی شفاعت سے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن انکار فرما دیں گے
(نعوذ باللہ منہ)۔

زکاۃ کی فرضیّت میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ
دولت کی محبّت کو دل سے نکالا جائے۔ حدیث میں
ہے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے اچھا ہے، یعنی
مال کا دینے والا، لینے والے سے بہتر ہے۔ صوفیہ کہتے
ہیں کہ اسی سے فقر کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ
دینے والا ہاتھ اُس مال کی حد تک جو اس نے دیا ہے
فقر حاصل کرتا ہے اور لینے والا ہاتھ اس مال کے بقدر
جو اُس نے لیا ہے غنی (مالدار) بن جاتا ہے۔

حضرت شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر قدس سرہ
کا ارشاد ہے کہ زکاۃ کی تین قسمیں ہیں۔ زکاۃ شریعت۔
زکاۃ طریقت۔ اور زکاۃ حقیقت۔ زکاۃ شریعت یہ ہے
چالیس روپیوں میں سے ایک روپیہ دے دے،
زکاۃ طریقت یہ ہے کہ ایک روپیہ خود رکھ لے اور
۳۹ مساکین کو دے دے زکاۃ حقیقت یہ ہے کہ
ایک روپیہ بھی نہ رکھے سب دے ڈالے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء علیہ الرحمتہ نے
فرمایا ہے کہ صدقہ دینے کی پانچ شرطیں ہیں دو شرطیں
دینے سے پہلے، اور تین صدقہ دینے کے بعد۔ دینے

باقی ص۳۰ پر

اردو گلستاں

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا منتخب روزنامچہ

۴، جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ / ۲۷، اکتوبر ۱۹۳۰ء
دوشنبہ - دہلی

سیاسی } اب ہندوستان کے جذبہ آزادی کی ہر جنبش کے پاس گرفتاری کھڑی نظر آتی ہے ہر دن جگہ جگہ سے گرفتاریوں کی خبر لاتا ہے۔

قومی } لکھنؤ میں چند مسلمانوں نے جلسہ کر کے کہا کہ مسٹر محمد علی پر ہمارا اعتماد ہے۔ حضرت مولانا عبدالماجد صاحب قادری بدایونی اس جلسہ کے روح رواں تھے جو علی برادران کے پرانے دوست ہیں۔ ان کا اعتماد ظاہر کرنا ان کی وضع داری ہے ورنہ خود ان کا دل بھی اعتماد سے منحرف ہے اعلیٰ حضرت حضور نظام کی تائید میں جو تجویزیں منظور ہوئیں وہ البتہ سب مسلمانوں کی خواہش کو ظاہر کرتی ہیں۔

تلقین حیات } موجودہ زمانہ میں خودستائی اور خود پسندی معیوب نہیں ہے بلکہ ذریعہ حیات سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ پبلک کی آنکھیں اور کان کمزور ہوگئے ہیں اور لوگ خودستائی کے ذریعہ چیختے ہیں کہ ہم کو بھی ٹٹول کر دیکھو کہ ہم دنیا میں موجود ہیں اور ہماری بھی بات سنو کہ ہم کو پکارنے کی قوت ملی ہے۔

مگر برگزیدہ زندگی ان کی ہے جو خودستائی کے بغیر اپنی صورت دکھا سکیں اور اپنی آواز سنا سکیں۔

بھیا احسان کا حلیہ } شیخ احسان الحق خلف شیخ سبحان بخش صاحب مرحوم آنریری مجسٹریٹ میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے نانا شیخ الٰہی بخش صاحب بہت مشہور مسلمان تھے۔ جنھوں نے دہلی کی جامع مسجد تین لاکھ روپے دے کر انگریزی فوج کے قبضہ سے چھڑائی تھی۔ ان کے ماموں خان بہادر شیخ وحید الدین صاحب میرٹھ کے مشہور رئیس ہیں۔

ان کے خاندان کے سب افراد کو بھیا کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ بھیا احسان کی عمر چالیس کے قریب ہے مگر بال سفید ہوگئے ہیں۔ جسم دوہرا ہے۔ چہرہ گول ہے رنگ گندمی ہے۔ آنکھیں بڑی اور موثر ہیں۔ وہ انگریزی اور عربی کے پورے فاضل ہیں۔ مزاج فلسفیانہ ہے۔ نقادی کے فن میں مہارت رکھتے ہیں۔

عرصہ دراز سے دہلی میں رہتے ہیں۔ میری ان کی دوستی پچیس سال سے ہے۔ وہ نہایت مخلص اور حاضر و غائب ہمدرد اور پابند وضع داری ہیں۔ اور مجھ میں ان میں ایک جان دو قالب کا سا تعلق ہے۔

گفتگو کے وقت اگر بحث ہونے لگے تو ان کا غصہ ان کے قابو میں نہیں رہتا۔ لیکن ان کے دل کی نیکی ہر وقت ساتھ رہتی ہے۔ وہ مروجہ مذاہب سے اکتا گئے ہیں اور مذہب کے باہر اطمینان تلاش کرتے ہیں۔

ذاتی } رات کو رام پور جانا ہے ایک بجے تک محویت

ساتھ تحریری کام کرتا رہا۔ پھر دہلی گیا۔ مسٹر محمد علی کے نام
نگریزی خط ہوائی جہاز کی ڈاک میں روانہ کرایا۔ ایک لفافہ
یک روپیہ آدھ آنہ محصول خرچ ہوا۔ یہ خطوط انگلستان
سب اخباروں اور روزنیروں اور گول میز کانفرنس
ممبروں کو بھیجے گئے ہیں اور تمام دنیا کے بادشاہوں
باروں لیڈروں کو بھی بھیجے ہیں۔ ہندوستان میں
ں ہر جگہ ان کو تقسیم کرایا ہے۔

پانچ بجے گھر میں واپس آیا۔ ضلع جالندھر سے
ب خاتون آئی ہیں ان سے باتیں کیں۔ خواجہ بانو کے
ں ٹھہری ہیں۔ بنوں کے خدا بخش نظامی بھی آئے
۔ بنوں سے خبر آئی احمد ابدالی کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ میں
علی ابدالی نام رکھا۔

بعد مغرب تحریری کام شروع کیا۔ آٹھ بجے
کر دیا۔ مستری عشقی پاؤں دباتے رہے اور میں لکھتا رہا۔

نو بجے رات کو رام پور کے لئے گھر سے روانہ ہوا۔
ابن عربی ریل تک ساتھ آئے توکلی شاہ نظامی اور
محمد خاں حسن پوری رام پور تک ساتھ جائیں گے۔
ن میں ساڑھے نو بجے سوار ہوا۔ مگر ٹرین بارہ بجے
نہ ہوئی۔ جگہ آرام کی مل گئی ساری گاڑی میں اکیلا ہوں۔

صبح پانچ بجے مراد آباد پہنچا۔ آدھ گھنٹہ کے بعد
ری ٹرین رام پور جانے والی ملی۔ اس علاقہ میں کل بارش
ئی تھی اس لئے بہت سردی معلوم ہوتی ہے۔

مراد آباد کے اسٹیشن پر ڈاک کے تھیلے شمار
جا رہے تھے۔ میں نے ہندوستانی عملے کے کام کو
غور سے دیکھا ان کی کاہلی اور آرام طلبی کی عادت کو
ہزی انتظام مجبور کر رہا تھا اور یہ بادل ناخواستہ کام
رہے تھے۔

آج دہلی میں ایک صاحب نے کہا آپ کی آنکھیں
بڑھاپے میں بھی بہت خوبصورت ہیں میں نے کہا۔
آپ کو کچھ امداد کی ضرورت ہے۔ کیونکہ کسی کے حسن
تعریف وہی کرتا ہے جس کو کسی سے مطلب نکالنا ہو

رنڈیاں بھی بدصورت مردوں کو خوبصورت کہہ کر روپیہ
وصول کرتی ہیں۔ یہ جواب سن کر وہ صاحب کبیدہ ہوگئے
مگر میں نے تو ایک تجربہ کی بات کہی تھی۔ کیونکہ میں جب ڈاک
پڑھتا ہوں تو دو چار خطوط میں بڑی بڑی تمہید کے
ساتھ میری تعریف ہوتی ہے اور میں سمجھ لیتا ہوں کہ آگے
کوئی خاص مطلب ضرور ہوگا اور کبھی یہ اندازہ غلط نہیں ہوتا۔

ایسے ہی میری صورت یا میری آنکھوں کی تعریف
کرنے والے بھی تھے۔ اگرچہ انھوں نے رنجیدہ ہوکر اپنا کوئی
مقصد ظاہر نہیں کیا۔ لیکن بغیر کسی غرض کے کون کسی کی
آنکھوں کو خوبصورت کہہ سکتا ہے۔ ہر شخص کو تو اپنی صورت
اور اپنی ہی سیرت سارے جہان سے اچھی معلوم ہوتی ہے۔

آج میں نے ایک خوبصورت جوتی خریدی تھی۔ کیونکہ
میری جوتی کی بدصورتی کو واحدی صاحب نے ناپسند کیا تھا۔
اچھی جوتی خریدنے کے بعد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اپنے سوکھے
اور مرجھائے ہوئے پاؤں کو دیکھا کہ وہ جوتی کے حسن سے
شرمایا جاتا ہے۔ اس کی شرم فضول تھی کیونکہ جب میرے
جسم میں خون موجود تھا تو پاؤں بھی بہت خوبصورت
تھے۔ حسن تو خون کی تندرستی سے نمودار ہوتا ہے۔ یہ جوتی
بھی چند روز کے بعد بدصورت ہو جائے گی، کیونکہ ہر حسن کی
ایک عمر ہوتی ہے۔

میرا حسن تو موجودہ عمر میں حسن خیال ہے۔ حسن عمل ہے
اور حسن تجربہ ہے۔ مجھے اب کوئی شخص یہ کہہ کر خوش نہیں کرسکتا
کہ تمہارا چہرہ اور تمہارا جسم اور تمہارے ہاتھ پاؤں حسین
ہیں۔ کیونکہ میں اپنے وجود کا دوسرے لوگوں سے زیادہ عارف
ہوں۔ اور صرف اس تعریف کو قبول کرسکتا ہوں جو میری
اصلی حالت کے موافق بھی ہو۔

۵ رجمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۲۸ راکتوبر ۱۹۳۰ء

سہ شنبہ۔ ریاست رام پور

سیاسی } بادلوں نے آفتاب کی چمک کو ماند کر رکھا ہے
اور یہی سب سے بڑی سیاسی خبر ہے۔

قومی } بڑے درجہ کے مسلمان نماز سے عمداً غافل ہوتے ہیں۔ آج میں نے مغرب کی جماعت میں جو نواب صاحب کے خاص باغ میں پڑھائی تھی معمولی درجہ کے مسلمانوں کو دیکھا۔ بڑے درجہ کے مسلمان نہ تھے۔

تلقین حیات } مذہب کا اعتقاد مرنے کے بعد کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن حیات موجود میں بھی مذہب انسان کے دل کو بڑے بڑے مصائب میں تسکین و تسلی دے سکتا ہے۔

شبلی } بھیا احسان کا لڑکا ہے۔ چار سال کی عمر ہے۔ زبان بہت صاف ہے۔ اس عمر کے بچے بعض حروف کا مخرج ٹھیک ادا نہیں کرتے مگر شبلی کی زبان بہت صاف ہے۔ رنگ گندمی ہے۔ ٹیلیفون میں بات کرنے کا شوق ہے۔

ذاتی } صبح ساڑھے چھ بجے رام پور پہنچا۔ موٹر اور استقبال کرنے والے موجود تھے۔ ایجنٹ صاحب کے بنگلہ پر آیا۔ ناشتہ کیا۔ تحریری کام کرتا رہا۔ دس بجے ملٹری سکریٹری صاحب کا خط آیا کہ نواب صاحب نے شام کو چار بجے خاص باغ پیلس میں ملاقات کا وقت مقرر کیا ہے۔

گیارہ بجے کھانا کھا کر موٹر میں شہر کی سیر کرنے گیا۔ ظہر کے بعد سو گیا۔ ساڑھے تین بجے موٹر آئی اور میں خاص باغ پیلس میں گیا۔ نواب صاحب کلب میں چلے گئے تھے۔ میں ملٹری سکریٹری صاحب کے آفس میں رہا۔ عصر وہیں پڑھی۔ مغرب کی نماز محل کے قریب نماز کے چبوترہ پر پڑھائی۔

علی برادران کے بڑے بھائی ذوالفقار علی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پھر معین الدین صاحب انصاری جج رام پور ملنے آئے جو علمائے فرنگی محل لکھنؤ کے خاندان میں ہیں۔ ان کے دادا ملا حسن صاحب کا رام پور میں مزار ہے۔ جو مشہور منطقی کتاب کے مصنف تھے۔ انصاری صاحب بہت خوش جمال اور صاحب کمال جج ہیں۔

نواب صاحب کلب سے تشریف لائے اور فرمایا کہ میں آج دہلی واپس نہ جانے دوں گا۔

صاحبزادہ عبدالصمد خاں صاحب چیف منسٹر اور خان بہادر محمد حسین صاحب فنانس منسٹر اور حسن رضا صاحب ملٹری سکریٹری بھی تشریف لائے۔ مسعود الحسن صاحب جج بھی آئے۔ ان سب سے بہت دیر تک باتیں کیں۔ دہلی کو تار بھیج دیا کہ کل نہیں آ سکتا۔ ساڑھے آٹھ بجے رات کو ایجنٹ صاحب کے بنگلہ میں آیا۔ کھانا کھایا۔ دس بجے تک لکھتا رہا۔ پھر عشا پڑھ کر سو گیا۔

یہاں سردی زیادہ ہے۔ تعویذ لینے والے آتے رہے۔ شہر میں کسی مرید اور دوست کو میرے یہاں آنے کی خبر نہیں ہوئی ہے۔ پڑوس میں کوئی سکھ صاحب بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔

۶ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۰ء
چہارشنبہ۔ رام پور

سیاسی } رام پور میں ہوں جو ایک ریاست ہے۔ یہاں کانگریسی تحریک کا نام و نشان بھی نہیں ہے اور غالباً سب ریاستیں اس تحریک سے محفوظ ہیں۔

قومی } خاص باغ پیلس میں مرحوم نواب صاحب نے ایک نہایت خوبصورت مسجد بنوائی ہے اگرچہ مرحوم نواب صاحب شیعہ تھے لیکن یہ مسجد اہلسنت کے لئے بنی ہے۔ اس کا فرش نہایت ہی نرم و نازک ہے۔ پنجتن کی یادگار میں اس کے پانچ دروازے ہیں اور نواب صاحب کی ایک صاحبزادی کی تندرستی کی خوشی میں یہ مسجد بنوائی گئی ہے۔

تلقین حیات } برداشت اور تحمل نہایت عمدہ صفتیں ہیں لیکن ان کی بھی ایک حد مقرر ہے۔ حد سے زیادہ برداشت انسان کے ضمیر کو تباہ کر دیتی ہے۔ کامیاب زندگی اعتدال میں ہے۔

بشریٰ } بھیا احسان کی لڑکی ہے۔ شبلی سے بڑی ہے۔

ونکہ ان بچوں کی والدہ لکھنؤ کی ہیں اس واسطے ان دونوں
بچوں میں بات چیت کی تمیز اور شائستگی بہت زیادہ ہے
شری نام بھیانے رکھا ہے اور میں اس نام کو بہت ہی
سند کرتا ہوں ۔

ذاتی } صبح ناشتہ کے بعد چہل قدمی کی ۔ ساڑھے نو بجے خاص باغ پیلس میں بلایا گیا ۔ اور بارہ بجے
ہاں سے واپس آیا ۔ کھانا کھایا ۔ پھر کچھ لکھتا رہا ۔
تعویذ گنڈے والے بھی آتے رہے ۔ اس کے بعد سو گیا ۔
ھر کے بعد چہل قدمی کی ۔ پھر خاص باغ پیلس میں بلایا
گیا ۔ نواب صاحب کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھائی ۔
س کے بعد ساڑھے سات بجے تک خاص باغ پیلس میں
ہا ۔ واپس آکر کھانا کھایا ۔ آٹھ بجے ریل پر آیا ۔
ونے نو بجے ڈاک گاڑی آئی ۔ ساڑھے نو بجے مرادآباد
پہنچا ۔ بھائی سید محمد صاحب اسٹیشن پر موجود تھے
ور ایک بڑا ٹوکرا مٹھائی کا بھی لائے تھے ۔ محمد شاہ صاحب
سے بھی ملاقات ہوئی ۔ بہت نورانی صورت ہے ۔ مجوجوں
میں تقریریں کرتے ہیں ۔ پنجاب کے رہنے والے ہیں ۔
چار بجے دہلی پہنچا ۔ چند احباب استقبال کے لئے موجود تھے ۔

٧ ، جمادی الثانی ١٣٤٩ھ ٣٠ ، اکتوبر ١٩٣٠ء
پنجشنبہ ۔ دہلی

قومی } سردی کی برسات غریب مسلمانوں کا پردہ فاش کردیتی ہے ۔ گرمی پردہ پوشی کرتی ہے اور سردی کہہ دیتی ہے
اس قوم کے پاس گرم کپڑے نہیں ہیں اور ہیں تو پھٹے ہوئے
پیوند لگے ہوئے ہیں ۔

تلقین حیات } جب بات کرنی ہو تو پہلے سوچ لینا چاہئے کہ میں کیا کہتا ہوں اور سننے والوں پر
س کا اثر کیا ہوگا ۔ اس سے باتوں کی احتیاط پیدا ہو جائے گی ۔

ذاتی } نو بجے تک کام کر کے دہلی گیا ۔ بارہ بجے واپس آگیا اور شام تک تحریری کام کرتا رہا ۔ ابر چھایا ہوا
ہے ۔ بوندیاں پڑ رہی ہیں ۔ ملا طیب علی عبدالرسول صاحب
جبل پوری بھی دہلی سے میرے ساتھ آئے تھے ۔ ایک گھنٹہ ٹھہر کر
چلے گئے ۔ آج ایک بڑا فریب ظاہر ہوا ۔ ایک شخص نے مجھ کو
اور مسلمانوں کو عرصہ دراز تک فریب دیا اور رقمیں حاصل
کیں ۔ میں اس کی تفتیش کر رہا ہوں ۔ پورا حال معلوم ہونے
کے بعد معاملہ پولیس کے حوالہ کیا جائے گا ۔

آج مولوی مسعود علی صاحب بی ۔ اے سابق
سشن جج حیدرآباد کے بڑے بھائی صاحب اپنے والد
اور چچا کے مزارات کی زیارت کے لئے آئے تھے ۔ ورنگل میں
رہتے ہیں ۔ ان کے والد کا مزار درگاہ میں میرے حجرہ کے
سامنے ہے اور چچا کا مزار میرے بھائی کے مزار کے برابر
ہے ۔ آج میرے دادا حضرت مولانا خواجہ سید محمد امام ؒ کی
سالانہ نیاز تھی ۔ بچے سب گئے تھے میں سردی کی وجہ سے نہیں
گیا ۔ لالہ شمبو ناتھ صاحب مالک دلی پرنٹنگ ورکس
اور پنڈت چشتی ناتھ صاحب ملنے آئے تھے ۔ پارہ
صبح ٦٤ درجہ پر تھا ۔ ایک رات میں چار درجہ سردی بڑھ گئی ۔
کل صبح سردی ٦٨ درجہ پر تھی اور آج ٦٤ ہے ۔

٨ ، جمادی الثانی ١٣٤٩ھ ٣١ ، اکتوبر ١٩٣٠ء
جمعہ ۔ دہلی

سیاسی } دو روز سے دہلی میں گرفتاریوں کی شدت ہے ۔ عوام کہتے ہیں یہاں بھی بمبئی کی تقلید شروع
ہوگئی ہے ۔

قومی } ہز ہائی نس صاحب خیرپور دہلی میں آئے ہیں ۔ انجمن اسلامیہ دہلی نے ان کو میڈن ہوٹل میں
ایک شاندار پارٹی دی تھی ۔ نواب صاحب نے چار ہزار
روپے انجمن اسلامیہ کو دئے اور دو ہزار روپے شیعہ انجمن
کو دئے اور سنا ہے کہ ایک دوسری شیعہ انجمن کو بھی دو ہزار
روپے دئے ۔ اور عربک کالج دہلی میں بھی گئے تھے ۔ غالباً
وہاں بھی کچھ دیا ہوگا نواب صاحب کا دل سلاطین قدیم
کا دل ہے اگر ان کے پاس ایک کروڑ روپے موجود ہوں تو وہ
منٹ ختم ہونے سے پہلے ان کو ختم کر سکتے ہیں ۔

تلقین حیات } جب انسان کسی دکھ اور مصیبت میں مبتلا ہو تو اس کو اپنے سے زیادہ مصیبت زدہ لوگوں کا خیال کرنا چاہئے۔ دل کو تسکین و تسلی ہو جائے گی کہ دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جو ہمیشہ خوش حال اور مطمئن رہا ہو۔

ذاتی } آج دہلی نہیں گیا۔ دن بھر کام کرتا رہا۔ جالندھر والی خاتون واپس چلی گئیں۔ ملنے والے بھی آئے رہے جمعہ کی نماز درگاہ شریف میں پڑھی شام کو پرنس بدرالدین نظامی فرزند نواب صاحب مانگرول ملنے آئے میرے دادا حضرت مولانا خواجہ سید محمد امام رضی کی نیاز میں میں بھی شریک ہوئے اور دو نعتیں بھی پڑھیں۔ وہ موسیقی کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ علی گڑھ سے بی۔ اے پاس کر کے آئے ہیں۔ بڑے عابد زاہد نوجوان ہیں۔ میرا ان کا ۱۹۰۷ء سے تعلق ہے جب کہ وہ بچہ تھے۔ آج حسین کو بخار ہو گیا ہے مگر وہ خوش ہے۔ بخار نے اس کو افسردہ نہیں کیا۔ رات کو کھانا کھا کر سب بچوں کو علی محل میں لایا۔ اور آج سے علی محل میں سونا شروع کیا۔ برسات کی وجہ سے اسکول کے نیچے حسین خانہ میں رہتے تھے اب سردی آگئی اور وہ بورڈنگ میں آگئے ہیں۔

۹ر جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ یکم نومبر ۱۹۳۰ء شنبہ۔ دہلی

سیاسی } میں نے کمبل اور لحاف کا مناظرہ ایک مضمون خواجہ گزٹ اسکول میں لکھا تھا وہ ایک تعلیمی چیز تھی اخباروں نے اس کو سیاسی بنالیا اور سب نے نمایاں کر کے چھاپا۔ سچ کہا تھا بزرگوں نے ہر آدمی اپنے اوپر دوسروں کو قیاس کرتا ہے۔

قومی } آج صبح آٹھ بجے میاں سر فضل حسین صاحب لاہور سے دہلی میں آئے اسٹیشن پر دہلی کے سب مسلمان عمائد موجود تھے۔ ہر پارٹی اور ہر انجمن کے نمائندے آئے تھے۔ اس سے میاں صاحب کی ہر دلعزیزی اور قومی اعتماد کا اظہار ہوتا تھا۔

تلقین حیات } جب تک خود انسان اپنی ذات پر اعتماد پیدا نہ کرے دوسروں میں اس کا اعتماد پیدا نہیں ہو سکتا۔

میرزا محبوب بیگ صاحب } بھاری بدن سانولا رنگ۔ درمیانہ قد۔ عمر چالیس سے زیادہ آنکھیں بڑی بڑی۔ ڈاڑھی طویل و عریض۔ محنتی اور کاروباری دماغ رکھنے والے مسلمان ہیں۔ دہلی کے سب رسالے اور اخبار انہی کے چھاپہ خانہ میں چھپتے ہیں۔ جیسی نرم مزاجی اور برداشت کاروباری آدمی کے لئے ہونی چاہئے وہ ان میں موجود ہے۔ میرا ان کا تعلق بہت پرانا ہے۔

ذاتی } ساڑھے چھ بجے کام ختم کر دیا۔ مولانا عبداللہ سیفی اور غزالی خاں اور واحدی صاحب کے ہمراہ ریلوے اسٹیشن پر گیا۔ جہاں دہلی کے بہت سے مسلمان عمائد جمع تھے۔ آٹھ بجے فرنٹیر میل آیا اور میاں سر فضل حسین صاحب ٹرین سے اترے۔ میں نے مصافحہ کیا اور دہلی کی طرف سے ان کے خیر مقدم میں مختصر تقریر کی۔ پھر مسلمان عمائد نے گوٹے کے اور پھولوں کے ہار پہنائے۔ میاں صاحب نے مختصر الفاظ میں سب کا شکریہ ادا کیا۔ چہرہ سے ان کی صحت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ نہایت دانشمند اور عملی مسلمان ہیں۔ بولتے کم ہیں کرتے زیادہ ہیں سر حبیب اللہ کی جگہ مقرر ہوئے ہیں کئی محکمے گورنمنٹ آف انڈیا کے ان کے ماتحت ہیں۔

یہاں سے روانہ ہو کر میڈن ہوٹل میں گیا۔ ہز ہائی نس نواب صاحب خیر پور سے ملا۔ وہ شیعہ جماعتوں کے اختلافات دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہوں نے نہایت عمدہ تقریر کی اور یہ بھی کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ شیعہ سنی کے اختلافات دور ہو جائیں اور مسلمان ایک متحدہ قومیت اختیار کر لیں۔ مجھ سے کہا۔ میں آپ کو اپنا پیر سمجھتا ہوں آپ بھی اس کام میں میری مدد کیجئے میں نے کہا آپ سندھ کے تاجدار ہیں۔ تو ہندوستان میں مسلمانوں

ے اٹھنے کا دروازہ ہے۔ اور آپ کے اس نیک ارادہ کی
رکت ہر مسلمان کے لئے ضروری اور لازمی ہے۔ میں بسروچشم
پ کی تائید وحمایت میں کام کروں گا۔ واحدی صاحب
ر میرے ساتھیوں پر نواب صاحب کے عمدہ خیالات
بہت اچھا اثر ہوا۔

میڈن ہوٹل سے گھر میں واپس آیا۔ کھانا کھا کر
م شروع کیا اور تین بجے تک سب کام پورا کر دیا۔
رد ہلی گیا۔ جموں سے غلام رسول نظامی آئے تھے۔ حکیم ماہر
ا حب اکبر آبادی اپنی نئی طبی تصانیف لائے تھے۔ شام کو
احدی صاحب کے ہاں کھانا کھایا۔ پرنس بدرالدین صاحب
نے نعت خوانی کی۔ رات کو بھیا کے ہاں سویا۔ وہاں بھی
بناب جمع ہوئے تھے۔

ا رجمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۲ر نومبر ۱۹۳۰ء
یکشنبہ ۔ دہلی

سیاسی } لاہور سازش کا مشہور مفرور ملزم
آج دہلی میں گرفتار ہوا ہے۔ اس نے
ولیس پر گولی بھی چلائی تھی۔ شہر میں اس کا بہت چرچہ
ہے۔ کہتے ہیں اس کا ایک ساتھی بھی تھا جو بھاگ گیا۔
البًا سیاست میں گرفتار ہونا اور بھاگ جانا دونوں
ائز ہیں۔

قومی } پرسوں غلام محمد کو پھانسی ہو گئی جس کا ذکر
روزنامچہ میں آچکا ہے کہ میں مسلمانوں کے
پوٹیشن کے ساتھ چیف کمشنر کے پاس گیا تھا۔ مسلمانوں
ں اس کا بھی ہر جگہ تذکرہ ہورہا ہے۔ مرحوم پر کسی آریہ
کے قتل کا الزام تھا جس نے مفتی محبوب علی کو شہید
کیا تھا۔

لقین حیات } جو شخص ماضی اور استقبال سے
قطع نظر کرکے موجودہ حال کو
نبھالنا چاہتا ہے وہی کامیاب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد عمر صاحب } گورا رنگ ہے۔ لمبا قد
ہے۔ عمر پچاس سے زیادہ ہے۔ دوہرا بدن ہے۔ ڈاڑھی
مونچھ کے بال کترواتے ہیں۔ میرے فیملی ڈاکٹر ہیں۔ دہلی میں
بہت زیادہ مقبول ہیں۔ ہندو مسلمان دونوں ان کے
عمدہ علاج اور عمدہ توجہ اور عمدہ دواؤں کے معتقد ہیں۔
مزاج میں قدیمی مسلمانوں کی سادگی اور وضعداری اور
بھولپن بھی ہے۔ اگرچہ آزاد خیال ہیں لیکن جلدی ہر شخص
کی بات کا یقین کر لیتے ہیں اور اس سے متاثر ہو جاتے ہیں۔
خدا نے ان کے ہاتھ میں عجیب اثر شفا دیا ہے۔

ذاتی } صبح نماز کے بعد شملہ مسلم ہوٹل میں گیا۔ پرنس
بدرالدین نظامی فرزند نواب صاحب مانگرول
کے بچوں کو دیکھا جو موسمی بخار میں مبتلا ہو گئے ہیں۔
ہوٹل میں انگریزی اخبار علی گڑھ میل کے ایڈیٹر صاحب
سے بھی ملاقات ہوئی۔ بات چیت سے لائق مسلمان معلوم
ہوتے ہیں۔ بدر صاحب میرے ہمراہ پیدل بھیا کے مکان
پر آئے۔ ان کا سادہ لباس اور میرے ساتھ پیدل چلنا
مجھ پر بہت اثر کرتا تھا۔ میں نے کہا بدر شاہ تم تو اس
وقت پرنس نہیں ایک درویش معلوم ہوتے ہو اگرچہ
تمہارے والد بھی حکمراں ہونے کے باوجود نہایت سادہ
اور منکسر مزاج مسلمان ہیں لیکن تمہاری یہ درویشانہ ادا
مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی ہے ماسٹر حفیظ نظامی کی
قیام گاہ پر گیا۔ ان کی بیمار اہلیہ کو دیکھا پھر بھیا کے ہاں
آکر کھانا کھایا۔ واحدی صاحب اور رحمانی صاحب اور
غزالی خاں اور بدر صاحب بھی شریک تھے۔ قلندر جنگ
نظامی اور پروفیسر شمشاد علی صاحب ایم۔ اے بھی
ملنے آئے۔ کپور تھلہ سے منشی اسمٰعیل نظامی اور رائل پور
سے حافظ عبداللہ صاحب رئیس بھی ملنے آئے۔ حکیم
عبدالحی صاحب انصاری بھی آئے۔ ماسٹر حفیظ اور بدر
صاحب نے نعتیں اور مرثیے اور غزلیں پڑھیں۔

قلندر جنگ نظامی نے بھی مجذوبانہ انداز سے غزلیں
پڑھیں۔ مراد آباد سے بھائی سید محمد صاحب اپنے صاحبزادہ
کے ساتھ ملنے آئے۔ دس بجے کے بعد نواب صاحب چھپوسے

ملنے گیا۔ پھر رائے بہادر للا پارسداس صاحب سے ملا۔ پھر خان بہادر تصدق حسین صاحب سے ملنے گیا۔ اور عباسی صاحب انجینیئر اور ایچ۔ ایم خاں صاحب سے بھی ملا۔ گھر میں آکر کام کیا۔ پھر شام کو دہلی گیا۔ مغرب سے پہلے واپس آگیا۔ حسین کے بخار میں کمی ہے۔ رات کو انعام الرحیم صاحب ملنے آئے تھے۔ پارہ صبح ۶۰ درجہ پر تھا۔ سردی ٹھہر رہی ہے۔ بھائی سید محمد صاحب شام کو مرادآباد چلے گئے۔

۱۱ر جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۳ر نومبر ۱۹۳۰ء
دوشنبہ۔ دہلی

سیاسی } سرحدی لام بندی کا چرچا اب ہندوستان کے مسلمانوں میں زیادہ بڑھ رہا ہے۔

قومی } ہز ہائی نس نواب میر علی نواز بہادر تاجدار خیرپور سندھ نے دہلی کی انجمن اسلامیہ کو چار ہزار روپے اور شیعہ انجمن کو ڈھائی ہزار اور دوسرے تاریخی اور علمی مرکزوں کو امداد دی ہے۔ اس کا دہلی میں آج بہت زیادہ اعتراف کیا جا رہا ہے۔ آج بخارا۔ سرحد۔ چترال وغیرہ مقامات کے علماء کا وفد بھی نواب صاحب کے پاس ایڈرس دینے گیا تھا۔ وسط ایشیا کے علماء اگر جھکے تو اس حکمران کے سامنے جس کا ملک سندھ مسلمان قوم کی ابتدائی فتوحات کا دروازہ ہے۔

تلقین جیات } سخاوت ہر عیب کو ڈھک لیتی ہے اور بخیلی ہر ہنر اور صفت کو عیب دار بنا دیتی ہے۔ جو خرچ کرتا ہے اسی کو خرچ کرنے کے لئے ملتا ہے۔

حیدر } بھیا احسان کا قدیمی ملازم ہے۔ ستر کے قریب عمر ہے۔ آنکھوں سے معذور ہو گیا ہے۔ بھیا کے بچے اس کو دادا کہتے ہیں۔ ایسا خیر خواہ اور دیانت دار نوکر آجکل مشکل سے ملتا ہے۔ بھیا جیسا قدر دان آقا ہو اور حیدر جیسا نوکر ہو تو پھر کسی گھر میں سوراج مانگنے کی ضرورت نہ رہے۔

ذاتی } دو بجے تک کام ختم کر کے دہلی گیا۔ نیازی صاحب کو بخار ہو گیا تھا۔ آج اپنے ہاتھ سے ہی کام کیا۔ اس قبرستان کو دیکھا جس کا گورنمنٹ سے جھگڑا ہے اور جہاں اروِن اسپتال بننے والا ہے۔ مغرب کے بعد تک واحدی صاحب کے ہاں رہا۔ کھانا بھی وہیں کھایا آغا محمد طاہر بھی شریک طعام تھے۔

بعد مغرب واحدی صاحب اور آغا صاحب کے ہمراہ نواب صاحب خیرپور سے ملنے گیا۔ کچھ دیر بات چیت کر کے واپس آیا۔ نواب صاحب کل صبح خیرپور واپس جائیں گے۔

آٹھ بجے گھر پہنچا۔ سید ابن عربی کے ساتھ مل کر خلاصہ سیرت نبوی ﷺ کی کاپیاں درست کیں۔ دس بجے سویا چار بجے بیدار ہوا۔ پارہ ۶۲ درجہ پر تھا۔ نماز کے بعد ۶۰ درجہ پر آگیا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر صدر اعظم حیدرآباد نے سیرت نبوی ﷺ کی بہت تعریف لکھی ہے اور دو سو روپے کی کتابیں جیب خاص سے منگائی ہیں۔ گورنمنٹ آسام کے محکمہ تعلیم نے اطلاع دی ہے کہ سیرت نبوی اس صوبہ کی لائبریریوں اور اسکول کے انعامات کے لئے منظور ہوئی ہے۔ ریاست الور نے بھی یہ کتاب محکمہ تعلیم کے لئے منظور کر لی ہے۔

بقیہ صفحہ

سے پہلے کی شرطیں یہ ہیں کہ مال حلال ہو، دوسرے کسی نیک اور پرہیزگار شخص کو دیا جائے جو اس روپے کو ممنوعہ مصرف میں خرچ نہ کرے۔ دینے کے بعد کی یہ ہیں کہ جو کچھ دے خوش دلی اور عاجزی کے ساتھ دے، دوسرے یہ کہ پوشیدہ طریقے سے دے اس کا پروپیگنڈا نہ کرے، تیسری اور آخری شرط یہ کہ دے کر کبھی احسان نہ جتائے۔

یہ تو خیر درویشوں کا کردار ہے، عام مسلمانوں کو بھی شریعت کے ظاہری احکام کا ضروری علم ہونا چاہیئے خصوصاً بنیادی ارکان دین کا۔ اور ان میں بھی زکاۃ کی شرطیں جو شریعت نے بتائی ہیں ان کا جاننا اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

ری قسط

مفتاحُ الخزاین

حالات و ملفوظاتِ حضرت خواجہ شاہ عبدالہادی چشتی امروہوی قُدِّسَ سِرُّہٗ

(۹)

تالیف : سید شاہ نثار علی بخاری بریلوی علیہ الرحمۃ

ترجمہ : پروفیسر نثار احمد فاروقی

پچ کو آنچ نہیں

روایت ہے کہ ایک دن آنحضرت سچائی اور راست گوئی کے ے میں گفتگو فرما رہے تھے کہ سچائی نجات کا سبب ہوتی اور جھوٹ ہلاک کر دیتا ہے۔ اس کے مطابق جناب لت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث شریف دْقُ یُنْجِي وَالْكِذْبُ يُهْلِكُ اور اسی کے موافق ت غوث الثقلین (رضی اللہ عنہ) کا قصّہ بیان فرمایا کہ ۔ آں حضرت رض حصول علم کے لیے اپنی والدہ ماجدہ رض سے ست ہونے لگے تو حضرت کی والدہ نے چالیس دینار ان پیراہن مبارک میں سی دیے اور ہر حال میں ہمیشہ سچ نے کی تاکید فرمائی۔ جب آں حضرت رض نے بغداد کا رخ ، تو راستے میں ڈاکوؤں نے قافلے کو گھیر لیا اور سارا واسباب لوٹنا شروع کر دیا۔ ان ڈاکوؤں میں سے نے حضرت رض کے پاس بھی آکر پوچھا کہ "کیا تمہارے ا بھی کچھ نقدی ہے"؟ آں حضرت رض نے فرمایا کہ "چالیس ر میرے خرقے میں (سلے ہوئے) ہیں"۔ اُس شخص نے ں بات کو ٹھٹھول سمجھا، اور چلا گیا۔ دوسرا آیا سے بھی آپ نے یہی فرمایا۔ اُس نے بھی یقین نہ ا، یہاں تک کہ یہ بات ڈاکوؤں کے سرغنہ تک پہنچی، اُس نے خرقۂ مبارک کو اُدھیڑ کر دیکھا تو واقعی چالیس دینار نکلے۔ سرغنہ نے پوچھا کہ عام دستور کے خلاف تم نے اس بات کا اظہار کیوں کیا؟ آں حضرت رض نے فرمایا کہ میری والدہ ماجدہ رض کا حکم تھا کہ ہمیشہ سچ بولوں۔ ڈاکوؤں کا وہ سارا گروہ اس سچائی کی برکت سے اپنے افعال سے تائب ہو گیا۔ مقصود یہ کہ سچ بول کر آں حضرت رض کو خود بھی نجات ملی اور دوسروں کو بھی ہدایت نصیب ہو گئی۔

اسی مفہوم کی مناسبت سے ایک حکایت حضرت خواجہ حسن بصری (رضی اللہ عنہ) کی بھی آپ نے ارشاد فرمائی کہ ایک دن حضرت خواجہ اپنے مخالفوں سے بچ کر، جو آپ کو ایذا دینے کے درپے تھے، حضرت حبیب عجمی (رضی اللہ عنہ) کی کٹیا میں پہنچے، اور ایک کونے میں چھپ گئے۔ ڈھونڈھنے والے پیچھے پیچھے آئے اور اُن کے بارے میں دریافت کیا۔ حضرت حبیب عجمی رض نے کہا کہ خواجہ گھر کے اندر ہیں۔ اُن لوگوں نے ہر چند ڈھونڈھا آپ نہیں ملے تو یہ سمجھے کہ حضرت (حبیب عجمی رض) نے مذاق میں کہہ دیا ہے۔ جب وہ لوگ گھر سے باہر نکل گئے تو حضرت خواجہ (حسن بصری رض) نے اندر سے آکر فرمایا: "اے حبیب تم نے میرا پتا کیوں بتا دیا؟" انھوں نے عرض کیا کہ آپ نے سچ

بولنے کی ہدایت فرمائی ہے اگر میں جھوٹ بولتا تو یہ (آپ کے فرمان کی) خلاف ورزی ہوتی، اللہ تعالیٰ نے میری سچائی کی برکت سے آپ کو بھی مخالفوں کے ہاتھ سے بچا لیا اور مجھے بھی صدق کے خلاف عمل کرنا نہ پڑا۔

اِن دونوں قصّوں کا خلاصہ یہی ہے کہ ہر حالت میں سچائی کو اختیار کرنا چاہیئے کہ وہی موجبِ نجات ہے۔

عبادت پر گھمنڈ نہ کرے

روایت ہے کہ ایک دن آں حضرتؒ فرما رہے تھے کہ "آدمی کو چاہیئے اپنے زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت پر گھمنڈ نہ کرے، نہ اُن پر بھروسا کرے، کیوں کہ نجات کا مدار حسنِ خاتمہ پر ہے۔" اِسی سلسلے میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ "ایک دن حضرت بایزید بسطامی (رضی اللہ عنہ) اور (حضرت) ابراہیم ادہم (رضی اللہ عنہ) (حضرت) رابعہ بصری (رضی اللہ عنہا) سے ملاقات کرنے گئے۔ رابعہؒ اُس وقت نہانے کے بعد اپنے سر کے بال خشک کر رہی تھیں۔ اسرارِ حقیقت کے شناسا اِن دونوں (بزرگوں) کے آنے کی خبر پاکر، اُنھوں نے ابراہیم (ادہم) کو اندر طلب کر لیا، اور بایزید (اپنے) گھر کو واپس آگئے۔ رابعہؒ نے اِس کے لیے یہ معذرت پیش کی کہ اے بایزیدؒ ابراہیمؒ نے سلطنت چھوڑ کر (درویشی کی) اس راہ میں قدم رکھا ہے اور مجھ جیسی ہزاروں خادمائیں اور کنیزیں (اُن کے محل میں) رہی ہیں، اِس لیے وہ سیر چشم ہیں، میں نے جان لیا کہ وہ میری طرف نظرِ التفات نہیں ڈالیں گے، مگر آپ کو اِن باتوں سے حصّہ نہیں ملا ہے، ہوسکتا ہے کہ آپ کا خیال دگرگوں ہو جائے اور آپ اللہ کے نزدیک ماخوذ ہوں، اس لیے میں نے اِس حالت میں آپ کو (گھر کے اندر) طلب کرنا مناسب نہ سمجھا۔

در راہِ مولیٰ مرد باید

بایزیدؒ نے کہا کہ اے رابعہ کیا تم مجھ سے نکاح کرنا پسند کروگی؟ رابعہؒ نے کہا کہ "اے بایزیدؒ طالبِ مولیٰ مذکّر (نر) ہوتا ہے، اور نر کا عقد نر سے نہیں ہوا کرتا۔ اگر وہ طالبِ دنیا ہے تو مونّث (مادہ) ہے۔ مؤنّث کا نکاح بھی مونّث سے نہیں ہوسکتا۔ اور اگر طالبِ عقبیٰ ہے تو مخنّث ہے، مخنّث کا عقد بھی مخنّث سے نہیں کیا جاسکتا۔ اگر تم مرد ہو تو بتاؤ۔" بایزید خاموش ہوگئے اور اس بات کا جواب پھر کسی وقت کے لیے اُٹھا رکھا۔ یہاں تک کہ بایزیدؒ کی اِس دنیا سے رحلت کا وقت آگیا۔ (حضرت) رابعہؒ اُن کے جنازے پر حاضر ہوئیں اور کہا کہ "آپ نے اب تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" بایزیدؒ نے کفن سے سر باہر نکالا اور کہا کہ "اے رابعہؒ آج مجھے معلوم ہوا ہے کہ مرد ہوں، مردانہ وار جا رہا ہوں، ورنہ آج تک مجھے یقین نہیں تھا۔" یہ کہا اور پھر سر نیچے رکھ لیا۔"

اِن باتوں سے حضرتؒ کا مدّعا یہی تھا کہ اپنے اعمال پر مغرور ہونا نادانی ہے، اگر اللہ تعالیٰ خاتمہ درست کر دے تو مرد ہے ورنہ نہیں۔

جس کا کام اُسی کو ساجے

روایت ہے کہ ایک دن آں حضرتؒ فرما رہے تھے کہ ہر شخص کو لازم ہے کہ اپنے اندازے (حیثیت) سے باہر قدم نہ رکھے کیوں کہ اس میں ترکِ ادب بھی ہے اور یہ خوف کا مقام بھی ہے۔ اِسی سلسلے میں آپ نے ایک حکایت بیان فرمائی، کہ ایک دھوبی کے پاس ایک گدھا تھا اور ایک کتّا تھا۔ وہ گدھے کو اپنے کاموں (میں مدد لینے) کی وجہ سے خوب پیٹ بھر کے گھاس دانہ کھلاتا تھا اور کتّا تنگی ترشی سے زندگی بسر کرتا تھا۔ اُس پڑوس سے کوئی لقمہ یا کوئی ہڈی بھکاریوں کی طرح اُسے مل جاتی تھی اُسی پہ گذر کر لیتا تھا۔ مگر دھوبی کا ساتھ نہ چھوڑتا تھا، اور راتوں کو رکھوالی کرتا تھا ایک دن اُس دھوبی کے گھر میں چور گھس آیا کتّے کی آواز فاقے کرتے کرتے بہت کمزور ہوگئی تھی وہ بھونک نہ سکا گدھا جو نعمتوں میں پرورش پائے ہوئے تھا اُس نے کتّے سے کہا کہ گھر کے مالک کو جگانا چاہیئے کتّے نے اپنی کمزوری کی وجہ سے کچھ تساہل کیا اور طرح دے گیا بے تمیز گدھے نے بڑی وفاداری دکھائی اور دھوبی کے سرہانے آکر

رسے رینگنے لگا تاکہ وہ جاگ جائے اور چور کے شر
سے بچ جائے۔ گدھے کی اونچی آواز سے دھوبی گہری نیند
ے جاگ اٹھا اور اس کو یہ فریاد اس وقت بہت
گوار گذری اٹھ کر لکڑی کے دو چار ہاتھ اس کے سر
ر جڑ دیے۔ گدھے نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔
لاصہ یہ کہ پاسبانی کا اور (مالک کو) جگانے کا کام
تے کا تھا دوسرے کسی نے یہ کام کیا تو اپنی سزا
گیا۔

کارِ خود کن کارِ بیگانہ مکن
در زمینِ دیگراں خانہ مکن

(اپنا کام کرو، دوسرے کے کام میں مت اڑو۔
وسروں کی زمین میں اپنا گھر مت بناؤ)

کیمیائے است عجب بندگی پیرِ مغاں

شیخ الاسلام مولوی
ے روایت ہے کہ جس زمانے میں مجھے اس ہادی برحق کے
ضور میں ملازمت کا شرف حاصل ہوا ان دنوں میرے
ل میں کیمیا اور اکسیر بنانے کا خیال جما ہوا تھا اور
و لوگ اس فن کی بھٹیاں جلانے کے ماہر تھے اور اس
ولت کو حاصل کرنے کے شوق کی کٹھالی میں سونے
ی طرح ہوس (کی آگ) سے پگھل رہے تھے ان سے
س موضوع پر خوب گفتگو اور بحث ہوا کرتی تھی۔
سی زمانے میں محمد اعظم نامی ایک شخص حضرت شاہ دانا
ما حبؒ کی درگاہ کے قریب ٹھہرے ہوئے تھے اور اس
لم میں ان کی شہرت کا ڈنکا بج رہا تھا، انھوں نے
لم کیمیا میں اپنی معلومات کا علم (جھنڈا) آسمان تک
لند کر رکھا تھا مجھے بھی اس امید کے حصول (کی تمنا)
یں ان کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا مگر ان کے مزاج
کے استغنا کی وجہ سے مدعا حاصل نہ ہوتا تھا، ہر چند
یں اپنی آرزو کے تانبے کو اس طلا ساز کی (محبت کی) آگ
یں پگھلاتا تھا مگر وہ اس کی کم توجہی اور بے التفاتی کے
سبب سے کوئی رنگ نہ پکڑتا تھا۔ ناچار ایک دن اس
مرشد کامل (حضرت شاہ عبدالہادیؒ) کے حضور میں یہ
احوال عرض کیا گیا اور ان سے مدد فرمانے کی التجا کی گئی۔
آں حضرتؒ نے قرآن کریم کی سورتوں میں سے ایک سورۃ کی
طرف اشارہ کیا کہ اس کو چند بار پڑھ کر کھانے پر دم کرو
اور اس کیمیا ساز کو کھلا دو، قوی امید ہے کہ فضل الٰہی سے
وہ (کیمیا کا) راز ظاہر کر دے گا۔ اگرچہ پہلی فرصت میں،
اس سبب سے کہ طمع کی دیگ جوش پر تھی اس کی
مہمانداری کا سامان مہیا کر کے میں نے وہ سورۂ مبارکہ
پڑھی مگر اچانک وہ ہوس (کیمیا سازی) میرے گوشۂ
دل سے رخصت ہو گئی اور آں حضرتؒ کے ارشاد
کی تاثیر سے وہ شخص جو کبھی ہرگز کسی کی گذارش پر
کان نہ دھرتا تھا، خود آیا اور یہ درخواست کرنے لگا
کہ وہ اپنے سینے کا راز مجھے بتانا چاہتا ہے۔ مگر میں نے
اپنے دل میں اس (راز) کو حاصل کرنے کا ذوق مطلق نہ
پایا بلکہ اس کی صحبت سے نفرت اور کدورت ہونے لگی
اور وہ (کیمیا سازی کا) خطرہ قطعاً دل سے نکل گیا۔
مولوی صاحب مذکور سے ہی منقول ہے کہ اسی زمانے میں
ایک دن میرے دل میں یہ آئی کہ اکسیر کیا چیز ہے جو اتنی
نایاب ہے۔ آں حضرتؒ اس چھوٹے کنوئیں کی مینڈھ پر
تشریف رکھتے تھے جو نئے باغ میں بنایا گیا تھا آپ پر
یہ خطرہ منکشف ہو گیا ایک مٹھی ریت اپنے ہاتھ میں لے کر
فرمایا: "لو یہ اکسیر ہے" اس وقت اس شیر بیشۂ تقدس
کی ایسی ہیبت اور رعب میرے دل پر طاری ہوا کہ بس
یہی عرض کیا "حضرت یہ مجھے مطلوب نہیں، حضور کی نظرِ
التفات جو ہم نیازمندوں کے وجود کے تانبے کے لیے
(سونا بنانے والی) کیمیا کا حکم رکھتی ہے بس وہ درکار ہے"۔

کیمیائے است کہ در صحبتِ درویشاں است

(کیمیا وہی ہے جو درویشوں کی صحبت میں ملتی ہے)

دوست کا وعدہ

منقول ہے کہ ایک دن آں حضرتؒ نے توکل اور خدا پر بھروسا کرنے
کے بارے میں ارشاد فرمایا: "فقیر کو چاہیے کہ کسی حال

میں بھی اُس کا مطمحِ نظر حق کے سوا کچھ نہ ہو، ماسوی اللہ پر اپنی آنکھوں کو بند کرلے، جو بھی اُمید رکھے اُسی سے رکھے۔" اِسی سلسلے میں ایک حکایت بیان فرمائی کہ حضرت رابعہ عدویہ قدس اللہ اسرارہا توکل میں مشغول تھیں، ایک دن ایک مہمان حضرت رابعہؒ کے گھر میں آیا، اُسی وقت کوئی شخص حضرت رابعہؒ کے لیے دو روٹیاں لے کر آیا۔ مہمان نے سوچا کہ (رابعہؒ) اِن روٹیوں کو آدھا آدھا بانٹ لیں گی۔ اُسی وقت ایک سائل نے آواز دی رابعہؒ نے وہ دونوں روٹیاں اُس سائل کو دے دیں۔ مہمان کو تعجب ہوا کہ مہمان کے ہوتے ہوئے بھی اُنھوں نے روٹیاں دوسرے کو کیوں دے دیں؟

کچھ دیر کے بعد ایک باندی اٹھارہ نان لے کر آئی۔ رابعہ رضی اللہ عنہا نے اُنھیں گن کر واپس کر دیا اور کہا کہ اللہ کا وعدہ خلاف نہیں ہوتا شاید ان روٹیوں میں کچھ خیانت ہوئی ہے۔ باندی اپنی مالکن کے پاس واپس گئی اور مزید دو روٹیاں لے کر واپس آئی۔ اُس کی مالکن نے کہا کہ میں نے (۲۰) روٹیاں بھیجنے کو سوچا تھا، دو بھولے سے رہ گئیں۔ جب بیس کا عدد پورا ہوگیا تو اُس مہمان نے رابعہ سے اِن معاملات کا احوال پوچھا۔ فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ ایک خرچ کرنے پر دس دیتا ہے، میں نے اُس کے نام پر دو روٹیاں دی تھیں، اُس نے مجھے بیس روٹیاں بھیج دیں تاکہ میں جان لوں کہ دوست کا وعدہ خلاف نہیں ہوا کرتا۔ اللہ تعالیٰ سے یہ معاملہ اور سوداگری تمہاری مہمانی کی وجہ سے تھی۔"

حضرتؒ کے ارشاد کا خلاصہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پر اس طرح بھروسا کرنا چاہیے۔

ابھی دل وطن میں ہے!

حضرت شاہ نعمت علی صاحبؒ سے منقول ہے کہ اکثر اوقات اس فقیر کے دل میں یہ بات گذرتی تھی کہ اپنے وطن (بریلی) میں (گھر والوں کی) معیشت اور اسباب کا حال سمعِ مبارک تک پہنچاؤں مگر اس کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ گذارش کرسکوں۔ ایک دن آں حضرتؒ نے بطورِ حکایت فرمایا کہ حضرت ابراہیم (ادہمؒ) اپنے پیرِ طریقت کے دروازے پر گئے۔ خادم نے اُنھیں اطلاع کی۔ شیخ نے خادم سے فرمایا کہ ابراہیمؒ کی کمر پر ایک گھونسا مارو، اور جو کچھ وہ کہیں مجھے آکر بتاؤ۔ خادم نے ایسا ہی کیا۔ جاکر ایک گھونسا اُن کی کمر پر لگایا، ابراہیمؒ نے کہا کہ "اگر میں بلخ میں ہوتا تو اس وقت تمھیں کچھ (انعام) دیتا۔" خادم نے جاکر یہی شیخ سے عرض کر دیا۔ فرمایا کہ اُن سے کہہ دو: "اے ابراہیم ابھی تمھیں وطن یاد ہے اور سلطنت کے عیش کی یاد دل سے نکلی نہیں ہے تم ہماری خدمت میں آنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔" یعنی فقیر کو خانگی مال و اسباب سے قطعِ تعلق اختیار کرلینی چاہیے، اور پوری آزادی و تجرید کے ساتھ اس راہ میں قدم رکھنا چاہیے۔

لعلِ شکر فروشِ تو بس چارہ سازِ ما

چونکہ آں حضرت کی کرامات اور خرقِ عادات تواتر اور تسلسل کے درجے کو پہنچ گئی تھیں، اگر اس میں سے ایک شمّہ بھی قیدِ تحریر میں لایا جائے تو اس کے لیے ایک دفتر درکار ہے اور اس کتاب میں ایجاز و اختصار کا لحاظ رکھا گیا ہے اور اس کام کا ارادہ کرنا کاتبِ حروف کے حوصلے سے باہر بھی ہے صرف چند حکایتیں جو اُس عیسوی مرتبت و علوی منزلت کے مُردوں کو زندہ کرنے کی کرامات سے متعلق اربابِ بصیرت کی نگاہ میں آئی ہیں ہزار میں سے ایک اور اندکے از بسیار ہیں آں حضرتؒ کے ارادت مندوں کی عقیدت کے رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے یہاں لکھی جارہی ہیں۔ یہ سب بریلی والوں کی ایک جماعت کے مشاہدات ہیں اور محلہ قاضی ٹولہ کے ثقہ حضرات نے دیکھی ہیں بلکہ بعض اُسی محلے میں واقع ہوئی ہیں۔

طبیبِ بے چارگاں

روایت ہے کہ شیخ غلام حسین کو جو محمد

(قاضی ٹولہ بریلی) کے باشندوں اور عزیزوں میں سے تھے بچپن ہی میں مرضِ دق لاحق ہوگیا۔ شہر کے طبیبوں نے علاج معالجے میں مقدور بھر کوشش کی اور حکمت و حذاقت کی داد دی مگر وہ بیماری روز بروز بڑھتی ہی گئی، یہاں تک کہ درجۂ دوم میں پہنچ گئی کہ اس مرحلے میں اطبا کے نزدیک اس کا علاج بہت دشوار ہوتا ہے۔ سب (گھر والوں) نے اُن سے ہاتھ اٹھا لیا اور جان لیا کہ اب اُن کی شمعِ حیات اِس تپِ استخوانی کے دامن کی ہوا سے بجھنے ہی والی ہے۔ شیخ غلام حسین مذکور کی والدہ آں حضرتؒ سے حسنِ عقیدت کی بناء پر اُنھیں موضع کھائی کھیڑا میں لے گئیں جو ضلع بریلی سے سات کوس کے فاصلے پر واقع ہے، اس زمانے میں حضرتؒ وہاں تشریف فرما تھے اور اس ظاہر و باطن کے طبیب اور دردِ پنہاں میں مبتلا لوگوں کے نبض شناس کے سامنے نہایت عاجزی اور الحاح کے ساتھ پیش کیا کہ اس کے سوا میرا کوئی بیٹا نہیں ہے، اور اب میں سنِّ یاس کو بھی پہنچ چکی ہوں (اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی)۔

حقیقی شفا بخشنے والے (خدا) کے مظہر کی عنایت باطنی کی امید لے کر اس فلک رتبہ آستانے پر آئی ہوں اور اِس کی نئی زندگی کی سوالی ہوں آں حضرتؒ نے فرمایا: "حکیم علی الاطلاق جلّت حکمتہٗ (خدا) شفا بخشے گا۔" دل کو مطمئن کرنے والے اور طمانیت بخشنے والے کچھ کلمات آپ نے ارشاد فرمائے۔ شیخ غلام حسین کو اُن کی والدہ نے وہیں چھوڑا اور خود بریلی کو واپس ہوگئیں اُس روز آپ کے مطبخ میں گول کدو کا سادہ سالن پکا ہوا تھا آں حضرتؒ نے دریافت فرمایا: "غلام حسین کیا کچھ کھاؤ گے" ؟ اگر چہ ایک مدّت سے اُن کی بھوک مر چکی تھی مگر اُس وقت کچھ کھانے کی خواہش محسوس کی۔ آں حضرتؒ نے دو روٹیاں اور کچھ کدو (کا سالن) طلب فرمایا اور اُسے خود تھوڑا سا چکھ کر اپنا اُلش انھیں عنایت کیا۔ غلام حسین نے وہ دونوں روٹیاں سالن سے کھالیں۔ بس وہ آبِ حیات تھا۔ غرض کہ چند روز

اُس شفانشان آستان کی خاک پر جسے درحقیقت خاکِ شفا کہنا چاہیئے قیام کیا۔ اللہ کی حکمت اور حضرتؒ ولایت پناہی کی توجہ (باطنی) کا اثر یہ ہوا کہ وہ مہلک بیماری دفع ہوگئی اور ایک ہفتہ سے زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ وہ صحت مند ہو کر اپنے گھر کو واپس آگئے، طبیبوں نے جب حضرتؒ کی یہ کرامت اور خرقِ عادت معاینہ کی تو سمجھ لیا کہ باطنی طبیبوں (درویشوں) کو دواؤں کے استعمال کے بغیر بھی امراضِ ظاہری کے دُور کرنے کی پوری قدرت ہوتی ہے۔

سب نے آں حضرتؒ کے اشارات کو بشارت اور شفا سمجھ کر عقیدت کی سعادت حاصل کی۔

حیاتِ تازہ

روایت ہے کہ ایک بار شیخ محمد حیات کو جو محلہ قاضی ٹولہ بریلی کے ممتاز افراد میں سے تھے ایک سخت بیماری ہوئی اور اُس مرض نے مدت تک طویل کھینچا ہر چند اُنھوں نے دوا دارو کی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر ایک دن نزع اور سکرات کا سا عالم طاری ہوگیا اور اُن کے جسم سے روح پرواز کر گئی رشتہ داروں نے نوحہ وزاری شروع کر دی۔ اُس زمانے میں ہوائے ولایت کا یہ شاہباز (حضرت شاہ عبدالہادیؒ) اور قافِ قناعت کا یہ سیمرغ اُسی جگہ (بریلی میں) تشریف فرما تھا، شیخ محمد حیات کی موت کی خبر سن کر آپ نے فرمایا کہ "ابھی اُن کی زندگی کا سررشتہ منقطع نہیں ہوا ہے اور اُن کا نخلِ حیات اس بوستانِ عالم میں عمر کا ثمر لانے والا ہے، اللہ کے فضل سے وہ اولاد کے وجود سے بھی کامیاب ہوں گے۔" جو ابھی تک اُن کے ہاں پیدا نہ ہوئی تھی۔

غرض اُس وقت آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ ان (محمد حیات) کے پلنگ کو اٹھا کر گھر کے آنگن میں واقع درخت کے نیچے رات بھر رکھیں ایسا ہی کیا گیا، جب صبح کا وقت نزدیک آیا اور سورج نکلنے والا ہوا تو اُن کے بدن کے مشرق سے بھی خورشیدِ زندگانی طلوع

ہونے کے آثار ظاہر ہوئے۔ اُس بحرزخار (حضرت شاہ عبدالہادیؒ) کی آبیاری سے نہر کا گیا ہوا پانی واپس آگیا اور (محمد حیات کے) بدن کا سوکھا درخت اُس رحمانی نفس کی عنایت کی نسیم کے چلنے سے نئی تازگی حاصل کرنے لگا۔ مگر وہ درخت جس کے سائے میں آپ کے بشارت بھرے اشارے کے مطابق (محمد حیات کو) ساری رات رکھا گیا تھا نیچے سے اُوپر تک پورا سوکھ گیا اور اُن کے عیال و اطفال کے بارے میں جو آپ کی الہام ترجمان زبان سے نکلا تھا کچھ سال گذرنے کے بعد وہ بھی قوۃ سے فعل میں آیا اور شیخ محمد حیات اپنی مدّت حیات کے آخر تک مع اہل و عیال آں جناب فیض مآبؒ کے نیاز مندوں اور معتقدوں میں سے رہے اور آپ کی اطاعت کا حلقہ گوشِ جاں میں پہنے رہے۔

تو یہاں کیوں آئی؟

روایت ہے کہ شیخ محمد اسلم بھی محلہ قاضی ٹولہ (بریلی) کے اکابرین سے تھے اُن کا ایک کم سن بیٹا تھا جس کا نام ریاض الدین تھا، وہ اپنے بیٹے سے بہت محبت اور دل بستگی رکھتے تھے اُسے چیچک کی بیماری ہوگئی اور چند روز کے بعد وہ بچہ اسی بیماری میں جنت کو سدھار گیا اُن کے گھر سے نوحہ وزاری کا شور برپا ہوا آں حضرتؒ (شاہ عبدالہادیؒ) اُس زمانے میں صحن مسجد کے بالائی حصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے اِس فریاد وزاری (کی آواز سن کر اُس) کا سبب پوچھا تو لوگوں نے جو واقعہ تھا اُس کا احوال عرض کیا۔ آں حضرتؒ وہاں سے اُٹھ کر گھر کے اندر تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ وہ بچہ بے حس و حرکت ٹھنڈا پڑا ہوا ہے۔ اُس کے پاس بیٹھ کر آپ نے اپنا دستِ مبارک اُس کی پیشانی اور جسم پر پھیرا اور اس وقت زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے کہ "اے چیچک تو یہاں کیوں آئی؟ کیا تجھے خبر نہیں تھی کہ یہ فقیر یہاں حاضر ہے۔" فرمایا کہ "اِس بچے کو لحاف اور توشک میں لپیٹ کر حفاظت سے رکھیں، اِس پر ٹھنڈ کا غلبہ ہوگیا ہے۔ اللہ کے فضل سے اُسے افاقہ ہو جائے گا۔" ایسا ہی کیا گیا۔ اُس نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور اُسے جسمانی صحت نصیب ہوگئی پھر وہ چند سال تک زندہ رہا۔

سہولی کو سہولت

روایت ہے کہ موضع کھائی کھیڑا میں ایک بڑھیا سہولی نام کی تھی آں حضرتؒ اکثر اوقات اُس سے مزاح اور خوش طبعی کی باتیں کیا کرتے تھے اُس کے گھر میں جو کچھ ترکاری وغیرہ موجود ہوتی تھی فرمائش کرکے بڑی رغبت کے ساتھ تناول فرماتے تھے۔ دنیا میں اُس کی لے دے کے ایک بیٹی تھی جس کو اُس کا عصائے پیری (بڑھاپے کا سہارا) کہا جا سکتا ہے۔ قضارا وہ بیٹی بیمار ہوگئی اور چند روز کے بعد خلوت خانۂ عدم میں دلہن بن کر بیٹھ گئی۔ وہ بیوہ اپنی جھکی ہوئی کمر کے ساتھ فریاد و زاری کرتی ہوئی آنسوؤں کے تار باندھ رہی تھی جب اُس کے نالوں کا شور حد سے زیادہ ہوا، آں حضرتؒ اُس کی فریاد سن کر اُس کے گھر میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ مردہ پڑا ہوا ہے۔ آپ نے اُس بڑھیا سے بہ طورِ خوش طبعی فرمایا کہ شاید شیخ سدّو یا شاہ مدار وغیرہ میں سے کسی کی نذر تیرے ذمہ باقی ہے اِس لیے یہ بے خودی اور غفلت اِس پر طاری ہوئی ہے۔ اُٹھ کر وہ نذر پوری کرنے کی تیاری کر اور چولھا سلگا دے اُس بیوہ نے خیال کیا کہ حسبِ عادت حضرتؒ خوش طبعی فرما رہے ہیں عرض کیا کہ حضرتؒ یہ کون سا موقع مذاق کا ہے؟ آں حضرتؒ نے فرمایا کہ میں مذاق سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ واقعی بات ہے۔ اُٹھ اور (نیاز کی) تدبیر کر۔ پھر اپنا دستِ مبارک اُس بچی کی پیشانی پر پھیرا اور کچھ پڑھ کر اُس پر دم کیا وہ فوراً فنا کے صحرا سے نکل کر شہرستانِ وجود میں آگئی وہ بڑھیا جو حضرتؒ کی خدمت کیا کرتی تھی اُس کا پھل اُسے مل گیا۔

دعا بھی دوا بھی!

منقول ہے کہ مولوی

شیخ الاسلام محلہ قاضی ٹولہ کے ممتاز لوگوں میں سے تھے اُنحضرت کے خاص مرید اور معتقد تھے۔ ایک بار اُنھیں سل کی بیماری ہوگئی اُنھوں نے مقدور بھر علاج معالجے میں کوشش کی مگر یہ خونخوار مرض برابر اُن کے سینے کو کھرچتا رہا اور دل میں طوفان اُٹھاتا رہا۔ ایک دن اپنی عادت کے موافق انھوں نے آں حضرتؒ کی قدمبوسی کا شرف حاصل کیا۔ آں حضرتؒ نے پوچھا کہ "مولوی صاحب آپ کا یہ مرض ابھی تک زائل نہیں ہوا؟ اور آپ سے دست و گریبان ہو رہا ہے۔" عرض کیا کہ "جب آپ کی نظرِ عنایت مبذول ہوگی تو یہ جاتا رہے گا" پھر حضرت وہاں سے اُٹھ کر باغ کے کنارے تشریف لے گئے وہاں کیکر کے درخت تھے اُس کا گوند اپنے ہاتھوں سے چھڑایا، اور اُنھیں عنایت کیا کہ لو اسے کھاؤ مولوی صاحب نے ارشاد کے موافق وہ گوند چند روز استعمال کیا اللہ کی حکمت کاملہ سے صحت یاب ہوگئے اور وہ مہلک مرض ہلاک ہو کر بالکل دفع ہوگیا۔

مُردے کو کھانا!

روایت ہے کہ محلہ قاضی ٹولہ بریلی کے بقال محمد فاضل کی اہلیہ اپنی بیٹی کو لے کر جو بیمار تھی دعائے صحت کے لیے کھائی کھیڑا میں آں حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی ابھی یہ گاؤں تقریباً ڈیڑھ کوس پر تھا کہ موضع دھوراً میں اُس لڑکی نے دم توڑ دیا۔ اُس کی ساتھی عورتوں نے کہا کہ بریلی کو واپس ہو جاؤ اِس مُردے کو حضرت کی خدمت میں لے جانے سے کیا حاصل ہے؟ اُس خوش گمان عورت نے کہا کہ یہاں سے میت کو بریلی لے جانا بہت دشوار ہے وہیں کھائی کھیڑے میں اسے دفن کر دیا جائے گا۔ آخر وہ موضع مذکور میں پہنچی اور وہاں مُردہ بیٹی کو ایک جگہ لٹا کر حضور کی خدمت سے فیض یاب ہوئی اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی تھی یہ چاہا کہ قبر کی جگہ کے لیے حضرتؒ سے التماس کرے، حضرتؒ اُس وقت حجامت بنوانے میں مشغول تھے فرمایا کہ "یہ بات کرنے کا وقت نہیں ہے اِس سے فارغ ہو کر تمہاری بات سنی جائے گی" آپ نے اُسے روٹی کا ایک ٹکڑا عنایت فرمایا کہ تمہاری بیٹی بھوکی ہوگی اُسے جا کر کھلاؤ جب وہ وہاں پہنچی تو دیکھا کہ بیٹی بیٹھی ہوئی ہے اور کھانا مانگ رہی ہے۔ وہ مُردوں کو زندہ کر دینے والی اِس کرامت سے سخت حیرت میں پڑ گئی اور حقیقی جان بخشنے والے (خدا) کے حضور میں شکر کے سجدے بجالائی وہاں سے خوشی خوشی رخصت ہو کر بریلی واپس آگئی۔

خاک را بنظر کیمیا کنند

منقول ہے کہ محمد اشرف خاں افغان وزدک کے بیٹے نصرت خاں ساکن بریلی دق میں مبتلا ہوئے۔ یونانی اور ہندی طبیبوں نے اُن کا بہتیرا علاج کیا اُس کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوا۔ یہاں تک کہ رات دن میں اُن کے خون سے ایک طشت بھر جاتا تھا اور کھانسی نے ان کی تمام نسوں کو کھینچ کر رکھ دیا تھا اُن کی حالت بالکل ناامیدی کی ہوگئی تھی۔ اطبا نے بھی اُن کے حال کی پریشانی دیکھ کر دوا دارو بند کر دی تھی کہ اس مرض سے جان بچانا دشوار ہے محمد اشرف خاں بہت بدحواس ہوگئے چونکہ آں حضرتؒ کی کرامات اور خرقِ عادات کی ہر طرف شہرت تھی رات کے وقت قاضی صدر الشریعت اور کرم خاں کرانی کو ساتھ لے کر موضع کھائی کھیڑا کے لیے روانہ ہوئے جب حضرتؒ کی خدمت میں پہنچے تو آپ کے قدموں میں گر پڑے اور التماس کیا کہ غلام زادہ حضور کی عنایت اور مہربانی سے اِس بلا سے جاں بر ہو جائے قاضی صدر الشریعت اور کرم خاں نے بھی بہت عاجزی اور الحاح کے ساتھ یہی التجا کی۔ آں حضرتؒ نے اُن کا اضطراب اور بے قراری کی حالت ملاحظہ فرمائی تو ایک مٹھی راکھ اپنے چولھے میں سے اٹھائی اور اُنھیں مرحمت فرمائی کہ یہ مریض کو کھلاؤ اللہ تعالیٰ شافیِ مطلق ہے وہ صحت عطا کر دے گا۔ یہ کہہ کر اُنھیں رخصت کر دیا۔ یہ لوگ اپنے

گھر کو آئے اور وہ راکھ مریض کے منہ میں ڈالی فوراً مرض کے اوپر خاک پڑ گئی خون اور کھانسی اُسی وقت موقوف ہوگئی اور ایک ہفتے کے اندر وہ شدید اور مہلک بیماری بالکل جاتی رہی۔

کشفِ خواطر

سیادت مرتبت فضیلت منزلت واقفِ رموزِ خفی و جلی مولوی بشارت علی کا بیان ہے جو ترک و تجرید کی راہ کے چلنے والے ہیں کہ جن دنوں میں آں حضرتؒ موضع کھائی کھیڑہ میں رونق افروز تھے میں اکثر قصبہ سنبھل سے جو سادات عظام کا مسکن ہے، حضرتؒ کی خدمت کا شرف حاصل کرنے کو حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک دن شرفِ ملازمت حاصل کرنے کی نیت سے اور آپ کی صحبت کی برکتوں سے مستفید ہونے کے ارادے سے قصبۂ مذکور (سنبھل) سے متوجہ ہوا اور کسی کو اپنے اس ارادے کی اطلاع نہیں کی۔ لوگوں نے پوچھا بھی کہ کہاں جا رہے ہو مگر میں نے اس کے اظہار میں پہل نہیں کی، سید فقیر اللہ نے کہا کہ میں جانتا ہوں آپ حضرت شاہ عبدالہادی صاحبؒ کی خدمت میں جا رہے ہو۔ اُس وقت ان کے کہنے پر میں نے اس بات کا اقرار کیا۔ جب اِس اربابِ کشف کے امام (حضرت شاہ عبدالہادیؒ) کی خدمت میں پہنچا تو تھوڑی دیر بیٹھ کر آپ اُٹھے اور صحرا کی جانب تشریف لے گئے۔ حاضرانِ محفل نے ایک دو قدم آپ کی موافقت کی اور واپس آگئے، میں تنہا کچھ فاصلے سے حضرتؒ کے پیچھے چلتا رہا آپ نے میری طرف روئے مبارک کیا اور فرمایا کہ "فقیروں کی خدمت میں حاضری کو اپنے لیے اشتہار اور شہرت کا وسیلہ کیوں بناتے ہو؟ کیا اس لیے آتے ہو کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ بھی درویشوں سے ملاقات رکھتے ہیں"؟ میں نے عرض کیا کہ بندہ نے خود کسی سے عرض نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا کہ "سید فقیر اللہ کے یہ کہنے کے بعد کہ یہ فلاں کی خدمت میں جا رہے ہیں تم نے اِس بات کا اقرار تو کیا؟ اگر آنا منظور ہوا کرے تو بغیر کسی کو بتائے آنے کا معمول بناؤ۔" پھر مجھے رخصت کر دیا۔ حضرتؒ کا صاف اور صریح کشف مجھے تحقیق ہوگیا اور حضرتؒ کے بارے میں جو حسنِ ظن تھا وہ پختہ یقین میں بدل گیا۔

فقیر کو چٹخارے سے کیا لینا!

مولوی بشارت علی کی ہی زبانی منقول ہے کہ ایک دن ملّا بہادر نے کچھ پان کے پتّے اور بکرے کے گوشت کا ایک پارچہ ایک شخص کے ہاتھ حضرتؒ کی خدمت میں بطورِ ہدیہ بھیجا اُس وقت میں بھی آپ کی خدمت سراسر سعادت میں حاضری کے لیے جا رہا تھا میرا اس شخص سے راستے میں ساتھ ہوگیا۔ اُس ناقباحت فہم زبان دراز شخص نے جو کوتاہ اندیش اور اللہ والے درویشوں کے حال سے غافل تھا راستے میں مجھ سے کہا کہ آں حضرتؒ کے لیے پانوں کا تحفہ تو ٹھیک ہے کہ کبھی کبھی حضرتؒ کی سانس اکھڑنے لگتی ہے یہ اُس میں مفید ہوتا ہے مگر گوشت کا بھیجنا بے فائدہ ہے کیونکہ فقیر کو زبان کے چٹخارے سے کیا لینا؟ یہ تو آں حضرتؒ مجھے عنایت فرمادیں تاکہ میں اپنے کام میں لاؤں۔

جب وہ اس خطراتِ قلبی سے آگاہ (حضرت شاہ عبدالہادیؒ) کی خدمت میں پہنچا اور وہ ہدیہ پیش کیا تو آپ نے فوراً ارشاد فرمایا: "پانوں کا بھیجنا تو ٹھیک ہے کیونکہ مجھے اکثر ان کی ضرورت پڑتی ہے مگر یہ گوشت ناحق بھیجا ہے" پھر گوشت لانے والے کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: "یہ تم لے لو۔ اس نے تکلف کیا تو فرمایا کہ "فقیر کو زبان کے چٹخارے سے کیا لینا؟" وہ شخص اپنے خطراتِ قلبی سے ڈر گیا اور لرزنے لگا۔ آپ نے پھر فرمایا کہ میں نے اُن کا ہدیہ قبول کرلیا اور اب اپنی طرف سے تمہیں دے رہا ہوں۔ اس شخص نے (گوشت) لے لیا اور اپنے گھر لے آیا۔

یہ دونوں حکایتیں اِس کی بہترین مثال ہیں کہ حضرت کو خطراتِ قلبی اور احوالِ باطن کا کیسا کشف ہوتا تھا جو اس راہ کے حقیقی سالکوں کا حصّہ ہوا کرتا ہے۔

در حضور حضرتِ صاحبدلاں
ہاں نگہدار ید دل، اے عاقلاں
پیش این شمشیرِ بے استر مئیا
کز بُریدن تیغ را نبُود حیا

(اے دانش مندو صاحبدل درویشوں کے حضور میں اپنے دل کو (خطرات سے) بچاؤ اس تلوار کے سامنے بے روک ٹوک مت آؤ کیونکہ تلوار کاٹنے میں کچھ حیا نہیں کرتی)۔

آپ کے سر کی قسم منقول ہے کہ جس زمانے میں آں حضرت براہی کے نواح میں تشریف رکھتے تھے ایک دھوبی نے اپنے تختہ حال کو اپنی ارادت مندی کے نقوش سے درست کیا۔ وہ اپنی عاجزی کے جامے کو عقیدت کے صابن اور نیازمندی کی شست وشو سے صاف کرکے اُس دریائے توحید ومعرفت کی چشمِ عنایت کا امیدوار ہوکر حاضرِ خدمت ہوتا تھا اور جو کچھ خدمت اُس کی استطاعت میں تھی ادا کرکے فخر ومباہات کرتا تھا۔ جب حقیقت کے اس دریائے مواج کی موجیں شہر بریلی کی جانب ملتفت ہوئیں تو اسے حضرتؒ کی خدمت سے محرومی پر ایک زمانہ گذر گیا اس کی طبیعت کی کثافت نے ممنوع باتوں کی طرف رخ کیا اور کوئی بڑا نامشروع فعل اُس سے سرزد ہوگیا جس کی وجہ سے اس پر سب لوگوں کی پھٹکار پڑنے لگی۔ کرامت خاں نے وہ سارا قصہ حضور کی خدمت میں لکھ بھیجا۔ تو حضرت کی طبع ہمایوں کو بہت ناپسند ہوا اُسی زمانے میں وہ دھوبی موضع کھائی کھیڑا میں جہاں اُن دنوں حضرتؒ تشریف فرما تھے حاضر ہوا۔ آں حضرتؒ نے اس معاملے میں اس سے پوچھا کہ کیا ہوا تھا اُس کوتاہ اندیش کم فہم شخص نے بے تامل اپنا ہاتھ حضرت کے سرِ مبارک پر رکھ کر جھوٹی قسم کھائی کہ مجھ سے یہ فعل سرزد نہیں ہوا آں حضرتؒ نے تبسم فرمایا اور وہ ناعاقبت اندیش دھوبی رخصت ہوکر اپنے وطن کو روانہ ہوا۔ قضارا وہ راستے میں کھو گیا اور پھر اُس کا کچھ پتا نشان نہ ملا۔ آں حضرتؒ نے فرمایا کہ مجھے دو بار ہنسی آئی ہے ایک تو رحمت اللہ کے معاملے میں جو پہلے بیان ہو چکا ہے۔ دوسرے اِس دھوبی کے حال پر۔ دونوں اپنے اعمال کی سزا کو پہنچے۔

لب و دندانِ کرامات آں حضرت کہتے ہیں کہ جس زمانے میں آں حضرت موضع کھائی کھیڑا میں رونق افروز تھے آپ کے خلف الرشید شیخ ظہور اللہ صاحبؒ نے اپنے مکان مسکونہ کے قریب (۱۴۱) بیگہ زمین خرید کر اُس میں آموں کا باغ لگایا جب وہ پودے پنپ گئے اور اُن میں پھل لانے کی صلاحیت پیدا ہونے لگی تو وہاں خار پشت جانور (سیہہ) بہت کثرت سے پیدا ہوگئے اُنھوں نے سارا باغ کھود کر پھینک دیا دوسری بار از سرِ نو باغ لگایا گیا۔ پھر اُنھیں جانوروں نے جنھیں ہندی میں سیہہ کہتے ہیں اُن پودوں کو کھود ڈالا۔ تیسری بار اُس حدیقہ ولایت کے نونہال (شیخ ظہور اللہ) نے پھر تگ ودو کرکے باغ لگانے کی تیاری کی۔ دو سال کے بعد پھر اُنھیں جانوروں نے پہلے کی طرح باغ کو برباد کردیا۔ جب اِس معاملے میں عاجز آگئے تو شجر مراد کے اس ثمر (شیخ ظہور اللہؒ) نے جو اس نقصان سے بہت رنجیدہ تھے آں حضرتؒ کی خدمت میں گذارش کی کہ بہت تگ ودو سے چند بار آم کے درخت لگانے کا اتفاق ہو چکا ہے مگر سیہہ ان پودوں کو پنپنے نہیں دیتی۔ جو باغ تیار ہوسکے آں حضرت نے آموں کی قسمِ اول کے سات سو دانے طلب کیے اور ہر ایک کی گٹھلی کو اپنے لب و دنداں سے مس کرکے شرف بخشا پھر وہ سات سو گٹھلیاں یہاں (امروہہ میں) بھیج دیں کہ انھیں باغ میں لگائیں۔ کارسازِ حقیقی کے فضل سے یہ جڑ پکڑیں گی اور خار پشت کے دانت اِن کو نہیں لگیں گے۔ جب آپ کے بھیجے ہوئے وہ تخم لائے گئے تو پھر خار پشت نے اُن کو نقصان نہ پہنچایا اور باغ تیار ہوگیا جو آج تک اپنی سرسبزی وشادابی کے ساتھ موجود ہے[1] اور اسی باغ میں (بعد کو) آں حضرتؒ

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو

کا مزار مبارک بنا جو دور و نزدیک سے آنے والوں کی زیارتگاہ ہے۔

ادراکِ ذات کا عالم

روایت ہے کہ ایک وقت حضرتؒ کو طبیعت کی سستی کی شکایت ہوگئی اور تیز بخار رہنے لگا جب اسی حال میں چندروز گذر گئے اور اس کیفیت میں کوئی فرق نہ آیا تو شاہ نزہت علیؒ اور قاسم شاہؒ جو ہر وقت خدمت میں حاضر رہا کرتے تھے رونے دھونے لگے اور بے قراری واضطراب کا بے قابو ہو کر اظہار کرنے لگے۔ آں حضرتؒ نے فرمایا کہ "آنسو کیوں بہار ہے ہو اور یہ بے قراری کس لیے ہے؟ ابھی ایک حساب سے میری عمر کے سات سال اور دوسرے حساب سے تین سال اور باقی ہیں اور یہ بخار کی شکایت عارضی ہے اسے مہلک نہیں سمجھنا چاہیئے۔ شافی برحق (اللہ) کے فضل سے دور ہو جائے گی۔" آخر چند روز کے بعد بخار جاتا رہا اور وہ کمزوری بھی صحت سے بدل گئی تین سال کے بعد آپ نے اس جہان ناپائدار سے عالمِ بقا کی طرف کوچ کیا اور اس کا حساب یوں تھا کہ آپ نے اپنی عمر شریف کے چار سال خود کرامت خاں کے بہنوئی بازید خاں کو دے دیئے تھے جب وہ بیمار ہوا تھا اس کا قصہ تیسرے باب میں گذر چکا ہے۔ محاسبِ حقیقی (اللہ) نے وہ چار سال آپ کی عمر شریف سے منہا کر لیے۔

آخری مرض اور وفات

روایت ہے کہ جب آں حضرت کو آخری مرض لاحق ہوا اور آپ صاحبِ فراش ہوگئے تو اس بیماری نے طول پکڑا۔ حضرت شاہ عبدالباریؒ آں حضرتؒ کے پوتے پاس موجود تھے جب روزِ موعود آیا آں حضرتؒ نے خادموں اور ارادت مندوں کو نصیحتیں اور وصایا کیے۔ حاضرین کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں ہو گیا اور آپ کی جدائی کا خیال دل میں جم گیا۔ ان سب کے رونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ آں حضرتؒ کو امروہہ لے جائیں گے اور اس علاقے (کھائی کھیڑا) کے لوگ زیارت سے محروم رہ جائیں گے حضرتؒ نے فرمایا کہ "یہ واقعہ (موت) ناگزیر ہے کسی کو بھی اس سے مفر نہیں۔ میں یہاں بھی تم لوگوں سے جُدا نہیں ہوں۔"

آخر جمعہ کے دن دوپہر کے قریب رمضان کی چوتھی تاریخ کو ۱۱۹۰ھ میں آپ نے رحلت فرمائی۔ آپ کی روحِ مبارک جسم خاکی کو اس خاک دان میں چھوڑ کر ریاضِ جنت کی طرف چلی گئی۔ (قطعہ تاریخ)

سوئے ملکِ جاوداں رحلت نمود
شاہ عبدالہادیؒ والا مقام
آن محبِّ خاصہ پروردگار
بے تعلق بود از خاص وعوام
روزِ جمعہ چارمیں از ماہِ صوم
بود، کامد از درِ ایزد پیام
سالِ تاریخش بجُستم از خرد
تا بود آن یادگارِ ہر کدام
گفت ہاتف بادلِ قلبِ سلیم
رفت ہادی رابعِ ماہِ صیام

۱۱۶۰ + ۳۰ = ۱۱۹۰ھ

جمعہ ۴ رمضان المبارک کو موضع کھائی کھیڑا میں دفن کیے گئے چنانچہ اس جگہ آپ کا عرس رمضان

لہ حضرت شیخ ظہور اللہؒ کا لگایا ہوا یہ باغ حضرت شاہ عبدالہادیؒ کے روضۂ مبارک کے ساتھ ہی بہت گھنا اور سرسبز تھا، یہ درگاہ کی زمین کے ساتھ وقف تھا مگر غالباً ۱۹۴۵ء میں بعض لوگوں نے اُس کے پیڑ کاٹ کر بیچ ڈالے اب جو باغ وہاں ہے وہ پہلے باغ کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے اور ۲۰ — ۲۵ سال قبل کا لگا ہوا ہے۔

ی چوتھی تاریخ کو ہوتا ہے۔ اس کے بعد پہلی شوال کو آپ
ی نعش مبارک یہاں سے نکال کر امروہہ کو لے گئے
ور ۸؍ شوال کو وہاں دفن کیا گیا۔ وہاں (امروہہ میں)
پ کا عرس شریف ۸؍ شوال کو ہوتا ہے[1] آپ کے
لف الصدق حضرت شیخ ظہور اللہؒ کے باغ میں اس
نصر لطیف کا مزار شریف ہر پاک ولطیف کی زیارت گاہ
ہے۔

خاتمہ کتاب صوف پوش قلم کا صوفی
صفحہ کتاب میں اس موجد کا شکر ادا کرنے کے اشغال
یں تر زبان ہے جس نے اس مختصر کرامت نامہ کو اپنی
نابت سے اختتام کا خرقہ عطا کیا اور قلم معرفت کوش کا
خانقاہ نشین دعاؤں کے مقصورے میں اس واحد کی
بیاز مندی کی تسبیح پڑھ رہا ہے جس نے اس کی
جان کے سر پر دوتہ کی تاج رکھا۔
..... خاکسار نے محض اللہ کے لیے، کسی
تحسین وآفریں کا خیال کیے بغیر سالکان مراحل طریقت کے امام
ور رہروان منازل حقیقت کے پیشوا، قاف جبروت کے
عنقا، ہوائے لاہوت کے شہباز، آزادی کا جھنڈا بلند
کرنے والے حضرت شاہ عبدالہادی قدس اللہ سرہ العزیز
کی چند کرامتیں اور کشف وکرامات کی حکایتیں جمع
کرکے لکھ دی ہیں، اور اس ثواب آخرت کے باعث
شاہ نزہت علی شاہؒ ہوئے ہیں، کہ انھوں نے
خود بھی ثواب کمایا اور سعادت کا ذخیرہ اپنے لیے فراہم
کیا اور اس خاکسار کو بھی اس ثواب عظیم میں داخل
کرلیا۔ ..... کوئی نیک کام اگر محض اللہ کے لیے
ہو تو اس میں دونوں جہان کی بھلائی مضمر ہوتی ہے
اور وہ ذخیرۂ سعادت بن جاتا ہے۔
اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اپنے فضل وکرم سے
اس عمل کی توفیق عطا فرمائے آمین یا ربّ العالمین۔

شدہ این کتاب خوارق تمام
بہ حق محمد علیہ السلام
الٰہی طفیل بزرگان دیں
نگاہ ترحّم بر ایں خوشہ چین
ہمہ عمر دادم بہ غفلت تمام
ہم از صبح تا آخر وقت شام
بہر سو کہ کردم زحیرت نگاہ
بجز درگہ تو ندیدم پناہ
برائے محبّان نیکو سیر
ز جرم ہمہ عمر من کن گذر
اگرچہ گناہم ہمہ مو بموست
نگاہم بر آں امر لاتقنطواست

(ترجمہ: یہ کتاب کرامت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں
تمام ہوئی۔ اے اللہ بزرگان دین کے طفیل میں اس خوشہ چین (مولف)
کے حال پر رحم کر۔ میں نے اپنی ساری عمر صبح سے شام تک غفلت میں
گزاری ہے میں نے پریشان ہوکر ہر طرف نگاہ دوڑائی ہے مگر تیری درگاہ
کے سوا کہیں پناہ نہیں دیکھی۔ اپنے نیک سیرت درویشوں کے صدقے
میں میری ساری عمر کے گناہوں سے درگذر فرما۔ اگرچہ میرا بال بال
گناہوں میں بندھا ہوا ہے مگر میری نظر تیرے اس فرمان پر ہے کہ
"مایوس مت ہو")
(الحمدللہ ترجمہ مفتاح الحزاین آج ۴؍ ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ کی شب
میں بارہ بجے تمام ہوا۔)

[1] حضرت شاہ عبدالہادیؒ کا عرس امروہہ میں ۴؍ رمضان کو ہوتا ہے جس میں اہل خاندان، اہل محلہ اور جو حضرات موجود ہوں درگاہ شریف میں جاکر روزہ افطار کرتے ہیں اور نماز مغرب کے بعد فاتحہ وقل ہوتا ہے۔ دوسرا عرس ۶؍ شوال سے ۸؍ شوال تک تین دن ہوا کرتا تھا۔ اب تقریباً ۱۵؍ سال سے یہ عرس ۱۱؍ شعبان کو ہوتا ہے۔ جو حضرت کے پوتے اور پہلے سجادہ نشین حضرت شاہ عبدالباری چشتیؒ کا یوم وصال بھی ہے۔ ۸؍ شوال کو محلہ قریشیان کی مسجد میں خرقہ وتبرکات کی زیارت ہوتی ہے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کا سفرنامہ افریقہ و ماریشس (مسلسل)

چھٹی قسط

کالے کوس، کڑے کوس

بوٹس وانا } ہفتے کی صبح ناشتے کے بعد لینشیا جوہانس برگ، یا "انکل جو" کی ٹھنڈی گود سے جنوبی افریقہ کے شمال میں واقع ایک گرم ملک بوٹس وانا کی طرف روانگی ہوئی۔ ڈربن سے جوہانس برگ تک کا طویل سفر پورے ایک دن میں طے ہوا تھا حالانکہ ہم لوگ ایک صبا رفتار جاپانی موٹر میں سوار تھے۔ جوہانس برگ سے بوٹس وانا کی سرحد تک آدھے دن میں پہنچ گئے۔ راستے میں کئی خوبصورت دیہات قصبے اور شہر آئے۔ بوٹس وانا کی سرحد پر ذی رسٹ ZEERUST نامی ٹاؤن واقع ہے یہاں سر راہ ایک ریسٹوراں میں چائے پینے اور تازہ دم ہونے کے لئے رکے۔ اس کے مالک بھی حسن اتفاق سے ہندوستانی الاصل نکلے۔ نہ صرف ہندوستانی بلکہ عبدالمجید خاں جیسا جانا پہچانا نام رکھنے والے۔ اور ہمارے خاص الخاص افریقی پیر بھائی عبدالمجید خاں نظامی سے خوب واقف اور رسیدی و مولائی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے بے حد عقیدت مند! ہم ان کے ریسٹوراں میں گاہک بن کر پہنچے تھے۔ مگر انھوں نے گھر کی طرح استقبال کیا۔ خانہ ساز قیمہ بھرے سموسے کھلائے۔ بسکٹ کھلائے۔ چائے پلائی اور قیمت لینے سے انکار کر دیا۔ آقا کی سلطنت جتنی وسیع ہو۔ غلاموں کو اتنا ہی زیادہ فائدہ بھی پہنچتا ہے۔

نومینز لینڈ } NO MAN'S LAND. دو ملکوں کی سرحدوں پر یا کسی جنگ بندی کے دوران دو فوجوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا ایسا بھی ہوتا ہے جس کو دونوں ملک یا دونوں فریق حدّ فاصل کے طور پر خالی رکھتے ہیں۔ اور یہ نومینز لینڈ NO MAN'S LAND کہلاتی ہے۔ جنوبی افریقہ اور بوٹس وانا کی سرحدوں کے درمیان بھی اسی طرح کی ایک زمین کا ٹکڑا واقع ہے۔ مگر مجھے دلچسپ اور پر لطف بات یہ محسوس ہوئی کہ اس رسمی نومینز لینڈ سے پیچھے بھی خاصی دور تک دونوں ملکوں میں جنگل کے ایسے ٹکڑے ہیں۔ جہاں انسانی آبادی نہ ہونے کے برابر نظر آتی ہے البتہ حیوان یعنی جنگلی جانور بکثرت ہیں۔ اور سڑک کے دونوں طرف مٹر گشت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ پکی سڑک استعمال کرنے والے انسانوں کے لئے جگہ جگہ تختیاں لگی ہوئی ہیں کہ سواری کو آہستہ چلاؤ۔ یہ جانوروں کی گذرگاہ ہے! گویا صراط مستقیم پر چلنے والوں کے لئے اپنے ساتھ دوسروں کا دھیان رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے خاص طور پر حیوانوں سے خبردار رہنے کی ضرورت پڑتی ہے!

حیوانوں کا یہ احترام اور ان کے لئے یہ اہتمام کہ انسانوں کو لگام دے دی جائے اور آہستہ روی کا حکم

ہوئے نکیل انسانی زندگی کے زمانے میں بے حد قابل تعریف ہے۔

اچھلو اور کودو } افریقہ میں غزال ہندی اور آہوئے ختن وایران کی سی شکل وشباہت
رکھنے والے ہرنوں کی کچھ اقسام پائی جاتی ہیں جن میں سے
ایک قسم کو اسپرنگ بک SPRINGBOK کہتے ہیں۔
بک کی املا ہندوستانی انگریزی میں BUCK ہے۔
افریقی انگریزی میں BOK ہے جیسے ہمارے یہاں
بدبودار نر بکرے کو "بوک" کہہ کر پکارتے ہیں۔ ایک
قرب تو مجھ ہندوستانی نے افریقہ سے یہ پایا۔ دوسرا
قرب یوں محسوس ہوا کہ اسپرنگ کا ترجمہ اردو میں
کیا جائے تو "پانی کا چشمہ" ہو گا یا اچھلنا اور کودنا۔
افریقہ اور بوتسوانا کی سرحدوں پر واقع جنگل
سوکھا سوکھا دکھائی دیا۔ چشمہ وشمہ مجھے کوئی نہیں
سوجھا۔ اس لئے سوچا کہ اردو میں اسپرنگ بک
کو اچھلو ہرن کہا جائے کہ بھلا کون سا ہرن ہے جسے
چوکڑی بھرنی اور اچھلنا نہ آتا ہو اور یہاں تو ان
میاں "اچھلو" کے ایک بڑے اور بہت بڑے بھائی
"میاں کودو" KUDOO بھی موجود ہیں! ان
دونوں کی سرراہ زیارت ہوئی۔ برادر بزرگ کے نام کا
تو اردو میں ترجمے کرنے کی ضرورت بھی قطعاً نہیں
ہے۔ جو افریقہ میں اور انگریزی میں مروج ہے وہی
ہندوستان اور اردو اور ہندی میں "برجلت"! یعنی
کودو KUDOO ! جی تو چاہا کہ ذرا سا موقعہ ملے
تو اپنے ان صحرائی "اچھلو" اور "کودو" حیوان
میزبانوں کے قدم سے قدم ملا کر خود بھی کسی قدر اچھلا
اور کودا جائے۔ مگر اس کی اجازت کون دیتا؟ ہمارے
بزرگوں میں سے تو ایک بزرگ نے یہاں تک فرما دیا
ہے کہ ہم لوگ فرقہ اس لئے بھی پہنتے ہیں کہ فرقہ پہن کر
ساری دنیا کو اپنا نگران اور چوکیدار مقرر کر لیتے ہیں
ہماری ایک ایک نقل وحرکت دیکھی جاتی ہے اور
واچ WATCH کی جاتی ہے۔ اور بال برابر
بھی غلط چلتے ہیں تو انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں اور
اعتراض کیا جاتا ہے! اس لئے فرقہ پہننا دراصل
اپنے آپ کو انتہائی حدوں تک جکڑ بند اور پابند کر لینا
ہے۔ اور بس ایک ہی لگے بندھے راستے یعنی صراط مستقیم
پر چلنا ہے۔

کالاہاری یا گوری ہاری؟ } اگر مجھے تقریباً آدھی صدی پہلے
پڑھا ہوا جغرافیے کا سبق صحیح صحیح یاد ہے تو افریقہ میں
دنیا کے دو عظیم ترین صحرا واقع ہیں۔ ایک صحرائے اعظم
جو شمال سے وسط افریقہ تک پھیلا ہوا ہے اور زیادہ تر
بے آب وگیاہ ریتیلے میدانوں اور ٹیلوں اور خشک
پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے صحرائے کالاہاری
یا کلاہاری جو صحرائے اعظم سے نسبتاً چھوٹا ہے۔ اور
جمہوریہ جنوبی افریقہ کے شمال میں۔ بوتسوانا ملک
سے لے کر وسطی اور مغربی افریقہ تک کے کئی ملکوں کو
گھیرے ہوئے ہے۔

اگر یہ صحرا ہندوستان میں ہوتا، کرشن مراری
کے ملک میں ہوتا۔ اور برج بھاشا میں اس کا نام
رکھا جاتا تو میں سمجھتا کہ کسی "رادھا ہاری" نے اپنے
سانولے سلونے کے نام پر اسے گوری ہاری کی جگہ کالاہاری
پکارا ہے۔ گوری ہندی میں محبوبہ کو کہتے ہیں۔ وہ
تسلیم ورضا کا پتلا بھی ہوتی ہے۔ اور محبت کا اظہار
بھی اسی کے حصے میں آتا ہے۔ اس لیے رادھا کو محبوبہ کا
نہیں محب کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ باقی ساری دنیا میں معاملہ
برعکس ہے۔ نجد والے حضرت قیس عامری نے ہندوستانی
روایت سے الگ مرد اور صنف کرخت کی طرف سے
محبت کا اظہار کیا لیکن حیرت انگیز مماثلت یہ ہے کہ جس سے
محبت کی گئی وہ نجد میں بھی کرشن جی کی طرح سانولے
اور سیاہ روپ میں آیا۔ یعنی لیلےٰ کے بارے میں بھی
یہی کہا جاتا ہے کہ وہ کالے حسن کی مالک تھی! دنیا کے
دوسرے رازوں کی طرح شاید یہ راز بھی کبھی حل نہ ہو سکے کہ

محب کون ہے۔ محبوب کون۔ گورے کو کہا جائے اور نہ کالے کو کہا سمجھا جائے کس کی جیت پر ایمان لائیں اور نہ کس کی ہار کا یقین رکھیں! شاید یہ ساری الجھن شرک اور دوئی کے تصور نے ڈالی ہے۔ توحید کا عقیدہ درست ہو تو ساری گتھیاں سلجھ جائیں گورے کالے۔ رادھا کرشن۔ لیلےٰ مجنوں، محب و محبوب۔ ساجد و مسجود سب کی داستانیں صاف صاف سمجھ میں آئیں! حضرت غالب تو فرما ہی گئے ہیں کہ

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں!

میں بوٹس وانا کیوں جاتا ہوں؟ برسوں پہلے کی ایک کہانی ہے۔ ہندوستان کا ایک چھوٹا سا گاؤں۔ گاؤں کا پوسٹ آفس۔ جلال نامی پوسٹ ماسٹر! ان کے جی میں خدا معلوم بیٹھے بیٹھے کیا آئی کہ اٹھے۔ ڈاکخانے میں قفل ڈالا اور افسران کو یا گھر والوں کو خبر کئے بغیر سیدھے ریلوے اسٹیشن پہنچے وہاں سے دور دراز کے شہر دہلی! دہلی میں بستی حضرت نظام الدین! اور بستی حضرت نظام الدین میں ایک مرد درویش خواجہ حسن نظامیؒ کے سامنے جا کر کہا۔ مرید ہونے آیا ہوں۔ مرید کر لیجئے۔ چنانچہ رسمی مرید ہوے۔ اور رسم کو پورا کرتے ہی کے لئے پیر کو یہ بتائے بغیر کہ سرکاری ملازمت اور گھر گرہستی کی ذمے داری کس پر چھوڑ کے آیا ہوں دو مہینے تک ٹھاٹ سے دہلی میں براجمان رہے کہ سلوک کی کچھ تکمیل ہو!

اُدھر گھر والے پریشان۔ افسران حیران کہ ہمارا آدمی گیا تو کہاں گیا؟ رپورٹیں درج ہوئیں۔ مقدمے قایم کئے گئے۔ مگر نجد والے مجنوں اور متھرا والی رادھا نے قاعدے ضابطے کی طرف کوئی دھیان دیا ہوتا تو یہ ڈاکخانے والا مجنوں بھی جو معلوم نہیں کتنے عرصے سے دوسروں کے نامہ و پیام پہنچانے کے کام میں لگا ہوا تھا اپنے راز و نیاز کے لئے کسی احتیاط کو خاطر میں لاتا۔ اس پر تو بے پئے ایسی چڑھی ہوئی تھی کہ نشہ اترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

میرے ان پیر بھائی جلال نظامی کی داستان کس طرح اختتام پذیر ہوئی۔ مجھے کچھ نہیں معلوم! یہ سارا قصہ میرے ہوش سے پہلے کا ہے۔ میں نے ہوش سنبھالا تو بس اتنا علم تھا کہ ان بڑے جلال صاحب کے چھوٹے بھائی عبداللطیف جلال صاحب افریقہ کے دور دراز براعظم میں رہتے ہیں اور اپنے بڑے بھائی کے زیر اثر حضرت خواجہ حسن نظامیؒ سے عقیدت رکھتے ہیں۔ نیز کبھی کبھی حضرت خواجہ صاحب کو خط بھی لکھتے ہیں۔ تحریر اور ہنڈ رائٹنگ ان کی ایسی تھی کہ کوئی سچے موتی بھی کیا پروتا ہوگا۔ عبارت منہ سے بولتی اور گواہی دیتی کہ خط لکھنے والے کا اوڑھنا بھی اردو اور فارسی ادب ہے اور بچھونا بھی اردو اور فارسی ادب!

میں اس زمانے میں حضرت خواجہ صاحبؒ کا پارٹ ٹائم املا نویس تھا۔ اسکول سے گھر آتا تو حضرت بولتے جاتے میں لکھتا جاتا۔ منشیوں کی غیر موجودگی میں بعض خطوط کے جوابات بھی میرے قلم سے لکھوائے جاتے۔ عبداللطیف جلال صاحب، حضرت خواجہؒ اور ان کے خاص املا نویس منشی کا خط پہچانتے تھے۔ اس نئے بد خط خط نویس کے بارے میں انھوں نے خواجہ صاحب سے معلوم کیا اور جب پتہ چلا کہ خطوط اسکول میں پڑھنے والے، حضرت کے ایک بیٹے کے قلم سے بھی لکھوائے جاتے ہیں تو انھوں نے حضرت کے ساتھ بیٹے کے نام بھی خط لکھنے شروع کر دیئے اور اس بیٹے نے جب رسالہ منادی دوبارہ جاری کیا تو عبداللطیف جلال صاحب نے یہ ذمے داری اپنے اوپر لے لی کہ جہاں جہاں موقعہ مل سکے اس کی ہمت افزائی کرتے رہیں۔ اور جہاں گنجائش ہی ہمت بڑھانے کی نہ ہو وہاں نہایت شفقت اور محبت سے بھول چوک بتائیں اور صحیح راہ پر لگائیں۔ اور حضرت خواجہ صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے

تو انھوں نے اپنے وہ دکھ درد خواجہ صاحب کے بیٹے کو لکھنے شروع کر دیئے جن سے وہ صرف اپنے بڑے بھائی کے پیرومرشد کو آگاہ کیا کرتے تھے۔ اور اس کے بعد انھوں نے خط کے ذریعے میرا یعنی خواجہ صاحب کے بیٹے کا مرید ہونا چاہا۔ میں انھیں ٹالتا رہا کیونکہ ان کی حیثیت میرے لئے ایک بڑے بھائی کی سی ہو گئی تھی۔ بڑے بھائی کو مرید کرنا غلط تو نہیں تھا لیکن عجیب ضرور تھا۔ مگر جلال صاحب کا اصرار بڑھتا ہی رہا اور ان کی بات آخر کار مجھے ماننی ہی پڑی۔

میں نے حضرت خواجہ صاحب کے بہت سے مریدوں کو صاحب کرامت دیکھا اور پایا تھا مگر مجھے دور دور تک گمان بھی نہ تھا کہ کوئی ایسا آدمی میرا بھی مرید ہونا چاہے گا جو پہلے سے صاحب کرامت ہو۔ میں جلال صاحب کی بہت سی کرامتیں اُس زمانے میں دیکھ چکا تھا جب وہ مجھ سے بڑے بھائی کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ وہ صرف حضرت خواجہ حسن نظامیؒ ہی سے عقیدت اور محبت نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ براہ راست حضرت محبوب الٰہیؒ سے قوی نسبت انھیں حاصل تھی۔ جس کے کرشمے دور بیٹھ کر بھی میں نے بارہا دیکھے۔

مرید ہونے کے بعد جلال صاحب نے تقاضے پر تقاضا کیا کہ میں ان سے ملنے افریقہ جاؤں۔ مگر والدہ ماجدہ حضرت خواجہ بانو صاحبہ کی مسلسل علالت کی وجہ سے مجھے بوٹسوانا افریقہ جانے کی مہلت نہ مل سکی۔ پھر وہ وقت آیا کہ عبداللطیف جلال نظامی صاحب سخت بیمار ہو گئے۔ وہ بھی میری طرح شکر کے مریض ہی نہیں بد پرہیز بھی تھے۔ پیر کا معمولی زخم ایسا بڑھا کہ ٹخنے کے پاس سے پیر کاٹا گیا۔ پھر گھٹنے کے پاس سے پیر کٹا اور مرحوم مجھے خط پر خط لکھتے رہے اور اپنے مخصوص والہانہ انداز میں یہ جتاتے رہے کہ یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ میں تمہارے پاس نہ آؤں۔ بلکہ تم میرے پاس آؤ۔ ایک روز ٹیلی فون کیا اور حضرت امیر خسروؒ کا شعر پڑھا۔

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی آمد

میری جان ہونٹوں تک آگئی ہے تم آجاؤ کہ دوبارہ جان پڑ جائے۔ اور اگر اس وقت آئے کہ میں موجود ہی نہ ہوا تو ایسے آنے سے کیا فائدہ ہوگا ؟

مگر میں بدقسمت پھر بھی افریقہ نہ جاسکا۔ اپنے آخری ٹیلی فون میں انھوں نے حضرت امیر خسروؒ کی اسی غزل کا پورا شعر بھی نہیں صرف ذرا سا حصہ پڑھا۔

. . . . بہ جنازہ گر نیائی ، بہ مزار خواہی آمد !

اگر جنازے پر بھی نہ پہنچ سکو تو مزار اور قبر پر تو آہی جانا !

چنانچہ اب اپنی جنوبی افریقہ آمد سے فائدہ اٹھا کر میں بوٹسوانا صرف اس لئے جا رہا ہوں کہ اپنے اس مرحوم بھائی کی قبر کی زیارت کر سکوں۔ جو خط کے ذریعے سلسلہ عالیہ نظامیہ میں شریک ہوا۔ جس نے مجھے ظاہری زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ اور میں نے بھی اس سے عالم ناسوت میں کوئی ملاقات نہیں کی۔ ہم دونوں زندگی بھر ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور رہے۔ لیکن قرب کا یہ حال تھا کہ بس کچھ نہ پوچھئے !

عبداللطیف جلال نظامی مرحوم کے اکلوتے فرزند علی میاں صاحب دہلی آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان سے میری بہت اچھی ملاقات ہے۔ ان کے تایا زاد بھائی عبدالحئی صاحب جو میرے مرحوم پوسٹ ماسٹر پیر بھائی کے صاحبزادے ہیں وہ بھی ایک بار دہلی جاچکے ہیں۔ مگر وہ مرحوم جو اپنے پرانے دیس ہندوستان سے دور بوٹسوانا میں صحرائے کالاہاری کے کنارے منوں ٹنوں مٹی کے نیچے آرام کر رہا ہے۔ اس سے میری ملاقات نہ ہونے کے باوجود سب سے اچھی ملاقات تھی۔

مگر ایسی کر بعد کے زمانے میں کبھی کبھی خیال آتا کہ کاش
ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہی رہتے۔
اس کیفیت کو شاید وہی تھوڑا سا سمجھ سکے جس کو
حضرت امیر خسروؒ کا مذکورہ بالا ایک پورا اور ایک
آدھا شعر سننا ہی نہ پڑا ہو۔ بلکہ دوسرے مصرعے کی
تعمیل میں وہ اپنے بھائی کی قبر کی طرف میری طرح
بصد حسرت و یاس جا بھی رہا ہو!

سرحد } سرحد کوئی بھی پار کرنی ہو اس کے چوکیداروں اور محافظوں کی زبان
آتی ہو تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ اِدھر جنوبی
افریقہ کی جانب عبدالغنی صاحب اور ڈاکٹر عبدالخالق
صاحب انگریزی ہی میں نہیں AFRICAAN میں بھی
فرّاٹے بھرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ اُدھر بوٹس وانا
کی جانب علی میاں جلال اور عبدالحئی جلال موجود تھے۔
اور جواب آں غزل انھیں بھی اپنے ملک کی زبان میں
دینا خوب آتا تھا۔ اس لئے سب مرحلے پلک جھپکتے
طے ہو گئے۔

جنوبی افریقہ کی بہ نسبت بوٹس وانا
کی دھوپ میں تپش اور تیزی زیادہ محسوس ہوئی
مگر ہوا ٹھنڈی تھی اس لئے دھوپ بہت ناگوار
نہیں گذری۔ سرحد سے بوٹس وانا کا صدر مقام
خیبرونز GABERONES تیز رفتار موٹروں کے
لئے بھی خاصا دور ہے۔ ایک موٹر کو میاں عبدالحئی
کی کم عمر صاحبزادی تنہا چلاتی ہوئی لائی تھیں۔
واپسی میں ان کی موٹر پیچھے رہ گئی۔ جنگل کا ویران
راستہ تھا۔ مجھے تشویش ہوئی مگر میری تشویش
پر بچی کے باپ اور چچا ہنستے رہے کیونکہ وہ جانتے
تھے کہ یہاں ہندوستانی الاصل تاجروں کی کم عمر
بچیاں بھی مردانہ وار زندگی بسر نہ کریں تو ان کا
یہاں رہنا مشکل ہو جائے۔

خیبرونز صاف ستھرا ہندوستان کے
بہت چھوٹے شہروں کی مانند ایک شہر ہے۔ مگر یہاں
کے حسابوں یہ ملک کا سب سے بڑا شہر ہے۔ حکومت
کا مرکز بھی یہی ہے۔ علی میاں صاحب سب سے پہلے
اپنی ہول سیل دوکان پر لائے۔ اس دوکان کا اصل
کام ڈبوں میں بند خشک و تر دودھ کی سپلائی کا
ہے۔ انھوں نے اس ہول سیل کام کو اپنے اکلوتے
برادر نسبتی ایوب قاسم سلمہٗ کے سپرد کر رکھا ہے۔
خود یہاں سے مزید فاصلے پر واقع ایک اور چھوٹی سی
آبادی مولے پولولے کی دوکان چلاتے ہیں جو ان کے
والد ماجد عبداللطیف جلال نظامی صاحب نے قایم
کی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد
MOLEPOLOLE مولے پولولے نامی یہ آبادی بھی
آگئی۔ مکانات بہت دور دور بنے ہوئے ہیں۔ اس
لئے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ کل آبادی کتنی ہے۔ تاہم اس
سے کشادگی اور خاموشی کے علاوہ ایک پرسکون
کیفیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اور خلوت و جلوت
دونوں بیک وقت نظر آتے ہیں۔ ہندوستان میں
اس طرح کی بستیاں صرف اونچے پہاڑی علاقوں میں
ہیں مجھے اس بستی میں بھائی عبداللطیف مرحوم کے
رین بسیرے سے زیادہ ان کی دائمی آرام گاہ
کی تلاش تھی۔ مگر پتہ چلا کہ اس بستی میں مسلمانوں
کا کوئی قبرستان نہیں ہے۔ صرف دس بارہ گھر ہیں
اور سب میتیں یہاں سے کافی دور راموٹسا
RAMOTSA نامی شہر میں تدفین کے لئے لیجائی جاتی
ہیں عبدالحئی صاحب کی دوکانات اور مکانات وہیں
ہیں۔ اور وہاں ہم لوگ واپسی کے وقت ہی جاسکیں گے
علی میاں صاحب کی بیوی رشیدہ سلمہا
کیپ ٹاؤن جنوبی افریقہ کی ہیں۔ انھوں نے اپنی
بھاوج اور خاندان اور احباب کے ہاں کی خواتین
کے ساتھ مل کر بڑا پرتکلف لنچ تیار کر رکھا تھا
بہت سے لوگ کھانے میں شریک ہوئے مگر

مغربی طرز معاشرت رکھنے کے باوجود مردوں اور عورتوں نے
الگ الگ کھانا کھایا۔ میٹھے سفرا اور مرغن اور مکلف کھانے
کے بعد نیند کے حقوق ادا کرنے بھی ضروری تھے۔ چنانچہ
ادا کیے گئے۔ عصر کے بعد گھر اور دوکان کے اطراف کا
کچھ جائزہ لیا گیا۔ گھر اور دوکان دونوں ایک بڑے
احاطے کے اندر واقع ہیں۔ احاطے میں سامان لانے
لیجانے والے ٹرکوں اور گاڑیوں کے آرام بسرام کی
بھی کافی جگہ موجود ہے۔ اصل میں یہاں اکثر دوکانیں
ایسی ہیں جہاں ایک ہی چھت کے نیچے ہر قسم کا سامان
فراہم رہنا ضروری ہے۔ آبادیاں دور دور ہیں ہندوستان
کے دیہات کی طرح ہاٹ بازار کا رواج نہیں۔ صحرا
کے لوگ خریداری کے لئے خاصے فاصلے سے ان چھوٹی
آبادیوں میں آتے ہیں اور ان کی سہولت اسی میں
ہے کہ سب چیزیں ایک جگہ مل جائیں۔ مغربی ممالک
میں ڈپارٹمنٹل اسٹور کا تصور یقیناً انہی علاقوں
سے گیا ہوگا۔

مغرب سے پہلے یہاں کا اسلامی سینٹر دیکھا۔
کتابیں بہت اچھی ہیں۔ لیکن پڑھنے والے اور فائدہ
اٹھانے والے کم ہیں۔ ان کی معلومات بھی محدود ہے۔
تاہم دس بارہ مسلمان گھروں کی آبادی میں اس
طرح کا سینٹر قائم کرنے کا خیال ہی قابل ستائش ہے۔
مغرب کی نماز مقامی مسجد میں جاکر پڑھی۔
ایسی مختصر آبادی میں نمازی بھی تھوڑے ہی تھے۔
لیکن مسجد کا انتظام بہت اچھا نظر آیا۔ نماز کے بعد
مجھ سے تقریر کی فرمائش ہوئی۔ سوال جواب کا
سیشن بھی کچھ دیر رہا۔

رات کو راجدھانی خیبر ونز سے محمد احمد
صاحب اور ان کی بیوی اور دوسرے بہت سے
حضرات ملنے تشریف لائے۔ محمد احمد صاحب مراد آباد
کے رہنے والے ہیں۔ ان کی بیوی چاند پور کی ہیں۔ اور
میرے بہت سے چاند پوری احباب خاص کر اختر خاں
صاحب مرحوم سابق چیرمین وغیرہ سے خوب واقف
ہیں۔ محمد احمد صاحب پہلے اسکول میں تدریس کی خدمت
انجام دیتے تھے۔ اب اپنا علاحدہ کاروبار کرتے ہیں اور
ماشاء اللہ یہاں کے رئیس التجار ہیں۔ مجھ پر بھی اس
وقت سے مہربان ہیں جب وہ بھائی عبداللطیف
جلال نظامی مرحوم کے قاصد بن کر دہلی تشریف
لایا کرتے تھے۔ کل انھوں نے اپنے ہاں لنچ پر اور عبدالحیٔ
صاحب نے راموٹسا میں ڈنر پر آنے کی دعوت دی اور
کہا کہ وہاں کے احباب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔
میں نے انھیں سنانے کے لئے تو بظاہر ہوں ہاں کر لی۔
لیکن سچ پوچھئے تو کالاہاری صحرا کے بالکل کنارے
پر پہنچ جانے کے بعد پھر کسی شہر کی طرف جانا میرے
نزدیک سخت بدمذاقی تھی۔ اور حضرت مجنوں کی شان
میں ایسی گستاخی کا اندیشہ بھی جس کی تلافی شاید عمر بھر
ممکن نہ ہو۔ دراصل میرے ارادے کچھ اور ہی تھے۔ اور
انھیں کسی قدر میزبانوں نے بھی بھانپ لیا تھا۔ وہ
میری علالت کے پیش نظر اس بات کے لئے قطعاً رضامند
نہ تھے کہ جنگل کی طرف ذرا سا جھانکنے بھی دیں! تاہم
ہار تھک کر میں نے بھی اپنا تیر چلا ہی دیا اور رات کے
کھانے پر جبکہ دور و نزدیک کے سارے اہم اور
وی آئی پی V.I.P مہمان کثیر تعداد میں جمع
تھے۔ صفائی سے کہہ دیا کہ حضرات میں یہاں صرف
دو کاموں کے لئے آیا تھا۔ ایک اپنے بھائی کی قبر کی زیارت
اور ان کے بچوں احباب اور قرابت داروں سے ملاقات
دوسرے صحرا نوردی! آپ سب سے ملاقات ہو ہی
گئی۔ قبر پر آپ کہتے ہیں کہ واپسی کے وقت لیجائیں گے۔ صحرا
کی طرف جانے سے روکتے ہیں۔ لہذا اب میرا یہاں
کام ہی کیا رہ گیا ہے آپ سب کا اللہ بیلی نگہبان!
میں کل صبح منہ اندھیرے یہاں سے ڈربن واپسی کا
ارادہ رکھتا ہوں! ظاہر ہے اس کے خلاف احتجاجی آوازیں
بلند ہوئیں مگر میں نے کنکھیوں سے یہ بھی دیکھا کہ بھائی

عبدالحئیٔ صاحب کے منجھلے صاحبزادے عارف سلمہٗ چپکے سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ یہ علامت خاصی امید افزا تھی لہٰذا میں نے اطمینان کا سانس لیا اور انتظار کرتا رہا کہ دیکھیں پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

اللہ اکبر۔ بھائی عبدالحئی کے بال بچوں والے فرزند اکبر ڈاڑھی رکھ کر زبردستی کے بزرگ بن گئے ہیں۔ لیکن میرے لئے تو یہ بالکل کل کی سی بات ہے کہ ان کے اماں ابا کی شادی کو سات آٹھ برس بیت گئے مگر موصوف زمین پر ظہور اجلال فرمانے کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں! خدا معلوم ہندوستان کے کسی کلرک کی طرح ان کی آمد کے پاسپورٹ و ویزا کو کسی نے الماری کے فائلوں تلے دبا کر چھپا دیا تھا یا کیا ہوا تھا آخر مجبور ہو کر ان کے چچا عبداللطیف نظامی مرحوم نے مجھے لکھا کہ اجمیر شریف جاؤ اور خواجہؒ کے ہاں معروضہ پیش کر کے عبدالحئی کے ہونے والے بیٹے یا بیٹی کا پاسپورٹ و ویزا برآمد کراؤ۔ نیز ہندوستان سے بوٹس وانا آنے کی اجازت کی درخواست بھی لگاؤ۔ چنانچہ میں ان کے لئے اجمیر شریف حاضر ہوا اور الحمدللہ اگلا عرس خواجۂ ہند اور خواجۂ کل جہان کا آیا تو میں بھی ان صاحبزادے سلمہٗ کی آمد کی منت بڑھانے کے لئے چادر و شیرینی و عطر و گل کے ساتھ اجمیر شریف میں موجود تھا!

اب یہاں بوٹس وانا آکر کیا دیکھتا ہوں کہ ماشاءاللہ خواجہ اجمیری نے جو پاسپورٹ دلوایا تھا اس کے کئی صفحات پر ویزا کے ٹھپے لگے ہوئے ہیں۔ یعنی بھائی عبدالحئی صاحب اور ان کی اہلیہ اللہ نظر بد سے بچائے بھرے پُرے گھر کے سرپرست ہیں۔ ان کے منجھلے صاحبزادے عارف سلمہٗ اپنے چچا علی میاں کے ساتھ صرف دو تین روز کے لئے دلی آئے تو یہ بھی ارشاد ہوا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کو بھی میری طرح شکار کا شوق ہے۔ ذرا مجھے بھی یہاں کے شکار کا مزا چکھائیے اور پھر افریقہ آئیے تاکہ میں بھی کچھ خدمت کر سکوں۔ چنانچہ ان کا بھری محفل سے کچھ کہے سنے بغیر باہر نکل جانا گویا یہ اطلاع دینا تھا کہ چچا آپ گھبرائیں نہیں آپ کے بھتیجے بلکہ پوتے (ان کے دادا میرے پیر بھائی تھے) کے بس میں جو کچھ ہوگا وہ اس سے دریغ نہیں کرے گا! پھر سب کو کھانا کھائے اور دنیا زمانے کی گفتگو کئے مدتیں گذر گئیں اور سپیدہ سحر کے آثار ظاہر ہونے لگے تو کیا دیکھا کہ بھوکے پیاسے عارف سلمہٗ فاتحانہ انداز سے میرے کمرے میں داخل ہو رہے ہیں اور یہ خوشخبری سنا رہے ہیں کہ صحرا نوردی کا سارا انتظام الحمدللہ میں نے کر لیا ہے۔ اب میرے باوا اور چچا سے اجازت دلوانا یا اجازت لینا آپ کا کام ہے! مجھے تو ظاہر ہے کہ یہ کہنا ہی تھا کہ "نری آواز کسّے اور بیٹے! میاں جیو اور جگ جگ جیو۔ اللہ تمہیں شاد آباد رکھے اور جلدی سے ایک چاند سی دلہن لاؤ تم نے میرا جی خوش کر دیا۔ مگر! کیا سابق کے کسی مجنوں نے صحرا نوردی کے لئے کسی سے اجازت لی تھی۔ جو ہم تمہارے باوا چچا کا منہ تکیں! اور اس کے بعد جو اپنے میزبانوں کی طرف نظر کی تو دیکھا کہ وہ اپنے ہتھیار ڈال چکے ہیں! اور یہیں چاہیے بھی کیا تھا!

صبح ہوئی پرتکلف ناشتہ ہوا۔ دو بڑی بڑی ویز VANS باہر تیار کھڑی نظر آئیں تو پتہ چلا کہ عید اس طرح بھی آتی ہے۔ میاں عارف سلمہٗ نے اس علاقے کے سب سے ماہر شکاری جناب عبدالکریم خاں صاحب کی سرکردگی میں بارہ پندرہ آدمیوں پر مشتمل ایک پارٹی تیار کر رکھی تھی۔ گاڑیوں میں جو سامان لدا دیکھا وہ ایسا تھا کہ شکار کے لئے کہا جا یا جا رہا ہے۔ یا تو کوئی ملک فتح کرنا مقصود ہے۔ یا آج سے دو سو برس پہلے دریائے نیل کے منبع کو ڈھونڈنے کی ایک مہم ہے! علی میاں نے اپنی ہمہ الوان دوکان سے بلامبالغہ درجن بھر نئے نئے قیمتی کمبل

نکال کر خاک آلود ہو جانے والی گاڑیوں میں ڈال دیئے تاکہ راہ کی ناہمواری کسی کو محسوس نہ ہو۔ پانی کے بڑے بڑے ڈرم پٹرول کے شاہی سائز کے ڈبے۔ کھانے کے انبار محفوظ رکھنے والے برتن سب گاڑیوں میں آراستہ تھے۔ اور رات بھر کے ہارے جاگے تھکے عارف میاں سلمہ اس بات پر بضد کہ وہ مجھے ارجن بنا کر بلا تشبیہ خود شری کرشن جی مہاراج کی طرح کالاہاری کی مہا بھارت کا رتھ ہانکیں گے! یعنی میری وین کے ڈرائیور خود بنیں گے سو یہی ہوا بھی۔ بس فرق اتنا رہا کہ گیتا کے سبق انھوں نے نہیں دیئے۔ میں نے انہیں پڑھائے! کچھ تو عمر کے بڑے فرق کا یہ تقاضا تھا کچھ اس بات کا کہ ان کے پاس تو اپنے آپ کو سیٹ پر روکے رکھنے کے لئے اسٹیرنگ کو تھامنے کا ایک ذریعہ موجود تھا۔ لیکن ٹوٹی پھوٹی اونچی نیچی ریتیلی سڑک یا ہندوستان کی دیہاتی زبان میں ''دگڑے'' پر گاڑی کی اچھل کود کے درمیان جو الحمدللہ ایک سو بیس کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے کچھ زیادہ ہی تیزی سے ہو رہی تھی اپنے سر کو وین کی چھت سے ٹکرا کر ٹوٹنے سے بچانے کا ڈوبتے اور تنکے والا واحد سہارا میرے پاس یہی تھا کہ اپدیش دے دے کر گاڑی کے ایکسی لیٹر کو عارف میاں کی ٹھوکر سے بچانے کی ناکام کوشش کرتا رہوں! میں نے اس کیفیت کی منظر کشی کے لئے جو طول طویل بے مہار فقرہ استعمال کیا ہے اس سے اس بات کا اظہار ہو ہی جاتا ہے کہ ان اپدیشوں کے دوران میرا سانس رک رک کر بہت بہت دیر بعد آیا گیا! عارف میاں سلمہ کے پاس ہر اپدیش کا جواب بس ایک ہی تھا۔ کچھ اس طرح کا کہ ہستی کی فرصت دو روزہ بھی نہیں۔ صرف یک روزہ ہے۔ اور منزل سینکڑوں میل کی جانور مارنے سے پہلے ہی مار لینی ہے۔ ورنہ بے نیل مرام واپس جائیں گے!

اس روز کیسا کیسا جی چاہا ہے کہ کاش اس گاڑی میں بھی وہ گورنر لگا ہوتا جو نئی گاڑی یا نئے انجن کو گرم ہونے سے بچانے کے لئے لگایا جاتا ہے اور جو گاڑی کو پندرہ بیس میل فی گھنٹہ سے زیادہ تیز اسی طرح نہیں چلنے دیتا جس طرح کوئی اسپیکر گورنر اپنی اسٹیٹ کے کسی بے لگام چیف منسٹر کو بگٹٹ دوڑنے سے روکے رکھتا ہے! میں نے اس خلائی گاڑی کی زمینی دوڑ کے دوران کسی نہ کسی طرح دو ایک دفعہ یہ کام کر دکھانے میں بھی کامیابی حاصل کر لی کہ گھڑی کو پورے ایک منٹ تک گھور کر نبض کی رفتار چیک کی جائے کہ خدا نخواستہ خودکشی کی کوشش کے سلسلے میں کوئی مقدمہ قائم ہونے کا اندیشہ تو نہیں ہے۔ اور پھر اس کو ہر طرح نارمل پا کر عجیب طرح کی راحت کا احساس ہوا اور کچھ ایسا لگا کہ یہ صحرا۔ یہ گاڑی۔ یہ راستہ یہ ڈرائیور صاحب اور میں خود یہ سب کے سب ہی الحمدللہ ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اور اس نعمت پر اللہ کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے!

سرِ صحراء موٹے بولولے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ صحرائے کالاہاری کا دروازہ ہے۔ یوروپ امریکہ دنیا جہان سے لوگ اس صحراء کو دیکھنے یا شکار کھیلنے آتے ہیں تو موٹے بولولے کی ننھی آبادی ہی سے صحرا کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ گھنٹہ بھر کی ڈرائیو تو بہت عمدہ پکی سڑک کی ہے۔ اس کے بعد ایک اور بہت چھوٹا سا گاؤں آتا ہے۔ ہمارے شکاری رہنما عبدالکریم خاں صاحب کی والدہ ماجدہ یہاں ایک صدرنگ دوکان چلاتی ہیں۔ اور صحرا میں گھومتے پھرتے مویشی پالنے والے اپنی ضروریات کا سامان یہیں سے خرید کر لے جاتے ہیں۔ سڑک اور شہریت سب یہاں ختم ہو جاتے ہیں۔ عبدالکریم صاحب نے اس گاؤں کے ذمے داروں کو سنجیدگی کے ساتھ اطلاع دی کہ ہم لوگ بظاہر ایک بے عقلی کا کام کیا چاہتے ہیں۔ اگر رات کو آٹھ بجے تک واپس نہ آئیں تو سمجھ لیجئے کہ اگر چہ

ہم نے اپنے کیے کی سزا پائی مگر آپ اپنے انسانی فرائض
کو بلاد نے آتے ہوئے ہمارے لیے سرچ پارٹیوں کا انتظام
کریں اور ہم کو زندہ یا مردہ ڈھونڈ نکالیں۔ اور
اگر ضروری ہو تو ہیلی کوپٹر کے ذریعے اسی طرح
ہماری کھوج اور تلاش ہو جس طرح گدھ VULTURES
مردہ جانور کو تلاش کرتے ہیں۔ کھانے کے کام نہ بھی
آئے تو انسانی خدمت کا تمغہ سینے پر لگانے کے کام تو
ضرور آجائیں گے!

واہ افریقہ وا۔ بھلا ہندوستان کے کسی شکاری
کو اس ہدایت نامۂ بے غفلاں کے لطف سے کب
سابقہ رہا ہوگا۔ مجھ دل کے مریض نے تو ایسا محسوس
کیا کہ انجیوگرافی اور سرجری کے بغیر ہی "بائی پاس"
نامی علاج ہو گیا ہے۔ اور رجمن کی بھیڑ بھاڑ سے
الگ شہر آبادی، گلوں، گل رخوں سب سے
بچ بچا باہر باہر اپنی منزل مقصود کی طرف لمبے راستے
سے جا رہے ہیں۔

جمن میں گذرے کہ صحرا کے درمیاں گزرے
تمہاری یاد سے خالی مگر کہاں گزرے

علاقۂ مجنوں صبح کا سورج گرم ہونا شروع
ہوا ہی تھا کہ ہم نے علاقۂ مجنوں یعنی
TERRITORY OF THE ... میں
قدم دھرا۔ عارف میاں، عارف ٹھیرے۔ انھوں نے
اپنی موٹر آگے رکھی کیوں کہ رہنمائی کا حق شکار کے
دیوانوں ہی کو تھا۔ دوسری گاڑی کی باگ ڈور بھی
اگرچہ ایک ہم ہی جیسے دیوانے عبدالکریم خاں صاحب
کے ہاتھ میں تھی۔ مگر ان کے ساتھ بہت سے فرزانے
بھی تھے۔ مثلاً عبدالغنی صاحب۔ ڈاکٹر عبدالخالق
صاحب وغیرہ۔ ہم نے ان عقل کے پاسبانوں کو خود
سے فرلانگ دو فرلانگ پیچھے ہی رکھا۔ دائیں طرف
سوکھی گھاس۔ کانٹے دار جھاڑیاں اور کہیں دور
حد نظر پر کوئی ٹمٹماتا سا حیران و ویران ببول کا درخت!

بائیں طرف بھی یہی حال۔ گاڑی کے پیروں یعنی ٹائر
تلے ریت۔ پیچھے چھوٹے راستے اور سر کے اوپر ٹائرو
کی اڑائی ریت نہیں۔ ریت کے بگولے۔ سامنے ایک
تپتا جھلستا راستہ مگر طلسمات کی سی یہ ادا بھی مو
کہ ہوا ٹھنڈی اور خوب ٹھنڈی۔ اللہ جانے کیا راز تھا
گاڑی کے سامنے والے راستے کی طرف سے آنے والی ہو
غیر معمولی گرم محسوس ہوتی اور گاڑی روک لو۔
راستے کے دائیں بائیں کچھ فاصلے پر کھڑے ہوجاؤ تو
ہوا ٹھنڈی اور خوش گوار لگتی۔ شاید یہاں
کی سوکھی گھاس میں ہوا کو ٹھنڈا کرنے کی کوئی خاصیت
ہے۔ زمین کے جس ٹکڑے پر گھاس نہ ہو صرف
سوکھا ریت ہو وہ گرم لگتا ہے۔

ماڈرن آبلے غالب نے کہا تھا۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں آوے

لیکن اس کو کیا کیجیے کہ ماڈرن انسان نے ٹائروں کے پیروں
سے چلنا سیکھ لیا ہے۔ کوئی پیاسا کانٹا چھالے کے پانی کی آس
چھبتا بھی ہے تو پانی کی جگہ شوں شاں کی پھنکار بن مارتی گرم
بیچارے کانٹے کو ناگن کی طرح ڈس لیتی ہے۔ میاں عارف اپنی
واہن (گاڑی) کے ساتھ صحرا میں کچھ ہی دور گئے تھے کہ ک
بدنصیب کانٹے نے ٹائر کے جگر میں ٹوٹ کر ہائے کا نعرہ ما
انھوں نے گاڑی روکی۔ دوسری گاڑی نے ہمیں فوراً آلیا جر
لگایا گیا مگر ریگستان کا دل ایسا نرم تھا کہ جیک بھی صحرا کے دل
ساتھ بیٹھا چلا جاتا تھا سب پریشان ہو گئے۔ بارے سنگ
میں ایک پتھر کا ٹکڑا بھی نظر آگیا۔ ممکن ہے مجنوں کے سر کی خا
اسے یہاں لایا گیا ہو۔ بہرحال ایسے پتھر مجنوں کے کام آئے تھے تو
ہمارے کام کیوں نہ آتے۔ پہیہ بدل دیا گیا۔ اور پھر وہی دوڑ
الامان والحفیظ۔ میں نے عارف میاں سے پوچھا ادھر میاں راہ
تمہاری شکارگاہ اور کتنی دور ہے؟ بولے بہت دو
میں نے کہا ہاں میاں بالکل سچ کہتے ہو!

منادی ایمان و امن

بارگاہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ سے
ایمان اور امن کی ندا دینے والا
اور ان کے جانشین
امام المشائخ شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی یادگار

ماہنامہ
منادی
نئی دہلی

منادی ۱۹۲۶ء سے جاری ہے یہ اٹھہترویں جلد (۱۹۹۴ء) کا چھٹا شمارہ ہے

مدیر
خواجہ حسن ثانی نظامی
معاون مدیر
خواجہ مہدی نظامی

— درگاہ —
شریف اور منادی کے بارے میں
خط و کتابت کرنے اور قیمت
جمع کرانے کا پتہ
خواجہ حسن ثانی نظامی
ڈاکخانہ حضرت نظام الدین اولیاء
نئی دہلی ۱۳-۱۱

سالانہ قیمت
ہندوستان میں
پچاس روپے
غیر ممالک سے
دس ڈالر
فی پرچہ
پانچ روپے

فہرست

پرنٹر پبلشر خواجہ حسن ثانی نظامی نے ... پریس جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ سے شائع کیا۔

سلوک میں تعلیم و ترتیب کا لزوم

خواجہ حسن ثانی نظامی

"سلوک" نت نئی سیر اور نت نئے معانی کا ایک لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی اور عام مطلب ہے "راستہ چلنا" مگر راستہ بے مقصد چلا جائے تو آوارہ گردی قرار پاتا ہے۔ آوارہ گردی عبث اور بیکار کا کام تو ہے ہی۔ اس کی شرکت جرائم کی فہرست میں بھی ہے۔ بے مقصد اور نا وقت گھومنے پھرنے والا تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۰۹ کے تحت گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ جیل بھیجا جا سکتا ہے۔

لیکن راستہ چلنے کا کام کسی مقصد کے تحت ہو تو

۱۔ دفعہ ۱۰۹ کی زد سے باہر ہو جاتا ہے۔
۲۔ اچھے مقصد کے لئے ہو تو قابل تعریف ٹھیرتا ہے۔
۳۔ برے مقصد سے ہو تو قابل مذمت بھی ہے۔

اور دفعہ ۱۰۹ سے بھی زیادہ خطرناک کسی دفعہ تک پہنچا سکتا ہے۔ بلکہ برا مقصد رکھنے والے کو ہر طرف سے طرح طرح کی دینی اور دنیوی دفعات آگھیرتی ہیں اور ان کے ذریعے اس کے لئے ایسی سزائیں تجویز ہو سکتی ہیں جن سے دنیا بھی برباد ہو جائے اور آخرت بھی تباہ!

سلوک کے معانی اگر اہل تصوف کی ایک اصطلاح کی حیثیت سے ڈھونڈے جائیں تو اس کا جوڑ مذہب سے مل جائے گا۔ مذہب بھی جانے کی جگہ، راستے ہی کو کہتے ہیں۔ طریق بھی راستے کا مفہوم رکھنے والا لفظ ہے طریقت کی کی اصطلاح اسی سے بنی ہے۔ صوفیہ کے ہاں سلوک طے کرنے والا سالک کہلاتا ہے۔ مذہب کی ایک خاص طرح پیروی کرنے والا مذہبی آدمی۔ دھرم پر ایک خاص انداز میں چلنے والا دھارمک انسان! سالک کے مقابل جو لفظ ہے۔ وہ مجذوب ہے۔

مذہبی اور دھارمک آدمی کے حریف اور مقابل کو ہم دہریہ ناستک وغیرہ الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ مگر یہ اسی وقت ہوتا ہے جب ہم مذہب کے مفہوم کو روا[جی] اور روایتی مذہب تک محدود کر لیں۔ ورنہ رواجی اور روایتی مذہب سے انکار خود اپنی جگہ ایک مذہب ایک دھرم اور ایک طریقہ ہے۔

گویا مذہب کی دو بڑی قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ ایک مذہب وہ جو خدا کا اقرار کرے۔ دوسر[ا] وہ جو خدا کا منکر ہو۔ سلوک کا تعلق خدا کا اقرار کر[نے] والے مذہب سے ہے۔ اقراری اور انکاری مذہبوں [کی] بھی ان گنت قسمیں ہیں۔ اور پھر ان ان گنت قسمو[ں] کی ذیلی اور ضمنی شاخیں بھی بے شمار ہیں۔ مگر یہاں ا[ن] سے بحث مقصود نہیں ہے۔

البتہ یہ تذکرہ موضوع سے متعلق اور دلچسپ ہوگا کہ چین کے قدیم مذہب "TAOISM" میں تاؤ یا ڈاؤ "TAO" بھی راستے اور طریق ہی کو کہت[ے] ہیں اور جس طرح راستہ کو نقشہ بنا کر دکھایا جا[تا] ہے۔ پرانے چینی بھی TAO کو خطوط اور لکیر

کے ذریعے سمجھاتے تھے۔ وہ ایک سیدھی لکیر، عمودی یعنی
VERTICAL شکل میں کھینچتے۔ غالباً یہ سیدھا خط،
صراط مستقیم کو ظاہر کرتا۔ مگر اسے تین اور متوازی PARALAL
اور افقی HORIZONTAL، خطوط کاٹتے۔
پہلی متوازی اور افقی لکیر عمود کے سب سے اوپر والے
پوائنٹ پر ہوتی۔ دوسری بالکل درمیان میں اور تیسری
بالکل نیچے آخری نقطے اور پوائنٹ پر
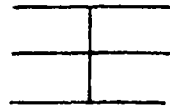
اوپر کی لکیر آسمان، یا آکاش کو ظاہر کرتی، نیچے کی لکیر
زمین کو اور درمیانی لکیر زمین اور آسمان کے درمیان
پائی جانے والی زندگی اور حیات کی علامت ہوتی۔
اوپر کی لکیر یانگ YANG، مثبت اکائی
اور متحرک قوت اور بالکل نیچے کی لکیر "YIN" "ین"
غیر متحرک قوت اور منفی اکائی۔ ان دونوں کے
درمیان زندگی کا وجود اور ان سب کا حاکم وہ واحد
وجود جسے خالق کل کہیئے۔ اس واحد وجود کا عرفان
جسے ہم واجب الوجود کہتے ہیں یعنی چینی TAI XI
کا عرفان تعینات اور تنزلات اور مخلوقات میں غور وفکر
اور مشاہدے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

ہندوستان کے قدیم فرقے بھی ماتھے پر
بندیاں اور تلک اور مخصوص علامات بنا کر اپنے اپنے
عقیدے کا اعلان کرتے ہیں۔ ان میں ماتھے کی تین افقی
اور متوازی لکیریں جو شاید "رجوگن" "ستوگن"
اور "تموگن" کی علامتیں ہیں ان کی جیومیٹریکل شکل
بھی چینی نقشے سے کسی حد تک ملتی ہوئی ہے رجوگن
فرماں روائی، ستوگن ستیہ اور حق اور تموگن سے
اسفل کیفیات کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔

بعض صوفیہ نے بھی شاید مقامی تقاضوں
کے تحت سلوک کو سمجھانے کے لیئے، دائروں اور
لکیروں اور اقلیدسی شکلوں کا استعمال کیا۔ مگر اس کو
محدود ہی رکھا اور بالکل خاص الخاص تلقین کے حلقے
سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ
اسلام وہ مذہب ہے جو تاریخ کے ہر دور میں نمودار
ہوتا رہا۔ ہر نبی اور پیغمبر اسلام ہی کا پیغام لے کر
آیا۔ اسلام نے حیات اور کائنات کے ہر سرد و گرم
کو چکھا اور برتا اور اس طویل تجربے نے اس کے
پیرو کاروں کو یہ بات سکھادی کہ لکیریں اور شکلیں
LINES AND FIGURES ذراسی
دیر میں شرک اور بت پرستی تک پہنچا دیتی ہیں۔ اس
لیئے ان سے پرہیز ہی مناسب ہے۔ حرف اور لفظ
اور عبارت کی بھی قرآن کی طرح حفاظت نہ ہو تو یہ بھی
لائن اور پٹری سے اتر جاتے ہیں اور آنکھ بند کر کے
لفظ کی لکیر کا فقیر بننے والے کو بھٹکا دیتے ہیں نیز حرف
اور لفظ اور عبارت بالکل صحیح صحیح ذیلی تفصیلات
کے ساتھ اس طرح موجود نہ ہوں جس طرح قرآن کے
ساتھ حدیث شریف ہے اور مزید یہ کہ ان دونوں کو
تسلسل اور تواتر کی پوری اور مکمل سند کے ساتھ سمجھنے
اور سمجھانے اور عملی شکل میں پیش کرنے والا موجود نہ ہو
تب بھی گڑبڑ ہو سکتی ہے یا افادیت پوری طرح نمودار
ہونے سے رہ جاتی ہے۔ یعنی ایک چلتے پھرتے، جیتے جاگتے
مستند گائڈ اور رہنما یعنی پیر و مرشد کی ضرورت
ہر زمانے میں رہتی ہے۔ صوفیہ نے دوسری بہت سی
وجوہ کے ساتھ زندہ پیر و مرشد کو اس لیئے بھی
ضروری خیال کیا ہے کہ اللہ تک پہنچانے والا راستہ جسے
صراط مستقیم کہا گیا ہے کسی سمنٹ یا تار روڈ کی مانند
تو ہے نہیں۔ اس راستے کی تو شان ہی سب راستوں
سے نرالی ہے کہ نظر بھی آتا ہے۔ نظر نہیں بھی آتا۔ اس پر
چلنا آسان بھی ہوتا ہے۔ مشکل بھی۔ اس راستے کی منزل
دوسری منزلوں سے مختلف کیفیت رکھتی ہے۔ وہ
نام و نشان بھی رکھتی ہے۔ بے نشان بھی ہے۔ شاعر نے

سلوک کے اس مفہوم کو مجازی استعارے میں بیان کیا ہے ؎

یار بے نام ونشاں تھا سو اسی نسبت سے
لذت عشق بھی بے نام ونشاں ٹھہری ہے

دوسرے مصرعے میں "لذت عشق"، عشق کو راستے اور لذت کو راستے کی کیفیات کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

راستہ کوئی بھی ہو۔ اس پر گامزن ہونے کے لئے آنکھ، نگاہ۔ بصیرت سب ضروری ہیں، ارادہ، ہمت، کوشش۔ سب درکار ہیں۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کسی کو مرید کرتے تو فرماتے،

"اس ضعیف۔ اس کے خواجہ اور سلسلے کے تمام مشائخ سے عہد کرو کہ تم اپنی آنکھ اور زبان کو قابو میں رکھوگے اور شرع پر عمل پیرا رہوگے۔"

آنکھ کی حفاظت سب سے پہلے اس لئے ضروری سمجھی گئی کہ اس سے راستہ ہی نظر نہیں آتا۔ راستے کے خیر وشر بھی نظر آتے ہیں۔ جائز چیزیں بھی۔ ناجائز چیزیں بھی۔ مددگار چیزیں بھی۔ راستہ کھوٹا کرنے والی چیزیں بھی۔ راقم الحروف نے مغربی ممالک میں چلتے پھرتے برقی زینوں اور سیڑھیوں سے کمزوروں اور ضعیفوں کے علاوہ ہٹے کٹے لوگوں کو بھی گرتے اور چوٹیں کھاتے دیکھا اور غور کیا تو پتہ چلا کہ ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو راستے کے عجائبات کو غیر ضروری یا ناجائز طریقے سے دیکھ رہے تھے!

نگاہ کی حفاظت اس لئے بھی لازم ہے کہ دل کا اچھا برا ارادہ آنکھ سے کچھ دیکھنے کے بعد ہی جنم لیتا ہے۔ اور اپنے سوا خواجگانؒ تک سے عہد کرانا اس لئے اہم ہے کہ اسی سے اللہ رسولؐ کے ساتھ تعلق جڑتا ہے۔ سب سے بڑے اور گویا "خواجۂ کل" تو خود اللہ میاں ہی ہیں۔ اصل اور کام کا عہد تو انہی سے ہوتا ہے۔ باقی خواجگان وہ ہیں جن کے ذریعے کتاب وسنت لازم ہوئے اور تواتر وتسلسل کے ساتھ لازم ہوئے اب جتنا غور کرتے جائیے۔ ایسی دریافتوں کی طرح بہ دریافتیں بھی ہوتی ہی چلی جائیں گی۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "اول آدمی کے دل میں کوئی چیز آتی ہے۔ اس کے بعد عزیمت ہے۔ یعنی اس خیال پر دل جم جاتا ہے۔ اس کے بعد فعل ہے (جو) اس عزیمت (وارادے) کو عمل تک پہنچاتا ہے۔ عوام جب تک کہ نہ گذریں گرفت نہیں کی جاتی۔ لیکن خواص کی پکڑ ارادے ہی پر ہوجاتی ہے۔"

یعنی اگر نگاہ کی حفاظت ہوجائے تو ارادے اور عزیمت اور فعل سب کی حفاظت خود بخود، اپنے آپ ہی ہوجاتی ہے۔

دین کو اس طرح سمجھانا۔ صرف کتاب پڑھانے والوں کے ہاں عام طور پر رائج نہیں ہے۔ اسی لئے اللہ تک پہنچانے والے راستے کے راہی اس راہ میں قدم دھرنے سے پہلے ایک راہبر ڈھونڈتے ہیں۔

"حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نے فرمایا ہے کہ "اگر کوئی شخص ایک گلی سے دوسری گلی میں جانے کا راستہ نہیں جانتا کبھی ادھر سے گذرا ہی نہیں اور یکایک چاہتا ہے کہ چلا جائے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ اپنی منزل مقصود کو پہنچ جائے گا؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم بھی نماز پڑھتے ہیں۔ روزہ رکھتے ہیں مجاہدہ اور ریاضت کرتے ہیں۔ پیر لوگ اور کیا کرتے ہیں؟ ان کا کہنا بجا ہے۔ لیکن یہ بھی سوچنا چاہیے کہ آدمی اپنے مال اسباب کے ساتھ دریا میں کشتی پر سفر کرتا ہے اس وقت ملاح کیا کرتا ہے؟ جب تک ملاح نہ ہو وہ کشتی سلامتی کے ساتھ کنارے پر نہیں پہنچ سکتی۔ اسی طرح پیر کی مثال ہے۔ مرید جو کچھ چاہے کرلے۔ لیکن شیطان کے وسوسوں اور خطرات سے اس کو پناہ صرف پیر کی تعلیم کے ذریعے مل سکتی ہے۔"[۱]

---

[۱] فوائد الفواد ۲۸ - ۵۲۔ جوامع الکلم اردو ترجمہ پروفیسر معین الدین احمد دردائی صفحہ ۱۹۰۔

اب تک کی گفتگو سے غالباً یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ سلوک مذہب پر، اسلام پر چلنے کا نام ہے۔ بے کھٹکے اور کامیابی کے ساتھ چلنے کا نام ہے۔ کسی ماہر رہنما کے ساتھ چلنے کا نام ہے!

اس کے بعد یہ سوال آتا ہے کہ راستہ شروع کہاں سے ہوا اور ختم کہاں۔ ہر راستہ چلنے والا کسی خاص جگہ اور خاص پوائنٹ سے روانہ ہوتا ہے۔ کسی خاص پوائنٹ پر پہنچنا چاہتا ہے۔ سلوک کا پہلا پوائنٹ کون سا ہے؟ آخری کونسا؟ جواب ہے اسلام بھی ایک ڈگر ہے۔ انسانوں کے چلنے کے لئے ہے۔ بندہ چلتا ہے۔ خدا کی طرف چلتا ہے۔ سفر کا آغاز بندگی کے مقام سے ہوتا ہے اور منزل خدائی بھی ہے۔ خدا بھی!

سلوک کی مدت عام طور پر وہ سمجھی جاتی ہے۔۔ جو بیعت وارادت سے شروع ہوا اور کامل اور واصل ہونے پر ختم ہو جائے۔ حالانکہ غور کیجئے تو ایسا ہے نہیں۔ اس کی ابتداء تو مہد یعنی پالنا اور پنگوڑا ہے۔ اور انتہا لحد اور جنازہ! نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر بچہ دین فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس کے ماں باپ اسے اپنے عقیدے پر چلانے لگتے ہیں۔ فرض کر لیجئے کہ ماں باپ مسلمان ہی ہیں۔ ماحول بھی اسلامی ہے۔ لیکن ان ماں باپ اور اس ماحول کی ذمے داری بچے کے پیدا ہوتے ہی اس طرح شروع ہو جاتی ہے کہ وہ نومولود کے فطری مذہب اسلام کی حفاظت کرتے رہیں۔ اس کے لئے بھی تعلیم اور تربیت لازم ہے۔ بچے کی طرف سے غیر شعوری اور ماں باپ کی طرف سے راہ پر رکھنے کی شعوری کوشش سلوک ہی کا ایک حصہ ہے!

اس کے بعد وہ وقت آتا ہے۔ جب بچے کے شعور کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ وہ سیانا ہوتا ہے۔ اگر توفیق ایزدی نے ساتھ دیا اور اس نے کسی کامل مرشد کا ہاتھ تھام لیا تو یہ سلوک کے دوسرے حصے کی شروعات ہے۔

اس راستے میں بھی تعلیم و تربیت کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھ سکتا۔ اگر اللہ نے کیا اور سلوک کی تکمیل ہو گئی۔ آدمی خدا سے ملا۔ محنت وصول ہوئی تو پھر اس وصال اور دائمی بندھن کی حفاظت کا مرحلہ آتا ہے۔ یہاں بھی چھٹی پانے یا چھٹی ہو جانے یا وظیفے پر گھر بیٹھنے کا موقعہ ہرگز ہرگز نہیں۔ تعلیم و تربیت چاہے اس شکل میں نہ ہو جس شکل میں تکمیل سلوک کے دوران تھی مگر دنیا اور اس کی آگ وہ ظالم چیزیں ہیں۔ جو بڑے سے بڑے مضبوط سے مضبوط فولادی وجود کو توڑ پھوڑ سکتے ہیں، گلا اور پگھلا سکتے ہیں۔ نیک راہ کو گم راہ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اسی لئے ایمان وہی معتبر سمجھا جاتا ہے جو مرتے دم تک برقرار رہے۔ یہ قیام و دوام بھی کوئی آسان کام نہیں ہے غرضیکہ زندگی کا کوئی حصہ بھی ایسا نہیں ہے جب تعلیم و تربیت لازم نہ ہوں اور نگہداشت کی ضرورت نہ پڑے ہندو مذہب والوں نے اس بات کو وقت اور زمانے یعنی عمر کے کسی حصہ سے وابستہ کرنے کے ساتھ ساتھ مکان سے متعلق بھی کیا ہے۔ ان کے ہاں ورن آشرم بھی ہے جو عمر کو چار حصوں میں تقسیم کرتا ہے اور ان کے الگ الگ کام بتاتا ہے۔ اور دوسری طرف نفس کی تقسیم ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک ہندو جوگی سے پوچھا کہ تمہارا طریقہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک آدمی کے نفس میں دو عالم ہوتے ہیں۔ ایک عالم علوی، دوسرا عالم سفلی۔ پیشانی سے ناف تک عالم علوی ہے اور ناف سے پیروں تک عالم سفلی۔ کام اس طرح بنتا ہے کہ عالم علوی میں تو پوری طرح صدق و صفا اور اچھے اخلاق اور حسن معاملہ ہوں اور عالم سفلی میں نگاہ داشت اور پاکی اور پارسائی۔[1]

ظاہر ہے ان دونوں عالموں کا قصہ پچیس، پچاس یا پچھتر سال کے آشرموں تک محدود نہیں ہے۔ پوری زندگی

---

[1] فوائد الفواد۔ اردو ترجمہ راقم الحروف صفحہ ۱۴۴۔

بھر پھیلا ہوا ہے اور جنم سے مرن تک کا قصہ ہے۔

دو قسمیں صوفیہ راہ طریقت پر چلنے والوں کی دو قسمیں بتاتے ہیں۔ ایک سالک، دوسرے مجذوب۔ حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے ان دونوں کی تشریح ان جامع الفاظ میں فرمائی ہے۔

"مجذوب وہ لوگ ہیں کہ کمند جذبہ نے انھیں مرتبہ ولایت تک پہنچا دیا ہے مگر (وہ) غلبۂ شوق میں اس طرح محو ہوتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ وہ ہر مقام سے گذر چکے ہوتے ہیں۔ ان کو اس کی خبر نہیں کہ راہ کا کیا حال ہے۔ مقام کی کیفیت کیسی ہے۔ خیر کس شئے کا نام ہے۔ شر کس بلا کو کہتے ہیں۔ نفع کی کیا صورت ہے۔ ضرر کس بات میں ہے اس لئے مجذوب پیر بنانے کے لائق نہیں۔ شیخ بننے کے لائق وہ ہستی (یعنی سالک) ہے کہ اگرچہ جذبۂ شوق سے راہ طے کرتا ہے۔ مگر نہایت سکون اور آہستگی سے۔ یعنی وہ ہر ہر مقام کی داد انصاف سے دیتا جاتا ہے اور آگے بڑھتا جاتا ہے، احوال خیر و شر اور صلاح و فساد کل اس پر کھول دیئے جاتے ہیں کبھی کبھی راہ سے بے راہ بھی ہو جاتا ہے (یعنی راستے کے دائیں بائیں کا جائزہ بھی لیتا ہے) تاکہ راہ اور بے راہی سے پورا وقوف حاصل ہو جائے۔ اتنے مرحلوں کے بعد اس میں یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ ایک جماعت کی رہبری کر سکے۔"[1]

دوران سلوک تعلیم و تربیت کے لزوم کے سلسلے میں مندرجہ ذیل حوالے اب تک کی گفتگو کو واضح بھی کریں گے اور اس گفتگو کو درجہ استناد بھی ملے گا۔

۱۔ شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے ایک جلیل القدر خلیفہ اور مجاز بزرگ حضرت جمال الدین ہانسویؒ کا وصال شیخ کے سامنے ہی ہو گیا تھا۔ ان کے چھوٹے اور کم عمر صاحبزادے حضرت برہان الدین صوفیؒ کو ان کی آیا حضرت مادر مومناںؒ شیخ کی خدمت میں لے گئیں تو شیخ نے اس بچے کو مرید بھی کر لیا اور اسی وقت خلافت بھی دے دی۔ حضرت برہان الدین کی آیا حیران ہوئیں اور عرض کی کہ توجہ بالا ہے۔ یعنی یہ تو ابھی بچہ ہیں۔ شیخ بولے چودھویں کا چاند پہلی رات کو چھوٹا ہی ہوتا ہے۔ بتدریج کمال کو پہنچتا ہے۔ پھر ہدایت فرمائی کہ یہ برہان الدین حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے تعلیم و تربیت حاصل کریں۔ چنانچہ حضرت امیر خورد کرمانیؒ کے بیان کے مطابق موصوف حضرت سلطان المشائخ سے تعلیم و تربیت پا کر ظاہری اوصاف یعنی رسمی علوم سے آراستہ اور باطنی خوبیوں یعنی روحانی کمال سے مالا مال ہو گئے۔[2] یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ فیضان نظر اور مکتب کی کرامت دونوں کو بیک وقت اہم سمجھا گیا۔ مرید کرنا، خلافت دینا۔ بیج کو زمین کے حوالے کرنا تھا۔ سینچنا، پالنا، پوسنا۔ سلوک کے دوران تعلیم و تربیت کا وہ لزوم تھا۔ جس کی ذمے داری حضرت سلطان المشائخ کو سونپی گئی۔

۲۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے اعلیٰ مریدوں اور خلفاء میں حضرت شیخ سراج الدین عثمان عرف حضرت اخی سراجؒ کا اسم گرامی بھی ہے۔ انھوں نے اپنی مبارک عمر کا بڑا حصہ شیخ کی خدمت میں اور خانقاہ عالیہ میں گذارا تھا۔ مگر جب حضرت شیخ خلافتیں تقسیم فرمانے لگے اور حضرت اخی سراجؒ کا نمبر آیا تو فرمایا کہ اس کام میں سب سے پہلی شرط علم کی ہے۔ اور حضرت سراج علم میں اس درجے حصہ نہیں رکھتے جس درجے شرط ہے۔ اس موقع پر حضرت مولانا فخر الدین زرادیؒ نے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو میں انھیں علم کی تکمیل کرا دوں؟ چنانچہ پڑھنے والے نے ایسا

---

[1] مکتوبات صدی اردو ترجمہ شاہ نجم الدین فردوسی و شاہ الیاس فردوسی صفحہ ۱۳۹ — ۱۴۰۔

[2] سیر الاولیاء اردو ترجمہ مولانا اعجاز الحق قدوسی صفحہ ۱۸ — ۳۱۷۔

ڑھا اور پڑھانے والے نے ایسا پڑھایا کہ چھ ماہ بعد خلافت
ور اجازت سے سرفراز کر دیئے گئے۔ مگر اس کے بعد بھی انھوں
نے رسمی تعلیم کو ترک نہیں کیا۔ اور پیر و مرشد کے وصال کے
ن سال بعد تک اس کام میں اپنی مرضی اور خوشی سے
لگے رہے[1]

۳ - حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ پیر و مرشد
حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے ہیں تو نہ صرف رسمی تعلیم
پوری طرح حاصل کر چکے تھے۔ بلکہ علماء میں ان کا بڑا نام اور
مقام تھا۔ مگر اس کے باوجود پیر و مرشد سے قرآن مجید کے
چند پارے پڑھے اور اس درجے معمولی سمجھی جانے والی چیزوں
میں بھی کمال حاصل کرنے کی کوشش کی جیسے سورہ فاتحہ
میں ضاد کا تلفظ! یا کسی دعا کے اعراب کی پیر و مرشد
کے ارشاد کے موافق تصحیح! حالانکہ جن اعراب کے
ساتھ حضرت سلطان المشائخؒ نے دعا پڑھی تھی، قاعدے
کے مطابق وہ بھی بالکل درست تھے۔[2]

حضرت بابا صاحبؒ نے ایک روز حضرت محبوب الٰہیؒ
سے یہ بھی فرمایا تھا کہ پیر مرید کا مشاطہ یعنی بنانے سنوارنے
والا ہوتا ہے۔ یہاں اس نکتے کو دھیان میں رکھنے کی
ضرورت ہے کہ ایک بننا سنورنا تو دائمی ہوتا ہے جسے
شخصیت کی تکمیل کہتے ہیں۔ لیکن دوسرا بننا سنورنا روز
روز کا بھی ہوتا ہے۔ ہر وقت کا ہوتا ہے۔ اور کوئی ایسی
بات سنگھار میں رہ جائے۔ جو آئینہ بھی دیکھ بنا سکے آدمی
کو خود بھی نظر نہ آئے تو بے تکلف احباب اور گھر والے
اس کی نشان دہی کرتے ہیں۔ نیز محبوب کے سنگھار کا
جائزہ لینے کے لئے محب اور مرید کے سنگھار کو جانچنے
کے لئے پیر سے زیادہ کسی کی نگاہ نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ
حضرت خواجہ بندہ نوازؒ مجاہدے کے زمانے میں جو لباس
زیب تن فرمائے ہوئے تھے۔ اس کی بوسیدگی پیر و مرشد
حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کی نظر میں کھٹکی۔

حضرتؒ خود نہایت بے داغ سفید اور صاف لباس
استعمال فرماتے۔ نشست کے اطراف موسم کے پھول
بھی ہوتے۔ چہیتے مرید خواجہ گیسو درازؒ کو جسے کب کا
اپنے ہی جیسا بنا چکے تھے۔ اسے روز روز ہر لحظہ اپنے ہی جیسا
بھلا کیوں نہ دیکھنا چاہتے۔ اس لئے ذات مبارک کی
طرف اشارہ کر کے کہہ اٹھے۔ کیا مومن اس طرح زندگی
بسر نہیں کر سکتا؟ یہ ارشاد گرامی میرے ناچیز خیال
میں بقول اقبالؔ محض

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر!

والی فرمائش نہ تھی۔ اس طرف اشارہ تھا کہ سلوک
خاک مٹی میں اٹ کر ہی منزل پر پہنچنے کا نام نہیں ہے۔
خوب سے خوب تر سفر کا نام بھی ہے۔ آن بان شان سے
بھی سلوک طے کیا اور کرایا جا سکتا ہے۔ پیر اعلیٰ سے اعلیٰ
درجے کا ٹکٹ دلائے تو مرید اس سے فائدہ کیوں نہ
اٹھائے؟

دوران سلوک تعلیم و تربیت کی حکایتیں بے شمار
ہیں۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے عالم طریقت
کے ذکر میں شرف الدین نامی ایک صاحب کا ذکر کیا ہے
جو بڑی صلاحیت اور راہبیت کے آدمی تھے۔ مگر حضرت
بابا فرید گنج شکرؒ نے ان سے پوچھا کہ تمہاری پڑھائی
کا کیا حال ہے تو بولے۔ اب تو سب کچھ بھلا دیا ہے۔
شیخ کو یہ بات پسند نہ آئی۔

خود حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے بارے
میں اوپر ذکر آ چکا ہے کہ مرید ہوتے ہیں تو ساری ڈگریاں
جیب میں موجود تھیں۔ پھر بھی پیر و مرشد سے پوچھا کہ
کیا میں پڑھنا چھوڑ کر ورد وظیفے اور مجاہدے میں
لگ جاؤں؟ بابا صاحب نے فرمایا کہ میں کسی کو علمی مشغلے
سے نہیں روکتا۔ دونوں کام کرتے رہو (ضرورت کے
موافق) ایک کام دوسرے پر اپنے آپ غالب آجائے گا!

---

[1] سیر الاولیاء اردو ترجمہ مولانا اعجاز الحق قدوسی صفحہ ۴۵۰۔ [2] فوائد الفواد صفحہ ۲۴۲۔

حضرت محبوب الٰہیؒ سے باباصاحبؒ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ تم میں علم اور عشق اور عقل تینوں چیزیں پائی جاتی ہیں اور جس میں یہ تینوں چیزیں ہوں اس سے بزرگوں کی خلافت کا کام خوب ہوتا ہے۔ گویا علم، عشق اور عقل پیر و مرشد کے لئے اسی لئے ضروری ہیں کہ سالک یعنی وہ شخص ان کا ضرورت مند ہوتا ہے جسے سلوک طے کرانا ہے۔ راستہ اس وقت طے ہوتا ہے جب آدمی بیٹھ نہ رہے متحرک رہے۔ متحرک رہنا، علم عشق اور عقل کے بغیر ہو تو گمراہی ہے۔ علم عشق اور عقل کے ساتھ ہو تو ہدایت! تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۰۹ کا ذکر بالکل شروع میں آچکا ہے!

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نے ایک دفعہ اہل مجلس سے فرمایا کہ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کسی ایسے تخم اور بیج کا نام بتاؤ کہ اگر اسے ایک زمین میں بویا جائے تو گندم پیدا ہو۔ دوسری زمین میں لگایا جائے تو جو اُگیں۔ تیسری میں لگایا جائے تو سیب۔ (غرضیکہ) کسی میں کدو۔ کسی میں دھتورہ۔ کسی میں تو تیا اور کسی میں زہر پیدا ہو۔ یعنی بیج تو ایک ہی ہو لیکن طریقے اور تربیت خاص کی وجہ سے اس کا ماحصل اور پیداوار مختلف ہو جائے تو میں کہوں گا کہ وہ تخم انسان ہے! وہی ایک ایسا تخم ہے جو تربیت، طریقہ اور ماحول بدلنے سے کبھی پیغمبر، ولی، ابدال اور قطب کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ کبھی کافر، فاسق، چور اچکا اور چنڈال! [1]

لیکن وہ طریقہ اور تربیت اور ماحول ہے کیا؟ جس کا ذکر حضرت بندہ نوازؒ فرما رہے ہیں اور جس سے آدمی کا چولا ہی نہیں کہنا چاہیے کہ جون بدل جاتی ہے تو عرض ہے کہ جس طرح خالق کل

کل یوم ھو فی شان

ہر روز ایک نئی شان کا مالک ہے۔ اسی طرح اس کی مخلوق بھی طرح طرح کی شانوں کے زیر اثر رہنے کی وجہ سے نت نئے روپ دکھاتی ہے۔ اس کی بہترین مخلوق انسان جسے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے ”احسن تقویم“ بہترین نقشے پر بنی ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ نقشہ ایک ہوتے ہوئے بھی ہر آدمی کا روپ مختلف ہے۔ کیفیات اور احوال بھی الگ الگ ہیں۔ افتاد بھی ایک نہیں۔ ایک ہی سائز کا سلا سلایا لباس بھی ہر انسانی جسم پر فٹ نہیں۔ موزوں نہیں۔ ہیں سب آدمی۔ شریعت بھی سب کے لئے ایک ہے۔ لیکن یہی شریعت نماز کے لئے صحت مند آدمی کے لئے ایک طرح کا حکم لگاتی ہے بیمار کے لئے دوسرے کے لئے دوسری طرح کا۔ کھانے کے جواز میں پیٹ بھرے کے لئے ایک حکم ہے۔ بھوک سے جان گنوانے کے لئے دوسرا حکم۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ڈاکٹر بخار کی ایک ہی علامت رکھنے والے متعدد مریضوں کے لئے ملیریا، فلو، ٹائی فائڈ کی الگ الگ دوائیں تجویز کرتا ہے۔ روحانی معالج پیر بھی سلوک کے دوران شریعت کی بنیادی پابندی کے ساتھ دوا اور پرہیز ہر ایک کے لئے ایک نہیں رکھتا۔ کسی کے لئے نچلے اور چلے کو ضروری سمجھتا ہے۔ گیان دھیان کراتا ہے۔ کسی سے حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے پیر کی طرح یہ کہتا ہے کہ تم لاکھ سوچو کہ جنگل بیابان باغ اور قبرستان میں عبادت کی یکسوئی ہے۔ کنویں سے زیادہ دریا کا پانی صاف ہے۔ مگر تمہیں آبادی کے درمیان وقت گذارنا چاہیئے مخلوق اور دنیا کے جفاقفا جھیلو اور پھر خدا کو یاد رکھو۔ خدائی کی رہنمائی کرو!

جب صورت حال یہ ہو تو کتابی تعلیم کے کورس اور نصاب کی طرح بہت ہی لگا بندھا اور جکڑا ہوا ضابطہ نہ مقرر کیا جا سکتا ہے نہ ہر زمانے، ہر علاقے اور ہر آدمی کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ تاریخ بھی شاہد یہی گواہی دیتی ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا سوا اس کے کہ قرآن و حدیث بنیاد ہیں شریعت مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ و

[1] جوامع الکلم صفحہ ۱۴۶ — ۱۴۷۔

سے سرمو انحراف اور تجاوز جائز نہیں۔ لیکن شریعت کے منشاء
کو تمام و کمال سمجھنا اور ہر سالک کی استعداد اور احتیاج
کے مطابق اس پر اس کا نفاذ آسان کام نہیں۔ یہ کام
زندہ پیر اسی طرح کرتا ہے۔ جس طرح ہر مریض کا علاج
زندہ ڈاکٹر کرتا ہے۔ یعنی قرابادین اور فارماکوپیا دیکھ کر
نسخے بنانا سمجھداری کی بات نہیں ہے۔ اور جہاں تک
سمجھ کی بات ہے۔ یہ بھی ہر آدمی الگ الگ طرح کی رکھتا
ہے۔ سمجھانے والا کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو۔ ضروری نہیں
کہ ہر ایک کو بات سمجھا سکے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کتنے
بڑے عالم، مفتی اور بزرگ ہیں مگر ایک عام آدمی کے
دماغ میں اتنی سی بات نہ بٹھا سکے کہ کسی بڑے دریا کے
کنارے ہونے کے باوجود آدمی وضو میں مقررہ مقدار
سے زیادہ پانی کیوں استعمال نہ کرے۔ آخر یہ فرمادیا
کہ میاں راج شاہ نامی بزرگ جمعے کے دن گاؤں
سے نماز پڑھنے آئیں تو ان سے یہ مسئلہ پوچھنا چنانچہ
جب میاں راج شاہ سے پوچھا گیا تو انھوں نے
چٹکی بجاتے اس طرح بات سمجھا دی کہ کھانا پکاتے وقت
ہانڈی میں پانی کم ڈالا جائے جب بھی ہانڈی بگڑ جاتی
ہے اور جو کچھ پکایا گیا ہے۔ مزے کا اور ٹھیک نہیں
پکتا اور اگر پانی زیادہ پڑ جائے تب بھی کھانا مزے کا
نہیں رہتا۔ ہانڈی بگڑ جاتی ہے۔۔ یہی حال وضو غسل
میں، پانی کے استعمال اور دوسرے شرعی خرچ کا ہے۔

واضح رہے کہ میاں راج شاہؒ بے پڑھے لکھے
امی محض تھے اور حضرت حاجی عابد حسین صاحب مرحوم
بانی دارالعلوم دیوبند کے پیر و مرشد تھے۔ انھوں نے
تیس میل دور سے آکر برسہا برس حضرت شاہ
عبدالعزیز دہلویؒ کے پیچھے جمعے کی نماز پڑھی وہ
رسمی تعلیم نہ رکھنے کے باوجود دین سے اس قدر واقف
تھے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز جیسا بزرگ بے کھٹکے
سائل کو ان کے حوالے کر دیتا تھا!

سلوک کے دوران قدم قدم پر اور
ہر وقت ضرورت ہوتی ہے کہ پیر سالک کی دیکھ بھال کرتا
رہے۔ وسوسوں اور خطرات سے بچائے تعلیم دے
اور تربیت فرمائے۔ موجودہ زمانے میں جبکہ لوگ
پانچ وقت کی نماز اور تہجد پڑھ کر اور دو چار چلے
صحیح اور غلط کھینچ کر سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم منزل پر پہنچ
گئے اور خدا رسیدہ ہو گئے حالانکہ صبح سے شام تک
غیر اسلامی اور ناجائز کاموں اور دھندوں میں مصروف
رہتے ہیں۔ ان کے لئے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ
کی بیان کردہ یہ حکایت شاید مفید ہو کہ ایک
بڑے پرہیزگار بزرگ ہمیشہ یہ فرماتے کہ نماز روزہ
تسبیح و اوراد سب دیگ کے مسالے ہیں۔ اصل چیز
دیگ میں گوشت ہوتا ہے۔ جب تک گوشت نہ ہو
ان مسالوں سے کچھ نہیں بنتا۔ ان بزرگ سے ان کے
قول کی وضاحت چاہی گئی تو بولے کہ گوشت ترک
دنیا ہے اور نماز روزہ اور اوراد اس کے مسالے ہیں
اوّل آدمی کو چاہئے کہ ترک دنیا اختیار کرے۔ دنیا
کی محبت دل میں ہوگی تو عبادت سے پورا فائدہ نہیں
اٹھایا جا سکے گا۔ جو شوربا بغیر گوشت صرف مسالوں
کی مدد سے تیار کیا جائے اسے شوربائے زور (نقلی شوربہ)
کہیں گے۔ اصل شوربہ وہ ہوگا جو گوشت سے
تیار ہو۔ [1]

یہاں یہ بات بھی یاد رکھی جائے کہ حضرت
محبوب الٰہیؒ کے بقول ترک دنیا یہ نہیں ہے کہ آدمی
لنگوٹی باندھ کر پہاڑ کی کھوہ میں جا بیٹھے۔ یہ کام تو
ایک بڑھیا بھی کر سکتی ہے۔ مردوں کا کام یہ ہے کہ
کھائے پیئے کمائے دھمائے لیکن دنیا اور اس کی
چیزوں سے محبت نہ کرے۔ ان سے دل نہ لگائے۔
اسی طرح درست نماز اس طرح ہے کہ اس کے ظاہری
ارکان درست طریقے سے ادا ہوں اور دوسری طرف

۱؎ فوائد الفواد صفحہ ۱۲۔

دل اِدھر اُدھر نہ بھٹکے۔ اللہ کے سامنے پوری یکسوئی کے ساتھ حاضر ہو۔

نماز کی حضوری کے سلسلے میں حضرت نے دہلی کے ایک معمولی کلرک کا قصہ بیان فرمایا ہے جس نے دنیا سے دل لگانا چھوڑا تو اس کا دل خدا سے واقعی اس طرح لگ گیا کہ ایک روز دہلی کی فصیل کے باہر مغرب کی نماز پڑھ رہا تھا اور لوگ بھی ساتھ تھے۔ یکایک ڈاکوؤں کے خطرے کا شور مچا۔ سب لوگ بھاگ کر فصیل کے اندر پناہ لینے چلے گئے۔ ان کو بہت پکارا۔ مگر کریم صاحب نامی ان کلرک نے پورے خشوع و خضوع اور اطمینان کے ساتھ اپنی نماز پوری کی۔ اس کے بعد ہی فصیل کے اندر گئے۔ ساتھیوں نے کہا تعجب ہے۔ ہم نے اتنا شور مچایا مگر تم نے ذرا نہیں سنا۔ وہ بولے کہ تمہیں تعجب تو اس پر ہونا چاہئے تھا کہ کوئی اللہ کے سامنے حاضر ہو اور نماز پڑھ رہا ہو اور پھر ادھر ادھر کی آوازیں سنے! [۱]

صوفیہ نے سلوک کی تکمیل کے دوران دو طرح کی طاعتوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ ایک طاعت لازم۔ دوسری طاعت متعدی طاعت لازم روزہ نماز وغیرہ فرائض ہیں۔ ان کی ادائیگی بے حد ضروری ہے۔ اس طاعت میں خلوص اور حضور بھی شرط ہے۔ خلوص نیت سے ہوتا ہے۔ حضور کوشش اور مشق سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مراقبے اور اشغال حضور ہی کے لئے تجویز کئے جاتے ہیں۔ دنیا دکھاوے ریاکاری اور ظاہر داری کی طاعت لازمی سے فرض تو خیر ادا ہو جاتا ہے۔ لیکن پورا فائدہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ سلوک پورے اسلام اور پورے فائدے ہی کا متقاضی ہے۔ طاعت متعدی ہر اس کام کو کہتے ہیں جس سے اللہ کے بندوں، اللہ کی مخلوق کا بھلا ہو۔ اس کام میں خلوص بھی اس طرح شرط نہیں۔ جس طرح طاعت لازم میں شرط ہے۔ یعنی متعدی طاعت اگر بے خلوص ہو تو اس سے ثواب کم تو ہو جاتا ہے۔ لیکن بالکل ختم نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی شخص ریاکاری سے اور اپنی سخاوت کی نمائش کے لئے یا کسی اور غلط مقصد سے کسی بھوکے کو کھانا کھلائے تو اس کو اپنی بری نیت کے باوجود نیکی کا اتنا ثواب ہر حالت میں مل جائے گا کہ اس عمل سے اللہ کے ایک بھوکے بندے کا پیٹ بھر گیا۔ [۲]

اہل تصوف نے تکمیل سلوک کے لئے محض فضل ایزدی پر بھروسہ کر کے بیٹھ جانے کو پسند نہیں کیا ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ فرماتے تھے کہ جو بھی تھا، حسن عمل سے کسی مقام پر پہنچا۔ خدا کا فیض تو ملتا ہی ہے۔ لیکن ہمیں خود بھی جدوجہد کرنی چاہیے۔

سلوک کی راہ ایسی راہ ہے جہاں ذرا سی غفلت راہی کو بہت پیچھے کر دیتی ہے۔ مشہور شعر ہے ؎

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

میں پیر سے کانٹا نکالنے کے لئے ذرا پلٹا تھا کہ پیارے کی محمل نظر سے اوجھل ہو گئی۔ ایک لحظے کی غفلت نے مجھے اپنے راستے سے سو سال دور کر دیا!

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا:۔

"چلنے والا الکمال کی طرف رخ رکھتا ہے۔ یعنی سالک جب تک سلوک میں ہے۔ کمالیت کا امیدوار ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ سالک ہوتا ہے۔ اور واقف ہوتا ہے۔ اور راجع۔ چنانچہ سالک تو وہ ہے جو راستہ چلتا ہے۔ اور واقف وہ ہے کہ جس کو وقفہ پڑ جاتا ہے۔ پوچھا گیا کہ کیا سالک کو بھی وقفہ پڑ جاتا ہے۔ فرمایا ہاں! جب بھی سالک کی طاعت میں کوئی فتور پڑتا ہے۔ جیسے کہ

---

[۱] فوائد الفواد صفحہ ۱۶۔ [۲] فوائد الفواد صفحہ ۲۱۔
[۳] فوائد الفواد صفحہ ۱۰۔

طاعت میں ذوق نہ رہے تو اس کے لئے وقفہ ہوتا ہے۔ اگر جلدی ہوشیار ہو جائے اور حق تعالٰی کی طرف رجوع ہو تو پھر سالک ہو سکتا ہے۔ اور اگر خدا کی پناہ اسی (حال پر) جما رہے تو اس کا خطرہ ہے کہ راجع ہو جائے۔

"اس کے بعد اس راہ کی لغزشں کی سات قسمیں بیان فرمائیں۔ اعراض، حجاب، تفاصل، سلب مزید، سلب قدیم، تسلی، عداوت۔ ان قسموں کی تمثیل اور تفصیل میں فرمایا کہ (جیسے) دو دوست ہوں۔ عاشق اور معشوق۔ ایک دوسرے کی محبت میں ڈوبے ہوئے اس درمیان اگر عاشق سے کوئی حرکت یا کام یا بات یا فعل ایسا ہو جائے جو اس کے دوست کی پسند کا نہ ہو وہ دوست اس سے اعراض کرتا ہے۔ یعنی منہ موڑ لیتا ہے۔ پس عاشق پر واجب ہے کہ اسی وقت استغفار میں مشغول ہو جائے اور معذرت چاہے تو یقیناً اس کا دوست اس سے راضی ہو جائے گا۔ تھوڑی سی بے توجہی جو ہوئی تھی جاتی رہے گی۔ اور اگر وہ محبت کرنے والا اس خطا پر اصرار کرے گا اور عذر (پیش) نہیں کرے گا تو وہ اعراض حجاب تک پہنچ جائے گا۔ معشوق ایک حجاب (پردہ) درمیان میں لے آئے گا۔ پس محب (عاشق) پر واجب ہوگا کہ معذرت کی کوشش میں رہے اور توبہ کرے اور اگر اس معاملے میں سستی کرے گا تو وہ حجاب تفاصل میں بدل جائے گا۔ کیا ہوگا؟ یہ کہ وہ دوست جدائی اختیار کرلے گا۔ پس شروع میں اعراض سے زیادہ نہیں تھا۔ چونکہ معافی نہیں چاہی حجاب ہوگیا اور جب اس ناپسند بدگی پر اڑا رہا تو تفاصل ہوگیا (دوری ہوگئی) اگر اس کے بعد بھی وہ دوست معافی نہ مانگے تو سلب مزید (واقع) ہو گا یعنی اس کے اوراد اور طاعت و عبادت کے ذوق میں جو بڑھت تھی وہ واپس لے لی جائے گی۔ پس اگر اس پر بھی عذر نہ کرلے اور اس ہٹ دھرمی پر جما رہے تو سلب قدیم ہوگا کہ وہ طاعت اور وہ راحت جو "مزید" (بڑھوتری) سے پہلے میسر تھی وہ بھی چھن جائے گی۔ پس اگر یہاں بھی توبہ میں کسر رہ جائے تو اس کے بعد تسلی ہوگی۔ تسلی کسے کہتے ہیں؟ یعنی اس کے دوست کا دل اس کی جدائی پر مطمئن ہو جاتا ہے۔ پس اگر پھر بھی توبہ میں سستی ہو تو عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور محبت جو تھی وہ عداوت میں بدل جاتی ہے۔ نعوذ باللہ منہا [1]

حضرت نے فرمایا کہ ہمیشہ طاعت و عبادت میں مشغول رہو اور اوراد اور دعاؤں کے پڑھنے میں محنت کرو اور مشایخ کی کتابوں کا مطالعہ کرو غرضیکہ مشغول رہو۔ بیکار نہ بیٹھو۔[2]

سلوک کے فاصلے اور مدت کے سلسلے میں حضرت محبوب الٰہی رح کا ارشاد ہے کہ اگر سلوک کے سو درجے سمجھے جائیں تو اس میں کشف و کرامت کا مقام اور درجہ سترھواں ہے۔ اس کو راستے کا حجاب (بھی) کہا گیا ہے۔ کام کی چیز محبت میں استقامت ہے۔ اگر آدمی سترھویں مقام ہی میں گم ہو کر رہ جائے تو باقی کے تراسّی [۸۳] درجے کیسے حاصل ہوں گے [3]

دوران سلوک پوری تعلیم اور تربیت ایک خاص ترتیب کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس لئے طالب کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ نہ صرف کسی زندہ پیر کا ہاتھ تھامے بلکہ کسی ایک در کا ہو کر رہے۔ بزرگوں کے مزار پر جاکر اور چادر پکڑ کر مرید ہونے کو حضرت بابا فرید گنج شکر رح نے درست قرار نہیں دیا ہے کیونکہ اس طرح ظاہری تعلیم و تربیت سے محرومی رہتی ہے۔ اور جگہ جگہ جانے میں تعلیم کا انداز بھی بدل جاتا ہے اور ترتیب بھی قایم نہیں رہتی۔ حضرت شیخ ابوالخیر ابوسعید رح سے

---

[1] فوائد الفواد صفحہ ۲۶ ـــ ۲۷۔ [2] فوائد الفواد صفحہ ۳۹۔ [3] فوائد الفواد صفحہ ۵۴۔

کوئی شخص بیعت ہوا اور تلقین کی درخواست کی۔ انھوں نے فرمایا۔ جو چیز اپنے لئے پسند کرتے ہو وہی دوسرے کے لئے بھی پسند کرو۔ مرید کو اس طرح کی تلقین کی خواہش نہیں تھی۔ ورد وظیفہ چاہتا تھا۔ کچھ مدت بعد پھر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں آپ کا مرید ہوا تھا۔ منتظر ہوں کہ کوئی وظیفہ تلقین کیا جائے۔ حضرت نے کہا مرید ہوتے وقت ہم نے تمہیں کیا بات بتائی تھی۔ بولا آپ نے کہا تھا جو چیز اپنے لئے چاہتے ہو وہی دوسروں کے لئے بھی چاہو۔ شیخ نے جواب دیا کہ جب تم نے پہلا سبق یاد نہیں کیا اور اس پر عمل پیرا نہیں ہوئے تو ہم دوسری بات کیا بتائیں۔

صوفیہ نے اللہ رسولؐ کی طرف سے آئی ہوئی تعلیم کو جوں کا توں پہنچانے کا اس درجے اہتمام رکھا ہے کہ جس طرح حدیث شریف کی روایت میں ثقہ راویوں کا معمول رہا ہے کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی بات ارشاد فرماتے وقت آدھی بات کہی اور تھوڑے سے توقف کے بعد اسے پورا فرمایا تو یہ راوی بھی آدھی بات کہہ کر رک جایا کرتے تھے اور تھوڑا سا وقفہ دے کر بات پوری کرتے تھے تاکہ اس وقفے سے اگر معنویت کا SHADE اور پرتو کچھ بدل جاتا ہو تو وہ بھی روایت میں جوں کا توں منتقل ہو کر بعد والوں تک پہنچے۔ اسی طرح صوفیہ نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ حضرت خواجہ حسن علا سجزیؒ کو نماز اور اوراد کی تلقین فرمارہے تھے۔ تلقین کرتے کرتے فرمایا کہ دو رکعتیں اور ہیں۔ وہ بھی بتاؤں گا۔ یہ بات زبان مبارک سے فرمائی اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور ارشاد کیا کہ جس روز میرے مرشد شیخ الاسلام فریدالدین قدس اللہ سرہٗ العزیز نے مجھ سے نماز اشراق کے لئے فرمایا تھا۔ پہلے یہی چھ رکعتیں بتائی تھیں اور ارشاد ہوا تھا کہ دو اور بھی بتاؤں گا۔

پیر کی صحبت میں رہنے کے فائدے وہی فائدے ہیں۔ جو صحابہ کرام رضؓ کو ان کی صحابیت کی وجہ سے پہنچے۔ مسائل کے وہ باریک نکتے اور وہ نازک پہلو جن کا ذکر نہ عام طور پر کتابوں میں آتا ہے۔ نہ عمل دنیا سے دور رہنے والے ان کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں ان کو جان لینے کی خوش نصیبی صحبت پانے والوں ہی کو ملتی ہے حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس سلسلے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ کا واقعہ نقل فرمایا ہے کہ وہ سامنے سے آرہے تھے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے اپنا ہاتھ سمیٹ لیا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ میں اس وقت ایسی حالت میں نہیں ہوں کہ آپ جیسی پاک ہستی کا ہاتھ تھام سکوں۔ میں اپنی بیوی کے پاس تھا اور ابھی تک غسل نہیں کر سکا ہوں۔ حضور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد کیا کہ مومن غسل کا ضرورت مند تو ہوتا ہے مگر نجس نہیں ہوتا۔ غسل کے ضرورت مند مومن کا جھوٹا پانی پیا جا سکتا ہے۔

جس چیز کو ہم سلوک کہتے ہیں وہ حقیقت میں شریعت مطہرہ ہی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے لوگوں نے اس کی روح کو نظرانداز کرنا شروع کر دیا۔ اس لئے ایک اور لفظ کے ذریعے اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ شریعت کے ظاہری اور باطنی دونوں مقامات تک رسائی ہو جائے تو دراصل یہی خدارسیدگی ہے اور اس منزل کو پانے والا ہی واصل کہلا سکتا ہے۔ یہ کام آسان نہیں ہے اور صوفیہ اسی کو کامل اور واصل مانتے آئے ہیں جو ہر وقت سلوک کے اس معیار پر پورا اترتا رہے۔

حضرت خواجہ بندہ نوازؒ نے کسی بزرگ کا قصہ بیان فرمایا ہے کہ وہ ایک اور نامی بزرگ سے ملنے جارہے تھے۔ اتفاق سے یہ نامی گرامی بزرگ اپنی قیام گاہ سے پہلے ہی نماز کے لئے مسجد جاتے ہوئے مل گئے اور انھوں نے چلتے چلتے قبلے کی طرف تھوک دیا۔ پہلے بزرگ نے فوراً ان کی ملاقات کا ارادہ ترک کر دیا اور فرمایا کہ جس کے اعضاء

ور جوارح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقوں ورآداب کے خوگر اور عادی نہیں ہوتے ہیں وہ بزرگ بھی نہیں ہوسکتا۔

حضرت بندہ نوازؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ سالک کو توراہ سلوک کے بارے میں اس طرح خبر دینی چاہئے جیسے کوئی مسافر راستے میں واقع کانٹے۔ نشیب وفراز درخت، دریا وغیرہ کی خبر دوسرے راستہ چلنے والے کو دیتا ہے۔

صوفیہ نے اپنے مریدوں کو دوران سلوک قرآن مجید کا یہ حکم بار بار سنایا ہے کہ

کونوا مع الصادقین۔ صادقوں کے ساتھ ہوجاؤ! یہ مرتبہ اول درجے میں پیغمبروں کو حاصل ہے۔ بعد میں ان کے خلفاء کا یعنی مشائخ کرام کا درجہ ہے۔ کیونکہ وہی اصل میں العلماء ورثۃ الانبیاء (علما انبیاء کے وارث ہیں) کا صحیح مصداق ہیں۔ لوگ ان سے صرف مسائل کا علم ہی حاصل نہیں کرتے مسائل پر عمل پیرا ہونا بھی سیکھتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پر توبہ بھی کرتے ہیں۔ ان کے سامنے اللہ سے عہد بھی باندھتے ہیں۔ توبہ کرنے والوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ۔ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں۔

مگر توبہ کی حقیقت کیا ہے؟ توبہ کی حقیقت آئندہ کا عہد اور گزشتہ کی تلافی ہی نہیں ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ طالب کے صفات ذمیمہ صفات حمیدہ سے بدل جائیں۔ یہ ایک ہمیشہ جاری رہنے والا کام ہے۔ بعض صوفیہ نے اسے گردش کے لفظ سے بھی یاد کیا ہے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ مرید ایک حال سے دوسرے حال میں ہوجائے اور اس دوسرے حال ہی میں رہے۔ جب مرید کی حالت بدل جاتی ہے تو وہ دوسری ہی چیز ہوجاتا ہے۔ گویا ایک اور ہی ہستی نمودار ہوجاتی ہے۔ یہ نئی ہستی ہی سلوک کا پھل ہے۔ مگر شگوفے سے پھول اور پھول سے پھل بننے تک اور پکنے تک بڑی خبر گیری چاہتا ہے۔

(یہ مضمون حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے سالانہ عرس ۱۴۱۴ھ کے موقع پر منعقد ہونے والے سیمینار میں پڑھا گیا)

ایکیوپنکچر علاج کا مذہبی اور روحانی پہلو

از ڈاکٹر سیدہ گل رخ محمود

(ڈاکٹر سیدہ گل رخ محمود سلمہا شمس العلماء
حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی نواسی اور خواجہ صاحب
کی چھوٹی صاحبزادی سیدہ کوثر بانو اور داماد اعجاز علی
صاحب ایڈوکیٹ کی بیٹی ہیں۔ آجکل اپنے شوہر ڈاکٹر
فرخ محمود سلمہ کے ساتھ اٹلی میں قیام پذیر ہیں۔
میڈیسن کی متعدد ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد
انھیں ایکیوپنکچر علاج سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس
دوران انھیں اندازہ ہوا کہ اس علاج کا ایک روحانی
اور مذہبی پہلو بھی ہے۔ اگرچہ مذہب اور روحانیت
ان کی تعلیم کا موضوع کبھی بھی نہیں رہے۔ لیکن ایک
مذہبی اور روحانی گھرانے سے متعلق ہونے کی وجہ
سے انھیں نہ صرف مذہب کے مبادیات سے واقفیت
ہے بلکہ کہیں بھی کوئی چیز روحانیت سے تعلق رکھنے
والی نظر آتی ہے تو ان کے ذہن میں سوالات ابھرتے
ہیں۔ اور ان کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کرتی
ہیں۔ ایکیوپنکچر چینی طریقہ علاج ہے۔ اس کے مطالعے
کے دوران انھیں پتہ چلا کہ قدیم چینی اپنے عقاید کا سلسلہ
بھی جسمانی علاج سے جوڑتے تھے نیز ان کے بعض عقاید
اسلامی عقاید سے بھی ملتے جلتے انھیں محسوس ہوئے۔
اس کا ذکر انھوں نے ایک نجی خط میں اپنے ماموں
خواجہ حسن ثانی نظامی سے بھی کیا۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں
ہے کہ ڈاکٹر گل رخ کے تاثرات سے سب لوگ متفق
ہوں لیکن نئے زمانے کے ایک ڈاکٹر کے ذہن میں جو
سوالات آئے ہیں انھوں نے اہل علم کو دعوت دی ہے
کہ وہ سنجیدگی سے ان پر غور فرمائیں۔ اور دیکھیں کہ
یہ تاثرات کہاں تک حقیقت سے مطابق ہیں۔ امید ہے
منادی کے ناظرین بھی ڈاکٹر گل رخ کے نجی خط کو جو ذیل
میں درج کیا جا رہا ہے دلچسپ پائیں گے۔
حضرت خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی
کے صدر محترم عالی جناب حکیم عبدالحمید مدظلہ چانسلر
ہمدرد یونی ورسٹی بیک وقت مذہب اور طب کے
ماہر ہیں۔ ذیل کا خط ان کی توجہ کا بطور خاص مستحق ہے۔
(ادارہ)

پیارے ماموں حسن

السلام علیکم

آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں نے اپنا PHD پچھلے
سال مکمل کر لیا تھا اب ACUPUNCTURE کے امتحان
کے لئے تیاری کر رہی ہوں۔ سارا دن مختلف کاموں میں

زر جاتا ہے۔ صبح کے وقت جب اپنے SHOWROOM
جاتی ہوں تو بیٹھ کر کچھ پڑھ لیتی ہوں جاوی کی شادی
غالباً ہماری بات ہوئی تھی کہ آنحضرتؐ نے یہ کیوں
یا تھا کہ "علم حاصل کرو چاہے اس کے لئے چین جانا پڑے"
نے مجھ سے ایک مضمون لکھنے کے لئے کہا تھا۔ لیکن
ں وقت میں اپنے دوسرے کورس میں مصروف تھی
ں لئے ACUPUNCTURE کی پڑھائی کی طرف
جہ نہ دے سکی اور دیر ہوتی گئی۔ اب میں نے سوچا کہ
ام بھی کر لوں لیکن معلوم ہوا کہ اتنا آسان نہیں ہے۔
ونکہ ایک تو اطالوی زبان سے اردو میں ترجمہ کرنا پھر مختلف
مطلاحات TERMS جو کہ چینی زبان سے اخذ
لئے ہیں۔ ان کی تشریح کرنا "کارے دارد" ہے۔ پھر یہ
جمے جو چینی سے فرانسیسی اور اس سے اطالوی میں ہوئے
ں مکمل نہیں ہیں۔ جگہ جگہ کمی محسوس ہوتی ہے اس کے
۔ پرا ابھی ریسرچ جاری ہے۔ دوسرے مغربی علماء نے
ترجمے ایک محدود نقطہ نظر سے کئے ہیں۔ یعنی انھیں
رف طب MEDICINE میں استعمال (APPLY)
یا ہے۔ جبکہ یہ علم چینیوں کی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی
ہے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ چند بنیادی چینی اصطلاحات
ر تصورات CONCEPTS کا ترجمہ کروں جو کہ اس
ئنات کی حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔ کئی جگہ چینی
مطلاحات استعمال کی گئی ہیں کیونکہ ان کا اصل ترجمہ
از کم اردو میں مشکل ہے۔ دوسرے یہ چینی کتابیں
تین چار ہزار سال پرانی ہیں CODE WORDS
ں ہیں اور جگہ جگہ صرف حل موجود ہیں مختلف اشکال
شکل میں بغیر تشریح کے، ان کو فرانسیسی علماء
نے DECODE کیا ہے اور منطق، فزکس اور
THERMODYNAMICS کے موجودہ جانے

پہچانے اصول استعمال APPLY کئے ہیں۔ بہر حال
جو صورت حال میرے سامنے آئی ہے وہ تھوڑا بہت
آپ کو لکھ کر بھیج رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس
میں بے ترتیبی نظر آئے اور اردو بھی کوئی خاص ٹھیک
نہ ہو۔ دلی سے دور ہونے کا یہ نقصان تو ہونا ہی تھا!
میرا خیال ہے۔ اس معلومات کی روشنی میں اور
مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کائنات کے کئی رازوں
کو سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اللہ کی نشانیوں پر
غور کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ہر ایک عام آدمی کے لئے یہ سب
سمجھنا ذرا مشکل ہوگا۔ لیکن کوشش کی جا سکتی ہے۔
آپ بھی کچھ بتائیے۔

چینی قائل ہیں " "TAOISM" کے یہ
"TAO" (تاؤ) کہا ہے یہ چینی زبان میں اس کا سلیس ترجمہ
ہے "راستہ"، (غور کیجئے سلوک یا صراط) یہ پہلا تشریح ہے
اس کو چھوا نہیں جا سکتا اور یہ خیال انسانی کے احاطے سے
باہر ہے۔

انسان کس طرح وجود میں آیا: ازل ایک لامتناہی
خلا تھا۔ جو کہ بنیاد بنا تبدیلی ماہیئت کی (TRANS
FORMATION) اس کی شروعات ہوتی ہے "ایک"
سے۔ اس کا نام ہے "TAE XI" (تائے زی) یعنی
سب سے بڑا "ایک"۔ جب یہ "ایک" حرکت میں آیا
تو دو طاقتیں وجود میں آئیں۔ آسمانی (YANG) اور
زمینی (YIN)۔ ان دونوں طاقتوں کے ملنے سے
آسمان اور زمین کے درمیان موجود تمام چیزیں پیدا
ہوئیں۔ YIN مظہر ہے ٹھہری ہوئی قوت کا
(مادی) جبکہ YANG ظاہر کرتا ہے محرک طاقت کو
ان دونوں کے آپس میں ملنے سے تمام چیزیں پیدا
ہوئیں۔

TAE XI کو انسان نہیں پہنچ سکتا۔ انسان
اس کی بنائی ہوئی چیزیں دیکھ کر ہی اسے سمجھ سکتا ہے

۵ ڈاکٹر گل رخ کے بھائی علی جاوید سلمہ

کہتے ہیں کہ یہ کائنات دراصل YIN اور YANG (زمین اور آسمانی) طاقتوں کے تغیر کا نام ہے اور چونکہ یہ دونوں طاقتیں دراصل TAE XI کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں۔ اسی لئے TAE XI یہی دراصل اس کائنات کے ہونے کی اصل وجہ ہے۔

آسمانی طاقت (YANG) محرک ہے باہر کی طرف ہے اوپر ہے یہ عمل کرتی ہے زمین پر جو نیچے ہے ٹھہری ہوئی ہے، اندر کی طرف ہے اور زمین دراصل آسمان کو جواب دیتی ہے۔ یعنی چیزیں پیدا کرتی ہے۔ آسان الفاظ میں آسمانی طاقت بارش بن کر برستی ہے تو زمین سے سبزہ نکلتا ہے۔ آسمانی طاقت نیچے اترتی ہے (تنزلات؟) اور زمینی طاقت آسمانی پہنچنے کے لئے اوپر اٹھتی ہے۔ (عروج)

چینیوں کے پاس اس تصور کو ظاہر کرنے کے لئے جو FIGURE ہے وہ کچھ اس طرح ہے: تین متوازی لکیریں اور ایک درمیان سے کاٹتی ہوئی سیدھی۔

آسمان ←
جاندار (آدمی) ← صراط مستقیم
زمین ←

(اب ذرا لفظ "اللہ" سے مشابہت دیکھئے)

یہ درمیانی سیدھی لکیر زمین اور آسمان کو ملا رہی ہے۔ آسمانی طاقت YANG کو ایک POSITIVE اکائی سے تشبیہ دی گئی ہے جبکہ زمینی یا YIN کو NEGATIVE سے، جس طرح بجلی کی رو مثبت سے منفی کی طرف جاتی ہے اسی طرح آسمانی طاقت زمین کی طرف سفر کرتی ہے۔ آسمان اور زمین کے ملنے سے ۴ حالتیں پیدا ہوتی ہیں پھر ان سے آٹھ شکلیں بنتی ہیں۔

ان میں سے ہر حالت یا TRIGRAM میں آسمانی اور زمینی طاقتیں عمل کر رہی ہوتی ہیں۔ کسی میں ایک زیادہ تو دوسری کم۔ اور یہ تغیر متوازن ہے یعنی BALANCED (میزان) ان آٹھ حالتوں یا طاقتوں کو اگر دائرے کی شکل میں لکھا جائے تو مندرجہ ذیل شکل وجود میں آتی ہے۔
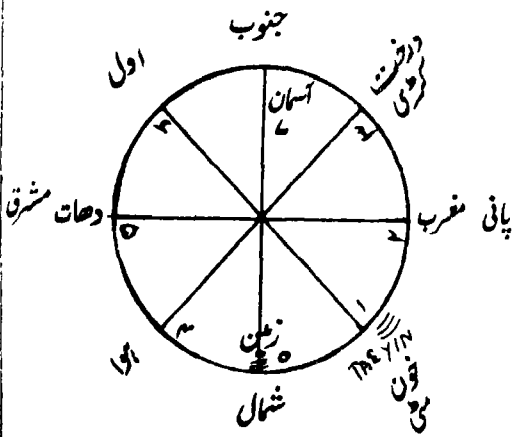
اس شکل کو وجود میں لانے کا ذمہ دار چینی ایک بادشاہ جن کا نام "FOU XI" تھا کو قرار دیتے ہیں۔ "FOU XI" کا چینی میں مطلب ہے "FOU THE FIRST" کہتے ہیں کہ "FOU XI" جب دنیا پر حکومت کرتے تھے تو "انھوں نے

ان کی طرف نظر اٹھائی۔ وہاں نشانیاں دیکھیں پھر زمین
طرف نظر کی اور ان کا مطلب سمجھ لیا" اس طرح انھوں
اولین آسمانی طاقتوں کی ترتیب کو بے نقاب کیا۔
ترتیب کو ہم AUTERIOR SKY کہہ سکتے ہیں
ند بمراولی) یہ اولین ہے (PRIMOR'AL)
و نکہ یہی بنیاد ہے۔ پیدائش کی۔ یہ وہ راز ہے جس
زندگی نے جنم لیا اور جس کے قانون آسمان میں لکھے
ئے ہیں (لوح محفوظ ؟) اس طرح یہ ترتیب ایک
انی راستہ قرار پائی۔ اس کے آٹھ پہلو نشاندھی
تے ہیں ان آٹھ عقل مندوں کی جنھیں یہ راز معلوم
(اصحاب کہف ؟)۔ یہاں ایک بات کا ذکر کرنا
سپی سے خالی نہ ہوگا کہ اصحاب کہف ۳۰۹ برس تک
میں سوتے رہے۔ جبکہ انسان کے جسم پر POINTS
OF ACUPUNCTURE کی تعداد ۳۰۹ ہے۔
ذکر PRINCIPLE ہے۔ واللہ اعلم۔

اس ترتیب کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آسمان
ر زمین کے ملنے سے چھ طاقتیں وجود میں آتی ہیں۔
ن میں سے ۳ زمینی یا YIN ہیں اور ۳ آسمانی یا
YANG ہیں۔ یہ ترتیب چونکہ آٹھ آسمانی حالتوں
نشاندہی کرتی ہے اس لئے منطقی طور پر ایک
تیب زمینی حالتوں کی نشاندہی کے لئے ہونی چاہیئے۔
س کو POSTERIOR SKY نام دیا گیا
فذ بمر ثانی؟)۔ یہ ترتیب منسوب ہے ایک اور
دشاہ WANG سے اور ظاہر کرتی ہے آسمانی
اقت کی مادے میں تبدیلی کو (ENERGY
CHANGES INTO MATTER یہ بادشاہ
ات سال اندر بند رہے تو یہ انکشاف ہوا لیکن
ں کی تشریح ان کے بیٹے نے کی۔ پہلی ترتیب
سمانی ہے متوازن یعنی BALANCED ہے
بکہ دوسری زمینی ہے اور غیر متوازن (UNBA
LANCED) ابھی صرف مادہ وجود میں آیا ہے۔ شکل

نہیں بنی۔ یہ وجود میں آئی ہے پہلی ترتیب کے اندر
TRANSFORMATION سے یہ ترتیب درج ذیل
ہے۔
اس کے حساب سے رنگوں کی ترتیب یہ ہے۔

لال
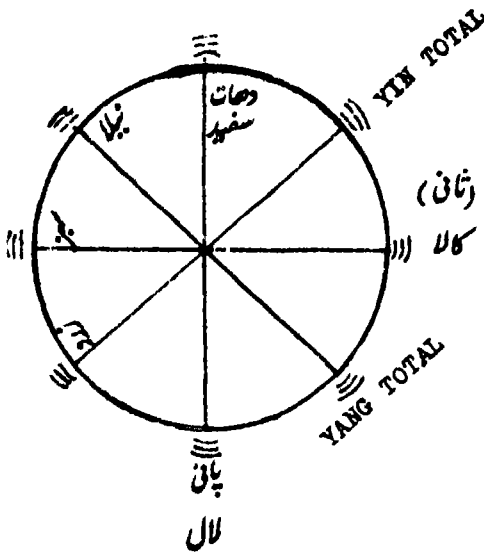
اب ان دونوں ترتیبوں کے ملن سے مزید ایک ترتیب وجود
میں آئی ہے جس کو کہتے ہیں ۶ کی ترتیب (SYSTEM
OF SIX)۔ یہ دو طرح لکھی جا سکتی ہے۔ گھڑی کی
سوئیوں کے مطابق یعنی سورج کی گردش کی سمت
YANG OR POSITIVE یا اس کے برعکس یعنی ـــ
YIN or NEGATIVE گویا پہلی حالت مردانی ہے
(MASCULINE) اور دوسری زنانی
(FEMININE) اب ایک زندگی وجود میں آنے کو
ہے لیکن ابھی ایک اشارے یا SIGNAL کی کمی ہے۔ جب
تک وہ اشارہ اس چھ کی ترتیب کی کسی بھی حالت میں
داخل ہوکر اسے حرکت میں نہ لائے۔ یہ خاموش
رہے گی۔ یعنی بذات خود کارآمد نہیں ہے۔ یہ کسی
کسی بیرونی اشارے کے انتظار میں ہے (قرآن مجید
کا ارشاد ہے کہ کائنات کو چھ روز میں بنایا
گیا ہے)۔

جب یہ بیرونی اشارہ ان ترتیبوں میں داخل ہوگا اور ان کے آپس میں حالتوں کی تبدیلی سے ایک اور ترتیب وجود میں آئے گی جسکو "پانچ عنصروں کی ترتیب یا قانون" کہا گیا۔

"LAW OF FIVE ELEMENTS"

"ہم نے میزان قائم کیا"

۲

آگ جنوب ۳ ۶

نیلا دھات مشرق ہوا سبز ۴

زرد، جون، مٹی ۱

مغرب ۵ سفید، دھات

۶ شمال پانی کالا

یہ ہے اصل میں ایک وجود کی مکمل تصویر۔ یہ ہے زندگی سے بھرپور اور آخری تبدیلی جس کے بعد مزید کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ اس پانچ کی ترتیب میں دراصل، حالتیں ایک دوسرے کو اس طرح تقاضے ہوتے ہیں کہ میزان قائم رہے۔

اس کو سمتوں کے لحاظ سے مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی سورج کا منہ مشرق سے مغرب کی طرف۔ جنوب میں نصف النہار ہے۔ جبکہ زمین کے مرکز کا وجود۔ جو دراصل پانچواں نقطہ ہے وہ جنوب اور مغرب کے درمیان ہے۔

یہ ترتیب چینی ACUPUNCTURE میں بنیادی اور مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور ظاہر کرتی ہے کہ انسان مکمل ہو چکا ہے اور اس کے تمام اعضا اور ان کے کام متوازن BALANCED ہیں۔

اب آئیے چینی معاشرے میں ہندسوں کی اہمیت کی طرف (CHINESE NUMEROLOGY)

یہ ہندسے دراصل ایک پورا پیغام ہیں جو چار ہزار سال سے اسی طرح محفوظ چلا آرہا ہے۔

ایک (۱): یہ TAEXI کا نمبر ہے۔ وہ جو آسمان اور زمین سے پہلے سے موجود ہے۔

دو (۲): ایک نے دو پیدا کئے۔ یہ زمینی یا مادی نمبر ہے۔

تین (۳): جب آسمان نے زمین پر عمل کیا تو تیسرا پیدا ہوا یہ آسمانی ہندسہ ہے۔

چار (۴): چار موسموں وغیرہ کو ظاہر کرتا ہے۔ چینی زبان میں ہم کا مطلب موت بھی ہے زمینی ہندسہ ہے۔

پانچ (۵): یہ پانچ عنصروں کی ترتیب کا ہندسہ ہے اور بیک وقت زمینی اور آسمانی ہے کیونکہ یہ طاق عددوں میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے ۹، ۷، (۵)، ۳، ۱۔

چھ (۶): یہ چھ طاقتوں کو ظاہر کرتا ہے جو آسمان اور زمین کے درمیان موجود ہیں۔

سات (۷): یہ حالتوں کی تبدیلی کا مقدس عدد ہے، آٹھ میں سے ہر ایک حالت جب تک سات حالتوں سے نہ گزرے تبدیلی کا عمل مکمل نہیں ہو سکتا۔ یعنی سات کا ہندسہ دراصل آسمانی ارادے WILL کا مظہر ہے۔

آٹھ (۸): آٹھ اولین طاقتیں یا حالتیں FOUXI کی پہلی ترتیب۔

نو (۹): یہ وہ زیادہ سے زیادہ آسمانی طاقت ہے جو زمین تک پہنچتی ہے۔ (۳ × ۳) اسی طرح یہ بادشاہوں کا عدد ہے۔

دس (۱۰): یہ پانچ کا دگنا ہے۔ یعنی ماہیئت کی تکمیل یا

+ ۱ = ۱ یعنی جہاں سے شروع ہوا وہیں پر ختم۔
دوسرے الفاظ میں جفت مادی ہندسے ہیں
رطاق آسمانی۔

انسان جو کہ زمین اور آسمان کے تعلق سے وجود
ں آیا ہے وہ اس وسیع کائنات کے اصول وضوابط
تابع ہے گویا انسان اس بڑی کائنات میں ایک چھوٹی
ئنات کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا ہر نظام انہی اصولا
کام کرتا ہے جن پر اس کائنات کی بنیاد رکھی گئی ہے۔
سان کا نظام زندگی ۵ کی بنیادی ترتیب پر ہے جبکہ
مان اور زمین کے درمیان ۶ طاقتیں کام کر رہی ہیں
ہذا آسمان اور زمین کا آپس میں یہ محرک تعلق دراصل
سا ایسا دائرہ ہے جس کے ۵ × ۶ = ۳۰ حصے ہیں۔
نیس پارے ؟) TAOISM کا بنیادی خیال یہی
ے کہ اس کائنات کی ہر چیز گویا بذات خود پوری کائنات
ہے اور ہر چیز میں YIN YANG گردش کر رہے
ں۔ یعنی آسمانی اور زمینی طاقتیں۔ زمین اور آسمان
ں نہیں ہو سکتے۔ یعنی مادے کے اندر طاقت ہے
ر طاقت مادہ میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ یہ سب دراصل
شبیہیں ہیں۔

پہلی ترتیب وقت کی گردش کے حساب سے
سانی زندگی کی پیدائش سے پہلے نمودار ہوتی ہے
یونکہ انسان کی پیٹھ YANG ہے اور پیٹ
YIN لہذا یہ تقدیر اولیٰ گویا اس کی پیٹھ پر
ت ہے یعنی اس کی قسمت کا دروازہ ہے جو آسمان کی طرف
ھلا ہے وہاں سے لیتا ہے اور آگے بھیجتا ہے (بیٹا باپ
ی پشت سے پیدا ہوتا ہے۔ القرآن) یہ پہلی ترتیب
یک DIAGRAM ہے یعنی دائرہ یا CIRCLE
بلکہ یہ دنیا ایک 3 DIMENSIONAL چیز ہے۔
ب اس DIAGRAM کو 3 DIMENSION
ں لانے کے لئے ایک ہی حل ہے اور صرف "ایک" وہ
ہے ایک CUBE کی شکل جس کے آٹھ کونے،

آٹھ طاقتوں کو ظاہر کر رہے ہوں اس کے ایک کنارے
پر آسمان ہے اور اس کے مخالف سمت میں زمین ہے
اور دونوں کے درمیان چھ حالتیں ہیں اور یہ
CUBE ایک گول کرہ یا SPHERE کے
ندر ہے۔
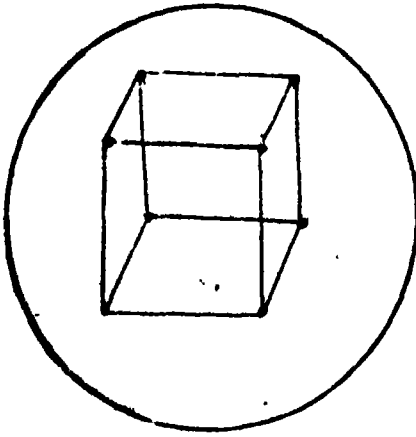
اب ذرا ان تمام معلومات کا اسلام اور قرآن کے
حوالے سے جائزہ لیں۔ انسانی پیدائش کے باب میں
چینیوں کے نزدیک پانچ عنصروں کی ترتیب آخری اور
مکمل وزن کی حالت میں ہے۔ اب دیکھئے کہ ہمارے مذہب
میں پانچ کے عدد کی کیا اہمیت ہے۔ اسلام کے پانچ
ارکان۔ غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے "ہم نے دین
کو مکمل کر دیا" اور "محمدؐ آخری نبی ہیں"۔

پھر دیکھئے کہ بنی اسرائیل کا نشان چھ کونوں
والا ستارہ ہے۔ ہیکل سلیمان ' ہے۔ جو کہ SYSTEM
SIX کو ظاہر کرتے ہیں جو کہ چینیوں کے نزدیک
انسانی پیدائش میں دراصل ایک درمیانی حالت
ہے اور بذات خود کارآمد نہیں ہے جب تک کہ اسے
کوئی بیرونی اشارہ نہ ملے۔ جب یہ اشارہ اسے ملتا
ہے تو یہ مکمل ہو کر وزن کی حالت میں آجاتی ہے یعنی
پانچ کی ترتیب بن جاتی ہے۔ سوچئے کہ کیا یہ اشارہ

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کریم کا نزول نہ تھا، جس کے بعد اللہ تعالیٰ کا دین مکمل ہو گیا۔ ہو سکتا ہے بادشاہ WANG سے مراد دراصل حضرت داؤدؑ ہوں جن کے بیٹے حضرت سلیمانؑ نے ہیکل بنوایا بیت المقدس میں۔

اب ذرا خانہ کعبہ کی طرف آئیے۔ اس کی شکل اور تعمیر پر غور کیجئے۔ کیا وہ پتھر کا ایک CUBE نہیں ہے جس کے آٹھ کونے ہیں۔ کیا وہ FOU XI کی پہلی آسمانی ترتیب یا تقدیر اولیٰ سے مشابہت نہیں رکھتا ہے۔ ان اوّل بیت وضع للناس (خدائے واحد کی پرستش کے لئے انسانوں کے لئے بنایا گیا۔ پہلا گھر!) خانہ کعبہ حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا اور ہم سب جانتے ہیں کہ وہ تمام صاحب کتاب نبیوں کے باپ تھے یعنی پہلے۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ "ابراہیمؑ دین حنیف کے پیرو تھے، مسلمان تھے اور صراط مستقیم پر تھے۔" کیا FOU XI اور حضرت ابراہیمؑ ایک ہی شخصیت کے دو نام نہیں؟

قرآن شریف میں جا بجا اسلام کو صراط مستقیم کہا گیا۔ کیا چینیوں کے TAO اور اس میں کچھ فرق ہے؟

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تمام دینی و دنیوی باتوں سے بہرہ ور کیا تھا۔ اسی لئے آپ نے فرمایا تھا کہ "علم حاصل کرو چاہے چین جانا پڑے" کیونکہ آپ جانتے تھے کہ دین ابراہیمی وہاں اپنی اصلی شکل و صورت میں محفوظ ہے جبکہ دوسرے لوگ اسے بگاڑ چکے ہیں۔ چونکہ دین ابراہیمی اور اسلام دراصل ایک ہی چیز ہیں۔ ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں ایک ہی سلسلہ کی پہلی اور آخری کڑی ہیں اسی لئے دین ابراہیمی کا مطالعہ اصل میں اسی راستہ کی طرف لے جاتا ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ انسان کو لے جانا چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اور تم لوگ میری نشانیوں پر غور نہیں کرتے؟" ذرا دیکھئے کہ واقعی کیسی کیسی نشانیاں ہمارے آس پاس موجود ہیں اور ہم بغیر سوچے سمجھے گزرے چلے جا رہے ہیں۔ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے ہیں۔ حقیقت جانے بغیر۔ پانچ وقت کی نماز پڑھ رہے ہیں بغیر سمجھے ہوئے کہ یہ پانچ کیوں ہیں؟ چار یا چھ کیوں نہیں؟

چینی عالموں کی کتابیں جب مغربی مفکروں نے DECODE کیں تو خیال کیا کہ چینی بڑے پائے کے عالم تھے کہ اتنے لمبے چوڑے پیغام کو اتنے چھوٹے ہندسوں اور اشکال میں محفوظ کر دیا کہ وہ چار ہزار سال سے اسی طرح چلا آ رہا ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ یہ کارنامہ چینی عالموں کا نہیں ہے بلکہ اس ذات پاک کا ہے۔ جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔۔ جو اس کائنات کی اصل وجہ ہے اور انسانی احاطہ خیال سے باہر ہے اب اس کا پیغام جو کہ سراسر حقیقت اور سچائی ہے وہ مکمل اور جامع نہ ہوتا تو اور کس کا ہوتا۔ تمام غلطیوں اور شبہات سے پاک۔ یہ تو ہوا بیان بنیادی چینی خیالات کا۔ اب ذرا چند عام فہم باتوں کا ان کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔ جو کہ قرآن پاک میں بیان کی گئی ہیں۔ اور ان کو بغیر سوچے سمجھے من و عن اخذ کر لیا گیا ہے۔

چونکہ یہ کائنات دراصل آسمانی اور زمینی قوتوں کے باہم اتصال اور تغیر کا نام ہے اسی لئے اس میں موجود ہر شے کو آسمان یا زمین سے نسبت دی جا سکتی ہے۔ کسی میں ایک طاقت کم ہے تو دوسری زیادہ۔ چند مثالیں درج ہیں:۔

آسمانی (YANG)	زمینی (YIN)
آسمان	زمین
اونچا	نیچا
ENERGY	STRUCTURE

POSITIVE	NEGATIVE
گرم	ٹھنڈا
دن	رات
روشنی	تاریکی
آگ	پانی
سورج	چاند
مرد	عورت
جاگنا	سونا
باہر	اندر
سر	پیر
طلوع	غروب وغیرہ وغیرہ

اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔
" مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے۔" پھر کئی جگہ ارشاد ہے " ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے خواہ مرد ہو یا عورت اور تقویٰ کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔"

اب ذرا دیکھئے کہ کس طرح ثابت ہوتا ہے کہ عورت نہ تو کم تر ہے نہ کمزور ہے اور نہ ناقص العقل جیسا کہ بعض مردوں نے اخذ کر لیا ہے قرآن شریف کے ان الفاظ سے۔ مرد YANG ہے آسمان ہے اوپر ہے غالب ہے عورت YIN ہے زمین ہے نیچے ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ مرد عورت سے برتر ہے۔ یہ پیدائشی طاقت (YIN YANG) کی موجودگی کی وجہ سے ہے، عورت میں زمینی طاقت زیادہ ہے مرد میں آسمانی۔ یہ ہے اصل مقصد۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا اور عورت کو حیثیت یا عقل میں کم ثابت کرنا ہوتا تو عورتوں کی سزا بھی مردوں سے آدھی ہوتی۔ کیونکہ پھر وہ اپنے افعال میں آزاد نہ ہوتیں۔ جیسا کہ لونڈی یا غلام۔ کیونکہ قرآن شریف ایک شک و سبہ CONTRADICTIONS سے پاک کتاب ہے۔ لہذا اس کے الفاظ کے بارے میں زبان نہیں کھولنی چاہیئے۔ جب تک کہ تحقیق نہ کر لی جائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " ہم نے انسان کو مختلف حالتوں پر پیدا کیا ہے۔ جن میں سے تین تاریکیاں ہیں۔" اب اگر آپ پہلی ترتیب (تقدیم اولیٰ) پر غور کریں تو دائیں بائیں کی چھ طاقتوں میں سے تین YIN ہیں اور ۳ YANG یعنی ۳ تاریک ہیں اور ۳ روشن۔ اسی طرح ہر مثال واضح ہو جاتی ہے تحقیق سے۔ TAOISM کا نشان حسب ذیل ہے۔ اب ذرا سورہ کہف کی وہ آیتیں پڑھیے جن میں نوجوانوں کے غار میں سونے کا ذکر ہے!
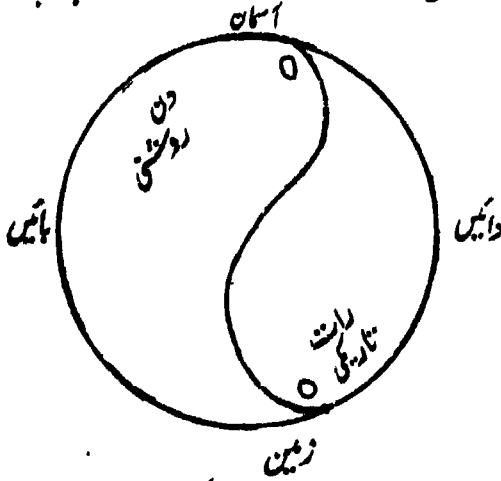
غرضیکہ ان گنت مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ غور و فکر کے بغیر کچھ سمجھ میں نہیں آ سکتا اور غور و فکر کے لئے METIRIAL چاہیے۔ جو چین میں ملے گا یعنی کبھی اسی لئے جہاں سے چلتے تھے وہیں پہنچ گئے۔

اسی طرح کئی باتیں ہیں۔ جو آپ سے تفصیلی کرنی ہیں۔ مثلاً واقعہ معراج، جنت و جہنم وغیرہ وغیرہ۔ جن کے متعلق میرے پاس کچھ THEORIES ہیں لیکن ابھی مزید غور کی ضرورت ہے اس لئے لکھ نہیں رہی ہوں۔ جب موقع ملا تو انشاءاللہ لمبی بات ہوگی۔

آپ کی بھابھی گلمی

اُردو گلستاں

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا منتخب روزنامچہ

۱۲ر جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۴ر نومبر ۱۹۳۰ء
سہ شنبہ - دہلی

سیاسی } مصر میں بھی ہندوستان کی دیکھا دیکھی سول نافرمانی شروع ہوئی ہے ہندوستان کو اس پر فخر ہے کہ مصر نے اس کی تقلید کی۔

دہلی میں اروِن اسپتال بننے والا ہے۔ اس زمین میں مسلمانوں کے آثار قدیم نکلے ہیں جس کا بہت چرچا ہے۔ آج چیف کمشنر دہلی نے دہلی کے آٹھ مسلمانوں سے ان آثار قدیم کی نسبت ہمدردانہ اور مصالحت آمیز گفتگو کی۔

تلقین حیات } ہر بات میں دوسروں کی تقلید کرنا انسان کو پست خیال اور بے ہمت بنا دیتا ہے۔ تقلید زندگی کی روح کے لئے عزرائیل ہے۔

غزالی خان } دہلی کے مشہور ڈاکٹر عنایت خاں مرحوم کے لڑکے ہیں اور مشہور رسالہ درویش اور مولوی کے ایڈیٹر منشی عبدالمجید خاں صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔ عبدالرشید خاں نام ہے۔ میں ان کو غزالی کہتا ہوں۔ لمبا قد ہے۔ سانولا رنگ ہے۔ موثر آنکھیں ہیں۔ عمر چالیس کے قریب ہے مگر ورزش کرتے ہیں اور عمر بیس سال سے بھی کم معلوم ہوتی ہے۔ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ چاول اور کپڑے کی تجارت کرتے ہیں۔ بہت سمجھدار اور باتدبیر ہیں۔ تعلیم یافتہ ہوتے تو لیڈر بن جاتے۔ میری ان سے قدیمی دوستی ہے۔

ذاتی } ساڑھے بارہ بجے تک کام کیا۔ کتاب تسلی کا بڑا حصہ تیار ہو گیا اور کاتب کے پاس چلا گیا۔ ایک بجے دہلی گیا۔ نیشنل بنک میں کچھ دیر رہا۔ پھر ایس۔ ایم الٰہی صاحب مشہور دندان ساز سے دانت صاف کرائے۔ یہ افغانستان کے بڑے بڑے آدمیوں سے اسناد حاصل کر چکے ہیں۔ میں نے پہلے کئی مشہور ڈاکٹروں سے دانت صاف کرائے ہیں جنھوں نے رقم بھی زیادہ لی اور وقت بھی زیادہ خرچ ہوا۔ اور دانتوں کی صفائی میں تکلیف بھی بہت ہوئی۔ ایس ایم الٰہی صاحب نے صرف ایک گھنٹہ میں اوپر کے سب دانت صاف کر دیئے حالانکہ اس سے پہلے ایک ڈاکٹر نے آٹھ دن میں اوپر کے دانت اور سات دن میں نیچے کے دانت صاف کئے تھے۔ میرے خیال میں ایس۔ ایم۔ الٰہی صاحب بہت کامیاب دندان ساز ہیں اور قدر کے قابل ہیں۔

تین بجے چیف کمشنر صاحب کے دفتر میں گیا جہاں پانچ انگریز اور آٹھ مسلمانوں نے جمع ہو کر مسجدوں اور مقابر کی نسبت مصالحت آمیز گفتگو کی۔ چار بجے کے بعد واحدی صاحب کے ہاں واپس آیا اور کچھ دیر وہاں کام کر کے مغرب کے وقت گھر میں آ گیا۔ دیکھا بچے جیسے منزل کی دیواروں پر گھوڑا بنائے بیٹھے ہیں۔ منا چیکے

گے بڑھ گیا۔ تاکہ مجھے دیکھ کر بچے گھبرا نہ جائیں اور نیچے
گر پڑیں۔ محمد شفیع صاحب ماسٹر ضلع حصار سے آئے ہیں۔
ید منزل میں ٹھہرے ہیں۔ نو بجے سویا۔ چار بجے بیدار
ہوا۔ پارہ شام کو ۷۰ درجہ پر تھا اور صبح ۶۰ درجہ پر گویا
رات بھر میں دس درجہ سردی بڑھتی ہے۔ کل بھی پارہ
اتنا ہی تھا۔

۱۴ رجمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۵ رنومبر ۱۹۳۰ء
چہارشنبہ دہلی

سیاسی } دہلی میں بم اور پستول وغیرہ چیزوں کا ایک بڑا ذخیرہ گرفتار ہوا ہے اور حافظ فیاض احمد صاحب انصاری بھی گرفتار ہو گئے۔

قومی } حافظ فیاض احمد صاحب انصاری حال میں دہلی کانگریس کے ڈکٹیٹر مقرر ہوئے تھے۔ میری ان کی بیس سال کی ملاقات ہے۔ پہلے علی گڑھ کالج میں تھے۔ اب سالہا سال سے جامعہ ملیہ میں کام کرتے ہیں۔ کانگریس کی تحریک شروع ہوئی تو جامعہ ملیہ سے علیحدہ ہو گئے۔ بیس سال ہوئے میں نے ان کو مخلص نکتہ چین کا خطاب دیا تھا۔

ملقبین حیات } حد سے زیادہ کسی پر بھروسہ کرنا اور حد سے زیادہ کسی سے بدگمان ہونا دونوں زندگی کو ناکام کر دیتے ہیں۔

بقائی صاحب } حافظ سید عزیز حسن نام ہے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب کی اولاد میں ہیں اس واسطے میں نے ان کو بقائی کا لقب دیا ہے۔ گورا رنگ ہے۔ درمیانہ قد۔ چھریرا بدن۔ کتابی چہرہ۔ بہت تیز و طرار طبیعت۔ رسالہ پیشوا کے اڈیٹر ہیں جو ہندوستان کا مشہور رسالہ ہے۔ پہلے واحدی صاحب کے ہاں کام کرتے تھے۔ پھر کئی برس میری رفاقت میں کام کیا۔ اب ایک بہت کامیاب کاروبار کے مالک ہیں۔ لوہے کے قلم سے لکھتے ہیں۔ یعنی ان کی تحریر میں گرمی اور سختی زیادہ ہوتی ہے۔ سوائے خدا کے کسی سے نہیں ڈرتے اور کسی کا لحاظ اور رعایت نہیں کرتے۔ اگرچہ میرا بہت لحاظ کرتے ہیں لیکن حق گوئی کا جذبہ ہوتا ہے تو میرے خلاف بھی خوب لکھ ڈالتے ہیں۔ ہندوستان کا کوئی لیڈر اور حکمران ان کے قلم کی تلوار سے بچ نہیں سکتا۔ میری پارٹی کے جرنیل سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن درحقیقت نہ میری کوئی پارٹی ہے اور نہ وہ میری پارٹی کے جرنیل ہیں۔ البتہ یہ بات ٹھیک ہے کہ میرا ان کا تعلق جس طرح شروع ہوا تھا اسی طرح قائم ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی قائم رہے گا۔

ذاتی } ایک بجے تک بورڈنگ ہاؤس میں کام کر کے دہلی گیا۔ کچھ دیر واحدی صاحب کے ہاں رہا۔ پھر ایس۔ ایم الٰہی صاحب دندان ساز کی دوکان پر گیا۔ واحدی صاحب بھی ساتھ گئے۔ آج نیچے کے دانت بھی صاف ہو گئے۔ مغرب کے وقت گھر میں واپس آ گیا کھانا کھا کر اخبار پڑھے۔ پھر بورڈنگ میں آیا۔ ماسٹر محمد شفیع صاحب اور لالہ شبو دیال صاحب اور سید باقر علی صاحب اور مستری عشقی نظامی وغیرہ احباب جمع تھے ان سے باتیں کیں۔ جوالا پرشاد نظامی اپنے لڑکے اور اس کی بیوی کے ساتھ آئے ہیں۔ احمد آباد منزل میں ٹھہرے ہیں۔ میرے پرانے مرید ہیں اور آج کل تکلیف میں ہیں۔ میں نے کہا جب تک میں زندہ ہوں یہاں ٹھہرو۔ اور جو کچھ مجھے میسر ہو کھاؤ۔ نور بانو کو بخار ہو گیا ہے اور سب اچھے ہیں۔ نو بجے سویا۔ مستری عشقی نے بدن دبایا۔ ۳ بجے بیدار ہوا۔ اور صبح تک بہت سا کام کر لیا۔ پارہ صبح ٦٠ درجہ پر تھا۔ حیدرآباد دکن کے روزانہ اخبار صحیفہ نے روزنامچہ کا بہت اچھا اقتباس شائع کیا ہے۔ اس کے اڈیٹر عارف تحریر معلوم ہوتے ہیں۔

۱۴ رجمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۶ رنومبر ۱۹۳۰ء
یوم پنجشنبہ - دہلی

---

[1] سابق رجسٹرار جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

سیاسی } گرمی کے کپڑے اتر گئے۔ سردی کے کپڑے پہن لئے۔ یہ سب سے بڑا سیاسی انقلاب ہے۔ اگر سیاسی اشخاص اس پر غور کریں۔

قومی } دہلی میں جس وقت غلام محمد مرحوم ۳۱ راکتوبر ۱۹۳۰ء کو اپنی پھانسی کے قریب آیا تو سردار عبدالصمد خاں صاحب مجسٹریٹ دہلی نے اس سے کہا غلام محمد، سامنے کیا چیز ہے؟ غلام محمد نے نہایت مردانگی سے جواب دیا۔ یہ مسلمان بہادروں کا زیور ہے۔ یہ کہہ کر خود اپنے ہاتھ سے غلام محمد نے گلے میں پھانسی ڈال لی اور تھوڑی دیر کے بعد ختم ہو گیا۔

غلام محمد پر یہ الزام تھا کہ اس نے اس آریہ کو قتل کر دیا جس نے سوامی شردھانند کے قتل کے دن مفتی محبوب علی صاحب کو شہید کیا تھا اور وہ مقدمہ ہونے کے بعد اس الزام سے رہا ہو گیا تھا۔

تلقین حیات } جو شخص موت کا خوف دل سے نکال دے اس کو زندگی کی اصلی راحت اور ترقی حاصل ہو جاتی ہے۔

منشی عبدالمجید } ڈاکٹر عنایت خاں مرحوم کے بڑے بیٹے ہیں۔ لمبا قد ہے چھریرا بدن ہے سانولا رنگ ہے۔ خوبصورت اور موٹی آنکھیں ہیں۔ آواز نہایت باریک اور شیریں ہے۔ مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیت علمائے ہند اسی وجہ سے ان کو کوئل کہتے ہیں۔ پہلے رسالہ مخزن میں کاپی نویسی کرتے تھے جب وہ دہلی سے نکلتا تھا۔ پھر عرصہ تک واحدی صاحب کے ہاں ملازم رہے۔ اس کے بعد واحدی صاحب کی شرکت میں رسالہ درویش جاری کیا جس کی اشاعت پانچ چھ ہزار تک پہنچ گئی۔ پھر رسالہ مولوی جاری کیا جو بارہ ہزار چھپتا ہے اور اردو زبان کے رسالوں میں سب سے زیادہ اشاعت رکھتا ہے۔ منشی عبدالمجید صاحب شروع سے آجتک بقائی صاحب کی طرح میری جماعت میں سمجھے جاتے ہیں اور مجھ ان سے دیرینہ تعلق ہے نہایت عقلمند اور منتظم اور محنتی مسلمان ہیں۔ کاروباری قابلیت بہت اچھی ہے مگر اس کو اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ مزاج میں وہابیت ہے مگر مجھ بدعتی سے اس طرح ملتے ہیں گویا پکے قبر پرست ہیں۔ یہی حال واحدی صاحب کا ہے۔

ذاتی } آج کام بہت زیادہ تھا۔ چونکہ مجھے لاہور اور ملتان جانا ہے اس واسطے کام ختم کر رہا ہوں۔ تسلی کتاب کے بھی بیس پچیس صفحے لکھے۔ خطوط کے جواب بھی دیئے۔ دو بجے دہلی گیا۔ واحدی صاحب کے ہمراہ ایس۔ ایم الہی صاحب دندان ساز کے ہاں جا کر دانت صاف کرائے۔ پھر بھیا کے ہاں مکان پر آیا اور شام تک ایسٹرن لٹریچر کمپنی کے جلسہ میں شریک رہا۔ مغرب سے پہلے گھر میں واپس آگیا۔ یہاں خانہ میں نماز پڑھائی۔ بعد مغرب کھانا کھایا۔ آج کوثر بانو نے بہت دیر تک دعا مانگی۔ کہا گیا اب یہ روحہ کی جگہ لے رہی ہے۔ میں نے کہا روحہ کی مقبولیت کہاں سے لائے گی؟ نو بجے سویا چار بجے بیدار ہوا۔ سردی آج ایک درجہ بڑھی کل تک پارہ ۶۰ درجہ پر تھا۔ آج ۵۹ درجہ پر ہے۔

۱۵ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ / ۷ نومبر ۱۹۳۰ء

جمعہ۔ دہلی

سیاسی } میں نے دنیا کے اتنے سیاسی انقلاب دیکھے ہیں کہ چند صدی پہلے دنیا کے کسی آدمی نے نہ دیکھے ہوں گے۔ روس کا انقلاب۔ ٹرکی اور ایران کا انقلاب۔ عرب اور مراکو کا انقلاب۔ بیت المقدس کا انقلاب۔ بغداد کا انقلاب چین اور افغانستان کا انقلاب۔ حالانکہ مجھ کو تو اطمینان کا زمانہ دیکھنے کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔

قومی } دہلی کے اندرون اسپتال میں جو مساجد اور مقابر گورنمنٹ اور مسلمانوں کے

مد بحث تھیں اور جن کا ایک حد تک تصفیہ ۴ نومبر کو سلمانوں کے حسب منشا ہوگیا تھا۔ اب دہلی کے ایک سلمان صاحب نے حسب عادت مخالفانہ پوسٹر شائع رکے اس تصفیہ کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی ے مسلمان ایسے نہ ہو جاتے تو ان کی سلطنت کیوں جاتی۔

قین حیات } زندگی کے لئے معدہ بہت ضروری ہے اور معدہ کے یئے دانت اور مسوڑوں کی صحت بہت ضروری ہے ر تلقین حیات کے لئے ان دونوں چیزوں کی طرف ظرین کو متوجہ کرنا بہت ضروری ہے۔

نشی قربان علی صاحب } لمبا قد ہے۔ دُبلا بدن۔ عمر ساٹھ سے زیادہ۔ سفید ڈاڑھی۔ گندمی رنگ۔ خوش نویسی کرتے تھے۔ ر ایک چھاپہ خانہ اور ماہوار رسالہ اردوئے معلیٰ جاری کیا۔ بہت سی مفید کتابیں بھی شائع کیں۔ میرے الد کے ملنے والوں میں ہیں۔ مجھ سے بھی خاص تعلق کھتے ہیں۔ سید ہیں۔ دہلی کے قدیم باشندہ ہیں۔

راتی } میں ہوں۔ قلم ہے۔ دوات ہے کاغذ ہے۔ اگالدان ہے۔ پانوں کی ڈبیہ ہے۔ ٹیلیفون ہے۔ گاؤ تکیہ ہے۔ ورنگل کا بنا ہوا کالے رنگ کا گرم لین ہے۔ رات کے چار بجے سے لے کر دن کے بارہ بجے ک مسلسل کام کرتا رہا۔ رات کو حکیم مہتمم الدین صاحب ئے تھے۔ ایمان خانہ میں ٹھہرے تھے ان سے باتیں کیں۔ ڈت رام نرائن صاحب اور اڈیٹر صاحب جنرل نیوز ں ملنے آئے۔ پھر دہلی گیا اور صابریہ خانقاہ میں نماز ڑھی۔ واحدی صاحب کے ہاں کام کیا۔ نئی دہلی میں یا مسٹر ہنزا ہن مجسٹریٹ نئی دہلی سے ملا۔ خواجہ ئرل اسکول کی نسبت گفتگو کر کے گھر میں واپس آیا۔ رنس محمد بدرالدین نظامی۔ بی۔ اے علیگ بچوں اور ستورات کے ساتھ آئے تھے۔ ان سے باتیں کیں۔ روفیسر شمشاد علی صاحب ایم۔ اے بھی مستورات کے ساتھ آئے ہیں۔ دیوان خانہ میں ٹھہرے ہیں۔ حسین کو بخار ہوگیا ہے۔ نو بجے سویا تین بجے بیدار ہوا۔ پارہ شام کو ۶۸ درجہ پر تھا اور صبح ۵۸ درجہ پر۔

۱۶ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۸ نومبر ۱۹۳۰ء
شنبہ۔ دہلی

سیاسی } اخبارات لکھ رہے ہیں کہ وائسرائے اور سب انگریز افسروں کی بہت زیادہ حفاظت کی جا رہی ہے۔ احتیاط و حفاظت تو ہر شخص کو اپنی اپنی کرنی چاہیئے۔ لیکن ایسی خبرں شائع کرنے کا مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔ انقلابی زمانہ میں احتیاط یقیناً ضروری ہے۔

قومی } محمد علی صاحب لندن پہنچ گئے۔ انھوں نے ایک بیان شائع کرایا ہے کہ میں برطانیہ کا سب سے بڑا دوست ہوں۔ برطانوی گورنمنٹ کو چاہئے کہ محمد علی صاحب کے اس اعلان عام کی خوشی میں اپنے تمام مفتوحہ ملکوں میں جلسے کرا کر شکریہ کے رزولیوشن پاس کرے کہ ایک بڑے لیڈر نے یہ دعوی کیا ہے کہ وہ برطانیہ کا سب سے بڑا دوست ہے۔ لاہور کا اخبار انقلاب بھی دن کو اپنے دفتر میں اس خوشی میں خوب روشنی کرے تاکہ پنجاب کو معلوم ہو جائے کہ انقلاب کے اڈیٹر بھی اب انقلاب میں ہیں۔

تلقین حیات } جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آج کل دنیا میں ہر جگہ تکلیف بڑھ گئی ہے وہ گذشتہ تاریخ پر غور نہیں کرتے۔ تکلیف ہر زمانہ میں ایسی ہی رہتی ہے جیسی آجکل ہے۔ فرق یہ ہے کہ انسان گزشتہ باتوں کو بھول جاتا ہے اور موجودہ حالت کو محسوس کرتا ہے۔

جمالی صاحب } محمد یوسف نام ہے دہلی کے رہنے والے ہیں۔ خوب گورے ہیں اور خوب موٹے ہیں۔ عمر پچیس کے قریب ہے۔ عرصہ تک میرے ہاں دفتر میں کام کر چکے ہیں اردو

بہت صاف لکھتے ہیں۔ نہایت سمجھدار اور ذکی الحس ہیں۔ خانگی پالیٹکس کو خوب سمجھتے ہیں۔ اگر اس فن کی ان کو باقاعدہ تعلیم دی جاتی تو بڑے ماہر ہو جاتے۔ میرے قدم ملنے والے ہیں۔

ذاتی } کئی روز سے حسین کو بخار ہے۔ چھوٹی لڑکی کوثر بھی بیمار ہے۔ بڑی لڑکی حور بانو بھی سسرال سے آئی ہوئی ہے اور تندرست نہیں ہے۔ خواجہ بانو کی چھوٹی بہن اور ابن عربی کی اہلیہ شاہ بانو اور لڑکی صادقہ بھی بیمار ہیں۔ بوا کریمًا اور نو کلی شاہ کو بھی بخار ہے۔ استانی صاحبہ اخلاص بانو اور خود خواجہ بانو بھی تندرست نہیں ہیں۔ آجکل تو ساری دہلی میں بیمار..وں کا بہی زور ہے۔ موسم بدل رہا ہے اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے مجھے اس کا کچھ فکر نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمد عمر صاحب کی دوائیں آرہی ہیں۔ گھر میں اسپتال کی طرح بیماروں کے پلنگ بچھے ہوئے ہیں۔ خواجہ بانو رات دن تیمارداری میں مصروف ہیں۔ میں بھی تھوڑی دیر کے لئے سب کو جا کر دیکھ لیتا ہوں حسین کا بخار زیادہ ہے۔ اس کی تکلیف سے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ دو بجے تک کام کر کے دہلی گیا۔ پرنس محمد بدرالدین نظامی اہل و عیال کے ساتھ آگئے ہیں۔ خسرو منزل میں ٹھہرے ہیں۔ خواجہ گرل اسکول حبیب منزل میں آگیا ہے۔ شام کو کھانا واحدی صاحب کے ہاں کھایا۔ رات کو بھیا کے مکان پر سویا۔ معمولی آنے والے احباب بھی جمع ہوئے۔ ملتان جانے کا ارادہ امام صاحب جامع مسجد کی علالت کی وجہ سے ملتوی ہو گیا۔ آج خان بہادر میاں عبدالحمید صاحب سی۔ آئی۔ ای وزیر اعظم ریاست کپورتھلہ سے بھی ملاقات ہوئی تھی مسجد کپورتھلہ کے امام صاحب کی تعریف کرتے تھے۔

سیاسی } اپنی ناتوانی کو چھپانا اور فرضی قوت کو ظاہر کرنا آج کل کمال سیاست ہے۔ اور ساری دنیا اس پر عمل کر رہی ہے۔

قومی } اردون اسپتال کے اسلامیہ آثار قدیم کی نسبت رات کو مشترکہ مسلم بورڈ کا ایک جلسہ ہوا تھا۔ یہ جماعت بہت دانشمندی اور خلوص سے کام کرتی ہے۔ اس جماعت کے باہر ایسے مسلمان بھی ہیں جو ذاتی اغراض کے لئے جھگڑا بڑھانا پسند کرتے ہیں۔

تلقین حیات } آٹھ دن میں ایک دفعہ یا رات دن میں ایک مقررہ وقت دماغی محنت ترک کر کے تفریح کرنا جسمانی قوت کو اعتدال پر لے آتا ہے۔ مگر غلط اور مضر صحت تفریح تندرستی کو تباہ کر دیتی ہے۔ ہندوستانی لوگ تفریح کا فلسفہ بہت کم سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد بشیر صاحب } پنجاب کے رہنے والے ہیں، عرصہ دراز سے دہلی کے سول اسپتال میں ملازم ہیں۔ آنکھ۔ کان۔ ناک۔ دانت کے امراض کے ماہر خاص ہیں۔ لمبا قد ہے۔ مضبوط جسم ہے۔ گورا رنگ ہے۔ بہت سنجیدگی کے ساتھ آہستہ بولتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آواز سے بھی دوسروں کے کانوں کا معائنہ کرتے ہیں۔ نہایت ہمدرد اور مخلص ڈاکٹر ہیں۔ آنکھ بنانے میں ان کی اچھی شہرت دور دور پھیل رہی ہے اور اس کثرت سے بیمار آتے ہیں کہ اسپتال میں رہنے کی جگہ نہیں ملتی۔ اور میں نے ایک بیمار کی نسبت بھی یہ نہیں سنا کہ ان کے اپریشن سے آنکھ خراب ہوئی ہو۔ میرا ان کا ذاتی تعلق بہت پرانا ہے۔ خواجہ بانو بھی ان کی مستورات سے ملتی رہتی ہیں اور کہتی ہیں کہ وہ بھی ایسی ہی نیک اور خلیق اور ملنسار ہیں۔ سرکار نے خان صاحب کا خطاب دیا ہے ان کی خدمات تو خان بہادری کے خطاب سے بھی زیادہ ہیں۔ وہ عنقریب یورپ کا سفر کرنے والے ہیں۔

۱۷ر جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۹ر نومبر ۱۹۳۰ء
یکشنبہ۔ دہلی

بھیا کے مکان پر ہوں۔ صبح آٹھ بجے واحدی
[ذ]اتی } صاحب وغیرہ احباب آگئے۔ کھانا کھا کر دونوں
...ے ہمراہ بازار گیا۔ بارہ بجے بھیا اور واحدی صاحب
...ر رابعہ اور جمالی صاحب کے ہمراہ درگاہ میں آیا۔
...ند ھندو تعویذ لینے آئے تھے۔ حاجی شمس الدین
...ظامی برما والے بمبئی سے آئے ہیں۔ محمد عباس نظامی
...ی بہن کے ساتھ سیالکوٹ سے آئے ہیں۔ ان سب
...ے باتیں کرکے تین بجے علی اور روحہ اور مذکورہ سب
...نباب کے ساتھ درگاہ حضرت بی بی نور صاحبہؒ میں گیا۔
...فتی شوکت صاحب فہمی بھی تھے۔ حکیم محمد جمیل خاں صاحب
...ے درگاہ کے قریب قصر مسیح الملک بنایا ہے۔ اس کے
...فتتاحی جلسہ میں شریک ہو کر مغرب کے وقت واپس
...ا اور دہلی میں حکیم محمد ایوب خاں صاحب کے ہاں دعوت
...ں گیا۔ پرنس بدر الدین نظامی اور ان کے بچے بھی تھے۔
...ہی کے اعزاز میں یہ دعوت ہوئی ہے۔ ساڑھے سات بجے
...ھانا کھا کر ریل پر گیا۔ مہاراجہ کپورتھلہ ولایت سے
...ئے ان سے ملا۔ وائسرائے کے ایڈی کانگ سے بھی ملاقات
...وئی۔ اور باتیں ہوئیں۔ نو بجے گھر میں واپس آیا۔
...ن بھر تیز ہوا چلتی رہی۔ پارہ صبح ۶۱ درجہ پر تھا۔

۱۸ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ - ۱۰ نومبر ۱۹۳۰ء
دوشنبہ - دہلی

سیاسی } کالا کوئلہ کسی صابن سے دھو ڈالو اُجلا نہیں ہوگا۔ مگر جلنے کے بعد اس کی ...اکھ سفید اور اُجلی ہو جاتی ہے۔ آگ میں جلتی ہوئی چیز ...ر پانی ڈالو تو ایک چیخ کی سی آواز نکلتی ہے کیونکہ آگ ...انی میں سیاسی عناد ہے۔

قومی } مسٹری محمد اسمٰعیل عشقی نظامی ایک ایسے مسلمان ہیں جن کی محنت مسلمان قوم کے لئے نمونہ بن سکتی ہے۔ رات کو تین بجے بیدار ہو کر اپنے ہاتھ سے روٹی پکاتے ہیں۔ پھر عبادت کرتے ہیں۔ صبح کی نماز کے بعد بارہ میل چلکر نوکری پر جاتے ہیں اور شام تک دوڑ دھوپ کی نوکری کرتے ہیں۔ مغرب سے پہلے گھر میں آکر شام کا کھانا تیار کرتے ہیں۔ پھر مغرب کی نماز میرے ساتھ پڑھتے ہیں اس کے بعد رات کے دس بجے تک میری خدمت کرتے رہتے ہیں۔ گویا آرام صرف پانچ گھنٹے کا ملتا ہے۔ حضرت امیر خسروؒ بھی ایسے ہی محنتی اور مستعد اور خوش اعتقاد مرید تھے۔

تلقین حیات } بانس میں آگ کی چنگاریاں رکھ کر بہت سے سوراخ کر دیتے ہیں تو وہ بانس سریلی بانسری بن جاتا ہے اور اس کی غمگین آواز ہر کان کو بھاتی ہے۔ ظاہر ہوا کہ سوخت اور سوراخ دار زخم سے یہ نعمت ملتی ہے۔

فہمی صاحب } مفتی شوکت علی صاحب فہمی میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ عرصہ سے دہلی میں رہتے ہیں۔ ان کا خاندان میرٹھ میں بہت مشہور ہے۔ چھوٹا قد ہے۔ دُبلا بدن ہے۔ عمر تیس سے کم ہے کتابی چہرہ ہے۔ ڈاڑھی مونچھ منڈاتے ہیں۔ بڑی بڑی آنکھیں ہیں۔ پان کھاتے ہیں۔ اخبار طاقت اور رسالہ دین دنیا وغیرہ بہت سے رسالوں کی ایڈیٹری کی وجہ سے ہر جگہ مشہور ہیں۔ ان کے مضامین میں سادگی اور جدت اور دلفریبی ہوتی ہے۔ میری جماعت میں سمجھے جاتے ہیں کیونکہ میری روش پر شروع سے لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ذاتی } دو بجے تک کام کرتا رہا۔ بستی سے خبر آئی کہ نیازی صاحب کی بھانجی کا انتقال ہو گیا۔ بہت پیاری بچی تھی۔ میرے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئی۔ تین بجے دہلی گیا۔ چار بجے تک کام کیا۔ پروفیسر شمشاد علی صاحب بھی ساتھ گئے تھے۔ ہومیوپیتھک کے ایک مشہور ڈاکٹر صاحب میرزا اعجاز حسین صاحب وکیل کے ہمراہ ملنے آئے وہ دہلی میں مطب کرنا چاہتے ہیں۔ محمد عباس نظامی اپنی بہن کے ساتھ سیالکوٹ واپس چلے گئے۔ جوالا پرشاد نظامی تھوڑی دیر کے لئے روزانہ ملنے آتے

ہیں رایس. ایم الٰہی صاحب کے ہاں دانت صاف کرانے گیا۔ آج پالش بھی ہوئی۔ بعد مغرب گھوڑی آیا۔ حسین کو اب تک بخار ہے۔ اور سب اچھے ہیں۔ نو بجے سویا۔ پانچ بجے بیدار ہوا۔ پارہ ۶۱ درجہ پر تھا۔ سردی ایک درجہ کم ہو گئی۔ انفلوئنزا بخار کا چرچہ بہت بڑھ رہا ہے۔

۱۹ رجمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۱۱ رنومبر ۱۹۳۰ء
یوم سہ شنبہ۔ دہلی

سیاسی } خبریں آئی ہیں کہ تمام دنیا کی قوموں کی طرح انگریز قوم میں بھی بیکاری بڑھ رہی ہے۔ جو قوم دنیا کے ایک بڑے حصہ پر حکومت کرتی ہو۔ وہاں بیکاری کا بڑھنا تعجب خیز ہے اور اس سے انسان کی عاجزی اور خدا کا دست نگر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ رزق تو بس اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہے۔

قومی } کشفی شاہ نظامی مسلمانوں کو منظم کرنے اور ایک مرکز پر لانے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔ جو قوم اپنے ماضی اور اپنے مستقبل کو فراموش کر کے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہی ہو اس کو ایک کشفی شاہ کیا ہزار کشفی شاہ بھی منظم نہیں کر سکتے۔ البتہ اگر خدا اپنی قوت معنوی کشفی شاہ کو عنایت کرے تو یقیناً وہ کامیاب ہو جائیں گے۔

تلقین حیات } تانبہ کا قلعی دار کٹورہ۔ یورپین ساخت کے اس گلاس سے بہت بہتر ہے جو مہینے میں کئی دفعہ ٹوٹے اور ہماری جیب خالی کرے۔ کٹورہ کو ہم خریدتے ہیں اور وہ ہماری کئی نسلوں تک قائم رہتا ہے۔

محمد انوار صاحب ہاشمی } میرٹھ کے مفتی خاندان میں ہیں۔ ان کے دادا مولوی محمد ہاشم صاحب کے ہاشمی پریس میں مدرسہ دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب بھی ملازمت کرتے تھے۔ دراز قد گورا رنگ۔ چھریرا بدن مسلمانوں کا ڈاڑھی دار چہرہ۔ سچے مسلمانوں کی طرح بھولے بھالے تجارتی کاروبار میں مستعد اور محنتی۔ پہلے اخبار توحید میرٹھ کے منتظم تھے۔ پھر رسالہ اسوہ حسنہ میرٹھ کو بہت کامیابی سے چلایا۔ اس کے بعد دہلی میں آئے اور رسالہ دین دنیا کو فروغ دیا۔ کتابوں کی تجارت بھی خوب کرتے ہیں۔ ایک عرصہ تک میری کتابوں کے سول ایجنٹ بھی تھے اور خواجہ بک ڈپو کے نام سے ایک کاروبار اس وقت جاری کیا تھا۔ اب سول ایجنسی ان کے پاس نہیں ہے مگر خواجہ بک ڈپو کاروبار کا نام اب بھی ہے۔ میرے ساتھ شروع سے آج تک خلوص رکھتے ہیں بھیا احسان کے تربیت کردہ ہیں۔

ذاتی } ہز ہائنس سر شجاع الملک مہتر چترال کے صاحبزادہ موٹر کے حادثہ سے زخمی ہو گئے ہیں۔ آج ہز ہائنس کا چترال سے دعا کے لئے تار آیا تھا۔ میں نے بھی تار دیا تھا۔ ہز ہائنس مہاراجہ کپورتھلہ دو روز سے وائسرائے کے مہمان تھے۔ آج کپورتھلہ چلے گئے۔ حیدرآباد سے نواب عابد یار جنگ مرحوم کے بڑے صاحبزادہ میر خورشید علی صاحب آئے ہیں۔ زبیدہ منزل میں ٹھہرے ہیں۔ عبدالمجید نظامی ضلع ہوشیار پور سے آئے ہیں احمد آباد منزل میں ٹھہرے ہیں۔ حسین کا بخار اتر گیا ہے۔ میں دو بجے تک کام کرتا رہا۔

قطب الدین احمد صاحب چودھری دہلی سے ملنے آئے میں شام تک واحدی صاحب کے ہاں رہا۔ کھانا کھا کر مغرب کے بعد گھر میں واپس آیا۔ رات کو سوا آٹھ بجے ایک صاحب کے آنے کی اطلاع ٹیلیفون میں آئی۔ ۱۱ بجے تک جاگتا رہا۔ وہ نہ آئے اور مجھے بہت تکلیف ہوئی۔

چار بجے بیدار ہوا۔ پارہ ۶۱ درجہ پر تھا۔ چار بجے میں نے پارہ کو کمرہ کے اندر لگالیا۔ فوراً ۲ درجہ حرارت بڑھ گئی اس سے باہر کی اور اندر کی حرارت کا فرق معلوم ہوا۔

ا رجمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۱۲ر نومبر ۱۹۳۰ء
چہارشنبہ - دہلی

سیاسی } گول میز کانفرنس میں ہندو مسلمانوں کے اختلافات شروع ہوئے ہیں۔
مسٹر جناح کی ۱۴ شرطیں یقیناً فریقین کو مطمئن کردیں گی
...ر سمجھوتہ ہوسکے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ مہاسبھائی ہندو
...زک وقت کو دیکھ کر اپنی ضد چھوڑ دیں اور دوسروں
...ے اشاروں پر کام نہ کریں۔

ایک بڑی ریاست کے ایک بڑے مسلمان
...ہدہ دار محض اس وجہ سے علیحدہ کر دیئے گئے کہ انھوں
نے گول میز کانفرنس کی نسبت آزاد نویسی کی تھی۔

...ومی } کل دہلی میں خان بہادر ابو محمد ابراہیم حسن نظامی اہل و عیال سمیت آنے والے ہیں ایک رات
...ر دو دن قیام کرکے کلکتہ جائیں گے اور ۱۶۔ نومبر
...و جہاز میں سوار ہو کر رنگون چلے جائیں گے۔

...یقین حیات } خودستائی ہر زمانہ میں بُری تھی اور اب بھی اس کو بُرا ہی سمجھا جاتا
...ہے۔ لیکن موجودہ زمانہ میں لیڈر کے لئے ضروری ہوگیا
...ہے کہ وہ اپنی تعریف خود اپنی زبان سے استقلال کے
...اتھ بیان کرتا رہے۔ پہلے کچھ لوگ مذاق کریں گے
...پھر اس تعریف کا یقین کرنے لگیں گے۔

...خان بہادر ...ابراہیم حسن نظامی } میگڑی ضلع گورداسپور پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ چار بھائی زندہ ہیں۔ ایک کا انتقال ہوگیا۔
...سب بھائیوں میں چھوٹے ہیں۔ ان سمیت ۳ بھائی
...مامیں رہتے ہیں ٹھیکہ داری کرتے ہیں اور ایک پنجاب
...ں مقیم ہیں۔ گندمی رنگ ہے۔ میانہ قد ہے آنکھیں چمکدار
...ر موثر ہیں۔ عمر چالیس کے قریب ہے آواز مہین اور شیریں
...ہے۔ طبیعت میں فیاضی اور سیر چشمی ہے۔ لاکھوں روپیہ
...پبلک رفاہ عام میں خرچ کرچکے ہیں۔ اپنے کام کو بہت توجہ
اور محنت اور مستعدی سے انجام دیتے ہیں۔ ہر چھوٹی بڑی چیز کو خود دیکھتے ہیں اور فوجی سپاہی کی طرح رات دن دوڑ دھوپ میں مصروف رہتے ہیں۔ اصلی مسلمانوں کی طرح اچھی بات کو فوراً قبول کرلیتے ہیں۔ رائے اور خیال اور عقیدہ کے پکے ہیں۔ سنی سنائی باتوں سے رائے کو جلدی جلدی نہیں بدلتے۔ ترقی تعلیم اور قومی بھلائی کو ذاتی وجاہت سے ہمیشہ مقدم رکھتے ہیں۔

ذاتی } کل رات کو نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ گیارہ بجے سویا اور چار بجے بیدار ہوا تھا اس لئے آج جسم پر اس کا اثر زیادہ ہے مگر ایک ناتوان چیونٹی کی طرح کام کے دانہ کو کھینچ رہا ہوں۔ ایک مرید کہہ رہے ہیں مجھے نوکر کرادو۔ کہتا ہوں کوئی جگہ معلوم کرو تو سفارش کردوں گا۔ وہ کہتے ہیں جگہ بھی تم ہی تلاش کرو۔ دوسرے مرید اپنے مقدمہ کی وجہ سے پریشان ہوکر آئے ہیں۔ ان کی صلح کا بندوبست بھی کر رہا ہوں۔ دہلی کے ایک معزز مسلمان کو بیچ میں ڈالا ہے۔

دس بجے نواب صدر یار جنگ صاحب شروانی تشریف لائے ساڑھے گیارہ بجے تک ان سے باتیں کیں نواب صاحب نے میرزا غالب کا قصہ سنایا کہ مجھ سے کہتے کہ قاف بے الف کون ہے۔ میں کہتا۔ میں ہوں۔ فرماتے خوب لدے گا۔ (قبا) دوسرے بچہ سے کہتے سنگ بے نون کون ہے۔ وہ کہتا۔ میں ہوں۔ فرماتے خوب بھونکے گا۔ (سگ) یہ بھی کہا میرزا غالب کے پاس ایک سائل آیا انھوں نے گھر کا سارا سامان دے دیا اور رات کی سردی آگ کے پاس بیٹھ کر گزاری۔

دو بجے دہلی گیا سید حسین صاحب اور حاجی عبدالمنان صاحب ساکن میراں شاہ سرحد ملنے آئے۔ حج کرکے آئے ہیں۔ مغرب کے بعد تک باتیں کیں۔ سید شوکت صاحب نظامی دہلوی بھی روز ملنے ہیں آج بھی بہت دیر باتیں کرتے رہے۔ ذکر اولیاء اللہ کرتے رہتے ہیں۔ بعد مغرب گھر میں واپس آیا۔ کھانا نہیں کھایا کہ

بھوک نہ تھی۔ حسینن کو آرام ہے۔ حسن الدین کو بخار ہوگیا ہے۔ ابھی بخاروں کا اثر ہوا سے دور نہیں ہوا۔

نواب میر نور رشید علی حیدر آبادی اور پروفیسر شمشاد علی بھی دہلی سے ساتھ آئے تھے۔ پرنس بدرالدین نظامی کی اہلیہ بیمار ہیں ان کو دیکھنے خسرو منزل میں گیا۔ درد تھا۔ جادو کی پڑیا دوا بھجوادی۔ بورڈنگ ہاؤس میں آیا۔ مستری عشقی نظامی اور امام علی شاہ نظامی نے اشغال خاص کی کیفیت سنائی۔ ان دونوں نے چالیس دن پورے کرلئے۔ میں نے آگے کے طریقے بتائے۔

اخبارات پڑھے۔ حیدر آباد دکن کے اخبار صحیفہ میں آج پھر مجلس تلقین کا اقتباس میرے نام کے حوالے سے شائع ہوا ہے۔ میں نے اس کو دیکھا کہ مولانا اکبر علی صاحب ایڈیٹر نے انتخاب کس چیز کا کیا۔ جن کو میں خشک ملا سمجھتا تھا وہ اصلی ضرورتوں کے موتی سمندر کی تہہ سے نکال کر اپنے اخبار میں موزونیت سے جڑ دیتے ہیں۔

روزنامہ اخبار ملت دہلی نے بھی آج خواجہ اسکول گزٹ سے "بیس سر کٹ گئے"، میرا ایک مضمون حوالہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مولانا محمد جعفری کی نظر انتخاب بھی بہت گہری ہے۔ اخبار دین احمد آباد سے آیا اس میں شہزادہ جہاندار شاہ صاحب میری سیرت نبوی کو گجراتی میں ترجمہ کرکے شائع کرا رہے ہیں۔

نواب صاحب جاورہ کا خط آیا ہے۔ ۲۱۔ نومبر کے بعد جاورہ جاؤں گا۔

مہتر صاحب چترال کے صاحبزادہ کی صحت و سلامتی کے لئے روزانہ مجلس دعا ہوتی ہے آج بھی ہوئی۔

میں ہز ہائنس سر شجاع الملک مہتر چترال سے اس لئے محبت کرتا ہوں کہ وہ بڑے خوش اعتقاد اور پابند صوم و صلوٰۃ حکمران ہیں۔ نواب صاحب جاورہ بھی نماز با جماعت کے پابند ہیں اور صوفی مشرب ہیں۔

سنٹرل انڈیا میں ان کی ریاست بہت مشہور ہے۔

چترال کی فوجی طاقت ایک دفعہ انگریزوں کو پریشان کرچکی ہے۔ اب اس نے سرحدی امن قائم کرنے میں انگریزوں کی امداد کی تھی۔

آج اعلیٰ حضرت حضور نظام کی نسبت ایک واقفکار نے کہا کہ وہ قرآن مجید کی دعائیں بہت پڑھتے ہیں۔

دوسرے صاحب نے کہا مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی جگہ نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم ہونے والے ہیں۔

نواب معین الدولہ بہادر حیدر آباد سے کرکٹ دیکھنے دہلی میں آئے ہیں۔ حیدر آباد کے بڑے امیر ہیں وہاں مہاراجہ سمیت آج کل اکثر امیر کرکٹ کی وبا میں مبتلا ہوگئے ہیں۔

جب فتوحات کی گیند ہاتھ سے نکل جاتی ہے تو فاتح قوم کی اولاد بچوں کی گیند سے کھیلنے لگتی ہے۔ نواب صاحب حضرت بابا گنج شکرؒ کی اولاد ہیں۔ جو نفس و شیطان کی گیند کے سر پر بلّا مارتے تھے۔

پارہ آج بھی ٦١ درجہ پر ہے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کا سفرنامۂ افریقہ و ماریشس

ساتویں قسط (مسلسل)

کالے کوس، کڑے کوس

صحرا کا فرائی پین

صحرائے کالاہاری میں بارش برائے نام ہی ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے میں نے یہاں برساتی ندی نالوں کے آثار ہندوستان جیسے نہیں پائے۔ البتہ ایک بالکل نئی چیز "پین" (PAN) نامی دیکھی۔ ایک دوسرے سے بیسیوں میل کے فاصلے پر کہیں کہیں ایسے مسطح میدان ہیں جن کے کنارے ہمارے ہاں کے "لگن" برتن کے کناروں کے مانند دو چار فیٹ سے لے کر دس پندرہ فیٹ تک اونچے ہوتے ہیں۔ یہ یہاں کے سوکھے جوہڑ یا تالاب ہیں کبھی بھولی بسری برسوں کی برسات ہو تو اطراف کا بہتا بہاتا پانی جوگیوں کی طرح یہاں بسرام کرلیتا ہے۔ رات بھر ٹھیرے۔ صبح ہوئی تو آگے چل پڑے۔ یعنی پانی کے اس ذخیرے کا کچھ حصہ تو فوراً سوکھی زمین نگل جاتی ہے۔ کچھ سورج اور دھوپ کی معرفت آسمان صاحب کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ پورے علاقے میں نرم مٹی کی تہہ بھی چار پانچ فیٹ سے زیادہ گہری نہیں ہے۔ گھاس، جھاڑی اور گنے چنے درختوں کی جو مایا ہے وہ ہوا کے دوش پر آئی اس چند فٹ مٹی کی تہہ کی ہی ہے۔ اس کے نیچے چونے کا وہ خزانہ چھپا ہوا ہے جس کی مقدار کا حساب لگانا بھی شاید آسان نہیں ہے۔ جہاں جہاں مٹی نے پردہ ڈھک رکھا ہے وہاں تو غنیمت ہے جہاں سے پردہ اٹھ گیا ہے۔ وہاں کا پانی۔ برائے نام ہی سہی تالابوں تک پہنچتا ہے تو اس کے ساتھ چونے کی اس قدر آمیزش ہوتی ہے کہ پانی جیسی جاں بخش اور روح افزا چیز تالابوں میں گھاس اور سخت جان پودوں تک کو جمنے اور پنپنے نہیں دیتی۔ اور پانی کا جمال دل فروز، صورت مہر نیم روز ہر نظارے کو جلا کر خاک کر دیتا ہے۔

عارف میاں نے کالاہاری کے "پین" (PANY) کا اس طرح ذکر کیا جیسے میں اسکو پہلے سے جانتا ہوں۔ حالانکہ میری سمجھ میں بہت دیر بعد یہ بات آئی کہ وہ کسی سوکھے تالاب اور جوہڑ کا ذکر کر رہے ہیں۔ اوّل تو میں آواگون اور تناسخ TRANSMIGRATION کا قایل نہیں۔ اور اگر قایل ہوتا بھی تو شاید مجھے اپنے کسی سابق جنم میں اس طرح کی چیز سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس لئے سمجھتا تو کیسے سمجھتا۔ مجھے تو یہ میدان صرف "پین" نہیں۔ "فرائی پین" FRY PAN لگے۔ یہ سردی کا موسم ہے۔ گرمی میں خدا معلوم یہ کس کس طرح جلاتے بھونتے ہوں گے۔ مگر قربان جائیے اللہ میاں کی قدرت کے! انھوں نے اپنے ان لمبے چوڑے فرائی پینوں کے لئے نمک مصالحے کا بھی باقاعدہ انتظام کر رکھا ہے۔ اطراف کی زمینوں سے پانی اور چونے کے ساتھ ساتھ کسی قدر زمین کا نمک بھی بہہ بہہ کر یہاں آجاتا ہے اور جمع ہوتا

رہتا ہے۔ اور یوں کہنا چاہیئے کہ جنگلی جانوروں کے لیے کیلشیم اور نمک جالینوس کی ہمدرد مارکہ گولیاں بقول کسے تیار ہو جاتی ہیں! اگر ہمدرد والے اعتراض کریں اور اسے نمک جالینوس کا صحیح نسخہ نہ مانیں تو اتنا تو انھیں تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ یہ قدرتی سوغات جنگلی جانوروں کے لیے چورن اور چاٹن کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو حضرات وائلڈ لائف سے کسی قدر واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ دنیا کے شاید سبھی سبزی خور جانوروں کو ہاضمے کے لیے ایسی مٹی کی سخت ضرورت ہوتی ہے جس میں نمک ملا ہوا ہو۔ اور وہ ہر دعوت کے بعد یہ مٹی چاٹتے ہیں! ہمارے ہندوستان کے مہاراجہ بنارس جو جنگلی جانوروں سے بڑی محبت کرتے تھے ویگن کے ویگن لاہوری نمک سے بھرے ہوئے اپنے ہاں کے جنگلات میں جگہ جگہ ڈلوایا کرتے تھے کہ ان کی اس جنگلی رعایا کا ہاضمہ درست رہے اور وہ آرام سے نمک چاٹے! شاید اسی کے اجر کے طور پر ان کے وارث مہاراج کمار صاحب کے لیے جو کرکٹ کے مشہور کھلاڑی بھی تھے اور "وزّی" کے نام سے مشہور تھے۔ قدرت نے انتظام کیا تھا کہ دنیا میں جہاں جائیں بنارس سے پان کی گلوریاں ان کے لیے بن بن کر پہنچتی رہیں قدرت ان پر ساری زندگی مہربان رہی اور وہ خود ہم دو بھائیوں خواجہ مہدی نظامی اور خواجہ حسن ثانی نظامی پر مہربان رہے۔ جب ہم لوگ چھوٹے تھے تو مہاراج کا خاص شکاری منیا شکار کا سروے کرنے جاتا تو مہاراج کے حکم پر ہم دونوں کو سیر کے لیے جیپ میں بٹھا لیتا۔ اور ہم مفت میں جگہ جگہ کے جنگلوں کی سیر کرتے!

کالاہاری کے ہیں اللہ کی جنگلی مخلوق کو اور کچھ دیں یا دیں نمک کا چٹخارہ اور ہاضمے کی دوا ضرور دے دیتے ہیں۔

اللہ کا شکر اس بات پر بھی ادا کرنا چاہیئے کہ صحرائے کالاہاری کے چونے کو ریت کی ایک موٹی تہہ نے چھپا رکھا ہے ورنہ لالچی انسان اس صحرا کو بھی بدترازہ صحرا کرکے چھوڑتا اور اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو ہندوستان میں ہمالیہ پہاڑ کا ہو رہا ہے کہ دہرہ دون اور مسوری جیسے خوبصورت اور ہرے بھرے درختوں سے لدے اور قدرتی چشموں سے آراستہ علاقوں کو بڑی تیزی سے ایک بھیانک صحرا میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ خدا کرے ہمارے نام نہاد تہذیب و تمدن کے سبز قدم یہاں کبھی نہ آئیں!

پیر صحرا عارف میاں نے بتایا تھا کہ اگرچہ ہم صبح سے صحرا اور جنگل ہی میں سفر کر رہے ہیں لیکن صحرا کے جس مخصوص علاقے میں شکار کرنے کا پرمٹ اور لائسنس ان کے پاس ہے۔ وہ علاقہ بہت دور ہے۔ اور اس خاص جنگل کے کنارے پر ایک انسانی آبادی بھی ہے جہاں سے ایک گائڈ اور رہنما کو ساتھ لینا ہوگا۔ کیونکہ مقامی صحرائی باشندوں کے علاوہ اور کوئی بھی راستے اور سمت کا اندازہ یہاں نہیں لگا سکتا۔ اور ذرا سی دیر میں اس طرح رستہ بھولتا اور بھٹکتا ہے کہ جیتے جی پھر باہر آنا نصیب نہیں ہوتا!

مجھے اس اطلاع سے بہت لطف آیا۔ کہ پیر و مرشد کی ضرورت یہاں بھی موجود ہے! سبحان اللہ آدمی بھی کیا چیز ہے۔ جنگل کا راستہ ڈھونڈھنے کے لیے تو جیتے جاگتے گائڈ کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ صرف نقشے اور کتاب سے کام نہیں چلے گا۔ لیکن اللہ کا راستہ پانے کے لیے بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ بات قطعاً ضروری نہیں ہے کہ کسی کو رہنما اور رہبر و مرشد بنایا جائے!

عبدالکریم خاں اور عارف میاں کی ولایت خدا خدا کرکے

وہ بستی بھی آگئی جس کا ذکر صبح سے سنا جا رہا تھا اور جو اس صحرائی ولایت کے کنارے واقع تھی جسے ان دونوں شکاری حضرات کے حوالے لائسنس اور پرمٹ کے لفافے نامے کے ذریعے کیا گیا تھا۔ جہاں تک یاد آتا ہے یہ بستی تین جھونپڑیوں کی ایک آبادی پر مشتمل تھی۔ اور یہ تین جھونپڑیاں بھی اس نام نہاد راستے سے فرلانگ دو فرلانگ دور واقع تھیں جسے کہنے کو راستہ کہیے لیکن سڑک نام کی کوئی تہمت اس کے لیے جائز اور درست نہ تھی۔ لیکن اللہ اکبر! یہ صحرا نشین اور BUSHMEN

ایسے مہذب تھے جیسے ابھی ابھی یورپ و امریکہ سے تازہ بتازہ امپورٹ کیے گئے ہوں۔ ورنہ آپ ہی بتائیے کہ کیا دہلی اور بمبئی کے شائستہ باشندوں سے بھی یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے گھر کا کوڑا کالے پولی تھین کے ایک بڑے تھیلے میں بھریں۔ اس تھیلے کا منہ بند کریں اور کندھے پر لاد کر دو فرلانگ لے جائیں اور اس راستے پر رکھ آئیں جس کی ہجو میں ابھی کر چکا ہوں! محض اس امید پر کہ دو چار دس بیس جتنے دن میں بھی سرکاری کوڑا گاڑی اس صحراء کو قابل اعتناء گردانتے اور یہاں سے گزرے تو کسی شاعر استاد کی طرح انسانی منظومات کے ان سارے حشو و زوائد کو اناڑی شاگردوں کے کوچے سے۔ لیجائے اور منادی کے صفحات پر منعقد ہونے والے اس مشاعرے میں دھوم مچوادے!

ہاں ہاں یقین کیجئے کہ اس صحراء میں جہاں نہ کوئی صفائی کا جمعدار ہے نہ انسپکٹر نہ قانون کا کوڑا۔ نہ اسکول نہ مدرسہ، نہ کالج نہ فیشن میں نے خود اپنی آنکھوں سے کوڑے کا پولی تھین بیگ "تین جھونپڑی گاؤں" سے فرلانگ دو فرلانگ دور راستے کے کنارے رکھا دیکھا جو کوڑے کے ٹرک کے انتظار میں موسم کی ہر سختی برداشت کر رہا تھا!

پیرومرشد کی شیرافگنی!

ہم لوگ مقامی گائڈ کو لینے "تین جھونپڑی گاؤں" (اس نام سے اسے اس لئے پکارا جارہا ہے کہ اس صحراء میں شاید غیر ضروری نام رکھنے کا رواج ہی نہیں ہے!) پہنچے تو یہ پریشان کن لیکن انتہائی دلچسپ خبر سنی کہ گائڈ صاحب یعنی بقول میرے "شیخ صحراء" یا "جنگل پیر" صاحب گھر پر موجود ہی نہیں ہیں! کہاں گئے ہیں؟ ببر شیر مارنے! اچھا تو انہیں شیر مارنے کا بہت شوق ہے؟ جی نہیں ضرورتاً گئے ہیں! روایت ہے کہ ببر شیر یا شیرنی نے ان کی گائے کو مارا تھا اس لئے پیر صحراء نے اپنی نہایت شریف امن پسند اور بال بچوں کو دودھ دہی سے نوازنے والی رعیت یعنی گایوں کی حفاظت کے لیے ضروری سمجھا کہ علاقے کے بدمعاش شیر کو فوراً سزا دیں اور جتادیں کہ تمہارے لئے اللہ میاں نے جنگلی جانور بنائے ہیں اور تمہیں ہر طرح کی آزادی دی ہے۔ جاؤ مزے سے کھاؤ کماؤ! ہم گنے چنے انسان خود اپنی ہی برادری سے تنگ آکر اس علاقے میں آن بسے ہیں۔ ہماری گزر بسر کا ذریعہ صرف گایوں کے گلے ہیں اگر تم ان ہی پر دانت تیز کروگے تو ہماری تمہاری لڑائی ہوجائیگی اور تم جانتے ہو کہ ہم رسمی مسلمان نہ سہی فطری اور عملی طور پر مسلمان ضرور رہیں۔ ناک کا بدلہ ناک سے اور کان کا بدلہ کان سے ضرور لیں گے اور تم کو حد سے ذرا باہر نہ نکلنے دیں گے!

مردے از غیب!

اتنی دور آکر بے نیل مرام شکار کھیلے بغیر واپس جانا سخت محرومی کی بات تھی لمحہ بھر کو میں نے میزبانوں کے چہروں پر کچھ پریشانی پائی لیکن اللہ تعالی نے ایک نہیں بہت سے در کھول رکھے ہیں۔ ایک گائڈ اور رہنما نہ سہی دوسرا گائڈ اور رہنما سہی۔ آشنا صاحب نہ ملے تو ان کے پڑوس کے کسی "ناآشنا" نے "آشنائی" کا دم بھرا اور راستہ دکھانے کے لئے خدمات پیش کیں۔ یہ بالکل اجنبی تھے۔ لیکن مجبوری تھی انہی کی خدمات کو قبول کرلیا گیا۔ ایک صاحب اور ان کے جوڑی دار بن کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ تجربے نے بتایا کہ نئے شیخ پرانے شیخ سے بڑھیا ہیں اور جانوروں کے گھر گھاٹ سے زیادہ واقف ہیں۔

فیضانِ حمک دان

"تین جھونپڑی گاؤں" ایک بہت لمبے چوڑے "چپین" یا "فرائی چپین" کے کنارے آباد ہے۔ معلوم نہیں ہمارے کسی اور ساتھی نے غور کیا یا نہیں کیا۔ لیکن میری نگاہ سے یہ منظر نہیں چوکا کہ گاؤں کے اطراف کا غذ کے ٹکڑے پلاسٹک کی تھیلیاں یا اسی طرح کا اور کوڑا کباڑ تو موجود نہیں تھا۔ جیسا کہ عام طور پر گاؤں کی آبادی کے اطراف

ہر جگہ دیکھا جاتا ہے۔ وہ تو غالباً سب کا سب کالے پولی تھین بیگ میں نام نہاد سڑک تک پہنچایا جا چکا تھا۔ البتہ جنگلی جانوروں کے سینگ اور کھال کے پرانے ٹکڑے ادھر ادھر ضرور پڑے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں کسی گاؤں والے کی زبان جانتا ہوتا اور اس سے پوچھتا کہ یہ کوڑا گاؤں کے پاس کیوں ہے تو اس کے جواب دو ہو سکتے تھے! نمبر ایک یہ کہ ہم کالے بیگ میں وہ سامان نہیں رکھنا چاہتے تھے جس کو وائلڈ لائف ڈپارٹمنٹ والے مقدمے کا ثبوت بنا لیں۔ نمبر دو یہ کہ جنوبی افریقہ کے بھڑولیمپ والے رقاص ملازم کی طرح شکار کا دلدادہ گاؤں کا باشندہ بھی شاید مٹکتا جھومتا لہراتا اور رقص کا ایک خوبصورت جھوٹا لے کر کہتا یہ آثار ہی تو ہمارے لئے

چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط!

کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تو کلیجے سے لگائے رکھنے کی چیزیں ہیں انہیں کوڑے کے ساتھ ایکسپورٹ نہیں کیا جا سکتا! شکار تو ہماری نس نس میں بسا ہوا ہے!

گاؤں کے "قرائی بہین" کی لمبائی چوڑی کیلومیٹروں ہی میں ناپی جا سکتی تھی۔ بتایا گیا کہ یہ دوپہر کا وقت ہے۔ اس لئے میدان بھی سنسان ہے۔ دھندلکا پھیلتے چاندنی اترتے اور رستہ اندھیرے آکر دیکھو تو یہ سوکھا جوہڑ یا تالاب جانوروں کے لئے بمبئی کی چوپاٹی یا دلی کا انڈیا گیٹ لگے گا۔ یعنی بھانت بھانت کا جانور یہاں بھیل پوری یا آئس کریم کھانے والوں کی طرح موجود ہوگا۔ اور بیچارہ صرف زمین چاٹنے ہی میں مگن رہے گا۔ زمین چاٹنا انگریزی میں تو شکست کھانے یا ہار ماننے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جانور نہ انگریز ہیں نہ اردو کے محاورہ باز وہ بیچارے تو یہاں واقعی چورن یا چاٹ کی چاٹ میں آتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ گاؤں کے شکاری بھی یہاں تاک لگا کر بیٹھتے ہیں۔ اور قدرت کے نان و نمک پر گذارا کرنے والی مخلوق کے زخموں پر واقعی نمک چھڑکنے کا باعث بن جاتے ہیں۔

بہ عبور میدان شور! خلیج بنگال میں واقع انڈمان اور نکوبار کے جزیروں کو کسی زمانے میں برٹش حاکموں نے بے کس رعیت کے لئے قید خانہ بنا رکھا تھا۔ اور جرائم پیشہ لوگوں کو کم اور آزادی کے متوالوں کو زیادہ یہاں بندی بنا کر رکھا جاتا تھا۔ اور طرح طرح کے ظلم ڈھائے جاتے تھے۔ کالا پانی اس جگہ کا نام دھرا گیا تھا اور یہ جگہ چونکہ ہندوستان کے اصل بر اعظم سے دور سمندر پار تھی۔ اس لئے جج صاحبان عمر قید کا حکم سناتے تو تو اس میں بس دو "بہ عبور دریائے شور" بھی لکھا کرتے جس کا مطلب یہ ہوتا کہ زندگی بھر کی قید کھاری سمندر کو پار کر کے ایک بھیانک جزیرے میں کاٹنی پڑے گی تاکہ کسی نامراد قیدی تک آشنائی اور ہمدردی اور وطن کی خوشبو تک نہ پہنچ پائے۔

مگر ہم لوگوں نے صحرائے کالاہاری کے اس ویرانے کا انتخاب مجبوری سے نہیں کیا۔ خوشی سے کیا ہے۔ اور جائداد کے قبالوں کے الفاظ میں "برضا و رغبت" اور بلا جبر و اکراہ" کیا ہے۔ بعض لوگوں کے بقول اپنی "اس سزا" کے جج بھی ہم خود ہی ہیں۔ اس لئے "تین جھونپڑی" بہین سے گذرنے کو" بہ عبور میدان شور" کہہ کر حضرت سعدی کے اس شعر پر جھومتے ہیں کہ

ابنائے روزگار غلاماں بزر خرند
سعدی بہ اختیار و ارادت غلام شد

دنیا والے پیسے سے غلام خریدتے (بیچتے) ہیں لیکن سعدی تو خود اپنے اختیار اور ارادے سے غلام ہوا ہے۔

بحمد اللہ "تین جھونپڑی گاؤں" چھوڑ، میدان پار کر، اس جنگل میں داخل ہوئے جس سے آگے نہ کسی انسانی آبادی کی آس، امید، خطرہ یا اندیشہ تھا نہ اپنی صحیح سلامت واپسی کا گمان یا یقین! اس کیفیت کے لطف سے بھی وہی واقف ہو سکتا ہے جس کو اللہ یہ نعمت عطا فرمائے۔ سچ پوچھئے تو مجھے ایسا محسوس ہوا

تھا کہ ہندو بھائیوں والے سارے آواگون ہوا ہو گئے
ں اور مکتی اور نجات پوری کی پوری "بھا بہت"!

دھنیہ ہو دھنیہ! سب سے پہلے درشن دیئے تو
س نے دیئے۔ شتر مرغ! ایک نہیں دو نہیں۔ پورے
ن!

اگلے وقتوں کا ذکر ہے۔ پروفیسر علی محمد خسرو
وجودہ چانسلر مسلم۔ یونیورسٹی علی گڑھ کے صاحبزادے
سلمہٗ اپنے ابا اور میرے ساتھ شکار کو گئے۔ انھوں نے
نگل میں تیتری نامی پرندہ پہلی دفعہ دیکھا۔ والد سے
وچھا ابا یہ کیا ہے؟ خسرو صاحب نے اپنے مخصوص
شہرہ آفاق اسٹائل میں نہایت سکون اور اطمینان
سے آدھے انچ فی گھنٹہ چلنے والی گاڑی کی رفتار سے
واب دیا۔

"بیٹا یہ ایک پرندہ ہے۔ نہایت چھوٹا، حقیر معمولی
بے ضرر سا جانور!"

کالاہاری میں کوئی چھوٹا بچہ سوال کرنے والا
ساتھ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے خود ہی بچہ بن کر
پنے آپ سے پوچھا کہ کیا یہ وہی کم ہمت بے ضرر اور
بے وقوف لیکن لحیم شحیم سب سے بڑا پرندہ ہے جو
شمن کو دیکھ کر موڈرن مسلمانوں کی طرح ریت میں
منہ چھپا لیتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ کوئی خطرہ موجود
نہیں ہے۔ اور پھر بن آئی مارا جاتا ہے؟ جواب ملا۔
کہتے تو یہی ہیں! اور کہتے کیا ہیں؟ کوئی ہمیں دیکھے
تو یہی سمجھے کہ انسانی آبادی سے فرار اور جنگل میں بزعم
خود سکون و قرار! خود وہی مشہور زمانہ "شتر مرغیت"
ہے جو زمانہ نامعلوم سے معلوم چلی آتی ہے۔

لیکن اس کو کیا کیجئے کہ شکار بھی سائنس کی طرح
یہی سکھاتا ہے کہ سنو سب کی۔ لیکن مانو وہی جو تجربے
پر کھری اترے۔ تم بھی ذرا ایک پرانے یورپین سائنسداں
کی طرح کے آدمی بن جاؤ اور یکساں اونچائی سے ہلکی
بھاری چیز کو ساتھ نیچے پھینکو اور پھر دیکھو کہ کون سی
چیز پہلے نیچے آتی ہے؟

میری ٹکٹکی "شتر مرغان" کی طرف جمی دیکھی
تو گاڑی بان میاں عارف سلمہ اللہ تعالےٰ نے اپنی وین کو
دھیمے دھیمے اس طرف بڑھانا شروع کیا جو شاید ان کے
ذہن میں میرے لئے شتر مرغ نہیں "سی مرغ"
بن چکی تھی ــــ ایک خیالی اور طلسماتی پرندہ!

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ یہ تینوں پرند فوراً
قدم بوسی کے لئے جھکتے۔ چونچ سے زمین کریدتے اور
اپنے سر کو ریت میں دفن کرکے حبس دم کی ورزش
کے ساتھ ساتھ یہ انتظار شروع کرتے کہ ہم کب
ان تک پہنچتے ہیں۔ اور بندوق کی نال اور چھری کی نوک
ہماری ان کی مشکل آسان کرتے ہیں اور مجبوری کی شہادت
کے ذریعے جنت الفردوس پہنچاتے ہیں!

لیکن دیکھئے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا! افسوس
صد افسوس! ان تین "شتران مرغ" یا "شتر مرغوں"
نے نہ تو ریت میں سر چھپایا نہ رکوع اور سجدے میں گئے۔
نہ ہم سے صرف نظر ہی کیا۔ خاصی دیر تک یہی جانچتے پرکھتے
رہے کہ یہ نئی چیز اس ویرانے میں کیا آگئی اور کیوں آگئی؟
اور پھر شاید اپنے کسی پرانے تجربے کی بنا پر اس حدیث شریف
کو یاد کیا کہ

مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں ڈسا اور کاٹا
جاتا!

اور بطور احتیاط فوری طور پر ہم سے دور ہو جانا شروع کیا
سمجھا اور اس تیزی سے مخالف جانب قدم بڑھانے شروع
کئے جیسے جج صاحب کے چپراسی کی پکار پر مدعی یا مدعا علیہ
کورٹ روم کی طرف بگٹٹ دوڑتے ہیں کہ کہیں ذرا سی دیر
میں یک طرفہ ڈگری صادر نہ ہو جائے!

لاحول ولا قوۃ۔ یہ معصوم پرندہ بھی انسانی بدعقیدگی
کا مارا نکلا۔ کم از کم ہم نے تو سب کی طرح اس کو بھی اپنی
جان سے پیار کرنے والا اور جی جان سے اس کی حفاظت
کرنے والا پایا۔ آدمی سے منہ پھیرنا تو یہاں کے شتر مرغ میں

پایا گیا۔ لیکن وہ ریت میں کفن دفن والی روایت کچھ بھی معتبر نہ دکھائی دی۔

میرے میزبان دیکھ رہے تھے کہ دلی والے پیر صاحب شتر مرغ کے گیان دھیان میں لگے ہوئے ہیں۔ شاید چند ہی لمحے میں جھپٹّا بھی ماریں! اس لئے انھوں نے فوراً پیش بندی کی کہ " اگر چہ یہاں شتر مرغ کو مارنے کی اجازت ہے اور ہمارے پاس اس کا بھی لائسنس موجود ہے۔ لیکن اس کے گوشت میں ایسی سخت بو ہوتی ہے کہ اگر قاعدے کے موافق اس کا پیٹ صاف کرکے یعنی ایک طرح سے غسل میت دے کر " توپ گاڑی " کے جنازے کا اعزاز بخشا گیا تو مارے بدبو کے جنازہ تو جنازہ " توپ " یعنی قیمتی بندوقوں اور قیمتی گاڑی سب کو چھوڑ کر بھاگ جانے کو جی چاہے گا اور واضح باد کہ یہاں جائے فرار کوئی نہیں ہے!"

مجھے ہنسی آگئی اور عرض کیا کہ آپ میری " دید و شنید " کو بدیقینی پر کیوں محمول کرتے ہیں؟ میرا کوئی ارادہ شتر مرغ مارنے کا نہیں ہے خاص طور پر اس لئے بھی اسے مارنا درست نہیں سمجھتا کہ یہ صحیح یا غلط میری قوم سے منسوب ہو گیا ہے۔ اپنے بھائی کو مار کر کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا زندہ کو زندہ دکھا کر البتہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ دیکھو یہ زندہ ہے۔ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اس کو زندہ رہنا آتا ہے۔ انشاء اللہ یہ زندہ رہے گا۔ ریت میں منہ چھپا کر نہیں سر اٹھا کر زندہ رہے گا!

میرے بھائی! میں تو یہاں کے جغرافیے میں شتر مرغ کی وہ تاریخ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جو صرف تاریخ ہی کی نہیں ہمارے ہاں ادب کی ہر کتاب میں بھی لکھی ہوئی ہے۔ اور جس سے دل سہما جاتا ہے۔ الحمد للہ اس جغرافیے نے اس تاریخ کو غلط اور بناوٹی کر دکھایا جو ڈرائی آئی تھی! دیکھا آپ نے! شکار صرف جانور مارنے کو نہیں کہتے۔ بہت سی چیزوں کو کہتے ہیں!

درون خانہ

ہماری پارٹی جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی۔ صحرا کے عجائبات بھی ایک کے بعد ایک اپنے جلوے دکھا رہے تھے۔ ان کا حال لکھنے کو ایک کتاب درکار ہے۔ اور اس کا نہ میرے پاس وقت ہے نہ شاید آپ اسے پڑھنے کی تاب لا سکیں۔

پرمٹ لائسنس والوں نے اپنے خلافت ناموں کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اور علامہ اقبال کے مشہور شعر

پلٹنا جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ!

کے منظر خوب خوب دکھائے تھرما میٹر ہمارے ساتھی ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کے پاس ہو تو ہو۔ میرے پاس نہیں تھا کہ شکاریوں کے خون کا درجہ حرارت ناپتا۔ شکار کے ساتھ صحرا میں جماعت کی نماز بھی ہوئی۔ کھانے کے لمبے چوڑے دستر خوان بھی بچھے۔ کہنیوں کے تکیے بنا کر لوگوں نے ریت پر استراحت بھی فرمائی۔ قیلولہ بھی کیا۔ گویا کہتے ہوں ؎

گھر ہم نے لے لیا ہے ترے گھر کے سامنے!

سر تاج کمپنی اور سارہ سلمہا کے بیک وقت سرتاج عبدالغنی صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کے لئے صحرا اور شکار زندگی کے پہلے تجربے کی حیثیت رکھتے تھے۔ بظاہر تو وہ لطف اندوز ہوتے نظر آئے۔ دل کا حال اللہ بہتر جانتا ہے۔ البتہ باقی ساری پارٹی جنونیوں کی تھی۔ اور اپنے جنون میں بے طرح مست!

ہندوستان کے نیل اور سانبھر سے بھی بڑے سائز کے ایک خوبصورت ہرن " جیمس بوک " کو ذبح کیا جا چکا اور اس کے ایک ایک میٹر لمبے نکیلے سجیلے سینگوں سے کوئی خطرہ باقی نہ رہا تو میں نے ڈاکٹر عبدالخالق صاحب سے فرمائش کی کہ آپ خنجر بدست اس بیچارے کے گلوئے خون آلود کے پاس تصویر کھنچوانے ہی کو جھک جائیے تاکہ میں ڈربن واپس جا کر آپ کی بیوی فاطمہ سلمہا، بچوں اور دیگر

عزیزوں کو یہ فوٹو دکھا کر کہہ سکوں کہ ڈاکٹر صاحب کی ایک سرجری یہ بھی ہے!

جیوانِ دل جو جانور شکار ہوئے ان میں گھوڑے کے سائز کا ہرن HARTEBEEST بھی تھا۔ جنوبی افریقہ میں حروف تہجی کی آوازیں اور تلفظ خوب تماشے دکھاتے ہیں۔ انگریزی جی G کا تلفظ کبھی اردو گاف (گ) کا سا ہوتا ہے۔ کبھی اردو مے (خ) کا سا۔ افری کان AFRICAAN میں انگلش، فرنچ، ڈچ، اسپینش۔ جرمن خدا معلوم کیا کیا گڈمڈ ہو گیا ہے۔ اور اب کچھ پتہ نہیں چلتا کہ جس نقل کو ہم دیکھ رہے ہیں اور سن رہے ہیں اس کی اصل کیا تھی؟ HARTEBEEST کو اردو میں ہارٹ بیسٹ یا ہارٹے بیسٹ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ نہ بھی پڑھا جا سکتا ہو تو اس وقت میں یہی چاہوں گا کہ مختلف زبانوں کو بگاڑنے اور ان کا ملغوبہ بنانے کا حق مجھے بھی مل جائے۔ آخر کو میں بھی اردو والا ہوں۔ اور اردو کے ہلو روح بھی افریقیوں کی طرح اسی طرح کے کام کرتے چلے آتے ہیں کہ "سیپ ٹمبر" SEPTEMBER کو ستمبر کہیں اور " اپرل" APRIL کو "اپریل" اس لئے میں بھی ہارٹے بیسٹ کو ہارٹ بیسٹ HEART BEAST پکار کر اس کا ترجمہ "جیوانِ دل" کر لوں تو مضائقہ ہی کیا ہے۔ جیوان کے معنی "زندہ" کے بھی ہیں اور "درندے" یعنی BEAST کے بھی۔ ہماری زندگی یعنی انسانوں کی زندگی دونوں طرح کی کیفیات کی حامل ہے اس میں وہ زندگی اور پائندگی بھی ہے جو انسانیت سے عبارت ہے۔ اور وہ جیوانیت بھی جو آنی جانی فانی درندگی سے پہچانی جاتی ہے۔ اس بے چارے ہرن پر تو جو گذر گئی سو گذر گئی۔ لیکن اگر اس نے اپنی جان کی قربانی دے کر کسی انسان کے دل سے جیوانیت کو کم کر دیا تو سمجھنا چاہیے کہ اس کا خون رائگاں نہیں گیا۔ ورنہ کیا عجب تھا کہ اس مشقِ ستم کا نشانہ کوئی انسان بنتا اس بے زبان نے آدمی کی آئی اپنے اوپر لے لی۔ کاش وہ آدمی کوہ شکاری بھی سوچتا کہ جانور کو مارا تو کیا مارا۔ بات تو جب تھی کہ اصلی جیوانِ دل کا شکار کرتا جو دل کے صحرائے کالاہاری میں دندناتا پھرتا ہے!

کس کی قسمت؟ دن ڈھلا۔ واپسی کا فکر شکار یوں پر سوار ہوا اور شکاری گاڑیوں پر کسی نے مجھ سے کہا کہ آپ بڑے قسمت والے LUCKY آدمی ہیں ابھی چند روز قبل ہم لوگ اسی علاقے میں آئے تھے اور چھ دن کا شکار کیمپ کیا تھا۔ شروع کے چار دن ہمیں کسی جانور کی پرچھائیں تک دکھائی نہ دی۔ آخری دو دن البتہ آنسو پونچھنے کے لائق کچھ شکار ہوا اور آپ دن بھر کے لئے آئے اور یہ حال رہا کہ جدھر بڑھتے تھے ہر قسم کے جانور قطار اندر قطار اور انبوہ در انبوہ بقول کسے اُمڈے چلے آتے تھے۔ آخر اتنے جانور ایک دم کہاں سے آ گئے؟ میں نے عرض کیا کہ جناب عالی یہ اس دور افتادہ مسافر کی قسمت نہیں تھی جس کے کرشمے آپ نے دیکھے۔ یہ تو اس مسافر کے خواجگانؒ کی قسمت تھی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی جنگل بیابان میں راستہ بھول جائے یا اور کوئی پریشانی درپیش ہو اور مدد کی ضرورت پڑے تو ان الفاظ کے ساتھ اللہ سے دعا مانگے کہ اے اللہ کے بندو! اللہ کے حکم سے میری مدد کرو۔ کیونکہ اللہ کی کچھ مخلوق ایسی ہے جو نظر تو نہیں آتی لیکن موجود ہوتی ہے۔ اور مدد کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے اس ارشاد گرامی کے تحت صحرائے کالاہاری بھی اللہ کے نیک بندوں سے خالی نہ ہو گا۔ اور ان بندوں نے دیکھا ہو گا کہ ہندوستان کے خواجگان، خاص کر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا ایک چاکر ان کے دیس میں آیا ہے۔ اس کی خاطر تواضع اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اس کے شوق کو پورا کیا جائے۔ تاکہ ہندوستان کے خواجہؒ خیال فرمائیں کہ دیکھو ہمارے افریقہ کے ساتھی ہمارے آدمی کی پذیرائی کر رہے ہیں۔

لہذا یہی حضرات جانوروں کو گھیر ہانک کر آپ کے سامنے لاتے رہے! ورنہ میں کیا اور میری قسمت کیا؟

آگ اور پانی} ہم لوگ بڑی مقدار میں پٹرول ساتھ لے کر چلے تھے۔ اور یہاں بھی بڑے بڑے ڈرمز میں ایسا وافر موجود تھا کہ ایک پوری آرمی رجمنٹ کو کافی ہو۔ واپسی میں "تین جھونپڑی گاؤں" میں مقامی گائڈ حضرات کو چھوڑا تو جہاں ان کو انعام اکرام سے نوازا گیا۔ وہاں پانی کا بچا ہوا اسٹاک بھی ان کے حوالے کر دیا گیا۔ پانی پا کر ان لوگوں کو جو خوشی ہوئی ہے۔ وہ دیکھنے کے قابل تھی۔ کیونکہ اس موسم میں اور اس علاقے میں پانی کا بس تصور ہی کیا جا سکتا تھا موجود پانی کی کوئی بوند تک نہ تھی۔ اور حیرت پر حیرت یہ کہ ان گنت جانور بھی زندہ سلامت۔ اور انسان بھی گنتی ہی کے سہی لیکن بے پانی جیتے جاگتے ہرا جمان! قدرت کے انتظام، کہا کیجئے کیسے کیسے نباہ رہے ہیں۔ اس پورے علاقے میں خاص کر جنگل کے علاقے میں میں نے پچاس گز زمین کا ٹکڑا بھی ایسا نہیں دیکھا جہاں تربوز کی وضع کا ایک جنگلی پھل جو بے پتوں کی ایک بیل میں لگتا ہے۔ کہیں پڑا ہوا نظر نہ آیا ہو۔ سائز اس کا کرکٹ کی گیند سے بس ذرا سا بڑا ہوتا ہے۔ اور باہر کا حصہ کریلے سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ اس پھل میں رس ہمارے تربوز سے بہت کم ہوتا ہے۔ لیکن ہوتا ضرور ہے۔ بس اسی پھل کو کھا کر جانور بھی زندہ ہیں اور آدمی بھی! غسل اور وضو یہاں غالباً اسی وقت آ سکیں گے جب اسلام آئے گا۔ فی الحال تو ایک مسلسل اور دائمی تیمم پر گزارا ہے۔ تاہم کبھی کہیں سے پانی فراہم ہو جاتا ہے تو یہاں کے باشندوں کو حد سے زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ گویا عید آ گئی۔ مگر یہ عید بھی برسوں کی برسات کی طرح بس کبھی کبھی ہی آتی ہوگی!

رنگ کی پختگی} افریقہ کے شہری باشندوں میں رنگت ہلکی گہری ہوتی ہے۔ لیکن کالے رنگ کی جو پختگی صحرائی علاقوں میں ہے۔ وہ کچھ اور ہی ہے۔ تاہم پانی کی نایابی نے اس سیاہی کی چمک کو ذرا مدھم کر رکھا ہے۔ گرد و غبار غازے کا کام کرتے ہیں۔ بالکل یوں لگتا ہے کہ یہ لوگ نیچر کے ٹیلی وژن اسٹوڈیو میں ہیں۔ اور قدرت کا کیمرہ مین ان کی تصویر کو اپنے پورے فن کے ساتھ پردے پر لانا چاہتا ہے۔ شہروں کے ٹی وی اسٹوڈیوز میں میک اپ روم کا خاص کام یہی ہوتا ہے کہ ہر چمک کو ڈل کیا جائے۔ اہل تصوف کے ہاں کرامت کا اخفا بھی شاید اسی طرح کے مقاصد کے تحت ہوتا ہو کہ چکا چوند سے آنکھوں کو خیرہ اور زعم کو خراب نہ کیا جائے۔

نمک پکا کر رکھا ہے} حضرت محبوب الٰہیؒ کے مبارک ذکر میں ایک لطیفہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ کسی غریب مرید نے اس زمانے میں پیر و مرشد اور اپنے پیر بھائیوں کی دعوت کی جب لنگر کے فلڈ گیٹ FLOOD GATES ابھی کھولے نہیں گئے تھے اور پیر مرید سب مل کر کئی کئی وقت کے فاقے کرتے تھے۔ اس دعوت شیرازہ میں بس تھوڑی سی کھچڑی پکا کر رکھی گئی تھی۔ سب کھانے بیٹھے تو پتہ چلا کہ کھچڑی میں نمک بہت زیادہ پڑ گیا ہے۔ دعوت کو یہ کھچڑی کھانی دوبھر ہو گئی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ اس تنگی ترشی میں لطف یوں پیدا کیا کہ ارشاد بھائیو! تم کچھ خیال نہ کرو۔ ہمارے اس پیر بھائی کے پا بس تھوڑا سا نمک تھا سو اس نے وہی پکا کر تمہارے سامنے رکھ دیا ہے کہ جو تھا وہ حاضر ہے! لہذا تم بھی صبر شکر سے کھا لو!

صحرائے کالاہاری قدرتی URBAN ART S COMMISSION کے بچے کچھے سامان سے خوب آراستہ پیراستہ ہے۔ آجکل بہت سے ماڈرن ڈرائنگ روم میں بھی ٹیڑھی میڑھی درختوں کی جڑیں اور بل کھاتی ہوئی شاخیں ہی نہیں سجائی جاتیں۔ سوکھی گھاس

ببول کے کانٹے بھی گلدانوں میں آراستہ کئے جاتے ہیں۔
"شام رنگ" ہندوستان سے آنے والے کے لئے چہروں کی نمکینی بھی لازمی خاطر تھی۔ لیکن صحرا میں تو یہ ملاحت واقعی نمک کی ہانڈی بن گئی۔ میں نے بھی اس سے اسی طرح لطف اٹھایا جس طرح آٹھ سو سال پہلے نمک سے مالامال کھچڑی سے میرے آقا و مولا حضرت محبوب الٰہیؒ اور ان کے آنکھ والے اور دل والے اور احساس والے مریدوں نے لطف اٹھایا تھا۔ بلکہ مجھے تو کچھ ایسا لگا کہ میں خود بھی اسی کالی کھچڑی کا ایک نمک آلود دانہ ہوں جس کے ظاہر و باطن اور رگ رگ اور ریشے ریشے میں محبوبی نمک رچا بسا ہوا ہے! مگر یہ دعوے شاید خودستائی کے تحت آئے اس لئے توبہ کرتا ہوں! اور کہتا ہوں کہ

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک!

صبح عاشور و شام غریباں } موٹے پو لوٹے سے چلتے وقت

ہر شخص نے کہا تھا کہ صحرائے کالاہاری میں سورج کے طلوع و غروب کا منظر دیکھنے کے لئے یوروپ و امریکہ تک سے لوگ آتے ہیں۔ تم بھی اسے خاص طور پر دیکھنا۔ واقعی میں نے اسے دیکھا۔ مگر مجھے یہ منظر بھی کچھ دیکھا ہوا سا لگا اور اس نے ایسی افسردگی طاری کی جس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ سورج نکلتے وقت بھی اور ڈوبتے وقت بھی بہت بڑا تھا جیسے اسے اپنی پوری تمازت دکھانے کے لئے مصنوعی طور پر بڑا کر دیا گیا ہو۔ مگر اس کی صبح، شام والی لالی، شفق والی، شاداب لالی نہیں تھی۔ اس میں تو کسی سخت زخمی چہرے سے بہنے والے خون کی سرخی نمایاں تھی۔ اور خون بھی وہ خون جس کو سارے کا سارا صحرا بے قرار ہو ہو کر اور پنجوں کے بل پر اٹھ اٹھ کر ہاتھ بڑھا بڑھا کر اپنی پاک مٹی سے روک دینا چاہتا ہو مگر خون کسی طرح نہ رکتا ہو۔ میرے دادا حضرت امام حسین علیہ السلام کا معصوم خون کسی بے مایہ ندی کے پانی کی طرح صحرا میں جا کر سوکھ جانے والا خون تھوڑی تھا۔ یہ تو وہ سمندر ہے جو قیامت کے بعد تک موج زن رہے گا!

سورج کو تو خیر رات کے بڑھتے ہوئے کعبے کے سے ایک کالے غلاف نے ڈھک لیا۔ لیکن چاند نکلا تو وہ بھی معمول سے بہت بڑا تھا۔ مگر غمگین اور گرد آلود۔ اس کی طرف نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اور بار بار بس یہی خیال آتا تھا کہ اس کی روشنی اور تابناکی کو آج کیا ہو گیا؟ کیا کالاہاری میں سورج کا طلوع صبح عاشور کا طلوع تھا۔ اور کالاہاری کا یہ چاند کیا کسی شام غریباں کی خبر لایا تھا؟

واپسی میں عارف میاں بار بار گاڑی کے عوارضات کی خبر گیری کرتے رہے۔ اور میں انجائنا کے درد کو دور کرنے کے لئے SORBITRATE دوا کی گولیوں پہ گولیاں کھاتا رہا۔ مگر ان سے صرف انجائنا کا درد جا سکتا تھا۔ وہ درد نہیں جو دل کا درد بھی ہو۔ جگر کا درد بھی ہو اور جان کا دکھ بھی!

موٹے پو لوٹے } خاصی رات ہو جانے کے بعد ہم لوگ موٹے پو لوٹے پہنچ سکے۔

پتہ چلا کہ ہم لوگوں کی خیر و عافیت کے ساتھ واپسی کے لئے میزبان دعائیں مانگتے رہے اور وظیفے پڑھتے رہے۔ اگرچہ کہ آدھی رات ہو چکی تھی مگر رات کی دعوت کے میزبان علی میاں جلال کے برادر نسبتی ایوب قاسم اور ان کے بیوی بچے منتظر تھے۔ عارف میاں اور عبدالکریم خاں صاحب کے احسان سے دبے ہم لوگ گیبرونز GABBRONES آئے۔ کھانا کھایا اور رات کو ایوب قاسم صاحب کے مکان ہی میں سوئے۔

گذشتہ روز دوپہر کا کھانا محمد احمد صاحب مراد آبادی کے ہاں کھاتا تھا۔ مگر اس کھانے کی مہر صحرا میں لگی ہوئی تھی۔ اس لئے اگلے دن صبح ایوب صاحب کے ہاں ناشتہ کر کے محمد احمد صاحب کے ہاں گھر پر چائے پی۔ جو جیتی طوہ سوہن نمک سے آراستہ تھی۔ اس گھر میں بیٹھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے مراد آباد یا چاندنی چوک

مجھے افسردہ کل صحرا میں سورج کے غروب اور چاند کے طلوع ہی نے کر دیا تھا آج راموتسا میں برادر روحانی عبداللطیف جلالی نظامی مرحوم کی قبر پر جانا ہے۔ اس لئے دل میں بشاشت کیسے آسکتی تھی۔ خاصے لمبے سفر کے بعد راموتسا پہنچے تو وہاں خوب سردی محسوس ہوئی۔ ہوا بہت ہی ٹھنڈی تھی۔ اس آبادی میں مسلمانوں کا قبرستان بھی ہے۔ ایک بڑے احاطے کے کونے میں بڑی ترتیب سے قبریں بنی ہوئی ہیں۔ انہی میں سے ایک قبر کو بھائی جلال مرحوم نے آباد کر رکھا ہے۔ یہاں جیسی حاضری ہوئی بس ہوئی۔ اب اس کا حال کیا بیان جائے۔ میں مرحوم کی قبر کے لئے دہلی سے وہ چادر لایا تھا۔ جو حیدرآباد دکن کی جماعتِ نظامیہ نے اپنے پیرومرشد حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے مزار پر نذر کی تھی۔ وہاں سے اس چادر کی قسمت میں افریقہ اور بوتسوانا آنا لکھا تھا۔

قبرستان سے عبدالحیٔ صاحب کے نئے تعمیر شدہ مکان میں آیا۔ ابھی اس مکان میں تعمیر کا کچھ کام ہونا باقی ہے۔ بہت بڑا کشادہ اور شاندار مکان ہے۔ پہلے زمانے میں کہا جاتا تھا کہ خالی مکان میں جن بھوت آجاتے ہیں۔ لیکن عبدالحیٔ صاحب کے مکان میں تو جن بھوت نہیں آدمی آتے اور انھوں نے ظہر کی باجماعت نماز پڑھی۔ افتتاح سے پہلے یہ افتتاح بہت برکت والا اور اچھا لگا۔ دوپہر کے کھانے پر بھائی عبدالحیٔ نے اپنے پڑوسیوں کو بھی جمع کیا تھا اور ہندوستان سے آئے ہوئے کچھ رشتے دار بھی تھے۔ کھانے میں تکلف تھا۔

نماز کے بعد سب سے اجازت لی اور ایک نئے راستے اور نئی سرحد سے جنوبی افریقہ کی طرف روانگی ہوئی۔ اس راستے میں LOBATSE نامی شہر بھی پڑا جہاں ڈاکٹر عبدالخالق مرحوم کے بھائی اپنی آئرش بیوی کے ساتھ رہتے ہیں۔ انھوں نے بوتسوانا آتے وقت ساری رسمیات ادا کرائی تھیں مگر میں ان کا شکریہ ادا کرنے تک نہ جا سکا۔ کیونکہ بہت لمبا راستہ طے کرنا باقی تھا۔ علی میاں اور عبدالحیٔ صاحب ملک کی سرحد تک چھوڑنے آئے۔ پتہ چلا کہ یہ راستہ ایک اور چھوٹے سے ملک سے گزر کر جنوبی افریقہ جاتا ہے۔ یعنی اس درمیانی ملک BOPHUPHATSWANA کی سیر مفت میں ہوگئی۔ کئی گھنٹے اس ملک سے گزرنے میں لگے بڑا آباد اور بارونق علاقہ ہے۔ سب سے دلچسپ اور اچھی بات یہ دیکھی کہ راستے میں جہاں بھی کوئی اسکول پڑتا تھا اور موٹر کی رفتار کم رکھنے کا حکم ہوتا تھا وہاں ہر جگہ یہ بھی لکھا ہوا نظر آتا تھا کہ

یاد رکھئے ہمیں بھی اپنے بچے بہت ہی پیارے ہیں!

(باقی آئندہ)

مدیر
خواجہ حسن ثانی نظامی
معاون مدیر
خواجہ مہدی نظامی

منادیاً ینادی للایمان

بارگاہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ سے
ایمان اور امن کی ندا دینے والا
اور اُن کے جانشین
امام المشائخ شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی یادگار

منادی ۱۹۲۶ء سے جاری ہے یہ انہترویں جلد (۱۹۹۴ء) کا ساتواں شمارہ ہے

درگاہ شریف اور منادی کے بارے میں خط و کتابت کرنے اور قیمت جمع کرانے کا پتہ
خواجہ حسن ثانی نظامی
ڈاکخانہ حضرت نظام الدین اولیاء
نئی دہلی ۱۳-۱۱

سالانہ قیمت
ہندوستان میں
پچاس روپے
غیر ممالک سے
دس ڈالر
فی پرچہ
پانچ روپے

فہرست

دیوانہ ہوں دیوانۂ محبوبِ الٰہیؒ

قاضی محمد سراج الدین عاقل مدرس مدرسۂ نظامیہ ادونی

ہاتھوں میں ہے پیمانۂ محبوبِ الٰہیؒ
دیوانہ ہوں دیوانۂ محبوبِ الٰہیؒ

پڑھنے سے ہوں ایمان کی آنکھیں وہیں روشن
مشہور ہے افسانۂ محبوبِ الٰہیؒ

اس شخص کی قسمت پہ کرے رشک زمانہ
جو بن گیا مستانۂ محبوبِ الٰہیؒ

بیٹھے جو کبوتر تو اُٹھے باز وہ بن کر
کیا خوب ہے کاشانۂ محبوبِ الٰہیؒ

دن رات ہی ہوتے ہیں عطا جام مسرت
اللہ رے میخانۂ محبوبِ الٰہیؒ

دنیا کی اور عقبیٰ کی ہر اک فکر سے عاقلؔ
آزاد ہے پروانۂ محبوبِ الٰہیؒ

اسلام کا پیغام

پروفیسر نثار احمد فاروقی

حکومت پنجاب کے محکمہ السنہ (LANGUAGES DEPT.) کی جانب سے اور وزیر تعلیم حکومت پنجاب کی صدارت میں "مذاہب عالم کے پیغام" پر ایک روزہ سیمینار ڈاکٹر بلبیر سنگھ ساہتیہ کیندر دہرہ دون میں ۱۸ر جون ۱۹۹۴ء کو منعقد ہوا جس میں اسلام، ہندومت، جین مت، سکھ مت، عیسائیت، بودھ دھرم وغیرہ کے پیغام پر ان مذاہب کے علماء نے تقاریر کیں یا مضامین پیش کیے۔ اسلام کی نمائندگی کے لیے نثار احمد فاروقی کو (۱۵) منٹ کا وقت دیا گیا تھا انھوں نے حاضرین کی سطح ادراک کا لحاظ کرتے ہوئے اختصار کے ساتھ چند بنیادی باتوں پر روشنی ڈالی سامعین تمام تر غیر مسلم تھے۔ ان کی یہ مختصر سی تقریر بحمد اللہ سب سے زیادہ پسند کی گئی۔

اسلام دنیا کے بڑے مذہبوں میں سے ایک ہے۔ اس
اد کسی فلسفے پر نہیں بلکہ وحی الٰہی یعنی DIVINE
GUID پر ہے۔ انسان کا علم بھی محدود ہے، سمجھ بھی ناقص
اس لیے زندگی، کائنات اور حقیقت اعلیٰ ULTIMATE
TRU کو جاننے کے لیے انسان کا علم کافی نہیں ہو سکتا، اس
یے ضروری ہے کہ ہدایت اور رہنمائی خدا کی طرف سے ملے۔
ہدایت اللہ کے خاص بندوں کے ذریعے ہر زمانے میں
ر قوم کو ملتی رہی ہے۔ قرآن کہتا ہے: لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ

ہر قوم میں ہدایت دینے والا بھیجا گیا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں ان کو نبی اور رسول کہا جاتا ہے۔ نبی کا مفہوم ہے ان باتوں کی خبر دینے والا جنھیں ہم دیکھ نہیں رہے ہیں جیسے کوئی شخص ایک بلند ٹیلے پر کھڑا ہوا ٹیلے کے دونوں طرف ہونے والی باتوں کو دیکھ رہا ہو اس طرف کھڑے لوگوں کو دوسری طرف کی باتیں اپنی آنکھوں دیکھی بتا رہا ہو۔

رسول کے معنی ہیں قاصد، ایلچی، نامہ بندہ یا ہرکارہ۔ اللہ کی طرف سے اس کے احکام بندوں تک پہنچانے والے کو

رسول کہتے ہیں۔ اللہ کے اِن خاص بندوں میں سے صرف ۲۰۔ ۲۵ نبیوں اور رسولوں کے نام قرآن میں ملتے ہیں مگر خود قرآن کہتا ہے کہ کچھ رسولوں کا ہم نے ذکر کیا ہے اور کچھ کا ذکر نہیں کیا۔ حدیث کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے ہیں ہر قوم اور ہر ملک میں آئے ہیں ہندوستان بھی ایک بہت بڑا ملک ہے یہاں کی تہذیب بھی ہزاروں سال پرانی ہے، یہاں بھی یقیناً بہت سے نبی آئے ہوں گے۔ قرآن میں ایک پیغمبر کا نام ذوالکفل ملتا ہے اور ان کے بارے میں کہیں دوسری جگہ کچھ تفصیل معلوم نہیں ہوتی۔ بعض مسلمان علماء کا یہ خیال ہے کہ کفل دراصل کپل کی عربی شکل ہے ذوالکفل کے معنی ہیں کپل والا۔ مہاتما گوتم بدھ کپل وستو میں پیدا ہوئے تھے یہ ان کی طرف اشارہ ہے۔ کچھ عالموں نے سری کرشن جی مہاراج کو بھی نبی مانا ہے۔ لیکن یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہزاروں برس کے الٹ پھیر میں قصے کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں، انسان کا حافظہ بہت سی باتوں کو بھول جاتا ہے۔ بہت سی باتیں اپنی طرف سے بڑھا دیتا ہے، کچھ باتوں کو اس کی ناقص عقل سمجھ نہیں پاتی، اس لیے قصوں، کہانیوں اور دیومالا میں ان بزرگوں کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے اسے تاریخی سچائی سمجھنا غلط ہوگا۔

اسلام کے معنی ہیں امن، سلامتی، شانتی۔ سماج کا فساد سے، گڑبڑ اور بے ایمانی سے پاک صاف رہنا اسلام کا مقصد ہے۔ قرآن کریم نے بعض قوموں پر یہی الزام لگایا ہے کہ وہ اصلاح سدھار اور ترقی کے نام پر بگاڑ اور تباہی پیدا کر رہے ہیں۔ دور کیوں جائیے ہمارے زمانے میں دنیا بھر میں جو لاکھوں مہلک ہتھیار پھیل گئے ہیں یہ سب ترقی کے نام پر ہی تو ہوا ہے۔ اسلام کی ضد کفر اور شرک ہیں۔ ہمارے بہت سے بھائیوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ کافر یا مشرک کہنا گالی دینے کی برابر ہے، حالانکہ ان دونوں لفظوں میں گالی دینے یا حقیر سمجھنے کا کوئی اشارہ نہیں ہے شرک کے معنی ہیں شریک بنانا، جو کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ خدا کے ساتھ کوئی اور بھی اس کائنات کا چلانے والا، مارنے یا جلانے والا ہے اُسے مشرک کہا جائے گا، جس کے لیے انگریزی میں لفظ (POLY THEIST) ہے۔ کافر کے معنی ہیں انکار کرنے والا، چھپانے والا۔ پرانی آسمانی کتابوں میں پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کی بشارتیں لکھی ہوئی تھیں، جب آپ نے اپنی نبوت کا اعلان کیا تو کچھ فرقوں نے آدی گرنتھوں کی ان عبارتوں کو چھپانا یا بدلنا شروع کر دیا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا نبی ماننے سے انکار کیا، ان کے لیے عربی زبان میں لفظ کافر آتا ہے قرآن میں یہ لفظ صرف عرب قبیلوں کے (CONTEXT) میں استعمال ہوا ہے۔ انہی سے جہاد اور قتال کا حکم ہے۔ قتال کے معنی قتل کرنا نہیں ہیں بلکہ صرف جنگ یا (WAR) کے لیے آتا ہے۔ اس میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ اگر وہ تمہیں (یعنی عرب کے پہلے دور کے مسلمانوں کو) تمہارے گھروں سے نکال دیں یا فتنہ پیدا کریں تو ان سے جنگ کرو۔ اِس جنگ کا حکم ایسا ہی ہے جیسے سری کرشن جی مہاراج نے بھگوت گیتا میں یدھ اور کرما کا فلسفہ بتایا ہے۔ جنگی تاریخ کے ماہرین جانتے ہیں کہ اکثر حالات میں امن قائم کرنے کے لئے جنگ کرنا ضروری ہو جاتا ہے جیسے ایک سرجن بدن کا فاسد مادّہ دور کرنے کے لیے آپریشن کرتا ہے۔

اسلام خود کو کوئی نیا مذہب نہیں بتاتا۔ وہ دینِ فطرت ہے۔ اللہ نے انسانوں کے سماج میں پہلے دن سے نبی، رسول، ہدایت دینے والے اور سیدھا راستہ دکھانے والے بھیجے ہیں، جو پیغمبر بعد میں آئے ہیں انھوں نے اگلے پیغمبروں کی تصدیق کی ہے۔ بعض نبیوں کو صحائف آسمانی یعنی (DIVINE SCRIPTURES) دیئے گئے ہیں، ان میں سے بہت سے ضائع ہو گئے، بعض کی اصل نہیں ملتی ترجمے ملتے ہیں بعض کو بعد میں (REVISE) کیا گیا ہے۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ تم ایسی ایک سورۃ (یعنی کم از کم تین فقرے) لکھ کر دکھا دو، اور اپنے گواہوں کو

لو کر دہی یہ فیصلہ کر دیں تمہاری لکھی ہوئی عبارت قرآن
مقابلہ کر رہی ہے یا نہیں۔ یہ دعویٰ اُس عرب سماج میں
یا گیا جس کی فصاحت، بلاغت، زبان و بیان پر قدرت
و آج بھی تسلیم کیا جاتا ہے، عرب اپنے سوا دنیا کی ساری قوموں
و عجم یعنی گونگا یا بے زبان سمجھتے ہیں۔ مگر قرآن کے اس چیلنج
کو کوئی قبول نہ کر سکا کہ اس جیسے تین چار فقرے لکھ دیتا
پھر اللہ نے قرآن میں یہ بھی اعلان کیا کہ اسے ہم نے اُتارا ہے
ور ہم خود اس کی حفاظت کریں گے۔ چنانچہ ہر زمانے میں
سلم سماج میں ہزاروں لاکھوں ایسے انسان رہے ہیں جنہیں
شروع سے آخر تک پورا قرآن زبانی یاد ہوتا ہے اور
ہر سال مسجدوں میں رمضان کے مہینے میں پورا قرآن سنایا
جاتا ہے۔

ایک بات اور بھی حیرت میں ڈالنے والی ہے،
جو لوگ عربی زبان جانتے ہوں وہ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں
کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زبان سے نکلے ہوئے
ایک ایک لفظ کو محفوظ رکھا گیا ہے اور ان سے سیکڑوں کتابیں
بن گئی ہیں۔ آپ کے ارشادات کو "حدیث" کہا جاتا ہے
اور حدیث کی روایت کو ایک نسل سے دوسری نسل کی
طرف ساڑھے پانچ لاکھ راویوں یعنی (TRANSMITTERS)
نے پہنچایا ہے اور ان ساڑھے پانچ لاکھ راویوں کے حالات
زندگی یعنی BIOGRAPHICAL NOTIES بھی جمع
کیے گئے ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ ان میں کون سچا تھا کون
جھوٹا تھا۔ مگر جتنی حدیثیں روایت ہوئی ہیں ان کا اسٹائل
اور DICTION قرآن سے بالکل مختلف ہے۔ اگر قرآن
حضرت محمد کا لکھا ہوا ہوتا تو اس کے اور حدیث کے
STYLE میں کہیں کہیں تو یکسانی ضرور پائی جاتی،
مگر ایسا نہیں ہے۔ قرآن (۲۳) برسوں میں نازل ہوا
اور کبھی لمبے عرصے تک کوئی وحی نہیں آتی تھی، وحی
کے نہ آنے کا طویل ترین وقفہ لوگوں نے تین برس بتایا
گیا ہے اس مدت میں آپ نے کبھی وحی کے آنے کا دعویٰ
نہیں کیا بلکہ نہایت بے چینی سے اس کا انتظار کرتے رہے۔

قرآن نے صاف لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ "اے
محمد لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میں تمہارے جیسا ہی ایک انسان
ہوں، بس اتنا فرق ہے کہ میرے پاس اللہ کا پیغام (وحی)
آتا ہے۔" آپ نے کسی طرح کی DIVINITY کا دعویٰ
نہیں کیا۔ عام انسانوں کی طرح رہے۔ مخالف ہنسی بھی
اڑاتے تھے کہ یہ کیسے پیغمبر ہیں جو بازار میں چلتے پھرتے ہیں
آپ نے دعا مانگی تو یہ کہ "اے اللہ مجھے مسکین یعنی DESTITUTE
بنا کر زندہ رکھیو، مسکینی کی حالت میں ہی موت دیجیو اور
قیامت کے دن مجھے مسکینوں اور فقیروں کے ساتھ ہی اٹھائیو۔"

اسلام میں داخل ہونے کے لئے کوئی خاص رسم نہیں
ہے بس زبان سے کلمہ پڑھنا ہوتا ہے اور دل سے اس کو ماننا
ہوتا ہے۔ کلمہ یہ ہے کہ اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد
ان محمدا عبدہ ورسولہ یعنی میں گواہی دیتا ہوں
کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور یہ بھی
گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد اللہ کے بندے اور اس کے
رسول ہیں۔

یہ تو بنیادی کلمہ ہے، ایک دوسرا کلمہ بھی ہے جسے
ایمان مفصل کہا جاتا ہے۔ وہ یوں ہے کہ "میں ایمان لاتا ہوں
اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر، اور اس کی کتابوں پر،
اور اس کے رسولوں پر، اور اس پر ایمان لاتا ہوں کہ نیکی
اور بدی یعنی اچھی بری ہر بات پر قدرت اللہ ہی کو ہے
اور مرنے کے بعد حساب کتاب کے لیے اٹھائے جانے پر ایمان
لاتا ہوں۔"

اس کلمے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا ایمان انجیل و تورات
پر بھی ہے اور حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام اور حضرت
موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر بھی ہے۔ اگر کوئی حضرت عیسیٰ
یا حضرت موسیٰ کو نہ مانے تو وہ مسلمان نہیں رہے گا،
اگرچہ عیسائی اور یہودی حضرت محمد کو نہ مان کر عیسائی اور
یہودی رہتے ہیں۔ اللہ کے فرشتوں اور اللہ کی بھیجی ہوئی
کتابوں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ ہمیں ان سب مذہبی
کتابوں کا احترام کرنا چاہیے جنہیں کوئی قوم اپنی مقدس

کتاب کہتی ہے۔

اسلام کا کہنا ہے کہ انسان کا فطری عقیدہ "توحید" ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ اس میں تبدیلی ہوتی رہی ہے جیسے زردشتیوں نے دنیا میں نیکی اور بدی کی جنگ دیکھی تو یہ سمجھ لیا کہ اچھائی یعنی خیر کا خدا یزداں ہے اور برائی یعنی شر کا خدا اہرمن ہے دونوں میں ازل سے جنگ ہو رہی ہے کبھی یہ غالب آجاتا ہے کبھی وہ۔ کسی فرقے نے کائنات کے مظاہر یعنی PHENOMENA کو اصل سمجھ لیا اور ان کی پوجا کرنے لگے۔ کسی نے یہ غور کیا کہ مادہ بھی لازوال ہے یہ فنا نہیں ہوتا روپ بدل لیتا ہے، اسی طرح روح بھی ازلی وابدی ہے وہ ایک بدن سے دوسرے بدن میں سفر کرتی رہتی ہے، کسی نے سوچا کہ انسان جو دکھ درد میں مبتلا ہوتا ہے اس کا سبب خواہش نفس ہے، خواہشوں کو ختم کر دو، نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ اللہ ایک ہے۔ "اللہ" کے لفظ پر بھی غور کر لیجئے۔ عربی زبان میں COMMON DEITY کو الٰہ کہتے ہیں اور کسی PROPER NOUN کو بنانے کے لئے الف لام DEFINITE ARTICLE کے طور پر آتا ہے الٰہ پر الف لام آیا تو وہ اللہ ہو گیا۔ GOD کے ساتھ تو THE نہیں آتا، مگر یہاں آپ THE GOD سمجھ لیجیے۔ یعنی وہی ایک پوجا کا پاتر ہے، انادی ہے، اننت ہے، نرگن ہے، نراکار ہے نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، نہ اس سے کوئی پیدا ہوا، وہ کسی جگہ میں بھی بند نہیں ہے ورنہ محدود ہو جائے گا، اس کی کوئی سمت یا DIRECTION بھی نہیں ہے وہ ہر جگہ ہے، ہر چیز کا خالق ہے، پالن ہار ہے، سب کو دیکھتا ہے، سب کی سنتا ہے، مگر اس کا دیکھنا آنکھ کے وسیلے کا محتاج نہیں، اس کے سننے کو کانوں کا واسطہ درکار نہیں، وہ نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے نہ سوتا ہے، نہ تھکتا ہے، اس کی کوئی شکل نہیں کوئی صورت نہیں کوئی مورتی نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ زمین اور آسمانوں کا نور ہے۔ صوفیہ جب مراقبہ (MEDITATION) کرتے ہیں تو ایک منزل ذات بحت یعنی PURE AND ULTIMATE BEING کا دھیان کرنے کی آتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس مرحلے میں کچھ نہیں سوجھتا، سیاہی اور تاریکی نظر آتی ہے جدید سائنس بھی یہ کہتی ہے کہ نور یا LIGHT جب بہت زیادہ ہو جائے تو سیاہ ہو جاتی ہے۔

اللہ غنی ہے ہم سب فقیر ہیں۔ غنی اس کو کہیں گے جو ان چیزوں کی احتیاج بھی نہ رکھتا ہو جو اس کے پاس ہیں، فقیر وہ ہے کہ جو وہ نہیں رکھتا اس کا محتاج ہے۔ زندگی اور موت کا دینے والا بھی اللہ ہے، وہی ہے جو ایک حقیر سے بیج کو تناور درخت بنا دیتا ہے وہی ہے جس نے زمین کی مٹی میں اتنی طاقت بھر دی ہے کہ لاکھوں برس سے وہ پیداوار دے رہی ہے بلکہ اب تو پہلے سے بھی زیادہ دے رہی ہے۔ اللہ ہی ہے جس نے اربوں کھربوں ستاروں کو ایک دوسرے سے ایسا باندھ دیا ہے اور اتنے فاصلے پر رکھا ہے کہ وہ آپس میں نہ ٹکرائیں۔ وہی ہے جو بادل بھیجتا ہے پانی برساتا ہے، ہوا چلاتا ہے، اسی نے یہ کائنات اپنے ایک اشارے سے پیدا کی ہے اور اسی کے حکم سے ایک دن یہ فنا ہو جائے گی۔ انسان کو اللہ نے زمین پر اپنا خلیفہ VICEROY بنا کر بھیجا ہے، اُسے کچھ اختیارات دیئے ہیں کچھ باتوں میں مجبور رکھا ہے، تقدیر ضرور لکھی ہے مگر تدبیر کو بھی اثر سے خالی نہیں چھوڑا ہے۔ انسان کی عظمت کا جیسا تصور اسلام میں ہے شاید ہی اور کہیں مل سکے۔ اللہ کہتا ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین نقشے پر پیدا کیا ہے، دوسری جگہ کہتا ہے کہ ہم نے انسان کے پتلے میں اپنی روح پھونکی ہے، فرشتوں کو حکم دیا کہ انسان کے آگے سر جھکائیں۔ جس نے یہ حکم نہ مانا اُسے شیطان قرار دے کر نکال دیا گیا۔

لیکن انسان کی اس عظمت کے ساتھ ایک اور آزمائش بھی ہے۔ اسلام آخرت پر زور دیتا ہے،

یعنی اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی بھی ہے، سب انسان دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور انھیں اس دنیا کی زندگی کے ایک ایک چھن کا حساب دینا ہوگا، جو کچھ انھوں نے یہاں کیا تھا وہ سب REPLAY کرکے دکھایا جائے گا، خود انسان کے ہاتھ، پانو، وغیرہ گواہی دیں گے جس نے ذرّہ بھر نیکی کی ہوگی اس کا بدلہ پائے گا، جس نے ذرّہ بھر بدی یا شرارت کی ہوگی اس کی سزا پائے گا۔ یہ امتحان فرشتوں کا نہیں ہوگا، وہ لذّت گناہ سے واقف ہی نہیں، حیوانوں کا بھی نہیں ہوگا انھیں عقل نہیں دی گئی، انسانوں کا حساب کتاب ہوگا اس لیے کہ انسان کو کسی قدر اختیار بھی دیا ہے، عقل بھی، وہ نیکی اور بدی کا علم بھی رکھتا ہے، جسمانی خواہشات بھی۔ اُسے اس زندگی میں توازن کے ساتھ ایسے گذرنا ہوتا ہے جیسے نٹ رسّی پر چلتا ہے۔

اسلام کا ایک اور وصف اخوت و مساوات کا نظریہ ہے۔ اسلام میں کوئی اپنی قومیت یا نسب، یا علم، یا دولت یا عہدے کے اعتبار سے بڑا چھوٹا نہیں ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے اُسے دوسروں پر فضیلت حاصل ہے اور کسی کو نہیں۔ بادشاہ وقت بھی مسجد میں جاکر اپنے دربان کے ساتھ صف میں کھڑے ہوکر نماز پڑھے گا۔ کسی انسان کا جھوٹا ناپاک نہیں، کوئی پیشہ حقیر نہیں، ہمارے سال بھر کے خرچ سے بچے ہوئے مال پر ۲½ فی صد زکاۃ ہے جسے فقیروں اور مسکینوں کا "حق" بتایا گیا ہے عورتوں کو جتنے حقوق اسلام نے دیئے ہیں اتنے اُس زمانے میں کسی مذہب اور کسی تہذیب میں عورت کو حاصل نہیں تھے۔ طلاق کو انتہائی دشوار بنانے کے لیے انتہائی آسان کیا گیا ہے۔ اسلامی شریعت کے جو قانون قرآن کی روشنی میں بنے ہیں ان میں کوئی تبدیلی کرنے کا کسی کو بھی اختیار نہیں البتہ دوسرے قوانین میں حالات اور زمانے کی رعایت سے اور علماء کے اتفاق سے

اسلام کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانوں کے معاملات آپس میں اچھے ہوں، اور ہر انسان کا تعلق اپنے خالق اور پالن ہار سے مضبوط ہو اور اخلاص کے آدھار پر ہو۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

خواجہ حسن ثانی نظامی

خواجہ خواجگان، حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ ہندوستان میں بھیجے ہوئے آئے تھے۔ وہ نائب رسولؐ اور عطائے رسولؐ ہیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روحانی اشارے اور حکم پر انھوں نے ہماری اس دھرتی کے بھاگ جگائے۔ لیکن ان کے جانشین حضرت خواجہ قطب صاحبؒ کا دم قدم، ہم دلی والوں کی محبت اور عقیدت کا ثمرہ ہے۔ ان خواجہؒ کو ہم نے یہاں روکا ہے۔ ان کا دامن اپنے کمزور ہاتھوں سے ہم نے تھاما تھا۔ ورنہ وہ تو یہاں سے سدھار چلے تھے۔ پیران کو کوچ کا حکم دے چکے تھے عجیب واقعہ ہوا تھا وہ بھی!

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ دہلی تشریف لائے تو سرکاری درباری مولوی شیخ نجم الدین صغریٰ سے بھی ملنے گئے۔ جو ان دنوں شیخ الاسلام کے عہدے پر براجمان اور حضرت خواجہؒ کے پرانے ملاقاتی تھے شیخ الاسلام صاحب اپنے مکان کے پاس کھڑے چبوترہ بنوا رہے تھے۔ حضرت خواجہؒ کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ خواجہؒ نے فرمایا۔ کیوں صاحب! شیخ الاسلامی کے منصب نے آپ کو اس قدر دماغ دار بنا دیا ہے؟ شیخ بولے۔ نہیں حضور! میں تو ویسا ہی عقیدت مند اور مخلص ہوں جیسا پہلے تھا لیکن آپ ... خواجہ بختیار کو ... [illegible]

کی دیوانی بنی ہوئی ہے۔ مجھ غریب کو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔

خواجہ اس دلچسپ گلے پر مسکرائے اور کہا مولانا! آپ گھبرائیں نہیں۔ اپنے بختیار کو ہم اجمیر ساتھ لے جائیں گے اور پھر خواجہ قطب سے فرمایا بابا بختیار! تم یکایک اتنے مقبول ہو گئے ہو کہ لوگوں کو شکایت ہونے لگی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمہاری وجہ سے کسی ایک آدمی کا دل بھی میلا ہو چلو ہمارے ساتھ اجمیر چلو۔ تم بیٹھنا، ہم کھڑے رہیں گے!

خواجہ صاحب سناٹے کے عالم میں بولے، حضور یہ کیا فرماتے ہیں۔ مخدوم کے سامنے بیٹھنا تو کیسا میں تو کھڑے رہنے کی جرأت بھی اپنے اندر نہیں پاتا۔ حکم کی تعمیل میں یہاں تھا۔ حکم کی تعمیل میں اجمیر چلوں گا! — اور واقعی یہ دونوں بزرگ دلی چھوڑ اجمیر کے لئے چل پڑے!

ہم دلی والے ہزار نالائق سہی مگر اس وقت ہماری عقیدت کام دکھا گئی۔ آگے آگے یہ پیر اور مرید تھے اور پیچھے پیچھے دلی کی خلقت۔ روتی دھوتی، نالہ و فریاد کرتی۔ پیر پڑتی اور کہتی کہ اے حضرت خواجہ! آپ ہمارے بابا قطب کو کہاں لے جاتے ہیں؟ ہم بھلا یہاں کس کے سہارے رہا کریں گے؟ —— جہاں جہاں خواجگانؒ

...مٹی تبرک کے طور پر اٹھا لیتے!

خواجۂ خواجگانؒ نے یہ رنگ دیکھا تو ذرا تھم گئے اور ...ر پلٹ کر چہیتے مرید کو دلّی ہی میں ٹھہرنے کا حکم دیا اور فرمایا ...رہ جاؤ! یہ شہر تم کو سونپا۔ خلقت تمہاری جدائی سے بے چین ...رہے قرار ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ایک دل کی خاطر اتنے ...مارے دل خراب اور کباب ہوں! چنانچہ حضرت خواجہ ...طب صاحبؒ دلّی میں ٹھہر گئے اور اس وقت سے آج تک ...شہر اور یہ ملک ان کی پناہ میں ہے۔

حضرت امیر خورد کرمانیؒ نے سیر الاولیاء ...ں حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ کی کرامات بیان کرتے ...وئے لکھا ہے کہ اس سے بڑھ کر بزرگی اور کرامت اور ...یا ہو سکتی ہے کہ جو بھی حضرت خواجہؒ کا مرید ہوا اس نے ...لقت کی دستگیری کی، دنیاوی غرور کو ترک کیا اور آخرت ...د اپنی منزل اور اپنا مقصد ٹھہرایا!

دستگیری، ترک غرور، آخرت کا خیال۔ خواجہؒ ...کے عام مریدوں کی صفات تھیں۔ خواجہ قطب صاحبؒ تو ...ام نہیں، خاص، بلکہ خاص الخاص مرید تھے۔ خلافت پر ...ائز، جانشینی سے سرفراز! اور ایسے لاڈلے، ایسے چہیتے ...ہ پیر و مرشد پیار سے خود اس مرید کی خدمت بجا لانا چاہتے ...تھے۔ یہاں تو رنگت اور خوشبو اور بہار ساری کی ساری ...ہی تھی جو خود اجمیری خواجہؒ کی تھی اور جس کو وہ خاص مکّے ...مدینے کی سوغات بنا کر لائے تھے۔ رحمت عالم کی سوغات ...مد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سوغات۔ جس سوغات ...ا تذکرہ آسان بھی ہے، مشکل بھی۔ آسان یوں کہ ہر شخص ...س بھر اپنی جھولی اس سے بھر سکتا ہے۔ اور مشکل یوں کہ ...ماری جھولیوں میں بھی اس کی سمائی نہیں ہو سکتی اس لکھ ...لٹ داتا نے دیس بدیس، اپنے پرائے، سب کو بھر بھر ...ٹھی دیا اور وہی دیا جس کی لینے والے کو ضرورت تھی ...ر جگہ طلب گاروں کی بصارت اور بصیرت کے مطابق ہی ...روپ دکھایا گیا۔ چنانچہ جو جلوہ خواجہؒ لے کر آئے تھے۔

اس کو ہندوستانی آنکھ دیکھ سکتی تھی۔ ان کی مدھر بانی ہندوستانی کانوں میں رس گھولتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے یہ بات سنی سنی سی ہو۔ ان کا پیغام نیا اور اچھوتا ضرور تھا۔ لیکن اس میں اجنبیت کے بجائے آشنائی تھی اندر سے کوئی کہتا تھا کہ یہ سب کچھ تو ایک دفعہ پہلے بھی کان میں پڑ چکا ہے۔ توحید اور ایک خدا کی پرستش چاہے عمل میں نہ رہی ہو لیکن جو خون رگوں میں دوڑتا تھا اور بزرگوں سے ورثے میں ملا تھا وہ کبھی توحید کا کلمہ پڑھ چکا تھا۔ ایکو برہم دیتیو ناستی کا ذوق بالکل فنا نہیں ہوا تھا۔ خواجہؒ نے بدعملی کے پھوڑے پر نشتر لگایا اور اندرونی ذوق کو خون میں سے ابھار کر باہر لائے۔

ہمارے حضرت سلطان جی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے پاس ان کا کوئی مرید اپنے کسی ہندو دوست کو اس غرض سے لایا تھا کہ حضرت وعظ فرمائیں اور یہ دوست مسلمان ہو جائے۔ مگر حضرت سلطان جی صاحبؒ نے وعظ فرمانے کی بجائے آنکھوں میں آنسو بھر کر اس مرید سے کہا کہ میاں! اس قوم پر وعظ و تقریر کا اثر نہیں ہوتا اس کو تو کسی مرد مومن کی صحبت میں رکھو۔ اپنے آپ مسلمان ہو جائے گا!

ہندوستان میں کتھائیں ضرور بکھانی جاتی تھیں اور بکھانی جاتی ہیں۔ لیکن ہمارے حضرت سلطان جی کے بقول یہ ملک بنیادی طور پر وعظ و تقریر کا ملک نہیں ہے۔ یہاں ہمیشہ تقریر سے زیادہ تاثیر پر زور دیا گیا۔ یہ مون برت کا دیس ہے۔ خاموشی، گیان دھیان تپ اور تیاگ، اندر کے تیج کی طرف ہی بھارت واسیوں کے دل جھکتے اور راغب ہوتے ہیں۔ یہاں واعظ گھر گھر اور منبر منبر نہیں پھرتا۔ حق کے متلاشی خود کسی گیانی دھیانی تیاگی کی آہٹ لینے کو گھومتے ہیں۔ چشتی بزرگوں میں ہندوستانیوں کے اس ذوق کی تسکین کا سامان سب سے زیادہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی ذات والا صفات میں ملتا ہے۔ حضرت ہمیشہ شغل

"لی مع اللہ" میں محو رہتے تھے۔ گفتگو بہت کم فرماتے۔ اکثر استغراق کا عالم طاری رہتا۔ ملنے والے آتے، خاموش کچھ دیر حضرت کے پاس بیٹھتے اور سرد دلوں میں اس طرح گرمی پیدا ہوتی جیسے جاڑوں میں دہکتے الاؤ کے اطراف ٹھنڈے پالا جسم گرماتے ہیں۔ پیاسوں کے لئے پانی کے کوزے بھرے رکھے رہتے تھے۔ عالم تحیر سے باہر آکر حضرت ان کی طرف اشارہ فرماتے، حاضرین سے معذرت کرتے اور پھر یاد الٰہی میں محو ہو جاتے۔ یہ محویت اس قدر گہری ہوتی تھی کہ حضرت کے فرزند کا انتقال ہو گیا۔ گھر میں سے بیوی کے رونے کی آواز آئی تو حضرت چونکے اور کہا افسوس ہم نے اپنے بچے کی صحت کی اور زندگی کی دعا نہ مانگی۔ اگر مانگتے تو اللہ تعالےٰ ضرور قبول فرماتا!

حضرت کی رحلت بھی عالم تحیر میں ہوئی۔ حضرت شیخ علیؒ کی خانقاہ میں محفل سماع برپا تھی۔ احمد جامؒ کا مشہور شعر

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

پڑھا جا رہا تھا۔ خنجر تسلیم کے کشتگان کے لئے ہر زمانے میں ایک نئی زندگی غیب سے ہوتی ہے۔ حضرت پر حالت طاری ہوئی۔ وہاں سے گھر آئے تو متحیر اور مدہوش تھے۔ قوالوں کو یہی شعر پڑھنے کا حکم ہوا۔ قوال گاتے رہے اور حضرت مدہوش رہے۔ صرف نماز کے وقت ہوشیار ہو کر نماز ادا فرمالیتے اور پھر حال طاری ہو جاتا۔ پانچویں رات کو وصال فرمایا۔

نماز کے وقت ہوشیار ہو جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کی بے خودی غیر اختیاری نہیں تھی بلکہ یاد الٰہی، مراقبہ و مشاہدے کی وجہ سے حضرت کسی اور طرف التفات نہ فرماتے تھے۔ ورنہ ظاہری حیات تو ظاہری حیات تھی۔ دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد بھی یہ عالم ہے کہ ایک دفعہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ مزار مبارک پر حاضر ہوئے تو دل میں خطرہ گزرا کہ آتی خلقت حضرت کے پاس آتی ہے۔ خدا معلوم ہم لوگوں کی حاضری کی حضرت کو خبر بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ فوراً قبر شریف سے آواز آئی۔

مرا زندہ پندار چوں خویشتن
من آیم بجاں گر تو آئی بہ تن

ہم کو اپنی طرح زندہ سمجھو۔ تم جسم کے ساتھ آتے ہو تو ہم جان کے ساتھ آتے ہیں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ روایت فرماتے ہیں کہ خواجہ قطب صاحب ایسے شب بیدار تھے کہ حضرت نے کہیں بستر نہیں بچھایا۔ ابتدا میں تو نیند کے غلبے میں کبھی کبھی تھوڑا سا سو لیتے تھے۔ لیکن آخر میں اسے بھی ترک کر دیا۔ فرماتے تھے کہ اگر کبھی سو جاتا ہوں تو کوئی نہ کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے۔

ایک طرف یاد الٰہی میں یہ انہماک تھا۔ دوسری طرف مریدوں کی تعلیم و تربیت ایسی خاموشی اور چابکدستی سے ہوتی تھی کہ سبحان اللہ۔ ملتان کی ایک مسجد میں انھوں نے کسی طالب علم کو کتاب نافع کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا۔ اور نگاہ پڑتے ہی ماہر جوہری کی طرح اس آبدار موتی کو پرکھ لیا۔ پاس آکر بولے کیوں میاں یہ کتاب تم کو کچھ نفع دے گی؟ طالب علم نے جو بعد میں شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے نام نامی سے مشہور ہوئے فوراً قدموں میں سر رکھ کر کہا جی نہیں مجھے تو آپ کی سعادت بخش کیمیا سے فائدہ پہنچے گا۔ قطب صاحبؒ بابا صاحبؒ کو ملتان سے دہلی لے آئے مرید کیا اور مجاہدے کرانے شروع کئے۔ اس درجے کہ خود پیر حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ کو کہنا پڑا کہ بختیار نوجوان کو کب تک تپاؤگے؟ قطب صاحبؒ بابا صاحب سے پے درپے روزے رکھواتے۔ مگر چلہ کرنے سے منع کرتے اور کہتے کہ اس سے شہرت ہوتی ہے۔ ہمارے خواجگان کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ ایک دفعہ حضرت بابا صاحبؒ نے تعویذ کی اجازت مانگی اور عرض کی کہ لوگ مجھ سے تعویذ

گتے ہیں۔ آپ کا کیا حکم ہے۔ فرمان ہوا کہ میاں! کام نہ تمہارے
تھ میں ہے نہ میرے ہاتھ میں۔ تعویذ خدا کا نام ہے۔ لکھو
ر دو!

بات بظاہر معمولی سی نظر آتی ہے کہ تعویذ کی اجازت
لب کی گئی اور وہ مل گئی۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ
ن تین فقروں میں کہ "کام نہ تمہارے ہاتھ میں ہے نہ
یرے ہاتھ میں۔ تعویذ خدا کا نام ہے۔ لکھو اور دو!"
کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا۔ کوزے کو دریا میں بند کرنے
کی روایت بہت پرانی ہے۔ لیکن تعلیم و تربیت میں
تنے کم الفاظ سے اتنا زیادہ کام لے لینا بھی صرف حضرت
خواجہ قطب صاحبؒ ہی کے ہاں نظر آئے گا۔ حضرت
ریدوں کے احوال پر برابر نظر رکھتے تھے۔ اور جب
ضرورت ہوتی ایک آدھ فقرہ فرما دیا کرتے۔ ایک دفعہ
حضرت بابا صاحبؒ اجودھن میں تھے کہ حضرت شیخ
جلال الدین تبریزیؒ وہاں تشریف لے گئے اور ایک
انار نکال کر رکھا۔ بابا صاحب روزے سے تھے۔ انار
وڑ کر مہمان کو کھلا دیا۔ ایک دانہ گرا پڑا رہ گیا تھا۔
س کو پگڑی میں بطور ایک بزرگ کے تبرک کے باندھ کر
کھ لیا اور شام کو اس سے افطار کیا تو دل میں بڑی
صفائی محسوس کی اور افسوس کیا کہ ایک دانے سے
زیادہ کیوں نہ رکھا۔ کچھ عرصے بعد دہلی آئے تو خواجہ
قطب صاحبؒ نے فرمایا کہ مولانا فریدالدینؒ! اتنے کیوں
کڑھتے ہو؟ پورا انار بھی کھا لیتے تو کیا ہوتا۔ ہر انار
میں ایک دانہ ہی تو کام کا ہوتا ہے سو وہ تمہاری قسمت
میں تھا اور مل گیا۔

حضرت خواجہ قطب صاحبؒ وسط ایشیا کے مقام
اوش کے رہنے والے تھے۔ چھوٹے سے تھے کہ والد ماجد کا سایہ
سر سے اٹھ گیا۔ دوسرے بڑے آدمیوں کی طرح حضرت
کی تعلیم و تربیت بھی ان کی والدۂ ماجدہ نے فرمائی۔ ہونہار
بروا کے چکنے چکنے پات۔ بچپن میں خود والدہ سے فرمائش

کی کہ میں قرآن مجید پڑھنا چاہتا ہوں۔ پڑوس میں ایک
حافظ جی رہتے تھے۔ والدہ نے تختی اور شیرینی لے کر
خادمہ کے ساتھ ان کے پاس بھجوا دیا۔ مگر قدرت کو
کچھ اور منظور تھا۔ گھر سے نکلے ہی تھے کہ ایک بزرگ
سامنے آئے ان کو حافظ جی کے بجائے حضرت ابوحفصؒ
کے پاس لے گئے اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ صاحبزادے کو
قرآن شریف پڑھائیے۔ حضرت ابوحفصؒ نے قطب صاحبؒ
سے پوچھا کہ یہ جو بزرگ تم کو لے کر آئے تھے۔ انہیں
جانتے ہو؟ قطب صاحبؒ نے جواب دیا کہ نہیں مجھے تو یہ
راستے میں ملے تھے۔ اور حافظ جی کے بجائے آپ کے پاس
لے آئے۔ حضرت ابوحفصؒ نے کہا کہ یہ خواجہ خضر علیہ الصلوٰۃ
والسلام تھے! غرضیکہ حضرت نے ناظرہ قرآن مجید حضرت
ابوحفصؒ سے پڑھا اور اس کے تیس سال بعد آخر عمر میں
قرآن مجید حفظ فرمایا۔

کہا جاتا ہے حضرت قطب صاحبؒ، اجمیری خواجہؒ
کے سایہ عاطفت میں رجب ۵۲۲ھ میں آئے تھے۔
اور بمقام بغداد مسجد امام ابواللیث ثمرقندیؒ میں مرید
ہوئے تھے۔ اس بیعت کے وقت بزرگان دین کا بڑا
یادگار مجمع تھا۔ سیر الاولیاء کے مصنف نے حضرت
شیخ شہاب الدین سہروردیؒ حضرت شیخ اوحد کرمانیؒ
حضرت شیخ برہان الدین چشتیؒ اور حضرت شیخ محمد
صفاہانیؒ جیسے بزرگوں کے نام گنائے ہیں۔

حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ نے ہندوستان
تشریف لانے کے بعد اجمیر کو اپنا مرکز قرار دیا
تھا۔ اور دہلی جیسے اہم مقام کو حضرت خواجہ قطب
صاحبؒ کے حوالے کر دیا تھا۔ دہلی کے غلام سلاطین
خاص کر سلطان شمس الدین التمشؒ حضرت قطب
صاحبؒ سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ التمش کے
بارے میں تو یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ نہ صرف حضرت
سے بیعت تھا بلکہ اس نے خلافت بھی حاصل کی تھی۔ وہ کبھی
آسمان کو بے وضو نہیں دیکھتا تھا۔ اور رات کو تہجد

کے لئے اٹھتا تو اپنے کسی ملازم اور غلام کو نہ جگاتا اور خود
ہی اٹھ کر وضو کر لیتا۔ ارادت اور خلافت کی اس روایت
کے باوجود حضرت خواجہ صاحبؒ کے سوانح حیات دیکھنے
سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اپنے شیوخ کی سنت کے مطابق
دربار میں جانا اور بادشاہ سے ملنا پسند نہیں فرماتے
تھے۔ صرف ایک دفعہ آپ کے بادشاہ کے پاس جانے
کا ذکر ملتا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ ان کے پیر و مرشد
حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ کے صاحبزادوں کی زمین
حاکم اجمیر نے ضبط کر لی تھی۔ اس کی بحالی کے لئے حضرت
التمتش کے پاس تشریف لے گئے۔ بادشاہ کو حضرت
کی تشریف آوری کی خبر ہوئی تو ننگے پیر دوڑتا ہوا
باہر آیا اور بڑے اعزاز سے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔
اس وقت اتفاق سے اودھ کا حاکم رکن الدین حلوائی
بھی موجود تھا۔ ناواقفیت کی وجہ سے وہ حضرت
خواجہ قطب صاحبؒ سے اونچی جگہ بیٹھ گیا۔ بادشاہ کو
یہ چیز ناگوار ہوئی تو حضرت خواجہ قطب صاحبؒ نے
فرمایا کہ آپ ناراض نہ ہوں۔ ان کے نام کے ساتھ حلوائی
لکھا جاتا ہے اور میرے نام کے ساتھ کاکی۔ اور حلوا کاک
کے اوپر ہی رکھ کر کھایا جاتا ہے اس لئے حلوائی کاکی سے
اونچی جگہ بیٹھ گیا تو کیا مضائقہ ہے۔ اس ملاقات میں
بادشاہ نے حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ کے فرزندان
کی زمین کی واپسی کا فرمان لکھا اور نذر بھی گذرانی۔

کاک ایک قسم کی چھوٹی سی گول روٹی بسکٹ
کی طرح ہوتی ہے جس کے کنارے ابھرے ہوئے ہوتے
ہیں۔ حضرت قطب صاحب کے عرس میں آج بھی یہ روٹی
تبرکاً تقسیم کی جاتی ہے۔ فقر و فاقے کی زندگی میں اسی
طرح کی روٹی حضرت کو غیب سے ملا کرتی تھی۔ اس لئے
حضرت کی شہرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے لقب
سے ہو گئی۔

موجودہ درگاہ کے مقام کو حضرت نے اپنے
مدفن کے لئے خود پسند فرمایا تھا۔ اپنی ظاہری حیات
میں ایک دفعہ حضرت عید کی نماز پڑھنے کے بعد گھر
تشریف لے جا رہے تھے۔ جب اس مقام پر پہونچے
جہاں آجکل حضرت کا مزار ہے تو یکایک کھڑے ہو گئے
اور بہت دیر کھڑے رہے۔ انتظار کرنے کے بعد لوگوں
نے عرض کی کہ آج عید کا دن ہے اور گھر پر ملنے والے منتظر
ہوں گے حضور گھر تشریف لے چلیں اس وقت حضرت
استغراق سے باہر آئے اور فرمایا کہ اس جگہ سے دلوں کی
خوشبو آتی ہے۔ یہ زمین کس کی ہے۔ مالک کا نام پتہ دریافت
کر کے حضرت نے اس زمین کو خرید لیا اور اپنے مدفن کے لئے
مختص فرما دیا۔

۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ کو حضرت نے وصال فرمایا
تھا۔ وصال کے وقت ان کے ہونے والے جانشین حضرت
بابا فرید الدین گنج شکرؒ دہلی میں تشریف نہیں رکھتے تھے۔
ہانسی میں تھے۔ خواب میں دیکھا کہ پیر و مرشد یاد فرماتے
ہیں۔ دہلی پہنچے تو حضور قطبؒ صاحب کا وصال ہو چکا
تھا۔ بابا صاحبؒ نے اپنے سر مبارک پر مٹی کی ٹوکریاں
لا لا کر مزار مبارک پر ڈالیں اور ان کو ہموار نہیں کیا یوں
ہی اونچا نیچا رہنے دیا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس میں کیا
مصلحت تھی۔ اس وقت سے آج تک حضرت کا مزار اسی
شکل میں ہے۔ اور اتنا بڑا ہے کہ دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ
شائد اس جگہ کئی مزار ہوں گے۔ ممکن ہے حضرت کا اپنی
ظاہری حیات میں یہ فرمانا کہ یہاں سے دلوں کی خوشبو آتی ہے۔
اور بابا صاحبؒ کا اصل مزار اور اس کے اطراف مٹی ڈالنا
اسی وجہ سے ہو کہ اس جگہ اللہ کا کوئی اور محبوب بندہ
پہلے سے آرام فرما ہو۔ حضرت سلطان المشائخؒ فرمایا کرتے
تھے کہ جب حضور قطب صاحبؒ نے یہ کہا ہے کہ یہاں
سے دلوں کی خوشبو آتی ہے تو اندازہ کرو کہ وہاں کیسے کیسے بزرگ
آرام فرما ہیں۔ حضرت خواجہ قطب صاحبؒ اور حضرت
قاضی حمید الدین صاحبؒ کے مزار کے درمیان جو جگہ ہے
اس مقام پر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نماز پڑھا
کرتے تھے اور ارشاد ہوتا کہ اس جگہ بڑی راحت ہے

یونکہ دونوں طرف بادشاہ لیٹے ہوئے ہیں۔
قدیم تذکروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت
واجہ قطب صاحبؒ نے ایک سے زیادہ نکاح فرمائے
تھے۔ ایک اہلیہ محترمہ اور ان کے صاحبزادے کا ذکر
و پر گذر چکا ہے۔ انہی سے ایک فرزند اور ہوئے تھے
نھوں نے عمر طبیعی پائی تاہم حضرت بابا صاحبؒ فرماتے تھے
کہ ان کے احوال اپنے والد ماجد جیسے نہ تھے دوسری اہلیہ محترمہ کا
ذکر اس طرح ملتا ہے کہ رئیس نامی ایک صاحب حضرت
واجہ قطب صاحبؒ کے پاس آئے اور کہا کہ میں نے رات
و خواب میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کی زیارت کی۔ اور حضور نے فرمایا کہ قطب الدین
ختیارؒ کے پاس جانا اور کہنا کہ تم روزانہ رات کو
جو تحفہ ہمیں بھیجا کرتے تھے وہ برابر ملتا تھا لیکن
گذشتہ چند رات سے نہیں ملا ہے۔ یہ سن کر حضور
واجہ قطب صاحبؒ نے اپنی اہلیہ محترمہ کو مہر ادا کر کے
خصت فرما دیا اور کہا کہ میں روزانہ رات کو تین ہزار مرتبہ
درود شریف پڑھا کرتا تھا۔ نکاح کرنے کی وجہ سے
چند روز اس معمول میں ناغہ ہو گیا۔

حضرت خواجہ قطب صاحبؒ کے خلفاء میں
دو بزرگ بہت نامی ہوئے ایک حضرت بابا فرید الدین
مسعود گنج شکرؒ دوسرے حضرت بدرالدین غزنویؒ۔
حضرت قاضی حمید الدین صاحبؒ کے بارے میں بھی روایت
ہے کہ انھوں نے حضرت سے خلافت پائی۔ یہ بھی کہا جاتا
ہے کہ وہ حضرت کے مرید بھی تھے اور شاید انھوں نے
حضرت کو پڑھایا بھی تھا۔ رحلت کے وقت انھوں نے
وصیت کی تھی کہ مجھے پیر و مرشد کے قدموں میں دفن کیا
جائے۔ ان کے لڑکوں نے استاد ہونے کی وجہ سے شاید
اس بات کو اپنے باپ کی سبکی سمجھا اور اونچا چبوترہ بنا کر
وہاں انھیں دفن کیا۔ اسی رات کو خواب میں انھوں نے
اپنے لڑکوں سے کہا کہ تم نے مجھے اونچی جگہ دفن کر کے اپنے
پیر کے سامنے شرمندہ کر دیا۔

یہ بڑے لوگوں کی بڑی بات تھی ہم سب کی دعا تو یہ ہے
کہ اللہ تعالیٰ نے حضور خواجہ قطبؒ کا جو دامن آٹھ سو
برس پہلے ہمارے ہاتھوں میں تھمایا تھا۔ ہم اس کو
مضبوط پکڑے رہیں۔ اور اسی کے سہارے اللہ رسولؐ
کی خوشنودی کے اعلیٰ مقصد تک پہنچیں چشتیہ نظامیہ
سلسلے کے مجدد حضرت مولانا فخرالدین محب النبیؒ اس
اونچی چوکھٹ کے محافظ بنے لیٹے ہیں۔ انھوں نے سلسلۂ عالیہ
کو ایک نئی زندگی بخشی تھی۔

ہم ان کا واسطہ اور وسیلہ پکڑتے ہیں سلسلہ بسلسلہ
ہماری التجا بارگاہ الٰہی تک پہنچے۔ اور دونوں جہان میں
کامیاب اور بامراد بنا دے۔

(یہ مضمون چند سال قبل حضرت خواجہ قطب صاحبؒ کے
عرس مبارک میں درگاہ شریف کے رہبیور جناب قمر محمود
صاحب کی فرمائش پر پڑھا گیا تھا۔ ربیع الاول کی ۱۴ تاریخ
کو حضرت کا عرس مبارک پھر ہونے والا ہے۔ اسی مناسبت
سے اس مضمون کی اشاعت عمل میں آ رہی ہے۔
(ادارہ)

ایک ضروری اطلاع

خواجہ مہدی نظامی سلمہٗ کی علالت کی وجہ سے منادی کے دو شمارے
ایک ساتھ شائع کئے جا رہے ہیں۔ دوسرے شمارے کے صفحات بھی کچھ کم ہیں
اور حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے سالانہ عرس کی رہا اور شاد اور [illegible] نظامیہ
کی اطلاعات بھی درج ہونے سے رہ گئی ہیں۔ اس کوتاہی کے لئے میں
معذرت خواہ ہوں۔ خدا نے چاہا آئندہ شمارے میں
اس کمی کو پورا کر دیا جائے گا۔
ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ خواجہ مہدی نظامی
کی صحت کے لئے دعا فرمائیں۔

مخلص
حسن ثانی نظامی

دہلی کی ایک تاریخی عمارت۔ جنتر منتر

خواجہ حسن ثانی نظامی

ریاضی کا علم، اور فلکیات کا علم، ہماری پرانی میراث ہے۔ باہر والوں نے ان علوم کی بہت سی باتیں ہندوستان ہی سے سیکھی ہیں۔ اگلے وقتوں میں نہ لینس والی دوربینیں تھیں نہ ریڈیو ٹیلی اسکوپ۔ لیکن آسمانوں میں کیا ہو رہا ہے۔ چاند سورج اور دوسرے سیارے فضا میں کس طرح تیر رہے ہیں۔ ان کے نام اور مقام کیا ہیں اس کا بہت کچھ حال قدیم ودوانوں نے معلوم کر لیا تھا۔ آسمان کے مطالعے کے لئے انھوں نے زمین پر نقشے بنائے۔ حساب لگائے اور بڑی ناپ تول کے ساتھ چھوٹی چھوٹی عمارتیں بطور رصدگاہ اور آبزرویٹری، تعمیر کیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی عمارتیں اور بعض آلات جو خلا کے مطالعے میں کام آتے تھے جنتر کہلاتے تھے۔ اردو کا لفظ جنتری بھی اسی لفظ جنتر سے نکلا ہے۔ یعنی وہ رسالہ اور کتاب جس میں دن مہینوں سالوں اور تاریخوں کا حساب ہوتا ہے۔ اور جو سال کے مختلف اوقات میں سیاروں کے مقام اور رفتار کا پتہ دیتی ہے۔

قدیم ہندوستان میں یہ رصدگاہیں اور جنتر لگانے کے مقام یقیناً جگہ جگہ ہوں گے۔ لیکن علمی زوال اور زمانے کے انقلابات نے ان میں سے اکثر کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ دہلی اس لحاظ سے بڑی خوش قسمت ہے کہ یہاں ایک پرانی جنتر گاہ یا رصدگاہ ابھی تک قائم اور موجود ہے۔ اور یہ بھی ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ نئے زمانے کے آل انڈیا ریڈیو یعنی آکاش وانی اور دور درشن کے مرکز بھی اسی رصدگاہ کے قریب قائم ہوئے ہیں۔ ایک کا کام آسمانوں کے درشن کا ہے۔ دوسرے کا دھرتی کے باسی انسان کی بانی کو فضاؤں اور خلاؤں میں اڑائے پھرنے کا!

دہلی کی یہ قدیم رصدگاہ جو آخری مغل دور کی یادگار ہے۔ جنتر منتر کہلاتی ہے۔ جنتر آلہ رصد کو کہتے ہیں اور یہ رصد سین والی رسد نہیں صاد والی رصد ہے۔ یعنی آسمانوں اور فضاؤں اور خلاؤں کے مطالعے میں مدد دینے والا آلہ۔ خدا معلوم اس لفظ جنتر کے ساتھ منتر کا لفظ کیوں اور کیسے جوڑا گیا۔ جیوتش اور علم نجوم علوم فلکیات ہی کا حصہ ہیں۔ انگریزی میں ان کو ایسٹرانومی اور ایسٹرالوجی کے الگ الگ لفظوں سے یاد کیا جاتا ہے جیوتش یعنی ایسٹرالوجی کا تعلق چونکہ حیوان ناطق انسان سے ہے۔ جس کی زندگی میں بول اور منتر ہی کا جادو چل رہا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کسی من چلے نے جنتر کے ساتھ منتر کا لفظ جوڑ دیا ہو اور لوگوں نے یہ ترکیب

.جو د میں آئی ہو۔ بہرحال اب تو دلی ہی کی نہیں جے پور کی
صدگاہ بھی جنتر منتر کہلاتی ہے۔

سرسید احمد خاں نے اپنی مشہور کتاب آثار الصنادید میں
منتر کا حال بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ انھیں اس علم سے ذاتی واقفیت اور دلچسپی ہے۔
لین انھوں نے اس کی تعمیر کا زیادہ حال نہیں کھولا صرف
نا لکھا کہ یہ عمارت آلات رصد ہیں۔ جو محمد شاہ بادشاہ
کے عہد میں بنی تھی اور بڑے بڑے ریاضی داں ہندو
ر مسلمان اس میں شریک تھے۔ سرسید کے اس
یان کے ساتھ جب جے پور کے جنتر منتر کو دیکھا جاتا
ہے تو یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ محمد شاہ کے عہد میں تعمیر
نے والی یہ عمارات مہاراجگان جے پور کی رہین منت
یں۔

سرسید کا ارادہ تھا کہ اس عمارت کے بارے میں
ا الگ ایک رسالہ لکھیں گے۔ لیکن جو حال انھوں نے
ثار الصنادید میں سرسری طور پر لکھا ہے وہ بھی ایسا
قیق ہے کہ اس کو سمجھنا اور سمجھانا خاصا مشکل کام ہے۔
س لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ان عمارتوں کا حال
یان کرتے وقت علمی نکتوں سے اپنے آپ کو محروم رکھا جائے
ر عام فہم الفاظ میں ان عمارتوں کی تصویر کھینچنے کی کوشش
ی جائے۔

اس رصدگاہ کی ایک عمارت مقیاس کو یوں بیان
یا جائے گا کہ جیسے آدھی گھڑی ہو۔ اس میں چھ بجے کا مقام
زمین سے لگا ہوا ہے اور چھ بجے سے ایک جانب تین بجے
کے مقام تک اور دوسری جانب نو بجے کے مقام تک
دھے دائرے کی شکل میں دیواریں اٹھائی گئی ہیں۔
ر یہ دیواریں تین بجے اور نو بجے کے مقام پر ختم کر دی
ئی ہیں۔ نو بجے سے بارہ اور پھر تین بجے تک کا آدھا دائرہ
عنی گھڑی کا اوپر کا آدھا حصہ خالی ہے۔ بیچ کی آدھی
گھڑی میں بطور سوئی ایک سیدھا پایہ یا پاکھا ایک سو
سو فٹ اونچا چھ بجے کے مقام پر اس طرح تعمیر کیا گیا
ہے جس سے دونوں طرف نوے نوے ڈگری کے زاویے
بن جاتے ہیں۔ اس پاکھے کے بالکل اوپر کے حصے تک
پہنچنے کے لئے سیڑھیاں صرف ایک جانب بنی ہوئی
ہیں۔ تین بجے اور نو بجے کے مقام پر جانے کے لئے بھی
سیڑھیاں ہیں۔ عمودی پاکھے کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے۔
جس میں آسمان کی جانب ایک چھوٹا سا سوراخ چھوڑا
گیا ہے۔ تاکہ اس میں سے سیاروں کو دیکھا جائے اور
اوپر کی عمارت سے جو نصف گھڑی کی صورت میں ہے۔
سیاروں کے مقام اور نقل و حرکت کو جانچا اور ناپا جائے۔
یہ پوری عمارت مقیاس یعنی گھڑی کے نام سے مشہور ہے۔

دوسری عمارت دو الگ الگ پیالوں کی شکل میں ہے
یہ پیالے نما عمارتیں ایسی ہیں کہ اگر ان کو ایک دوسرے کے اوپر
رکھنا ممکن ہو تو ایک گولہ بن جائے۔ ان پیالوں کے اندر
بارہ بارہ قوسیں یا کمانیں اس طرح ہیں کہ چھ بھری ہوئی
اور چھ خالی۔ یہ گویا بارہ برج ہیں۔ یہ کمانیں ایک ایک
جانب چھوٹے دائروں سے ملی ہوئی ہیں۔ یعنی قطب شمالی اور
قطب جنوبی کا قائم مقام ہیں۔ ہر کمان کے خالی حصے میں
سیڑھیاں اوپر جانے کے لئے ہیں۔ ان پیالوں کا قطر
چھبیس فٹ سات انچ کا ہے۔

جنتر منتر کی تیسری عمارت بھی عام آنکھ کے لئے
اچھی خاصی عجوبہ ہے۔ لیکن ماہرین فن کے نزدیک مفید
اور کام کی چیز ہے۔ یہ دائرے میں بنی ہوئی عمارت
چار منزلہ ہے۔ درمیان میں چھت وغیرہ کچھ نہیں ہے۔
خالی دیواریں ہیں۔ اور ان میں ساٹھ ساٹھ خانے
بنائے گئے ہیں۔ تیس خالی محراب کی صورت میں اور تیس
بھرے ہوئے۔ اس طرح محرابوں کی شکل طاق کی بھی ہوگئی
ہے۔ خالی اور بھرا ہوا پایہ ہر ایک دو فٹ ساڑھے دس انچ
کا ہے۔ درمیان میں ایک عمود ۴۲ فٹ کا ہے۔ یہ جنتر
جو دراصل چار منزلہ ہے۔ اس کی ایک منزل زمین کے اندر
ہے اور یہ مذکورہ بالا دونوں پیالوں کے جنوب میں
واقع ہے۔

جنتر منتر کی چوتھی اور آخری عمارت واقعی گورکھ دھندا نظر آتی ہے۔ اور جو آدمی اسٹرانومی سے واقف نہ ہو وہ اسے دیکھے تو سمجھے کہ شاید بچوں کے کھیل کے لئے عمارت بنائی گئی ہے۔ اس میں ایک آدھی گھڑی پہلی گھڑی کی طرح باہر کے رخ اور دوسری گھڑی پان نما اندر کی طرف ہے۔ دونوں پہلوؤں میں زینے چڑھتے ہیں جن میں سے ایک تین بجے اور نو بجے کے باہر ہے اور ایک اندر، نیز سوئی آدھی گھڑی میں نہیں بلکہ پوری گھڑی میں بارہ بجے اور چھ بجے کے مقام کے درمیان ایک زینے کی شکل میں قائم ہے۔ جیسے ساڑھے بارہ بج رہے ہوں۔ ساڑھے بارہ بجتے وقت چھوٹی سوئی بارہ اور ایک کے درمیان آجاتی ہے۔ لیکن یہاں یہ بالکل سیدھی بارہ سے چھ بجے تک بنی ہوئی ہے۔

ان عمارتوں میں سے ہر ایک کا کیا مقصد اور مصرف ہے۔ اس کو علم فلکیات جاننے والے ہی جان سکتے ہیں۔ آجکل یہ عمارت اہل علم کے استعمال میں ہے بھی نہیں۔ کیونکہ ایسے جدید سائنسی آلات ایجاد ہوگئے ہیں۔ جنھوں نے ان لمبی چوڑی عمارتوں سے آدمی کو بے نیاز کر دیا ہے۔ اب تو صرف باہر سے آنے والے سیلانی اور ٹورسٹ ہی جنتر منتر کی عمارت کو بطور آثار قدیمہ دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ آثار قدیمہ بتاتے کہ ہمارے ماضی کا ورثہ کیسا عظیم اور قابل فخر ورثہ ہے۔ ہم بھی زندہ اور تابندہ تھے آج بھی قائم اور برقرار ہیں۔ اور خدا نے چاہا ہمارا مستقبل بھی ماضی کی طرح شاندار ہوگا۔ اقبال نے جب کہا تھا کہ

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری!

تو ان کی مراد اس "کچھ بات سے" یہی تھی کہ ہم نے انسانیت کے شرف اور علم و فضل کو ہر زمانے میں برقرار رکھا ہے۔ اور اسی وجہ سے ہمیں سر اٹھا کر زندہ رہنے کا حق بھی ہے۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

ہ حسن ثانی نظامی کا سفرنامۂ افریقہ و ماریشس

یں قسط (مسلسل)

کالے کوس، کڑے کوس

شمال کے ایک معنی تو سمت کے ہیں یعنی اُتر
ال } یا نارتھ۔ دوسرے معنی شمال سے چلنے والی
ہوا کے بھی ہیں۔ جو خوشگوار ہوتی ہے۔ موسم بہار کی خبر
ہے۔ اہل ایران، خاص طور پر اہل شیراز "بادِ بہاری"
ر شمال" کہتے ہیں۔

میرے لئے بھی بوٹس وانا جو جنوبی افریقہ کے
ں میں واقع ہے۔ خوش گوار یادوں کا ملک ہے لیکن
ں ملک کی طرف میں جا رہا ہوں۔ یعنی جمہوریۂ جنوبی افریقہ
بھی میرے لئے تعلق، محبت اور خوشگوار یادوں کی سرزمین
، اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ میں شمال سے جنوب کی طرف نہیں۔
شمال سے شمال کی جانب جا رہا ہوں۔ بہار سے بہار کی
ت! جو حضرات عقیدۂ وحدت الوجود کے قائل
ان کے لئے زندگی کا سب سے بڑا لطف یہی ہے کہ وہ
ھر بھی رخ کریں

فاینما تولوا فثم وجہ اللہ

(تم جدھر بھی رخ پھیرو اللہ کا چہرہ اُدھر ہی ہے)
، کرشمے دیکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کی
ضری ہر وقت "مواجہہ شریف"، میں رہتی ہے۔
ی جس طرف پاک پروردگار کا "وجہہ مبارک"
ے! کعبہ اور اس کا مطاف یعنی کعبے کے اطراف کا

وہ دائرہ جس کے اندر چکر کاٹ کر طواف ہوتا ہے نیز خود طواف بھی یہی رنگ دکھاتا ہے کہ چہار جانب سے طواف کرنے والے کا رخ بس کعبے ہی کی طرف رہتا ہے چاہے وہ مشرق سے چل کر مغرب میں جائے جنوب میں جائے شمال سے ہو کر پھر جہاں سے چلا تھا وہیں یعنی مشرق میں پہنچے۔ کعبہ اس کے سامنے ہی رہتا ہے۔ اور خود اس کا اپنا چہرہ بھی کعبے کی طرف ہوتا ہے۔

مدینۂ منورہ میں بھی روضۂ نبوی کا وہ مقام جس کو "مواجہہ شریف" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جہاں سب کھڑے ہو کر سلام و درود کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ وہ بھی اسی وجہ سے "مواجہہ شریف" کہلاتا ہے کہ قبر مبارک میں حضور کا چہرہ اقدس اسی رخ یعنی کعبے کی جانب ہے۔ اب ذرا غور کیجیے کہ جب تک دنیا کا پورا جغرافیہ اور کرۂ ارض یعنی گلوب کی کیفیت معلوم نہیں تھی نہیں تھی۔ لیکن اب تو ذرا سا علم رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ حضور کی بارگاہ میں سلام پیش کرنے والا بظاہر اپنا چہرہ حضور کے روئے اقدس کی طرف اور اپنی پیٹھ اور پشت کعبے یعنی قبلے کی طرف کر لیتا ہے۔ لیکن دنیا کے دوسرے رخ سے دیکھا جائے تو اس کا رخ بدستور اللہ کے مرکزی گھر کعبے کی طرف رہتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اس "مواجہہ شریف"

کو بھی کعبے کی طرح ایک ایسا مرکز اور مرجع ماننے جہاں ہر پھر کر ہر طرف سے پہنچنا ضروری ہو۔ یہ اللہ کے "احسن تقویم" بہترین نقشے کا کمال بھی ہے کہ توحید پرستوں یا وحدت الوجودیوں کے لئے ظاہری طور پر بھی ہر سمت سے منظر ایک ہی رکھا گیا ہے۔ اور شاید ہمارے لئے سب سے بڑا انعام بھی۔ ہندوستان میں بھگتی کی ایک نمایندہ شاعرہ میرابائی نے بھی شاید اسی طرح کی کیفیت کو اپنے بھجن میں بیان کیا تھا کہ "مینا میرے مہری اُدرا"

ہم چشتی غلاموں کے لئے تو خواجگان نے درود شریف بھی وہ منتخب فرمایا ہے جو "حاضری" کے تصور اور "مواجہہ شریف" کے تصور کے بغیر پڑھا ہی نہیں جا سکتا۔ یعنی صلی اللہ علیک یا محمدؐ! "علیک" اسی وقت بولا جاتا ہے کہ جب کوئی سامنے موجود ہو اور ہم اس کے سامنے حاضر ہوں۔ لطیف اور نازک سی بات ہے مگر ہے کہ جو حضرات وحدت الوجودیا نہیں ہیں وہ کبھی نہ کبھی کعبے اور گویا اللہ کی طرف سے روگردانی اور پیٹھ پھیرنے کے مرتکب نادانستہ اور غیر شعوری طور پر ہو بھی سکتے ہیں۔ لیکن جن کا "یار" ہمہ وقت اور ہمہ جا موجود اور جلوہ فرما ہو اور انھیں اس کا شعور بھی ہو ان سے تو اس گستاخی کا سرزد ہونا ممکن ہی نہیں رکھا گیا۔ ان کے لئے تو یہ جنت دنیا ہی میں فراہم کر دی گئی کہ

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اٹھائیے!

میرے خیال میں تو "نیت" بھی "مژگاں" اٹھانے ہی کا نام ہے! اور سلام پھیرنا۔ پلکیں جھکا لینا ہے! حضوری پھر بھی رہتی ہی ہے!

"جو" برگ کا پڑوس } جوہانس برگ عرف "جو برگ" عرف

"انکل جو" عرف "ماموں جو" عرف "ماموں جان" یا "ماموں جی" بھی خوب چیز ہیں۔ بنگلہ دیش سے کوئی یہاں آتا تو اسے میری طرح "ماموں جان" نہ کہتا۔ "سونار گاؤں" کہتا کہ یہ سونے کی کانوں کا شہر ہے۔ بنگال والے اپنے دار السلطنت کو کسی زمانے میں "سونار گاؤں" کہہ کر ہی پکارتے تھے مگر اس افریقی شہر میں صرف سونا ہی نہیں نکلتا۔ ہیرے بھی نکلتے ہیں۔ یعنی یہ "الماسی شہر" بھی کہلا سکتا ہے۔ مگر اس نام سے اسے یاد کرنا یوں اچھا نہیں لگتا کہ ہم غالب کا پڑوسی ہوں اور وہ کہہ چکے ہیں کہ

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحت دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزو اعظم ہے

دل کے زخم کے لئے جو مرہم درکار ہے۔ اس کا نسخہ نہ پوچھ کہ اس میں ہیرے کی کنی سب سے بڑا جزو ہے۔ اور ہیرا ایسی سخت چیز ہے کہ اگر اس کی کنی مرہم میں شامل کی جائے تو کھٹک اور خراش کبھی جا ہی نہیں سکتی۔ صوفیہ کے لئے تو خیر یہی مرہم سب سے مفید مرہم سمجھا جائے گا لیکن جو حضرات صوفی نہیں ہیں ان کے لئے ہم ایسی چیز پسند نہیں کر سکتے جو انہیں ناپسند ہو۔ خود مجھے بھی بہت بڑے شہر بہت زیادہ اچھے نہیں لگتے۔ قدرت نے بھی یہ مہربانی فرمائی کہ بوٹسوانا جاتے وقت بھی "جو برگ" کے پڑوس "لینا شیا" میں قیام ہوا تھا اور اب واپسی میں بھی ہم لوگ غنی میاں اور خالق میاں کی بہن عائشہ بی بی سلمہا اور بہنوئی غلام شہاب الدین سلمہٗ کے ہاں لینیشیا میں ٹھہرے۔ شہاب الدین نام سے پہلے "غلام" کا لفظ وہی جوڑ سکتا ہے جس کو حضرت شہاب الدین سہروردیؒ یا شہاب الدین نامی کسی اور بزرگ سے نسبت ہو۔ غلام شہاب الدین صاحب کے والد یقیناً کوئی نہ کوئی روحانی نسبت ضرور رکھتے ہوں گے۔ واپسی کے وقت بھی انھوں نے اپنا خاص بیڈ روم اور باتھ روم میرے حوالے کیا۔ اس طرح کا ایثار بھی صوفیہ اور ان سے تعلق رکھنے والے ہی کرتے آئے ہیں۔

رات کے کھانے میں عائشہ بی بی نے نئی نئی چیزیں پکا کر رکھی تھیں۔ صبح ناشتہ بھی بڑا پر تکلف کرایا۔ کل رات کو کھانا غنی میاں کی دوسری بہن کے ہاں کھایا تھا۔ انھوں

نے اور حضرات کو بھی مدعو کیا تھا۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے
ربن روانہ ہوئے۔ مگر پہلے سرتاج کمپنی کی کئی دوکانوں کے
رشن کئے ماشاء اللہ سب سامان سے بھری پڑی اور
راستہ پیراستہ! ایک دوکان کے پڑوس میں قصائی
ی دوکان بھی تھی مگر ہندوستان پاکستان جیسی نہیں
س میں ایک ایسی ناگزیر ہستی تشریف فرما ہوتی ہے
جو ہماری خاطر دو عالم کا خون اپنی گردن پر لیتی ہے۔
کیمسٹ کی دوکان پر موجود قیمتی سے قیمتی پروٹین کا
دل نہایت کم دام فراہم کرتی ہے۔ مگر پھر بھی دنیا بھر کے
طعنے سنتی ہے۔ کیونکہ وہ اس شان سے اپنے ٹھیے پر بیٹھتی
ہے کہ رنگین میلا تہمد، خون کی چھینٹوں سے بولتا بنیان
ہیرے انگوٹھے اور ہماری انگلی کے درمیان دبی تیز دھار
چھری۔ ہاتھ میں بڑا سا چھرا یا بغدا۔ سامنے مکھیاں بھنکتی
لکڑی کی منڈی، چھت سے لوہے کے کڑوں اور ہکس کے
سہارے جھاڑ فانوسوں کی طرح لٹکتے جانوروں کے
رہ آدھے پونے جسم جن پر مشق ناز کرنے کے لئے
صلائے عام ہے اور جو لکڑی کی منڈی کی طرح مکھیوں کے
لئے ایسی کشش رکھتے ہیں کہ کوئی کافوری شمع بھی
پروانوں کے لئے کیا کشش رکھتی ہوگی۔ مزید یہ کہ دوکان
کے پٹرے کے نیچے انتظار "ہڈی و چھیچھڑا" کھینچنے والے
کتے اور بلیاں!

لینیشیا کی دوکان تو ایسی تھی کہ کہئے۔

دیکھو!

قصائی لایا ہے سوغات کیا کیا؟

انواع واقسام کے قیمے، پارچے، پسندے، بوٹیاں۔
چانپیں۔ دستیں۔ رانیں۔ انڈرکٹ۔ دل، جگر، گردے،
بھیجے (مغز) پائے وغیرہ وغیرہ مشین سے کٹے، نہایت
شفاف پلاسٹک اور ربولی تھیلیوں میں پیک، پہلے سے
وزن شدہ، یخ بستہ، شوکیسوں میں یوں آراستہ
ہیں کہ جو گوشت خور دیکھے للچائے نہ مکھی نہ مچھر، نہ بدبو
نہ بساند! اور "پورا قصاب" یعنی شیخ جی کی آل اولاد
صاحبزادگان یا خدمت گاران جو بھی ہوں۔ "سر جلوہ گاہ"
یعنی شوکیسوں کے کنارے اپنے "کشتوں کے پشتوں"
کی بے ٹکٹ نمائش دکھانے اور کسی مَن چلے نہیں بلکہ مَن لگے
گاہک کے ہاتھ جگر ہائے لخت لخت یا شائستہ و مہذب
یعنی اِن کیمرہ" (INCAMERA) پہلے سے کی کرائی تکا
بوٹی کو بیچنے۔ یوں سرو قد کھڑے ہیں۔ جیسے مقتل اور
قاتل اور مقتول اور بسمل اور خون اور رنھیا سب ہی کو
شعراء کے دیوانوں اور اہل علم کی ڈکشنریوں سے یک قلم
خارج کیا جا چکا ہو اور پرانے دقیانوس لوگوں سے
آشنا کہنے کی ضرورت بھی نہ رہی ہو کر حضرت! یہ سب
الفاظ واصطلاحات و محاورات کب کے متروک ہوئے۔
اب تو کتنے مسلمانی شعار ہیں جنھوں نے قشقہ کھینچا اور
دیر میں بیٹھنے کی تیاری کر لی ہے اور تو اور شہیدی اور
شہادت تک نقل مکانی کر گئے اور غیر مسلم بھائیوں کے
ہاں جا بیٹھے! پہلے خون حق پر بہایا جاتا تھا میدان جنگ
میں دیا جاتا تھا۔ اب اسپتالوں میں خریدا اور بیچا جاتا
ہے۔ اعضائے جسم کا بھی لین دین ہوتا ہے۔ یہ مقدس
کام ہیں۔ بے زبان جانوروں کے جسم کے ٹکڑے بھی
اسی طرح پیک اور پیٹنٹ کر دیئے جائیں اور ان پر
ٹیکس و رشوت کی ادائیگی قاعدے اور رواج کے موافق
ہوگئی ہو تو کسی سبزی خور و سبزہ دوست نمائندہ
اہالیان عدم تشدد کو بھی اعتراض نہیں رہتا! بلکہ باہر
سے دیکھنے والوں کو تو پتہ بھی نہیں چلتا کہ کوئی گوشت
و خون کے بازار میں یا کیلے اور مذبح سے متعلق دوکان
میں گیا ہے ریستوراں اور ہوٹل بھی ایسے شراب خانے
بن گئے ہیں جہاں زاہد و شراب خوار دونوں بے کھٹکے جاتے
ہیں۔ نہ اِس کو تہمت کا خطرہ نہ اُس کو فتوے کا ڈر!
شاکاہاری اور گوشت خور کے لئے بھی یہی صورت حال
ہے۔ سب شبہے کا فائدہ اسی طرح اٹھاتے ہیں جس طرح
عدالت میں قاتل شبہے کی بنیاد پر بری ہوتا ہے۔ دوسری
چیزوں میں اشتراک و یک جہتی ہو یا نہ ہو گناہ و ثواب

میں ضرور ہوگئی ہے۔ نئے زمانے نے بقول کسے کچھ حجاب اُٹھائے ہیں تو کچھ پردے گرائے بھی ہیں اور جائز ناجائز کے قصے اور اچھے اور بُرے کی کہانی کو نئے نئے موڑ مل گئے ہیں!

حال میں تین مہینے تک ہندوستان کے دل دلی کا کمیلا اور گوشت کی دوکانیں سب بند رہے۔ کیونکہ ماحولیات کی سب سے بڑی محافظ اور سابق وزیر باتدبیر محترمہ مینکا گاندھی کی درخواست پر عزت مآب ہائی کورٹ نے حکم جاری فرمایا تھا کہ چونکہ کمیلے میں گندگی بہت ہے۔ اس لیے آنریبل مسٹر جسٹس جین کی سرکردگی میں ایک کمیٹی یا کمیشن مذبح کا معائنہ کرے اور مشورہ دے کہ اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔ چنانچہ ان معزز حضرات نے نیچ اس مسئلے کے نہ تو یہ فرمایا کہ یہ ملک ہندوستان یا بھارت ورش لارڈ مہابیر اور مہاتما گوتم بدھ اور گاندھی جی کا ملک ہے۔ خون ریزی انسانوں کی ہو یا جانوروں کی سرے سے بند کر دینی چاہیے نہ محترم جین صاحب نے اپنے جین مذہب پر عمل کرتے ہوئے کمیشن کی سربراہی سے مذہبی عقاید کی بنا پر انکار فرمایا البتہ جو مشورہ دیا اس مشورے کی بنیاد پر عدالت عالیہ کا حکم صادر ہوا کہ کمیلے میں صفائی ستھرائی رکھی جائے اور گن کر صرف ڈھائی ہزار جانور روز کاٹے جائیں یعنی یہاں بھی عاشق کے گریبان کے روایتی ڈھائی گرہ کپڑے کی قیمت کی طرح زیادہ نہ سہی ڈھائی ہزار جانوں کا جانا تو لازمی کر ہی دیا گیا!

اگر دلی کے قصائی اکیسویں صدی میں داخل ہوگئے ہوتے اور انھوں نے یوروپ و امریکہ کی نہ سہی اپنے کالے بھائی افریقہ ہی کی پیروی کی ہوتی تو نہ محترمہ مینکا گاندھی کو کورٹ کچہری کی زحمت اٹھانی پڑتی نہ کسی اور کو! دوسری طرف وہ ان گنت غریب مزدور اور دوکاندار جو اس دھندے میں لگے ہوئے ہیں فاقے کرنے سے بچ جاتے اور گوشت و خون کا بازار بھی بدستور گرم رہتا!

تاہم یہ راستہ کھل ہی گیا ہے تو کیا عجب کہ کوئی نیا آدمی نیے زمانے کا ساتھ دینے کے لئے ایک دن پھر عدالت عالیہ کا دروازہ جا کھٹکھٹائے اور یہ رِٹ یا رَٹ لگا آئے کہ کمیلے میں کاٹے جانے والے جانوروں کی طرح دریا میں بہائی جانے والی چیزوں کی تطہیر کا کام بھی حکماً کیا جائے مثلاً فی دریائی دن پانی کی خاص مقدار میں بہائی جانے والی انسانی اور حیوانی لاشوں اور دیگر فضلے کا کوٹا بھی مقرر ہو کیونکہ ایک انار اور سو بیمار والا معاملہ اب ہوگیا ہے۔ دریا ایک ہوتا ہے اور وہ بھی نہروں کا لوٹا کھسوٹا اور لاشیں اور فضلہ بہت! ان سے بھی تو پاک و طاہر تر ماحول میں قابل دست اندازی پولیس حد تک مداخلت بیجا ہوتی ہے۔ کم از کم اتنا ہی سہی کہ لاشوں، لاشوں کی راکھ اور فضلے کو واٹر پروف پیکنگ کے ساتھ دریا میں بہایا جائے تاکہ لاشوں کے سوپ اور انسانی راکھ کے شربت دستو سے کسی کا دھرم بھی بھرشٹ نہ ہو اور صفائی کا بھی دھرم نہ سہی کچھ بھرم ہی قایم رہے!

نیوکاسل ڈربن واپس جاتے وقت نیوکاسل نامی شہر میں دوبارہ غنی میاں کی بھتیجی اور داماد صاحب کو زحمت دی اور دوپہر کو کھانے نماز کا پڑاؤ رہا۔ انھوں نے پہلے کی طرح اس بار بھی بڑے تکلف کا انتظام کر رکھا تھا۔

دنیا گول ہے شام کو پانچ بجے صبا رفتاری کے ساتھ پھر ڈربن پہنچ گئے۔ گھر کے بالکل قریب ایک چھوٹا سا نہایت معمولی قسم کا روڈ ایکسی ڈ[illegible] بھی دیکھا۔ یہ شاید نظر کا ٹیکہ تھا۔ مائیں خوبصورت بچوں کے چہرے پر کسی جگہ ایک کالا ٹیکہ نظر لگنے سے بچانے کے لئے لگا دیتی ہیں۔ جنوبی افریقہ کے محفوظ اور مامون ٹریفک کو شاید میری نظر لگ جاتی اگر یہ ایکسی ڈنٹ نہ دیکھا ہوتا!

عبدالرشید خاں صاحب بھائی عبدالمجید خاں نظا[illegible]

مرحوم کے منجھلے صاحبزادے عبدالرشید خاں صاحب سلمہٗ
اور ان کی اہلیہ سمندر کے کنارے ڈربن کے ایک بڑے آباد
اور بھرے پڑے لیکن صاف ستھرے اور پرفضا علاقے
کے نہایت خوبصورت اور وسیع فلیٹ میں قیام پذیر
ہیں۔ آج رات کو ان دونوں میاں بیوی نے مجھے رات
کا کھانا کھانے کے لئے بلا رکھا تھا۔ میں اس طرح کی
دعوتیں قبول کرنے میں تامل کرتا ہوں جو کسی دوسرے
شہر یا کسی دوسرے ملک سے واپسی کے فوراً بعد
طے پائیں۔ کیونکہ کچھ خبر نہیں ہوتی کہ آدمی بخیر و عافیت
یا وقت پر واپس آ بھی سکے گا یا نہیں بار ہا اس سلسلے میں
میزبانوں کی تکلیف کے تلخ تجربے ہو چکے ہیں۔ لیکن
میاں عبدالغنی نے یہ پروگرام بنا یا ہی نہیں اسے وقت
پر پورا کر کے بھی دکھا دیا۔ اسے ان کے حسن انتظام
کے ساتھ اقبال مندی کا نتیجہ بھی سمجھنا چاہئے اقبال مند
لوگ جو ارادہ کرتے ہیں اللہ اسے پورا کرا دیتا ہے۔
اللہ تعالیٰ ان کے دولت و اقبال میں اضافہ کرتا
رہے آمین۔

میاں عبدالرشید اور ان کی بیوی نے
ہندوستانی کھانوں کے ساتھ انگریزی طرز کے
کھانے بھی تیار کئے تھے اور پورے خاندان کو مدعو
کیا تھا۔ بڑی چہل پہل اور رونق رہی۔ اور
میں نے بھی لمبے سفر کی تکان کے باوجود کھانے ہی
کا حق ادا نہیں کیا بلکہ اہل خاندان کے ساتھ مل بیٹھنے
کے لطف سے بھی جی بھر کر فائدہ اٹھایا۔ صغرا بی بی نے
یہاں بھی اپنی استقبالیہ نظم سنائی۔

عید میلاد آجکل جنوبی افریقہ میں عید میلاد النبیؐ
کے سلسلے میں جگہ جگہ جلسے جلوسوں
اور تقریبات کی دھوم ہے۔ اس تحریک کو ساری دنیا
میں عام کرنے کے لئے والدی و مرشدی حضرت خواجہ
حسن نظامیؒ نے بڑی کوشش اور جد و جہد فرمائی
تھی۔ اس تحریک کی کامیابیاں جہاں دیکھتا ہوں
خوشی ہوتی ہے۔

بھائی عبدالمجید خاں نظامی صاحب مرحوم کے
منجھلے داماد ڈاکٹر عبدالخالق موسم اور بیٹی زہرہ بی بی سلمہا
ایک دعوت کر چکے تھے لیکن آج صبح انھوں نے دوبارہ
ناشتے پر یاد فرمایا اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے
میں دیر تک گفتگو رہی۔ ناشتے کے بعد سب لوگوں
کے ساتھ حضرت قاضی صاحب کے ہاں عید میلاد کے جلسے
میں شرکت کی سعادت میسر آئی۔ بہت بڑا جلسہ تھا۔
حضرت کے گھر کے باہر میدان میں شامیانے لگائے گئے تھے
کرسیوں پر نشست کا انتظام تھا۔ اسٹیج پر فرشی نشست
تھی۔ حضرت خود صدر میں تشریف فرما ہونے کی بجائے
انتظامات میں لگے رہے۔ اور ایک کنارے پر بیٹھے۔
صدر میں مقررین کو بٹھایا گیا۔ سلسلہ عالیہ حبیبیہ کے
ایک بزرگ حیدرآباد ہندوستان سے آئے ہوئے
ہیں۔ وہ بھی تشریف لائے تھے۔ پاکستان کے
مشہور مقرر اور پیر مولانا طاہر القادری صاحب
کے مریدوں نے سیرت پاک پر تقریریں فرمائیں
اور اس کے بعد سب حاضرین کو مکلف کھانا کھلایا گیا۔
واپسی میں تاج کمپنی میں عبدالمجید نظامی
صاحب اور عبدالعزیز نظامی اور ان کی والدہ اور
اہل خاندان کے ساتھ کچھ وقت حضرت عبدالمجید خاں
نظامیؒ مرحوم کے مکان پر بھی گذرا۔

بیرون ڈربن اگلی صبح کا ناشتہ عبدالحمید خاں
نظامی صاحب کے مکان پیٹر ماریٹز برگ
میں ہوا۔ ان کی دوکان اور گودام پر جا کر دعا بھی کی۔
شیر بی بی نظامی بیگم عبدالحمید خاں صاحب کے
بھائی بھتیجے اور رشتے دار بھی ملنے تشریف لائے
جو ڈربن سے دور رہتے ہیں۔
عبدالمجید صاحب کے چھوٹے بھائی اور تاج کمپنی
کے پارٹنر میاں عبدالعزیز نظامی سلمہ نے ڈربن کے
اصل شہر سے خاصی دور سمندر کے کنارے ایک بیکری

کھولی ہے۔ اس کو بھی دیکھا اور دعا کی۔ دنیا کے دوسرے شہروں کی طرح ڈربن شہر بھی دن بدن پھیلتا جاتا ہے۔ اور آبادی دور دراز علاقوں تک پہنچ گئی ہے۔ بھائی عبدالمجید خاں نظامی مرحوم کا آخری زمانہ بھی ایک ایسے ہی دور دراز علاقے میں گذرا تھا۔ سمندر کے کنارے ایک بلند پہاڑی پر انھوں نے بہت خوشنما مکان بنایا تھا اور خواجہ منزل اس کا نام رکھا تھا۔ اس کی زیارت بھی کی اور مرحوم پیر بھائی کا خالی بیڈ روم دیکھ کر طبیعت افسردہ ہوگئی۔

حضرت صوفی صاحب کی درگاہ کے سجادہ نشین حضرت مولانا سعید صاحب کے ہاں عرس کا لنگر چکھ کر کئی دفعہ کھا چکا تھا مگر انھوں نے آج دوپہر کو دوبارہ لنچ پر یاد فرمایا۔ نہایت پر تکلف انتظام تھا۔ اور محبت کا برتاؤ کھانے سے بھی زیادہ متاثر کرنے والا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو خوش رکھے۔

رات کو ڈنر پر ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے مدعو فرمایا تھا۔ ان کے پیر حضرت قاضی صاحب اور سب اہل خانہ موجود تھے۔ گھریلو ماحول میں بڑا اچھا وقت گذرا۔

اگلے دن صبح میرس پیٹرس برگ سے غنی میاں کی صاحبزادی فاطمہ سلمہا ملنے تشریف لائیں۔ اور بہت دیر تک مذہب اور تصوف اور اسلام پر گفتگو فرمائی۔ اور آخر میں بیعت ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ شاید ان کے ذہن میں بھی نئی نسل کے دوسرے نوجوانوں کی طرح کچھ سوالات تھے مجھے خوشی ہوئی کہ انھوں نے سب کی دیکھا دیکھی رسمی طور پر بیعت نہیں کی۔ بلکہ کمہار سے مٹی کا برتن خریدنے والے کی طرح پہلے برتن کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھا اور مطمئن ہونے کے بعد بیعت کا ارادہ کیا۔ ممکن ہے بیعت کے آداب اور شرائط انھیں اپنے والد سے معلوم ہوتے ہوں۔ جلد بازی میں بیعت کرنے اور بعد میں بے عقیدہ ہو جانے سے یہ بات کہیں بہتر ہے کہ جس کے مرید ہوتے ہیں اس کے بارے میں پورا اطمینا کر لیں کہ اس سے ہمارا مقصد حاصل ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔

غنی میاں صاحب کے ہم کار گورا صاحب کے بھیجے ہوئے کچھ لوگ تعویذ لینے بھی آئے۔ میں تعویذ وغیرہ دہلی اور ہندوستان میں بھی کم ہی دیتا ہور کیونکہ تعویذ لینے والے بھی اکثر و بیشتر بھیڑ چال چلنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ تعویذ لینے کا دروازہ کھل جائے تو پھر بند ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اور روحا[نی] اور دینی کام کرنے والوں کا سارا وقت تعویذ گنڈ[وں] کی نذر اس طرح ہو جاتا ہے کہ لوگ انگلیاں اٹھانے لگ[تے] ہیں کہ پیر لوگ تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے سو[ا] کچھ کرتے ہی نہیں عام لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بیچارے تو سب کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ تعویذ گنڈے وا[لے] ہی انھیں بے وارنٹ گرفتار کر لیتے ہیں اور پھر چھوڑ[تے] نہیں! البتہ جو لوگ میری طرح ذرا ہوشیار ہیں وہ تعویذ دوسرے لوگوں سے لکھوا کر دیتے ہیں یا بس خا[ص] خاص حالتوں میں دیتے ہیں۔ یا موقع ملتا ہے تو بالک[ل] ہی ٹال جاتے ہیں تاکہ دوسرے کام بھی کر سکیں۔ ور[نہ] تعویذ اللہ کا نام ہے۔ بابرکت نام ہے۔ اس سے فائد[ہ] بھی ہوتا ہے۔ اس سے بالکل ہی انکار درست نہیں ہو سکتا۔

ہنس پھر اُڑا اُسا نقہ اُڑا } ہنس یا قاز ایک گھومنے پھرنے والا پرند ہے۔ کسی موسم میں کہیں رہتا ہے کسی موسم میں کہی[ں] اس مسلسل سفر میں ہر طرح کی صعوبتیں سہتا ہے۔ [ک]بھی ہوتا ہے کہ قافلے سے بچھڑ جاتا ہے اور اکیلا رہ جا[تا] ہے۔ شاعر نے کسی نظم میں ایک کہانی سنائی تو ایک بچھڑ جانے والے ہنس کے بارے میں یہ بھی کہا کہ

آخر کو اکیلا ہی اڑا ہنس بچارا

اس مصرعے نے ایک محاورے اور کہاوت کی حیثیت ا[ختیار]

کرلی اور تنہائی کے مارے ہر شخص کے کام آنے لگا۔ مگر مجھے ڈربن سے جنوبی افریقہ کے ایک اور شہر اور بے حد مشہور شہر کیپ ٹاؤن کی طرف پرواز کرنے کے سلسلے میں ہنس کی اڑان کو ان روایتی معنوں میں استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کیونکہ عبدالغنی صاحب ان کی اہلیہ سارہ بی بی۔ ڈاکٹر عبدالخالق اور ان کی بیوی فاطمہ سلیمانے بھی میرے ساتھ کیپ ٹاؤن جانے کا پروگرام بنالیا۔ فاصلہ ڈربن سے کیپ ٹاؤن کا بہت زیادہ ہے۔ اس لئے ہوائی سفر کو ترجیح دی گئی۔ پورے دو گھنٹے کی فلائٹ تھی۔ یوں سمجھئے جیسے دلی سے مدراس یا بنگلور جانا پڑا ہو۔ یہاں ہر چیز کی طرح ہوائی سفر بھی ہندوستان کی بہ نسبت بہت مہنگا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ میرے میزبانوں کی بھاری جیب کو ہمیشہ بھاری رکھے میری ہلکی جیب کو اس مہنگائی کی بقول کسے "دو چھنتا" بالکل نہیں کرنی پڑی۔ بلکہ ایرپورٹ پر روانگی کے وقت ایک پیالی چائے کے لئے بھی "بفے" کا طریقہ رائج ہونے کے باوجود مہمان کو یہ سبق پڑھایا گیا کہ ہمارے ہاں طریقہ یہ ہے کہ پہلے میز پر جاکر بیٹھ جاؤ کچھ دم لو۔ سیٹ پر اپنے قبضے کو پکا اور سچا کرو اور اس کے بعد بفے والی بڑی میز کی طرف بڑھو۔ مگر سب کے بھیڑ لگانے کی ضرورت نہیں! اگر بہت زیادہ لد پھند کرآنا منظور نہیں تو ایک دو آدمی جائیں اور سب کے لئے کچھ لے آئیں۔ واللہ اعلم اس میں اصلی ایٹی کیٹ کتنا تھا اور مہمان کی خاطر کتنی یہاں تو پہلے ہی مریدوں نے اور احباب نے نکما بنا رکھا تھا۔ دوسری منزل پر جہازوں کے اڑنے اترنے کی سیر کے دوران چائے کافی کے آنے کا انتظار کیا۔ اور جب جہاز پر سوار ہونے کے لئے نام کی ہانک پکار ہوئی تو کافی کا گلاس اس طرح چھوڑ کر جانا پڑا جیسے آب حیات سے محروم کیا جارہا ہو اور بلانے والے کچھ بہت زیادہ ہردل عزیز فرشتے نہ ہوں۔ مگر جن لوگوں نے لبیک کا وظیفہ سیکھ لیا ہو وہ ہر جگہ لبیک کہہ سکتے ہیں۔ سو ہم نے بھی کہا!

نکیلا شہر کیپ اور راس زمین کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جو سمندر میں کچھ دور چلا گیا ہو۔ رات کو نو بجے ہمارا جہاز بادلوں میں آنکھ مچولی کھیلتا روشنی سے جگمگاتے کیپ ٹاؤن میں اترا تو شہر واقعی نکیلا سجیلا لگا۔ سردی ڈربن سے بہت زیادہ تھی۔

کیپ ٹاؤن کی مسجد جیبیہ کے امام وخطیب اور خانقاہ کے سجادہ نشین حضرت عبداللطیف صوفی اور عنایت حسین گورا صاحب کے صاحبزادے میاں اسلم ایرپورٹ پر لینے تشریف لائے تھے۔ سفر کے دوران ساتھ ہی رہے۔ میرے میزبان کیپ ٹاؤن میں خود مسافر اور مہمان تھے۔ لیکن انھوں نے مجھ مہمان در مہمان کو فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھیرایا۔

اوّل مسجد دوسرے دن صبح ہم کیپ ٹاؤن کے اس محلہ میں گئے جہاں مسلمان سب سے پہلے آکر آباد ہوئے تھے۔ چار ساڑھے چار سو سال پرانا محلہ ہے۔ لیکن نہایت صاف ستھرا۔ اس علاقے کے سب سے اونچے اور خوبصورت ہرے بھرے پہاڑ کے دامن میں سطح سمندر سے خاصی بلندی پر آباد ہے۔ اس محلے میں یہاں کی سب سے پرانی مسجد بھی ہے غالباً جن اولین مسلمانوں نے یہ مسجد بنائی ان کو قبلے کی سمت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ بعد میں قبلے کو درست کیا گیا۔ مگر فرق چند ڈگری سے زیادہ نہیں تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس مسجد کو سلام کیا۔ یعنی تحیت مسجد کی نماز پڑھی اور اس تصور نے بڑا لطف دیا کہ یہاں نماز کا سلسلہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے کم از کم چار ساڑھے چار سو سال قریب تک بہ نسبت ہمارے زمانے کے پہنچتا ہے۔ اور اس پوری مدت میں نہ معلوم اللہ کے کتنے محبوب اور مقبول بندوں

نے یہاں سر جھکایا ہے۔

تین قیدی بزرگ بتایا گیا کہ مقامی کالی آبادی میں ممکن ہے کچھ گنے چنے مسلمان بھی رہے ہوں لیکن یورپ والوں نے ہندوستان کی تلاش میں راس امید CAPE OF GOOD HOPE اور کیپ ٹاؤن کو پایا اور آباد کیا تو سب سے پہلے انڈونیشیا اور ملیشیا کے اپنے نئے مفتوحہ علاقوں سے کچھ قیدیوں کو یہاں لاکر رکھا۔ مشرق بعید کے ممالک میں اس وقت تک اسلام پوری طرح پھیل چکا تھا۔ اور وہاں صوفی سلاسل کے شیوخ بڑے با اثر تھے۔ اور انھوں نے مقامی سلاطین اور راجاؤں کے علاوہ اپنے طور پر بھی بیرونی حملہ آوروں کی سخت مزاحمت کی تھی۔ چنانچہ ملیشیا میں سلسلہ عالیہ خلوتیہ قادریہ کے تین بڑے شیوخ کو۔ یوروپین حضرات نے جنگ کے بعد گرفتار کیا تو کسی اور بڑی بغاوت اور مزاحمت کے ڈر سے انھیں قتل تو نہ کر سکے لیکن ملیشیا ہی میں قید رکھنا بھی خطرے سے خالی نہ جانا اور انھیں کیپ ٹاؤن لے آئے۔ ایک بزرگ کو تو کیپ ٹاؤن شہر کے بالکل سامنے سمندر کے اندر اس چھوٹے سے جزیرے میں جیل بناکر رکھا جس میں موجودہ افریقی لیڈر نیلسن منڈیلا تیس برس قید رہے۔ دوسرے دو بزرگوں میں سے ایک کو ٹیبل ماؤنٹین کہلانے والے اونچے پہاڑ کی شمال ڈھلان پر اور دوسرے کو جنوبی ڈھلان پر عمر قید کاٹنی پڑی۔ ان تینوں بزرگوں نے قید ہی میں وفات پائی۔ لیکن ان کے فیوض و برکات کا یہ عالم رہا کہ پہاڑ کے شمال میں قید اور دفن کئے جانے والے بزرگ کی آرام گاہ انگریزوں کے زمانے ہی میں "اسلام ہل" یعنی "کوہ اسلام" کہلانے لگی۔ جنوبی قید خانے میں بند بزرگ کے اطراف مسلمانوں کا محلہ بسا۔ پہلی مسجد بنی جو آج تک موجود ہے۔ اور تیسرے بزرگ کے مزار کا نشان جو وصال کے بعد جزیرے کے قید خانے سے باہر لاکر ہ[...] افریقہ کے بالکل آخری اور جنوبی کنارے پر ساحل کی ر[...] میں دفن کئے گئے تھے۔ ان کا مزار ریت میں دب کر غا[...] ہو گیا اور کئی صدی تک غائب رہا۔ مگر ۱۹۲۵ء میں اس علاقے کے حبشی مویشی چرانے والوں میں سے کئی آدمیو[ں] نے ایک ہی روز ایک ہی طرح کا خواب دیکھا کہ بزرگ فرماتے ہیں میرا مزار فلاں مقام پر کئی گز گہرائی کے ان[در] موجود ہے۔ ریت ہٹاکر اس کو باہر نکالو۔ اس کا چ[رچا] اتنا زیادہ ہوا کہ اس وقت کے انگریز گورنر نے غا[لباً] محکمہ آثار قدیمہ کی نگرانی میں یہاں کھدائی کرائی تو پختہ مزار برآمد ہو گیا اور انگریز گورنر نے نہ صرف روضہ بنوایا بلکہ اپنی طرف سے انگریزی میں کتبہ بھی نص[ب] کیا۔ ایک معزز مسلمان تاجر نے بھی اس کار خیر میں نما[یاں] حصہ لیا۔

میں نے یہاں کے ایک کتابچے میں یہ قصہ پڑھ[ا] تو خیال آیا کہ بزمانہ طویل قید نیلسن منڈیلا صاح[ب] کی رگ رگ میں چار صدی پہلے کے بزرگ اور رح[مت] مآب بزرگ کی برکات اس طرح رچ بس گئیں کہ ان[...] کے علاوہ کوئی اور نئے افریقہ کی آزادی کا پہلا پرچ[م] لہرا سکا۔ نہ افریقہ کی آزادی کو کوئی روک سکا۔ یہاں تک ان بزرگ نے بھی آزادی کے ہراول ک[ی] سے پون صدی پہلے ظاہر ہو جانا ضروری سمجھا!

غلام حسین ملک صاحب بھائی عبدالمجید خا[ں] نظامی صاحب۔ ایک برادر نسبتی یعنی بیوی کے بھائی کیپ ٹاؤن ک[ے] اسی پرانے محلے میں آباد ہیں جہاں قدیم ترین مسج[د] واقع ہے۔ مسجد ان کے گھر سے بس چند قدم کے فاصلے پر ان کی گلی ہی میں ہے۔ مگر اس سڑک کو گلی کہنا اس کی توہین کرنا ہے۔ ہماری دہلی کی نئی کالون[یوں] کی گئی سڑکوں سے زیادہ چوڑی اور صاف ستھری سڑک ہے۔ تاہم قدامت کی علامات یہاں موجود ہ[یں]

سب سے پہلے قافلہ ملک صاحب کے ہاں پہنچا۔ میرے میزبانوں کے یہ بزرگ سگے ماموں یا ماموں خسر ہیں اپنی ضعیف اہلیہ کے ساتھ تنہا رہتے ہیں۔ ہر جمعرات کو ہفتہ بھر کا سودا میاں بیوی خود بازار جاکر خرید لاتے ہیں۔ اور دوسرے عزیز واقارب سے دور خلوت کی زندگی بسر کرتے ہیں اس طرح کے ماحول میں رہنے والا افسردہ غمگین اور بے تعلق سی شخصیت بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن ملک صاحب جوانوں سے زیادہ زندہ دل اور باغ و بہار ہیں۔ بڑے تپاک اور محبت سے ملے۔ اور ہم نے کیپ ٹاؤن کی سیر کے لئے ان کو رہنما بنالیا۔

ٹیبل ماؤنٹین } کیپ ٹاؤن کے سرہانے ایک بڑا اور ہرا بھرا پہاڑ اسی طرح واقع ہے۔ جس طرح ہندوستان کے نقشے میں ہمالیہ ہے۔ لیکن ہمالیہ پہاڑوں کے ایک بہت بڑے سلسلے کا نام ہے۔ لیکن ٹیبل ماؤنٹین جناب غلام حسین ملک صاحب کی طرح ایک تنہا اونچا ہرا بھرا، زندہ و زندہ دل پہاڑ ہے۔ اس کی شاخیں بمشکل تین چار ہوں گی۔ سب سے بلند جگہ میز کی طرح مسطح ہے۔ اور یہاں تک جھولا گاڑی یعنی کیبل ٹرالی جاتی ہے۔ ایک دوسری چھوٹی چوٹی سگنل ہل شاید اس لئے کہلاتی ہے کہ یہاں مواصلاتی آلات نصب ہوں گے۔ اس کو لائن ہیڈ ہل بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کی سب سے بلند اور بڑی چٹان شیر ببر کے سر کی ہم شکل ہے۔ ٹورسٹ اور سیلانی یہاں شیر کے نام نہاد سر کو دیکھنے جاتے ہیں۔ مگر ہم لوگ ایک اصلی شیر کے قدموں میں حاضر ہوتے۔ پہاڑ پر ایک خاص اونچی جگہ حضرت سید شاہ حسن محمود غیبی شاہ نامی بزرگ ہمیشہ کے لئے آرام فرما ہیں۔ بڑی سنسان مگر پرسکون اور پرفضا جگہ ہے۔ غالباً یہ بزرگ یہاں اللہ اللہ کرنے آتے ہوں گے دفن بھی اسی جگہ کر دیئے گئے۔ عقیدت مندوں نے روضہ بنوادیا۔ کسی کے پاس وقت ہو اور توفیق الٰہی بھی تو اس جگہ سے بہتر جگہ اعتکاف اور شغل و عبادت کی کوئی اور نہ ملے۔ کاش کہ ایک حجرہ یہاں اعتکاف کرنے والوں کے لئے بن جائے۔ موسم بھی آجکل ٹھنڈا ہونے کے باوجود بڑا خوش گوار تھا۔ اور روحانی کیفیت تو ایسی تھی کہ کیا بیان کیا جائے۔ بڑے لطف کی حاضری رہی۔

کرامت ! } کیپ ٹاؤن میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں اور علاقوں کی طرح بزرگوں کے مزارات کو نہ تو درگاہ کہا جاتا ہے۔ نہ روضہ حظیرہ اور زیارت! بلکہ "کرامت" کہتے ہیں۔ مثلاً یہاں کا محاورہ استعمال کیا جائے تو درگاہ حضرت خواجہ صاحب اجمیر شریف کو کرامت حضرت خواجہ صاحب اجمیر شریف کہا جائے گا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے بزرگان دین کی طرف سے کرامتوں کا اظہار اتنا زیادہ ہوا ہے کہ لوگ خود انہی کو کرامت کہنے لگے ہیں۔ حضرت غیبی شاہؒ کے مزار یا کرامت سے کچھ فاصلے پر ایک اور بزرگ حضرت نور المبینؒ آرام فرما ہیں۔ ان کے بارے میں زیادہ تفصیلات معلوم نہ ہوسکیں۔ لیکن ان کے مزار کے پاس ایک قدرتی پانی کا چشمہ جاری ہے۔ اس کی کرامات بہت مشہور ہیں۔ عبدالغنی صاحب نے بتایا کہ ان کے اکلوتے صاحبزادے میاں اسلم پرویز سلمہٗ ماں باپ کے ساتھ بہت چھوٹی عمر میں کیپ ٹاؤن کی سیر کو آئے تو یکایک سخت بیمار ہوگئے۔ اور انھیں اسپتال میں داخل کرنا پڑا جہاں ڈاکٹروں نے بہت تشویش ظاہر کی۔ عبدالغنی صاحب بچے کو اسپتال پہنچا کر حضرت امام عبداللطیف صاحب کے پاس دعا کے لئے گئے۔ انھوں نے ارشاد کیا کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں بھی دعا کروں گا لیکن تم فوراً پہاڑ پر چلے جاؤ اور حضرت نور المبینؒ کے مزار کے پاس جو چشمہ جاری ہے۔ اس کا پانی لے آؤ۔ اسپتال والے شاید بچے کو پانی پلانے پر اعتراض نہ کریں۔ پانی پیتے ہی انشاء اللہ بچہ

شک ہو جائے گا۔ عبدالغنی صاحب نے اس ارشاد
کی تعمیل کی۔ باہر کا پانی پلانا اسپتال کے قواعد و ضوابط
کے خلاف تھا۔ لیکن اسپتال کے غیر مسلم اسٹاف نے
جب یہ سنا کہ یہ حضرت نور المبین رح کی درگاہ یعنی کرامت
کا پانی ہے تو فوراً پانی پلانے کی اجازت دے دی۔
کیونکہ وہ اس سے پہلے بھی اس کے کرشمے دیکھ چکے
تھے۔ اور واقعی اللہ کے حکم سے میاں اسلم پرویز نے
جیسے ہی پانی پیا ان کو صحت ہوگئی۔ اس واقعے سے
متاثر ہو کر عبدالغنی صاحب نے اپنے صاحبزادے کو
بیعت بھی حضرت امام عبداللطیف صاحب صوفی سے
کرایا ہے۔

افسوس حضرت نور المبین صاحب کے مزار
مبارک تک پہنچنے کے لئے اتنی زیادہ سیڑھیاں پہاڑ
پر چڑھنی پڑتی ہیں کہ مجھ دل کے مریض نے اس کی
ہمت نہیں کی۔ رہا پانی تو وہ میرے لئے اپنے آقا
حضرت محبوب الٰہی رح کی باؤلی ہی کا آب حیات کی
حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت نور المبین کی وفات ۱۷۱۳ء
میں ہوئی تھی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس سلسلے کے
بزرگ ہیں۔

جنت ارضی } اس کے بعد پہاڑی کے دامن میں
جس کرامت تک غلام حسین صاحب
لے گئے وہ کرامت تو جس طرح ہے اس طرح ہے۔ لیکن
اس کا ماحول میں نے جنت سے کم نہیں پایا۔ ایک چشمۂ شیراز
میں حضرت سعدی علیہ الرحمہ کی قبر کو رات دن ٹھنڈک
پہنچانے والا دیکھا تھا۔ دوسرا یہاں حضرت
عبدالرحمٰن مطیبی شاہ قادری کے مزار پر دیکھا۔
اطراف انگور اور دوسرے پھلوں کے باغات طرح طرح
کے خوبصورت پھول، پودے۔ مزار کے پائتیں کے
رخ دائیں جانب پہاڑ سے ایک چھوٹا سا آبشار بن کر
چشمے کا پانی گرتا ہے۔ اور حضرت کے پہلو میں سے
نکل کر تاکستانوں اور باغات کی سیرابی کا باعث
بنتا ہے۔ یہاں عقیدت مندوں کی مقامی آبادی بالکل
نہیں ہے۔ یہ گوروں کا علاقہ چند دن پہلے تک تھا اور کسی
رنگین آدمی کو یہاں صورت دکھانے کی بھی اجازت
نہیں تھی۔ لیکن بزرگوں کی صبغۃ اللّٰہی ہستیاں یعنی وہ
ہستیاں جو اللہ کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں بے
ٹوک یہاں آرام فرما ہیں۔ گوروں نے خود اسے اسلا
کہنا شروع کر دیا۔ اطراف دور دور فاصلوں پ
گوروں کے کچھ بنگلے بنے ہوئے ہیں۔ باغات کے مالک
بھی گورے ہیں۔ یہاں صفائی اور دیکھ بھال کے لئے
کبھی کبھی باہر سے کوئی آجاتا ہے۔ اگر کوئی یہاں کا مستق
مجاور بنے تو کیسا خوش نصیب کہلائے!

تین میں سے ایک } غلام حسین صاحب نے بتا
تین ملیشیائی قیدی بزرگو
میں سے ایک اسی علاقے میں آرام فرما ہیں لیکن ان کی کرا
کا راستہ وہ بھول گئے۔ بنگلوں اور باغوں کے درم
بھٹک بھٹکا کر واپس جانا چاہتے تھے کہ اس سنسا
علاقے میں غیبی مدد بن کر ایک صاحب نظر آئے اور
انھوں نے درگاہ کے راستے تک پہنچایا۔ فد
یورپین بنگلوں کی طرح درگاہ کی مرکزی عمارت
اطراف دور تک کھلی ہوئی افتادہ زمین باغ کی صو
میں تین چار فٹ اونچی چار دیواری سے گھری ہوئی
ایک رخ درگاہ کی اندرونی باؤنڈری اور عمارت تھ
مگر بالکل سناٹا۔ نہ کوئی مجاور نہ زائر!

عجیب واقعہ } ملک صاحب اور عبدالغنی صاح
ڈاکٹر عبدالخالق اور ان کی بیگما
ذرا پیچھے رہ گئے تھے۔ میں ان کا انتظار کرنے کے لئے
بیرونی گیٹ کے پاس ٹھیر گیا اور خدا معلوم کیوں مج
اس جگہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری خط
عرفات یاد آیا جہاں سرکار دو عالم نے ایک لاکھ
کے مجمعے سے پوچھا تھا کہ کیا تم گواہی دیتے ہو کہ میں
اللہ کا پیغام تم تک پہنچا دیا۔ اور رسالت کے فرض

ادا کر دیا؟ اور جب حاضرین نے ایک آواز ہو کر کہا
کہ بے شک ہم گواہی دیتے ہیں تو حضورؐ نے تین دفعہ
اس بات کی تکرار کرائی اور آسمان کی طرف رخ کر کے
فرمایا کہ اے اللہ تو بھی گواہ رہیو!

میں جب بھی اس واقعے کو یاد کرتا ہوں۔
حضورؐ کی اس عجیب و غریب شہادت طلبی کا تصور
کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اللہ اکبر کیسے کیسے
دکھ جھیل کر اور کیسی جانفشانی سے حضورؐ نے رسالت
کا حق ادا فرمایا اور اس کے بعد بھی لوگوں کو اور اللہ کو
گواہ کرنا ضروری سمجھا!

اسلام ہل کی درگاہ سے باہر پہنچ کر جیسے ہی
مجھے عرفات کا تاریخی واقعہ یاد آیا۔ یہ خیال بھی اس کے
ساتھ ہی آیا کہ حضور روحی فداہ، کی رسالت کی
گواہی اس وقت موجود ایک لاکھ صحابہ کرامؓ ہی نے
نہیں دی تھی۔ ہر زمانے کے بزرگانِ دین اور اہل ایمان یہ
گواہی دیتے آئے ہیں۔ اور یہ تین بزرگ جنھوں نے اسلام
کی خاطر پوری زندگی قید میں بسر کر دی اور سخت تکلیفیں
اٹھانے کے باوجود حرف شکایت زبان پر نہ لائے اور
جیل میں جان جہاں آفریں کے سپرد ہنسی خوشی
فرما دی ان سے بڑا گواہ اس کامیاب رسالت کا بھلا
اور کون ہو سکتا ہے؟

جس وقت میرے دل میں یہ خیال آیا میں
درگاہ کے اندرونی دروازے سے تقریباً پچاس گز
دور تھا۔ ٹھیک اسی وقت درگاہ کا بند دروازہ ایک
جھٹکے کے ساتھ اس طرح کھل گیا جیسے کسی نے بڑے
زور کا دھکا دیکر اسے اندر سے کھولا ہو۔ اور عین
اسی وقت میرے دل میں یہ خیال گزرا جیسے کوئی کہتا
ہو ہاں! بے شک ہم حضور رسالت مآبؐ کی رسالت
کے گواہ ہیں!

میں دم بخود ہو کر کبھی درگاہ کی طرف دیکھتا تھا
کبھی پلٹ کر اپنے ساتھیوں پر نظر ڈالتا تھا جو ذرا
پیچھے رہ گئے تھے اور آپس میں باتیں کرتے ہوئے اور
زمین کی طرف نظریں جھکائے آہستہ آہستہ قدم
بڑھا رہے تھے۔ دروازے کے اس طرح یکایک کھل
جانے نے انھیں بھی چونکا دیا تھا اور وہ بھی کھڑے
ہو کر درگاہ شریف کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے
کہ شاید اس کے بعد دروازہ کھولنے والا خود بھی باہر
نکلے! مگر وہاں نہ درگاہ کے اندر کوئی آدمی موجود
تھا نہ باہر!

آخر اندر جا کر دیکھا۔ مزار شریف قیمتی غلاف
سے آراستہ خوشبو سے مہک رہا تھا۔ ایک رخ
انگریزی میں حضرت کے حالات پتھر پر کندہ تھے۔ ہوا نہ
باہر چل رہی تھی۔ نہ اندر کوئی روزن ایسا تھا جس کے
ذریعے ہوا کا دباؤ دروازہ کھولتا۔ سب حیرت زدہ تھے۔
ڈاکٹر خالق صاحب سائنسداں آدمی ہیں۔ انھوں نے
اندر جا کر سب سے پہلے دروازے کے ہینڈل اور
لاک کا جائزہ لیا؟ اور معائنے کے بعد وہ بھی خاصے
حیران ہوئے کہ جب تک اس ہینڈل کو گھمایا نہ جاتا۔
دروازے کا اپنے آپ کھل جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس
وقت میں نے ساتھیوں کو بتایا کہ جس وقت دروازہ
کھلا ہے میرے دل میں کیا خیال آ رہا تھا!

اس واقعے کے بعد جیسی پر کیف حاضری حضرت
کے ہاں ہوئی ہے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا!
حضرت کا اسم گرامی سید محمودؒ ہے۔ حضرتؒ کی درگاہ
میں ایک خاص طرح کے جلال اور ہیبت کی کیفیت
بھی میں نے محسوس کی۔

ان تین بزرگوں میں جنکا ذکر اوپر آیا یہ حضرت
بھی شامل ہیں۔ ان کے دوسرے ساتھی پہاڑ کی دوسری
جانب ملک صاحب کے محلے کے قریب آرام فرما ہیں۔
جن کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ غیر ملکیوں نے ان کو قید
کرنے کے بعد کیپ ٹاؤن میں گھر گھر تلاشی لے کر
قرآن مجید کے سارے نسخے برآمد کرالئے اور انھوں جلوادیا

کر نہ قرآن ہوگا نہ اس کی تعلیمات پھیلیں گی۔ مگر ان بزرگ نے ضعیفی کے باوجود بڑے جتن سے کاغذ قلم روشنائی جیل میں فراہم کی اور چپکے چپکے خفیہ قرآن مجید تحریر فرمایا کیونکہ وہ حافظ قرآن بھی تھے اور پھر اس نسخے کو باہر پہنچوا دیا۔ جس سے مزید نقلیں راز میں تیار کرالی گئیں۔

دوسرے بزرگ } کیپ ٹاؤن کی کھاڑی کو تین طرف سے زمین اور پہاڑ گھیرے ہوئے ہیں جیسے کسی نے اپنے دونوں بازو پھیلا کر کھاڑی کو گلے لگانا چاہا ہو۔ درمیان میں سمندر کے بیچوں بیچ وہ جزیرہ ہے جہاں تیسرے ملائی بزرگ اور موجودہ زمانے میں نیلسن منڈیلا قید رکھے گئے۔ یہ سمندر بحر ہند کا آخری حصہ ہے اس سے آگے راس امید سے بحر اوقیانوس شروع ہوجاتا ہے۔ جزیرے اور جیل خانے تک جانے کی عام اجازت نہیں ہے۔ وہ علاقہ اب تک ہائی سیکورٹی علاقہ بنا ہوا ہے۔ ہفتے میں صرف ایک روز وہاں اسٹیمر جاتا ہے۔ اور اس میں جزیرے تک جانے والے بھی خاص اجازت حاصل کرنے کے بعد ہی جاسکتے ہیں۔ مگر اب یہ بزرگ افریقہ کے ساحل ہی پر دائمی نیند سو رہے ہیں۔ اس لئے ان تک پہنچنے کے لئے اجازت درکار نہیں ہے۔ انشاء اللہ کل وہاں حاضری ہوگی۔ البتہ دوسرے بزرگ کے ہاں حاضری دے لی۔ وہی بزرگ جو قرآن مجید کے حافظ ہی نہیں تھے محافظ بھی بن گئے! جی چاہا کر کوئی قوال ہو اور حضرت امیر خسروؒ کی مشہور غزل

بخوبی ہم چو مہ تابندہ باشی!

گائے۔ اللہ تمہیں ہمیشہ چاند کی طرح جگمگاتا رکھے! صوفیہ کو جھاڑ پھونک گنڈے تعویذ تک محدود سمجھنے والے ذرا آئیں اور دیکھیں کہ دین کی لاج ہی کو نہیں خود دین کو کس نے محفوظ رکھا ہے۔ کس نے پھیلایا ہے علم

ہوٹل جہاز یا مچھلی گھر! } لنچ کے لئے میزبان سمندر کے کنارے واقع ایک نہایت دلچسپ ریسٹو[ران] میں لے گئے۔ جو تمام تر پرانے جہازوں کی لکڑی سے سمن[در] کے بالکل کنارے بنایا گیا ہے۔ ہوٹل کی تعمیر میں لکڑ[ی] اس طرح استعمال ہوئی ہے جیسے جہاز کے ایک ایک حصے کو جوں کا توں ہوٹل میں فٹ کر دیا گیا ہو۔ او[ر] ہوٹل میں جانے والے دراصل پانی کے کسی قدیم لکڑ[ی] کے جہاز ہی میں گھوم رہے ہوں۔ یہاں کے کھانوں [میں] طرح طرح کی تازہ بتازہ اسی وقت پکڑی ہوئی مچھلی[وں] کی بڑی دھوم ہے۔ ہم نے بھی جی بھر کر ان سے لطف اٹھایا۔ ہوٹل کے نچلے حصے میں دوکانیں بھی ہیں۔ خاص[کر] ایک دوکان مچھلی فروخت کرنے کے لئے بھی ہے۔ مگر یہاں نہ صفائی زیادہ نظر آئی۔ نہ قصائی کی مذکورہ با[لا] دوکان کی نفاست! بدبو اور بساند بھی خاصی تھی۔ شام کو تھکے ہارے ہوٹل پہنچے۔ ایک پاکستا[نی] ہوٹل سے منگا کر خالص پاکستانی ذوق کا کھانا کھا[یا]۔

تیسرے بزرگ } اگلے دن جمعہ تھا۔ صبح صبح نہا[کر] عمدہ ناشتہ کرکے تیسرے ملا[ئی] بزرگ کی زیارت کو نکلے۔ وہ شہر سے بہت دور ہ[یں]۔ دو ڈھائی گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد کئی کالی آبادیوں [کے] بیچ میں سے گذر کر وہاں پہنچے۔ کالی آبادیاں سب کی س[ب] غربت کا نمونہ تھیں۔ درگاہ شریف بالکل سمندر [کے] کنارے ہے۔ چند گھر وہاں حال میں مسلمانوں او[ر] ہندوستانیوں کے بھی بس گئے ہیں یہ جگہ مقصر کہلا[تی] ہے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ درگاہ شر[یف] سے باہر آرائش کے لئے کئی قدیم زمانے کی توپیں [بھی] نصب ہیں۔ یہ درگاہ بھی انگریزوں کے زمانے [میں] بنی۔ توپیں بھی ممکن ہے آثار قدیمہ کی تلاش اور کھ[دائی] کے دوران مزار شریف کے اطراف سے برآمد ہ[وئی] ہوں اس لئے مزار کی تعمیر ہوئی تو انھیں بھی یہا[ں] نصب کر دیا گیا۔ غالباً یہ جگہ کیپ ٹاؤن شہر کی حفا[ظت] کرنے والے کسی قدیم ساحلی مورچے کی رہی ہو[گی]

اسی مورچے میں جزیرے والے بزرگ کو انتقال کے بعد جزیرے سے لاکر دفن کر دیا ہوگا اور پھر یہ پوری جگہ کسی سمندری طوفان کے دوران ریت سے اٹ کر غائب ہو گئی ہو گی تاکہ نئے زمانے میں پھر ظاہر ہو اور ایک ثبوت اس بات کا مہیا کر دے کہ

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

جیبیہ } درگاہ شریف کی زیارت سے فارغ ہوتے ہوتے جمعے کی نماز کا وقت قریب آگیا۔ سلسلہ عالیہ سلیمانیہ حافظیہ جیبیہ کا ایک مرکز کیپ ٹاؤن کی ڈاؤن ٹاؤن آبادی سے دور ایسا ہے جو درگاہ سے شہر کی بہ نسبت قریب تھا اس لئے ہم لوگ نماز کے لئے وہیں چلے گئے۔ یہ پورا محلہ جیبیہ کہلاتا ہے خانقاہ اور مسجد نہایت عالی شان ہیں۔ حضرت امام عبداللطیف صاحب اور ان کے رفیقوں نے اپنے اعلیٰ کام سے اس مرکز کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ قریب کی غریب کالی آبادیوں کے بے شمار افراد مسجد کے اطراف جمع تھے یہ سب لنگر لینے آئے تھے۔ نماز کے بعد ہر آدمی کو بڑے سائز کی آدھی آدھی ڈبل روٹی تقسیم کی گئی اور اس تبرک سے غریب لوگ بے حد خوش نظر آئے۔ مسجد میں نماز شافعی طریقے سے ہوئی۔ اور اس بات سے بھی مجھے بہت خوشی ہوئی کہ سلسلہ عالیہ کے صوفی بزرگوں نے جو خود سب کے سب حنفی ہیں مقامی آبادی کے مسلک کا اس درجے احترام کیا ہے کہ ان کی کثرت کے پیش نظر اپنی مسجد میں نماز شافعی طریقے سے بھی جائز رکھتے ہیں۔

نماز سے پہلے وعظ بھی ہوا جس میں حضرت امام صاحب کے صاحبزادے اور ایک دوسرے عزیز قطب میاں صاحب نے جو ندوے کے فاضل ہیں حصہ لیا۔ تقریریں انگریزی میں ہوئیں۔ مسجد میں قیمتی قالینوں کا فرش تھا۔ وضو کا انتظام بھی صاف ستھرا اور اعلیٰ درجے کا۔ مسجد کے ساتھ ایک بڑا مدرسہ بھی ہے اور اس سے ملحق سلسلہ عالیہ کے بزرگوں کے مزارات اور درگاہیں!

حضرت امام صاحب نے ہمیں رات کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ مگر دوپہر کو بھی لنگر میں شریک فرمایا: سب اہل خانہ اور احباب کھانے کی میز پر موجود تھے۔

دوسری میز } جیبیہ میں کھانے کی میز کے بعد ہم لوگ ٹیبل ماؤنٹین پر لے جائے گئے۔ اگرچہ مجھے قلب کا دورہ پڑنے کے بعد سے ڈاکٹروں کی ہدایت ہے کہ ہر کھانے کے بعد کم از کم ایک گھنٹہ لازمی طور پر آرام کروں۔ مگر میزبان چاہتے تھے کہ میں ٹیبل ماؤنٹین تک کیبل ٹرالی میں ضرور جاؤں اور اس اونچی میز سے شہر اور اطراف کی سیر کروں۔ چنانچہ میری بے شوقی کے باوجود اصرار کر کے لے گئے۔ ٹرالی اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد پتہ چلا کہ وہاں تو ایک بہت اونچے زینے پر چڑھنے کے بعد ہی جایا جا سکے گا۔ سیڑھیاں چڑھنا ویسے ہی دل والوں کو منع ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ کہ کھانا کھانے کے بعد چڑھا جائے۔ تاہم ڈاکٹر عبدالخالق ساتھ تھے۔ توبہ کو توڑ تاڑ کے گھبرا کے پی گیا کے مصداق میں بھی لاموجود الا اللہ یعنی یہ رٹ لگا کر ساری سیڑھیاں چڑھ گیا کہ اللہ کے سوا کچھ موجود ہی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ یہ سیڑھیاں بھی موجود نہیں ہیں۔ اور ان سیڑھیوں پر چڑھنے والا میں خود بھی غائب ہی ہوں۔ الحمد للہ اس تصور نے بڑی مدد کی اور بخیر و خوبی اوپر پہنچ گیا۔ ٹرالی میں سے پہاڑ پر جگہ جگہ مسلمانوں کی قبریں چادریں چڑھی ہوئی نظر آئیں اور پتہ چلا کہ انگریز اس کا نام "اسلام ہل" رکھنے پر کیوں مجبور ہوئے۔ ہمارے بظاہر مُردوں لیکن بہ باطن زندوں نے تو یہاں چھاؤنی سی چھا رکھی ہے۔ اگر یہاں اسلام کے نمائندے نام نہاد وہابی اور قبر شکن حضرات ہوتے تو اس جگہ کا نام بھی کبھی اسلام ہل نہ پڑتا!

پہاڑ پر سے شہر اور سمندر کا نظارہ واقعی دیدنی تھا!

اللہ کے سوا کسی سے مدد

کیپ ٹاؤن میں بیگم عبدالمجید نظامی کے بھائی ملک صاحب کے علاوہ ان کی ایک بہن امینہ صاحبہ بھی رہتی ہیں۔ جمعے کی نماز سے پہلے بھی ہم لوگ ان کے پاس گئے تھے اور عصر کے بعد دوبارہ گئے۔ ان کے بچے ماشاء اللہ دین دار اور سمجھ دار ہیں۔ ان کی صاحبزادی کا نام بھی فاطمہ ہے۔ یہ نام افریقہ میں بہت مقبول نظر آیا۔ فاطمہ سلیمانے اپنے کچھ پڑوسیوں کو بھی جمع کر رکھا تھا۔ انہی میں ایک ڈاکٹر صاحب اور ان کی اہلیہ بھی تھے۔ اہلیہ مشہور انگریز صوفی بزرگ حضرت مولانا شہید اللہ علیہ الرحمہ کی مرید ہیں۔ مولانا شہید اللہ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے عقیدت مندوں میں تھے۔ پھر مسلمان ہوئے۔ ایک درویش سے بیعت کی۔ خلافت پائی اور خود بہت بڑے صاحب ارشاد بزرگ بنے۔ بکثرت لوگوں نے ان سے ہدایت حاصل کی۔ ان کی مریدہ تو ظاہر ہے کہ بہت خوش عقیدہ ہیں لیکن ان کے شوہر ڈاکٹر صاحب کو ان جاہل واعظوں نے غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا جو مسجدوں میں اور اجتماعات میں روٹی روزی کے لئے اختلافی تقریریں کرتے پھرتے ہیں۔ ان کے سامعین کی اکثریت براہ راست قران وحدیث کا کوئی علم نہیں رکھتی۔ نہ ان کی رسائی صحیح اور مفید دینی لٹریچر تک ہوتی ہے۔ اس لئے وہ آسانی سے غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ حضرت شہید اللہ کی مرید خاتون کے شوہر بھی اس طرح کے واعظوں کی تقریریں سن کر غلط فہمی میں پڑ گئے تھے اور اپنی اہلیہ کے عقائد اور اعمال پر اعتراض کرتے تھے۔ مجھ سے ملنے تشریف لائے تو خاصی سخت گفتگو فرمائی۔ پہلے تو میں نے انھیں عقلی اور نقلی دلائل سے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ براہ راست قران وحدیث کا علم نہ رکھنے کی وجہ سے کچھ متاثر نہیں ہوئے تو میں نے ان کی سمجھ کے موافق طریقہ اختیار کیا۔ انھیں سب سے زیادہ اعتراض اس بات پر تھا کہ اولیاء اللہ کے مزارات پر منتیں کیوں مانگی جاتی ہیں اور ان سے مدد کیوں طلب کی جاتی ہے۔ یہ شرک اور حرام ہے! محترمہ امینہ صاحبہ کے ہاں چائے آئی اور ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی اہلیہ سے جو حضرت مولانا شہید اللہ صاحب کی مرید ہیں۔ کہا کہ ذرا میز پر سے پلیٹ اٹھا کر دینا تو مجھے موقعہ مل گیا اور میں نے فوراً ان خاتون سے کہا کہ آپ پلیٹ نہ اٹھائیں بلکہ دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا مانگیں اور کہیں کہ یا اللہ یہ پلیٹ میرے شوہر کو دے دے اور انھیں اس شرک سے بچا کر وہ تیرے بجائے مجھ سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ یہی طریقہ آپ کو اپنے گھر میں ہمیشہ رکھنا چاہیئے۔ اور اللہ کے سوا کسی سے کچھ طلب نہیں کرنا چاہیئے! ڈاکٹر صاحب اس عجیب وغریب صورت حال سے ذرا زچ ہوئے تو میں نے عرض کیا کہ حضرت! اللہ کے حکم کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا۔ اللہ نے ہم سب کو ایسی صلاحیت دی ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کرسکیں اور باہم کام آئیں۔ بزرگانِ دین کو ہم زندہ سمجھتے ہیں اور یہ قران کا ارشاد ہے کہ جو اللہ کی راہ میں جان دے وہ زندہ ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان ولیوں کو وہ طاقت عطا فرمائی ہے جو بظاہر ہم زندہ لوگوں کو بھی میسر نہیں ہے۔ جب ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں ایک دوسرے سے مدد مانگتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور اس میں کوئی شرک نہیں ہوتا کیونکہ ہم سب کا عقیدہ یہ ہے کہ فاعل حقیقی اللہ ہی ہے تو پھر بزرگوں سے کچھ مانگنے میں جو ہم سے یقیناً زیادہ قوی اور تصرف کی صلاحیت رکھنے والے ہیں مگر اللہ نہیں ہیں کچھ مانگنا شرک کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب ڈاکٹر صاحب کے پاس نہیں تھا۔ اس لئے اس کے بعد انھوں نے زیادہ بحث نہیں فرمائی۔ اللہ تعالیٰ انھیں نیم حکیم خطرہ جان کی طرح نیم ملا خطرۂ ایمان مولویوں سے بچاتے رکھے۔

رات کی دعوت حضرت امام عبداللطیف صاحب
...ں تھی۔ پر تکلف ڈنر تھا۔ مولانا قطب الدین صاحب
... ندوۃ العلماء بھی تشریف لائے تھے۔ حضرت امام
...ب نہایت خاموش طبیعت کے بزرگ ہیں۔
... مل کر دل کو بھی راحت حاصل ہوتی ہے اور یہی
بزرگی کی پہچان ہے۔

...سا امید} دوسرے دن ہم لوگ کیپ ٹاؤن
سے خاصی دور راس مشہور تاریخی
...کو دیکھنے گئے جو راس امید
...م سے مشہور ہے۔ یوروپ والے اپنے بادبانی
...زوں میں سونے کی چڑیا کہلائے جانے والے ملک
...وستان کی تلاش میں عرب جہاز رانوں کی
...ی میں روانہ ہوئے تو ہفتوں مہینوں کے سفر
...عد انھیں سب سے پہلے زمین کا جو حصہ نظر آیا وہ
...قہ کے جنوبی ساحل کا وہ مقام تھا جہاں بحر ہند
بحر اوقیانوس یعنی انڈین اوشن اور اٹلانٹک
...ن ملتے ہیں اس کا نام انھوں نے راس امید رکھا
...ندوستان پہنچنے کی جگہ انڈونیشیا اور ملیشیا کی
... جا نکلے۔ پرتگالیوں فرانسیسیوں اور انگریزوں
...ل ہندوستان کا راستہ بعد میں ملا۔

کئی گھنٹے کے سفر کے بعد راس امید تک
...۔ ساحل کے کنارے کنارے کیپ ٹاؤن سے وہاں
...سڑک گئی ہے اور بہت خوبصورت اور آباد
...ہے۔ مچھلیاں پکڑنے والے بھی یہاں ساری دنیا
...آتے ہیں۔ سمندر بے حد شفاف اور ساحل
... صاف ہے۔ جہاں جہاں سڑک ساحلی پہاڑوں
...ے گذرتی ہے۔ اونچائی سے سمندر کی تہہ نظر آتی ہے
...لیان مقامات پر بھی پانی خاص گہرا ہوتا ہے۔
... جگہ دو وہیل مچھلیاں بھی نظر آئیں بالکل ایسا
تھا کہ دو چھوٹی چھوٹی آبدوزیں پانی کے اندر

بھی ہے۔ یہاں بندر بکثرت ہیں۔ ایک دو جگہ شتر مرغ
بھی نظر آئے۔ دوپہر کے قریب ہم لوگ راس امید پہنچے
بہت خوبصورت جگہ ہے۔ ساری دنیا کے ٹورسٹ موجود
تھے۔ تصویریں دھڑا دھڑ کھینچ رہی تھیں۔ مگر میں نے
اپنے میزبانوں سے کہا کہ میں تو ظہر کی نماز پڑھ کر اور اس سے
پہلے دو رکعت شکرانے کی نماز ادا کر کے اس آمد کو یادگار
بنانا چاہتا ہوں کہ میرے لئے تو دوسری دنیا کی تلاش
اور وہاں کے خزانوں اور دولت کی دریافت میں
اصل راس امید نماز اور خدا کی یاد اور فرمان برداری
ہی ہے۔ نیز یہ فخر بھی رہے گا کہ میں نے افریقہ کی آخری نوک
پر نماز پڑھی۔ ہم لوگوں کی نماز گورے سیلانیوں کے لئے
تماشا بھی بنی! لیکن اس کی ہمیں پرواہ نہیں تھی بقول
کسے WHO CARES ?

واپسی میں ہوٹل سے سامان اٹھایا حضرت
امام عبداللطیف صاحب کی خدمت میں حاضری دی اور
ایرپورٹ کا رخ ڈربن آنے کے لئے کیا۔ تاہم دو تین دن
کی زبردست بھاگ دوڑ کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ عصر
کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آیا تو سینے میں سخت درد
ہو رہا تھا۔ حضرت امیر خسرو رحمہ کے مشہور مصرعے نے
نیا لطف دیا۔

درد ہا دادی و درمانی ہنوز!

آپ نے درد دیا اور اس کا درمان اور علاج بھی
بس آپ ہی ہیں! یہ بات بھی یاد آئی کہ ایمان امید اور
ناامیدی کے بین بین ہے!

بائیبل} جہاز میں وقت گذاری کے لئے اخبار رسالے
سب جگہ رکھے رہتے ہیں۔ اس جہاز میں یہ
دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ایک بائیبل بھی رکھی ہوئی تھی
میں نے اسی کو پڑھنے کے لئے اٹھایا۔ جہاز کے عیسائی
عملے کے لئے یہ حیرت کی بات تھی کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ
میں مسلمان ہوں۔ کیپ ٹاؤن پہنچا ہوں تو بعض لوگوں کو اس

بائبل کا ایک بہت قدیم نسخہ دکھانا چاہا تو میں نے وضو نہ ہونے کی معذرت کی اور پھر وضو کرنے کے بعد ہی اسے ہاتھ میں لیا۔

میں نے حیرت زدہ لوگوں سے کہا کہ اگرچہ قرآن کے علاوہ سب آسمانی کتابوں میں تحریف اور ردّ و بدل مسلمانوں کے نزدیک ہو چکا ہے۔ تاہم ان میں اگر ایک لفظ بھی اصل کتاب کا باقی رہ گیا ہے اور وہ اللہ کا کلام ہے تو میرا فرض یہی ہے کہ اس کا احترام اس طرح کروں کہ باوضو ہاتھ لگاؤں۔ اور احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ گمان کیا جائے کہ ان میں کچھ نہ کچھ اصلی ضرور موجود ہوگا۔ باقی کسی کی سمجھ میں میری دلیل آئی یا نہیں اس کا تو مجھے علم نہیں لیکن غلام حسین ملک صاحب نے فوراً ارشاد کیا کہ بے شک یہی رویہ سچے اور اچھے مسلمان کا ہونا چاہیے۔ اور میرے نزدیک تم واقعی سچے مسلمان ہو! میں نے دل میں سوچا کہ یہ فیصلہ تو خیر اللہ میاں ہی صحیح فرما سکتے ہیں کہ میں کیسا مسلمان ہوں۔ تاہم ان سے دعا یہی ہے کہ خود اپنی ذات پاک کی محبت ہی نہیں اپنی ذات پاک سے متعلق ہر چیز کی عقیدت اور محبت میرے دل میں پیدا فرما دیں۔ حالانکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی ذات پاک ہر تعلق سے بے نیاز ہے۔ مگر میں کسی چیز سے بھی بے نیاز نہیں ہوں! بس نیاز مند ہی نیاز مند ہوں۔

نئی جنت

راستے میں جہاز جوبرگ اور نیو لنڈن پر ٹھہرا۔ انگریز جب افریقہ آئے یا امریکہ گئے وطن کی یاد میں ہر نئی جگہ کا نام اپنے وطن کے کسی مقام کے نام پر رکھا بس لفظ "NEW" "نیو" کا اضافہ اس کے ساتھ کر دیا۔ نیو یارک! نیو جرسی! شداد بھی اپنی جنت کو صرف جنت نہ کہتا۔ "نیو جنت" نام دے دیتا تو یوں مجرم نہ بنتا اور کارکنان قضا و قدر یہ سوچ کر معاف کر دیتے کہ اسے اپنے

رات کو ڈربن ایئرپورٹ پر میاں اسلم پرویز ملنے آئے تھے۔ ان کا آنا یوں بھی حسب حال تھا کہ ہم ان کے پیر خانے اور اس مقام سے آرہے تھے جہاں ان کو بچپن میں نئی زندگی ملی تھی۔ ابھی کم عمر ہیں۔ بڑے ہوں گے تو انشاء اللہ کیپ ٹاؤن سے آنے والوں میں پیر کی خوشبو بھی محسوس ہونے لگے گی۔ خس کا عطر صرف گرمیوں میں اور مولسری کا عطر صرف برسات میں اپنی پوری خوشبو دیتا ہے! یہ وقت گویا ان عطریات کے "ظہور" کا وقت ہوتا ہے۔ حضرت صابر پاک کا مزار ہندوستان میں اور کیپ ٹاؤن کے قیدی بزرگ کا مزار افریقہ میں اسی طرح ظاہر ہوئے۔ اہل بیت پاک کی مہک بھی حضرت مہدی علیہ السلام کے روپ میں شاید اسی طرح جان و دل کو معطر کرے! ایک خاص وقت پر!

ڈربن سے رخصت

کیپ ٹاؤن سے واپس آکر ڈربن میں کئی دن گذارے۔ جی چاہتا تھا کہ اس کی ساری تفصیل لکھوں مگر عمر کے آخری حصے میں جس طرح کام تفصیلات پر توجہ کئے بغیر بس لشتم پشتم ہو جاتے ہیں اسی طرح سفرنامے کا یہ حصہ لکھا جا رہا ہے۔ ہر سفر زندگی کے اصل سفر ہی کی مشابہت رکھتا ہے۔ اگر دوسری زندگی ملی دوبارہ افریقہ آنا قسمت میں ہوا تو ممکن ہے سفر کا آخری حصہ ابتدائی حصے سے زیادہ مفصل ہو۔ اب تو میں لکھتے لکھتے تھک گیا۔ ناظرین پڑھتے پڑھتے تھک گئے ہوں گے۔ ممکن ہے بور بھی ہوئے ہوں۔ اس کی معافی چاہتا ہوں۔ بعد کے دنوں میں بھی بھائی عبدالمجید خاں نظامی کے صاحبزادگان صاحبزادیوں اور دوسرے عزیز و اقارب اور احباب کے ہاں دعوتیں ہوتی رہیں۔ سب کی دوکانوں اور تجارتی مرکزوں پر جاتا رہا۔ چلتے وقت تحائف کا جیسے سیلاب آگیا ہو۔ ایئرپورٹ پر سارا خاندان حضرت قاضی صاحب حضرت سعید صاحب سجادہ نشین حضرت صوفی صاحب اور احباب کا کثیر مجمع رخصت کرنے آیا۔ آسانیاں ہم پہنچائیں خاص کر عبدالمجید صاحب کے دوستوں نے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے اور سال بھر بعد سفرنامہ لکھنے کی وجہ سے کوئی بھول چوک ہوئی ہو تو اسے معاف فرمایا جائے۔ بہت سے احباب کی کرم فرمائیوں کا تذکرہ چھوٹ گیا ہے۔

مدیر

خواجہ حسن ثانی نظامی

معاون مدیر

خواجہ مہدی نظامی

منادی ایمانی وی الایمان

بارگاہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ سے

ایمان اور امن کی ندا دینے والا

اور اُن کے جانشین

امام المشائخ شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی یادگار

ماہنامہ منادی نئی دہلی

درگاہ شریف اور منادی کے بارے میں خط و کتابت کرنے اور قیمت جمع کرانے کا پتہ

خواجہ حسن ثانی نظامی

ڈاکخانہ حضرت نظام الدین اولیاء

نئی دہلی ۱۳-۱۱

منادی ۱۹۲۶ء سے جاری ہے یہ انہترویں جلد (۱۹۹۴ء) کا آٹھواں شمارہ ہے

فہرست

سالانہ قیمت

ہندوستان میں

پچاس روپے

غیر ممالک سے

دس ڈالر

فی پرچہ

پانچ روپے

ھوالکل ۷۸۶ یامعین

شیخ امم قطب حقیقت نظام
خضرؑ و مسیحؑ از دم یحیی العظام

امتوں کے رہنما و ہادی، نظام حقیقت کے مرکز و قطب، وہ خضرؑ و مسیحؑ جن کے دم کر دینے سے ہڈیاں بھی جی اٹھیں!

اے میر ہمہ شکر فروشاں در میکدہ غمت سفالے در کادش کنہ خوبی تو

توبہ شکن صلاح کوشاں نرخ ہمہ معرفت فروشاں کندست خیال تیز ہوشاں

یک خرقۂ غمت درست نگزاشت

در صومعہ کبود پوشاں

اے سب شکر فروشوں کے سردار! اے سارے پارساؤں کی توبہ توڑنے والے۔ تیری محبت کے میکدے سے ملے ہوئے ایک کوزے سے سارے معرفت فرشوں کو خریدا جا سکتا ہے۔ تیری خوبیوں کے اسرار جاننے میں بڑے بڑے تیز ہوش والوں کے اوسان گم ہیں۔ تیرے غم نے نیلی پوشوں (صوفیوں) کی خانقاہ میں ایک خرقہ بھی سالم نہیں چھوڑا ہے۔ (حضرت امیر خسروؒ)

نبی خصالی کہ از کمال عظمت بہ مقام عالی: الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتہ ترقی کردہ مسیح دمی کہ در مبارک نفسی بہ مرتبہ: الشیخ یحیی ویمیت باذن اللہ رسیدہ، کشف و کراماتش در شش جہات و ہفت اقلیم کیہان پوشیدہ نماندہ، باطن مبارکش رموز لوح محفوظ (خود؟) خواندہ، علمای کبار و ائمہ نامدار را بہ تقبیل آستان خانقاہ ثقلین پناہ او درجتی رفیع تیسیر پذیرفتہ، اولیاء و مشائخ کرامات شعار را بہ ادراک سعادت او منزلتی منیع بہ حصول انجامیدہ،

واصل و متواصل باد!

(وہ نبی جیسی خصلت والا جس نے کمال عظمت سے "الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتہ" (شیخ اپنی قوم میں ایسا ہے جیسا نبی اپنی امت میں) کا اونچا درجہ حاصل کیا ہے۔ وہ عیسیٰؑ نفس جو اپنی مبارک نفسی سے "الشیخ یحیی ویمیت باذن اللہ" (شیخ اللہ کے حکم مار بھی سکتا ہے جلا بھی سکتا ہے) کے مرتبے تک پہنچا ہوا ہے۔ جس کے کشف و کرامات دنیا جہان میں ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ جس کا مبارک باطن لوح محفوظ کے رموز پڑھ چکا ہے۔ بڑے بڑے علماء اور ممتاز ائمہ اس کے آستانے کو بوسہ دے کر اونچے درجات پاتے ہیں اولیاء اللہ اور باکرامت مشائخ اس کی قدم بوسی سے بلند و بالا منزلوں تک رسائی حاصل کر چکے ہیں۔

اس کا قرب ہمیشہ اور مسلسل ہمیں حاصل رہے

(از حضرت محمد جمال قوام نبیرۂ شمس العارفین مولف قوام العقاید ۷۵۵ھ)

یعنی

سلطان المشائخ حضرت خواجہ سید نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ

جن کے سالانہ عرس مبارک کی خوش خبری ان سطور کے ذریعے آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

چھ سو نوے سالہ عالمی اجتماع

انشاءاللہ ہوگا

خاص پروگرام کی تفصیلات

۱۶ ربیع الثانی ۱۵ ۱۴ھ کی شام کو حضرت محبوب الٰہیؒ کی درگاہ شریف میں فاتحہ

۱۷ ربیع الثانی کو صبح دس بجے حضرتؒ کی خانقاہ شریف میں فاتحہ اور قوالی

اسی دن شام کو بعد نماز عصر شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ سجادہ نشین حضرت محبوب الٰہیؒ کے خواجہ ہال میں۔

۱۔ مذاکرہ علمی (حضرت محبوب الٰہیؒ کی حیات پاک اور تعلیمات پر مشہور اہل علم کے مقالات تقاریر اور منظوم خراج عقیدت)

۲۔ بعد نماز عشاء قران خوانی فاتحہ۔ نعت و منقبت اور سماع کی محفل

۱۸ ربیع الثانی صبح نو بجے شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے حجرۂ قدیم واقع پائین مزار حضرت خواجہ امیر خسروؒ فاتحہ اور قوالی

دن کو ٹھیک گیارہ بجے حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار شریف کے پائین صحن درگاہ میں محفل قل اور قوالی

۱۹ اور ۲۰ ربیع الثانی کو دونوں روز دن کے گیارہ بجے درگاہ شریف میں محافل قل اور قوالی

اس پروگرام کے علاوہ پانچ رات دن مسلسل قران خوانی۔ روحانی تعلیم و تلقین پیش کش عطر و گل چادر و ہدیہ جات تقسیم لنگر وغیرہ کا سلسلہ جو معمولاً ہر عرس شریف پر ہوتا ہے۔ انشاءاللہ جاری رہے گا۔

زائرین اپنی آمد کی تاریخ اور ہمراہیوں کی تعداد سے قبل از وقت مطلع فرمادیں تو انتظامات میں سہولت ہوگی۔ جو عقیدتمند تشریف نہ لاسکتے ہوں اور عرس کی نیازات پھول چادر اور لنگر وغیرہ میں شرکت کے خواہش مند ہوں وہ اپنی رقوم مد کی صراحت کے ساتھ ارسال فرمائیں۔ ـــــــ انگریزی تاریخوں کی مطابقت رویت ہلال کے مطابق رہے گی۔

آپ کی تشریف آوری کا منتظر

دعا گو ـــ (خواجہ) حسن ثانی نظامی

حجرۂ قدیم درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

تار کا پتہ خاجگان نئی دہلی۔

ٹیلی فون ۶۱۹۸۰۷۴۔

میرے ہتھیار تیرے قدموں پر

از شمس العلماء مصورِ فطرت حضرت خواجہ سید حسن نظامی دہلویؒ
(سجّادہ نشین حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ)

میں ہار گیا۔ شکست کو مان گیا۔ یہ ہتھیار ڈالتا ہوں قدموں میں سر جھکاتا ہوں اور اے سب سے بڑے فاتح! تیرے امن کے دامن میں پناہ لیتا ہوں!

تیری شمشیر کی آب و تاب سلامت رہے۔ تیرے تیروں کی نوکیں اس سے زیادہ تیز اور سینہ شکن ہوں۔ تیرا برچھا چمکے اور دلوں کو پارہ پارہ کرنے میں آگے بڑھتا رہے۔ تیرے جہاز سمندروں میں تیریں اور دھوئیں اڑاتے ہوئے دوڑیں۔ تیرے گھوڑے ہنہنائیں اور ٹاپیں مارتے گرد و غبار اڑاتے میدانوں میں فتح یاب ہوں۔

اے مجھ سرکش کو جیتنے والے! اے میرے غرور کو نیچا دکھانے والے۔ تیرا ہمیشہ بول بالا ہو۔ اپنے جھنڈے کو بلند کر اور اس جگہ اس کو گاڑ۔ جہاں تیری مخالفت کے پھریرے لہرائے تھے۔ اب وہ سب جھنڈے سرنگوں ہوگئے اب ان تمام پھریروں نے سر جھکا دیئے۔ اب ان نشانوں کی سب شانیں ملیامیٹ اور نابود ہوگئیں۔

جب تیرا جھنڈا بلند ہوگا۔ میں تھکے ہوئے اور ہارے ہوئے دشمن کی طرح اس پر دانت نہیں پیسوں گا اور دل نہیں جلاؤں گا۔ بلکہ میرے دل میں ایسی ہی خوشی کی لہر پیدا ہوگی جیسی ایک اطاعت گزار دوست کے دل میں ہونی چاہیئے۔

اے میرے سب سے بڑے تاجدار! میری خطاؤں کو معاف کر۔ تو مجرم خطاکاروں کا خطا بخش ہے۔ میں نفس و شیطان کے اغوا میں تیرے مقابلے میں کھڑا ہو گیا تھا۔ مجھے اپنی نفسانی قوتوں اور عقلی طاقتوں پر گھمنڈ تھا۔ اور اسی کبر و رعونت نے تجھ جیسی عظیم الشان طاقت سے میرا سامنا کرا دیا تھا۔

میں بلا شرط ہتھیار ڈالتا ہوں۔ میں ذلت کے ساتھ التوائے جنگ کی درخواست کرتا ہوں، تو جو شرائط جنگ کی رکھے گا۔ میں ان کو عاجزوں، ذلیلوں اور تباہ شدہ لوگوں کی طرح قبول کروں گا۔ میں سب ہتھیار تیرے قدموں میں ڈال دوں گا۔ میں سارا سامان جنگ تجھ کو دے دوں گا۔ میں اپنے کھانے پینے کو بھی تجھ سے کچھ طلب نہ کروں گا۔

محمدؐ عیب پوش، درگزر شعار تیرا نام ہے احمد رؤف و مہربان تیرا خطاب ہے۔ اپنے خلق عظیم کی شان دیکھ۔ میری خطاکاریوں کو شمار نہ کر۔ میرے جرائم کو نہ گن۔ ورنہ میرا کہیں ٹھکانہ نہیں رہے گا۔

دنیا میں تیرے قدموں کے سوا اب کہیں میرا ٹھکانہ نہیں ہے۔ میری بداعمالیاں درحقیقت ایک سرکشانہ جنگ تھی جو نفس و شیطان کے کہنے سے میں نے تیرے خلاف برپا کی تھی۔ مگر میں ہار گیا۔ مجھ کو شکست ہوگئی۔ میری ذلت کی اب کوئی حد باقی نہیں رہی۔

راہی تھا۔ تیرا ہی ہوں۔ تیرا ہی رہوں گا۔اس عارضی
طا کو فراموش کر دے۔ اور پھر اپنا کہہ کر، اپنا
رہا تھ پکڑ لے اور اس خوف و مایوسی سے بچا کر
امن میں چھپالے۔
میرے غرور کے سب تاجدار تخت سے اتر گئے۔
مہوریت و مساوات کے قانون دنیا کے ہر باشندے
سلیم کر لیے۔ اب سب نے تیری بنائی ہوئی طرزِ زندگی
وشں حکومت اختیار کرنی شروع کر دی۔ اب
زمانہ آگیا۔ جس میں تیری انسانی اور جمہوری شہر یاری
لمہ بجے گا۔ اور تیرے قرآن کا لایا ہوا قانون مساوات
کیا جائے گا۔ انسانوں کی خدائی سوئے گی انسانوں
می اور بندگی نابود ہوگی۔ دولت دنیا کا اقتدار
گا۔ آدمیت بحیثیت آدمیت کے اپنے حقوق
گی۔ اپنے اختیارات حاصل کرے گی اور دولت
ونیت کا قبضہ آدمی کی دماغی قلبی اور ایمانی
سے اٹھ جائے گا۔ تیری سلطنت کا نام کچھ بھی
ائے۔ اس کو عرب کہیں۔ انگریز نام رکھیں امریکہ
م سے پکاریں یا کسی اور اسم سے مسمیٰ کریں مگر
رآن پر ہوگا اور اس کے بنائے ہوئے قانون پر حکومت
ئے گی۔ نہیں زندگیاں بغیر حکومت کے حکمران بسر
گی۔
اسی واسطے دنیا کے منکرین و مفسدین و غافلین
ایم مقام کی حیثیت سے میں اپنی تمام دنیا کی طرف
بنے ان سب ہتھیاروں کو تیرے قدموں میں ڈالتا
اور تیرے نام کا نعرہ لگاتا ہوں جس کے حرف حرف
ن، انصاف اور مساوات کے سمندر جوش مارتے
ور کہتا ہوں
محمدؐ فتح یاب! محمدؐ کی آخری جیت۔ محمدؐ ہی کا
خر جہان تک سلامت رہے!

جناب حیات جاوید
کا
انتقال پُرملال

جناب حیات جاوید دہلی کے ایک کامیاب تاجر اور خوش فکر و خوش گو شاعر تھے۔ ان کا قدیم وطن تو تاریخی قصبہ تجارہ تھا جو راجستھان اور ہریانہ ریاستوں کی سرحد پر واقع ہے۔ لیکن ان کے بزرگ دہلی میں آکر بس گئے تھے اور حیات صاحب ادبی اور شعری روایات کے لحاظ سے دہلی اسکول کی نمایندگی کرتے تھے۔ ان کو بھائی بزرگوں کے ساتھ تصوف اور اہل تصوف سے بھی قلبی لگاؤ تھا ان کے خالو خلیفہ عبدالرحمٰن صاحب شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے خسر حضرت صادق شہید کے خاص دوستوں میں تھے اور انتقال کے بعد ان کو دائمی آرام کی جگہ بھی حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے خاندانی قبرستان میں ملی۔ جو مرزا غالبؔ کے سامنے بستی حضرت نظام الدین میں واقع ہے۔

حیات جاوید صاحب حضرت خواجہ حسن نظامیؒ حضرت امیر خسروؒ اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے عرسوں کی محفلوں میں بڑی پابندی سے شرکت کرتے تھے اور لنگر میں زردے کی ایک دیگ ہمیشہ ان کی طرف سے شریک کی جاتی تھی۔ اور ان کا عارفانہ منقبتی کلام عقیدت مندوں سے داد و تحسین حاصل کرتا تھا۔ افسوس انھوں نے تقریباً دو ماہ کی سخت علالت کے بعد ۳۰ جون ۱۹۹۴ء کو وفات پائی اور دہلی کے باڑہ ہندو راؤ کے قریب واقع قبرستان چہلیان میں دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ادارہ منادی ان کی بیگم صاحبہ صاحبزادگان، صاحبزادیوں اور دیگر سب اعزہ اقارب اور احباب سے تعزیت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

سوگوار
خواجہ حسن ثانی نظامی

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ

نشاۃ ثانیہ کے ایک نمایندے تھے

رسالہ کتاب نما کے خواجہ نمبر کی رسم اجراء کے موقع پر

ادبی دنیا کی مقبول ترین شخصیت

محترمہ قرۃ العین حیدر

کی تقریر

پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب۔ خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب۔ خواتین و حضرات۔

آج شام کی محفل خانقاہی تہذیب کے تسلسل کی آئینہ دار ہے اور اس تہذیب کی بنیاد انسان دوستی پر رکھی گئی تھی۔ آجکل HUMAN RIGHTS کا بہت چرچا ہے۔ صوفیائے کرام نے یہ تحریک بغیر کسی MEDIA HYPE کے صدیوں تلک نہایت کامیابی سے چلائی۔ حضرت خواجہ حسن نظامیؒ عہد حاضر میں اسی انسان دوست تحریک کے ایک نہایت پر کشش نمایندے تھے۔ وہ قرون وسطیٰ کی محرابوں سے نکل کر آئے تھے اور اسی درگاہ کے باہر دنیا میں جو تبدیلیاں آچکی تھیں ان کے تقاضوں کا بھی پورا شعور رکھتے تھے۔ اور اسی عام فہم اور سلیس انداز میں جو صوفیاء کا وطیرہ تھا وہ اپنے ترقی پسند خیالات کا پرچار کرتے رہے۔ سرسید احمد خاںؒ کی کوششوں سے جس نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا حضرت خواجہ حسن نظامیؒ اس کے ایک نمایندے بھی تھے اور اس لحاظ سے ہم ان کو ایک RENAISSANCE MAN کہہ سکتے ہیں۔ ایک کثیر الجہت صلاحیتوں کا مالک دانشور فنکار۔ علامہ اقبال بھی اسی نشاۃ ثانیہ کے ایک فرد تھے۔ انھوں نے پیر حرم سے رسم و رہ خانقہی چھوڑنے کے لیے کہا وہ زوال پذیر رسمی تصوف کے خلاف تھے کیونکہ پنجاب اور سندھ میں چنوڈل لارڈ پیر بھی بن چکا تھا۔ حضرت خواجہ حسن نظامیؒ اسی زمانے میں ایک عمل پرست حقیقت پسند اور محنت کش صوفی کی حیثیت سے سرگرم عمل ہوئے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک کرم یوگی تھے۔ نفاق، انتشار، کاہلی اور جھگڑالوپن جس قوم کی خصوصیات ہوں اسے مسلسل اور مستقل مزاجی سے صلح اور محبت اور عمل پسندی کا درس ایک درویش ہی دے سکتا ہے۔ اصلاح قوم اور لیڈری میں بال برابر کا فرق رہ جاتا ہے لیکن حضرت خواجہ حسن نظامیؒ نے لیڈری کبھی نہیں کی۔ انھوں نے چند سادے اور بڑے دلنشیں سلوگن قوم کو دیے۔ اپنی مدد آپ کرو۔ تعلیم حاصل کرو۔ تجارت کرو۔ اردو بولو۔ اللہ ہر دم۔

دو گھر گھر۔

بحیثیت انشاء نگار خواجہ حسن نظامیؒ کا سب سے
شش وصف جزویات نگاری اور ان کا PUCKISH
SENSE OF HUMOUR ہے۔ ان کے
وز نامچے سے ان کی بصیرت اور دردمندی کا اظہار ہوتا
ہے وہ گرد و پیش کی معمولی حقیر چیزوں سے بھی محبت
رتے ہیں۔ اور ان کا حلیہ لکھتے ہیں۔ یہ سینٹ فرانسس
یر اکبر آبادی والا انداز بنیادی طور پر صوفی رویہ ہے۔
ئنات کی ہر چیز بڑی درست ہے اور ہیں سب کا دوست
ہوں۔

محبت اور تالیف قلوب چشتیہ مسلک ہے۔ کٹر پنتھیوں
رویہ اس کا الٹ ہے۔ وہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے
کے بجائے اپنی خشونت سے ان کو بھگا دیتے ہیں۔ اس
مت دونوں طرف کٹر پنتھیوں کے ہاں REJECTION
عمل زور و شور سے جاری ہے یہ بھی نہیں۔ یہ بھی نہیں۔
لیکن خواجہ صاحب کی صلح پسندی اور رواداری اس
وداعتمادی کی مظہر تھی۔ جو پکے اور مضبوط ایمان سے پیدا
وتی ہے۔ اسی خود اعتمادی سے انھوں نے پریم مارگی
وفیاء بلگرام کے اور حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ اور
جھن اور حضرت عبدالرزاق بانسوی اور دور حاضر کے
سن کاکوروی کی طرح بندرابن کی لہ مجری بھی اپنائی۔
راسے اپنے بانسری کے سُروں میں شامل کیا۔

قومیت اور کلچر کی تشریح کے متعلق شدید نظریاتی کشمکش
ور تشدد خواجہ صاحب کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا اسی کی
یاد پر ملک تقسیم ہوا۔ آج اس کشمکس نے ایک ہیبتناک صورت
ختیار کرلی ہے اس وقت خواجہ صاحب کا پیغام زیادہ سے زیادہ
وگوں تک پہنچنا چاہیئے۔

ایسا کہنا بہت POMPUOUS لگتا ہے
جھے بہت خوشی ہے مجھے کیا سبھی کو خوشی ہوگی کہ کتاب نما نے حضرت
واجہ حسن نظامیؒ پر ایک خاص نمبر شائع کیا ہے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی
فرمایا ہے کہ میں اس کا اجرا کروں۔ یہ ان کی ذرّہ نوازی ہے۔

ہدایت القلوب

ملفوظات حضرت خواجہ شاہ زین الدین داؤد حسین شیرازی قدس سرہ

(۱)

ترجمہ و تلخیص: پروفیسر نثار احمد فاروقی

حضرت خواجہ زین الدین داؤد حسین شیرازی قدس سرہٗ (متوفی ۲۵، ربیع الاول ۷۷۱ھ یکشنبہ) حضرت خواجہ برہان الدین غریب ہانسوی قدس اللہ سرہ العزیز (وفات ۱۳ صفر ۷۳۸ھ/ ۱۰ ستمبر ۱۳۳۷ء) کے خلیفہ و جانشین ہیں۔ آپ کا روضہ خلد آباد (مہاراشٹر) میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ (متوفی ۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ ۲ مارچ ۱۷۰۷ء) اور ان کے فرزند شہزادہ محمد اعظم شاہ (وفات ۱۸ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ/ ۱۸ جون ۱۷۰۷ء) کو حضرت شیرازیؒ کے قدموں میں ہی دفن کیا گیا تھا۔

آپ کے حالات } حضرت خواجہ زین الدین شیرازی، حضرت خواجہ غریبؒ کے آخری زمانے میں بیعت ہوئے تھے۔ علم و فضل کے ظاہری زیور سے آراستہ اور اپنے وقت کے ممتاز عالم دین تھے، حضرت غریبؒ کے فیضان تربیت سے مختصر سی مدت میں مدارج سلوک بھی طے کر لیے اور اپنے شیخ طریقت کے جانشین بنائے گئے۔

حضرت شیرازیؒ کے ملفوظات حضرت کی زندگی میں اور ان کی اجازت سے جمع کیے گئے۔ کتاب کا نام ہدایت القلوب حضرت نے پسند فرمایا۔

حضرت زین الدینؒ کے اجداد کا وطن شیراز تھا۔ آپ کے دادا خواجہ محمود شیراز ہی میں دفن ہیں ان کے دو بیٹے تھے خواجہ حسین اور خواجہ عمر۔ یہ دونوں ہندوستان آئے اور بقول صاحب روضہ اقطاب حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء قدس سرہ سے بیعت ہوئے۔ خواجہ عمر لاولد رہے، خواجہ حسین کے فرزند حضرت خواجہ زین الدین شیرازی قدس سرہ ہیں۔ آپ شیراز سے حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ وہاں حج و زیارت کے علاوہ علمائے وقت سے بھی استفادہ کیا اور حجاز سے دہلی تشریف لائے۔ یہاں چندے قیام کر کے دولت آباد کو منتقل ہو گئے۔ آپ کے والد خواجہ حسین (وفات ۲۷ شعبان ۷۵۰ھ/ ۲۷ نومبر ۱۳۴۹ء) اور چچا خواجہ عمر بھی آپ کی محبت میں کشاں کشاں دولت آباد آ گئے، وہیں دونوں کا انتقال ہوا۔ دولت آباد ہی میں دونوں بزرگوں کے مزار ہیں۔

حضرت زین الدین شیرازی ۰۱ ۷ھ/۲-۱۳۰۱ء
ں شیراز ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ ابھی سات برس کے
تھے کہ آپ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا۔ آپ کے والد
جد نے تعلیم و تربیت کی نگرانی کی دہلی میں آپ نے
مولانا کمال الدین سامانہ اور دوسرے ممتاز
علماء سے تحصیل علم کی۔ بعد فراغت ایک مسجد میں تفسیر،
حدیث، فقہ وغیرہ کا درس دیا کرتے تھے اور وعظ
بھی کہتے تھے ابتداء میں آپ صوفیہ کے معتقد نہ تھے
بلکہ ان کے سماع اور وجد و حال پر سخت تنقید کرتے تھے۔
ب دولت آباد میں حضرت برہان الدین غریبؒ کی
ولایت اور عظمت کا غلغلہ بلند ہوا تو آپ کے بعض
شاگرد بھی حضرت غریبؒ کے جماعت خانے میں جاتے
تھے آپ کو یہ معلوم ہوتا تھا تو ناراض ہوتے تھے اپنے
شاگردوں سے کہتے تھے کہ تم نے جو کچھ پڑھا تھا سب
برباد کردیا ناچنے والوں کی صحبت میں جاتے ہو۔

حضرت برہان الدین غریبؒ سے بیعت

لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک واقعے نے آپ کو حضرت غریبؒ کی محبت
کا اسیر بنا دیا، ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، قدموں
میں سر رکھ کر خوب روئے اور بیعت کی درخواست کی۔
حضرت غریبؒ نے ۷۳۶ھ میں انھیں بیعت سے مشرف
فرمایا۔ اسی دن مولانا رکن الدین عماد کاشانی اور
ان کے خاندان کے دوسرے افراد بھی بیعت ہوئے۔
۱۸ ربیع الثانی ۷۳۷ھ/ ۲۵ نومبر ۱۳۳۶ء
کو اپنی وفات سے دس ماہ قبل حضرت غریبؒ نے
خواجہ زین الدین شیرازی کو اپنی جانشینی اور خلافت کا
شرف عطا فرمایا۔ زین الدین خطاب بھی شیخ کا
ہی عطا کردہ ہے۔ حضرت غریبؒ کے سوم کے دن سب
یاران سلسلہ اور مشائخ کی موجودگی میں سجادہ پر
تشریف فرما ہوئے۔

دہلی کا سفر

۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء میں آپ
نے دہلی کا سفر کیا۔ یہاں حضرت شیخ نصیر الدین محمود
اودھی چراغ دہلی قدس سرہ کی صحبت سے مستفید ہوتے
حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار مبارک پر مہینوں
حاضر رہے اور ایک قرآن روز پڑھ کر ایصال ثواب کرتے
تھے۔

پاک پتن میں حاضری

سلطان فیروز شاہ تغلق ۱۸ صفر
۷۵۲ھ کو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ درخواست
کی کہ آپ دہلی ہی میں رونق افروز رہیں۔ مگر آپ نے
فرمایا کہ میں اپنے شیخ کے قدموں میں مرنا چاہتا ہوں۔
حضرت چراغ دہلیؒ اور دوسرے مشائخ وقت اور
ملوک و امراء آپ کو رخصت کرنے کے لیے حوض شمسی تک
آئے۔ حضرت شیرازیؒ نے پہلے پاک پتن کا قصد کیا اس
وقت حضرت علاء الدین موج دریاؒ کے فرزند شیخ محمد
سجادہ نشین تھے انھوں نے حضرت شیرازی کو بہت
نوازا۔ آپ تین دن تک بابا صاحبؒ کے روضے میں بند
ہو کر مشغول رہے صرف نماز ادا کرنے کو باہر نکلتے تھے۔
اجودھن میں ایک ماہ قیام کرنے کے بعد وہاں سے اجمیر
کا قصد کیا اور خواجہ بزرگؒ کے آستانے پر کچھ عرصہ
مشغول رہ کر بسر کیا۔
اس سفر میں آپ نے دریائے تاپتی کے کنارے
پڑاؤ کیا تھا، جب نصیر خاں فاروقی خاندیس کا بادشاہ
ہوا تو اس نے تاپتی کے ایک کنارے زین آباد
اور دوسرے کنارے پر برہان پور نامی شہروں کو
آباد کیا۔ فرشتہ وغیرہ کا یہ بیان غلط ہے کہ خود حضرت
شیرازی نے فرمائش کی کہ یہ شہر بنوائے تھے نصیر خاں
فاروقی شیخ کے انتقال (۷۷۱ھ/ اکتوبر ۱۳۶۹ء)
سے ۳۰ برس کے بعد خاندیس کا حکمراں ہوا تھا۔
خلد آباد میں اوّل آپ کے اور محمد شاہ بہمنی
کے درمیان کچھ کشیدگی رہی جس کا حال غلام علی آزاد
بلگرامی نے روضۃ الاولیاء میں لکھا ہے، پھر وہ توبہ کرکے

آپ کا عقیدت مند ہو گیا تھا اور آپ کی تجویز پر قوانین شرعی نافذ کر دیتے تھے شراب کی کشید، رہزنی، قمار وغیرہ جرائم بند ہو گئے تھے۔

وصال } حضرت خواجہ زین الدین شیرازیؒ اپنے شیخ حضرت غریبؒ اور دادا پیر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی طرح مجرد رہے شادی نہیں کی۔

جب آپ کا سن مبارک ۷۰ سال ہوا، ربیع الاول ۷۷۱ھ کی تیرھویں تاریخ سے مرض الموت شروع ہوا۔ کھانسی، زکام، بخار اور ضعف ہضم کی شکایت رہی آخری بارہ دنوں میں غذا بالکل بند ہو گئی تھی صرف پانی کے ایک دو گھونٹ لے لیتے تھے مگر نمازیں برابر کھڑے ہو کر پڑھتے رہے۔

یکشنبہ ۲۵ ربیع الاول ۷۷۱ھ/ ۲۸ اکتوبر ۱۳٦۹ء کو عصر کی نماز پڑھتے ہوئے سجدے میں انتقال فرمایا، اگلے دن ۲٦ ربیع الاول کو تدفین ہوئی۔

انتقال کے وقت آپ نے اپنا کتب خانہ چھوڑا جسے وقف کر دیا تھا۔ دنیوی سامان میں ایک تہبند، تین عدد کیلے اور تھوڑی سی گل چوری حجرے میں تھی یہ سامان بھی آخری دنوں میں کوئی نذر دے گیا تھا۔

آپ نے کسی کو اپنا جانشین نہیں بنایا اور فرمایا کہ میں کسی میں خلافت اور جانشینی کی لیاقت نہیں پاتا۔

جامع ملفوظات } حضرت کے ملفوظات کے جامع امیر حسن دہلویؒ، جو خلد آباد میں امیر حسن قوال کے لقب سے معروف ہیں، فوائد الفواد کے مؤلف امیر حسن علا سجزی دہلوی سے مختلف شخصیت ہیں۔

حضرت شیرازی سے ان کی عقیدت و محبت کے افسانے بھی زباں زد رہے ہیں۔ بعض حکایات روضۃ اقطاب میں لکھی بھی گئی ہیں۔

دہلی کے باشندے تھے، دولت آباد میں انتقال ہوا، حضرت کے روضے کے قریب شمال کی جانب جو مقام النگ کہلاتا ہے وہاں ان کی قبر ہے۔ ۲۷ ربیع الاول کو ان کا عرس ہوا کرتا تھا۔

(۲)

آپ کے ملفوظات } پہلا ملفوظ ۱۷ ماہ رجب ۷۴۵ھ/ ۲۵ نومبر ۱۳۴۴ء کی مجلس میں ہونے والی گفتگو پر لکھا گیا جامع ملفوظ امیر حسن دہلوی آئے تو حضرت زین الدینؒ نے فرمایا: آج اس فقیر کے پاس کہاں سے آنا ہوا؟ انہوں نے عرض کیا: آپ کی ملاقات کا اشتیاق تو ہمیشہ جان و دل کے اندر سمایا رہتا ہے، آج یہ سعادت نصیب ہو گئی۔

حضرت زین الدین شیرازیؒ نے دعا دی اور فرمایا کہ میں نے اپنے والد بزرگوار سے سنا ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ حدیث ہو: کُنْ عَالِماً أَوْ مُتَعَلِّماً أَوْ مُسْتَمِعاً أَوْ مُحِبّاً (یعنی عالم بنو تاکہ کسی کو فائدہ پہنچا سکو یا طالب علم بنو کر خود کچھ نفع حاصل کر سکو، یا علمی فوائد کے سننے والے بنو یا عالموں سے محبت کرو) ان چار طبقوں سے جو باہر ہے وہ نہ جانے کیا چیز ہے!

کچھ فرق نہیں! } پھر فرمایا کہ ایک قصہ یاد آیا کسی زمانے میں کوئی متعلم کسی کسان کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ ذرا ان بیلوں کو روک لے تاکہ ان سے میں کوئی مسئلہ پوچھ سکوں۔ کسان نے کہا: اے خواجہ تم عجیب آدمی ہو بیلوں سے مسئلے کا کیا تعلق؟ طالب علم نے کہا: تمہیں اس سے کیا مطلب؟ میں جانوں اور وہ جانیں کسان نے بیلوں کو روک لیا۔ متعلم نے ایک بیل سے پوچھا: "ما الایمان وما الاسلام وما الاحسان؟" (ایمان کیا ہے، اسلام کیا ہے اور احسان کیا ہے؟) بیل نے کوئی جواب نہ دیا، دوسرے بیل سے پوچھا اس نے بھی جواب نہ دیا، پھر کسان سے پوچھا اسے بھی جواب معلوم نہیں تھا۔ کسان نے دریافت کیا کہ اس سوال کرنے کا فائدہ کیا تھا؟ متعلم نے کہا: میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں اور ان بیلوں

کیا فرق ہے ؟ معلوم ہو گیا کہ کچھ فرق نہیں۔

صحبت کی قسمیں پھر فرمایا کہ صحبت تین طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو وہ صحبت سے تمہیں فائدہ پہنچے ایسی صحبت کو تو مضبوط پکڑ لینا چاہیئے۔ دوسری صحبت کی قسم یہ کہ دوسروں کو تم سے نفع حاصل ہو یہ بھی اچھی ہے۔ وہ صحبت جس میں دونوں فریق کو ایک دوسرے سے ضرر پہنچے اس کا ترک کر دینا ہی اچھا ہے۔

دوسری صحبت میں حضرت شیخ زین الدین شیرازی رح نے فرمایا: شیخ الاسلام برہان الدین قدس اللہ سرہ العزیز بارہا یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

ہیچ مانے و ہیچ عالم نے
وز پئے ہیچ ہیچ ماتم نے

ہم بھی ہیچ ہیں اور یہ عالم بھی ہیچ ہے اس لیے حقیر کا ماتم (افسوس) ہی کیا کرنا!)

درویشوں کا جمع و خرچ فرمایا کہ درویشوں کو آمدنی اور خرچ کی فکر نہیں ہوتی کیونکہ وہ اللہ تعالےٰ کے خزانوں کے نزدیک بیٹھے ہیں، جتنا زیادہ خرچ کرتے ہیں اتنا ہی اور ملتا ہے جیسے کوئی شخص دریا کے کنارے بیٹھا ہو تو اسے خرچ کرنے میں کیا تکلف ہو گا، جتنا بھی پانی وہ خرچ کرے گا دریا میں اور آتا رہے گا اگر درویش دولت جمع کرنے لگیں تو ہرگز مزید آمد نہیں ہو گی۔ چنانچہ ایک کسی وقت کوئی دیوار تعمیر کر رہے تھے اور ان کے مرید خشت گارا دست بدست دے رہے تھے وہ لیتے تھے اور دیوار میں ردا جماتے جاتے تھے۔ اتفاق سے اس وقت میں اینٹ پیر کے ہاتھ میں رک گئی۔ مریدوں نے جب پیر کا ہاتھ خالی نہ دیکھا تو اپنے ہاتھ روک لیے پھر ہر مرید اپنے ہاتھ میں اینٹ لیے کھڑا رہا پیر اپنے مریدوں کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا: کچھ سمجھے؟ انہوں نے کہا: جی نہیں فرمایا: درویشوں کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو کچھ ان کے پاس آتا ہے اسے خرچ کر دیتے ہیں تو اور آجاتا ہے اور اگر اسے روک رکھتے ہیں تو پہنچانے والے بھی رک جاتے ہیں۔ جیسے دولاب ہے کہ اس کی بالٹیوں میں پانی آتا رہتا ہے۔ مخلوق اپنے مشک اور گھڑے بھر کر لے جاتی ہے، چار پایوں کو پلاتی ہے باغوں کو سیراب کرتی ہے، وہ بالٹیاں خالی ہوتی ہیں تو دوسری بھری ہوئی اوپر آجاتی ہیں دولاب سے پانی کبھی کم نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کچھ مدت کے لیے اس سے پانی نہ کھینچیں تو پانی بھی اوپر نہیں آتا۔

اہل ایمان سے مقابلہ کرو ۱۹۔ رجب ۷۴۵ھ / ۲۷ نومبر ۱۳۴۴ء کو امیر حسن نے تیسری بار حضرت شیخ شیرازی رح سے ملاقات کی اور اس بار بیعت کرنے کی نیت سے آئے تھے۔ حضرت نے فرمایا: لَا تَزِنِ الْخَلْقَ بِمِيزَانِكَ وَزِنْ نَفْسَكَ بِمِيزَانِ الْمُوقِنِينَ لِتَرَىٰ فَضْلَهُمْ وَ إِفْلَاسَكَ (خلق کو اپنے پیمانے سے مت ناپو بلکہ اپنے آپ کو اہل ایمان کی ترازو میں تول کر دیکھو تاکہ ان کی فضیلت اور تمہارا افلاس تمہیں معلوم ہو جاتے) کیونکہ جب تم سب کو اپنے جیسا سمجھو گے تو ہرگز ناپسندیدہ بات یا عمل کو ترک نہیں کر سکو گے اور نقصان اٹھاؤ گے جب اپنے کردار کا مقابلہ نیک لوگوں کے کردار سے کرو گے تو یقیناً خود کو باطل میں مبتلا دیکھو گے اور اپنے اعمال بد سے شرمندگی محسوس کرو گے، نیک لوگوں کے کردار سے رغبت پیدا ہو گی اور اس سے فائدہ پہنچے گا۔

اوقات کی تقسیم فرمایا: حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ مومن کو چاہئے اپنے دن کو چار حصوں میں بانٹ لے ایک حصہ طاعت و مناجات کے لئے رکھے دوسرے حصے میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے کہ آج میں نے کیا کام کیے اور کیا باتیں کیں اگر اچھا کیا ہے تو خدا کا شکر کرے اور برا کیا ہے تو اس سے توبہ کرے، عذر خواہی کرے عاجزی و زاری

کرے: ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے بخش دے۔
تیسرے حصے میں علماء کی خدمت میں حاضری دے تاکہ وہ اسے بصیرت عطا کریں، اللہ کے فرمان سنائیں اور نصیحت کریں۔ چوتھے حصے میں خلوت اختیار کرے، اپنے نفس اور لذات نفس کے لیے۔ جو چیزیں حلال ہیں مثلاً کھانا پینا، اہل وعیال، دوستوں اور یاروں کے درمیان آسایش وغیرہ۔ تاکہ دل کا بوجھ کم ہو اور مجاہدات کے لیے مزید قوت اور رغبت پیدا ہو۔

ترقی کا فلسفہ

اسی دن بعد نماز چاشت جامع ملفوظ نے حضرت زین الدین شیرازی علیہ الرحمۃ سے بیعت کی۔ اس کے ۲۹ دن کے بعد (۱۹ شعبان ۷۴۵ھ) پھر مجلس شریفہ میں حاضر ہوئے۔ حضرت نے فرمایا: قالَ علیہ الصّلوۃ وَالسّلامُ مَنِ اسْتَوٰی یوماہُ فَہُوَ مَغْبُونٌ۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس کے دو دن برابر رہے وہ گھاٹے میں رہا۔)
یعنی جو ہر روز دینی معاملات میں کچھ ترقی نہیں کرتا وہ نقصان میں رہتا ہے۔ زندگی کا سرمایہ سانس ہیں اور ہر ایک کو گنے چنے سانس دیئے گئے ہیں، یہ ہر روز، ہر ساعت اور ہر دم گھٹ رہے ہیں لہذا اگر ہر روز کا نقصان پورا کرنے کے لیے مزید کوئی چیز حاصل نہ کرے گا تو یقیناً بہت ٹوٹے میں رہ جائے گا۔
خلق کی دو قسمیں ہیں: طالبانِ دنیا اور طالبانِ دین۔ جو طالب دنیا ہے وہ یا تو اپنا مقصود پالیتا ہے یا نہیں پاتا ہے۔ جو نہیں پاتا ہے وہ خَسِرَ الدُّنیا وَالْاٰخِرَۃ (دنیا اور آخرت میں نقصان زدہ) ہے اور جو مقصود دنیا پا بھی لے تب بھی کچھ نہیں کیونکہ اس نے باقی رہنے والی نفیس شے (دین) کو فنا ہو جانے والی گھٹیا چیز (دنیا) کے عوض بیچ دیا جو طالب دین ہے اگر اس کا ہر دن برابر ہے تو اس حدیث کے مطابق وہ زیاں زدہ ہے۔ لہذا ہر روز مزید حاصل کرنا عمل جوارح (جسمانی اعمال) سے ممکن نہیں۔ کیونکہ پہلے دن دو رکعت نفل پڑھے گا دوسرے دن چار تیسرے دن چھ، اسی طرح ہزار دو ہزار تک پڑھ لے گا اس سے زیادہ ممکن نہیں تسبیح صدقات اور دوسری عبادتوں کا بھی یہی حال ہے۔ روزہ بھی دن بھر میں بس ایک ہی ہے پس معلوم ہوا کہ اس حدیث کے مضمون نے عمل کو دل سے متعلق کیا ہے۔ اور دل والوں کے دو گروہ ہیں: علماء اور فقراء۔ امام اعظم اور شافعی واحمد حنبل وامام مالک اور ان کے اصحاب (رحمہم اللہ اجمعین) نے کیا کیا ہے۔ آج ایک مسئلہ طے کیا دوسرے دن اس پر کچھ اور اضافہ کر دیا تیسرے دن ان دونوں مسئلوں پر ایک اور مسئلے کو بڑھا دیا اسی طرح ہر روز علمی مسائل میں اضافے کرتے رہے، اس لیے ان کے سب دن برابر نہ رہے۔ مگر فقراء کمالات دل میں مشغول ہیں اور درجات ومقامات میں ترقی کرتے ہیں جب ایک مقام کو پختہ کر لیتے ہیں تو دوسرے مقام کو پکڑتے ہیں مثلاً آج مقام توبہ حاصل ہو گیا، کل کو انھوں نے توبہ کے ساتھ زہد میں بھی استقامت حاصل کر لی اگلے دن اس کے ساتھ مقام توکل کا اضافہ کر دیا، اس سے اگلے دن صبر، پھر تسلیم پھر تفویض پھر رضا۔ اس طرح ہر روز ایک نئے مقام کو استوار کرتے رہے اور دوسرے مقام میں ترقی ہوتی رہی دوسرا نیا کمال حاصل ہوتا رہا۔ روز بروز وہ اس علم میں دانا تر ہوتے گئے۔ یہاں تک سلوک کمالیت تک پہنچ گیا اور وہ مقام محبت میں داخل ہو گئے۔ کمالات محبت کی کوئی حد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو کہاں تک پہنچا دے۔

دوسری ولادت

فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے: لن یلج ملکوت

سمٰوات من لم یولد مرتین۔ جو دو بار پیدا نہیں ہوتا
، آسمانوں کے ملکوت میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتا۔ یعنی
ب بار ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اور اسے دایہ کی
ودھ میں دے دیا جاتا ہے، دایہ اپنا پستان اس کے
نھ میں رکھتی ہے اور کچھ زمانے تک اس کی پرورش
کرتی ہے کیونکہ اس کا معدہ ضعیف ہوتا ہے وہ بھاری
ذائیں برداشت نہیں کرسکتا اگر اس زمانے میں حلوا یا
روٹی اور گوشت، گھی اور شکر اسے کھلائیں تو وہ مرجائے گا
ں لیے اسے انسان کے دودھ سے پالا جاتا ہے۔ پھر گائے
بکری کا دودھ دیتے ہیں، پھر شوربا چکھاتے ہیں،
پھر بازار کی روٹی دیتے ہیں یا کھچڑی اور شوربا کھلاتے
ں اگر اس وقت وہ شکر مانگے تو اسے نہیں دیتے، وہ
ضد کرے تو اُسے مارتے ہیں کیونکہ شکر کھانے میں اس
ا نقصان ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ معدے کو قوت
یتے ہیں تاکہ وہ نان گوشت، حلوا پراٹھا، اور دوسری
ذائیں کھانے کے قابل ہوجائے اور اسے نقصان نہ ہو۔
ھر اس کا دودھ چھڑا دیتے ہیں وہ روتا ہے کیونکہ اسے
ودھ کے مزے کی عادت پڑ چکی ہے جب نہیں ملتا تو روتا
ہے، ماں باپ اُسے دودھ نہیں دیتے اور کہتے ہیں اب
م بڑے ہوگئے ہو، شریعت میں دودھ تم پر حرام ہوگیا
ب تمہیں بڑوں کی غذائیں کھانی چاہئیں۔ اگر وہ دودھ
نگنے سے باز نہیں آتا تو سر پستان پر کوئی بدذائقہ
چیز لگاتے ہیں، پھر بھی ضد کرتا ہے تو مارتے ہیں
یہاں تک کہ وہ یہ مطالبہ کرنا چھوڑ دے۔ اس پیدائش
یں تو سب حیوانات آدمی کے جیسے ہی ہیں۔ البتہ دوسری
پیدائش یہ ہے کہ وہ بشری خواہشوں سے نکل آئے
پیر کے حکم کو مانے، پیر اس کے مناسب حال (باطنی)
غذاؤں سے اس کی پرورش کرے اور اس کے باطن کو
بتدریج مضبوط بنادے تاکہ وہ ملکوتی غذاؤں کو برداشت
کر سکے۔ جیسے پہلی ولادت کا حال بیان ہوا بالکل اسی
طرح شروع ہی میں اگر اسے توکل، تسلیم، رضا، محبت،
ذوق وشوق وغیرہ جو مردانِ دین کی غذائیں ہیں چکھادیں
تو وہ ہلاک ہوجاتے کیونکہ ابھی وہ اس راہ میں بچہ ہے
اور اس کا باطن مردانِ دین کی بھاری غذائیں برداشت
کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔ اگر کوئی شخص شیخ کے تصرف
سے نکل کر انھیں استعمال کرے تو وہ جانے۔

سچ کی تلقین

فرمایا: کسی کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے کہ لوگوں نے سچ بولنے میں
کیا نقصان دیکھا جو جھوٹ بولتے ہیں!

کہتے ہیں کہ حجاج بن یوسف نے خواجہ حسن بصریؒ
کو قتل کرنے کے ارادے سے اپنے آدمیوں کو بھیجا کہ انھیں
پکڑ لائیں۔ خواجہ حسن بصریؒ کو اس کی خبر لگ گئی وہ
بھاگ کر خواجہ حبیب عجمی کے حجرے میں آئے اور کہا مجھے
کہیں چھپا دیجیے۔ خواجہ نے کہا اس حجرے کے اندر جا بیٹھو۔
خواجہ حسن بصریؒ حجرے کے اندر گئے تو پیچھے سے سپاہی
بھی آگئے اور خواجہ حبیب عجمی سے پوچھا: کیا تم نے
خواجہ حسن کو دیکھا ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ پوچھا:
وہ کہاں گئے؟ کہا: حجرے کے اندر ہیں۔ سپاہی اندر
گئے تو انھیں نہیں پایا۔ باہر آئے اور کہا کہ وہ اندر تو
نہیں ہیں، کدھر گئے؟ حبیب عجمی نے کہا: حجرے میں ہی
ہیں کہیں اور نہیں گئے ہیں ان سپاہیوں نے دو تین
بار جا جاکر تلاش کیا مگر انھیں نہ پاسکے۔ کہنے لگے تم نے
ہمارے اوپر جادو کردیا ہے۔ حبیب عجمی نے کہا: میں
بتا تو رہا ہوں، اب تم کو وہ نظر نہیں آتے تو میرا کیا
قصور ہے؟ وہ گالیاں بکتے ہوئے رخصت ہوگئے۔
کچھ دیر کے بعد خواجہ حسن بصریؒ باہر آئے اور کہا:
اے حبیب تم نے تو اپنے ہاتھوں مجھے مار ہی ڈالا تھا۔
خواجہ حبیب عجمی نے کہا: اے استاد یہ میرے سچ
بولنے کی برکت تھی کہ حق تعالیٰ نے ان کے شر سے
تمہیں بچالیا اگر میں جھوٹ بولتا تو ہم دونوں مارے
جاتے۔ الغرض سچ بولنے میں ہرگز کوئی نقصان نہیں
ہے اور جھوٹ بولنے سے ہرگز کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

دین اور دنیا کی سعادت رسول علیہ السلام کی پیروی کرنے میں ہے اور دین و دنیا کی بدبختی رسول کی مخالفت میں ہے۔

اولاد کی تربیت } اولاد کی تربیت کا کچھ ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا: پہلے تو بچوں کا نام اچھا رکھنا چاہیئے پھر ان کی پرورش حلال روزی سے کرنی چاہیئے۔ پھر قرآن اور علم و ادب سکھانا چاہیئے۔ اگر اس کے خلاف کرے گا تو اللہ تعالیٰ ان بچوں کو ماں باپ کو تکلیف پہنچانے پر لگادے گا اور یہ نالہ و فریاد کرتے رہیں گے کہ ہماری اولاد ہم پر ایسے ظلم و ستم کر رہی ہے یہ نہیں جانتے کہ اگر انھیں حلال روزی سے پالا جاتا اور علم و ادب سکھایا جاتا تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتے۔

فراغت اور صبر } فرمایا: حق تعالےٰ نے طرح طرح کی بلائیں اور فتنے پیدا کیے ہیں تاکہ اپنے بندوں کا امتحان کرے کہ کون صبر کرتا ہے، کون نہیں کر سکتا۔ وجعلنا بعضکم لبعض فتنۃ اتصبرون وکان ربک بصیرا (الفرقان ۲۰) (اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لیے فتنہ بنا دیا ہے کیا تم صبر کروگے؟ اور تمہارا رب سب دیکھنے والا ہے)

اس لیے ہر حال میں اللہ کی پناہ ڈھونڈھنی چاہیئے اور حق کے کام میں مشغول رہنا چاہیئے۔ خدمت شیخ الاسلام نظام الدین قدس اللہ سرہ العزیز کے ایک مرید تھے وہ اول صبح سے زوال کے وقت تک مسجد جمعہ میں مشغول رہا کرتے تھے، پھر گھر آتے اور گھر والوں سے پوچھتے کھانے کی کوئی چیز ہے؟ اگر ہوتی تو کھالیتے اور کھلانے والے کو دعا دیتے، پھر وضو کرتے اور مسجد میں چلے جاتے، عشاء کی نماز پڑھ کر واپس آتے اور پوچھتے: کیا چیز ہے؟ اگر کچھ ہوتا تو کھالیتے تھے ورنہ بھوکے سو جاتے تھے اس معمول میں کچھ اضافہ کرتے تھے ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ مقصود یہ کہ اگر درویش کو اتنی فراغت نصیب ہو کہ گھر والے اس سے کچھ مطالبہ نہ کریں تو یہی بہت بڑی بات ہے۔

دشت و کہسار گیر ہچو وحوش　　خانہ تسلیم کن بہ گربہ و موش

(تم جنگلی جانوروں کی طرح جنگل اور پہاڑ کو اپنا ٹھکانا بنالو اور گھر کو چوہوں بلیوں کے لیے چھوڑ دو)

کھانے کے آداب } حضرت نے فرمایا: کھانے سے تو چارہ نہیں البتہ کم کھانا بہت بڑی بات ہے پھر لقمان حکیم اور ان کے فرزند کی ایک حکایت بیان فرمائی جس کا مقصد کم کھانے کے فوائد بیان کرنا تھا۔

فرمایا: درویشوں کے نزدیک کھانے کے آداب یہ ہیں کہ بسم اللہ پڑھیں اور کسی سے کھانے کے لیے اصرار نہ کریں ہو سکتا ہے کہ وہ شخص کھا چکا ہو اور دوبارہ کھانا اسے نقصان دے جائے یا کوئی مجاہدہ اور شب بیداری کر رہا ہو اسے کھانے سے حرج واقع ہو۔ البتہ جو شخص بھوکا ہو اور تکلف کرے، کھانا نہ کھائے اس کے لئے یہی سزا کافی ہے کہ بھوکا رہے۔ کسی کے سامنے کھٹی چیز نہ رکھیں درمیان میں رکھی جائے کچھ لوگ کھٹی چیزیں ذرا زیادہ کھاتے ہیں اور بعضوں کو بالکل مرغوب نہیں ہوتیں۔

فرمایا: پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ فرائض ادا کرنے کے بعد اور کوئی عبادت اطعام (کھانا کھلانے) سے بڑھ کر نہیں ہے۔

استخارہ اور طلب خیر } فرمایا: جو کوئی مہم پیش آئے اس میں پہلے استخارہ کرنا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنی چاہیئے پھر دیکھیں وہ دل میں کیا القا کرتا ہے۔

خدمت شیخ (برہان الدین غریبؒ) نے فرمایا ہے کہ اگر کسی کو بڑی مہم پیش آئے تو بہت زیادہ استخارہ کرے اللہ تعالےٰ اس مصیبت کو ٹال دے گا۔ اگر کوئی مہم نہ بھی ہو تو اللہ تعالیٰ استخارے کی برکت سے اس کے سب کاموں کو ٹھیک کر دے گا۔

فرمایا یہ کہا گیا ہے کہ اللہ کے کچھ فقیر بندے ایسے ہیں کہ اگر وہ دولت مند ہو جائیں تو کافر بن جائیں

اور بعض دولت مند ایسے ہیں کہ اگر وہ فقیر ہو جائیں تو کافر بن جائیں۔ بندہ کسی حال میں بھی یہ نہیں جانتا کہ اس کی بھلائی کاہے میں ہے فقر میں یا غنا میں، سفر میں یا حضر میں، اس لیے کوئی چیز اپنی رائے سے اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ اور ہر وقت اللہ سے خیریت کا طلبگار رہنا چاہیے۔ اور استخارہ کرنا چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ خیریت رکھے۔

فرمایا: مالک دینارؒ کو سخت تمنا تھی کہ اگر جہاد ہو تو میں راہ خدا میں شہادت حاصل کروں۔ ایک بار ایسا موقع آیا اور وہ میدان جنگ میں گئے جب دشمنوں سے آمنا سامنا ہوا تو انھوں نے کہا خدا کا شکر ہے جو میری تمنا تھی وہ پوری ہو گئی اسی وقت انھیں سخت بخار چڑھ گیا، بے تاب ہو گئے اٹھنے بیٹھنے کی سکت بھی نہ رہی لڑھک کر بے ہوش ہو گئے ساتھیوں نے چاہا کہ انھیں اٹھا کر بستر پر لٹا دیں۔ انھوں نے کہا مجھے چھوڑ دو میں اٹھانے کے لائق نہیں، برسوں سے میری نیت تھی کہ اللہ کی راہ میں جہاد کروں جب وہ وقت آیا تو میرا یہ حال ہو گیا، اس سے میں نے جان لیا کہ مجھے اس بارگاہ میں قبولیت حاصل نہیں اور جسے اس بارگاہ میں قبولیت حاصل نہ ہو وہ اٹھانے کے لائق نہیں ہوتا۔ ہاتف نے آواز دی کہ اے مالک تمہاری خیریت اسی میں تھی۔ اگر تم جہاد کرتے تو گرفتار ہو جاتے، قید سخت میں رکھے جاتے، تم سے مشقت لی جاتی اور تم ناگفتنی کہہ اٹھتے کافر ہو جاتے۔

فرمایا: بندہ کچھ نہیں جانتا کہ اس کی خیریت کاہے میں ہے۔ اس لئے بندے کو چاہیے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے اپنی خیریت طلب کرے اور ہر لحظہ اس کی پناہ ڈھونڈے۔ پھر دیکھے اللہ کیا کرتا ہے۔

روزی رساں وہ ہے

جامع ملفوظ امیر حسن نے عرض کیا کہ اگر قتلغ خاں کے قافلے کے ساتھ بندہ دہلی چلا جائے تو میرے روزگار کا حال کیا ہوگا؟ حضرت نے فرمایا: ہونا کیا، جس شخص کو اللہ نے فراخ روزی پیدا کیا ہے وہ کیا یہاں کیا وہاں، جہاں بھی رہے گا اللہ تعالیٰ اسے روزی پہنچائے گا۔ یہ تو عوام کی باتیں ہیں کہ اگر فلاں چیز یا فلاں شخص نہ ہو تو ہم کہاں سے کھائیں گے، کہاں سے پہنیں گے۔ یہ نہیں سوچتے کہ اگر فلاں چیز یا فلاں شخص کو پیدا نہ کیا گیا ہوتا تو کیا وہ تمہیں روزی نہ دیتا؟

ایک بار خلیفہ ہارون الرشید اپنے شاہی دبدبے کے ساتھ گذر رہا تھا ایک مجذوب راستے میں پاؤں پھیلائے بیٹھا ہوا تھا اس نے خلیفہ کے کروفر کی طرف کچھ التفات نہ کیا، خلیفہ سواری سے اتر پڑا اور مجذوب کے پاؤں پر ٹھوکر ماری مجذوب نے کہا: یہ سب ہائے وہو کیا ہے؟ ہارون نے کہا: تجمل بادشاہی۔ اس مجذوب نے کہا: مصطفی علیہ الصلوۃ والسلام خانہ کعبہ میں جاتے تھے، طواف کرتے تھے ہر طرف جاتے تھے اور ایسا تو کچھ بھی نہ کرتے تھے، کیا تمہاری شان ان سے بھی بڑھ کر ہو گئی؟ ہارون نے کہا: کیا کروں؟ ہم نفس امارہ کے قیدی ہیں۔ پھر خلیفہ نے کہا کچھ قبول فرمائیں۔ مجذوب نے کہا: میرے اندر چوکیداری کرنے کی قوت نہیں ہے۔ خلیفہ نے کہا ہم آپ کے لئے روزینہ (وظیفہ) بھجوا دیا کریں گے۔ مجذوب نے کہا: بس بات کو طول نہ دو میں اور تم دونوں ایک ہی بادشاہ کے بندے ہیں جب وہ تمہیں روزی دے رہا ہے تو کیا مجھے چھوڑ دے گا؟

اسباب پر نظر

فرمایا: اس میں شک نہیں کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے اور لوگ دو طرح کے ہیں بعض تو اسباب پر نظر رکھتے ہیں تجارت کرتے ہیں یا کھیتی باڑی کرتے ہیں

یا کوئی پیشہ یا جاگیر رکھتے ہیں اور ان اسباب پر بھروسا کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ نہ ہوں تو ہم ہلاک ہو جائیں گے وہ ساری جدوجہد ان اسباب کو باقی رکھنے کے لیے کرتے ہیں یہ تو عوام الناس ہیں۔ مگر بعضے اپنی نظر مسبب الاسباب پر رکھتے ہیں اسباب پر نہیں وہ منتظر رہتے ہیں کہ اللہ کیا عطا کرے گا اور کہاں سے بھیجے گا ان کی نظر اسباب پر مطلق نہیں ہوتی۔ اگرچہ دونوں گروہ کے لوگ اللہ کی طرف سے اور کسی سبب کے ذریعے سے روزی پاتے ہیں مگر جن کی نظر اسباب پر رہتی ہے وہ محجوب ہیں (ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے) اور وہ مسبب الاسباب (اللہ) کو درمیان میں نہیں دیکھتے، جن کی نظر مسبب الاسباب پر ہوتی ہے ان کی آنکھوں پر کوئی سبب پردہ نہیں ڈال سکتا۔

تمھاری کیا مجال ہے!

فرمایا: ایک بار ایک درویش نے اپنا قصہ بیان کیا کہ اس کے پاس سرکاری آدمی آیا اور ٹیکس کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے اپنے غلام سے پوچھا کہ کچھ ہے؟ غلام نے کہا کہ کوئی چیز نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ اس سرکاری آدمی سے کیا کہوں۔ اور گھر کے آمد و خرچ کا کیا انتظام کروں؟ غلام سے پوچھا: آخر کچھ تو ہوگا؟ غلام نے کچھ سوچ کر جواب دیا کہ ایک کمخواب کا ٹکڑا ہے۔ میں نے کہا اس پایگاہ والے سے معذرت کر لو، جب ہم نماز جمعہ کے بعد واپس ہوں گے تو یہ کمخواب فروخت کریں گے، کچھ گھر کے خرچ کے لیے رکھ لیں گے اور پایگاہ کا وظیفہ (ٹیکس) بھی ادا کر دیں گے۔ مگر اسے پیسے نہ ہونے یا کمخواب فروخت کرنے کی بات مت بتاؤ۔

فرمایا کہ میرے پاس ایک بڑا سا گھوڑا تھا اس پر زین کسی اور اچھا قیمتی لباس زیب تن کیا، سوار ہو کر چلا۔ راستے میں غلام سے کہا کہ ایسا گھوڑا اور یہ لباس جو میں پہنے ہوئے ہوں، اس کے ہوتے اگر کسی سے یہ کہوں کہ میں مفلس ہوں، میرے پاس کچھ نہیں ہے تو کوئی یقین کرے گا؟ غلام نے کہا: کوئی بھی یقین نہیں کرے گا میں نے آسمان کی طرف رخ کر کے کہا: یا اللہ میرا حال تو خوب جانتا ہے۔ مسجد میں جا کر ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک امیر میرے قریب آیا اور بیٹھ گیا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا اور کہا: مولانا میرے دل میں یہ بات آتی ہے کہ پچاس تنکے آپ کی نذر کروں۔ میں نے کہا: تمھاری کیا مجال ہے جو نہ دو۔ اس جواب سے اس امیر کے چہرے کا رنگ بدل گیا، کہ آخر یہ کیا جواب ہوا؟ اس شخص کو معذرت کرنی چاہیے تھی۔ اور مجھے دعا دینی چاہیے تھی کہنے لگا: مولانا آخر یہ کیا جواب ہے جو آپ نے کہا۔ میں نے کہا کہ بات کو بڑھاؤ مت۔ میرا ایسا حال ہے اور میں راستے میں غلام سے یہ بات کہہ رہا تھا۔ اب جو اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرما رہا ہے اور تم سے مجھے دلا رہا ہے تو کیا تمھاری مجال ہے کہ تم مجھے نہ دو؟ وہ امیر مسکرایا اور خوش ہوا، غلام کو بلا کر اسے پچاس تنکے اپنے سامنے دلا دیتے۔

ہم سے بکری اچھی

فرمایا کہ اسی صاحب دل درویش نے یہ حکایت بیان کی کہ ایک دن ہم بیٹھے ہوتے تھے اور فرش پر کچھ درہم رکھے تھے ایک بکری آئی اور ان درہموں پر اس نے مینگنیاں کر دیں۔ مجھے بہت ناگوار ہوا کہ اس بکری نے فرش اور درہم دونوں کو گندا کر دیا یہ کیا ہوا؟ جب اس پر غور کیا تو میرے دل میں یہ بات آئی کہ ابھی تمھارا نفس بیمار ہے اور یہ بکری تم سے بہتر ہے۔ جو چاندی کو بھی اینٹ پتھر جیسا سمجھ رہی ہے اگر وہ یہ مینگنیاں اینٹ پتھروں پر کرتی تو تمھیں کچھ تکلیف نہ ہوتی مگر چونکہ تمھاری دنیوی غرض ان درہموں سے وابستہ ہے اس لیے یہ تمھارے محبوب ہیں ان پر بکری نے گندگی کر دی تو تمھیں ناگوار ہوا۔ آخر یہ کیا بیماری ہے کہ بکریاں بھی تم سے اچھی ہیں۔ میں رونے لگا اور سخت ندامت ہوئی۔

ایک گویّے کا قصہ

فرمایا: اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے جو کوئی اس کی درگاہ

ں پناہ لیتا ہے وہ ہرگز ضائع نہیں ہوتا اور اس کی
ب دینی و دنیوی مراد بن پوری ہو جاتی ہیں کسی زمانے
ں ایک گویا تھا جوانی میں بہت اچھی آواز تھی ہر طرف
سے آمدنی ہوتی تھی بہت سا اسباب واملاک اس نے
ع کر لیا تھا اور آرام سے زندگی گذارتا تھا جب بوڑھا
وگیا تو آواز میں وہ دم نہ رہا اور اسباب واملاک
ی سب خرچ ہو گئے اب کوئی شخص اس کا گانا نہ
ستا تھا مجبوراً وہ گھر میں بیٹھ رہا سب جگہ کا آنا جانا
ند ہو گیا۔ جب گھر والوں نے دیکھا کہ اب یہ کچھ کما کر
یں لاتا تو اس سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا کہ بیٹھے
لیا ہو، جاؤ کچھ کما کر لاؤ۔ اس نے کہا: میں بوڑھا
ہو گیا ہوں اب کسی کو میرا گانا پسند نہیں آتا، کہاں
باؤں؟ گھر والوں نے یہ عذر قبول نہ کیا اور کہا کچھ
ی ہو تمہیں کما کر لانا چاہئے وہ چند روز تک ادھر
دھر گیا، در بدر کی ٹھوکریں کھائیں کسی سے پھوٹی
وڑی نہ ملی، آخر اپنے گھر واپس آیا، گھر والوں نے
سے نکال دیا اور کہا اگر کچھ کما کر لاتے ہو تو ٹھیک
ہے ورنہ اب اس گھر میں مت گھسنا۔ بیچارے گویے
کا دل ٹوٹ گیا، وہ باہر نکلا، کچھ دور چلا ایک دریا
کے کنارے مسجد دیکھی اس میں داخل ہو گیا، محراب
ی طرف رخ کرکے بیٹھ گیا اور کہا: اے اللہ میں بوڑھا
ہو گیا ہوں، کوئی میرا گانا ایک چھدام میں بھی نہیں
خریدتا اب نہایت عاجزی و بے چارگی کے عالم میں
یرے سامنے حاضر ہوں اور گانا گاتا ہوں ساری
خلوق نے تو مجھے چھوڑ دیا ہے تو اپنے کرم سے مجھے خرید
لے۔ اس نے عصر کی نماز کے وقت تک گانا گایا، اور
ہا ہتا تھا کہ نہایت دل شکستگی کی حالت میں مسجد سے
ہر نکلے أنا عندَ المنكسرةِ قلوبُهم (میں ٹوٹے
ہوئے دلوں کے پاس ہوں) کے مصداق رحمت حق
وش میں آئی۔ ؎

شکستہ ہر چہ باشد ہیچ قیمت نادرد جز دل
کہ ہر چند او شکستہ تر فزوں تر قدرش از یزداں

ترجمہ: تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

(اقبال)

ہر چیز کہ بشکند بہا کم شود ش
جز دل شکند بہا یابد بیش
(جو چیز بھی ٹوٹ جائے اس کی قیمت کم ہو جاتی ہے
سوائے دل کے، وہ شکستہ ہو تو اس کی زیادہ قیمت
اٹھتی ہے)

ناگاہ دیوار کے درمیان سے ایک ہاتھ نکلا اور
چند درم ضرورت کے بقدر اس کے ہاتھ میں رکھ دیئے
گویا خوش ہو گیا، خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے گھر کو
واپس آیا وہ درہم گھر والوں کے سامنے رکھ دیئے۔
انھوں نے پوچھا: یہ کہاں سے لائے؟ اس نے کہا کہ آج
میں ایک سخی کے گھر گیا تھا وہاں سے یہ ملے ہیں۔ گھر والے
بھی بہت خوش ہوئے، انھوں نے کھانا پکا کر کھایا
اور کہا کہ بہت اچھا سخی ہے۔ گویا ہر روز اسی جگہ جا کر
نماز عصر کے وقت تک گانا گاتا تھا اور وہی ہاتھ دیوار
سے برآمد ہو کر اس کے ہاتھ پر چند درہم رکھ دیتا
تھا۔ چند روز تک یہی حال رہا۔ اب یہ ہوا کہ جو دن نکلے
بھی مشکل سے بیدار ہوتا تھا اسے اس بدبختی سے نجات
مل گئی۔ ایک دن دریا کے کنارے آیا اور سوچا کہ وضو
کر لوں۔ ہر روز مسجد میں بے وضو جایا کرتا تھا۔ اس
نے وضو کیا مسجد میں داخل ہوا، جب ظہر کی نماز کا
وقت ہوا تو سوچا کہ وضو تو ہے، ظہر کی نماز پڑھ لوں
اکیلے ہی نماز بھی پڑھ لی اور معمول کے مطابق چند درہم
بھی مل گئے یہ واپس ہو گیا دوسرے دن بھی نماز
مل گئی، پھر تین نمازیں پڑھنے لگا یہاں تک کہ پانچوں
وقت کی نماز کا پابند ہو گیا۔ اسے غیب سے ایک جھنیل (سکہ)

مل جاتا تھا وہ نماز میں پڑھتا رہتا تھا اور اس حال میں مگن تھا۔ ایک دن مسجد میں بیٹھا ہوا گار رہا تھا کہ اسے خیال آیا روزی تو اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے میں نے اس دیوار سے نکلنے والے ہاتھ سے دل اٹکا رکھا ہے آخر یہ کب تک چلے گا؟ اور کب یہ بیماری میرے دل سے دور ہوگی کہ میں اس دیوار سے ہاتھ اٹھالوں اور خدا سے لو لگاؤں۔ اس نے مناجات کی: خدایا تو ہی روزی دیتا ہے اور تجھے یہ بھی قدرت ہے کہ اس ہاتھ اور دیوار کے وسیلے کے بغیر میرا رزق پہنچا دے تاکہ میرا دل تیری یاد میں لگ جائے۔ جب واپس ہونے لگا تو اس نے انتظار کیا کہ وہ درہم ملیں گے مگر کچھ ظاہر نہ ہوا۔ اسے سخت حیرت ہوئی کہ یہ کیا ہوا؟ پھر سوچا کہ شاید اللہ کسی دوسری جگہ سے روزی پہنچائے گا، اٹھا اور واپس جانے لگا اس نے اپنی بانسری اٹھائی تو دیکھا کہ وہ بہت بھاری ہو رہی ہے اٹھتی نہیں غور کیا تو وہ پوری سونے کی ہو چکی تھی۔ اس نے کہا: یا اللہ یہ کیا بلا آئی؟ اب میں اسے کہاں لے جاؤں؟ اس کا کیا کروں؟ لوگ مجھے پکڑ لیں گے کہ یہ تونے کہاں سے چرائی؟ میری پٹائی کریں گے۔ اے اللہ میں نے تجھ سے یہ تھوڑی مانگی تھی بس وہ درہم ہی ٹھیک تھے میرا حال بھی چھپا ہوا تھا کوئی اس سے واقف نہ تھا اپنے کرم سے یہ بانسری تو وہی لکڑی کی کردے ہاتف نے آواز دی کہ کریموں کا یہ شیوہ نہیں ہے کہ اپنی بخشش کو واپس لے لیں اسے اٹھالو اور لے جاؤ، دیکھو اللہ تعالیٰ کیا کرتا ہے۔

اس نے بادل ناخواستہ وہ بانسری اٹھائی اور چل دیا۔ مغرب کی نماز کے وقت ایک مسجد کے دروازے پر پہنچا جماعت کھڑی ہو چکی تھی اس نے چاہا کہ جلدی سے جماعت میں شامل ہو جائے وہ بانسری ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اس کی ایسی آواز نکلی جو سب نمازیوں نے سنی وہ جتنی جلدی کر سکتا تھا کی اور جماعت میں شریک ہو گیا۔ نماز ختم ہونے کے بعد سب لوگ مسجد سے نکلے تو دیکھا کہ سونے کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں اس سے پوچھا یہ کہاں سے ملے؟ مجبوراً اس نے اپنا قصہ ان لوگوں کو بتایا سب لوگ متحیر ہوئے اور اس کے ہاتھ پاؤں چومنے لگے مختصر یہ کہ شہر بھر میں مشہور ہو گیا کہ فلاں گویا ایسا صاحب کرامات ہو گیا ہے جب اپنے گھر آیا تو گھر والوں کو بھی تعجب ہوا کہ اتنا سونا کہاں سے ملا اس نے مجبوراً گھر والوں کو بھی سارا ماجرا بتادیا وہ بھی معتقد ہو گئے اور یہ مطرب اپنی کرامت کے لیے مشہور ہو گیا ہر طرف سے فتوحات آنے لگیں۔ بس سمجھ لو کہ خود کو کارِ حق کے پیچھے لگائے رکھنا ایسے پھل دیتا ہے۔ لہٰذا یہ چاہیے کہ سب طرف سے نظریں ہٹالو اور جو بھی جدوجہد کرنی ہے وہ عبادت میں اور حق کی اطاعت میں صرف کرو اس وقت تک کہ یقین صادق حاصل ہو جائے: وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَأْتِیَکَ الْیَقِیْنُ (الحجر/۹۹)

(جاری ہے)

صاحب شریعت وطریقت، ادیب شاعر ونقاد

حضرت علامہ میکش اکبرآبادی

جناب ششی ٹنڈن

مری نگاہ نے ہستی کو دی ہے ضو میکشؔ
میں دیکھ لوں تو یہ موتی ہے ورنہ شبنم ہے

(علامہ میکش اکبرآبادیؒ)

حضرت قبلہ سید محمد علی شاہ میکشؔ اکبرآبادیؒ
ستانِ ادب آگرہ کے وہ آخری ذی علم ونظر ادیب
ناعر تھے جن کے وصال کے ساتھ ہی ایوانِ ادب آگرہ
ایک شمع جو باقی رہ گئی تھی وہ بھی خاموش ہوگئی۔
رت میکشؔ اکبرآبادیؒ کی ذاتِ گرامی کے دم ہی سے
رہ کے ادبی مقام ومرتبہ کا بھرم قائم تھا۔ آپ کے
سال کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے گویا کہ

"جو ہم نہ ہوں تو یہ دُنیا مقامِ ہُو سی ہے"

خاندانِ اصحابِ رشد وہدایت کے چشم وچراغ
رت میکش اکبرآبادی علوم باطنی وظاہری سے آراستہ
تھے۔ آپ نے دینی تعلیم آگرہ کی شاہی جامع مسجد کے
رسہ عالیہ میں مکمل کی اور مدرسہ عالیہ سے درسِ نظامیہ کی
ند حاصل کرکے فارغ التحصیل قرار پائے۔ جہاں تک
باطنی کا سوال ہے تو اسلاف کے شیوۂ شریعت وطریقت
تو آپ اوائل عمری ہی سے عمل پیرا تھے بعدازاں خانقاہِ
از بہ بریلی شریف کے صاحبِ کشف وکرامات بزرگ
رت شاہ محی الدین سراج السالکینؒ سے شرف بیعت
صل ہوا۔ حضرت سراج السالکین کی قربت نے آپ کے
سینہ کو علم باطن سے منور کردیا۔ اس ضمن میں حضرت
میکش اکبرآبادی صاحب فرماتے ہیں "ان کی (حضرت
سراج السالکینؒ کی) زیارت کے بعد مجھے جنیدؒ وبایزیدؒ
کی زیارت کی تمنا دہی۔ حضرت سے تصوف کے رسالے
سبقاً سبقاً پڑھے ہیں اور تقریریں سنی ہیں وہی میرے علم
تصوف کا سرمایہ ہے۔"

حضرت میکش اکبرآبادیؒ صرف وہ صوفی نہیں
تھے جن کے ضمن میں حضرت علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ

"میراث میں آئی ہے انھیں مسند ارشاد"

حضرت میکش کے بزرگوں میں سید امجد علی شاہ
صاحب اصغر، سید منور علی شاہ صاحب، سید مظفر علی
شاہ صاحب اللّٰہی اور سید اصغر علی شاہ صاحب وہ محترم
ہستیاں تھیں جنھوں نے اپنے علم وفضل اور عبادت
وریاضت سے آگرہ اور بیرون آگرہ کے عوام کو گرویدہ
بنا لیا تھا۔ ان صوفیائے کرام کے عقیدت مندوں کا وسیع
حلقہ تھا۔ حضرت میکش کو بزرگوں کی مسند ارشاد تو ورثہ
میں ملی لیکن مختلف طریقہ سے۔ آپ کے والد ماجد حضرت
اصغر علی شاہ صاحبؒ آپ کے عہدِ طفلی ہی میں انتقال فرماگئے

لہٰذا والد محترم کے وصال کے بعد حضرت میکش اکبرآبادیؒ نے جو علم ظاہری و باطنی حاصل کیا وہ آپ کے مطالعے، محنت شاقہ، عبادت و ریاضت اور حضرت قبلہ شاہ محی الدین سراج السالکینؒ کی قربت اور دست کرم کا نتیجہ تھا نہ کہ صرف "میراث میں آئی ہوئی مسند ارشاد کا پھل"۔ —

حضرت میکش نے اہل خرقہ اور اہل خامہ دونوں کے حلقہ میں یکساں پذیرائی اور عزت حاصل کی جو اس دنیا میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔ حضرت میکش اکبرآبادی جہاں گفتار و کردار کے اعتبار سے یکسانیت رکھتے تھے وہیں فکر و نقد کے معاملے میں بھی آپ کے یہاں کوئی تضاد نہیں تھا۔ آپ پُرشکوہ و پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ خاندانی شرافت و نجابت کے ساتھ آپ کی عالمانہ و مدلل گفتگو آپ کی مقناطیسی شخصیت کو اور زیادہ پُرکشش بنا دیتی تھی۔ خاندانی سیادت اور عقیدت مندوں اور پرستاروں کے وسیع حلقہ کے باوجود آپ قناعت پسند، کم سخن اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے۔ آپ کے علم و تبحر کی انتہا یہ تھی کہ کسی بھی پیچیدہ دینی و روحانی مسئلہ یا ادبی نکتہ پر آپ نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ سیر حاصل گفتگو فرماتے تھے۔ حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی حضرت میکش اکبرآبادی کے ادبی و روحانی مقام و مرتبہ کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فطرت میں علم و فضل کی دنیا لئے ہوئے
سیرت میں جلوۂ ید بیضا لئے ہوئے
خرقہ بدوش محفل ناز و نیاز میں
سجادہ و گلیم و مصلّے لئے ہوئے
خود میکش اور خود ہی قدح نوش و مے فروش
جام و سبو و شیشہ و صہبا لئے ہوئے

حضرت علامہ میکش اکبرآبادیؒ کی شخصیت جامع صفات اور رانجمن کی سی تھی۔ پاک طینت اور مے طہارت سے مخمور حضرت میکش کے ہم عصر شعراء و ادباء میں علامہ نیاز فتحپوری، فانی بدایونی، مانی جائسی، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، ل۔ احمد اکبرآبادی، فراق گورکھپوری آپ کی ادبی حیثیت کے قائل و معترف تھے۔ علامہ نیاز فتحپوری فرماتے ہیں "میکش آگرے کی ادب خیز سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں اور وہاں کی تمام فنی وزن رکھنے والی ادبی روایات سے واقف ہیں اسی لئے ان کے کلام میں وزن ہے، فکر ہے، متانت ہے، سنجیدگی ہے۔ اور اسی کے ساتھ شگفتگی اور ترنم بھی۔ ان کے جذبات جتنے ستھرے ہیں اتنا ہی ٹھہراؤ ان کے اظہار میں بھی پایا جاتا ہے"

حضرت علامہ نیاز فتحپوری نے جو کچھ فرمایا وہ صداقت و حقائق پر مبنی ہے۔ کلام میکش میں فن، فکر و فلسفہ کا حسین امتزاج ہے۔ چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

مری عمریں سمٹ آئی ہیں ان کے ایک لمحے میں
بڑی مدت میں ہوتی ہے یہ عمر جاوداں پیدا
یہ اپنا اپنا مسلک ہے یہ اپنی اپنی فطرت ہے
جلاؤ آشیاں تم ہم کریں گے آشیاں پیدا

یہ حال کیا ہے کہ آغوش میں تجھے لے کر
تمام عمر ترا انتظار میں نے کیا

بت خانے تری زلف سے تعمیر کئے ہیں
ابرو کو تری طاق حرم ہم نے کیا ہے
گلہائے پریشاں پہ شہیدوں کا فسانہ
خون دل شبنم سے رقم ہم نے کیا ہے

حاصل عشق غم دل کے سوا کچھ بھی نہیں
اور اگر ہے تو سب ان کا ہے مرا کچھ بھی نہیں
جو خدا دے تو بڑی چیز ہے احساس جمال
لیکن اس راہ میں ٹھوکر کے سوا کچھ بھی نہیں

وقت کے ساتھ بدل جاتی ہے دنیا میکشؔ
جس پہ ہم جیتے تھے وہ عہدِ وفا کچھ بھی نہیں

اس درجہ دشمنی تو مقدر کی بات ہے
ورنہ وہ ایک عمر مرے رازداں رہے
اہل حرم وہاں ہیں یہاں اہل دیر ہیں
اب کس سے جا کے پوچھئے انساں کہاں رہے

ہے یہ انسان ہی وہ قبلۂ برحق کہ جسے
سجدہ کرنے کے لئے دیر و حرم آتے ہیں
لوگ تو اور بھی تھے دُنیا میں
کیوں مرے دل کو بھا گئے وہ لوگ
ہر بہانے ہے دل کو اُن کی یاد
کچھ ہوا اور آگئے وہ لوگ

ایک ہلکا سا تبسّم مری راتوں کا چراغ
وہ بھی تیرے لبِ نازک کو گراں لگتا ہے

مجھے چمن میں نسیم بہار لاتی ہے
چمن میں کون مرے دل کی بات سمجھے گا
مچا ہوا ہو جہاں رنگ و بُو کا ہنگامہ
وہاں دلوں کی کوئی واردات سمجھے گا

آنکھوں میں نمی دلوں میں یادیں
ہیں صبح کو داستانِ شب ہم
کچھ سمجھا کسی نے کچھ کسی نے
ہیں کس کا پیام زیرِ لب ہم

حضرت قبلہ سید محمد علی شاہ میکشؔ اکبر آبادیؒ نے ایک طویل مدت تک ادب و ادیب دونوں کے لئے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ وقف کیا۔ آپ کے دیوان خانہ کی ادبی نشستوں کے ذریعہ مجاز، جذبی اور تاباں جیسے درخشاں ادب کے ستاروں کو ضیاء حاصل ہوئی۔ آج کے دور کے اہم نقاد و ادیب ڈاکٹر مغیث فریدی بھی حضرت میکشؔ اکبر آبادی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر مغیث فریدی ہی کی طرح دیگر اہلِ نقد و رقم اور اصحابِ ذوق و شوق نے آپ کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔

حضرت میکش اکبر آبادیؒ نے نظم و نثر دونوں پیرایہ میں کتب تصنیف کی ہیں۔ آپ نے ادب و تصوف اور دیگر موضوعات پر تقریباً ، مضامین قلم بند کئے ہیں۔ نگار، نقوش اور شاعر ادبی رسائل میں آپ کی ذاتِ گرامی اور ادب پر خصوصی شمارے شائع ہوئے۔ آپ کو مختلف انجمنوں اور اکادمیوں سے ادبی خدمات کے لئے اعزازات و انعام حاصل ہوئے۔

حضرت میکش اکبر آبادی آگرہ کی اس قدر بلند مرتبہ روحانی و ادبی شخصیت تھے کہ انھیں دنیاوی انعام و اکرام کی کوئی خواہش نہ تھی۔ تصوف سے وابستگی کی وجہ سے حضرت کی نظر میں اصل مقام و مرتبہ کا تعین تو اس دارِ فانی سے کوچ کرنے کے بعد ہی ہوگا صوفیائے کرام کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے وصال کے بعد اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرماتے ہیں۔ لہذا حضرت میکشؔ اکبر آبادی نے دنیاوی جاہ و جلال یا انعام و اکرام کی کبھی کوئی پرواہ نہ کی آپ بے لوث خدمات انجام دیتے رہے۔ بقول حضرت میکشؔ

گدائے خلق نہیں صاحبانِ فکر و نظر
نہ زندہ باد کی خواہش نہ خوفِ مردہ باد

حضرت میکش اکبر آبادی عالمِ دین، صوفی، ادیب و شاعر تھے۔ آپ نے تصوف، فلسفہ، ادب اور دیگر موضوعات پر اعلیٰ پائے کی تصانیف بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ نقدِ اقبال، مسائلِ تصوف،

فرزندِ غوث الاعظم، نغمہ اور اسلام، توحید و شرک کتب کے علاوہ حرفِ تمنا، میکدہ اور داستانِ شب شعری و فنی لطافتوں و نزاکتوں کے مجموعے ہیں۔ حضرت میکش اکبرآبادیؒ نے ستر سے زیادہ مختلف موضوعات پر مضامین بھی قلم بند کئے۔ آپ کی آگرہ کی ادبی، سماجی و تعلیمی انجمنوں سے وابستگی کم اہم نہ تھی۔ جامعۂ اردو علی گڑھ کا قیام آگرہ ہی میں ہوا تھا اور اس کے قیام کے وقت جامعۂ اردو کو آپ کا بھی عملی تعاون حاصل ہوا تھا یہ تعاون بعد کے برسوں میں بھی جاری رہا۔ بزمِ اقبال، بزمِ نظیر کی آپ نے تاحیات سرپرستی فرمائی۔
آپ عاشقِ رسولؐ عربی، مدّاح مولا مشکل کشا حضرت علیؓ مرتضیٰ، اور محبِّ اہل بیت، اور اولیائے کرام اور علمائے عظام کی حیاتِ مقدسہ کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ آگرہ آپ کا وطن تھا اور اسی کی خاک میں آج آپ آرام فرما رہے ہیں۔

ہے اس خاک میں مری عمروں کا رنگ و لو
میرا وطن الٰہی ہمیشہ جواں رہے

آپ کے انتقال پر ملال پر دہلی سے کراچی (پاکستان) تک ماتمی و تعزیتی نشستیں ہوئیں۔ آپ کے وصال کے بعد بہارِ گلشنِ اکبرآباد خزاں میں تبدیل ہوگئی۔

"آئی گلشن میں ذرا موجِ صبا اور گئی"

حضرت میکش اکبرآبادیؒ کے وصال پر مختلف تاریخیں کہی گئیں۔ جو فنِ تاریخ گوئی کا نمونہ اور حضرت میکش کو بہترین خراجِ عقیدت ہیں۔

واصلِ حق محمد علی شاہ کی
ہے یہ تاریخ بہ فیضِ شاہ نجف
لطفِ ساقیٔ کوثر ہے مخمور پر
باغِ جنت میں میکش ہیں ساغر بکف

۱۹۹۱
(جناب طیب علی کاظمی اکبرآبادی)

وقتِ رخصت حضرتِ میکش یہ کہہ کر چل دیئے
سوئے کوثر تھا یقینی ایک دن جانا مجھے
اور پھر دعوے سے یہ فرما گئے خلد آشیاں
یاد رکھیں گے سدا خاصانِ میخانہ مجھے

۱۹۹۱
(جناب طیب علی کاظمی اکبرآبادی)

حضرت قبلہ سید محمد علی شاہ میکش اکبرآبادیؒ کے مزار اقدس کی لوح پر آپ کا فرمایا ہوا شعر ہی ثبت ہے۔ یہ شعر آپ کے مجموعہ کلام داستانِ شب کے آخری صفحہ پر کتبۂ قبر کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

جو فرشِ گل پر سو نہ سکا جو ہنس نہ سکا جو رو نہ سکا
اس خاک پہ اس شوریدہ سر نے آخر آج آرام کیا

آج دبستانِ اکبرآباد اس مضبوط ستون سے محروم ہے جس پر آگرہ کے ادبی ایوان کے بام و در سہارا لئے ہوئے تھے۔ صاحبِ قلم حضرت میکش اکبرآبادی نے اس قدر لطیف و متاثر کن نگارشات کے ذریعہ اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا کہ آپ کی نگارشات سے 'نوائے سروش' کا احساس ہوتا ہے حضرت میکش اکبرآبادیؒ کو ڈاکٹر سرور اکبرآبادی (کراچی، پاکستان) حضرت میکشؒ کے شایانِ شان ہی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

ترے افکار سے اندازۂ الہام ہوتا ہے
محبت کا تخاطب عشق کا پیغام ہوتا ہے
ترے میخانۂ عرفاں کا اک اک رند اے میکش
سُرور و کیف و مستی کا چھلکتا جام ہوتا ہے

اردو گلستاں

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا منتخب روزنامچہ

۲۱ر جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۱۳ر نومبر ۱۹۳۰ء
پنجشنبہ ۔ دہلی

سیاسی } گول میز کانفرس لندن میں شروع ہوگئی۔ بادشاہ سلامت اور وزیراعظم اور ممبران خاص کی تقریریں ہوئیں جو دہلی میں بھی ریڈیو (خاص آلہ) کے ذریعہ لوگوں نے سنیں۔ بادشاہ سلامت کی آدھی تقریر صاف سنائی دی۔ دوسروں کی تقریریں کم سنی گئیں۔ مگر تالیوں کی آواز خوب آئی۔

جو قوم ایسے عجیب آلے بنا سکتی ہے وہ اتنا بڑا اور قیمتی ملک دوسروں کے حوالے کرسکے گی؟

قومی } مجھے خوشی ہے کہ گول میز کانفرنس میں مسلمان ممبر اپنی قوم کے حقوق کے لئے خوب متحد اور سینہ سپر ہوکر کام کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے مصلحت اتحاد کے لئے مسٹر محمد علی کو بھی باوجود اس کے کہ وہ ان کو بیکار اور ناقابل محض سمجھتے ہیں اپنا شریک حال کرلیا ہے تاکہ مسلمان متحد نظر آئیں۔

تلقین حیات } جو قوم اپنی اندرونی کمزوری کو طاقتور قوموں کے سامنے باہر لانے سے بچا سکتی ہے وہ اپنی اندرونی کمزوری کو دور بھی کرسکے گی۔

پرنس بدرالدین نظامی } شیخ محمد جہانگیر میاں صاحب فرمانروا ریاست مانگرول کاٹھیاواڑ کے چھوٹے فرزند ہیں۔ تیس کے قریب عمر ہے۔ ماشاء اللہ پانچ بچوں کے باپ ہیں۔ امیر شیر علی خاں سابق حکمران کابل کے خاندان میں شادی ہوئی ہے چھوٹا قد ہے۔ گورا رنگ ہے۔ بھولا چہرہ اور سادہ مزاج ہے۔ علی گڈھ سے بی۔ اے پاس کرکے آئے ہیں۔ آواز بہت اچھی ہے۔ موسیقی کے بڑے ماہر ہیں ہر قسم کے باجے اور ہر قسم کے گانے جانتے ہیں۔ بچپن سے نماز روزہ کے پورے پابند اور صالح نوجوان ہیں۔ امیری اور شہزادگی کا کوئی عیب نہیں ہے۔ سالہا سال سے میرے مرید ہیں۔ اگر قیامت کے دن مجھ سے پوچھا جائے کہ اپنے کسی ایسے مرید کو لاؤ جو عبد مومن ہو تو میں محمد بدر کو پیش کردوں گا۔ کہا جائے گا لو عجیب تماشا ہے کہ مرید پیر کی شفاعت کرتا ہے۔ کہدیا جائے گا کہ من تو شدم تو من شدی کے کوچہ میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

ذاتی } ساڑھے چھ بجے صبح تک کام پورا کردیا۔ پھر دہلی گیا۔ جان محمد نظامی ساتھ تھے واحدی صاحب بھی ساتھ تھے علی بھی ساتھ تھا۔ ساڑھے سات بجے ریل آئی تو خان بہادر ابراہیم حسن نظامی اپنے رفیقوں اور اہل وعیال سمیت آئے۔ ان کو لے کر گھر میں آیا۔ ناشتہ کر کے قطب صاحب کی زیارت کے لئے گیا۔ پرنس محمد بدرالدین نظامی بھی ساتھ رہے۔ ایک بجے واپس آکر

کھانا کھایا۔ پھر سب کو لے کر دہلی گیا۔ حکیم نابینا صاحب سے ملا۔ بازار سے کچھ خریدا۔ رات کو واپس آیا۔ خان بہادر اور محمد صدیق نظامی اور بابو معراج دین صاحب واحدی منزل میں ٹھہرے ہیں اور ان کے ساتھی ایمان خانہ اور زبید منزل میں ہیں۔

قاضی خورشید علی کلکتہ چلے گئے انھوں نے حبیب منزل میں خواجہ گرل اسکول کو بھی دیکھا۔

مسٹر چاؤلہ ہوائی جہاز والے ملنے آتے تھے۔ چکوال کے تاجران جفت بھی آئے تھے جو آگرہ میں تجارت کرتے ہیں۔ نواب میر خورشید علی حیدرآبادی آج قطب صاحب چلے گئے۔

دس بجے سویا تین بجے بیدار ہوا۔ سردی خوب ہے۔ پارہ ۶۱ درجہ پر ہے۔

۲۲ / جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۱۴ / نومبر ۱۹۳۰ء
جمعہ ۔ دہلی

سیاسی } گول میز کانفرنس اور اس کی تقریریں دماغوں اور ذہنوں کو دریائے فکر میں غوطے دے رہی ہیں اور ہم سب غوطے کھا رہے ہیں۔

قومی } مسٹر محمد علی کی بیگم صاحبہ نے لندن میں پردہ اٹھا دیا۔ اس کی نسبت بہت سے خطوط میرے پاس آئے ہیں لیکن میں مسٹر محمد علی کی ذاتیات کے خلاف کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ مسلمانوں کو امان اللہ خاں کے بعد اب ایک دوسرے مسلمان کو پردہ کی بحث سے نقصان پہنچانا مناسب نہیں ہے۔ میں نے جو خط مسٹر محمد علی کے نام شائع کیا تھا اس کا مقصد مسلمان قوم کو نقصان سے بچانا تھا اور اب بھی یہی مقصد ہے کہ مسٹر محمد علی کو بھی نقصان سے بچایا جائے۔ اور ان کی بیوی کے پردہ کی بحث کو زیادہ نہ بڑھایا جائے کہ افغانستان کا تجربہ ہم سب کے سامنے موجود ہے۔

تلقین حیات } مسلمان فضول خرچ ہوتے ہیں لیکن پانی کا استعمال ٹونٹی دار لوٹے سے کرتے ہیں۔ جو کفایت شعاری کا ظرف ہے۔ مگر ہندو کنجوس ہوتے ہیں اور پانی ایسے برتنوں سے خرچ کرتے ہیں جس میں اسراف زیادہ ہو۔ یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔

حکیم ماہر صاحب } حکیم محمود علی خاں ماہر اکبرآباد کے رہنے والے ہیں خاندانی حکیم ہیں۔ گورا رنگ ہے مضبوط جسم ہے۔ چالیس کے قریب عمر ہے۔ عرصہ دراز سے دہلی میں مطب کرتے ہیں۔ میرا ان کا بیس سال کا تعلق ہے۔ میرے ہمراہ بنگال تک سفر بھی کر چکے ہیں۔ بہت سی طبی کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کا مطب بھی بہت مشہور ہے اور کامیاب ہے۔

ذاتی } سات بجے بورڈنگ میں کام ختم کرکے حسین خانہ میں گیا۔ خان بہادر اور ان کے بچے سب بیدار اور دہلی جانے کے لئے تیار تھے۔ حکیم نابینا صاحب کو نبض دکھائی تھی۔ آٹھ بجے مہمان آنے شروع ہوئے جن کو چاء نوشی کی دعوت دی گئی تھی۔ سردار دیوان سنگھ صاحب اڈیٹر ریاست رام ریچپال صاحب شیدا بنفاتی صاحب اڈیٹر پیشوا اور جمالی صاحب اور علی احمد صاحب ایگزیکٹو انجینیر نئی دہلی اور پرنس محمد بدرالدین نظامی اور یوروپین منیجر صاحب نیشنل بینک اور چودھری نعمت اللہ خاں صاحب جج اور چودھری عبدالحمید صاحب جج اور ملک محمد اسلم صاحب افسر انکم ٹیکس اور مولانا محمد جعفری صاحب اڈیٹر ملت اور رائے بہادر لالہ نانک چند صاحب مجسٹریٹ اور خان بہادر شیخ عزیز الدین صاحب مجسٹریٹ اور شیخ شجاع الرحمان صاحب مالک فرم کے بی سعید اور خاں صاحب غلام محی الدین صاحب میر منشی وائسرائے اور بھیا شیخ احسان الحق صاحب فقیر عشقی اور محمد انوار صاحب ہاشمی اور مفتی شوکت صاحب فہمی اڈیٹر دین دنیا اور پروفیسر شمشاد علی صاحب ایم۔ اے اور ملا واحدی صاحب

یڈیٹر نظام المشائخ اور غزالی خاں صاحب وغیرہ احباب
مع ہوئے۔ ناشتہ اور چاء نوشی کے ساتھ ہی پرنس
بدرالدین نظامی کی نعت خوانی کا لطف بھی رہا۔ ساڑھے
و بجے سب لوگ واپس چلے گئے اور خان بہادر صاحب
قلعہ دیکھنے دہلی گئے۔ غزالی خاں صاحب نے ان کی
رفاقت کی۔ میں نے بورڈنگ میں آکر کام کیا۔ جمعہ کی
ماز درگاہ شریف میں پڑھی۔ نماز کے بعد کھانا کھا کر
خان بہادر صاحب اپنے سب رفیقوں کے ساتھ
ریل پر گئے۔ میں بھی پہنچانے گیا۔ ساڑھے چار بجے یہ
قافلہ کلکتہ کی طرف روانہ ہوا۔ غزالی خاں نے پھولوں
کے ہار پہنائے۔

اسٹیشن پر غلام زکریا خان صاحب اکاؤنٹ آفیسر
ریلوے بورڈ سے ملاقات ہوئی جو میرے قدیمی ملنے
والے ہیں۔ کچھ علیل تھے ناتواں ہو گئے ہیں اس لئے مجھے
پہچاننے میں دقت ہوئی۔ وہ مجھے اور حکیم عبدالحیٔ صاحب
انصاری اور مولانا عبداللہ صاحب سیفی اور غزالی خاں
وغیرہ احباب کو اپنے سیلون میں لے گئے۔ سرکاری کام
کے لئے کلکتہ جا رہے ہیں۔ کچھ دیر باتیں کرکے واپس
آیا۔ واحدی صاحب کے ہاں دفتر کا کام دیکھا اور
مغرب کے وقت گھر میں آگیا۔ سید معزالدین دہلی سے
آئے ہیں۔ بعد مغرب مسٹر چاؤلہ ملنے آئے جن کی ہوائی جہاز
چلانے میں بہت شہرت ہے۔ انھوں نے واحدی منزل
کے اوپر ہوائی جہاز بنا ہوا دیکھا۔ جو بہت عرصہ ہوا
میں نے لوہے اور لکڑی سے بنوا کر لگایا ہے میں نے کہا
میں اس صنعت کو بہت ضروری سمجھتا ہوں اور اپنے
بچوں پر اثر ڈالنے کے لئے یہ جہاز یہاں لگایا ہے انھوں
نے اس خیال کو بہت پسند کیا۔ میرا چھوٹا لڑکا زید
بھی ان سے ملا اور اس نے ہوائی جہاز بنانے کی نسبت
نہایت دلچسپ باتیں مسٹر چاؤلہ سے کیں مسٹر چاؤلہ
کا نام رام ناتھ ہے۔ پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ افریقہ
اور عرب بھی دیکھ چکے ہیں۔

آج توکلی شاہ نظامی بھی خان بہادر کے ساتھ
برما چلے گئے۔ وہ زید کے لئے روتے تھے اور زید ان
کے لئے روتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ میں ان کے ساتھ برما
جاؤں گا۔

مجھ پر انفلوئنزا نے حملہ کیا ہے۔ گلے میں بہت
زیادہ خراش ہے۔ رات بھر بےچین رہا ڈیڑھ بجے آنکھ کھل
گئی اور صبح تک نیند نہ آئی۔ حسن الدین نظامی کو بھی بخار
ہے۔ ملیریا اور انفلوئنزا دونوں کی بغاوت ابھی ختم نہیں
ہوئی ہے۔ پارہ آج بھی صبح ۶۱ درجہ پر تھا۔

۲۳ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۱۵ نومبر ۱۹۳۰ء
شنبہ ۔ دہلی

سیاسی گورنمنٹ ہند کی وہ سفارشات شائع ہوگئیں
جو اس نے گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں
وزیر اعظم انگلستان کو بھیجی ہیں۔ اس تحریر میں وائسرائے
اور ان کی کونسل نے نہایت سچائی اور صفائی کے ساتھ تسلیم
کر لیا ہے کہ ساری ہندو قوم آزادی کے مطالبہ میں متحد
ہو گئی ہے اور جو چند افراد بظاہر اس تحریک سے علیحدہ
ہیں وہ بھی اپنے دلوں میں اس تحریک سے ہمدردی رکھتے
ہیں۔ دیکھئے مسٹر محمد علی اور ان کے ہم خیال جنھوں نے
یہ دعوے کیا تھا کہ مسلمان قوم کو ہم نے اس تحریک
میں شریک ہونے سے بچا لیا اور مسلمان اس میں شریک
نہیں ہوئے اس رپورٹ کو پڑھ کر کیا کہتے ہیں کیونکہ
اس میں صفائی کے ساتھ یہ ذکر کہیں نہیں ہے کہ مسلمان
تحریک سول نافرمانی میں شریک نہیں ہیں۔ میں نے اس
رپورٹ کا ترجمہ مسٹر محمد علی کے ہم عقیدہ اخبار ریاست
میں پڑھا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ ترجمہ میں کوئی غلطی
نہیں ہوگی۔ میں نے اس رپورٹ میں یہ فقرہ بھی پڑھا جو
وائسرائے نے لکھا ہے کہ "بعض سیاسی گروہ ایسے بھی
ہیں جو موجودہ اصلاحات کی تنسیخ یا ان میں تخفیف کے
حامی ہیں لیکن گورنمنٹ نے اس خیال کو ناقابل قبول

سمجھ کر ٹھکرا دیا ہے۔"

در حقیقت برٹش گورنمنٹ خود بھی آزاد ہے اور دوسروں کی خواہش آزادی کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور جو لوگ آزادی کے خلاف چلنا چاہتے ہیں وہ گورنمنٹ کی نظر میں کسی عزت کے مستحق نہیں رہتے۔

قومی } اجمیر شریف کا عرس ۲۱، نومبر سے شروع ہوگا اور چھ دن رہے گا۔ ریلوے نے رعائتی ٹکٹ دینے کا اعلان کیا ہے۔

تلقین حیات } جو شخص اپنے مستقبل کی نسبت صحیح رائے قائم کر کے زندگی بسر نہیں کرتا۔ در حقیقت اس میں قوت فیصلہ بہت کم ہے اور اس کو زندگی کی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی زندہ قومیں فیصلہ کی قوت رکھتی ہیں اور جب وہ مرجاتی ہیں یا مرنے کے قریب ہوتی ہیں تو پہلے ان کی قوت فیصلہ کمزور ہو جاتی ہے۔

عباس حسین صاحب قاری } میانہ قد ہے۔ دوہرا جسم ہے۔ سانولہ رنگ ہے۔ گول چہرہ ہے۔ بلند آواز۔ عمر تیس اور چالیس کے درمیان۔ قاری سرفراز حسین صاحب سیاح جاپان و انگلستان کے بڑے صاحبزادہ ہیں۔ ہندوستان کے بہت سے روزانہ اور ہفتہ وار اخباروں کی ایڈیٹری کر چکے ہیں۔ اپنے اخبار اور رسالے بھی جاری کئے ہیں۔ ان کا اخبار قوم بہت شہرت حاصل کر چکا ہے آج کل میرا رسالہ تبلیغ نسواں لے لیا ہے اور اس کو نہایت عمدگی سے چلا رہے ہیں۔ تحریر بھی اچھی ہے اور تقریر بھی خوب کرتے ہیں۔ آزاد خیال نوجوان ہیں۔ سالہا سال سے کھدر پہنتے ہیں۔ میرا ان کا بہت پرانا تعلق ہے۔ اگر کسی کو یہ ضرورت ہو کہ جنات کا خط دیکھے تو وہ قاری صاحب کی تحریر کو دیکھ لے ان کا خط ہو بہو جناتی ہوتا ہے اور انسان بہت ہی مشکل سے اس کو پڑھ سکتے ہیں۔

ذاتی } انفلوئنزا کی تکلیف زیادہ ہے۔ رات کی بے چینی یاد آرہی ہے۔ حلق میں خراش ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کانگریسی لوگ میرے حلق میں گھس گئے ہیں اور وہاں جا کر ٹوڈی بچہ ہائے ہائے پکار رہے ہیں۔ سارا نرخرہ دکھتا ہے سینہ میں بھی تکلیف ہے تکیہ سے لگا ہوا لیٹا ہوں اور تحریری کام ہو رہا ہے صبح سے تین بجے تک جتنا ضروری کام تھا وہ سب ختم کرا دیا۔ تندرستی کے زمانہ میں اتنا کام نہیں ہو سکتا بیماری اس لحاظ سے ایک نعمت ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کو مجھ پر رحم آنے لگتا ہے۔ جو تندرستی کے زمانہ میں مجھ پر رحم کرنا نہیں چاہتے۔ ڈاکٹر محمد عمر صاحب اور واحدی صاحب ٹیلیفون میں آرام کرنے کی ہدایتیں اس طرح بھیج رہے ہیں جس طرح کانگریس کے ڈکٹیٹر اپنے کام کرنے والوں کو بھیجتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں ان پر عمل کر رہا ہوں۔ باہر نہیں نکلا۔ ہوا میں نہیں گیا۔ البتہ لکھوا رہا ہوں اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو پرہیز کے خلاف ہو۔ چار بجے حسین اور حسن الدین نظامی کو لے کر دہلی گیا۔ ڈاکٹر محمد عمر صاحب نے سب کا معائنہ کیا اور تول کر وزن بھی دیکھا۔ مغرب کے بعد واحدی صاحب کے ہاں گیا۔ ہفتہ کی دعوت میں شریک نہ ہو سکا پر نس محمد بدر الدین نظامی اور واحدی صاحب کو کھاتے ہوئے دیکھا۔ انھوں نے کھایا گویا میں نے کھایا۔ کہ ہم سب باطن میں ایک ہیں ظاہر میں صورتیں علیحدہ ہیں۔ بدر صاحب کے ہمراہ واپس آیا۔ رات کو حسین خانہ میں سویا تاکہ تیمارداری ہو سکے۔ پارہ آج بھی ۶۱ ہے۔ رات کو مرض میں کمی رہی۔

۲۴، جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۱۶، نومبر ۱۹۳۰ء
یوم یکشنبہ۔ دہلی

سیاسی } وائسرائے ہند نے جو یادداشت گول میز کانفرنس میں بھیجی ہے اس سے وائسرائے کی نیک نیتی ہر جگہ ظاہر ہوتی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ وائسرائے ہندوستان کی ترقی کے دل سے خواہش مند ہیں

قومی } عربک کالج دہلی میں آج کل انگریز پرنسپل مسٹر ہوکر کے خلاف طلباء کی شورش ہو رہی ہے مسلمانوں کی بد قسمتی ہے کہ وہ اپنے ایک کالج کو بھی اطمینان کی حالت

ہیں نہیں دیکھ سکتے۔ میرے خیال میں مسٹر واکر بہت اچھے آدمی ہیں۔

تلقین حیات } شلجم دماغی کام کرنے والوں کے لئے بہت مفید سبزی ہے اس کو اُبال کر نمک کے ساتھ کھانا یا گوشت میں ڈال کر کھانا یا پانی میں اچار ڈال کر کھانا دل اور دماغ کے لئے مقوی اور آنتوں کی خشکی دور کرنے کے لئے مفید ہے۔

ملنسار نظامی } میرے رہنما خاکسار صاحب مرحوم کے صاحبزادہ ہیں۔ لمبا قد ہے۔ سانولا رنگ گول چہرہ۔ موثر آنکھیں آواز بلند اور گرجدار۔ محمد دین نام ہے عمر چالیس کے قریب ہے۔ انگریزی پڑھے ہوتے ہیں۔ سب اور سیری جانتے ہیں۔ دہلی میونسپل کمیٹی میں نوکر ہیں باپ کی بہت سی صفات اپنے اندر رکھتے ہیں کنبہ پروری دو صدی پہلے کے مسلمانوں کی طرح کرتے ہیں اپنے والد کے سب ملنے والوں سے اسی طرح ملتے ہیں جس طرح سعادت مند اولاد کو ملنا چاہئے۔ خدا نے اولاد دی ہے اور اولاد کے فرائض کا احساس بھی دیا ہے۔ میں ان کو اپنے حقیقی بھائی کی طرح سمجھتا ہوں۔ ملنسار ہیں اپنے افسروں اور بزرگوں کی اطاعت کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ ملنسار کا خطاب میں نے دیا تھا اور یہ خطاب ان کی سیرت کا مکمل فوٹو ہے۔ میرے ساتھ ان کو اتنا خلوص ہے کہ ان کے والد کا پورا نقشہ ان کے عمل سے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

ذاتی } انفلوئنزا کی تکلیف بہت زیادہ ہے بالیر کوٹلہ کا سفر ملتوی کر دیا۔ صبح ہز ہائی نس نواب صاحب کا تار آیا تھا کہ آپ کی آمد کے سب انتظامات مکمل ہیں۔ میں نے تار دیدیا کہ آج کی روانگی ملتوی کر دی۔ گلے اور سینہ کی تکلیف زیادہ ہے۔ دس بجے دہلی گیا۔ واحدی صاحب کے ہاں احباب ملنے آتے۔ بمبئی کے مشہور گجراتی اخبار ہے گھڑی موج کے ایڈیٹر صادق صاحب بھی ملنے آئے یہ اخبار بارہ ہزار چھپتا تھا اب اشاعت ملتوی ہو گئی ہے۔ صادق صاحب عراق کے رہنے والے ہیں۔ واحدی صاحب کے ہمراہ حکیم ذکی احمد صاحب کے پاس گیا۔ اپنے لئے۔ رابعہ کے لئے اور واحدی صاحب کے لئے دوائیں تجویز کرائیں منیجر صاحب دواخانہ ہندوستانی سے ملا۔ پھر گھر میں واپس آیا۔ ڈاک پڑھی۔ رات کے دس بجے تک لیٹا رہا۔ انگریزی دوا چھوڑ دی۔ دیسی دوا پی۔ آج دہلی میں جواہر ڈے کی وجہ سے ہڑتال تھی۔ گرفتاریاں بھی بہت ہوئیں۔ دس بجے سویا۔ چار بجے بیدار ہوا۔ مرض میں کمی ہو رہی ہے نیند اچھی آئی۔ پارہ صبح ۶۹ درجہ پر تھا۔

۲۵ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۱۷ نومبر ۱۹۳۰ء
یوم دوشنبہ۔ دہلی

سیاسی } آج شام کو دہلی اسٹیشن پر پولیس اور فوجی پولیس کا بہت زیادہ انتظام تھا کئی سو آدمیوں نے ایک پلیٹ فارم کا محاصرہ کر رکھا تھا جس میں انگریز بھی تھے اور دیسی بھی تھے۔ کلکتہ سے ساڑھے پانچ بجے طوفان میل آیا تو ایک گھنٹہ تک گاڑی کے ہر درجہ اور ہر مسافر کو بہت احتیاط سے دیکھا گیا۔ شاید کوئی خفیہ اطلاع آئی ہو گی اور کسی خاص شخص کی تلاش ہو گی۔ احتیاط اور مستعدی سیاست کے دو ضروری ہاتھ ہیں اور یہ دونوں انگریزوں کے پاس موجود ہیں۔

قومی } بابا خلیل داس صاحب کا تار آیا ہے کہ وہ ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ اجمیر شریف جا رہے ہیں۔ دو روز میرے ہاں درگاہ شریف میں بھی ٹھہریں گے وہ سنسکرت کے بہت بڑے عالم ہیں اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔

تلقین حیات } جھوٹ بولنا بظاہر بہت آسان چیز ہے لیکن سچ بولنا اس سے زیادہ آسان ہے کیونکہ سچائی دماغ میں پہلے سے موجود ہوتی ہے اور جھوٹ انسان کو خود بنانا پڑتا ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کی زندگی ہمیشہ ناکام رہتی ہے جن کو جھوٹ بولنے کی عادت پڑگئی ہو۔

مولانا عارف صاحب } ہسوہ ضلع فتحپور کے رہنے والے ہیں سید ہیں۔ بہت دبلے ہیں۔ لمبا قد ہے۔ عربی فارسی کے عالم ہیں۔ دہلی میں پندرہ سال سے رہتے ہیں۔ مجھ سے اور واحدی صاحب سے بہت پرانی محبت ہے۔ مگر میرے ان کے خیالات میں بہت فرق ہے۔ وہ کانگریسی خیالات رکھتے ہیں اور کئی دفعہ قید بھی ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں میں اپنی ذہن اور اپنے خیال کا ایسا پکا آدمی میں نے کوئی نہیں دیکھا وہ نہایت مخلص اور سچے اور ظاہر و باطن میں یکساں آدمی ہیں۔

ذاتی } مرض میں کمی ہے۔ جسم و ذہن میں کہتا ہے کہ اب مجھے اذیت نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں دیکھ کوئی سن نہ لے کہ اظہار علالت سے مجھے طرح طرح کی راحتیں پہنچتی ہیں۔ تین بجے تک خوب کام کرتا رہا۔ پھر دہلی گیا۔ کچھ دیر واحدی صاحب کے ہاں کام کیا۔ مولانا سعید احمد صاحب مارہروی ملنے آئے۔ زنانہ ٹریننگ اسکول جاری کرنے کا انھوں نے مشورہ دیا۔ ساڑھے پانچ بجے اسٹیشن پر گیا۔ حاجی عبدالرحیم عثمان صاحب بچوں کے ساتھ طوفان میل میں آئے ہیں۔ پولیس کے محاصرہ کی وجہ سے ان کو بھی ایک گھنٹہ رکنا پڑا۔ سات بجے ان کو لے کر گھر میں آیا۔ علی محل میں ٹھہرے نو بجے کھانا کھا کر زنانہ مکان میں گیا۔ رات کو ذرا مرض کی تکلیف بڑھ گئی۔ مگر نیند اچھی آئی۔ وحید نظامی کو بھی بخار ہو گیا ہے اور سب اچھے ہیں۔ پارہ صبح ۵۹ درجہ پر تھا۔

۲۶/ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ/ ۱۸/ نومبر ۱۹۳۰ء
یوم سہ شنبہ۔ دہلی

سیاسی } بیت المقدس میں یہودیوں کو آباد کرنے کا فیصلہ بالفور صاحب نے کر دیا تھا۔ اب مزدور پارٹی کے وزیر اعظم نے اس کو منسوخ کر دیا۔ پہلے مسلمان عرب غل مچاتے تھے اب یہودی چیخ رہے ہیں۔ دونوں کا چیخنا فضول ہے یہ تو نئے زمانہ کی حکومت کا ایک طریقہ ہے کہ کبھی یہ پلڑا جھکا دیا کبھی وہ پلڑا جھکا دیا۔

قومی } لکھنؤ میں مسلمانوں کی کانفرنس ہوئی۔ نواب اسمٰعیل خاں صاحب نے بہت اچھا خطبہ پڑھا۔ لندن میں سر آغا خاں گول میز کانفرنس کے سب ممبروں کی صدارت کر رہے ہیں اور ان کے کام کی تعریف بھی شائع ہوئی ہے۔ لکھنؤ میں اسمٰعیل تھے اور لندن میں اسمٰعیلی ہیں کیونکہ سر آغا خاں اسمٰعیلیہ فرقہ کے پیشوا ہیں۔

تلقین حیات } جو شخص پبلک میں نیک نامی اور بدنامی کو سامنے رکھ کر کام کرتا ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ کیونکہ پبلک کا نہ حافظہ درست ہوتا ہے نہ اس کی رائے میں کوئی دوام ہوتا ہے۔ ارادی قوت والے جب چاہتے ہیں پبلک کی رائے اور خیال کو بدل دیتے ہیں۔ یہ بات ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے اور ہمیشہ ہوتی رہے گی۔

خواجہ فضل احمد خاں شیدا } واحدی صاحب کے قرابتدار ہیں۔ انہی کے قریب رہتے ہیں۔ پچاس کے قریب عمر ہے۔ چھریرا بدن اور میانہ قد ہے۔ دہلی کے محاورے خوب جانتے ہیں اور مسلمانوں کی قدیمی تہذیب کی سب چھوٹی بڑی چیزیں ان کو یاد ہیں اور ہمیشہ ان کو محسوس کرتے رہتے ہیں طبیعت میں زندگی اور خوش مزاجی بہت ہے جس مجلس میں بیٹھ جاتے ہیں اس کو خوش کر دیتے ہیں۔ میری ان کی بہت پرانی ملت ہے اور میں نے ان کو ہمیشہ حاضر و غائب مخلص پایا۔ وہ جس سے بھی ملتے ہیں خلوص سے ملتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے۔ جو ہندوستان میں گم ہوتی جاتی ہے۔

ذاتی } ابھی نزلہ کا اثر دماغ پر اور آواز پر اور اعصاب پر باقی ہے۔ صبح روزنامچہ لکھ کر

سیٹھ حاجی عبدالرحیم عثمان صاحب کے ہمراہ درگاہ شریف میں گیا۔ روضہ شریف کے اندر سنگ مرمر کا فرش لگانا ہے۔ دو گھنٹے تک پیمائش وغیرہ ہوتی رہی۔ سید باقر علی صاحب نے بھی امداد دی۔ پھر واپس آ کر کھانا کھایا۔ ساڑھے بارہ بجے تک کام کیا۔ اس کے بعد دہلی گیا۔ روشن آرا باغ میں کراچی والے سیٹھ محمد اسحٰق صاحب سے ملنے گیا جو حاجی زکریا عثمان کے داماد ہیں۔ یہ سب لوگ کرکٹ کھیلنے آئے ہوئے ہیں۔ پھر جامع مسجد میں آ کر ظہر کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد سب کے ساتھ لال قلعہ میں گیا۔ اور شاہی حمام کا فرش دیکھا۔ تاکہ وہاں کے نمونے سے روضہ شریف کے فرش میں کوئی فائدہ اٹھایا جاسکے۔ عصر کے بعد گھر میں واپس آیا مغرب سے پہلے کھانا کھایا۔ وحید نظامی کو آج پھر بخار ہوگیا اور سب اچھے ہیں۔ مسٹری عشقی نظامی کے بھائی اور بال بچے آئے ہیں۔ آج بورڈنگ ہاؤس کا ٹیلیفون دور کر دیا۔ پارہ صبح ۶۱ درجہ پر تھا۔

۲۰ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۱۹ نومبر ۱۹۳۰ء
یوم چہارشنبہ۔ دہلی

سیاسی } جواہر ڈے ہندوستان کے بہت سے شہروں میں منایا گیا اور ہر جگہ پولیس سے تصادم ہوا۔ لندن سے گول میز کانفرنس کی خبریں روزانہ آ رہی ہیں اور بہت دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ مصر کے ایک اخبار نے لکھا ہے آج کل برطانیہ چاروں طرف سے مشکلات میں مبتلا ہے۔ ہندوستان اور عراق اور مصر اور فلسطین سب ہی آزادی مانگ رہے ہیں۔ مصری اخبار نے یہ نہ سمجھا کہ برطانیہ میں اس سے زیادہ غل شور برداشت کرنے کی طاقت ہے اور اس کو ایسی حکمتیں آتی ہیں کہ وہ ان سب شورشوں کو کسی نہ کسی حکمت سے دبا سکتی ہے۔

[قو]می } کشفی شاہ نظامی کا برما سے خط آیا ہے کہ ان کو

اللہ تعالیٰ نے ایک اور بیٹا دیا۔ میں نے محمد امراللہ نام رکھا۔

تلقین حیات } تجارت میں بہت سے فائدے ہیں مگر تجارت سے بے مروتی اور بخیلی وغیرہ بُری عادتیں بھی پیدا ہوتی ہیں سیاست بھی بہت اچھی چیز ہے لیکن اس سے ضد اور بے رحمی بھی پیدا ہوتی ہے۔

میر ابوالحسن صاحب } میرے اور واحدی صاحب کے قرابتدار ہیں ستر برس کی عمر ہے۔ دراز قد۔ گورا رنگ۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ کتابی چہرہ جو میرے مرحوم والد سے بہت مشابہ ہے۔ میرے دفتر میں محاسب ہیں۔ سالہا سال سے اسی کام پر مقرر ہیں بہت دیانت اور توجہ سے کام کرتے ہیں۔ ان کا ابتدائی زمانہ بہت عیش و آرام کا تھا۔

ذاتی } آج انفلوئنزا کی تکلیف زیادہ ہے۔ بخار بھی ہے سر میں درد بھی ہے اعضا شکنی بھی ہے۔ میں نے سات بجے کام شروع کیا اور ساڑھے نو بجے ختم کر دیا مکرانہ والے حاجی نتھو صاحب ٹھیکیدار ملنے آئے۔ حاجی عبدالرحیم صاحب اور کمال الدین صاحب ٹھیکیدار اور نواب خضر صاحب اور حاجی نتھو صاحب ٹھیکیدار اور کوثر وزیدی کے ہمراہ قطب صاحب گیا حضرت مولانا فخر صاحبؒ کے سالانہ عرس میں شریک ہوا۔ یہ عرس مہاران شریف کے پیرزادہ غلام حسن صاحب کرتے ہیں۔ پیر جی خواجہ عبدالصمد صاحب مولانا فخر صاحب کے نواسہ اور جانشین ہیں۔ اصل اہتمام ان کا ہوتا ہے۔ تونسہ شریف کے سجادہ نشین خواجہ حامد صاحب بھی آئے ہیں۔ ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ بال بھی سفید ہوگئے ہیں۔ یہ مجھ سے عمر میں کچھ ہی زیادہ ہیں۔ جب میں نو برس کی عمر میں تونسہ شریف گیا تھا تو ان کی عمر بارہ تیرہ سال کی تھی اور ان کو قوالی میں وجد کو دیکھ کر بہت ہنسی آتی تھی۔ واپسی میں درگاہ حضرت بی بی نور صاحبؒ میں بھی ٹھہرا۔ پھر بورڈنگ ہاؤس میں آ کر کام کیا بعد مغرب حاجی عبدالرحیم عثمان صاحب اجمیر شریف چلے گئے پرنس بدرالدین نظامی بھی آج بہت دیر تک میرے ساتھ رہے۔ مجھے رات کو بھی تکلیف زیادہ رہی۔ آدھی رات کو سورت سے تار آیا۔ دیسی دوا پی رہا ہوں۔ سردی کچھ کم ہوگئی ہے۔ پارہ صبح ۶۲ درجہ پر تھا۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کا سفرنامہ افریقہ و ماریشس

نویں قسط (مسلسل)

کالے کوس، کڑے کوس

گردشِ ایّام! شاعر نے کہا تھا ؎

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!

لیکن نئے زمانے کے تیز رفتار ہوائی سفر میں ماضی حال اور مستقبل سب آپس میں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔ اور ہمارے زمینی اندازے آسمانوں میں جا کر بالکل بدل جاتے ہیں۔ ایک شعر حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ اور معین ہروی سے بیک وقت منسوب کیا جاتا ہے کہ

تا معین ذرّہ صفت رفت پے نور ازل
نہ طلوع و نہ غروب و نہ زوالے دیدم

جب معین نے ذرّے کی طرح نور ازل تک پہنچنا چاہا تو اسے نہ (سورج کا) طلوع نظر آیا۔ نہ غروب نہ زوال، یعنی جو کیفیت وہاں تھی وہ طلوع غروب اور زوال کی ان تینوں کیفیتوں سے مختلف کیفیت تھی۔

ظاہر ہے یہ بات ہوائی سفر سے کہیں زیادہ اونچی اور کہیں زیادہ تیز رفتار ہے۔ لیکن نئی زمانہ ناقابل فہم نہیں رہی ہے۔ جن لوگوں نے چاند سورج کو پوجا یا چاند سورج کی اولاد ہونے کا دعویٰ کیا وہ اس لحاظ سے معذور ہی سمجھے جائیں گے کہ دھرتی کے باسی تھے۔ دھرتی سے آگے کچھ نہ دیکھ سکے۔ لیکن جنھوں نے ہوائی جہاز اور راکٹ کی ایجاد سے پہلے عروج حاصل کر لیا وہ ساری حد بندیوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے اور زمان و مکان TIME AND SPACE سب ان کے لئے ہیچ ہو کر رہ گئے اسی لئے وہ ازل سے بھی پہلے سے ہیں اور ابد کے بعد تک رہیں گے۔ اور انھیں سب جگہ اور ہمیشہ پایا جائے گا کاش کہ مذہبی بحثیں کرنے والے اس سائنسی حقیقت پر بھی غور فرمائیں اور غیب و شہود کے لفظی چکر سے نکل جائیں۔

میں ظہر کے اوّل وقت ڈربن سے ماریشس کے لئے اُڑا تھا۔ تین گھنٹے بیس منٹ کی فلائٹ تھی ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ دن کے دن یا بہت سے بہت مغرب تک پورٹ لوئیس ماریشس پہنچ جاتا لیکن میرے لئے گردش ایام واقعی پیچھے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ کوئی یقین کرے یا نہ کرے لیکن حقیقت (بشرطیکہ اسے حقیقت کہا جائے!) یہ تھی کہ ڈربن میں جو "حال" تھا۔ میں اسی وقت ڈربن کے مستقبل یعنی آنے والی رات میں پہنچ چکا تھا۔ کیسا عجیب تماشا تھا کہ پیچھے کی دوڑ نے آگے یعنی مستقبل میں پہنچا دیا! گویا وہ کیفیت جسے "دقیانوسی" لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ بے معنی ہو کر رہ گئی! ترقی معکوس اصلی ترقی بن گئی!

جہاز وہی انڈو ماریشین تھا۔ یعنی بچوں کی زبان میں "یعن مین" "ہندوستانی"! انگریزی حکومت کے پرانے زمانے میں ریلوے اسٹیشنوں پر ہندو پانی اور مسلمان پانی کی آواز لگا کرتی تھی۔ جہاز میں ویجی ٹیرین اور نان ویجی کھانے کے مہذب متبادل الفاظ بھی استعمال نہیں کئے گئے صاف صاف ہندو کھانے او

مسلم کھانے کا اعلان ہوا۔ گندگی ڈھکے کی چوٹ بے جھجک پھیلائی گئی۔ ہوسٹس صاحبہ کی نوازشات اس طرح ہوئیں کہ کھانا تقسیم کم فرمایا گرایا زیادہ۔ زمانہ جاہلیت کے عربوں کا قصہ تو سنا تھا کہ شراب پینے بیٹھتے تو پہلے تھوڑی سی شراب زمین پر گرادیتے اور شعر پڑھتے کہ ہم ایسے فیاض اور سخی ہیں کہ زمین بھی ہم سے محروم نہیں رہتی لیکن مہمان نوازی میں مہمانوں پر کھانا گرایا جائے یہ نئے زمانے ہی کی ادا تھی۔ تاہم اس ادا کے قدردان وہی لوگ ہو سکتے تھے جو جسمانی ذہنی ہر لحاظ سے فاقہ زدہ ہوں یا جنھیں اپنے پیٹ کے ساتھ کپڑوں کے لئے بھی کھانا درکار ہو! میں دیکھ رہا تھا کہ گورے مسافروں کو یہ بے تمیزی سخت ناگوار گزر رہی تھی لیکن درویش کا قہر درویش ہی کی جان برداشت نہیں کرتی ہر شریف آدمی کی شرافت بھی برداشت کرتی ہے۔ سو شریفوں نے اسے برداشت کیا۔ البتہ کچھ نوجوان اس سے محظوظ ہوتے بھی پائے گئے اور شاید اسی کی امید پر ہوسٹس صاحبہ نے بے تمیزی کی جرأت بھی کی تھی!

پورٹ لوئی میں ماریشس میں کئی روز قیام کرآیا مگر اس کے دارالحکومت کا صحیح تلفظ معلوم نہ ہوسکا کہ پورٹ لوئی ہے یا پورٹ لوئیس بہرحال تلفظ کچھ بھی ہو کلائمکس کے بعد کس ڈرامے کا سین بھی کیا بدلتا ہوگا جو ایر انڈیا کے جہاز کے بعد لوئی یا لوئیس صاحب کی پورٹ کے ایرپورٹ کا منظر بدلا۔ یوں لگا کہ جیسے واقعی کسی نئی اور دوسری دنیا میں آگئے۔ امیگریشن کا عملہ نہایت مستعد اور مہذب! ایک الگ افسر خاص اس کام پر مقرر کہ جس کاؤنٹر پر لوگ زیادہ ہوں انھیں کم بھیڑ والے کاونٹر پر لے جائے اندراج کرنے والوں سے بار بار پھرتی دکھانے کا تقاضا کرے۔ نیز کسی مسافر کو کوئی خاص مسئلہ درپیش ہو تو اسے حل کرنے میں مدد دے۔ کسٹم بھی بہت سرسری ہوا۔ پریشان کرنیوالا طرز عمل سرے سے تھا ہی نہیں بس ضروری چیکنگ تھی اور وہ بہت سلیقے اور تہذیب سے ہوئی۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھلا کون ٹورسٹ ہوگا جو دوبارہ ماریشس آنا نہ چاہے۔

ایرپورٹ پر مجھے لینے غلام شرف الدین صاحب میاں غلام عبدالقادر۔ ہاشم بھائی اور حبیب بھائی آ ہی نہیں آئے تھے۔ باہر موٹر میں محترمہ زہرہ آپا بھی بنفس نفیس تشریف فرما تھیں۔ وہ ہندوستانی ہیں اور کلکتے میں رہتی ہیں آجکل عزیزوں کے پاس ماریشس آئی ہوئی ہیں۔ ان کے والد ماجد سیٹھ ذکریا صاحب ہمارے ہاں خواجہ ہال میں حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے قریب ہمیشہ کی نیند سو رہے ہیں۔ اس گھرانے کا تعلق ہم لوگوں سے ایسا ہے کہ شاید سگے رشتے داروں میں بھی ایسا تعلق کم ہو۔ ویسے ان سے ایک سگا رشتہ بھی ہے کہ میری ایک بھتیجی یعنی خواجہ سید رمان نظامی ابن خواجہ سید حسین نظامیؒ کی دلہن عزیزہ عزالہ سلمہا، زہرہ آپا ہی کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔

ماریشس میں بھی بارش ہو رہی تھی اور خوب سردی تھی۔ پورٹ لوئیس یہاں کا دارالحکومت بھی ہے بندرگاہ بھی اور ہوائی مستقر بھی۔ میرے میزبان شہر سے باہر کافی دور "موکا" نامی پہاڑ پر رہتے ہیں سڑکیں بہت اچھی، صاف ستھری اور ٹریفک کی بھیڑ بھاڑ سے محفوظ تھیں۔ پھر بھی گھر پہنچنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگا۔ گھر پر احمد بھائی مرحوم کی اہلیہ آمنہ بھابی اور عزیزہ کشور سلمہا میاں عبدالقادر کی دلہن اور ان کے پیارے پیارے بچے میرے منتظر تھے۔ ان سب کو عرصہ دراز کے بعد دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ کشور سلمہا نہایت خاموش سنجیدہ مگر بڑی چاہنے والی بھانجی ہیں۔

شکرستان ماریشس کا نام اگر کوئی مجھ سے رکھواتا تو میں شکرستان نام تجویز کرتا کیونکہ اس چھوٹے سے اور نہایت خوبصورت جزیرے میں سب سے زیادہ گنے کی کاشت ہوتی ہے۔

چکھا تو نہیں لیکن اندازہ کہ یہاں کے گنے رسیلے بھی بہت ہوتے ہوں گے کیونکہ آب و ہوا مرطوب ہے۔ سمندر بھی یہاں کے گنوں کا اتنا احترام کرتا ہے کہ بادلوں میں پانی بھر کر بھیجتا ہے تو نمک نکال کر اپنے پاس ہی رکھ لیتا ہے۔ ایئرپورٹ سے قیام گاہ تک ہیڈ لائٹس میں دونوں جانب بس گنے ہی کے کھیت نظر آتے رہے۔

کاش کہ میرا زمانہ بال پین اور فاؤنٹین پین کا زمانہ نہ ہوتا۔ نرکل اور واسطی قلم کا زمانہ ہوتا اور میں کسی نازک سے گنے کو تراش کر قلم تیار کرتا اور اس سے یہاں کا حال لکھتا تاکہ تحریر میں وہ ساری مٹھاس آجاتی جو محبت کرنے والے مہمان نوازوں کی خاطر تواضع میں محسوس ہوتی تھی۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی روزمرہ کی گفتگو نوٹ کرنے والے یعنی خاص الخاص ملفوظ نگار حضرت خواجہ حسن علاء سجزیؒ تو فرما ہی چکے ہیں کہ جب (محبوب) کے ہونٹوں کی شیرینی (میٹھی باتوں) کے اوصاف لکھے جاتے ہیں تو قلم لکھنے والے کے ہاتھ میں گنا بن جاتا ہے۔

چو اوصاف لب او می نوشتند
قلم در دست کاتب نیشکر شد

بزرگوں کے ہاں کھانے کا ذکر اکثر و بیشتر کھانا کھلانے یعنی لنگر اور کسی کا پیٹ بھرنے کے سلسلے میں آتا ہے۔ خود بزرگوں کی اپنی پسند اور اپنے کھانے کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ اس لحاظ سے کھانے کی چیزوں میں دو چیزیں بڑی خوش نصیب ہیں کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی بارگاہ سے انھیں پسندیدگی کی سند ملی۔ ایک خربوزہ دوسرے گنا۔ یہ دونوں چیزیں بھی حضرت کو اور ان کے پیر بھائی اور مربی اور پیر و مرشد کے داماد حضرت خواجہ بدرالدین اسحٰقؒ کو اس وجہ سے پسند رہیں کہ ان دونوں کو پیر و مرشد حضرت بابا فریدؒ سے نسبت تھی۔ بیماری کی حالت میں حضرت بابا صاحبؒ کے خربوزہ نوش فرمانے کا ذکر آتا ہے۔ اس پرہیزی غذا میں سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کو بھی ایک قاش اور پھانک مرحمت ہوئی تھی اور اس عطیے سے حضرتؒ ایسے خوش ہوئے تھے کہ روزے کے باوجود اسے کھانے کا ارادہ فرمالیا تھا کہ روزے کی قضا میں ساٹھ روزے مسلسل رکھ لوں گا مگر پیر کی دی ہوئی نعمت بھلا پھر کب میسر آئے گی۔ مگر بابا صاحبؒ نے انھیں روزہ توڑنے سے روک دیا تھا اور کہا تھا کہ مجھے تو بیماری کا شرعی عذر ہے۔ تم روزہ کیوں توڑتے ہو اسے رکھ لو۔ افطار اس سے کر لینا۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ اور حضرت بدر اسحٰقؒ دونوں دوستوں اور روحانی بھائیوں کو خربوزہ سدا بھایا کیا۔ گنا بھی اس لئے پسند رہا کہ پیر شکر بار تھے شکر گنج تھے۔ تاریخ میں ذکر آتا ہے کہ حضرت کی اس پسند سے واقف ہو کر مرید اور عقیدتمند گنے کا موسم نہ بھی ہوتا تو دور دراز سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تحفے میں گنے لاتے اور حضرت کے ہاں گنوں کو حاضری کی سعادت ملتی رہتی!

ڈربن والے حضرت بادشاہ پیر بھی ہندوستان سے افریقہ کے پردیس گنے کے کھیتوں میں کام کرنے گئے تھے۔ اگر صوفی بزرگوں کی ذات اور صفات اور مشن کے پورے مفہوم اور کیفیت کو بیان کرنے کے لئے صرف دو لفظ ڈھونڈنے کو کہا جائے تو اردو اور ہندی کے خزانے سے دو لفظ "رس" اور "مٹھاس" یعنی شیرینی سب سے پہلے بڑھ کر سامنے آئیں گے! گنا ان دونوں دولتوں سے مالا مال ہی نہیں ہے۔ دونوں کو ہمیشہ چھاتی سے لگائے اور امانت بنائے رکھتا ہے۔ اور پھر جس طرح صوفی بزرگ زندگی کے دکھ سہتے ہیں اور سب کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ گنا بھی کولہو میں پیلا جاتا ہے۔ اور اپنے رس سے ہر بے کیفی اور تلخی کو میٹھا کرنے کے بعد خود سوکھے ریشے اور مٹھی بھر راکھ بن کر جہاں تہاں اڑتا پھرتا ہے!

شکر فروش میزبان! میرے میزبان طرح طرح کے

سامان کی تجارت کرتے ہیں۔ مگر بنیادی طور پر شکر فروش ہیں۔ اور شکر کے تاجر ہیں۔ ہندوستان میں بھی مظفر پور بہار میں ان کا ایک بہت بڑا شوگر مل اور گنے کے کھیتوں کی عظیم الشان زمینداری ہے۔ لیکن فی الحال اس پر قومی ملکیت کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہے۔ اور یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ جو چیز ہماری بھاگوان قوم کے نام ہو جائے وہ میٹھی بھی ہو تو کڑوی ہو جاتی ہے۔

سنا ہے کہ ان لوگوں کے بزرگوں اور بڑے بوڑھوں کو کسی درویش نے سفید چیز کا کاروبار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے سوچا کہ چاول اور شکر سفید ہوتے ہیں۔ ان کا دھندا کرو۔ اللہ تعالے نے ان کے اس کاروبار میں واقعی بڑی برکت عطا فرمائی اور اس ریل پیل کے زمانے میں جو شکر بکھیری گئی اس نے چھوٹی چھوٹی درگاہوں سے لے کر بڑی بڑی بارگاہوں حد ہے کہ اجمیر شریف کے لنگر تک کو میٹھا کیا۔

موکا } بہن زہرہ عثمان صاحبہ کی بڑی صاحبزادی کشور سلطان کے بھتیجے میاں غلام عبدالقادر احمد سے منسوب ہیں اور میاں غلام عبدالقادر احمد کی والدہ ماجدہ آمنہ احمد صاحبہ زہرہ بہن کی صرف بھاوج اور سمدھن ہی نہیں ہیں۔ چچا زاد بہن بھی ہیں۔ اس خاندان میں یہ رواج بہت قدیم زمانے سے ہے کہ شادیاں آپس ہی میں کرتے ہیں۔ ہاشم میاں اور حبیب میاں صاحب اور دوسرے سب لوگ درجنوں رشتوں سے ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ آج ان سب نے میاں عبدالقادر کے مکان پر پر تکلف کھانا کھایا۔ اور اس پرسکون اور خاموش پہاڑی بنگلے میں خوب چہل پہل ہو گئی۔

ماریشس ایسی خوبصورت جگہ ہے کہ دنیا بھر کے لوگ یہاں سیر کرنے آتے ہیں۔ خاص کر یہاں کے سمندری ساحل، صاف ستھرے پانی اور پاکیزہ ساحلی ریت کی سب جگہ دھوم ہے۔ موسم بھی بہت پیارا ہے۔ لیکن ماریشس میں بھی وہ مقام جو "موکا" کے نام سے مشہور ہے۔ شاید پورے جزیرے میں سب سے خوبصورت مقام ہے۔ کیپ ٹاؤن افریقہ کی طرح یہاں بھی چھوٹی بڑی کئی پہاڑیاں ہیں۔ موکا بھی ایک پہاڑی کا نام ہے۔ جو زمین کی سطح پر تو خوب چوڑی ہے لیکن کچھ اونچائی پر جا کر بالکل ایک سیدھی قلعے کی دیوار کی طرح بلند ہو گئی ہے جس سے بادل ہر وقت ٹکراتے رہتے ہیں۔ پہاڑی کے دامن درختوں اور پودوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ شرط باندھ کر روز ہلکی سی بارش ہوتی ہے۔ پھر دھوپ نکل آتی ہے اور بادل پہاڑی پر بنے بنگلوں کے کمروں، برآمدوں اور پائیں باغوں اور پہاڑی کے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر تھوڑی دیر آنکھ مچولی کھیل کر اور ہر چیز کو بھگو کر نہ سہی لیکن تھوڑا سا گیلا ضرور کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ نمی اور نمو نے ہر چیز کو سبز زمردی اور لاجوردی لباس پہنا رکھا ہے۔ بارش چونکہ روز ہوتی ہے اور درخت گھاس اور سبزہ بکثرت ہے۔ اس لئے بارش سے مٹی کٹتی نہیں۔ پودوں اور گھاس کی جڑیں مٹی کو روکے اور سنبھالے رکھتی ہیں۔ صرف صاف ستھرا بارش کا پانی ندی نالوں میں جاتا ہے اور کیچڑ کہیں بھی نہیں ہوتی۔ پانی جہاں بھی جاتا ہے موتی کی طرح چمکتا ہوا جاتا ہے۔ میاں غلام عبدالقادر کا نام تو بزرگوں نے قادریہ نسبت کی وجہ سے رکھا ہو گا لیکن ان کے چھوٹے بھائی کا نام "فردوس" رکھنے کی تحریک اگر اس مقام سے ہوئی ہو تو کچھ عجب نہیں۔

میاں غلام عبدالقادر نے سونے پر سہاگہ یہ کیا ہے کہ اپنے بنگلے کے پائیں باغ میں زیتون کے کچھ درخت بھی لگوائے ہیں جن کو یہاں کا موسم خوب راس آیا ہے زیتون ایسا درخت ہے جس کی قسم خود اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمائی۔ زیتون ہی کو یہ سعادت بھی ملی کہ اس کی ٹہنی کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے امن کی علامت بنایا اور قرآن مجید میں اللہ کے نور

کا دیدار ہوا اور حاتی اور رفا قوس اور پہلاع کی متابیں دی گئیں۔ تو اس چراغ کے لئے زیتون کے مبارک درخت اور تیل ہی کا انتخاب کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس پہاڑ کو جس نے آتش فشانی کے بعد لاوے سے جنم لیا اور اب جسے ہر وقت آسمانی پھواریں ٹھنڈا رکھتی ہیں قایم و برقرار رکھے اور اس پر آباد محلے اور بسنے والوں کو امن و امان اور خوشیاں میسر رہیں۔ میاں غلام عبدالقادر کے چچازاد بھائی نوری میاں کا بنگلہ بھی اسی پہاڑ پر ہے۔ وہ آجکل باہر گئے ہوئے ہیں۔ ان کے والد ماجد الیاس سیٹھ صاحب امریکہ میں قیام پذیر ہیں۔ باقی رشتے دار وں میں سے کچھ ڈاؤن ٹاؤن پورٹ لوئی میں رہتے ہیں۔ کاروبار بھی سب کا وہیں ہے۔ شب بسری کے لئے اپنے اپنے گھروں پر آجاتے ہیں۔

رات کا کھانا بہار ہندوستان کے باورچی نے تیار کیا تھا۔ ہاشم بھائی مجھ شکر کے مریض کے لئے گھر سے بنگالی مٹھائی تیار کرا کے لائے تھے۔ کہ ان کی ابتدائی عمر کلکتے میں گزری ہے۔ مگر یہ بھی خوب تماشا تھا کہ یہ مٹھائی کہنے کو مٹھائی تھی مگر اس میں شکر نہیں تھی۔ میرے لئے تو اللہ میاں کے فرشتوں نے پہلے سے حکم لگا رکھا ہے کہ مٹھاس کھانے کے اندر نہیں کھلانے والوں کی محبت میں ڈھونڈو مگر ہاشم بھائی میری صحت کی خاطر شکرستان میں پھیکی مٹھائی لائے اور مجھے ہندوستان کا یہ لطیفہ یاد دلا دیا کہ کسی کفایت شعار ماں سے بچے نے پراٹھا کھانے کی فرمائش کی تو ماں نے بغیر گھی کی سادی روٹی سامنے رکھی اور بچے سے کہا کہ بیٹا گھی کی منڈی کی طرف منہ کرکے کھاؤ۔ بالکل پراٹھے کا سا مزا آئے گا اماریشس میں شکر کھانے کی جگہ شکر والوں کے ہاں قیام کرنا بھی اسی لطیفے کے تحت آگیا۔

زمینی جنت "موکا" میں بھی لینینشیا جو برگ کی طرح یہ قصہ رہا کہ میاں غلام عبدالقادر سلمہٗ اور ان کی دلہن کشور سلمہا نے خاص اپنے بہت بڑے بیڈروم کو جو بیڈ روم بھی تھا۔ ٹی وی لاونج بھی۔ خالی کر کے میرے حوالے کر دیا۔ اور خود گھر کے ایک اور چھوٹے بیڈروم میں منتقل ہو گئے۔ حالانکہ مجھ اکیلے آدمی کے لئے تو بڑا بیڈروم کیا کوئی چھوٹا سا گوشہ اور کونا ہی کافی تھا۔ بڑے بیڈ روم میں چونکہ ایک نام نہاد ہی سہی لیکن مذہبی آدمی مہمان تھا اس لئے بے چارے ٹی وی T.V پر بھی پردہ ڈال دیا گیا۔ بچوں کو بھی T.V دیکھنے کی ممانعت ہو گئی۔ شروع شروع میں تو مجھے اس خوبصورت مارشل لا کا احساس نہیں ہوا لیکن جب احساس ہوا تو میں نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور بغاوت میں بچوں کو بھی شرکت کا باوا بھیجا کہ T.V دیکھو اور جب تک جی چاہے دیکھو۔ مگر بیچارے مہذب بچے ڈرے سہمے ہی رہے۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ میں ان کے دادا اسمٰعیل صاحب کا ایسا ہم عمر دوست رہا ہوں جس کو زمانہ تعلیم میں اسمٰعیل بھائی نے لاکھ سگرٹ پینا سکھانا چاہا مگر اس کو سگرٹ پینا آیا ہی نہیں! تاہم میں جتنا سگرٹ پینے میں پیچھے رہا۔ اتنے اسمٰعیل بھائی کے بھانجے بھانجیاں اور پوتیاں میرے کمرے میں آنے اور ٹی وی دیکھنے میں پیچھے نہیں رہے۔ کسی قدر مجھ سے مانوس ہو ہی گئے خاص طور پر اس لئے بھی کہ زہرہ آپا کے صاحبزادے میاں غلام شرف الدین اور ان کی چھوٹی بہنیں تاجور اور عنبر کلکتے سے دہلی آتے رہتے ہیں اور وہ ہم لوگوں سے اجنبیت محسوس نہیں کرتے۔ ان کی بہن نیلوفر نظامی اور ان کے دولہا احسن نظامی اپنے بچوں کے ساتھ جدے میں مقیم ہیں۔ اچھی خاصی بین الاقوامی فیملی ہے۔ نیلوفر سلمہا اور احسن میاں تو پہلے ہی سے میرے ذریعے نظامیہ سلسلے میں داخل تھے موکا کے قیام کے دوران کشور سلمہا اور ان کی بچیاں مصباح نظامی، سیمی نظامی، بشریٰ نظامی اور میاں غلام شرف الدین اور تاجور اور عنبر بھی نظامی بن گئے اور سلسلے میں میرے

یے شریک ہوگئے۔ رتا جو رسلیہا ماشاء اللہ اعلیٰ تعلیم یافتہ
بہت سمجھدار ہیں۔ ان کی دونوں بڑی شادی شدہ
ون کشور اور نیلوفر نے بھی کم عمری کے باوجود والد کے
ال کے بعد اپنے تجارتی دفتر کی دیکھ بھال رکھی تھی
ں غلام شرف الدین اس وقت بہت چھوٹے
۔۔ اب ماشاء اللہ وہ بھی تعلیم سے فراغت پاچکے ہیں
کاروبار میں خوب حصہ لیتے ہیں مثل مشہور ہے کہ
ں کے جائے کو تیرنا سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی!
ے والد عثمان عبدالرحیم مرحوم نے اپنے بچوں کی بہار
یکھی لیکن بچوں کے بچوں کی بہار نہیں دیکھ سکے۔
زمین سے نہ سہی اب آسمان سے تو یہ بہاریں دیکھ
رہے ہیں۔ زہرہ آپا بھی بچوں کے لئے ماں اور باپ
نوں بیک وقت بنی ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا
ہ بچوں پر قایم رکھے سیمی سلیہا کی آپا امینہ نے بھی بیعت کی۔

ون ٹاون پورٹ لوئی میرے میزبان سب کے سب پشت ہا
ن سے کاروباری لوگ ہیں۔ اگلی صبح ان سب کی دوکانوں
یا تو نئے پرانے دونوں شہروں کی سیر ہوگئی۔
شہر تو بالکل ایسا ہے جیسے بمبئی یا گجرات کے کسی
وستانی شہر میں آگئے۔ بس فرق یہ تھا کہ ہندوستان
ہروں میں تو باشندے اکثر و بیشتر دیسی ہندوستانی
آتے ہیں۔ یہاں حبشی، چینی، ملیشین، یوروپین ہر نسل
رنگ روپ کے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔

پارکنگ کا مسئلہ یہاں بھی بڑا گمبھیر ہے موٹروں
مالکان کو اپنی اپنی سواریاں کھڑی کرنے کے لئے
دور جانا پڑتا ہے کہ اس کے بعد انھیں شاید
ں ورزش یا جاگنگ JOGGING کی
ررت نہیں رہتی۔

میزبان خاندان کی مشترکہ دوکان خاصی
ں متعدد دروازوں والی دکان تھی۔ لکڑی کے
تاریخی دروازوں ہی کو جوں کا توں قایم نہیں رکھا
گیا تھا۔ بلکہ ان پر رنگ بھی شروع سے آج تک
ایک ہی چلا آتا ہے۔ یعنی نیلا رنگ! اس رنگ کو ایک
زمانے میں درویشوں کا رنگ سمجھا جاتا تھا نیز کرشن جی
سے بھی دو ہی رنگ منسوب ہیں۔ ایک سانولا دوسرا نیلا۔
آسمان کو بھی نیلی چھتری کہا جاتا ہے۔ حبیب بھائی اور
ہاشم بھائی نے بتایا کہ پورے شہر میں ان کی دوکان
نیلے دروازوں والی دوکان کے نام سے مشہور
ہے۔ ہر تاریخی چیز یادوں کا خزانہ ہوتی ہے۔ یہ
دوکان بھی ایسی ہی تھی۔

عبدالقادر صاحب کی علیحدہ دکان بھی قریب ہی
ہے۔ سب جگہ خاطر تواضع ہوتی۔

جامع مسجد شہر کی جامع مسجد پرانے شہر میں ہے۔ پہلے بہت چھوٹی سی تھی۔ وقتاً فوقتاً اضافے
اور تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس کی
آخری بڑی تعمیر کے وقت کاریگر ہی نہیں اینٹیں تک
پانی کے جہاز میں بھر کر ہندوستان سے لائی گئی تھیں۔
بہت خوبصورت، صاف ستھری اور اچھے انتظام
سے آراستہ مسجد ہے۔ البتہ وضو کا اہتمام اس شان
کا نہیں ہے جو ڈربن کی مسجدوں میں دیکھا تھا۔ امام
اور خطیب مولانا شمیم صاحب یوپی ہندوستان کے
ہیں۔ چند ہی برس پہلے یہاں آئے تھے۔ ان کے لئے
رہائش کا انتظام بھی مسجد ہی کے کمپاؤنڈ میں دوسری
منزل پر کیا گیا ہے۔ ان کی صاحبزادی کی شادی ہونے
والی ہے۔ بہت مصروف تھے اور مہمانوں سے گھر بھرا ہوا
تھا۔ مگر اس مصروفیت کے باوجود بڑے اخلاق سے
پیش آئے اور بہت خاطر کی۔ مسجد کے اندر ہی یہاں
کے سب سے بڑے بزرگ حضرت جمال شاہ کی
درگاہ بھی ہے۔ انھوں نے اس مسجد کی بڑی خدمت
کی تھی اور دین کے چرچے کو یہاں زندہ رکھا تھا۔ "رکھا تھا"
کیا معنی آج تک زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

امیر البحر ماریشس میں ہندو مسلمان ہندوستانیوں

کی آمد کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ ۱۸۵۷ء میں حکومت ہاتھ سے نکل جانے کے باوجود اور فوجی اقتدار کے بغیر بھی ہندوستانیوں کی یہ شان تھی کہ تجارت کے نام پر ہی سہی لیکن اپنے چھوٹے چھوٹے جہازوں میں آس پاس کے سمندر کھنگالتے پھرتے تھے۔ اور اپنے چھوٹے چھوٹے تجارتی بحری بیڑوں کے "امیر البحر" کہلاتے تھے۔ اور یہ اپنے گھر کی جہاز رانی ہی کا ثمرہ تھا کہ تعمیرات کے لئے ضرورت پڑتی تھی تو کاریگر ہی نہیں اینٹیں چونا تک اپنے گھر ہندوستان سے ڈھو کر پردیس پہنچا دیتے تھے۔ یورپین اقتدار کی وجہ سے حالات بالکل سازگار نہیں تھے۔ لیکن ان لوگوں نے ہر جگہ اپنی جگہ بنائی اور سخت پابندیوں کے باوجود جو کچھ ناسازگار تھا اس کو سازگار کر لیا۔ چینی بھی غالباً یہاں اسی طرح آئے مالی اور کاروباری اعتبار سے ان کی حالت زیادہ اچھی بتائی گئی۔

درگاہ اور قبرستان } مذہب اسلام کا زیادہ چرچا یہاں دو مسلمان درویشوں کی وجہ سے رہا۔ ایک بزرگ حضرت جمال شاہ جامع مسجد کے پہلو میں آسودہ ہیں۔ دوسرے حضرت پیر جہاں گیر عام قبرستان میں اپنی عام برادری کے ساتھ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان کے مزار پر عقیدت مندوں نے روضہ بنوا دیا ہے اسی قبرستان میں میری مرحومہ پیر بہن بیگم سیٹھ عبدالستار صالح محمد نظامی اور ان کی صاحبزادی یعنی الیاس ذکریا صاحب کی اہلیہ اوّل آرام کر رہی ہیں۔ ان کے مزار پر فاتحہ پڑھنے بھی گیا۔ قبرستان بے حد صاف ستھرا اور سلیقے قرینے کا تھا۔ قبریں ترتیب سے تھیں۔ ہر طرف پھلواری تھی۔ ہمارے مولوی صاحبان کہتے ہیں کہ قبرستان کو عبرت کا نمونہ ہونا چاہئے یعنی بدحالی اگر نہ ہو تو گویا مصنوعی بدحالی پیدا کرو اور جب بدحال رہنے کی عادت پڑ جاتے تو قبرستان کیا خود اپنی زندگی ہی سے عبرت پکڑتے رہو

لاحول ولا قوۃ۔ ان مہربانوں نے اگر مسلمانوں کی تاریخ پڑھی ہوتی تو پتہ چلتا کہ دور عروج میں ان کے قبرستان بھی جنت کا نمونہ ہوا کرتے تھے۔ عبرت حاصل کرنے والے تو ہر چیز سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس چیز سے بھی کہ اگر خوش حالی ہے تو یہ خیال آتا ہے کہ سب کچھ فنا ہونے والا ہے۔ سب یہیں رہ جائے گا۔ اور اچھے اعمال کا نتیجہ جنت میں بھی انشاء اللہ اسی طرح ملے گا جس طرح مومن مُردے کو غسل اور کفن اور کافور وعطر اور احترام واکرام اور زمین میں گڑھے بعد بھی اچھا اور مختصر چھوٹا سا مہمان خانہ قبر کی صورت میں ملتا ہے۔ اور قبر کے اوپر پھلواری ہو تو سبحان اللہ۔ ان سب سے یہ بات کہاں فراموش ہوتی ہے کہ سزا اور جزا بھی ہے اور فنا کا ذائقہ سب کو چکھنا ہے۔ اور جو بے حس ہیں۔ اور نام نہاد علمائے کرام کے خوفناک وعظوں کے باوجود بے حس ہیں۔ ان کو اجڑے برباد قبرستانوں ٹوٹی قبروں سے جھانکتی ہڈیوں کے باوجود قبرستانوں کے اندر ہی اور کسی لاش کے ساتھ جانے کے باوجود ہنسی مذاق ہی نہیں فحش مذاق کرتے رات دن دیکھا جاتا ہے!

سب سے زیادہ خوشی مجھے اس بات سے ہوئی کہ میاں عبدالقادر اور ہاشم بھائی اور حبیب بھائی اور سلیم میاں اور دوسرے اہل خاندان اپنے مرحوم عزیزوں کی قبروں پر آتے جاتے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے قبرستان کی دیکھ بھال کرنے والے بھی مستعد رہے ہیں۔

قبرستان میں ایک نظامی نسبت رکھنے والی خاتون کی قبر علامت تھی اس بات کی کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا دامن ظاہری طور پر بھی یہاں تک آگیا ہے اور اس کا فائدہ انشاء اللہ ان مرحومین کو بھی پہنچتا رہے گا۔ جو پاس پڑوس میں دفن ہیں۔ حضرتؒ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ دکھایا گیا ہے کہ نظام!

جو تمہاری زیارت کرے گا ہم اسے بخش دیں گے!

مکتوبات صدی } دوپہر کو پرتکلف لنچ کے بعد قیلولے کے لئے بیڈ روم میں آیا تو آمنہ بھابی یعنی میاں غلام عبدالقادر کی والدہ ماجدہ نے کئی اعلیٰ درجے کی کتابیں پڑھنے کے لئے بھیجیں۔ انہی میں حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری رحؒ کے مشہور مکتوبات کا اردو ترجمہ بھی تھا۔ ان کتابوں سے نہ صرف ان کے اعلیٰ ذوق کا اندازہ ہوا۔ بلکہ ایسا محسوس ہوا کہ یہ سفر اللہ تعالیٰ کی ایک خاص نعمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ افریقہ میں بھی حضرت قاضی صاحب کے ہاں اعلیٰ درجے کا لٹریچر پڑھنے کے لئے ملتا تھا۔ ماریشس میں اس سلسلے کا جاری رہنا ایک ہی زنجیر کی دوسری کڑی نظر آیا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

اردو پروگرام } یہاں ریڈیو اور ٹیلی وژن دونوں سے اردو پروگرام بھی نشر ہوتے ہیں کیونکہ ان کے سننے دیکھنے والے اور پسند کرنے والے خاصی تعداد میں موجود ہیں ٹیلی وژن کے ایک معزز کارکن پیر و میاں صاحب چند سال پہلے ہندوستان آئے تھے اور غریب خانے ہی پر قیام فرمایا تھا۔ انھوں نے کسی سے میری آمد کی خبر سنی تو فوراً تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ریڈیو کے مسعود صاحب بھی تھے۔ دونوں نے میرے انٹرویو ریکارڈ کئے جنھیں چند روز بعد نشر کیا جائے گا۔ ماریشس میں بول چال کی زبان یا انگریزی ہے یا فرنچ یا ایک نئی کھچڑی زبان جس میں انگلش فرنچ چینی عربی اور خدا معلوم کن کن زبانوں کے لفظ شامل ہیں۔ مگر ان کے ساتھ الحمد للہ نہ صرف اردو زندہ اور موجود ہے بلکہ اس میں ٹی وی اور ریڈیو پروگرام بھی ہوتے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے یہاں ایک انٹرنیشنل اردو کانفرنس بھی ہوئی تھی جس میں ہمارے غالب انسٹی ٹیوٹ سے بھی ایک وفد فضیلت مآب

شفیع قریشی صاحب موجودہ گورنر مدھیہ پردیش کی سرپرستی میں آیا تھا۔

الیاس بھائی کے بیٹی داماد اور سمدھی اور محلے کی مسجد کے امام صاحب مولانا ذکریا اور دوسرے بہت سے احباب از راہ کرم ملنے تشریف لائے۔ الیاس بھائی کے سمدھی کے بھانجے بیمار ہیں اور اسپتال میں داخل ہیں۔ ان کی بیمار پرسی اسپتال جاکر کی۔ امام صاحب نے رات کو بعد نماز عشاء مسجد میں تقریر کرنے کی دعوت دی۔

چاندنی کی بہار } رات کو مسجد جاتے وقت جنگل پہاڑ درختوں اور چاندنی کی ایسی بہار نظر آئی جس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہاں بھی چاند کالاہاری صحرا کی طرح بہت بڑا اور زمین سے قریب محسوس ہوا۔ البتہ اس میں چمک اتنی زیادہ تھی کہ یک بارگی دیکھو تو نگاہ نہیں ٹھیرتی تھی۔ چاروں طرف سمندر کی موجودگی اور گرد و غبار کا نام و نشان تک نہ ہونے نیز کہر اور دھند کے فقدان کی وجہ سے غالباً یہ کیفیت تھی۔

محلے کی مسجد میں تھوڑے لوگ تھے اور ہمارے سیٹھ صاحبان کے سوا پورا مجمع کالج والا نہیں اکبر الہ آبادی کا جمن خانی مجمع تھا۔ مگر سب لوگ نہایت پر خلوص دیندار اور محبت والے تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر واقعی ایسا لگتا تھا جیسے اللہ والے اللہ کے سامنے حاضر ہیں۔ مسجد کے ساتھ مدرسہ بھی ہے۔ امام صاحب کا مکان یہاں بھی مسجد سے ملحق تھا۔ تقریر کے بعد وہ اپنے گھر لے گئے ماشاء اللہ جامع مسجد کے امام صاحب کی طرح ان کا گھر بھی میز کرسی اور صوفے سے آراستہ تھا۔ ہم لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ مگر امام صاحب نے از راہ کرم خوب تکلف کا اہتمام کر رکھا تھا۔

قیام میں توسیع } میں صرف دو دن ٹھیرنے کی نیت سے ماریشس آیا تھا۔

کیونکہ دلی اور ہندوستان سے غیر حاضری خاصی طویل ہوگئی ہے اتنی لمبی مدت تک تو میں شاید حج کے موقعے پر بھی باہر نہیں رہا تھا مسلسل سفر نے تھکا بھی دیا اور شکر اور دل کی بیماری ذرا اپنے مزاج بھی دکھانے لگی اس لئے چاہا تھا کہ جلدی واپسی ہو جاتے۔ مگر احباب نے قیام بڑھوا دیا۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ جمعے کے دن جامع مسجد کے امام مولانا شمیم صاحب کی صاحبزادی کی شادی تھی۔

میٹھی ریسرچ } ماریشس جزیرہ ہے۔ یعنی چاروں طرف سے کھاری اور کڑوے سمندر سے گھرا ہوا ہے۔ لیکن کاشت سب سے زیادہ گنے کی ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں گنے اور شکر پر ریسرچ کا ایک بہت بڑا ادارہ بھی قائم کیا گیا ہے جس کے کام سے سب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میاں غلام عبدالقادر نے اس کی سیر بھی کرائی۔ ان کے سب سے بڑے کزن نوری میاں کو اردو لٹریچر خاص کر غالب سے بھی خاصا شغف ہے۔ وہ ماریشس میں موجود نہیں ہیں۔ ورنہ کہتا کہ میاں ایک ڈپارٹمنٹ یہاں فارسی اردو اور ہندی شاعری کا بھی کھلوادو کہ شکر پر ریسرچ اس وقت تک مکمل ہی نہیں ہوگی جب تک ان تینوں زبانوں کی شاعری کا تذکرہ اس میں نہ آئے۔ میرا خیال ہے کہ دنیا کی شاید کسی زبان میں بھی تلخی وشیرینی اور شکر کا ذکر اس طرح نہ آیا ہوگا۔ جس طرح ہماری ان تین زبانوں میں آیا ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں نہ سہی۔ یہاں کی یونیورسٹی میں ضرور اس موضوع پر کچھ کام ہونا چاہیئے۔

مجھے ایک دفعہ پہلے بھی اسلامی فقہ کے ماہر ڈاکٹر طاہر محمود صاحب کی معرفت ماریشس آنے کی دعوت ملی تھی مگر میں نہیں آسکا تھا دوسری دفعہ اردو کانفرنس ہوئی سو اس کے شرکا کا انتخاب اسی طرح ہوا جس طرح اردو کانفرنسوں کے شرکا کا انتخاب ہوا کرتا ہے۔ یعنی من ترا حاجی بگو۔ تو مرا حاجی بگو! میں تمہیں سمینار اور کانفرنس میں بلاؤں۔ تم مجھے بلاؤ۔ اس لئے نہیں آیا۔ ورنہ وہ موقعے تھے کہ ایک مقالہ میں خاص اس موضوع پر خود تیار کرتا یا کسی سے تیار کراتا اور دنیا دیکھتی کہ اس جزیرے اور اس سمندر کی صباحت و ملاحت کا حق کس طرح ادا کیا جاتا ہے۔ خیر اب بھی کیا ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔ ہندوستان میں بیٹھ کر بھی خدا نے چاہا یہ کام کیا جاسکے گا۔ فی الحال تو میں سفر کرتے کرتے ہی نہیں اس کی داستان سناتے سناتے بھی تھک گیا ہوں!

رام تلا اور بی بی جان } ہمارے ہاں گجرات اور مہاراشٹر وغیرہ کے ہندو مسلمان قدیم زمانے میں اپنے نام انگریزی تلفظ کے ساتھ انگلش میں لکھا کرتے تھے۔ مثلاً کسی کے نام کا جزو لفظ بھائی ہے تو اسے BHAI کے بجائے BHOY لکھا جاتا تھا اور نہایت دلچسپ صورت رہتی تھی۔ یہ لوگ ہندوستان کے ان ساحلی مقامات سے ماریشس آئے اور انگریزی کے ساتھ فرنچ کا ملمع چڑھا تو اس سے بھی زیادہ دلچسپ کیفیت ہوگئی۔ ایسے ایسے مزیدار تلفظ ہندو مسلم ناموں کے ہوگئے کہ بس کیا کہئے۔ آج جن حضرات نے قیام گاہ پر کرم فرمایا ان میں میزبانوں کے ایک دوست بھی تھے جن کا تعلق ایر ماریشس سے ہے کارڈ پر نام

BEE BEE JAUN

تحریر تھا۔ میں سمجھا کہ کوئی خاتون ہوں گی مگر وہ نہایت شاندار مرد نکلے۔ خوب لطف رہا۔ تفصیل پوچھنے پر پتہ چلا کہ اصل نام حسن ہے۔ بی بی جان خاندانی نسبت ہے۔ جس کی وجہ تسمیہ خود انھیں بھی معلوم نہیں تھی۔ مگر میرا خیال ہے کہ ان کے بزرگوں میں بی بی جان کوئی خاتون رہی ہوں گی جن کے نام کاروباری فرم کھولی گئی ہوگی۔ اس فرم کے مالکان کچھ عرصے بی بی جان والے

کہلائے ہوں گے پھر فرم کے ہر مالک کے نام کا جزو بن جان ہوگیا ہوگا تذکیر تانیث کے جھمیلے میں کون پڑتا اور یہاں اس کو سمجھتا بھی کون !

دوسرے بزرگ جن کی زیارت RAMTOOLA اسم کے ساتھ ہوئی وہ میاں عبدالقادر کے خاص الخاص عزیز ہیں اور یہ بھی ایر ماریشس کے بڑے افسر ہیں۔ اصل نام عمر رحمت اللہ مگر اس کی کتابت اومر رام تلا!

OOMER RAMTOOLA

یہی حال ہندو ناموں کا ہے کہ کبھی وہ کرسچین نام لگتے ہیں کبھی مسلمان نام اور کبھی خالص قلندری اور ملنگ اسمائے گرامی! یہ موضوع خود ایک ریسرچ اور نہایت دلچسپ مقالے کا طلب گار ہے۔

عمر رحمت اللہ صاحب جامعی نکلے۔ ان کی تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ہوئی ہے۔ یعنی میرے ہم مدرسہ ہیں۔ ان دونوں حضرات سے ملاقات کیا ہوئی جیسے ایر ماریشس کی شیر ہولڈری میسر آگئی۔ کم از کم اتنا اطمینان تو ہو ہی گیا کہ جب چاہوں گا انشاء اللہ ہندوستان جا سکوں گا۔ ریزرویشن نہ بھی ملا اور سیٹ نہ بھی ہوئی تو کہوں گا دوست! سامان رکھنے کی جگہ بٹھا دو۔ مگر بھیج دو! اسکول کالج میں تو ہم ایک دوسرے کو نہیں دیکھا کیونکہ یہ بے حد جونیئر اور میں ایسا سینیر کہ ان کے بزرگوں کا ساتھ دے سکوں۔ تاہم مدرسے کی یاری تو مانی ہی جاتی گی اور یہ بڑی زبردست یاری ہوتی ہے۔ اس یاری ہی کے زور پر میں نے عمر بھائی اور حسن بھائی کے ناموں کے ساتھ ہنسی ٹھٹھا بھی کر لیا! ویسے بھی عمر بھائی میری بھتیجی بہو عزالہ سلمہا کے عزیز ہیں!

عبدن صاحب ایک اور کرم فرما عبدن صاحب بھی از راہ کرم تشریف لائے۔ یہاں مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ہندوستانی سینٹر ہے۔ اس میں اردو کا شعبہ بھی ہے

اس سے متعلق ہیں عالمی اردو کانفرنس کا اہتمام انہی نے کیا تھا۔ دبی زبان سے اور اشارتاً انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ہندوستان سے۔ جو ڈیلی گیٹ یہاں تشریف لائے تھے ان میں سے بعض کچھ اچھا تاثر چھوڑ کر نہیں گئے ہیں۔ باقی لوگوں کی انھوں نے خوب تعریف بھی کی۔ مجھے اپنے انسٹی ٹیوٹ بھی لیجانا چاہتے تھے۔ مگر اس کا وقت شاید نہ ملے۔ کیونکہ یہاں تعطیلات ہیں اور مجھے واپسی کی جلدی۔

قصر چوبیں ہاشم بھائی۔ سلیم میاں۔ اور غلام شرف الدین صاحب۔ حبیب صاحب وغیرہ سب کے قدیم بزرگوں کے چھوڑے ہوئے تاریخی مکانات یا قدیم شہر میں ہیں یا بالکل قدیم اور بالکل جدید شہر کے درمیان کی صاف ستھری آبادی میں جہاں سڑکیں چھوٹی ضرور ہیں مگر بنگلے نہایت خوبصورت اور شاندار۔ یوروپین اسٹائل پر بنے ہوتے ہیں۔ میاں غلام شرف الدین کے بنگلے میں زیادہ حصہ لکڑی کا ہے۔ اور نہایت خوبصورت ہے۔ سامنے کے رخ اتنا بڑا لان ہے کہ بڑی بڑی پارٹیاں آرام سے ہو سکتی ہیں۔ پشت پر پائیں باغ ہے۔ جس میں پھلوں کے درخت ہیں۔

ہاشم بھائی کا مکان بھی اس کے قریب ہی ہے۔ پہلے ان کے ہاں نہایت پرتکلف ایٹ ہوم ٹائپ کی چائے نوشی ہوئی۔ جس کے بعد کھانا کھانے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ تاہم زہرہ آپا اور میاں غلام شرف الدین صاحب نے اپنے مکان میں شاندار ڈنر کا اہتمام بھی کر رکھا تھا۔ الیاس بھائی کے داماد اختر صاحب اور ان کی دلہن یاسمین سلمہا بھی تھے۔ جو شاید ایک روز پہلے ہی لندن سے یہاں آئے تھے۔

لکڑی کے مکان پر یاد آیا کہ شروع شروع میں ماریشس کا جزیرہ تمام تر آبنوس کے درختوں

سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ درخت غالباً عرب ملاحوں کے ذریعے یہاں پہنچے تھے۔ مگر ان درختوں کی قیمتی لکڑی تقریباً سب کی سب کٹ کر یوروپ پہنچ گئی۔

محلے کی مسجد میں بھی حاضری ہوئی۔ نماز کا وقت نہیں تھا۔ تاہم تحیت مسجد ادا ہوگئی۔ بعد میں عشاء کی نماز بھی پڑھی۔ نمازی خاصی کثیر تعداد میں تھے کیونکہ یہ وقت محلے والوں کے اپنے اپنے گھروں میں رہنے کا تھا۔

جمعہ } جمعے کی نماز جامع مسجد میں پڑھی۔ نماز سے قبل امام صاحب مولانا شمیم کے چھوٹے بھائی (یا صاحبزادے) کا وعظ ہوا۔ جو جوہانس برگ افریقہ سے شادی میں شرکت کے لئے آئے ہوئے ہیں۔

روز ہل نامی محلہ بھی دیکھا۔ کسی زمانے میں یہاں گلاب کا باغ ہوگا۔ آثار اب بھی بتائے جاتے ہیں۔ مکانات ماڈرن اور شاندار، دوکانیں آراستہ پیراستہ اور ہر طرح کے سامان سے لدی ہوئی۔ ایک سندھی بھائی کا ڈپارٹمنٹل اسٹور برابر کے یوروپین اسٹور کی ٹکر کا دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کپڑے کی دوکانیں بکثرت ہیں۔ سنا ہے یہاں ساری دنیا کا بہتر سے بہتر کپڑا نہایت سستے نرخ دستیاب ہے۔ ٹورسٹ خوب خریدتے ہیں۔

شادی } شام کو بعد نماز مغرب مولانا شمیم صاحب کی صاحبزادی کا نکاح جامع مسجد میں اس شان سے ہوا کہ شہزادیوں کی شادی بھی کیا ہوتی ہوگی۔ سارے شہر کی کریم موجود تھی۔ یہاں تک کہ ماریشس کے صدر محترم جو مسلمان ہیں بنفس نفیس مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے اور ہر ایک کو درجہ بدرجہ اپنے اپنے مقام پر خود لے جاکر بٹھاتے تھے۔ گورنر صاحب اور دوسرے غیر ملکی اور غیر مسلم حضرات بھی بکثرت تھے۔ پولیس کا زبردست انتظام تھا۔ سارے شہر میں بس یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہر راستہ جامع مسجد کی طرف جا رہا ہے۔ برقی روشنی خوب تھی۔ لیکن سارا ماحول اس قدر سنجیدہ شائستہ اور باوقار تھا کہ نکاح کی محفل، محفل کے ساتھ ایک شاہی دربار بھی لگ رہی تھی۔ دولھا میاں خود ایک عالم دین ہیں۔ مشائخ اور علماء کو صدر میں اکابر حکومت سے اونچی جگہ بٹھایا گیا تھا۔ مجھے بھی ازراہ کرم دولھا کے قریب جگہ دی گئی تھی اور بعد نکاح فاتحہ خوانی اور دعا کا کام سونپا گیا تھا۔ جائس رائے بریلی کے مشہور اشرفی بزرگ مولانا نعیم اشرف کے صاحبزادے مولانا کلیم اشرف نے جو ہندوستان سے آئے ہوئے ہیں۔ نہایت خوش الحانی سے کھڑے ہوکر طویل خطبہ نکاح پڑھا۔ لیکن ٹھیک اسی دوران میری طبیعت خراب ہوئی اور نہ صرف شکر کا لیول کم ہوتا محسوس ہوا بلکہ سینے میں بھی تکلیف ہونے لگی اور میں نے مولانا شمیم صاحب سے معذرت کی کہ اس حالت میں کھڑے ہوکر بلند آواز سے دعا نہیں مانگ سکوں گا۔ اس لئے یہ فرض آپ خود انجام دیں۔ چنانچہ انھوں نے بہت اچھی دعا مانگی۔

واپسی میں موٹر تک پہنچنا خاصا مشکل کام تھا طبیعت بگڑنے کی وجہ سے اور بھی مشکل لگا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے بخیریت گھر تک پہنچا دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس شادی کی محفل ہی میں کوئی تماشا نہ ہو جائے۔ سو الحمدللہ نہیں ہوا۔

ہفتے کا سارا دن آرام کرتے اور گھر والوں اور احباب کے ساتھ وقت گذارتے گزرا۔ جس طرح گھوڑا گھر اور تھان کے قریب جاتے وقت تیز چلتا ہے۔ مگر سخت تھکا ہوا ہوتا ہے۔ میں بھی تیز چلنا چاہتا ہوں، مگر اتنا تھک گیا ہوں کہ چلنا دوبھر ہے۔

اتوار کا دن ہندوستان واپسی کا دن بھی تھا اور یہاں چھٹی کا دن بھی اس لئے ایرپورٹ جانے سے قبل احباب گھر پر جمع رہے۔ تحائف سے بھی خوب خوب نوازا گیا۔ عبدالقادر صاحب کی والدہ ماجدہ

ںحفوں میں غلاف کعبہ کا ٹکڑا بھی مرحمت کیا۔ الیاس
ں کی صاحبزادی نفیسہ سلمہا اور ان کے دولہا
ستاق میاں۔ عمر رحمت اللہ صاحب۔ حسن بی بی جان
ب۔ ڈاکٹر رشید صاحب حاجی عبداللہ صاحب
بھائی ان کی اہلیہ۔ سلیم میاں ان کی دلہن اور
سرے بہت سے احباب نے جن کے اسمائے گرامی
ب یاد نہیں ہیں۔ تشریف فرما ہونے کی زحمت
راکی تھی۔ خوب بارش ہو رہی تھی۔ کشور نظامی
ہا اور ان کے سب نظامی بچوں۔ زہرہ آپا۔ غلام
ٹرف الدین نظامی تا۔ نور نظامی عنبر نظامی سب
ایسی محبت سے رخصت کیا کہ برسوں اس کی
رہے گی۔ ہر ایک کا اصرار تھا کہ ابھی اور ٹھیرو!
جوگی کب کہیں زیادہ ٹھیرتے ہیں جو میں ٹھیرتا۔
بلورٹ پر رخصت کرنے کے لئے بھی بہت
۔ آئے۔ عمر رحمت اللہ صاحب مصروف تھے لیکن
ں نے اپنی کمپنی والوں کو ہدایت کر دی تھی کہ مجھے
رح کا آرام پہنچا ئیں سو انھوں نے پہنچایا۔ بمبئی
بلورٹ والوں کا رویہ جتنا خراب جاتے وقت
ھا تھا اتنی ہی اچھا واپسی کے وقت پایا۔ سب
ے زیادہ خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ ایک علیحدہ
نٹر عمر رسیدہ لوگوں کے لئے تھا۔ جہاں مدد
ینے والے پورٹر اور حمال بطور خاص موجود تھے۔
، پتہ چلا کہ اپنے پیارے دیس میں بھی بہت سی
، چیزیں ہیں۔ جہاز بہت لیٹ آیا تھا۔ کمپنی والوں
دہلی کے سب مسافروں کے ٹھیرنے کا انتظام
ں کے ایک ہوٹل میں کیا تھا۔ اس کے کوپن دیئے
، مگر میرے پاس ٹھیرنے کے جو کوپن تھے وہ
مذ کی پرچیوں کی شکل میں نہیں تھے۔ یوسف علی محمد
ی۔ کریم نظامی۔ عبدالعزیز نظامی۔ علی محمد مرادی
امی۔ یوسف مرادی نظامی۔ فاروق نظامی۔ فرید نظامی اور دوسرے
ناسے جیتے جاگتے چلتے پھرتے کوپنوں کی شکل میں

موجود تھے۔ یہ لوگ مجھے ایر ماریشس سے لے اڑے اور
ایسے اڑے کہ جس اگلے جہاز میں دہلی کا ریزرویشن
تھا اس کو بھی کینسل کرا دیا۔ دو روز تک بمبئی میں
خوب کھلایا پلایا۔ اونچے اونچے زینوں پر چڑھایا
اتارا۔ اس دعوے کے ساتھ کہ جو بد پرہیزی ہم کرائیں
وہ نقصان پہنچا ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ واقعی اس نے
نقصان نہیں پہنچایا اور دل کے جس مریض کو ڈاکٹر
دہلی سے سو پچاس میل دور جانے کی اجازت بھی نہ
دیتے تھے وہ کالے کوسوں کڑے کوسوں کی منزل مار کر
پھر اپنے تھان یا استھان یعنی حضرت خواجہ نظام الدین
اولیاؒ کے آستان پر پہنچ گیا۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔

حلقۂ نظامیہ ـــــ نظامی پیر بھائیوں کا خبرنامہ ـــــ مرتبہ خواجہ حسن ثانی نظامی

سلطان المشائخ حضرت خواجہ صاحبؒ کا عرس حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے جانشین شمس العلماء امام المشائخ مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے چالیسویں سالانہ عرس کی تقریبات بحمداللہ علمی اور ادبی جلسوں، ذکر وشغل، تعلیم وتلقین کی روحانی اور دینی محفلوں نیز نظامی پیر بھائیوں کے پر خلوص اور عقیدت بھرے اجتماع کے ساتھ منعقد ہوئیں۔

کتاب نما کا خواجہ نمبر اس عرس کے موقعے پر ایک خصوصی تقریب رسالہ کتاب نما کے خواجہ نمبر کے اجراء کے سلسلے میں تھی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو دنیا کا ایک قدیم، باوقار اور نہایت کامیاب اور مقبول اشاعتی ادارہ ہے۔ جس کی تاریخ مرحوم صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب۔ ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم، پروفیسر محمد مجیب مرحوم۔ حامد علی خاں صاحب مرحوم اور دوسرے بہت سے مشاہیر کے اسمائے گرامی سے مزین ہے۔ آجکل اس ادارے کے روح رواں جناب شاہد علی خاں صاحب ہیں۔ جنھوں نے اس دور میں جبکہ اردو کا کوئی پرسان حال ہندوستان میں نہیں ہے اس مکتبے کو کامیابی کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔ اور اتنی کتابیں شائع کی ہیں اور ان کو پڑھنے والوں تک پہنچایا ہے اور فروخت کیا ہے کہ ان سب کا شمار بھی آسان نہیں ہے۔ مکتبہ جامعہ غالباً اردو کا واحد اشاعتی ادارہ ہے۔ جو غیر ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو بھی جائز اور قانونی طریقے سے شائع کرتا ہے۔ حالانکہ آجکل کتابی اور علمی قزاقی اس قدر عام ہو گئی ہے کہ بڑے بڑے متشرع حضرات تک ایک ملک کے ادیبوں کی تخلیقات بغیر اجازت دوسرے ملک میں شائع کر کے ناجائز فائدہ اٹھا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ یہاں تک کہ قرآن مجید اور احادیث کے ترجموں اور مخصوص ایڈیشنوں تک کو انھوں نے اپنی چوریوں کی زد سے باہر نہیں رکھا ہے۔ اس ماحول میں اخلاقی قدروں اور ایمان داری کو باقی رکھنا خود اپنی جگہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ مگر شاہد علی خاں صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تجارتی مہارت سے یہ بھی ثابت کر دکھایا ہے کہ دیانت داری کے ساتھ بھی نہایت کامیاب کاروبار کیا جا سکتا ہے۔ اور اس میں ایسی برکت ہوتی ہے جس سے کتابی قزاق عموماً محروم رہتے ہیں۔ بہر حال یہ تو ایک جملہ معترضہ درمیان میں آ گیا۔ عرض یہ کرنا تھا کہ مکتبہ جامعہ کی طرف سے ایک ماہ نامہ بھی کتاب نما کے نام سے شائع ہوتا ہے جس میں صرف کتابوں ہی کا نہیں صاحبان کتاب یعنی مصنفوں اور مولفوں کا تعارف بھی پیش کیا جاتا ہے۔ کتاب نما کے خاص شمارے بھی چھپتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ابھی کچھ عرصہ پہلے پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب کے بارے میں کتاب نما کا ایک بہت اچھا نمبر شائع ہوا تھا۔ مگر یہ بات کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی

کہ اس یادگار خاص شمارے کے فوراً بعد شاہد علی خاں صاحب ایسی ہمت دکھائیں گے کہ صرف ایک مہینے کے اندر شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ سے متعلق ایک معرکۃ الآرا خصوصی شمارہ کتاب نما کا شائع کر دیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے اس خاص نمبر کا مہمان مدیر پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب کو بنایا اور چھپائی کمپیوٹر کے ذریعے کرائی تاکہ سارا کام پلک جھپکتے ہو جائے نیز کمپیوٹر جیسے ہی ایک اور کارگزار ماہر ادبیات و کتابیات و صحافت جناب ریحان احمد عباسی کو محترم نثار احمد فاروقی صاحب کا معاون بنایا۔

عباسی صاحب کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے ساتھ رہ کر کیا تھا اس وقت عباسی صاحب بہت کم عمر تھے اور حضرت خواجہ صاحب اپنی زندگی کے آخری مراحل طے کر رہے تھے۔ اس خاص نمبر کی اہمیت کا اندازہ ان مشہور ناموں سے لگایا جا سکتا ہے جن کے ارشادات اور مضامین اس خاص شمارے کی زینت بنے یعنی پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ آغا حیدر حسن صاحب دہلوی۔ حضرت ملا واحدی صاحب۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ شوکت تھانوی۔ جناب سید حامد۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ جناب شمس الرحمن فاروقی ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ جناب مجتبیٰ حسین۔ پروفیسر انور صدیقی۔ مفتی شوکت علی فہمی۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔ جناب عابد علی خاں۔ دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی۔ پروفیسر مشیر الحق۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ۔ ڈاکٹر خالد محمود۔ جناب دویا پرکاش سرور تونسوی۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی۔ پروفیسر مسعود حسین خاں۔ جسٹس جاوید اقبال (فرزند علامہ اقبالؒ)۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ جناب ضیاء الدین برنی۔ مولانا صلاح الدین احمد۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ متین امروہوی۔ خواجہ سید مہدی نظامی اور راقم الحروف حسن ثانی نظامی۔

رسم اجراء کے جلسے کی صدارت حضرت خواجہ صاحب کی حیات اور خدمات کے عنوان سے منعقد ہونے والے سیمینار کے ساتھ ہی پروفیسر خلیق احمد نظامی جیسی عظیم ہستی نے فرمائی جن کی مثال فی زمانہ علمی دنیا میں کم ہی ملے گی۔ رسم اجراء محترمہ قرۃ العین حیدر کے دست مبارک سے ادا ہوئی۔ وہ اس طرح کے جلسوں میں عام طور پر شرکت کم ہی فرماتی ہیں۔ لیکن انھوں نے از راہ کرم ہماری درخواست کو شرف قبولیت عطا فرمایا اور کتاب نما کے خواجہ نمبر کا اجراء فرماتے وقت ایک نہایت جامع اور یادگار تقریر بھی فرمائی جو اسی شمارے میں کسی اور جگہ درج کی جا رہی ہے۔

محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ کا نام آج کی اردو دنیا میں سب سے بڑا نام ہے اور ایسا نام ہے جس کے کمال کا اعتراف دوسری زبانوں کے اہل نظر بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ مختلف اداروں کی طرف سے ان کی خدمت میں اتنے اعزازات اب تک پیش کیے جا چکے ہیں جن کی تعداد بھی شاید سب کو یاد نہ ہو اور یہ بات تو یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ کسی اردو ادیب کی خدمات اور کمال کا اعتراف اس درجے کسی اور زبان کے ماہرین کی طرف سے اب تک نہیں ہوا تھا۔ جیسا اعتراف عینی آپا کے فن کا کیا گیا ہے۔ ان کی تخلیقات کے ترجمے متعدد زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور انگریزی داں اور ہندی داں بھی ان سے اسی طرح واقف ہیں جس طرح اردو والے واقف ہیں۔

ہم لوگوں کے لئے مزید خوشی کی چیز یہ بھی ہے کہ وہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی اولاد اور یادگار ہیں اور ان کے والد ماجد مرحوم سجاد حیدر یلدرم صاحب حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے خاص دوستوں میں رہے ہیں۔ اور حضرت خواجہ حسن نظامیؒ نے اپنے دوسرے صاحبزادے

خواجہ سید علی نظامیؒ کی بڑی لڑکی کا نام قرۃ العین انہی کے نام پر رکھا تھا اور خواجہ صاحب کی یہ پوتی انہی کے نام نامی پر اپنے گھر میں عینی پکاری جاتی ہیں۔ جس زمانے میں قرۃ العین نظامی کی ولادت ہوئی ہے۔ محترمہ قرۃ العین حیدر کی تحریروں کے ڈنکے بجنے شروع ہو گئے تھے اور میرے بڑے بھائی خواجہ علی نظامی مرحوم ان کی تحریر کے خاص قدر دانوں میں تھے۔

یہاں یہ بات بھی بیان کرنے اور ریکارڈ پر لانے کی ہے کہ ایک دفعہ محترمہ عینی آپا درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ میں حاضر ہوئیں تو میں نے حضرت امیر خسروؒ کے پہلو میں کھرنی کا وہ تاریخی درخت ان کو دکھایا جس کا ذکر سر سید احمد خاں صاحب نے آثار الصنادید میں کیا ہے اور جس کا ذکر غالب کے خطوط میں بھی آیا ہے۔ اور جس کے بارے میں روایت ہے کہ یہ درخت حضرت مخدوم سید جلال الدین جہانیاں جہاں گشتؒ نے خود اپنے دست مبارک سے درگاہ شریف میں لگایا تھا اور یہ سینکڑوں برس سے ہرا بھرا ہے۔ اس وقت عینی آپا نے بتایا کہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ ان کے جد اعلیٰ تھے۔ میں نے فوراً عرض کیا کہ تب تو آپ کو بھی کھرنی کا ایک درخت حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی درگاہ میں اپنے دست مبارک سے لگانا چاہیئے تاکہ بزرگوں کی سنت جاری اور قائم رہے۔ انھوں نے از راہ کرم میری درخواست منظور فرمائی اور ان کا نصب کردہ درخت ماشاء اللہ ان کے دادا کے لگائے ہوئے درخت کی طرح خوب پھل پھول رہا ہے۔

اس جلسے میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ایک اور برگزیدہ شخصیت نے شرکت فرمائی۔ میری مراد محترمہ شیلا کول صاحبہ وزیر تعمیرات و شہری ترقیات حکومت ہند سے ہے۔ ان کے شوہر مرحوم کول صاحب کو سر سید احمد خاں مرحوم کے پوتے اور حضرت خواجہ صاحبؒ کے خاص قدر دان اور دوست سر راس مسعود علیہ الرحمہ نے بیٹا بنا رکھا تھا۔ کول صاحب نے سر راس مسعود کی سرپرستی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور ان کا خاندان ہندوستان کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کے اعلیٰ ترین نمونے کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ سر راس مسعود کی منہ بولی بہو یقیناً حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی منہ بولی بہو بھی کہلائی جا سکتی ہیں کہ مسعود صاحب اور خواجہ صاحب میں برادرانہ تعلق تھا اور خواجہ صاحب کی انشاء پردازی کے بارے میں یہ بات سب سے پہلے سر راس مسعود ہی نے کہی تھی کہ خواجہ صاحب کے ہاں فرانسیسی انشاء پردازی کا رنگ ہے حالانکہ خواجہ صاحب فرانسیسی کیا انگریزی بھی نہیں جانتے۔

اس جلسے میں محترمہ عینی آپا کے بارے میں پروفیسر شمیم حنفی صاحب نے بہت اچھی تقریر فرمائی محترمہ شیلا کول صاحبہ نے بھی خالص اردو میں تقریر کی اور اپنے خاندان کی اعلیٰ تہذیبی روایات کا حق اس تقریر میں ادا کیا۔

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی حیات، کمالات اور خدمات پر محترمہ قرۃ العین حیدر کے علاوہ پروفیسر نثار احمد فاروقی۔ پروفیسر انور صدیقی۔ جناب فرخ جلالی اور جناب شمس کنول اور دوسرے اصحاب نے اعلیٰ درجے کے مقالات پڑھے اور تقریریں فرمائیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن نظامی صاحب اور جناب متین امروہوی اور جناب رفعت سروش نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

نظامی پیر بھائی ذکر شغل اور تلاوت وغیرہ میں رات دن مصروف رہے۔

شادیاں

حلقہ نظامیہ کی خبریں طویل وقفے کے بعد پیش کی جا رہی ہیں۔ اس دوران نظامی پیر بھائیوں اور پیر و مرشد حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے خاندان میں بہت سی شادیاں اور خوشیاں ہوئیں ان کا مختصر تذکرہ ان سطور میں کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ

خبریں مکمل نہیں ہیں۔

۱۸ مارچ ۱۹۹۴ء بروز جمعہ کراچی میں میرے ماموں زاد بھائی اور حضرت خواجہ سید ابن عربی نظامی کے صاحبزادے خواجہ سید طارق عربی نظامی کا نکاح عزیزہ کشور جمیل بنت جناب جمیل الرحمٰن صدیقی مرحوم کے ساتھ منعقد ہوا اور ۶ر جون ۱۹۹۴ء کو حضرت خواجہ سید ابن عربی نظامی کے نواسے اور سیدہ عابدہ بانو سلمہا اور جناب سید فضل الدین سید کے صاحبزادے سید فیضی سلمہ اور عزیزہ عائشہ سلمہا رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ اللہ تعالےٰ ان دونوں شادیوں کو مبارک فرمائے اور دولہا دولہن بزرگوں کے سایے میں پھلیں پھولیں اور شاد آباد رہیں۔

پچھلے دنوں حضرت خواجہ سید حسین نظامی رح اور سیدہ دل آرا بانو کے صاحبزادے خواجہ سید امان نظامی اور سیدہ فرح بانو بنت سیدہ روح بانو نظامی اور سید عبدالسلام کو اللہ تعالےٰ نے پہلا فرزند عطاء فرمایا جس کا نام سید عثمان والد نے تجویز کیا ہے۔ اس سے قبل خواجہ سید امان نظامی کے چھوٹے بھائی خواجہ عمران نظامی کو بھی اللہ تعالےٰ نے دوسرا فرزند عطاء فرمایا تھا۔ اللہ تعالےٰ ان دونوں بچوں کو نیک اور صالح بنائے عمر دراز عطا کرے دونوں ملکوں میں اتنی دوریاں ہوگئی ہیں کہ ان شادیوں اور ولادتوں کی اطلاع بھی ہم دہلی والوں کو عرصے بعد پہنچی۔

سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ کی ایک مشہور خانقاہ محمد آباد سلون ضلع رائے بریلی میں ہے۔ جہاں سلسلہ عالیہ نظامیہ سراجیہ کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ پیر محمد صاحب دائمی آرام فرمارہے ہیں۔ اس درگاہ کے سجادہ نشین حضرت شاہ احمد حسین جعفری کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سید ظہیر حسین جعفری جو دہلی یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ سے متعلق ہیں ۔ ۷ر مئی ۱۹۹۴ء کو خانقاہ کریمیہ سلون شریف میں سیدہ طیبہ سلمہا دختر سید غلام السیدین صاحب کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ میں نظامی برادری کی طرف سے حضرت شاہ احمد حسین جعفری سجادہ نشین ان کی والدہ ماجدہ بیگم حضرت شاہ محمد حسین جعفریؒ سابق سجادہ نشین اور دولہا کے دوسرے بھائی ڈاکٹر ولی حسین جعفری صاحب اور ڈاکٹر سید نقی حسین جعفری کی خدمت میں ہدیہ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

۸ر مئی ۱۹۹۴ء کو ادھونی میں ثنا خواں عبدالرحمٰن سلمہ فرزند مرحوم ثنا خواں عبدالرسول نظامی کی شادی پروین بانو بنت عالی جناب محمد اسمٰعیل صاحب سے ہوئی۔ دعوت نامہ خاندان کے سرپرست ثنا خواں عبدالوہاب نظامی کی طرف سے جاری ہوا۔

ادھونی ہی میں دوسری شادی کے نذیر احمد سلمہ اور عزیزہ شمس النساء عرف مبارک بیگم سلمہا دختر ڈی عبدالرسول صاحب کی ہوئی۔ دعوت نامہ حاجی کے عبدالمجید نظامی صاحب نے بھیجا۔

۸ر مئی کو عزیزم گٹو فیاض احمد نظامی کا نکاح مسنون عزیزہ عائشہ سلمہا دختر ایم قادر باشا صاحب کے ساتھ ہوا۔ دعوت نامہ دولہا کی والدہ بیگم عنایت اللہ نظامی کے نام سے جاری ہوا۔

یکم مئی ۱۹۹۴ء کو ادھونی میں عزیزہ نوربانو اور عزیزم کے رجب علی صاحب کا نکاح ہوا۔ دلہن حافظ محمد حیدر معروف بہ صاحب جان صاحب بانی حافظ پریس کی صاحبزادی ہیں جو جماعت نظامیہ کے سابق ناظم اور حضرت خواجہ حسن نظامی کے خلیفہ حضرت حافظ دادا میاں نظامی کے برادر زادے تھے۔ افسوس دلہن کے والد بیٹی کی شادی سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان کی اہلیہ کے ہاتھوں یہ مسنون فرض ادا ہوا۔

جناب عثمان بیگ نظامی سروگپا آندھرا کی صاحبزادی جی زیب النساء بیگم کی شادی این نذیر احمد صاحب کے ساتھ ۲۰ر مئی ۱۹۹۴ء کو سروگپا میں ہوئی۔

۵ / مئی کو کے ایم ابراہیم نظامی ساکن پامڑی کی صاحبزادی کی شادی شیخ بہاء الدین فرزند شیخ غلام حسین صاحب کے ساتھ ہوئی۔

۸ / اپریل کو مدرسے ملا اللہ بخش نظامی کی صاحبزادی مہربی سلمہا کا عقد مسنون کے حسین پیران ملہ فرزند کے حسن صاحب جاگیردار بڑا ٹمبوڑے کے ساتھ ہوا۔

۱۶ / مئی کو عزیزہ ثمینہ انجم نظامی سلمہا بنت چکولی محمد فاروق نظامی کی شادی عزیزم مستری محمد صادق فرزند مستری محمد اسمٰعیل صاحب نقشبندی کے ساتھ ہوئی۔

۵ / جون ۱۹۹۴ء کو بلاری کرناٹک میں منیار نظام الدین نظامی کے فرزند منیار عبدالکریم نظامی کا عقد حبیبہ بانو سلمہا دختر بارہ امام نظام الدین نظامی کے ساتھ اور منیار نظام الدین صاحب کی دختر منیرہ بیگم کا عقد مستری محمد غوث اشرفی کے ساتھ ہوا۔

۲۹ / مئی کو ممتاز پاشا نظامی کے لڑکے محمد یوسف پاشا کی شادی سلیمہ بیگم بنت سید مرتضیٰ صاحب زمیندار کے ساتھ ہوسپیٹ میں ہوئی۔

۱۹ / اگست ۱۹۹۴ء کو حیدرآباد کے سلسلہ عالیہ نظامیہ سلیمانیہ حافظیہ جیلیہ کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ حبیب علی شاہ ثانی کی پوتی اور حضرت حافظ پاشا جیلی کی صاحبزادی کی شادی خانہ آبادی سید افضل حسین سلمہ، فرزند سید عبدالبشیر صاحب سے بخیر و خوبی ہوئی۔

۹ / مئی ۱۹۹۴ء کو جے پور میں نقشبندیہ سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت مولانا انوار الرحمٰن صاحب بسمل کے صاحبزادے حضرت سید محبوب الرحمٰن نظامی نیازی کے دو فرزندوں صاحبزادہ سید خلیق الرحمٰن نیازی اور صاحبزادہ سید انعام الرحمٰن نیازی کی شادیاں بالترتیب سید فیض الحسن صاحب کانپوری اور سید آفاق احمد صاحب کاظمی اجمیری کی صاحبزادیوں کے ساتھ تزک و احتشام کے ساتھ ہوئیں۔ دونوں دولہا حضرت عزیز میاں صاحب مرحوم سجادہ نشین آستانہ عالیہ نیازیہ بریلی کے نواسے بھی ہوتے ہیں۔

۸ / اپریل ۱۹۹۴ء کو راولپنڈی میں برادر روحانی تمیز الدین نظامی کے صاحبزادے ڈاکٹر اسد تمیز الدین نظامی کا عقد مسنون عزیزہ لبنیٰ رحمٰن کے ساتھ ہوا جو جناب وصی الرحمٰن صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ دعوت ولیمہ ہوٹل ہالی ڈے ان اسلام آباد میں دی گئی۔ برادرم تمیز الدین نظامی صاحب برادر مرحوم محمد دین ملنسار نظامی کے فرزند ہیں اور وہ صاحبزادے تھے حضرت غلام نظام الدین خاکسار صاحب مرحوم کے جو شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے مربی خاص تھے۔ اور حضرت خواجہ صاحب کو خواجہ حسن نظامیؒ بنانے میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ وہ آج بھی حضرت خواجہ صاحبؒ کے پہلو میں آرام کر رہے ہیں۔

۱۶ / مئی ۱۹۹۴ء کو لکھنؤ میں مخلص قدیم جناب وقار الحسن صدیقی سابق ڈائرکٹر آثار قدیمہ و حال روح رواں رضا لائبریری رام پور کے صاحبزادے عزیزم راشد صدیقی کی شادی خانہ آبادی عزیزہ فقیہہ سلمہا بنت این ایم علوی صاحب کے ساتھ بصد شان و شکوہ ہوئی۔ دعوت ولیمہ کا اہتمام رام پور کے تاریخی رنگ محل میں تھا۔

میں ان شادیوں میں سے کسی شادی کی مبارکباد خود حاضر ہوکر اور شرکت کرکے پیش نہیں کرسکا اب حلقہ نظامیہ کے ذریعے یہ فرض ادا کیا جارہا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ پوری نظامی برادری مبارکباد اور دعاؤں میں شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب شادیوں کو کامیاب فرمائے اور سب خاندان ان شادیوں کی خوشیاں دیکھتے رہیں۔ آمین

بے مثل اور منتخب مطبوعات

کتاب	قیمت
ہندی ترجمہ قرآن نصف آخر (از حضرت خواجہ حسن نظامیؒ)	پچاس روپے
ہندی پارۂ عم	دس روپے
میلاد نامہ اور رسول بیتی	پندرہ روپے
قرآنی بول چال (مجلد)	دس روپے
تعلیم القرآن	پانچ روپے
اسلام کے ضروری عقائد	ایک روپیہ
اسلامی توحید	ایک روپیہ
آسان سبق کی پہلی	ایک روپیہ
یزید نامہ	بیس روپے
طمانچہ بر رخسار یزید	دس روپے
بیوی کی تعلیم	دس روپے
اولاد کی شادی	دس روپے
اعمال حزب البحر حصہ اوّل	بارہ روپے
اعمال حزب البحر حصہ دوم	چار روپے
مرشد کو سجدۂ تعظیم	تین روپے
اسرار کلام اللہ اور اسم اعظم	پندرہ روپے
تاریخ سلاطین عباسیہ حصہ دوم	چھ روپے
دہلی کی آخری شمع	پندرہ روپے
نظامی بنسری	ساٹھ روپے
منادی حضرت بابا فریدؒ نمبر	پندرہ روپے
منادی حضرت امیر خسروؒ نمبر	دس روپے

کتاب	قیمت
منادی حضرت خواجہ حسن نظامیؒ سیمینار نمبر	دس روپے
فائل منادی ۸۵ء ۸۶ء	بارہ روپے
تذکرۂ نظامی	پانچ روپے
تذکرۂ حضرت نظام الدین اولیاءؒ	پندرہ روپے
پریم سنگم (مہاراجہ کشن پرشاد اور اکبر الٰہ آبادی کے خطوط)	پانچ روپے
خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامیؒ	پندرہ روپے
دی ریلیجن آف پیس	پندرہ روپے
درس مادر	ایک روپیہ
اردو سبق باتصویر	ایک روپیہ
اتالیق خطوط نویسی	دس روپے
شیخ نظام الدین اولیاءؒ (انگریزی) پروفیسر خلیق احمد نظامی	تین سو روپے
شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ (انگریزی) " "	دو سو پچاس روپے
حضرت خواجہ حسن نظامی حیات و کارنامے	انتیس روپے
طب کی تاریخ	پانچ روپے
لڑائی کا گھر	دو روپے
خواجہ حسن نظامیؒ (کتاب نما کا خصوصی شمارہ)	پچھتر روپے
سفرنامہ مصر و شام و فلسطین و حجاز	پندرہ روپے
سفرنامہ پاکستان	چھ روپے
گائے کی جان بچانے کا بیان	تین روپے
کائنات بیتی	پانچ روپے
ایڈورڈ ڈائری (انگریزی)	دس روپے

مفلسی کا مجرب علاج	ایک روپیہ
ترکیب نماز	ایک روپیہ
تعلیم اسرار تصوف	پانچ۵ روپے
دہلی کی جاں کنی	بیس۲ روپے
بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ	بیس۲ روپے
فیوچر آف اسلام	دس روپے
دیوان حافظ مترجم	باون۵۲ روپے
مثنوی مولانا روم (مکمل سیٹ)	تین سو روپے
قصیدہ بردہ خورد	دس روپے
قصیدہ بردہ کلاں	تیس روپے
تاریخ مشائخ چشت (از پروفیسر خلیق احمد نظامی)	ایک سو بیس۱۲۰ روپے
خطبات غوثیہ	بیس روپے
مؤطا امام مالکؒ	چودہ۱۴ روپے
انتخاب صحاح ستہ	اٹھارہ۱۸ روپے
مشکوٰۃ شریف کامل (اردو)	چالیس۴۰ روپے
تجرید صحیح بخاری شریف کامل (اردو)	پچیس۲۵ روپے
صحیح مسلم شریف کامل (اردو)	تیس۳۰ روپے
ترمذی شریف کامل (اردو)	پینتالیس۴۵ روپے
اسلامی تعلیم (از مفتی محمود الوری)	تیس روپے
اسرار شریانیہ (کمالات حکیم نابینا)	پندرہ۱۵ روپے
حکومت اورنگ زیب کی اصلی تاریخ	دس۱۰ روپے
مبادیات اسلام	تین۳ روپے
تائید اسلام اور تردید الزام	دو۲ روپے
سوانح عمری خواجہ حسن نظامیؒ از ملا واحدی	دس روپے
قرآن مجید کے معجزات	دو روپے
القول الجلی ملفوظات حضرت شاہ ولی اللہؒ	ایک سو پچاس۱۵۰ روپے
تذکرۂ غازی بالے میاں	ایک روپیہ
وسائل معاش	دس روپے

فن انجینیری	دس روپے
معلومات تجارت	پانچ۵ روپے
مرغی انڈے کا بیوپار	پانچ۵ روپے
امت کی مائیں	چار۴ روپے
الزہرا (ناول)	چار۴ روپے
حضرت محمد اور اسلام	چار۴ روپے
بصائر	تین۳ روپے
مقدمہ شعر و شاعری از مولانا حالی	دس روپے
عمر بڑھانے کے طریقے	چار۴ روپے
مرقع کلیمی، از حضرت شیخ کلیم اللہ دہلویؒ	آٹھ۸ روپے
کشکول	آٹھ۸ روپے
سواء السبیل	دس روپے
عشرۂ کاملہ	دس روپے
مالابد کلیمی فی التصوف	پانچ۵ روپے
مخدوم صابری کلیریؒ	بارہ۱۲ روپے
فوائد الفواد	چھیانوے۹۶ روپے

خواجہ اولاد کتاب گھر
ڈاکخانہ حضرت نظام الدین
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

القول الجلی فی ذکر آثار الولی کا معرکۃ الآراء
مقدمہ اور اختتامیہ
از
حضرت مولانا شاہ ابو الحسن زید فاروقی مجددی
قیمت تین روپے

مدیر
واجہ حسن ثانی نظامی
معاونِ مدیر
خواجہ مہدی نظامی

مُنادِیًا یُنادِی لِلْاِیْمَان

بارگاہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ سے

ایمان اور امن کی ندا دینے والا

اور اُن کے جانشین

امام المشائخ شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی یادگار

ماھنامہ منادی نئی دھلی

منادی ۱۹۲۶ء سے جاری ہے یہ اُنہترویں جلد (۱۹۹۴ء) کا نواں شمارہ ہے

درگاہ
ـف اور منادی کے بارے میں
و کتابت کرنے اور قیمت
جمع کرانے کا پتہ
خواجہ حسن ثانی نظامی
ـاز حضرت نظام الدین اولیاء
ـئے دھلی ۱۳-۱۱

فہرست

سالانہ قیمت
ہندوستان میں
پچاس روپے
غیر ممالک سے
دس ڈالر
فی پرچہ
پانچ روپے

بقائے انسانیت کے سلسلہ میں

صوفیا کا طریقہ کار

مولانا جلال الدین عبد المتین
فرنگی محل لکھنؤ

بات کی ابتدا تو اللہ یا ایشور کے نام ہی سے ہے. جو نہایت مہربان اور انتہائی رحم والا ہے۔

اور سب تعریف تو ایشور یا اللہ کی ہی ہے. جو سب جگتوں کا پالن ہار ہے. جس کا کوئی ساجھی نہیں ہے جو نہایت رحم والا مہربان ہے اُس کا سلام محمدؐ آلِ محمدؐ اصحاب محمدؐ اور ان کے راستے پر چلنے والوں پر ہو۔

یہ تو سب نے دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جن کے پاس اللہ کی مخلوق جوق در جوق چلی آ رہی ہے۔ مخلوق کو ان کے پاس آنے سے ایک تسکین ہوتی ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ جس دکھ درد اور مشکل سے نجات پانے کے لئے اللہ کی مخلوق ان اللہ کے بندوں کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے. وہ دکھ دور بھی ہو جاتے اور مشکلات کا حل نکل آتے. لیکن ہوتا یہ ہے کہ انسان کو ان اللہ کے بندوں کے پاس بیٹھ کر دکھ درد کو برداشت کرنا آجاتا ہے۔ مشکلات میں ہراساں ہونے سے نجات مل جاتی ہے۔ مشکلات میں زندگی گزارنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ ان صوفیوں فقیروں اور سنتوں نے اللہ کی مخلوق کے غم کو اپنا غم سمجھا اور دعا اور دیگر تدابیر سے ان مشکلات کے حل کرنے کی کوشش کی۔ یہ صوفی اور سنت مخلوق کو بتا دیتے تھے کہ سارے معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ قادر مطلق رحیم اور کریم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جس غم کو ہم ایک بڑا غم سمجھ رہے ہیں اس میں اللہ کی کوئی مصلحت ہو اس غم کی وجہ سے اس دنیا یا آخرت میں کوئی بھلائی ہو۔

ان صوفیوں سنتوں کے پاس بیٹھنے سے انسان کی سمجھ میں یہ بھی آجاتا ہے کہ خواہشوں اور آرزوؤں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے کہاں تک ان کی خواہشات کی تکمیل ہوگی۔ خواہشات پوری نہ ہونے کی شکل میں انسان ملول ہو جاتا ہے۔ بعض مرتبہ تو یہ ہوتا ہے خواہشوں اور آرزوؤں کے پورا کرنے کے لیے انسان جائز اور ناجائز وسیلوں میں امتیاز نہیں کر پاتا ہے۔ یہ ناجائز وسائل اختیار کرنے والے ہمیشہ مضطرب اور بے چین رہتے ہیں۔ یہ اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ ان انسانوں کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا ہے کہ خلق خدا پر کیا بیت رہی ہے. بھوک افلاس رنج اور غم کی ماری دنیا سے انہیں کوئی مطلب نہیں ہوتا ہے یہ اپنی دنیا میں بظاہر مگن رہتے ہیں۔ لیکن جسے طمانیت قلب کہتے ہیں وہ انھیں حاصل نہیں ہوتی۔ ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ طمانیتِ قلب تو صرف اللہ کے ذکر سے ایشور کی پرارتھنا کرنے۔ بھگوان سے لو لگانے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ پھر بھی اگر ایسے انسانوں کو صوفیوں اور سنتوں کے قریب آنے کا موقع ملتا ہے اور ان سے عقیدت پیدا ہو جاتی ہے تو رفتہ رفتہ یہ بڑے لوگ اپنے سے کمتروں کو دیکھ کر سبق حاصل کرتے ہیں اور ایک عرصہ کے بعد یہ

لوگ اخلاق کے اعلیٰ معیار کے حامل ہو جاتے ہیں اور اللہ کی محبت
کی وجہ سے سارے انسانوں سے محبت ہو جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان فقیروں سنتوں کے پاس کیا ایسی چیز
ہے کہ ڈاکو، ظالم، بدکار، شرابی جواری اور ظالم برسر اقتدار
لوگ جب ایک مرتبہ ان کے پاس آنے جانے لگتے ہیں
تو سب اپنی برائیوں سے توبہ کر لیتے ہیں۔ تمام خانوادوں
قادری ہوں یا چشتی، سہروردی ہوں یا نقشبندی سب کے
سب اپنے مریدوں سے توبہ کراتے ہیں جس کو بیعت کہتے ہیں ان
مریدوں سے یہ عہد لیا جاتا ہے کہ آئندہ یہ لغویات سے
دور رہیں گے اور اگر انھوں نے اس عہد کو توڑا تو سراسر
انہیں کا نقصان ہے اس عہد وفا کو پورا نہ کرنے کی شکل
میں معلوم نہیں اس دنیا اور اُس دنیا میں کیا کچھ نہ بھگتنا
پڑے۔ اور اگر عہد وفا کو استوار رکھا تو اللہ ایسے لوگوں کو
بڑا اجر اور بڑا مرتبہ عنایت فرمائے گا۔

صوفی نہ تو فتویٰ دیتا ہے نہ کوئی فرمان پیش کرتا
ہے ان کے پاس نہ فوج ہوتی ہے نہ ہتھیار، نہ صوفی آج کل کی
طرح کوئی منظم تحریک چلاتے ہیں۔ نہ اپنے خلفاء اور مریدوں
کو لے کر گشت لگاتے ہیں۔ نہ یہ غلط کاروں سے کہتے ہیں
بھئی تم بدمعاشیاں چھوڑ دو نہ جواریوں سے جوا چھوڑنے
پر اصرار کرتے ہیں نہ شرابیوں کو شراب پینے سے روکتے
ہیں بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں

" نہ قاضیم نہ محدث نہ محتسب نہ فقیہہ
مرا چہ کار کہ منع شراب خوارہ کنم "

نہ تو میں قاضی ہوں نہ محدث نہ پولیس والا نہ
فقیہ، مجھے کیا کہ کوئی شراب پیئے جوا کھیلے یا دیگر لغو کام
کرے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ ان فقیروں کے پاس بیٹھنے سے
انسان سارے غلط کام چھوڑ دیتا ہے۔ پنجاب میں تو کیا
ہندو یا مسلمان جو شراب نہ استعمال کرتا ہو۔ برائیوں
میں نہ مبتلا ہو اسے صوفی کہتے ہیں۔ ہم کو آپ کو یہ تو معلوم
ہے کہ حضرت شاہ وارث علی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اتنے
لوگ آئے اور انسان بن گئے۔ حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ
کے ہاتھ پر کتنے بدکردار لوگوں نے آکر توبہ کی۔

مولانا عبدالرزاق فرنگی محلیؒ کے پاس طوائفوں نے
آکر اپنے پیشے سے توبہ کی۔ بداخلاق نواب اور جاگیرداروں
نے آپ کی خدمت میں حاضری دے کر اپنے کو پاک صاف
کر لیا اور اہل اللہ میں شامل ہو گئے۔ یہ تو آج سے
ڈیڑھ سو برس کے اندر کے ہم عصر بزرگ تھے۔ اس سے
قبل ایک بظاہر ان پڑھ بزرگ حضرت سید شاہ عبدالرزاق
بانسویؒ، کتنوں کو راہِ راست پر لے آئے۔ عالموں کے
غرورِ علم کو توڑنا سب سے مشکل کام ہے پڑھے لکھے جن سے
مقابلہ بہت مشکل ہوتا ہے، ہمارے سید صاحب نے
کتنے علماء کا غرورِ علم توڑ کر ان کو سرورِ محبت سے نوازا۔
ابھی حال ہی میں کاکوری کے حضرت شاہ حبیب قلندرؒ نے
معلوم نہیں کتنے دلوں میں شمع محبت فروزاں کر کے اعلا
اخلاق کا حامل بنا دیا۔

زمانہ قدیم کے بزرگوں کا خالی نام ہی لکھ دیا جائے تو
ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ
بابا فریدؒ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور خواجہ معین الدین چشتیؒ
نے تو پورے ہندوستان کو اپنی اخلاقی حکومت کے دائرہ
میں داخل کر لیا ہے۔ شہاب الدین سہروردیؒ، حضرت
شیخ عبدالقادر جیلانیؒ علی المہائمی داتا گنج بخشؒ تو تصوف
کے بہت بڑے ستون تھے تمام سلسلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ
پر ختم ہوتے ہیں۔ حضرت علیؓ کو نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم سے فیض ملا تھا بلکہ وہ سب کچھ جو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت
عثمانؓ کو عطا فرمایا تھا وہ سب ان لوگوں نے حضرت علیؓ
کو منتقل کر دیا تھا۔ اسی لئے آپ کو جامع ولایت محمدیہ
اور خاتم خلافت راشدہ محمدیہ کا خطاب حاصل تھا۔ پھر
آپ کی اولاد اور خلفاء سے یہ سلسلہ جاری رہا۔ سلسلہ
نقشبندیہ جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جاری
ہوا۔ اس کے سب سے بڑے شیخ حضرت علیؓ کے پوتے
حضرت امام جعفر صادقؒ تھے جن کا علمی اور روحانی فیضان

حضرت امام حنیفہؒ کے ذریعہ چار دانگ عالم میں جاری ہے
خود حضرت امام ابو حنیفہ تصوف کے ایک بہت بڑے
ستون تھے آپ اس واقعہ سے اندازہ لگالیں کہ آپ کے
پڑوس میں ایک شرابی رہتا تھا جو روزرات کو غل مچاتا
تھا، اور بلوہ کرتا تھا، جس کی وجہ سے آپ کی عبادت اور
علمی مشاغل میں خلل پڑتا تھا ایک مرتبہ رات کو اس کے
شور و غل کی آواز نہیں آئی سویرے معلوم ہوا کہ اس کو
پولیس پکڑلے گئی ہے، آپ نے کوتوالی جاکر اس شرابی کو
چھڑا لیا اور کہا یہ میرا پڑوسی ہے اور میرا جاننے والا ہے۔
آپ سوچیں کہ کیا حالت ہو گئی ہوگی اس شرابی کی۔ یہ تو حضرت
امام حنیفہ کا بے دام غلام بن گیا اور شراب تو کیا تمام
معائب اس سے دور ہوگیے۔

اس فقیر کے خیال میں تو سب سے بڑے صوفی
خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ آپ نے جب
اللہ کی طرف لوگوں کو بلانا شروع کیا تو باوجود ظاہری مفلسی
کے یہ کام کھانا کھلانے سے شروع کیا۔ چند کو چھوڑ کر
عرب سرداروں نے آپ کی سخت مخالفت شروع کی اور
درپے آزار ہوگئے۔ خود آپ کے گھر میں حضرت حمزہؓ
حضرت جعفرؓ اور حضرت علیؓ کے سوا مکہ میں کوئی ایمان
نہیں لایا گویا کہ بنو ہاشم میں کل تین، بنو امیہ میں صرف
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایمان لائے چند دوسرے
قبیلوں کے سربرآوردہ لوگوں میں خاص نام حضرت
ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کا ہے۔ ہاں غلاموں کمزور مردوں
اور عورتوں اور بے سہارا لوگ آپ کے گرد جمع ہوگیے
تھے اور اپنے دکھ درد کا مداوا چاہتے تھے۔ عرب کے سرداروں
کو اپنے نسب پر غرہ تھا سرداری کا غرور تھا۔ لیکن یہ
محبت کا جادو ایسا تھا کہ بعد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وآلہٖ وسلم کے صدقہ میں یہ سب بھی راہ راست پر آگئے۔
ان سب صوفیوں سنتوں فقیروں نبیوں اور
رسولوں کا طریقہ کار تو ایک ہی تھا۔ یہ سب اپنے معجزات
اپنی کرامات اور چمتکاروں کو اپنی طرف منسوب نہیں
کرتے تھے۔ یہاں تک بدمعاشوں ڈاکوؤں شرابیوں
جواریوں کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ معلوم نہیں اللہ نے
کیوں ان کو آزمائش میں مبتلا کیا ہے۔ صوفی بیمار کو اچھا
کرنا چاہتے تھے انھیں بیمار سے الجھن نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ
بیمار سے محبت کرتے تھے وہ بیماری خواہ جسمانی ہو یا
روحانی سب کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن
یہ نہیں سمجھتے تھے کہ "ہم" علاج کرسکتے ہیں بلکہ اس کا
یقین کامل تھا کہ جس اللہ نے بیماری دی ہے وہی شفا عطا
کرنے والا ہے۔ صوفیوں کے روحانی جدا علیٰ حضرت ابراہیم
علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے تھے کہ بیماری بھی
اللہ کی طرف سے ہے اور شفا بھی۔ اللہ ہی زندگی بخشتا ہے
اور وہی موت کے آغوش میں سلاتا ہے۔ غرض کہ ہر چیز کی
نسبت یہ صوفی اللہ یا ایشور ہی کی جانب کرتے تھے تمام
مخلوق کو اللہ کی مخلوق سمجھتے تھے۔ اللہ کی محبت کی وجہ سے
ہی یہ اللہ کی تمام مخلوق سے محبت رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ
یہ صوفی اللہ یا ایشور ہی کا حقیقی وجود مانتے تھے۔ باقی
موجودات کو مانتے ہی نہ تھے" ان سب کو اللہ کے موجود
کرنے سے عارضی وجود ملا ہے اور اس کے فنا کر دینے
سے سب فنا ہو جائیں گے۔" دوسرے الفاظ میں یوں کہیے
اللہ کا وجود حقیقی ہے اور سب مجازی وجود رکھتے
ہیں جو حقیقی وجود کا پرتو ہے۔
ہمارے صوفی حضرات اللہ تعالیٰ ہی کی نگاہ سے
سب کو دیکھتے تھے۔ موت اور حیات کی تشریح ان
کے یہاں بالکل دوسری طرز پر تھی۔

" زندگی کہتے ہیں کس کو موت کس کا نام ہے
مہربانی آپ کی نامہربانی آپ کی "

" ہر زماں میرم و ہر لحظہ شوم زندہ بجاں
گر زخندیدن تو گاہ زرنجیدن تو "

آپ کی ناراضگی میری موت ہے اور آپ کا مجھ سے
خوش ہونا میری زندگی ہے۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس
فقیر کے خیال میں سب سے بڑے صوفی تو احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں جن سے اللہ نے فرمایا ہے کہ قُلْ
إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ
رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ
وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ۝ اے رسول آپ کہہ دیں کہ میری
نماز میری قربانی میری زندگی میری موت سب اللہ کے لئے
ہے جو سب جہانوں کا پالن ہار ہے جس کا کوئی ساجھی
نہیں ہے اور اسی بات کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں نے
اسی بات کو سب سے پہلے تسلیم کر لیا ہے۔ یعنی کہنے کا
مطلب یہ ہے کہ نبیوں، ولیوں، صوفیوں نے آپ اپنے
کو بالکل اللہ کے سپرد کر دیا تھا اور اس شراب معرفت
سے خود بھی سیراب ہوتے اور خلق خدا کو بھی سیراب
کیا جس کی وجہ سے بقائے انسانیت کا دنیا میں بول بالا ہوا۔

یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں کے مشترک
بزرگ حضرت ابراہیمؑ تھے ان کی اولاد میں حضرت یعقوبؑ
تھے اور جن کے ایک چہیتے بیٹے حضرت یوسفؑ تھے میں جو
آگے قصہ بیان کرنے والا ہوں اس قصہ سے مجھے یہ بتلانا
مطلوب ہے کہ صوفیہ کا طریقہ کار بقائے انسانیت کے
سلسلہ میں کیا تھا۔

حضرت یعقوبؑ کے (۱۲) بارہ بیٹے تھے۔ دس
بیٹے ایک ماں سے دو چھوٹے بیٹے ایک ماں سے تھے یہ دونوں
چھوٹے بیٹے بوڑھے باپ کی توجہ کے زیادہ مستحق
تھے۔ ان میں سے ایک بیٹے کا نام یوسف تھا جو باپ
کے زیادہ چہیتے تھے ایک دن ننھے یوسف نے باپ سے
کہا کہ ابا میں نے رات کو خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے
چاند اور سورج مجھے سجدہ کر رہے ہیں باپ نے یوسف
سے کہا کہ بیٹا یہ خواب کسی سے بیان نہ کرنا۔ شیطان
جو انسان کا ازلی دشمن ہے اس کے بہکاوے میں آ کر
تمہارے بڑے بھائی کہیں تم کو کوئی نقصان نہ پہونچا دیں
معلوم ہوتا ہے تمہارے رب نے تم کو اس نعمت سے
نوازا ہے جو پہلے ابراہیمؑ اور آل ابراہیم اسحٰقؑ اسمٰعیلؑ
اور یعقوبؑ کو ملی تھی اور تم کو خواب کی تعبیر کا بھی علم دیا
گیا ہے۔ ادھر تو باپ بیٹے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں ادھر
بڑے بھائیوں کا جلسہ ہو رہا تھا کہ ہم بڑے ہیں ہم طاقتور
ہیں لیکن والد یوسف اور اس کے بھائی کو زیادہ چاہتے
ہیں ان پر زیادہ توجہ ہے والد سٹھیا گیے ہیں اب اس کا
علاج یہ ہے کہ یوسف کو قتل کر دیا جائے یا کہیں دور پھینک
دیا جائے اس کے بعد ہم لوگ نہایت شرافت کی زندگی بسر
کرنے لگیں۔ دیکھیے شیطان اور نفس امارہ انسان کو کس
طرح دھوکا دیتا ہے "ایک مرتبہ انتہائی غلط طریقے سے
معاملات کو اپنے حق میں استوار کر لو اس کام کے بعد
تم شرافت کی زندگی بسر کرنے لگنا" حالانکہ انسان جب
غلط راستے پر چل کھڑا ہوتا ہے تو اسے پیچھے دیکھنے کا کہاں
موقع، وہ تو برائی کے راستے پر آگے ہی بڑھتا رہتا ہے
یہی حال یوسف کے بڑے بھائیوں کا تھا۔ غرض کہ ایک
بھائی جو غالباً سب سے بڑا بھائی تھا جس کے دل میں
یوسف کے لئے کوئی نرم گوشہ تھا اس نے مشورہ دیا
کہ یوسف کو قتل نہ کیا جائے بلکہ کہیں دور ایک اندھا
کنواں ہے اس میں ڈال دیا جائے۔ بڑے بھائیوں نے
والد سے کہا "یوسف گھر پڑے پڑے گھبراتا ہوگا" ہم
مویشی چرانے جاتے ہیں ہمارے ساتھ جنگل میں بھیج دیا
کیجئے جنگل کی صاف ہوا اور سبزے میں یہ کھیلے گا اور
اور پروان چڑھے گا۔ والد نے جواب دیا تم لوگ
کھیتی باڑی میں مصروف ہوگے مویشیوں کی دیکھ بھال
کر رہے ہوگے مجھے ڈر ہے کہ کہیں کوئی بھیڑیا یوسف
کو اٹھا نہ لے جائے۔ بھائی بولے ہمارے ایسے ذمہ دار
طاقتوروں کے سامنے کیا مجال کہ کوئی بھیڑیا یوسف
کو کوئی نقصان پہونچا سکے غرض کہ ننھا یوسف
بھائیوں کے ساتھ جنگل جانے لگا۔ ایک دن یوسف
کو یہ بھائی بہت دور ایک اندھے کنویں کے پاس لے گیے
اور یوسف کی قمیص اتروا کر انھیں کنویں میں ڈھکیل
دیا شام کو قمیص نوچ ناچ اس پر جھوٹا خون چھڑک
باپ کے پاس روتے پیٹتے آئے کہ یوسف کہیں جنگل میں

نکل گیا تھا اسے بھیڑیا اٹھالے گیا ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہ خون آلود قمیص ملی ہے۔ اُدھر اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب کو آگاہی دے دی تھی لیکن والد نے لڑکوں کو جھٹلایا نہیں صرف اتنا کہا ''اللہ ہی مددگار رہے'' اس معاملہ میں جو تم بیان کر رہے ہو''

یہی طریقہ کار ہے صوفیوں کا وہ ہر معاملہ کو اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ بعد کو یہ بہکی ہوئی مخلوق اگر اللہ کی مرضی ہوتی ہے تو راہ راست پر آجاتی ہے۔ القصہ اس اندھے کنویں کے پاس سے کوئی قافلہ گزر رہا تھا جس کو معلوم نہ تھا کہ یہ کنواں اندھا ہے پانی کی تلاش میں کسی نے اس میں ڈول ڈالا اس میں ایک چھوٹے لڑکے کو دیکھ کر وہیں سے چلایا ''اماں دیکھو تو اس کنویں میں تو ایک پیارا بچہ ہے'' قافلہ والوں کو مفت کا مال ملا تو کھوٹے سکوں کے عوض اسے بیچ دیا کہ جو ملے سو غنیمت ہے۔ ایک سے دوسرے تک بکتے بکتے آخر کار شاہی محل کے لیے یوسف خرید لیے گیے وہاں وہ خوب پروان چڑھے اور روحانی ترقیاں بھی ہوتی رہیں خواب کی تعبیر کا علم بھی اللہ نے عطا فرمایا۔ یوسف خوب صورت تو تھے ہی جوان ہو کر مردانہ حسن کا ایک مکمل نمونہ بن گیے۔ یوسف کے مردانہ حسن پر ملکہ کا دل آگیا۔ یوسف کو خلوت میں بلایا۔ یوسف نے بچنا چاہا چھینا جھپٹی شروع ہوئی۔ یوسف بھاگے ملکہ نے دامن پکڑا دامن پھٹا آواز سن کر محل کی منتظمہ آگئی ملکہ نے کہا کہ ''یہ غلام میری بے عزتی کرنا چاہتا تھا''۔ یوسف نے کہا الٹا چور کوتوال کو ڈانٹ رہا ہے یہ عورت مجھے ورغلا رہی تھی۔ منتظمہ نے فیصلہ کیا کہ یوسف کے کپڑے دیکھے جائیں، سامنے کا دامن اگر پھٹا ہوگا تو یوسف گناہ گار ہے پیچھے کا دامن پھٹا ہوگا تو ملکہ غلط کار ہے۔ دیکھا گیا تو پیچھے کا دامن تار تار تھا۔ یوسف کی بے گناہی ثابت۔ لیکن شاہی محل کی عزت کے مقابلہ میں ایک غلام کی کیا حقیقت معاملہ دبا دیا گیا ملکہ کو وارننگ دے دی گئی۔ یوسف کو دھمکایا گیا کہ بس اب اس معاملہ کو ختم کر دو۔ بات چھپانے سے کہیں چھپتی ہے محل کی بیگمات میں چہ می گوئیاں شروع ہوئیں کہ ملکہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایک غلام پر لٹو ہو گئی ہیں۔ ملکہ کے کانوں تک عورتوں کی چہ می گوئیوں کی خبر پہونچی ملکہ نے شہر کی معزز بیگمات کی دعوت کی سب جب جمع ہو گئیں تو ان کے ہاتھوں میں چھریاں دی گئیں ان سے نیبو کاٹنے کو ملکہ نے کہا اُدھر پردے کے پیچھے۔ یوسف تھے ان کو آواز دے کر بلایا یہ بیگمات۔ یوسف کے حسن و جمال کو دیکھ کر بھوچکا ہو گئیں بجائے نیبو کاٹنے کے اپنی انگلیاں کاٹ لیں کہنے لگیں یہ تو ملکوتی حسن ہے ملکہ بولی کیوں ''اسی کے لیے تم سب مجھے لعنت ملامت کرتی تھیں''، ''اگر یوسف نے میری بات نہیں مانی تو میں اس کو ذلیل کر کے جیل میں ڈال دوں گی''۔ یوسف دل ہی دل میں اللہ سے دعا کر رہے تھے اے رب مجھے جیل عزیز ہے لیکن جس طرف ملکہ مجھے بلا رہی ہے اس سے اے اللہ تو مجھے بچالے۔ اللہ نے یوسف کی دعا سن لی۔ اور انھیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ جیل میں یوسف علیہ السلام نے اپنا صوفیانہ کام شروع کر دیا لوگوں کی دل جوئی کی، مصیبت میں ہراساں نہ ہونا، لوگوں کو خواب کی تعبیر بتانا، یہ تھے وہ کام جو جیل میں حضرت یوسف علیہ السلام انجام دے رہے تھے۔ ایک دن دو قیدی حضرت یوسف کے پاس اپنے اپنے خوابوں کی تعبیر پوچھنے آئے ایک نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ میرے سر پر کچھ ہے جسے پرندے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں دوسرے نے کہا کہ میں نے خواب دیکھا کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں حضرت یوسف نے کہا ابھی کھانا تقسیم ہونے میں کچھ دیر ہے کھانا آنے سے پہلے میں تمہیں خواب کی تعبیر بتا دوں گا۔ یوسف نے کہا دیکھو یہ جو خواب کی تعبیر کا علم ہے یہ مجھے اللہ نے ہی عطا فرمایا ہے۔ میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ دیا جو اللہ پر یقین نہیں رکھتے ہیں اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ میں نے تو اپنے باپ دادا ابراہیمؑ اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا مذہب اختیار کر لیا ہے میرے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ میں اللہ یا ایشور کا کوئی ساجھی مان لوں یہ جو کچھ مجھے حاصل ہوا ہے اس میں میری

کوئی خوبی نہیں ہے یہ تو اللہ کا فضل و کرم ہے۔ جو ہم پر اور
دوسرے اہل یقین پر ہے لیکن اکثر لوگ اللہ کا ناشکرا پن
کرتے ہیں۔ دیکھا آپ نے ایک صوفی کس طرح اپنی بڑائی
اپنی عبادت یہاں تک اپنے ایمان تک کو اپنی طرف نہیں
منسوب کرتا ہے بلکہ اس کو اللہ کا فضل و کرم ہی کہتا ہے۔
خیر۔ یوسفؑ نے پھر ان قیدیوں سے کہا کیوں بھائی
تمہارا کیا خیال ہے ایک اللہ کی پرستش بہتر ہے یا ہزار
خداؤں کو ماننا ٹھیک ہے اور یہ جو ایشور کو چھوڑ کر
ہزاروں کی پرستش ہوتی ہے جن کے لیے تم نے اور
تمہارے باپ دادوں نے فرضی نام رکھ چھوڑے ہیں
ایشور نے تو ان کے متعلق کوئی دلیل اتاری نہیں ہے۔ حکم
تو ایشور ہی کا چلتا ہے جس نے یہی حکم دیا ہے کہ اس ایک
ایشور کو چھوڑ کر کسی کی عبادت نہ کرو یہی دھرم ہے یہی
مذہب ہے۔ یہی مضبوط عقیدہ ہے بہت سے لوگ اس معاملہ
میں اللہ یا ایشور سے بالکل بیگانہ ہیں۔ اے قیدی بھائیو
جس نے اپنے آپ کو شراب کشید کرتے ہوئے دیکھا
ہے اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ بادشاہ کا ساقی بنے گا اور
اس کا مقرب ہو جائے گا۔ جس نے اپنے سر پر رکھی ہوئی
چیزوں کو دیکھا ہے کہ اسے پرندے کھا رہے ہیں اس
کی تعبیر یہ ہے کہ اس کو پھانسی پر لٹکایا جائے گا اور اس کا
بھیجا پرندے کھائیں گے بس یہ تھی تمہارے خواب کی تعبیر۔
دیکھا آپ نے ایک صوفی جس کو خواب کی تعبیر کا علم اللہ
عطا فرماتا ہے وہ اپنی بڑائی جتانے کے لیے اسے استعمال
نہیں کرتا ہے بلکہ لوگوں کو بھٹکنے سے بچانے کے لیے اپنی ان
تمام طاقتوں کو استعمال کرتا ہے۔ جو اللہ نے اسے عطا فرمائی
ہیں۔ غرض کہ جس کے متعلق یوسف کو یقین تھا کہ وہ بادشاہ
کا مقرب ہو گا اس سے کہا کہ "میرے معاملہ کو تم بادشاہ
سے بیان کرنا اور میری بے گناہی کو بتانا"۔ یہاں بھی دیکھیے
کتنی عظیم روحانی طاقت حضرت یوسف علیہ السلام کو
اللہ نے عطا فرمائی تھی لیکن اپنے معاملہ کے لیے یوسف
علیہ السلام نے اسے نہیں استعمال کیا اس کے لیے ظاہری
تدبیر ہی اختیار کی یہ بڑا مشکل کام ہے۔ جو ایک عظیم صوفی
ہی انجام دے سکتا ہے۔ یہ قیدی جب بادشاہ کا مقرب
بن گیا تو یوسف علیہ السلام کو بھول گیا ایک رات بادشاہ نے
خواب میں دیکھا کہ سات دبلی گائیں سات موٹی گایوں کو
کھا گئیں۔ یہ موٹی گائیں تر و تازہ تھیں اور دبلی گائیں بالکل
سوکھی مرجھائی تھیں۔ بادشاہ خواب سے بیدار ہوا تو
بہت متوحش تھا اس نے دربار بلایا اور درباریوں
سے اس خواب کی تعبیر پوچھی درباریوں نے عرض کیا یہ
سب خواب پریشان ہیں خواب و خیال کی باتوں کی تعبیر
ہم نہیں جانتے ہیں اب بادشاہ کے مقرب ساقی کو خواب
کی تعبیر کی بات پر یوسف علیہ السلام یاد آتے وہ دوڑا
دوڑا یوسف علیہ السلام کے پاس آیا اور کہنے لگا یوسف
تم سچے تمہاری تعبیریں صحیح، اب بتاؤ بادشاہ نے
ایسا خواب دیکھا ہے اس کی تعبیر کیا ہے؟ یوسف
علیہ السلام نے فرمایا تعبیر اس خواب کی یہ ہے کہ سات سال
تک غلہ خوب پیدا ہو گا پھر سات سال سخت قحط پڑے گا
یہاں تک اچھی فصل کا جمع شدہ غلہ سب ختم ہو جائے گا پھر
بڑا سخت زمانہ آئے گا لوگ دانہ دانہ کو محتاج ہو جائیں گے
بالکل بگڑ جائیں گے یہ مقرب، ساقی بادشاہ کے پاس
گیا پچھلے واقعات اور جو یوسف علیہ السلام نے اس
خواب کی تعبیر بتائی تھی وہ سب باتیں بادشاہ کو
سنا دیں بادشاہ نے کہا اچھا یوسف کو بلاؤ۔ حضرت
یوسف نے کہا کہ جب تک کہ میری بے گناہی قانوناً
ثابت نہ ہو جائے میں جیل سے باہر آنے کا نہیں دیکھیے
کیا کردار اللہ نے یوسف علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا محض
حکومت کے سربراہ کے مقرب ہونے کی بنا پر قانون
کے احترام کو ترک نہیں کیا حضرت یوسف نے کہا
محل کی منتظمہ کو بلایا جائے جس نے میرے پشت کے پھٹے
دامن سے میری بے گناہی مان لی تھی۔ ان بیگمات کو
بھی بلایا جائے جنھوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں
اور جن کے سامنے ملکہ نے کہا تھا یوسفؑ نے اب تک

تو اپنے کو بچایا ہے آئندہ اس نے اگر میری بات نہیں مانی
تو میں اسے ذلیل کر کے جیل میں ڈال دوں۔ یہ سب
باتیں دیکھ کر ملکہ نے اپنے قصور کا اعتراف کیا ہاں میں
نے اسے خلوت میں بلانا چاہا تھا مگر اس نے اپنے
آپ کو بچا لیا اس پر حضرت یوسف نے فرمایا میں نے یہ
سب اس لیے کیا کہ معلوم ہو جائے کہ میں خیانت کا
مرتکب نہیں ہوں اور اللہ خیانت کاروں کی سازشوں
کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اور میری بے گناہی کا جہاں تک
تعلق ہے تو ہر انسان کا نفس امارہ اس کو برائی کی
طرف لے جاتا ہے اللہ جس پر رحم کرتا ہے وہ اپنے کو
بچا لیتا ہے اور اللہ ہی معاف کرنے اور رحم فرمانے والا
ہے دیکھیے یہاں حضرت یوسفؑ نے ملکہ کے خلاف
کوئی غصہ کسی نفرت کا اظہار نہیں کیا۔ اپنی بے گناہی
کو اللہ کے کرم پر مبنی قرار دیا اس طرح صحیح معنی میں
ملکہ نے دل سے توبہ کی ورنہ بھید کھل جانے پر اوپری
دل سے ملکہ توبہ کر لیتی لیکن دل کیسے پاکیزہ ہو جاتا۔ یہی
اسوہ یوسفیؑ بواسطہ اسوۂ محمدیؐ اللہ نے صوفیا کو
عطا فرمایا تھا اسی طریقہ کار سے وہ دشمنوں کے دلوں
میں گھر کر لیتے تھے بے ایمانوں کے دل ایمان سے روشن
ہو جاتے تھے بدکردار صاحب کردار ہو جاتے تھے
ظالم مظلوموں کے پاسبان بن جاتے تھے مٹتی ہوئی
انسانیت پھر سے زندہ و توانا ہو جاتی تھی۔

" وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ"

بادشاہ نے حضرت یوسفؑ کی ایمانداری اور
حسن کردار عقل مندی اور ذہانت کی بنا پر اپنا مقرب
کر لیا اور حاکم بنانا چاہا حضرت یوسفؑ نے اس
شرط کے ساتھ اس عہدے کو قبول کیا کہ وہ مالیات
وغیرہ پر مکمل اور با اختیار حاکم ہوں گے جسے بادشاہ نے
منظور کر لیا۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ اچھے اعمال کا صلہ
ضائع نہیں ہوتا ہے اور آخرت میں جو صلہ ملے گا وہ اس
سے کہیں زیادہ ہے۔ زمانہ گزرتا گیا سات سال خوشحالی
کے ختم ہو چکے قحط کی سختیاں اپنی انتہا پر پہونچ چکیں
حضرت یوسف نے ایک قسم کی راشننگ شروع کر دی۔
دیہاتوں سے لوگ غلہ کے تلاش میں شہر کی طرف اپنی
اپنی پونجیاں لے کر امنڈ آئے حضرت یوسف کے بھائی
بھی بال بچوں کی پریشانیوں اور بھوک کے علاج کے
لیے اپنی پونجی لے کر شہر میں سرکاری محل کے سامنے
اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ حضرت یوسفؑ
بذات خود راشن کے کام کی نگرانی کر رہے تھے اپنے سامنے غلہ
تقسیم کروا رہے تھے اور دیہات کا حال بھی دریافت
کرتے جاتے تھے حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کو دیکھا
اور پہچان لیا، بھائی نہ پہچان پائے حضرت یوسفؑ
نے تقسیم غلہ کے وقت بھائیوں سے گھر کے حالات
معلوم کیے تھوڑا سا غلہ دیا اور کہا کہ اپنے چھوٹے بھائی
کو لاؤ گے تب ہی تمہیں پورا راشن ملے گا بھائی گاؤں
واپس آئے سامان کھولا تو دیکھا کہ پونجی سب واپس
کر دی گئی ہے والد سے کہا آپ چھوٹے بھائی کو ساتھ
کر دیں تو پورا غلہ ملے گا والد نے کہا میں تم پر اس
بچے کے سلسلہ میں کوئی بھروسہ نہیں کر سکتا یوسف
کے معاملہ میں تم پر بھروسہ کر کے کیا پایا؟ بھائیوں
نے کہا اتنا سا غلہ تو چند دن کے لیے بھی کافی نہیں ہے
ہمارے بیوی بچے مر جائیں گے ہم آپ کو اللہ کا واسطہ
دیتے ہیں کہ اللہ کے بھروسے پر اس چھوٹے بھائی کو
ہمارے ساتھ کر دیں اس کو واپس لا کر آپ کے سامنے
پیش کر دیں گے جو کچھ ہم نے کہا ہے اللہ کو اس پر وکیل
بناتے ہیں۔ اللہ کا نام آنا تھا کہ حضرت یعقوبؑ نے سب
مصلحتوں کو بھلا کر چھوٹے بیٹے کو ساتھ کر دیا اور
کہا کہ دیکھو شہر میں الگ الگ دروازے سے
داخل ہونا۔ لڑکے باپ کے حکم کے مطابق الگ الگ
دروازے سے داخل ہوئے ایک دروازے سے
چھوٹا بھائی جب داخل ہوا تو حضرت یوسفؑ نے

لگ بلا کر اس سے کہا کہ میں تمہارا بھائی یوسف ہوں جو کچھ تمہارے ساتھ کیا جائے اس سے تم پریشان نہ ہونا۔ جب سب بھائی جمع ہو گئے تو ان کو غلہ دے دیا گیا اور چھوٹے بھائی کے غلے کے جھولے میں عملہ والوں نے ناپ کا پیالہ چھپا دیا۔ سب بھائی خوشی خوشی روانہ ہوئے ابھی کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ سرکاری عملہ والے پیچھے سے پکارے اے قافلہ والو تم چور ہو قافلہ والوں نے مڑ کر دیکھا اور کہا کہ تمہیں معلوم ہے ہم غریب دیہات والے چور نہیں ہیں اور یہ تو بتاؤ کہ کیا چیز چوری ہوئی ہے۔ سرکاری عملہ والوں نے کہا کہ ناپ کا پیالہ غائب ہے۔ یوسف کے بھائیوں نے کہا کہ تلاشی لی جائے جس کے مال میں پیالہ برآمد ہو گا وہی چور ہے تلاشی شروع ہوئی آخر میں یوسفؑ کے چھوٹے بھائی کے غلہ کے تھیلے سے ناپ کا پیالہ برآمد ہوا اور اسے پکڑ لیا گیا بھائی کہنے لگے کہ اس نے چوری کی ہے تو اس کا بھائی یوسف بھی چوری کرتا ہو گا غرض کہ چھوٹے بھائی کو پکڑ کر لے گئے سب بھائی حاکم سے بولے ہم میں سے کسی ایک کو اس چھوٹے بھائی کے عوض پکڑ لیجئے ہمارے والد بوڑھے ہیں اس بچہ کے غم میں وہ پریشان ہو جائیں گے حاکم (حضرت یوسفؑ) نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چوری کرے کوئی پکڑا جائے کوئی یہ انصاف کے خلاف ہے جائیے اپنے باپ سے کہیے کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے کوئی شک ہو تو قافلہ والوں سے پوچھ لیا جائے۔ واپس لوٹ کر یوسف کے بھائیوں نے والد سے پورا واقعہ بیان کیا اور کہا اللہ سے بدعہدی ہم نے نہیں کی ہے۔ حضرت یعقوب نے سب سن کر کہا کہ "میرا بیٹا چور ہے" یہ کوئی گڑھی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال اللہ والوں کا طریقہ تو صبر ہی کا ہے۔ "عنقریب سب ساتھ واپس آئیں گے اللہ بڑا علم والا اور مصلحتوں کا جاننے والا ہے"، اور لڑکوں کی طرف سے اپنا رخ پھیر لیا اور کہنے لگے " ہائے میرا یوسف" اس غم اور صدمہ سے ان کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ بھائی کہنے لگے ابا کیا یوسف کے غم میں آپ اپنے کو ہلاک کر لیں گے۔ حضرت یعقوبؑ نے کہا مجھے تم سے کچھ لینا دینا نہیں ہے اپنا غم، اپنا شکوہ اپنی پریشانی سب کچھ مجھے اللہ ہی سے کہنا ہے۔

اے بیٹو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے اللہ کی رحمت سے تو اللہ کو نہ ماننے والے ہی مایوس ہوتے ہیں جاؤ اور اپنے چھوٹے بھائیؑ کی فکر کرو بھائی حضرت یوسفؑ کے پاس آئے ان سے یہ تو نہ کہا کہ ہم اپنے بھائی کو واپس لینے آئے ہیں۔ ہو سکتا اس پر خوش ہوں کہ یوسف سے چھٹکارا مل گیا تھا اب اس بھائی سے بھی نجات ملی۔ خیر حاکم صاحب سے کہنے لگے ہمارے پاس اب معمولی سی پونجی ہے آپ صدقہ خیرات کریں اور ہمیں غلہ عطا فرمائیں حضرت یوسف نے کہا سنو! کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اب بھائیوں نے حضرت یوسف کی طرف دیکھا اور کہا کیا آپ یوسفؑ ہیں حضرت یوسفؑ نے فرمایا ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے اللہ نے ہم پر بڑا اکرم کیا ہے۔ جو اللہ سے ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے اللہ اس کے حسن عمل کو ضائع نہیں کرتا ہے جاؤ تمہاری کوئی سزا نہیں ہے اللہ تم کو معاف کرے وہ بڑا ہی رحم کرنے والا ہے۔ دیکھا آپ نے حضرت یوسف نے یہ نہیں کہا جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا بلکہ معافی کا تعلق اور رحم کا معاملہ اللہ سے جوڑ دیا اور اس معاملہ میں بھائیوں کا بھی اللہ سے تعلق قائم کرا دیا یہ ہے صوفیوں کا طریقہ کار جس سے انسان کا دل پاک اور صاف ہو جاتا ہے اللہ نے اپنے اوپر یقین رکھنے والوں پر اس کا احسان رکھا ہے کہ اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا کہ وہ اللہ پر یقین رکھے

رکھنے والوں کا تزکیہ نفس کر دیتے ہیں۔ خیر۔ حضرت
یوسفؑ نے اپنی قمیص بھائیوں کے سپرد کی اور کہا
جائیے اسے والد کی آنکھوں سے لگائیے اس میں روشنی
آجائے گی پھر آپ سب والد والدہ کے ساتھ واپس
آجائیے ادھر یہ قافلہ روانہ ہوا ادھر گاؤں میں حضرت
یعقوبؑ نے کہنا شروع کیا "مجھے یوسف کے
پیراہن کی خوشبو آرہی ہے" گاؤں والوں نے
کہا یوسف کے غم نے آپ کے دماغ پر اثر کیا ہے
کہاں یوسف کہاں ان کا پیراہن۔ قافلہ واپس آگیا
حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسف کے زندہ رہنے کی
خوشخبری دی گئی اور ان کے چہرے پر حضرت یوسفؑ
کا کرتا ڈالا گیا۔ آنکھوں کی روشنی واپس آگئی۔ بڑے
بھائیوں نے کہا ابا ہمیں معاف کریں ہم بڑے خطاکار
ہیں۔ یہاں بھی والد نے خطا کی معافی کو اللہ پر چھوڑا
اور کہا میں اللہ سے تمہارے لیے مغفرت طلب کروں گا
اور وہی غفور الرحیم ہے حضرت یوسف نے
والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب سجدہ ریز ہوگئے
حضرت یوسفؑ نے والد سے کہا کہ یہی تعبیر ہے اس خواب
کی جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا کہ چاند سورج اور
تارے میرے سامنے سجدہ ریز ہیں یہ اس مقالہ
کا ماحصل یہ چند نکات ہیں۔

(۱) اللہ والے یعنی صوفیا چیزوں کی نسبت اپنی طرف
نہیں بلکہ صرف اللہ کی طرف کرتے ہیں۔ یہ بدکاروں
سے ان کی سطح پر آکر بات کرتے ہیں۔ ان پر اپنی بڑائی
نہیں جتاتے ہیں۔

(۲) ہر خطاکار کو شرمندہ کرنے کے بجائے
اس کی دلجوئی کرتے ہیں اور اس کی خطا ظاہر ہوجانے
پر اس کے لیے معافی طلب کرنے کے باوجود اس کی
معافی اللہ سے طلب کرتے ہیں اور براہ راست اور
اپنے وسیلے سے اس بندے کو اللہ سے ملا دیتے ہیں۔

(۳) انسان کے قلب کی صفائی پیار محبت اور
سب سے زیادہ للّٰہیت کے ذریعہ کرکے اسے انسانیت
کے معراج تک پہونچا دیتے ہیں۔

فقیر نے اس مقالہ میں انبیاء کو صوفیوں کا
سردار لکھا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صوفیاء
کا سرتاج لکھا ہے۔ اس معاملہ کو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ
پر یقین رکھنے والے چار طرح کے ہوتے ہیں۔

(۱) سالک۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ پر یقین کے ساتھ
شریعت پر عمل کرتے ہیں امکان بھر اپنے نفس کو کوتاہیوں
سے بچاتے ہیں اور غلطی ہوجانے پر توبہ کرتے ہیں ان
میں جذبہ نہیں ہوتا ہے یہ کسی دوسرے کو فائدہ نہیں
پہونچا سکتے ہیں۔

(۲) مجذوب۔ ان لوگوں کی جذبی کیفیت بڑھی
ہوتی ہے اور وہ اللہ کی محبت میں اتنے سرشار ہوتے
ہیں کہ وہ مثل پاگلوں کے ہوجاتے ہیں۔ ان سے عام آدمی
کو کوئی دینی فائدہ نہیں پہونچتا ہے۔

(۳) سالک مجذوب۔ ان میں جذبہ کم ہوتا
ہے لیکن ہوتا ہے یہ مخلوق کی رہنمائی محدود پیمانے پر کرتے
ہیں۔

(۴) مجذوب سالک۔ یہ اللہ کی محبت میں
بالکل سرشار ہوتے ہیں لیکن مخلوق کے سامنے نہایت
خوش اطوار خوش مزاج ان کے ہمدرد اور اللہ کے
لیے اللہ کی مخلوق سے انتہائی محبت کرنے والے ہوتے
ہیں یہی صوفیا ہوتے ہیں ان میں سب سے افضل
امت محمدیؐ کے وہ لوگ ہیں جنہیں درجہ محبوبیت بطفیل
محبوبیت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عطا ہوا ہے مثلاً
محبوب سبحانی حضرت عبدالقادر جیلانیؒ اور محبوب الٰہی
حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور وہ سب صحابہ جو سابقین
اولین میں سے تھے ان سے افضل انبیاء کرام ہیں جو اللہ
کے محبوب تھے بطفیل اور محبوبیت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم ان کو نبوت اور رسالت بھی عطا ہوتی ہے جن کے
صدقے میں سب کو محبوبیت بھی ملی ہے۔ خود احمد کہتے

باقی صفحہ ۳۴ پر

خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری

ایک جائزہ

از جناب حافظ تقی انور علوی کاکوروی

اودھ کے نامور قصبات میں جو شہرت وامتیاز اور
ردم خیزی قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ کو حاصل رہی ہے وہ
ورخین اور ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس قصبہ نے
ہر دور میں اپنی سرزمین سے وہ نامور ہستیاں پیدا کیں جو
علم وعمل کے آسمان پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکیں اور
اپنی ضیا پاشیوں سے دور و نزدیک کے علاقے روشن
کر دیئے۔ اس قصبہ نے جہاں ایک طرف عمائدین اور
ارباب دولت وثروت پیدا کیے وہاں دوسری طرف
علماء، فضلاء، شعراء، ادباء، فقہا اور فقرا ومشائخ
سے بھی اپنی سرزمین کو مالا مال کیا جن کی جد وجہد،
عبادت وریاضت، تدبر وسیاست، زور قلم
اور زور بیان نیز علمی خدمات قصبہ کی مردم خیزی
میں مزید اضافہ کا باعث ہوئیں۔ یہاں کے عظیم المرتبت
صوفیوں اور بزرگوں کا روحانیات، اخلاقیات
اور سماجیات میں ملک کے گوشہ گوشہ میں دخل
رہا ذہنی انقلاب کے دھاروں نیز ہند وپاک تقسیم
کی بدولت جیسے اودھ کے دوسرے قصبات کے
لوگ وہاں منتقل ہوتے خصوصیت سے اس قصبہ
کے تقریباً نوے فی صد باشندوں نے غریب الوطنی
کو حب الوطنی پر ترجیح دے کر اپنی دوسری دنیا بسالی
اور یہاں کے در و دیوار کو افسردہ اور ماتم زدہ
کر گئے۔ گو کہ اس ملک کے بھی گوشہ گوشہ کو انھوں
نے اپنی سرگرمیوں سے لالہ زار بنا دیا اور علم وادب
کے افق پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکے۔ لیکن اس
قصبہ کے مستقبل کو تیرہ وتار کر دیا۔ اہل کاکوری دنیا
کے جس خطہ میں بھی رہے اپنی مخصوص روش، وضعداری
اور بعض خصوصیات کی بنا پر ہمیشہ ممتاز رہے۔

اس قصبہ پر متعدد دور گذرے اور اس نے
نازک سے نازک تر دور میں حالات کا مقابلہ کیا اور
سپر نہ ڈالی کیوں کہ اس کے پس پشت لوگوں کے
قلب ماہیت کرنے والی وہ ہستیاں موجود تھیں جن کی
بروقت مدد اس کے مستقبل کو شاندار اور خوش آیند
بنانے میں ہمہ وقت مستعد اور مصروف تھی۔ پھر ایک
وقت ایسا آیا کہ برطانوی اقتدار کی نگاہوں نے قصبہ
کے مستقبل کو تاک لیا اور وہ مژدہ آزادی کے بجائے
طوق غلامی اور پا بہ زنجیری کا پیام زیاں لے کر آیا جو
شہیدان وطن کی سرفروشیوں سے رونما ہوا۔ باپ بیٹے
کا وطن کی خاطر بہ سر دار آنا کوئی ہنسی کھیل نہ تھا اور
انھوں نے جو اسکیم بنائی تھی وہ گو کہ آپس کے تعلقات
اور خرابیوں کی بنا پر عملی جامہ نہ پہن سکی لیکن بالکل
جداگانہ تھی۔ اس کا عملی جامہ نہ پہننے کا حالات پر داخلی
اور خارجی طور پر بڑا گہرا اثر پڑا جس نے اودھ کی
تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ کیا۔ (منشی رسول بخش
علوی شہید اور ان کے بیٹے منشی عبد الصمد صاحبان

جنگ آزادی کے ہیرو تھے۔ جنگ آزادی میں ان کے کارنامے اور پیش قدمی کے حالات اودھ کی تاریخ میں مفصل مذکور ہیں)۔

فخر اسلاف گرامی حضرت شاہ محمد کاظم قلندر (۱۷۴۵ء ــ ۱۸۰۶ء) نسباً علوی مخدوم زادہ اور حسباً عباسی تھے۔ آپ علوی سلسلۃ الذہب کی انتیسویں کڑی ہیں۔ آپ کے اجداد چنگیزی حملوں اور تاتاریوں کے پیہم انقلابات کی بدولت آستانۂ رسولؐ اور حجاز مقدس کی پاک سرزمین چھوڑنے پر مجبور ہوئے آپ کے جد اعلیٰ قاری امیر سیف الدین نے سکندر لودی کے عہد حکومت میں قصبہ کاکوری میں مستقل سکونت اختیار کرلی اس وقت سے لے کر اب تک ان کی اولاد کا وطن مالوف یہی قصبہ ہے قاری امیر سیف الدین کے باکمال نامور اور صاحب علم وعمل فرزند گرامی حضرت مخدوم قاری نظام الدین عرف شیخ بھکاری (۹۸۱ھ) تھے جو اپنی خداداد لیاقت اور فطری استعداد کی بدولت اپنے ہم عصروں میں نہ صرف ممتاز بلکہ ان سے سبقت لے گئے تھے۔ مورخین، تذکرہ نویس اور اہل قلم حضرات اپنی اپنی تصانیف میں ان کے ظاہری و باطنی کمالات کے معترف ہوئے۔ مثلاً مصنف "تذکرۃ الاصفیا" نے ان کو امام اعظم ثانی کے لقب سے یاد کیا۔ ملا عبد الرشید ملتانی نے "زاد الآخرت" میں ان کے کمالات بالتفصیل تحریر فرمائے۔ ملا عبد القادر بدایونی نے "منتخب التواریخ" میں عہد اکبری کے جلیل القدر علما میں شمار کیا۔ شیخ وجیہہ الدین اشرف لکھنوی نے "بحر زخار" میں ان کے فضل وکمال کا اعتراف کیا اور حضرت شاہ تراب علی قلندر نے ان کی مکمل سوانح "کشف التواری فی حال نظام الدین قاری" کے نام سے تحریر فرمائی۔

ملا عبد الکریم ابن حافظ شہاب الدین ابن حضرت مخدوم شیخ قاری نظام الدین عرف بھکاری نے علوم ظاہری و باطنی کی تعلیم اپنے جد بزرگوار سے حاصل کی اور بیعت واجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔ والد بزرگوار حافظ شہاب الدین نے حضرت مخدوم صاحب کے سامنے وفات پائی لہذا آپ بچپن سے ہی جد بزرگوار کے سایہ عاطفت وشفقت میں رہے۔ اور اٹھارہ[۱۸] سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے۔ علم تجوید موروثی تھا اور قرأت بھی خوب کرتے تھے۔ حسن سیرت وصورت کے ساتھ حسن صوت بھی خوب تھا۔ بعض اہم مسائل کی بنا پر جد بزرگوار کے حکم سے اپنی نوجوانی میں دہلی کے ارادہ سے روانہ ہوئے تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ جد محترم کی طبیعت کی ناسازی کا پتہ چلا چنانچہ ان کے طلب کرنے پر آپ راستہ سے ہی واپس آگئے۔ انھوں نے سات روز خلوت میں بٹھایا اور تمام نعمات خاندانی آپ کو عطا فرمائیں اور اپنے صاحبزادوں سے اس کا اظہار فرما دیا اور رخصت کرتے وقت فرمایا کہ اب جاؤ راستے میں اگر کچھ سننا تو واپس مت لوٹنا۔ چنانچہ آپ کے جانے کے ۲۔۳ روز بعد جد محترم نے وفات پائی۔ دہلی سے واپسی کے بعد اٹھاون[۵۸] سال اپنے جد بزرگوار کی مسند ارشاد وتلقین پر بیٹھے اور بڑی شہرت حاصل کی۔ ہر چیز میں جد بزرگوار کا نقش ثانی تھے۔ آپ کا سلسلہ قادریہ تھا۔ عہد اکبری سے شاہ جہاں کے زمانے تک حیات رہے۔ آپ کا مفصل حال تذکرہ "مشاہیر کاکوری مولفہ مولینا حافظ شاہ علی حیدر قلندر" و "سخنوران کاکوری مولفہ حکیم نثار احمد علوی کاکوروی" میں ملتا ہے۔

قابل رشک :۔ بارہویں صدی ہجری میں نمونۂ اسلاف حضرت شاہ محمد کاظم قلندر علوی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی تھے۔ جن کی ذات والا صفات قیود نفس سے آزاد، خمول وگمنامی کی خلعت زیب تن کیے ہوئے تھی۔ موسیقی کے شایق اور موت سے خائف۔ آواز میں بلا کی لگی تھی اور احباب میں قابل رشک تھے۔ دنیا کی بے ثباتی دل میں گھر کر چکی تھی۔ انخلاء

وکتمان کے پردوں میں مستور رہتے تھے اور ذاتِ حق کے سوا کسی کا تعلق گوارا نہ تھا۔ والد بزرگوار شاہ محمد کاشف چشتی نے فرزند رشید کا رنگ دیکھ کر ان کے ماموں بخشی ابوالبرکات خاں عباسی تہور جنگ کے ہمراہ گورکھپور فوج میں داخل کر دیا لیکن وہاں بھی شمشیر وخنجر، تیر و بتر دوسروں پر برسنے کے بجائے خوفِ خدا اور یادِ حق میں فنا رہنے والے خود اس نوجوان کے سینے میں کچوکے لگاتے رہے۔ رفتہ رفتہ اس کے دل و دماغ اور جسم و جان پر ایسے برسے کہ قلب و قالب عشق الٰہی کا نخچیر بن گئے نتیجہ لازمی تھا۔ جنگ سے دل برداشتہ ہوتے احباب کو فراموش کیا وطن کو خیرباد کہا اور بغیر کسی کو اطلاع کیے قائدِ تقدیر کی سرپرستی میں منزل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ عاقبت جویندہ یابندہ ہونے اثر دکھایا اور قطب وقت حضرت سید شاہ باسط علی قلندر الہ آبادیؒ کی خدمت میں پہنچا دیا۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ غبار راہ سے چہرہ اٹا ہوا تھا برہنہ پائی کی وجہ سے خارِ مغیلاں پیروں کو زخمی کیے ہوئے تھے۔ زرد چہرہ، بھوک، پیاس سے بے پرواہ، مرشد برحق کی نگاہ حق بیں اُٹھی ؎

صدف را کے پسند آید کہ آوارہ شود گوہر

کا ظہور ہوا۔ نسبت عشقی کی مخفی شان آنا فانا اثر انداز ہوئی اور طالب صادق کو چشم زدن میں سب کچھ پڑھا گئی ؎

فتنہ برپا شد و نشتر بہ رگِ آدم زد

ابھی نظارہ تماشہ کی نیرنگیوں میں گم ہی تھا کہ "بیا بیا دوران باخبر در حضور و نزدیکان بے بصر دور" کی آواز کانوں سے ٹکرائی جس نے مزید کچھ سوچنے نہ دیا۔ جزو نے کل کو جذب کر لیا اور تمام حجابات یک دم اُٹھ گئے اور جس مقصد کے لیے آئے تھے اس کی تکمیل کی یعنی نگاہیں چار ہوتے ہی مرشد برحق کی نظر عنایت ہوگئی اور دوسرے ہی روز سلسلہ عالیہ قادریہ میں مرید ہوئے اور اذکار و اشغال بالتفصیل حاصل کیے۔

دس برس کامل مرشد برحق کی خدمت میں رہے اور دم بہ دم، قدم بہ قدم فیوض و برکات اخذ کرتے رہے اور اپنی نسبت عشقی کی بدولت مرشد برحق کی ہستی پر اس طرح چھا گئے کہ من و تو کا امتیاز باقی نہ رہا۔ رفتہ رفتہ مبشرانِ غیب نے صاحب سر، عارف باللہ اور نصیر الدین خطابات دیئے اور مرشد کامل کی زبان پر ان الفاظ سے معرف ہوئے کہ "شاہ محمد کاظم اس مرتبہ پر پہنچ چکے ہیں جس سے بڑا مرتبہ اولیاء اللہ کے لیے نہیں ہے۔" مرشد کامل کی طرف سے خلافت کبریٰ سے سرفراز ہوئے اور سلاسل سبعہ قادریہ، قلندریہ، نقشبندیہ، چشتیہ، سہروردیہ، طیفوریہ وغیرہ کی اجازت عطا ہوئی اور وطن میں اقامت کا حکم فرمایا گیا۔ نیز رشد و ہدایت کی مسند پر ایک مصلح اور ریفارمر کی حیثیت سے مامور کیے گئے۔ آپ یہ سب دیکھ کر اور ان کا بارِ گراں اٹھانے پر متامل ہوئے اور گوشہ تنہائی میں بیٹھنے کی اجازت طلب کی۔ ارشاد ہوا کہ اس کی فکر کی تمہیں ضرورت نہیں۔ اصل حفاظت ہمارے ذمے ہے اور سلسلۃ الذہب کے جاری ہونے کی بشارت دی نیز یہ بھی فرمایا کہ "تمہاری اولاد امین کی اولاد کے مثل ہوگی۔ تم اگر یہ چاہو کہ کسی کوہستان یا جنگل بیابان میں بیٹھ رہو تو میں اس کی اجازت کبھی نہ دوں گا۔ اسلام نے رہبانیت کی ممانعت کی ہے۔ میں نے ہر چیز کی ذمہ داری لے لی ہے عرض کیا کہ اس کی اجازت مرحمت فرمائیں کہ یہیں کہیں قریب ہی سکونت اختیار کر لوں تاکہ ہر وقت حضوری اور خدمت کا موقع ملتا رہے۔ ارشاد ہوا کہ دو آفتاب ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اور نہ دو بادشاہ ایک ملک پر بیک وقت حکومت کر سکتے ہیں۔ غرض کہ مرشد برحق کے ارشادات و بشارات پر لاجواب ہو کر سر تسلیم خم کر دیا۔ وطن آئے رفتہ رفتہ دہاں

میں منسلک ہوتے لیکن یہ نشہ ترشی سے اترنے والا نہ تھا۔ گمنامی کو اپنا شعار بنایا۔ آبائی باغ کے ایک گوشہ کو جہاں آج خانقاہ شریف ہے اپنی تنہائیوں، شب بیداریوں اور یاد حق سے آباد کیا۔ خلق سے بے تعلقی اس پایہ کو پہنچ گئی تھی کہ کسی محرم اور نامحرم کو اپنے مراتب سے آگاہ نہ ہونے دیتے۔ لیکن رحمت حق کو پردۂ خفا چاک کرنا مقصود تھا تاکہ برکات کاظمی سے آنے والی نسلیں بھی محروم نہ رہیں۔ یہ سب دیکھ کر نہ صرف اہل قصبہ بلکہ اطراف و جوانب کے لوگوں کیا مسلمان کیا ہندو سب ہی کا ہجوم ہونے لگا۔ ان میں حکومت کے سربرآوردہ لوگ بھی تھے اور عوام الناس بھی۔ منشی فیض بخش مورخ اودھ بھی تھے اور سفیر شاہ اودھ امیر عاشق علی خاں و مفتی خلیل الدین خاں بہادر سفیر اودھ بھی۔ لالہ مجلس رائے اور لالہ شتاب رائے اور لالہ مجلس رام بھی تھے۔ رفتہ رفتہ وزیر اعظم مہاراجہ ٹکیت رائے بھی حلقہ بگوش ہوئے انھوں نے دو درجے کا پختہ دالان مع صحن چبوں اور ایک پختہ کنویں کے ۱۲۱۷ھ میں باصرار تعمیر کرائے جس کا دلچسپ قصہ تذکروں میں مذکور ہے۔ گویا باقاعدہ خانقاہ کی پہلی تعمیر جبھی ہوئی۔ مہاراجہ نے مدد معاش کے لیے معافی کا فرمان جاری کیا۔ ان تمام لوازم کو دیکھ کر صبر و تحمل کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ معافی کا پروانہ واپس کیا۔ کئی کئی روز بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہو کر دعائیں مانگیں کہ امرا و وزرا کی عقیدت زائل ہو جائے اور معموری اوقاف میں خلل نہ پڑے۔

خلوت و جلوت میں فنا رہنے کے باوجود شریعت ظاہری کا بھی شدت سے پاس رکھا اور اپنی علمی و عملی کاوشوں اور خدمات سے ذرا بھی دریغ نہ کیا۔ آپ جہاں ایک طرف لوگوں کی قلب ماہیت کرتے تھے وہاں دوسری طرف تصنیف و تالیف کے ذریعہ اہل علم و ادب اور عوام و خواص کو اسرار و رموز سمجھاتے تھے اور جو وقت بچتا اس میں اپنی مدھ لے اور سریلی ٹھمریوں سے عوام و خواص کے کانوں اور قلوب میں صوت سرمدی، شہنائی اور جل ترنگ کا رس گھولتے تھے۔ ایک کتاب "نغمات الاسرار" موسومہ "بہ سانت رس" تحریر فرمائی جس میں حقائق و معارف ٹھمریوں میں بیان فرمائے۔ ان میں سے نصف اشعار (ڈھائی ہزار) مع ترجمہ و شرح مولینا حافظ شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر مدظلہ العالی شائع ہوئے ہیں۔ سانت رس کی تصنیف کے وقت عوام کے مورد طعن و تشنیع ہوئے اور معترضین نے خوب اعتراضات کیے مگر آپ نے کسی ملامت کرنے والے کی پروا نہ کی اور اَلْحَقُّ یَعْلُو وَلَا یُعْلٰی (حق خود بلند ہوتا ہے نہ کہ بلند کیا جاتا ہے) کے مصداق برملا اظہار فرماتے رہے۔ ؎

نہ شد مست کا کم نہ ہے ظرف عالی
پیے مدھ کے دن رات بھر بھر پیالے

چنانچہ اپنے چھوٹے بھائی اور خلیفہ حضرت شاہ میر محمد قلندرؒ (جد امجد علامہ محسن کاکوروی) کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ "لوگو اور معترضین کے ان طعنوں کی مجھے مطلق پرواہ نہیں ہے میں اسی کی رضا پر راضی ہوں مجھ سے جو کروایا جاتا ہے وہی میں کرتا ہوں"۔

آپ نے اردو میں بھی شاعری فرمائی مگر اس کا سرمایہ بہت ہی کم ہے۔

جب ہی دل پہ اس کا کرم دیکھتے ہیں
تو دل کو بہ از جام جم دیکھتے ہیں
کھلا جس پہ جلوہ صفات خدا کا
وہ اس دیر کو بھی حرم دیکھتے ہیں
وجود و عدم دونوں شانیں ہیں اس کی
جدا دونوں شانوں سے ہم دیکھتے ہیں

یہاں سانت رس کے ادبی محاسن پر نہ بحث کرنے کا محل ہے اور نہ گنجائش اودھی اور برج بھاشا تو یوں بھی بڑی سریلی اور رسیلی ہیں پھر ایک عارف باللہ صاحب سر کے سوز و گداز کی تب و تاب، تخیل کی بلندی

اور رعنائی اور مختلف راگ راگنیوں کے دھن پر کہی گئی ٹھمریاں اور دوہے قلب و روح میں جو بالیدگی پیدا کرتے ہیں اس کا پوچھنا ہی کیا ہے۔

حضرت مولیناشاہ تراب علی قلندرؒ

مرشد برحق کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ نے عملی جامہ پہنا اور ۱۱۸۱ھ/۱۷۶۸ء میں خلف الرشید کی ولادت باسعادت ہوئی جن کے روئے انور سے نورِ ولایت اور پرتو چراغ ہدایت صاف ظاہر تھے۔ عربی و فارسی کی ابتدائی کتابیں ملا قدرت اللہ بلگرامی اور مولوی معین الدین بنگالی سے پڑھیں اور بقیہ ملا حمید الدین محدث کاکوروی، مولوی فضل اللہ نیوتنوی اور قاضی القضاۃ مولینا نجم الدین علی خاں ثاقب سے پڑھیں۔ چوں کہ شروع ہی سے متبرک اور قابل تقلید فضا میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا تھا۔ طاہر اور پاکیزہ ماحول میں سر ابھارا تھا لہذا بے ثباتی اور فنائیت کی جوش انگیز صداؤں نے کانوں کو پہلے ہی سے بے حقیقتی سے آشنا کر دیا تھا اور پھر والد محترم کی ہمہ وقت صحبت اور تعلیم نے کندن بنا دیا۔ کثرت عبادت میں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ایک حالت پر رہے جب سے سن شعور کو پہنچے کبھی نماز قضا نہیں ہوئی اذکار و اشغال اور اوراد و وظائف خاندانی کے ہمیشہ پابند رہے۔ والد محترم نے فرزند رشید کی لیاقت و قابلیت اور استعداد ظاہری و باطنی ملاحظہ فرماتے ہوئے کل امور تکیہ داری سپرد فرما دیئے۔ آپ اپنی حسن لیاقت اور ذمہ داری سے بخوش اسلوبی تمام امور ساری عمر انجام دیتے رہے باوجود اس کاروبار دنیاوی میں منہمک رہنے کے روزانہ دو سو رکعت نفل ادا فرماتے تھے۔ چنانچہ والد محترم خود بھی یہ سب دیکھ کر متحیر تھے۔

اپنے ایک مکتوب میں فرزند رشید کی عالی ہمتی کو سراہتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"جتنے خانگی امور ہیں سب کا بار گراں تراب علی پر آپڑا ہے میں خود بھی اس پر حیران و ششدر ہوں کہ کس طرح بسر کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو جزائے خیر دے اور دنیا و آخرت اس کے تابع ہو جائیں اور اس کا مالک اس کے دل میں اس طرح سما جائے کہ اسے دونوں جہانوں کی کوئی پرواہ نہ رہے۔"

احادیث سے ثابت ہے کہ ہر سو سال کے بعد ایک مرد پیدا ہوتا ہے۔ جو سنت سنیہ کو از سر نو زندہ اور بدعات شنیعہ کو معدوم کرتا ہے۔ اس زمانہ میں حضرت کی ہی ذات با برکات تھی جو ان تمام اوصاف کی جامع تھی۔ یعنی ظاہری آداب شریعت کو ضروری سمجھنا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پابندی، بلا پر تحمل، علم دین میں مشغولیت، فقراء کی ہم نشینی، امرا و بادشاہی سے بے پروائی، خلق سے یک سوئی، ملامت سے بے خوفی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر استقامت وغیرہ وغیرہ آپ کی ذات والا صفات میں بدرجہ اتم تھیں۔ بسبب حسن خدمت اور حسن آداب والد محترم قدس سرہٗ کے مقبول اور منظور نظر رہے۔ بیعت آپ کو سلسلہ عالیہ قادریہ میں حضرت سید شاہ مسعود علی قلندر الہ آبادیؒ خلف و خلیفہ حضرت سیدنا شاہ باسط علی قلندر الہ آبادیؒ سے تھی۔ اور اجازت و خلافت کبریٰ مع الباس اپنے پیر و مرشد اور حضرت والد ماجد دونوں سے حاصل تھی۔ ان کے علاوہ سلاسل سبعہ کی اجازت حضرت شاہ خدا بخش قلندر خلف اصغر شاہ باسط علی قلندر الہ آبادیؒ وغیرہ سے تھی۔ سلسلۂ چشتیہ کی اجازت والد محترم کے رفیق خاص حضرت خواجہ حسن مودودی چشتی لکھنویؒ سے تھی۔

آپ والد محترم کے وصال ۲۰ ربیع الثانی ۱۲۲۱ھ

۱۸۰۶ء کے بعد چونسٹھ سال سے زائد عرصے تک خاندان کے سجادہ نشین رہے اور فرائض سجادگی نہایت حسن و خوبی سے انجام دیئے۔ تصوف و سلوک، آداب طریقت اور فلسفہ اخلاق میں بہت سی مفید کتابیں تصنیف فرمائیں۔ جن میں "مقالات الصوفیہ"، شرائط الوسائط، کشف المتواری، اصول المقصود اور مطالب رشیدی وغیرہ ہیں مطالب رشیدی اپنی افادیت، معنویت اور ہمہ گیری کی بنا پر نہایت مقبول عوام و خواص ہوئی۔ متعدد مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ عصر حاضر کی ضرورت و اہمیت کے پیش نظر موجودہ صاحب سجادہ خانقاہ کاظمیہ حضرت مولینا شاہ مصطفےٰ حیدر قلندر مدظلہٗ العالی نے اس کا عام فہم، سلیس و بامحاورہ اردو ترجمہ فرمایا جو دو مرتبہ زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔

آپ کے مفصل حالات روض الازہر فی مآثر القلندر، نفحات العنبریہ من انفاس القلندریہ، اذکار الابرار، تذکرہ مشاہیر کاکوری، تذکرہ گلشن کرم وغیرہ میں موجود ہیں۔

شعر و سخن قسام ازل نے فطرتاً شعر و سخن کا ذوق بھی عطا کیا تھا۔ ابتدا میں شہید تخلص فرماتے تھے پھر تراب کر دیا۔ آپ نے شاعری کو نہ نام و نمود کا ذریعہ بنایا اور نہ کبھی اہل نظر سے داد تحسین کے متمنی ہوئے۔ محض اپنی تسکین خاطر کے لیے اپنی معنوی صلاحیتوں سے وابستہ کی آمد و رفت میں الہامی ماورائی طرز فکر کو اپنایا یعنی کبھی کوئی شعر خانقاہ شریفہ پر بیٹھ کر نہ کہا بلکہ بستی کی آمد و رفت میں دو ایک غزل کہہ لیا کرتے تھے۔ اردو ہندی اشعار تو ساتھ رہنے والے ایک عزیز قلم بند کر لیا کرتے تھے لیکن فارسی کلام ایک چھوٹی سی بیاض میں خود اپنے دست مبارک سے تحریر فرما لیا کرتے تھے۔ مظفر حسین صبا اپنے تذکرہ شعرائے فارسی موسومہ بہ "روز روشن" میں رقم طراز ہیں کہ شاہ تراب علی علوی خلف الصدق شاہ محمد کاظم قلندر کا شمار قصبہ کاکوری کے جلیل القدر مشائخ اور عزمائے کاملین میں تھا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں آب دار موتیوں کی طرح اشعار موزوں کرتے تھے۔

آپ کا فارسی اور اردو، ہندی کلام متعدد بار طبع ہو چکا ہے۔ ہندی کلام موسومہ بہ "امرت رس" مولانا حافظ شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر مدظلہٗ نے مرتب فرما کر شائع کی ہے فارسی کلام سے آپ کی نفاست کا پتہ چلتا ہے۔

نیست دنیا جائے راحت از غمش اے دل برآ
رخت ازیں دار المحن بردار و زیں منزل برآ

دنیا آخرت کی کھیتی ہے کی تشریح فرماتے ہوئے کہتے ہیں۔

مزرع عقبیٰ ست دنیا نے مقر و عیش گاہ
تخم نیکی کشتہ زیں جا باز مستعجل برآ

ہوا و ہوس میں گرفتار رہنے پر تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

غرق باشی تا بکے در بحر فکر آب و ناں
سر برآ از قعر دریا بر لب ساحل برآ

موتوا قبل ان تموتوا (اپنی موت سے پیشتر مر جاؤ) کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

بعد مرگ آخر رود ایں قالب خاکی ز تو
قبل مرگ اے جان من از قید آب و گل برآ

پھر اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کی تلقین فرماتے ہیں۔

باش محکوم خدا و تابع امر رسول ﷺ
چند باشی زیر حکم نفس و شیطاں دل برآ

شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت کی بھی تعلیم دیتے ہیں اور اہمیت بیعت کو بیان کرتے ہوئے اور اس سے انحراف سے خوف دلاتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

دست پیرے گیر ورنہ رہبرت شیطاں شود
طالب حق شو خدا را از رہ باطل برآ

پھر جمال ہمنشیں کی صحبت سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں

اس کو بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

مس ناقص از طفیل کیمیا زر می شود
اختیار صحبت کامل کن و کامل برآ

حضرت صاحب قدس سرہٗ جو کچھ فرماتے ہیں وہ بدیہی یقینی اور چشم دید فرماتے ہیں ایک غزل بیعت اور مرشد کی اہمیت میں پیش ہے۔

پنجۂ پیر نقش اللہ است
کے از یں راز ہر کس آگاہ است

پھر نص صریح سے مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

از یداللّٰہ فوق ایدیھم
شد یقینم کہ مرشد اللہ است

پھر اس کی اہمیت پر مزید زور دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ نادان ہے جو کسی کے دامن سے وابستہ نہ ہو۔

ہر کہ نگرفت دامن پیرے
مرد نادان و طفل گمراہ است

پھر حدیث شریف سے اس کی سند دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

ہر کہ بے پیر پیر شس ابلیس است
ایں حدیث نبیؐ در افواہ است[1]

بعد ازاں منکر بیعت پر تاسف فرماتے ہوئے کہتے ہیں۔

منکر پیری و مریدی را
حیف صد حیف آہ صد آہ است

مزید تاکید فرماتے ہیں۔

پیر آمد وسیلہ بہر نجات
پیر بگزیں کہ خواہ و ناخواہ است

پھر یہ واضح فرماتے ہیں کہ پیر جیسا مظہر حق ہے ویسا ہی مظہر رسولؐ بھی ہے کیونکہ ید اللّٰہ فوق ایدیھم کے مطابق مریدین کے ہاتھوں پر جو ہاتھ اللہ تعالیٰ کا ہے وہ ہاتھ فی الخارج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا تو ہے۔

پیر را صورت پیمبر داں
زاں کہ او رہنمائے درگاہ است

پیر کامل مرید سے ہمہ وقت باخبر رہتا ہے ؎

گرچہ پیر از مرید دور بود
التفاتش ہمیشہ ہمراہ است
پیر اگر حاضر ست ور غائب
بے یقیں از مرید آگاہ است

پیر کی خدمت میں ہمیشہ باادب رہنا چاہئے۔

باادب پیش پیر باید بود
کو ز سر تا قدم ادب گاہ است

پیر کی غلامی کونین کی دولت ہے۔

بندہ پیر دستگیر خودم
در جہانم بس ایں قدر جاہ است

آخر میں غزل کو اپنے پیر ارشاد کے نام پر ختم فرماتے ہیں۔

کے نہ نازم بہ بخت خویش تراب
مرشدم کاظم شہنشاہ است

ایک مقام پر درویشوں کی خدمت میں مودب رہنے کی تعلیم اس طرح فرمائی ہے۔

اے گرفتار خودی طعن بر درویش مکن
غیبت پاک دروں جان صفا کیش مکن
جاں سلامت نہ بری از نفس درویشاں
لقمۂ شیر مشو دشمنی خویش مکن

بعد ازاں قناعت کی تعلیم اس طرح دیتے ہیں۔

ہر چہ مقسوم تو حق کرد ہماں خواہی یافت
طلب حبۂ از قسمت خود بیش مکن

بزرگان دین کی صحبت کی جانب بلاتے اور بروں کی صحبت سے منع فرماتے ہیں۔

حاضر مجلس مردان خدا باش مدام
صحبت مردم بد وضع و بداندیش مکن

خلق کی نفع رسانی کی تاکید اور دل آزاری سے پرہیز کی ہدایت ؎

راحت در دل مخلوق رساں تامقدور
ہیچ کس را ز خود آزردہ و دلریش مکن

بعدازاں اسرار و رموز زبان پر لانے کا ارادہ ظاہر کرکے حسب معمول سکوت فرماتے ہیں ؎

مرشدت ہر چہ نہاں گفت عیاں گوئے تراب
لب باسرار کشا ہیچ پس و پیش مکن

کفر مصنوعی: آپ کے کلام میں اخلاقیات بھی ہیں اور حقایق و معارف بھی۔ اتباع شریعت کی تلقین بھی ہے اور عشق بازی بھی اور اس سب کے ساتھ ساتھ کفر مصنوعی بھی۔ انداز بیان اتنا سلیس و سادہ اور زبان اتنی عام فہم اور رواں ہے کہ دلوں پر نقش ہو جاتے ہیں۔ بعض اشعار تو سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہیں ؎

حیف سر حق نہ پوچھا ایک نے
پاس اپنے اک جہاں آیا گیا

اردو کلام میں بھی تصوف کی چاشنی اور حقایق کی تجلی موجود ہے۔

کافر ہے سیہ زلف پریشان ہو کافر
ٹوٹے کہیں بل اس کا پشیمان ہو کافر

تشبیہات و استعارات کے پردہ میں الفاظ کی نشست ملاحظہ ہو۔

دا تر ہے عبث مصحف رخسار پہ کاکل
ممکن ہے کہیں حافظ قرآن ہو کافر

محبت کے راز کو زبان پر لانے سے قبل اس کے عواقب سے آگاہ فرماتے ہیں۔

اس بت کی محبت کا اگر بھید کہوں میں
سکتے میں مسلمان ہو حیران ہو کافر

حقیقت کے برملا اظہار سے سکوت فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

منہ سے جو مرے نکلے ابھی راز حقیقت
کافر ہو مسلمان، مسلمان ہو کافر

محبوب کی جفا نما وفا کو کس بلیغ انداز میں بیان فرماتے ہیں۔

کس طرح تراب اس کو مصاحب کرے اپنا
جو آفت دیں فتنۂ ایماں ہو کافر

دوستو! یا مجھے اس شوخ کے گھر جانے دو
یا مرے حال پہ چھوڑو مجھے مر جانے دو
خون سے ہاتھ تو رنگین ہے قاتل کا تمام
قتل سے دل کے مکرتا ہے مکر جانے دو
رہزنو! مارو نہ قاتل کو مرے، رحم کرو
یار تک کچھ تو بھلا میری خبر جانے دو
صبر و تسلیم و رضا چاہیئے ہم کو بھی تراب
ہجر کا غم نہ کرو آٹھوں پہر، جانے دو

تغزل کی رنگینی ملاحظہ ہو۔

ادھر میں غم سے روتا ہوں ادھر وہ شوخ ہنستا ہے
کہیں بجلی چمکتی ہے کہیں پانی برستا ہے

تخیل اور ندرت ملاحظہ ہو۔

نقطۂ خال نہیں یہ لب جاناں کے تلے
چُنی نیلم کی جڑی لعل بدخشاں کے تلے

آپ کی متصوفانہ شاعری میں بعض مقامات پر خوش طبعی کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔

اس نے دل کو مرے پتنگ کیا
عشق بازی میں خوب جنگ کیا
خط کو میرے بنا کے کاغذ باد
پیٹا پھاڑا نہ کچھ درنگ کیا

ایک مقام پر فقرا کی صفت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے ؎

خدا نے جن کو خوبی دی وہ برقع منہ پہ ڈالے ہیں
کمال اپنا چھپائیں کیوں نہ جو اللہ والے ہیں
نہ کہہ اے منکر فقرا، زباں سے اپنی یہ کلمہ
کہ درویش اس زمانے کے مرے سب دیکھے بھالے ہیں
تو ارباب ملامت کی صلاحیت سے کیا واقف
بغل میں جن کی شیشہ اور ہاتھوں میں پیالے ہیں

ولی کو جز ولی ہرگز نہیں پہچانتا کوئی
جو بندے خاص ہیں حق کے وہ دنیا سے نرالے ہیں
تراب ان سے کہا اظہار ہو کشف و کرامت کا
ہمیشہ جن کو حق سے اپنی گمنامی کے لالے ہیں
حفظ شریعت کی پابندی کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔
بے کشتیٔ شریعت دریائے معرفت میں
بے جا ہے اے موحد کرنا عبور تیرا

قدم جو شرع سے باہر رکھے وہ بھٹکے گا
کہ شاہ راہ حقیقت ہے مصطفیٰؐ کی راہ
دوسروں کی عیب جوئی سے کس طرح منع فرماتے ہیں۔
عیب جوئی غیر کی کرنا بُرا ہے مدعی
خود نظر کرتا نہیں اپنے بُرے اعمال تو
تکبر سے بچنے کی کیسی ترغیب فرماتے ہیں۔
طینت آدم کی خاکساری ہے
جو تکبر کرے وہ ناری ہے
فنا کا بیان کیسا دلنشیں ہے
فنا کی سیر جس کو دیکھنا ہو
تماشا باغ کا دیکھے خزاں میں
آپ کے بکثرت اشعار پیشین گوئیاں ثابت ہو رہے ہیں۔ قلندر کے منھ سے نکلی بات گویا
من نمی گویم انا الحق یار می گوید بگو
ہے مثال کے طور پر صرف ایک شعر نقل ہے۔ قارئین بخوبی سمجھ لیں گے کہ اشارہ کس کی جانب ہے۔
جس کا اقبال ہو تنزل پر
وہ چڑھے لے کے فوج کابل پر
کابل (افغانستان) پر فوج کشی کس نے کی؟ اور پھر اُس کا عروج و اقبال کس طرح تنزل و پستی کی سمت رواں دواں ہوا۔
حضرت شاہ تراب علی قلندر قدس سرہٗ کی نگاہ حق بین دیکھ رہی تھی کہ ان کے نامور اخلاف اور

سلسلۃ الذہب کی بدولت ان کا نام نامی زندہ و پایندہ رہے گا تبھی تو انھوں نے فرمایا۔
رہے گا ذکر مرا قصہ و فسانے میں
مجھے بھی یاد کریں گے کسی زمانے میں
ربیع الثانی ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء کا زمانہ تھا اور سن شریف ۹۴ برس کا ہو چکا تھا۔ پیرانہ سالی اور ضعف کے باوجود تمام معمولات پورے کرتے رہے۔ حسب معمول والد ماجد قدس سرہٗ کے عرس کے تمام مراسم انجام دیے۔ محافل سماع کی صدارت فرمائی لیکن اس کے بعد ہی سے ملاء اعلیٰ سے چشمک شروع ہو گئی۔ ۲ / جمادی الاول کو فالج نے حملہ کیا اور ۳ / جمادی الاول کو ہستی کے تمام تعلقات اور قیود سے آزاد ہو گئے۔ تاریخ وصال پر ہر سال فاتحہ ہوتا ہے۔ آپ کے وصال کے بعد والد ماجد کے عرس ۲۰-۲۱ ربیع الثانی کے ہمراہ ۲۲ / ربیع الثانی کو آپ کا بھی عرس شامل کر لیا گیا۔
پیام حق} کہا جاتا ہے کہ علم و فضل میراث نہیں لیکن لسان غیبی کے مبشرات کا قول سے فعل میں آنا بھی لازمی ہے۔ حضرت شاہ حیدر علی قلندر سجادہ نشین اور حضرت شاہ تقی علی قلندر کی متبرک و مقدس ہستیوں نے والد محترم کی قدر و منزلت کو اپنی ذاتوں سے دوبالا کیا بلکہ اپنے علمی تبحر اور عملی جلوہ سامانیوں اور کارفرمائیوں سے ہر ذرہ کو آفتاب بنایا اور گمنامی کے لباس میں تصنیف و تالیف اور رشد و ہدایت کے ذریعہ لوگوں کے قلوب کو گرمایا اور اپنی نظر جامعیت اثر کی ہمہ گیری اور وسعت سے لوگوں کے قلوب کی کایا پلٹ دی اور ان کے کفر کے ذخیروں کو ایمان کے خزانے بنا دیے۔ دونوں حضرات کی روش سلوک میں بالکل جداگانہ تھی۔ والد محترم اپنی ایک تحریر میں ان کے متعلق رقم طراز ہیں۔
"فقیر کے دونوں لڑکے اللہ کی عنایت سے عالم باعمل اور صاحب استعداد ہیں شب و روز

تعلیم وتدریس میں مصروف رہتے ہیں فقیر کو اپنے والد بزرگوار (حضرت شاہ محمد کاظم قلندرؒ) سے علم سلوک اور فقر و درویشی میں جو بھی نعمات حاصل ہوئیں وہ سب ان دونوں کو دیدیں۔"

حضرت شاہ حیدر علی قلندرؒ دونوں حضرات والدِ محترم نیز دوسرے اکابر سے بھی اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت شاہ تراب علی قلندرؒ نے اپنے مرشد زادہ برحق حضرت شاہ علی مظہر قلندرؒ سے اپنے بڑے صاحبزادہ حضرت شاہ حیدر علی قلندرؒ کو مرید کرایا۔ ۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۸ء ۶؍ جمادی الاوّل کو حضرت شاہ تراب علی قلندرؒ کی حسب وصیت آپ سجادہ کاظمیہ پر رونق افروز ہوئے اور ۹ سال تک ایک عالم کو اسی سلسلۃ الذہب کی شاہراہ پر چلایا۔ ہر مذہب وملت کے لوگ اپنی اپنی استعداد کے مطابق اپنا اپنا حصہ لیتے رہے۔ ۲۰؍ شوال ۱۲۸۴ھ ۱۸۶۸ء کو وفات پائی۔

حضرت شاہ علی اکبر قلندرؒ حضرت شاہ علی اکبر قلندرؒ اپنے والد ماجد کے وصال کے بعد اپنے والد ماجد و جد محترم اور حضرت عارف باللہ شاہ محمد کاظم قلندرؒ کے سجادہ پر متمکن ہوئے۔ آپ کا تبحر علمی و عملی کمالات بہت تھے۔ ہمہ وقت تفکر میں مستغرق رہتے تھے۔ اخفاوکتمان کا خاص شوق تھا۔ نہایت درجہ منکسر المزاج متحمل النفس اور بردبار تھے۔ نیز پابند شریعت و طریقت اور فائز بہ حقیقت و معرفت تھے۔ علوم متعارفہ میں بحرزخار اور "صوفی آں بود کہ نبود" کے مصداق تھے۔ اپنی استعداد باطنی وظاہری اور حسن خدمت کی بدولت اپنے عم مکرم کے مقبول و منظور نظر رہے۔ والد ماجد، جد بزرگوار نیز عم مکرم سے نعمات خاندانی حاصل کیں اور اپنے والد ماجد کے حسب وصیت وارشاد سجادہ کاظمیہ پر رونق افروز ہوئے۔ عم مکرم حضرت مولینا شاہ تقی علی قلندرؒ نے مجمع عام میں کھڑے ہو کر یہ فرماتے ہوئے نذر پیش کی کہ یہ خادم آستانہ کی نذر ہے۔ تیس سال فرائض سجادگی انجام دے کر ۱۷؍ رجب ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۳ء کو اپنے صاحبزادہ عالی وقار کو تمام نعمتیں سونپ کر اپنے اسلاف کرام اور خالق حقیقی سے جاملے۔ "اصل الاصول فی بیان السلوک والوصول" اور "ہدیۃ المتکلمین" آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔

حضرت مولینا حافظ شاہ علی انور قلندرؒ حضرت حافظ شاہ علی انور قلندرؒ کی ذات والا صفات مجمع کمالات ظاہری و باطنی تھی۔ اپنے جد بزرگوار کا علمی تبحر آپ کی ذات میں بدرجۂ کمال جلوہ فرما تھا۔ سن طفولیت سے ہی ان کی خاص عنایتوں کے مرکز رہے۔ اپنی حد یدالذہنی عالی ہمتی، خصائل حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ کی بدولت مرجع خلایق تھے۔ خانقاہ کاظمیہ کے تمام سجادہ نشینان گرامی میں سب سے زیادہ کم سنی میں آپ کی ہی مشیخت کی شہرت دور ونزدیک ہوئی۔ ۵ برس کی عمر میں حضرت شاہ تراب علی قلندر قدس سرہٗ نے بیعت و اجازت خلافت سے سرفراز فرمایا۔ نیز حضرت مولینا شاہ حیدر علی قلندرؒ و شاہ تقی علی قلندرؒ اور والد بزرگوارؒ سے اجازت خلافت پائی۔ حضرات مرشدین اور اولیائے کرام کی ارواح طیبہ کی خاص توجہات کے مرکز تھے۔ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ اور مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ سے اویسی فیض تھا۔

نوعمری میں شاعری سے بھی ذوق رہا لیکن بعد میں ترک فرمادی۔ آپ کی بیش بہا تصانیف وتالیفات نے اپنے اسلاف کے فضائل و کمالات کو شہرت عام کے مسند پر جگہ دی اور حیات جاوید عطا کی۔ "الفیض التقی فی حل مشکلات ابن العربیؒ تصفیہ

شرح تسویہ للشیخ محب اللہ الہ آبادی، الانتصاح عن ذکر اہل الصلاح، الدر الدرر فی مناقب غوث الاعظمؒ جیسی بکثرت بیش بہا کتابوں نے شہرت دوام اور مقبولیت حاصل کی۔ پھر آپ کے تینوں گرامی قدر اخلاف نے اپنی سعی مشکور سے ان پر بقائے دوام کی مہر لگادی۔

۳۴ سال ارشاد و تلقین کی مسند پر بیٹھے اور والد محترمؒ کے وصال کے بعد سجادہ کاظمیہ پر رونق افروز رہ کر دس سال فرائض سجادگی انجام دیں اور اپنے اسلاف کی سنت قدیمہ کو برقرار رکھ کر ان کے سلسلۃ الذہب میں مزید کڑیوں کا اضافہ فرمایا۔ یعنی اسلاف کرام کے نقش قدم پر چلنے والے گرامی قدر اخلاف کو اپنا وارث بناکر تمام نعمات خاندانی ان کے سپرد فرمائیں اور ظاہری و باطنی علوم کا حامل کر کے خود بدولت نے ۴۵ سال کی عمر میں ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء آخرت کو دنیا پر ترجیح دی۔

حضرت مولانا شاہ حبیب حیدر قلندرؒ، مولانا شاہ تقی حیدر قلندرؒ، مولانا حافظ شاہ علی حیدر قلندرؒ

آپ کے وصال کے بعد آپ کے گرامی قدر اخلاف نے یکے بعد دیگرے اپنی گراں قدر کاوشوں اور جہد مسلسل سے تمام سابقہ فرائض نہایت حسن وخوبی سے انجام دیے اور والد محترم کے عہد کو دوبارہ لے آئے۔ یہ تینوں مقدس ہستیاں یعنی شاہ حبیب حیدر قلندر، شاہ تقی حیدر قلندر اور شاہ علی حیدر قلندر صاحبان محمدی المشرب، اتباع شریعت، حفظ مراتب، تحمل واستقلال میں حالت مصطفویؐ و مرتضویؑ سے مالا مال اور علمی تبحر و فضل و کمال میں بے مثال تھیں۔

حضرت شاہ حبیب حیدر قلندر نے ۴۲ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد کے وصال کے بعد سجادہ کاظمیہ کا بار اپنے دوش مبارک پر اٹھایا۔ ارشاد و تلقین رشد و ہدایت اور دار آسائی کے ساتھ ہی متعدد گراں قدر تصانیف مثل "ارمغان آندا دیہ، الشرف المبین فی معراج سید المرسلین، الکلمۃ الباقیہ فی الاسانید والمسلسلات العالیہ وغیرہ فرمائیں۔ والد ماجد کی اتباع میں سر مو فرق نہ آنے دیا۔ حتیٰ کہ ٹھیک ۴۵ برس کی عمر میں آنجناب نے بھی سفر آخرت فرمایا۔

حضرت شاہ تقی حیدر قلندر نے اپنے برادر معظم کے وصال ۱۷ ربیع الاول ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء کے بعد بروز سیوم اپنے اسلاف کرام کی سنت قدیمہ کے مطابق ترک لباس فرمایا اور خرابی صحت کے باوجود اوضاع خاندانی پر شدت سے کاربند رہے اور اس میں سر مو فرق نہ آنے دیا۔ خانقاہ کاظمیہ میں آپ سے زائد تصنیفات و تالیفات کسی نے نہیں فرمائیں۔ اخفا و کتمان کا حال یہ تھا کہ محرمان حقیقت کے محدود دائرہ کے باہر کوئی متنفس آپ کے فضائل و کمالات سے آگاہ نہ ہوسکا۔ اپنے جد بزرگوار حضرت شاہ علی اکبر قلندر کی طرح " ملامتہائے گوناگوں جراحتہائے بے مرہم" کو بخندہ پیشانی برداشت کرکے " دل بیار و دست بکار رہے اپنی ۸۴ سالہ زندگی کے بیشتر حصہ میں بیماری اور دوسرے عوارض کے باوجود بیش بہا مصنفات کا ایک معتدبہ ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا۔" الکہف والرقیم فی شرح بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الانسان الکامل للشیخ عبد الکریم جیلی کے بامحاورہ سلیس اردو ترجمہ، نفحات العنبریہ من انفاس القلندریہ، تعلیمات قلندریہ، اذکار الابرار، مناظر الشہود فی مراتب الوجود، ہدیۃ الشرف وغیرہ جیسی بلند پایہ مصنفات خاصی مشہور ہوئی ہیں۔

اپنے فرمانے کے مطابق کہ میں صرف پانچ سال کے واسطے لباس سجادگی پہن رہا ہوں ٹھیک پانچ سال بعد ۱۹ ربیع الاول ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء کو تمام نعمات خاندانی اپنے برادر اصغر حافظ شاہ علی حیدر قلندر کو سپرد فرماکر نیز سلسلۃ الذہب کی اشاعت واجرا کے لیے دو گرامی قدر اخلاف یادگار چھوڑے اور

مستقبل کے لیے تمام بندوبست فرما کر پردۂ خفا میں مستور ہو گئے۔ برادر اصغر خانقاہ کاظمیہ کے بار گراں کو اپنے دوش مبارک پر لیے رہے اور دونوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ خانقاہ شریف کی ذمہ داریوں کے باوجود اپنے گرامی قدر اسلاف کے طریقہ میں فرق نہ آنے دیا اور بعض بڑی بیش بہا تصانیف فرمائیں جن میں احسن الانتخاب فی ذکر معیشۃ سیدنا ابی تراب، نفائس اللمن فی فضائل سیدنا ابی الحسن، مناقب المرتضی من مواہب المصطفیٰ، مصباح التعرف، تذکرۂ حبیبی، اور تذکرۂ مشاہیر کاکوری جیسی اہم کتابیں ہیں۔ آنجناب نے ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ/ ۵ اگست ۱۹۴۷ء کو عالم قدس کو ابدی آرامگاہ بنایا۔

حضرت مولینا شاہ مصطفےٰ حیدر قلندر مدظلہ العالی سجادہ نشین حال خانقاہ کاظمیہ کاکوری

حضرت مولینا حافظ شاہ مجتبےٰ حیدر قلندر مدظلہ العالی برادر خورد حضرت صاحب سجادہ

حضرت شاہ مصطفیٰ حیدر قلندر مدظلہ العالی کی ولادت ۱۹۲۴ء اور آپ کے برادر اصغر کی ۱۹۲۶ء ہے۔ دونوں نے ابتدائی تعلیم فارسی و عربی مولینا شاہ حبیب حیدر قلندر سے پائی ان کے بعد اپنے والد محترم سے درسیات کی تعلیم حاصل کی آنجناب کے وصال ۱۹۴۰ء کے بعد بقیہ کتب درسیہ عربی فارسی ادب، تصوف، کلام، منطق و فلسفہ نیز تفسیر و حدیث وغیرہ کی تعلیم اپنے عم مکرم سے حاصل کی۔ اپنے والد ماجد سے بیعت اور عم مکرم کے بھی خلیفہ و مجاز ہوئے۔ علاوہ ازیں مولینا عبدالحق پیلی بھیتی اور مولینا ظفر الحسن جونپوری سے اخذ علم کیا اور مفتی ابوذر سنبھلی، شیخ محمد صالح مدنی سے سند حدیث تحریری طور پر حاصل کی۔ دونوں حضرات صاحب تصانیف شریعت و طریقت کے جامع اوضاع خاندانی اور معمولات پر سختی سے کاربند اور فخر اسلاف ہیں۔ الولد سر لابیہ کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ اس قحط الرجالی کے دور میں ان کی ذات آیۃ من آیات اللہ ہے۔ ایک کو دوسرے سے عینیت تام حاصل ہے۔ حضرت شاہ مصطفیٰ حیدر قلندر نے اپنے عم نامدار کے سیوم (۷ اگست ۱۹۴۷ء) کے روز ان کے حسب الحکم و وصیت لباس پہنا اور ۲۳ سال کی کم عمری میں خانقاہ کاظمیہ کے بار گراں کو اپنے دوش مبارک پر اٹھایا اور از سر نو خانقاہ شریفہ اور مسجد کاظمیہ کو زینت بخشی۔ ارشاد و تلقین کی مسند پر فائز ہیں اور اپنے نامور اسلاف کے اصولوں پر سختی سے کاربند ہونے کی بنا پر مقبول اور مرجع خلائق ہیں سلسلہ قلندریہ آپ کی ذات گرامی سے جاری ہے۔ اولوالعزمی سیر چشمی، عالی ہمتی، فراخ دلی، خدمت خلق وغیرہ میں نمونۂ اسلاف ہیں۔

آپ کے برادر خورد (حضرت مولینا حافظ شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر) کو اپنے برادر بزرگ سے جو نسبت حاصل رہی اور ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ انھوں نے برادر مکرم کو امور وانصرام تکیہ داری، امامت، میلاد شریف و نکاح خوانی و درس و تدریس اور دیگر ذمہ داریوں سے بے نیاز کرتے ہوئے عظیم ذمہ داریوں کو نہایت دیانت داری سے انجام دیا ہے اور اس سلسلہ میں اپنے اجداد حضرت شاہ حیدر علی قلندر و حضرت شاہ تقی علی قلندر کی یاد تازہ کر دی بلکہ ان سے بھی بڑھ گئے ہیں۔

اس دشوار گذار راہ میں ان کو جہاں جہاں دشواریاں پیش آئی ہیں وہ اپنے استاد اور مرشد سے فیضیاب رہے ہیں۔ غرض یہ کہ جو کچھ ہے وہ مرجعیت کی کارفرمائی ہے۔ جو خم کدۂ معرفت میں وغش پلا رہی ہے اور ہر ایک بے خودی کے عالم میں بزبان حال کہہ رہا ہے ؎

(باقی صفحہ ۲۶)

ہجرت اور اُس کے تہذیبی اثرات

از

پروفیسر نثار احمد فاروقی

جب سے انسان اس زمین پر آباد ہوا ہے، ہجرتوں کا سلسلہ بھی جاری ہے، اسی سے مختلف تہذیبیں وجود میں آئی ہیں، اسی سے تہذیبوں کا سنجوگ ہوا ہے، رسوم و رواج، عقائد اور عبادات نے دوسرے علاقوں میں جاکر اپنا اثر ڈالا ہے اور وہاں کے مقامی اثرات کو قبول کیا ہے اِن ہجرتوں سے زبانیں پھیلی ہیں، ادب میں نئے خیالات اور نئی امیجری، نئے اسالیب اور نئی تشبیہات آئی ہیں۔ انسانوں کے قافلے ایک جگہ سے اُکھڑ کر دوسری جگہ پہنچے ہیں تو لباس میں، کھانوں میں، رہن سہن میں، بول چال میں نئی تبدیلیاں آئی ہیں، نئی وسعتیں پیدا ہوئی ہیں، ایک مختصر سی مدّت کی افسردگی و بے دلی کے بعد نئی حرارت اور نئی توانائیاں بھی ملی ہیں۔ ہزاروں سال سے تہذیبِ انسانی کا یہ کارخانہ اِسی طرح چل رہا ہے۔ مولانا روم نے کہا ہے:

ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند
اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

جب کوئی نئی عمارت پرانی عمارت کی جگہ پر بنائی جاتی ہے تو پہلے پرانی عمارت کو ڈھایا جاتا ہے زمانے کا یہی دستور ہے، جب کوئی انقلاب آتا ہے یا تبدیلی ہوتی ہے تو اس میں کسی کے لیے فائدہ ہوتا ہے کسی کے لیے نقصان ہوتا ہے۔ عرب شاعر کہتا ہے:

بِذَا قَضَتِ الْأَیَّامُ مَا بَیْنَ أَھْلِھَا
مَصَائِبُ قَوْمٍ عِنْدَ قَوْمٍ فَوَائِدُ،

زمانے نے اپنے لوگوں کے درمیان اس بات پر فیصلہ کر دیا ہے کہ ایک قوم کے مصائب دوسری قوم کے لیے فائدے بن جائیں۔ اگر تاتاریوں کے حملے نہ ہوتے تو ہندستان کو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت مخدوم علی احمد صابر کلیریؒ جیسے بزرگ صوفی بھی نہ ملتے اور یہ صوفیہ نہ ہوتے تو بھکتی تحریک بھی نہ ہوتی۔ وسطِ ایشیا سے قافلے ہندستان کا رخ نہ کرتے تو ہمیں قورمہ، بریانی، پلاؤ، مزعفر اور متنجن جیسے لذیذ کھانے بھی نہ ملتے، لباس میں قمیص، پاجامہ، شلوار اور شروانی بھی نہ ہوتے، پھلوں میں سیب، انار، انگور، بادام، پستہ، ناشپاتی وغیرہ کی بہت سی قسمیں بھی یہاں نہ پائی جاتیں۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے کہا تھا:

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

بنو عباس نے جب اپنے ابتدائی دورِ حکومت میں بنو امیّہ کے حکمراں خاندان کے ایک ایک فرد کو چن چن کر قتل کیا تو ایک جیالا نوجوان جس کا تعلق خاندانِ بنی امیّہ سے تھا، کسی طرح بچ بچاکر نہایت بے سر و سامانی کے عالم میں شام سے مراکو تک جا پہنچا جہاں کے بربر قبیلے

میں اُس کی نھیال تھی اُن کی مدد سے اُس نے اندلس کے اُمَوِیوں سے رابطہ قائم کیا اور ۱۳۸ھ میں، یعنی بنو اُمیّہ کی خلافت ختم ہونے کے صرف چھ سال بعد اس نے اندلس کی حکومت پر قبضہ کرلیا۔ یہ نوجوان جس کا نام عبدالرحمن بن معاویہ بن ہشام تھا تاریخ میں عبدالرحمن الداخل کے نام سے مشہور ہے اس لیے کہ وہ اندلس میں داخل ہونے والا پہلا اُموی تھا جس کی قائم کی ہوئی حکومت آیندہ تین سو سال تک باقی رہی۔

عبدالرحمن الداخل اپنی جان مشکل سے بچا کر آیا تھا اور اب اسپین میں اُسے ہر طرح کی راحت اور عیش و آرام میسر تھا، یہاں کی زندگی عرب کی پُرمشقت زندگی سے بالکل مختلف تھی، موسم بھی اچھے تھے، پھل پھول بھی کثرت سے تھے، عالی شان محلات تھے، نفیس ترین اشیاء میسر تھیں، مگر وہ اپنے دیس کی مٹی کو، اُس لق و دق ریگستان کو، کھجور کے درختوں کو، بھولا نہیں تھا اُن کی یاد آتی تھی تو دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی تھی۔ اُس نے عرب کے ریگزار سے کھجور کا ایک پودا منگوا کر اپنے محل میں لگوایا، جسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا تھا، اپنے ماضی کو یاد کرتا تھا اور نہایت لطیف جذبات و احساسات سے بھرپور اشعار وجد کے عالم میں گنگناتا تھا۔ اُس کھجور کے پودے کو خطاب کرکے اپنے اشعار میں کہتا ہے :

اے کھجور کے پودے تو مغرب دیس میں میری ہی طرح اجنبی ہے۔

جیسے میں اپنی اصل سرزمین سے دور ہوں، اسی طرح تو بھی آوارۂ غربت ہے۔

میری طرح تو بھی آنسو بہا۔

مگر تو تو بے زبان ہے، تیرا منھ زمین میں چھپا ہوا ہے۔

تیری فطرت میں رونا دھونا نہیں ہے۔

اگر تجھے رونا آتا تو دریائے فرات کے پانی اور نخلستان کی زمین کے لیے تو بھی روتا۔

مگر تو بے حس ہے۔

میں بھی اپنے خاندان والوں سے بچھڑ کر بے حس ہوگیا ہوں۔

عبدالرحمن الداخل کے دادا ہشام نے دمشق میں ایک شاندار نخلستان لگایا تھا جس کا نام الرصافہ تھا عبدالرحمن نے اُس کی یاد میں قرطبہ کے شمال مغرب میں ایک باغ لگایا اور اُس کا نام منیۃ الرصافہ رکھا۔ منیہ یونانی زبان سے لیا ہوا لفظ ہے جو باغ کو کہتے ہیں عبدالرحمن کی ایک بہن شام میں رہ گئی تھی، وہاں سے اُس کو مختلف پودے بھجوایا کرتی تھی، جو منیۃ الرصافہ میں نصب کیے جاتے تھے۔ اسی باغ میں کھجور کے ایک درخت کو دیکھ کر عبدالرحمن نے بڑے جذباتی شعر کہے ہیں جن کا آزاد ترجمہ علامہ اقبال نے کچھ یوں کیا ہے :

میری آنکھوں کا نور ہے تو
میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں
میرے لیے نخلِ طور ہے تو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا
صحرائے عرب کی حور ہے تو
پردیس میں ناصبور ہوں میں
پردیس میں ناصبور ہے تو
غربت کی ہوا میں بارور ہو
ساقی تیرا نمِ سحر ہو

مطیع بن ایاس عہد بنی امیّہ کے آخر کا عربی شاعر ہے، یہ ایران کے شہر رَے میں مقیم تھا، یہاں ایک دیہاتی لڑکی کے حسن پر فریفتہ ہوگیا اور اُس کی تعریف میں اشعار لکھنے لگا۔ جب رَے سے عرب کی طرف واپس آرہا تھا، راستے میں حلوان

کے مقام پر اُس نے کھجور کے دو درختوں کو دیکھا جو
ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے انھیں دیکھ کر
بے ساختہ اپنی محبوبہ یاد آگئی اور اُس نے اُن درختوں
کو خطاب کرکے کہا۔

اے حُلوان کے دو درختو، میرے ساتھ مل کر
روؤ۔
دیکھو زمانے نے مجھ پر کیا ستم کیا ہے۔
گردشِ ایّام تو ہمیشہ چاہنے والوں کو جدا
کرتی آئی ہے۔
اگر تم نے ہجر کی [illegible] یہ کیا ہو[illegible] جو غم
مجھے رُلا رہا ہے
وہ تمھیں بھی ہلکان کر دیتا
تم میرے ساتھ نوحہ کرو اور جان لو
کہ زمانے کے منحوس ہاتھ ایک دن تم
پر بھی ستم کریں گے اور تم ایک دوسرے سے
جدا ہو جاؤ گے۔"

ابن ایاس کے ان اشعار نے نخلتیٔ حُلوان
(حُلوان کے دو نخل) کو ضرب المثل بنا دیا تھا۔
عبّاسی خلیفہ المنصور اور المہدی نے اُن کی حفاظت
اور آبیاری کا خصوصی انتظام کیا تھا مگر ہارون رشید
نے اُن میں سے ایک درخت کٹوا دیا، بعد کو وہ
بہت پشیمان ہوا، مگر شاعر کی پیشین گوئی پوری
ہو گئی۔ بہر حال حنینِ وطن (NOSTALGIA)
اور احساسِ تنہائی اندلس کی عربی شاعری کا
وصف بن گیا تھا پردیس میں یہ بالکل فطری بات
تھی۔ یہی حال عربی کے ادبِ مہجر کا ہے جو عربی
ادبیات کا ایک مستقل باب ہے۔

عبدالرحمن الداخل نے اپنی بہن کو جو اشعار
لکھ کر بھیجے تھے وہ (NOSTALGIA) کی بہترین
ترجمانی کرتے ہیں، وہ کہتا ہے:

اے میرے دیس کو جانے والے
میرے وجود کے ایک ٹکڑے کو دوسرے کا سلام
پہنچانا۔
میرا وجود ایک سرزمین میں ہے
دل اور دلربا دوسرے علاقے میں ہیں
ہجر ہماری قسمت تھا، ہم بچھڑ گئے
آنکھوں سے نیند بھی رخصت ہو گئی
اللہ نے ہمارے فراق کا حکم دیا تھا
اب وہی ہمارے وصال کا بھی حکم دے گا!

یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ
علامہ اقبال نے شاہین کا تصور عبدالرحمن الداخل
کی شخصیت سے ہی لیا ہے جس کے لیے خلیفہ المنصور
نے کہا تھا کہ وہ تن تنہا ایک اجنبی ملک میں داخل
ہوا بیابان او[illegible] پار کرتا ہوا وہاں پہنچا،
شہر آباد کیے [illegible]ر ترتیب دیے، دفاتر قائم
کیے اور سب کچھ کھونے کے بعد بھی اپنی تدبیر اور
ہوش مندی سے ایک بڑی مستحکم حکومت قائم کرلی۔

تہذیبیں اپنا عمل اسی طرح جاری رکھتی ہیں،
ان میں اختلاف اور تنوع کے باوجود وحدت اور
ہم آہنگی و یک رنگی بھی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے
عہد میں پاکستان اور ہندستان دو سیاسی
اکائیوں میں تقسیم ہوئے تو کتنی ہی چیزیں اور
تہذیبی علامتیں دونوں طرف ایک دوسرے سے
بچھڑ کر رہ گئیں۔ ہندستان میں انگور پہلے چمن سے
آتا تھا، اب یہاں اس کی کاشت پر توجہ کی گئی
تو اعلیٰ درجہ کا لاکھوں ٹن انگور ہر سال پیدا ہورہا
ہے۔ کاجو کی پیداوار جنوبی ہند میں اچھی ہوتی ہے
پاکستان اُس کی پیداوار میں تجربے کر رہا ہے۔
کیلا بھی اُدھر اتنا بڑا اور میٹھا نہ ہوتا تھا لیکن
تجربات نے اُس میں نمایاں افزائش کی ہے اور

اب وہاں کیلا بھی خوب ہو رہا ہے۔ اسی تجرباتی عمل نے سنگترے اور موسمی کی قلم بندی سے کینو پیدا کردیا جسے پاکستان میں پھلنے کا خوب موقع ملا ہے مگر سرحد کے شمال مغربی علاقوں جیسا سردا اور گرما ابھی ہندستان کے موسم سے موافقت نہیں کرسکا ہے۔ ہمارے ہاں آم کی ہزاروں قسمیں تھیں ملیح آباد کا سفیدہ، دسہری، لنگڑا، الفانسو، خاص الخاص، بے نشان، اور حمایت، شمالی ہند کا چونسا اور رٹول یہ اور ایسی درجنوں قلمیں پاکستان میں لگائی گئیں اور بیشتر کامیاب رہیں۔ اب وہاں بھی آم خوب اور کثرت سے پیدا ہو رہا ہے۔

اسی طرح پان ہماری تہذیب کی شان ہے۔ پاکستان میں اس کا فقدان تھا، لنکا یا بنگلادیش سے پان آتا تھا، اس میں وہ لذت اور حلاوت کہاں جو مہوبے کے پان میں تھی۔ یہاں سے جو تھوڑے بہت پان مسافروں کے ساتھ جاتے تھے وہ بہت مہنگے بکتے تھے۔ پاکستان نے پانوں کی پیداوار میں بھی نت نئے تجربے کیے اور بڑی حد تک کامیابی حاصل کرلی۔

اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ تہذیبی ثقافتی ایک دوسرے کی نفی ہی نہیں کرتے، اثبات بھی کرتے ہیں اور وحدت و ہم آہنگی کی لے ٹوٹنے نہیں پاتی۔ [بہ شکریہ اردو سروس آل انڈیا ریڈیو]

بقیہ صـ۲۲

ہم ترے کشتۂ رفتار ہیں کیا ہم کو خبر
کب پھنکا صور کب آئے یار قیامت آئی

یہ سب "ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ" (جو اللہ پر توکل کرتا ہے تو وہ اس کے لیے کافی ہے) کے کرشمے ہیں کہ اس ہوش ربا گرانی میں تمام معمولات اپنی سابقہ روایات کے ساتھ انجام پاتے ہیں۔ اعراس و فواتح میں بغیر ایک پیسے کی دوکانداروں و آیندوروندے وصولی کے ان کے آرام و قیام کا انتظام و انصرام نیز لنگر وغیرہ صرف توکل علی اللہ کے کرشمے ہیں۔

ہست مجلس براں قرار کہ بود
ہست مطرب بداں ترانہ ہنوز

سلسلۂ چشتیہ کو اپنے نعرۂ ہائے ہاؤ ھو اور اپنی مستانہ شوخیوں کی بدولت تمام سلاسل پر جو امتیاز حاصل رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اور اس کے عدم جواز و جواز کے سلسلہ میں بحث ان کے ملفوظات میں جگہ جگہ ملتی ہے۔ حضرت خواجہ حسن مودودی چشتی لکھنوی (م ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۲ء) اسی سلسلۂ چشتیہ کی ایک کڑی تھے۔ عارف باللہ شاہ محمد کاظم قلندر کے محبوب رفیق تھے ان ہی نے اپنے دوست کے عرس کی بنیاد ان کے چالیسویں کے روز رکھی تھی اور اپنی وفات تک بڑی پابندی سے خود کاکوری آکر عرس کرتے رہے۔ یہ غالباً اسی نسبت چشتیت کی ہنگامہ آرائی ہے جو اس وقت سے آج تک بڑی آب و تاب سے ۲۰/۲۱/۲۲ ربیع الثانی کو رونما ہوتی رہتی ہے۔

بقائے انسانیت میں صوفیوں کا حصہ

(حضرت شاہ تراب علی قلندر کاکورویؒ کے حوالہ سے)

ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی

قرآن مجید میں ارشاد ہے لقد من اللّٰہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ الخ (آل عمران)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ ہوا کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات و نشانیوں سے باخبر کریں ان کے نفوس کا تزکیہ و تصفیہ کرکے ان کی زندگیاں نکھاریں و سنواریں اور انھیں کتاب و حکمت کا سبق پڑھائیں۔

جس طرح پیغمبروں کی بعثت مخلوق پر احسان عظیم ہے اسی طرح صوفیوں، رشیوں خدا ترس و خدا رسیدہ ہستیوں کا وجود بھی اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام ہے۔ عالم انسانیت کی تاریخ کے صفحات ان پاک طینت صوفیوں، رشیوں، منیوں کے ناقابل فراموش احسانات کے تذکروں سے مزین ہیں جنھوں نے انسانیت کی بقا و سلامتی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ وہ پیغمبروں کے سچے پیرو جانشین ہوتے ہیں اسی لیے انھوں نے انسانیت کی فلاح و بہبود اور کامرانی کی ہر ممکن کوشش کی۔ انسانیت کو وہ رفعت و منزلت اور بلندی بخشی کہ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم سچ ہو گیا اپنے اخلاق و کردار اور عمل سے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا مخلوق خدا سے ایسی محبت کی اور ان کو ایسے فوائد پہنچائے کہ پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد لایومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ (تم میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ پر مکمل ایمان لانے والا ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ دوسروں کے لیے وہی نہ پسند کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے) صادق آگیا۔ انھوں نے روتی، بلکتی، سسکتی روحوں کو کامرانی و کامیابی سے ہمکنار کیا۔ گناہ گاروں و شرمسار لوگوں کو سینے سے لگایا اور یہ یقین دلایا کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین (تمام جہانوں کا پالن ہار) اور پیغمبر اسلامؐ رحمۃ للعالمین (تمام دنیا کے لیے رحمت) ہیں۔

HATE THE SIN BUT NOT THE SINNER

(جرم اور گناہ سے تو نفرت ضرور کرو مگر گناہ گار و خطاکار سے نہیں) پر سختی سے قائم رہنا، ایک دوسرے کے مذہبی جذبات و احساسات کو سمجھنا اور ان کی عزت کرنا سکھایا، وضعداری، پاس آداب وفا، خیر خواہی، دوستوں و دشمنوں سے یکساں سلوک اور بے نفسی و بے خویشی جیسی صفات پر عمل پیرا ہو کر دکھایا اور اپنے حاشیہ نشینوں و حلقہ بگوشوں کو اس کی دلنشیں تعلیم دی، ایسی دلنشیں تعلیم کہ انھوں نے اس کے علاوہ کچھ سوچا ہی نہیں آدمیت کو انسانیت کا لباس پہنایا وہ انسانیت جس کے حصول کے لیے آدمیت ہمیشہ سرگرداں رہی ہے

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کے مشائخ

وصوفیوں نے اس سلسلہ میں بڑا ہی اہم کردار کیا ہے انھوں نے تصوف کو ایک عوامی تحریک کی شکل دی، ان اقدار کو فروغ دیا جن سے انسانیت کی بقا و ترویج ہو اور اس کی سطح بلند ہو۔ یہ اعلیٰ اقدار رحمدلی، بھائی چارہ محبت والفت، تمام انسانوں کو یک رنگی سے دیکھنا، بغض وعداوت کینہ وحسد، حرص و ہوا، تکبر و خود پسندی اور خود بینی سے اپنے کو پاک رکھنا، اپنے مخالفین اور دشمنوں کی بھی خیر خواہی اور ان سے حسن سلوک کرنا، اپنے میں قوت برداشت، وضع داری، رواداری، دل آسائی اور دلگیری جیسی صفات پیدا کرنا ہے۔ ان اقدار کی عدم موجودگی انسانیت کا گلا گھونٹتی اور موجودگی اسے بقائے دوام سے ہمکنار کرتی ہے۔

انسانیت کے سب سے بڑے محسن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا پیاری بات فرمائی ہے۔ الخلق کلهم عيال الله فاحبهم اليه انفعهم لعياله (دنیا کی تمام مخلوق خواہ وہ کسی مذہب وملت کی ہو اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے۔ اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب و پیارا وہی شخص ہے جو اس کے کنبہ کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش ہو)۔

اسی بنا پر صوفیہ تمام انسانوں کو وحدت کی آنکھ سے دیکھتے ہیں ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند

(حضرت آدمؑ کی اولاد میں تمام لوگ ایک دوسرے کے حصے ہیں کیوں کہ اپنی پیدائش کے اعتبار سے سب ایک ہی اصل سے ہیں۔)

دوسرے انسانوں کی تکلیف، کلفت و پریشانی اور مصیبت ان کی اپنی پریشانی ہوتی ہے وہ دوسروں کی چوٹ پر اس لیے تلملا اٹھتے ہیں کہ یہ چوٹ ان کی اپنی ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے غم میں اس وجہ سے بلبلا اٹھتے ہیں کہ وہ ان کا اپنا غم ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی مصیبت پر اس سبب سے تڑپ جاتے ہیں کہ یہ مصیبت ان کی اپنی ذات سے وابستہ ہوتی ہے۔ پھر غم دوراں غم جاناں میں بدل جاتا ہے اور یہ سب اس لیے ہوتا ہے ؎

دل جب احساس کی آنچوں میں پگھل جاتا ہے
غم دوراں غم جاناں میں بدل جاتا ہے

انسان وانسانیت سے یہی محبت وشیفتگی تو تھی جو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ جیسی عظیم المرتبت مقدس ہستی کو راتوں کو بے چین کر جاتی تھی۔ بشری تقاضوں کی خاطر کئی کئی روز کے بعد جب ضرورۃً غذا کا لقمہ توڑتے منھ تک لے جاتے تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور آہ بھر کر لقمہ ہاتھ سے یہ فرماتے ہوئے رکھ دیتے کہ اس وقت بھی دہلی میں نہ جانے اللہ کے کتنے بندے ایسے ہوں گے جو ایک وقت کی روٹی کو ترس رہے ہوں گے۔

یوں تو صوفیوں کی تعلیمات اور بقائے انسانیت کے سلسلہ میں ان کی کوششوں کی معنویت وضرورت ہر دور میں رہی ہے مگر بیسویں صدی کے اس مادہ پرست دور میں اس کی اہمیت کچھ اور سوا ہو گئی ہے۔ محبت وآشتی، صلح کل ماحول اور صالح معاشرہ کی تشکیل وتعمیر کے سلسلہ میں اب یہ بات ناگزیر ہو چکی ہے کہ صوفیائے کرام اور ان کی تعلیمات کے سے متعلق علمی مذاکرات کرائے جائیں اور عوامی سطح پر ان کے افکار کی تبلیغ واشاعت کی جائے تاکہ آج کی دنیا انسان وانسانیت کے صحیح مفہوم سے آشنا ہو سکے۔

ہمارے پرانے بزرگ اور ہندوستانی صوفی سنت حضرات بھی چوں کہ فطرت کے بڑے نبض شناس بلکہ ماہر اور ہندوستانی ماحول سے پوری طرح واقف تھے اس لیے انھوں نے انسانیت کا سبق پڑھانے اور پیام انسانیت سے پوری طرح روشناس کرانے کے لیے ایسی زبان اپنائی جو ایک طرف بڑی رسیلی، میٹھی اور سریلی تھی اور

دوسری طرف عوام و خواص کی مشترکہ زبان تھی اور یہ تھی برج بھاشا اور معمولی سے فرق کے ساتھ اودھی۔ آدمی کی فطرت کا خاصہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اسے مشکل سے مشکل بات اگر آسان زبان، سادہ الفاظ اور سُریلے بولوں میں سمجھائی جائے تو وہ دل میں اتر جاتی ہے اور وہ بہت جلد اس کا اثر قبول کر لیتا ہے ؎

عجب عالم ہے ان کی وضع سادی شکل بھولی ہے
کھنچی جاتی ہے دل میں کیا رسیلی نرم بولی ہے

چنانچہ ہندوستان میں پیام انسانیت کی ترویج و اشاعت اور بقا میں ان دونوں زبانوں سے بڑی مدد ملی ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی اودھ کے مشہور و تاریخ ساز مردم خیز قصبہ کاکوری کی حضرت شاہ محمد کاظم قلندر علوی۔ بانی خانقاہ کاظمیہ قلندریہ تھے جنھوں نے تمام عمر انسانیت کی بقا کی کوششیں کیں۔ اپنے ہندی کلام کے ذریعہ عوام و خواص میں ایک نئی روح پھونک دی ایسی روح جو ان کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں جاری و ساری ہوگئی وہ اپنے عہد کے ایک باکمال صوفی و خدا رسیدہ بزرگ تھے جن کی خانقاہ امیر و غریب، بادشاہ و گدا، خواص و عوام، ہندو مسلمان سبھی کی آماجگاہ تھی۔ ایک طرف مہاراجہ ٹکیت رائے دیوان و وزیر نواب آصف الدولہ بہادر، لالہ مجلس رائے، لالہ بینی رام، لالہ شتاب رائے جیسے لوگ دست بستہ کھڑے نظر آتے ہیں تو دوسری جانب مفتی خلیل الدین خاں علوی سفیر شاہ اودھ، حکومت برطانیہ کے پہلے چیف جسٹس نجم الدین علی خاں ثاقب، امیر عاشق علی علوی سفیر شاہ اودھ اور منشی فیض بخش علوی مورخ اودھ و میر منشی بہو بیگم جیسی نامور و باکمال مقتدر شخصیتیں بھی مودب نظر آتی ہیں۔

حضرت شاہ تراب علی قلندر کاکوروی نے ۱۷۶۸ء میں ان ہی باکمال و خدا رسیدہ بزرگ کے گھر میں آنکھ کھولی۔ آغوش پدر و مادر علم و معرفت کا گہوارہ تھی۔ ولایت و کمال کی نشانیاں بچپن سے ہی ظاہر تھیں۔ زمانہ کے دستور کے مطابق ۴ سال کی عمر سے ظاہری تعلیم بھی شروع ہوئی اور اپنے وقت کے نامور علما سے منقولات و معقولات کا اکتساب کیا والد گرامی نے بھی ظاہری و باطنی تعلیم دی اور ہمہ وقت اپنے ساتھ خانقاہ پر رکھا۔ اٹھتے بیٹھتے مسائل و رموز تصوف سے آگاہ کیا۔ مشکل ترین اذکار قلندریہ خود کراتے اور ان کی مداومت کرائی اور ایسی بے نظیر تربیت فرمائی کہ لائق و فائق صاحبزادہ نکھر کر کندن بن گئے۔ فرزند عزیز نے ۱۸۰۶ء میں والد گرامی کے وصال کے بعد تقریباً ۴۵ سال تک ان کے سجادہ کو زینت بخشی۔ اپنی بکثرت تصانیف۔ فارسی و اردو و ہندی شاعری کے ذریعہ مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونکی۔ لوگوں کو اخلاق و کردار کی نعمت سے مالا مال کیا اور نہ معلوم کتنوں کو دولت باقی سے بہرہ یاب کیا ؎

دود آہ سینۂ سوزان من
سوخت ایں افسردگان خام را

(میرے قلب سوزاں کی آہوں کے دھوئیں نے ان افسردہ خام لوگوں کو جلا ڈالا ہے)

یہاں مختصراً صرف آپ کی اردو شاعری پر روشنی ڈالنا مقصود ہے کہ کس طرح آپ نے اپنے دور کے معاشرہ کی اخلاقی سطح بلند کی۔ عیش و نشاط میں ڈوبی اودھ کی فضا کو ایک ایسے ذہنی و فکری انقلاب سے دوچار کیا کہ ہر شخص یہ کہتا نظر آیا ؎

پھر ہو سرگرم تکلم اسی انداز کے ساتھ
حسن کو دینے لگے شعلہ آواز کے ساتھ

آپ کا کلام عمل و خیر کا ایک موثر پیغام ہے۔ مجازی مضامین استعاراتی زبان سب کی داخلی رو حقیقت ہی حقیقت ہے۔ تصوف کے دقیق ترین مسائل پانی کی طرح حل فرمائے۔ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کے بزرگوں کی آج تک

یہی روش رہی ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

(دلبروں کے بہترین اسرار وہی ہیں جو دوسروں کے لب ولہجہ میں بیان کیے جائیں)

انداز بیان اس قدر سادہ و سلیس اور دلنشیں و عام فہم ہے کہ دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ شاعری اصلاحی بھی ہے مگر خاص بات یہ ہے کہ تبلیغ واصلاح اور معاشرہ و سوسائٹی کی اخلاقی سطح بلند کرنے اور وعظ و پند ونصائح کے باوجود زبان بوجھل اور اکتادینے والی نہیں ہے۔ پوری پوری عاشقانہ غزلیں ہیں مگر کمال یہ ہے کہ مقطع میں کوئی ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ قلب انسانی مجاز سے یکسر حقیقت کی طرف مڑجاتا ہے۔

تکبر و انانیت سے بچنے اور خاکساری کی کیسی دلفریب تلقین فرماتے ہیں۔

طینت آدم کی خاکساری ہے
جو تکبر کرے وہ ناری ہے

عیب جوئی، غیبت و بدگوئی اور بدخواہی سے بچنے کی ترکیب یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔ دوسروں کے عیبوں پر نظر نہ ڈالے اور نہ ان کی برائی سے اپنی زبان آلودہ کرے بلکہ اپنے کو دوسروں سے کمتر سمجھے کہ اسی میں بڑائی ہے ؎

عیب جوئی غیر کی کرنا برا ہے مدعی
خود نظر کرتا نہیں اپنے برے اعمال تو

توسب سے آپ کو ناقص تراب سمجھے جا
یہی تو دیکھتے ہیں ہم بڑا کمال تیرا

بدوہی ہیں آپ کو جو جانتے ہیں سب سے نیک
آپ کو جو سب سے کم سمجھیں وہ سب سے بیش ہیں

خود بینی وانانیت اور خود پرستی سے بچنے کی تلقین فرماتے ہیں۔

جب تک خودی ہے تب ہی تلک ہے خدا جدا
غیبت گر آپ سے ہو تو حق کا ظہور ہے
کیوں نہو واصل بحق نکلے جو عالم سے تراب
بندہ جب چھوٹے خودی سے تو خدائی نقد ہے

لسان الغیب حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

میان عاشق ومعشوق ہیچ حائل نیست
تو خود حجاب خودی حافظ از میان برخیز

آخر میں انسانیت کی عدم موجودگی پر فیصلہ فرمادیتے ہیں۔

جس میں انسانیت نہ ہو کچھ بھی
وہ تو حیوان شکل آدم ہے

ہوا و ہوس اور حرص وطمع سے پرہیز کی تلقین اس طرح ہے ؎

دل کو خراب آرزوئے نفس نے کیا
دل صاف وہ ہے جس میں کوئی آرزو نہ ہو

نفس کی اصلاح کر پہلے ریاضت سے تراب
بے شکست نفس امارہ ظفر ملتی نہیں

ایک صوفی تمام انسانوں کو اکائی کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور یہی چیز انسانیت کی بقا کے لئے ضروری ہے اس کی نظر میں عالم عین حق ہے غیر حق عالم نہیں۔ ان دونوں باتوں کی کیسی ترجمانی فرماتے ہیں ؎

نیک و بد سب ہیں تراب اس کے ظہور اسما
مجھ کو یک رنگ نظر چاہئے ہر فرد کے ساتھ

جیسے موجیں عین دریا ہیں حقیقت میں تراب
ویسے عالم عین حق ہے غیر حق عالم نہیں
ایک قطرہ بھی نہ پایا میں نے پانی کے سوا
جز وایسا کون ہے جس میں وجود کل نہیں

کعبہ ہو یا بتکدہ ہو یا رو
ہیں دونوں اسی طرف کی راہیں
گر آنکھ کھلے تو صاف دیکھو
ڈالے ہے گلے میں یار باہیں

حضرت مولینا روم رح فرماتے ہیں۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند
میل آں اندر دلش انداختند

ہر شخص کو کسی نہ کسی کام کے لیے پیدا کیا گیا اس کی چاہت اس کے دل میں ڈال دی گئی۔

دوست کا کام فائدہ پہنچانا، دشمن کا کام تکلیف و بدی میں سرگرداں رہنا ہے انسانیت کی اقدار میں یہ چیز بھی ہے کہ دشمن کی بدی اور ایذا رسانی پر لب کشائی بھی نہ کی جائے۔ اس کا معاملہ پیدا کرنے والے پر چھوڑا جائے اور اس کے بدلہ میں برائی کرکے اپنی زبان آلودہ نہ کی جائے۔ بلکہ خاموشی اختیار کی جائے۔

شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

گر گزندت رسد ز خلق مرنج
کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج
گرچہ تیر از کماں ہمی گزرد
از کماندار بیند اہلِ خرد

(اگر تم کو لوگوں سے کوئی تکلیف پہنچے تو رنج مت کرو کیوں کہ ان سے نہ آرام ملتا ہے اور نہ تکلیف اگرچہ تیر کمان سے نکلتا ہے مگر صاحب عقل کمان کھینچنے والے کی طرف سے اُسے سمجھتا ہے۔)

حضرت رح بڑی سلیس زبان میں نصیحت فرماتے ہیں۔

یارو دشمن کی بدی پر منھ نہ کھولو چپ رہو
عیب اس کو کرنے دو تم کچھ نہ بولو چپ رہو
کہہ لے جو چاہے مخالف حرف ناموزوں نہیں
سُن کے دل کو صبر کی میزاں پہ تولو چپ رہو
ہم تو بدخواہ نہیں اپنے مخالف کے تراب
جو بدی ہم سے کرے اس کی خدا خیر کرے

حدیث شریف: اماطۃ الاذی عن الطریق صدقۃ۔ تکلیف دہ چیز کا راستہ سے ہٹا دینا کارِ ثواب ہے کی ترجمانی فرماتے ہیں ؎

دفعِ ایذا جس قدر ہو آپ سے کرتے رہو
دُور کر دو گر پڑا ہو راہ میں خار ببول

انسانیت کی بقا کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان مادی چیزوں پر تکیہ نہ کرے ان کے پیچھے نہ جان دے نہ جان لے کیوں کہ دنیا چند روزہ ہے۔ انسان کو بے ثباتی روزگار کا یقین رکھنا چاہیئے۔ فنا ہر ایک کے لیے مقرر ہے۔

فنا کی سیر جس کو دیکھنا ہو
تماشا باغ کا دیکھے خزاں میں

چشم عبرت سے ہم نے دیکھا خوب
اس جہاں کا عجیب عالم ہے
پھول ہنستا ہے اور کلی چپ ہے
منھ پہ دونوں کے روتی شبنم ہے

چند روزہ ہے دنیا اس کی کیا بنیاد ہے
جو غرور اس پر کرے فرعون ہے شداد ہے
اس جہاں کے رنج و راحت کا نہیں کچھ اعتبار
ایک دم میں جو یہاں خوش ہے وہی ناشاد ہے

غرض کہ جس طرح انسانیت کے اقدار کی معنویت و ضرورت ہر دور میں رہے گی اسی طرح حضرت شاہ تراب علی قلندر کاکوروی رح کے کلام کی مقبولیت و معنویت بھی ہر زمانہ میں باقی رہے گی اور آپ کا یہ شعر ہمیشہ یاد رہے گا۔

رہے گا ذکر مرا قصہ و فسانہ میں
مجھے بھی یاد کریں گے کسی زمانہ میں

اُردو گلستاں

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا منتخب رُوزنامچہ

۲۸ر جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ، ۲۰ر نومبر ۱۹۳۰ء
پنجشنبہ۔ دھلی

سیاسی } میرے جسم کا مرض اپنے کام میں مصروف ہے اور صحت اپنا کام کر رہی ہے۔ یہی حال ہندوستانی گورنمنٹ اور رعایا کا ہے۔

قومی } میں ایک بیمار قوم کا علیل فرد ہوں اور آج سفر بھی کرنا ہے اس لئے روزنامچہ کی مقررہ ترتیب ملتوی کرکے صرف ذاتی واقعات جمع کرتا ہوں۔ جب سفر و مرض سے آزادی ملے گی تو پھر ترتیب مقررہ کی موافق روزنامچہ لکھنے لگوں گا۔

تلقین حیات } اپنے جسم پر اس کی طاقت سے زیادہ کام کا بوجھ ڈالنا کام کی مقدار کو بڑھاتا مگر عمدگی کو خراب کر دیتا ہے۔

زکام کا حلیہ } گلے میں سل سلاہٹ اور خراش شروع ہوتی ہے۔ پھر چھینکیں آتی ہیں رطوبت بہتی ہے۔ ناک نہیں بہتی مگر کہتے ہیں ناک بہتی ہے۔

زکام کی پہلی رات ہجر و فراق یا پھانسی کی رات سے زیادہ خراب ہوتی ہے۔ اگر میں مجنوں ہوتا اور لیلیٰ وعدہ کرتی کہ میں کل رات کو ملنے آوں گی اور وہ رات زکام کی پہلی رات ہوتی تو میں لیلیٰ کو کہلا بھیجتا کہ جناب عالی کل کا آنا ملتوی فرمائیں کیونکہ کل زکام کی پہلی منحوس رات ہے اور میرے ہاں اس رات بہت سی چڑیلیں (چھینکیں) مہمان ہوں گی اور وہ ایسی بے تمیز ہیں کہ سرکار عالیہ کے روخ زیبا پر بذریعہ منجنیق (ناک) رطوبت بطریق فوارہ پھینک دیں گی۔

اور اگر لارڈ اِرون مسٹر کنگم پرائیویٹ سکریٹری کو بھیجتے کہ کل کی ایک رات تم ہماری جگہ لاٹ صاحب بن جاؤ ہم ذرا باہر جا رہے ہیں تو میں کہدیتا کہ اگر گورنمنٹ ہاؤس کے دو سو کمروں میں ہر پلنگ کے پاس دانہ عناب۔ گاؤزبان گل بنفشہ مصری جوش کردہ رکھی ہو تو میں اس قائم مقامی کو قبول کر سکتا ہوں ورنہ جناب معاف کیجے کل تو میرے زکام کی پہلی رات ہے۔

زکام کا دوسرا دن اور دوسری رات اعضا شکنی بخار اور افسردگی اور آزردگی بے سبب کا زمانہ ہوتا ہے بڑے بڑے ٹھنڈے مزاج والے پولس کے تھانہ دار بن جاتے ہیں۔

آج ۲۰ر نومبر ۱۹۳۰ء کو میرے زکام شدید کی پہلی رات ختم ہوئی اور دوسرا دن شروع ہوا۔

ذاتی } صبح سے نو بجے تک لکھواتا رہا۔ پھر دہلی کی تیاری ہوئی۔ گھر میں گیا۔ سید ابن عربی بھی

دہلی ساتھ جائیں گے۔ میاں عزیز محمد خاں سفر میں ہمراہ ہوں گے۔

دہلی کے کام پورے کرکے واحدی صاحب کے ہاں آیا۔ ساڑھے گیارہ بجے ریل پر گیا۔ مستری عشقی نظامی اسٹیشن پر ملنے آئے۔ جگہ اچھی مل گئی۔ جنرل مہر محمد خاں صاحب بھی اسی ٹرین میں ہیں یہ نواب صاحب مالیر کوٹلہ کے بہنوئی ہیں اور میرے قدیمی کرم فرما ہیں۔ ملٹری سکریٹری محمد حسین صاحب بھی اسی ٹرین میں ہیں۔ کوٹلہ جا رہے ہیں۔ ٹرین دہلی سے ساڑھے بارہ بجے روانہ ہوئی۔ میں لیٹ گیا۔ نزلہ کی تکلیف زیادہ ہے۔ کچھ دیر کے بعد تحریری کام شروع کیا۔ میاں عبدالمجید صاحب بی اے۔ ڈے انسپکٹر ریلوے جیند رفیق سفر ہیں یہ میاں سر محمد شفیع کی برادری میں ہیں اور بہت مخلص مسلمان ہیں۔

مضامین اور خطوط کے جوابات تیار کرتا گیا اور راستہ کے مختلف اسٹیشنوں پر لیٹر بکس میں ڈلواتا گیا۔ نروانہ پر بھوک لگی چار پوریاں اور مرچوں کا اچار خریدا پھر چار پوریاں اور لیں۔ اور سب کو کھا لیا۔ مرچ کے اچار سے منہ کا مزہ خوش ہو گیا۔

نروانہ کو جب دیکھتا ہوں اپنی مرحومہ بیوی کو یاد کرتا ہوں۔ یہاں ان کے بھائی تحصیل میں نوکر تھے اور میں ان کے پاس آیا کرتا تھا۔ بیوی بھی یہاں اکثر رہتی تھیں۔

ٹرین لیٹ ہے کہتے ہیں جاکھل پر مالیر کوٹلہ کی ٹرین نہیں ملے گی اور رات بھر جاکھل پر رہنا ہوگا مگر دل کہتا ہے ایسا نہیں ہوگا۔ مجھ بیمار پر قدرت رحم کرے گی۔

جاکھل آ گئی۔ کوٹلہ کی ٹرین خوب تیز بھاگنے اور سانس چڑھنے اور ہر پھول ڈاکو کی طرح دوڑنے کے بعد مل گئی۔ ہر پھول کی اس علاقہ میں بہت دھوم ہے۔ بیس پچیس قتل کر چکا ہے۔ جاٹ ہے ابھی گرفتار نہیں ہوا۔

مالیر کوٹلہ پر ٹھیک ساڑھے نو بجے رات کو پہنچا۔ میرزا قاسم بیگ صاحب افسر مہمان خانہ موٹر لئے ہوئے موجود تھے۔ گیسٹ ہاؤس میں گیا۔ صاحبزادہ عبدالرحمن خاں نظامی نواب صاحب کے حقیقی بھانجے اور میرے مرید گیسٹ ہاؤس میں موجود تھے۔ محمد عارف قوال دہلوی بھی تھے۔ جو یہاں تیس سال سے نوکر ہیں۔ دہلی کے قدیم قوالوں میں ہیں اور میری درگاہ سے اس خاندان کا جدی تعلق ہے یعنی ان کے بزرگ درگاہ کے قدیمی قوال تھے۔

مرض کے غلبے کے سبب فوراً لیٹ گیا۔ میر ظفر علی صاحب پرائیویٹ سکریٹری نواب صاحب کی طرف سے میری آسائش کے انتظامات دیکھنے آئے۔ مالیر کوٹلہ کا گیسٹ ہاؤس دوسری بڑی بڑی ریاستوں سے بھی اچھا اور آرام دہ مہمان خانہ ہے۔ اسباب آسائش بہت اعلیٰ اور با سلیقہ ہے اور نواب صاحب مالیر کوٹلہ کی نفاست طبع کو ظاہر کرتا ہے۔ گیارہ بجے سویا۔ مگر ساری رات بخار چڑھا رہا اور دماغی کرب سے جنگ ہوتی رہی۔ شروانی پٹھانوں کی حکومت میں ہوں لڑائی سے کیوں محروم رہنا۔

۲۹ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۲۱ نومبر ۱۹۳۰ء
جمعہ۔ مالیر کوٹلہ

ذاتی } سردی خوب ہے ناشتہ کے بعد ڈاکٹر محمد عمر صاحب کی دوا پی۔ بخار موجود ہے۔ اور میں ابن اسد اللہ الغالب بھی موجود اور بخار پر غالب ہوں۔ افسر مہمان خانہ اور صاحبزادہ عبدالرحمن خاں نظامی اور میر ظفر علی صاحب پرائیویٹ سکریٹری وغیرہ عہدہ دار ملنے آتے رہے محمد عارف قوال بھی ملنے آئے۔ دھوپ میں چہل قدمی کی۔ لکھنے کی ہمت نہ ہوئی تاہم ناغہ کی خواہش نفس کو باقاعدگی کی قوت ارادی سے توڑنے کے لیے کچھ لکھا۔ درد سر برٹش گورنمنٹ کے موجودہ سیاسی درد سر سے زیادہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ لکڑی لے کر لوگوں کے پیچھے دوڑتی ہے اور میں ہنسی خوشی اپنے ہاتھوں خریدے ہوئے مرض کو برداشت کر رہا ہوں۔ البتہ اگر بدقسمتی سے میں بھی برٹش گورنمنٹ ہوتا تو شاید میں بھی کانگریس والوں کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑتا۔

بارہ بجے نواب صاحب نے موٹر بھیجی اور میں محل میں گیا۔ محل نواب صاحب کے دل کی طرح وسیع اور روشن ہے۔ آرائش بہت قیمتی ہے اور سلیقہ کی سجاوٹ اس سے زیادہ بیش قیمت ہے۔ خدا دولت دے تو سلیقہ بھی دے ورنہ دنیا کی دوزخ میں ڈالنا ہو تو کسی دولت مند مارواڑی کے گھر میں جنم دیدے۔

نواب صاحب سے باتیں ہوئیں۔ پھر میز پر گئے آغا طباطبائی صاحب ایرانی جو نواب صاحب رامپور کے کے ایک خاص معتمد ہیں آج ہی رامپور سے آئے ہیں وہ بھی میز پر تھے۔ نواب صاحب نے تعارف کرایا۔ ایرانی چہرہ عراقی لباس علم اور عقل آنکھوں سے عیاں۔ عمر زیادہ نہیں ہے مگر روشن خیال اور بہت تجربہ کار عالم ہیں۔ ولی عہد صاحب اور ان کے بھائی بھی میز پر تھے کھانے انگریزی اور دیسی دونوں تھے تاکہ وہ تعاون ظاہر ہو جو ریاستوں میں نئی تہذیب سے ہو رہا ہے۔

کھانے کے بعد نواب صاحب کام میں مصروف ہوئے اور میں نے ولی عہد صاحب اور ان کے بھائی اور آغا صاحب سے باتیں کیں۔ آغا صاحب کی دلچسپ اور علمی باتوں کا خوب لطف رہا۔ وہ نواب صاحب رامپور (حال) کے بہت خیر خواہ ہیں اور ولی عہدی کے ایام میں جب کوئی مشکل پیش آتی تھی تو آغا صاحب سینہ سپر ہو کر موجودہ نواب صاحب کی حمایت کرتے تھے۔

ان کی وجہ سے آج میں نے ایران کی ذہانت اور موجودہ علمائے ایران کے خیالات کی رفتار کو اچھی طرح غور کر کے سمجھا۔ اگرچہ درد سر اعضا شکنی اور ہلکا بخار کان میں کہتا رہا کہ چلو ذرا لیٹیں۔

ڈھائی بجے رخصت ہو کر نواب صاحب کی بہن کے مکان پر گیا۔ منصب علی خاں صاحب نائب ہوم ممبر ہمراہ تھے۔ عبدالرحمن خاں نظامی بھی تھے۔ ان کی لڑکی روحہ کی برابر ہے اور بڑی ذہین ہے۔ میں نواب صاحب کی بہن سے باتیں کر رہا تھا کہ بھاگی ہوئی گئی اور نہایت ادب اور سلیقہ سے پان لے کر آئی اور تھالی دونوں ہاتھوں پر لے کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے روحہ یاد آگئی وہ بھی ایسے ہی ادب سے پان دیتی ہے۔

کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہوا۔ مہمان خانہ میں آیا۔ منصب علی خاں صاحب سے باتیں کیں وہ علالت کی وجہ سے آج کل رخصت پر ہیں۔

چار بجے پھر موٹر آئی اور میں نے نواب صاحب سے تخلیہ میں ملاقات کی۔ اس کے بعد ٹینس کورٹ میں نواب صاحب لے گئے وہاں عبدالرحمن خاں نظامی کا لڑکا زید کی برابر موجود تھا جس کو نواب صاحب ہمیشہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ میں نے کہا کیوں میاں میں عورت ہوں یا مرد۔ غور سے صورت دیکھ کر بولا تم آدمی ہو عورت مرد نہیں ہو۔ میں نے سر کے لمبے بال دکھا کر کہا بھلا کہیں کسی آدمی کے اتنے بڑے بال بھی ہوتے ہیں۔ کہنے لگا وہ دیکھو میرے نوکر کے بھی بال ہیں۔

آغا صاحب سے بھی خوب باتیں ہوئیں۔ ولی عہد صاحب کے کمرہ میں نماز پڑھی۔ پھر ولی عہد صاحب اور آغا صاحب سے دیر تک باتیں کیں۔ ولی عہد صاحب اپنے سفر یورپ کے حالات سناتے رہے۔ وہ نہایت مہذب اور نیک نوجوان ہیں۔ ہندوستان میں مجھ کو صرف دو ریاستیں ایسی معلوم ہیں جہاں ولی عہد اور ان کے باپ میں اختلاف نہیں بلکہ عشق ہے۔ ایک مالیر کوٹلہ۔ دوسری مانگرول اور یہ باپ کی عمدہ تربیت کا نتیجہ ہے۔

مہمان خانہ میں گیا۔ احباب ملنے آئے۔ آٹھ بجے پھر نواب صاحب سے تخلیہ میں ملا۔ اس کے بعد اسٹیشن پر گیا۔ ملٹری سکریٹری اور میرزا قاسم بیگ صاحب نے ساتھ دیا۔ بخار بڑھ گیا ہے ناک سے خون بھی آرہا ہے۔ جاکھل کے راستہ جانا ملتوی کر کے لودھیانہ کے راستہ کا ٹکٹ بدلوایا۔ لودھیانہ ساڑھے گیارہ بجے رات کو پہنچا۔ خوب بخار۔ خوب سردی۔ بارہ بجے بمبئی میل آئی۔

بہت کوشش کی مگر جگہ نہ ملی۔ آخر ویٹنگ روم میں ڈھائی گھنٹہ پڑا رہا۔ مسافر بہت تھے وہاں بھی آرام نہ ملا۔ ڈھائی بجے فرانٹیر میل آیا اس میں جگہ مل گئی فرسٹ کلاس گاڑی تھی اس کو سکنڈ بنا دیا تھا۔ دہلی کے ایک ہندو کپڑے والے رفیق سفر ہوئے اور میں سفر اور مرض کے دریا میں ڈوب کر غوطے کھاتا رہا۔ رات بھر بیچین رہا۔

۳۰ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ ۲۲ نومبر ۱۹۳۰ء
شنبہ۔ سفر جاورہ

ذاتی } مالیر کوٹلہ سے کئی جیبی رومال لئے تھے وہ سب ناک کے خون سے سرخ ہو گئے ہیں۔ رات سے برابر خون آرہا ہے۔ بخار بھی ہے۔ سات بجے خواب گاہ سے جدا ہوا اور اس کو بیداری کا گھر بنایا۔ گاڑی ایسی شاندار ہے کہ میں اس وقت ہز ہائی نس نواب بخار الدولہ بنا ہوا ہوں۔ آٹھ بجے دہلی آگئی۔ سید ابن عربی۔ واحدی صاحب۔ مولانا سیفی صاحب۔ مسٹری عشقی نظامی انور علی نظامی اور رحمالی صاحب موجود تھے۔ گھر سے کھانا۔ گرم کپڑے اور ڈاک بھی آئی تھی۔ ٹکٹ بھی تیار تھا۔

واحدی صاحب نے کہا بخار اور تکلیف کی حالت میں سفر مناسب نہیں ہے۔ اگر آج دن بھر آرام کر کے رات کو سفر کیا جائے تو کیا ہرج ہے۔ میں نے کہا حالت تو بیشک اسی بات کو چاہتی ہے مگر قوت ارادی کی توہین نہیں کر سکتا۔ وہ سفر کے لئے مستعد اور تکلیف سے بے پروا ہے۔

محمد جعفری صاحب اڈیٹر روزانہ اخبار ملت بھی اسٹیشن پر تھے۔ مجھ سے بھی ملے۔ مولانا محمد عرفان صاحب بمبئی جا رہے ہیں ان سے ملنے آئے تھے۔

دہلی سے چلا تو سارے درجہ میں اکیلا تھا۔ ڈاک پڑھی۔ اخبار پڑھے۔ ناک سے لال لال خون برابر آرہا ہے۔ جب ناک سنکتا ہوں کئی ماشہ تازہ خون رومال پر آجاتا ہے۔ بزرگوں نے لڑائی کے میدانوں کی ریت پر خون بہایا تھا۔ میری ناک انگریز ملک کے بنے ہوئے رومال پر خون بہا رہی ہے۔ اس خون ریزی سے ملک ملتے تھے اور اس خون ریزی سے طاقت کم ہوتی ہے۔

مولانا محمد عرفان صاحب بھی اپنے درجہ سے میرے پاس آگئے اور ڈیڑھ گھنٹے خوب باتیں ہوئیں جنگ صفین میں ان کی طرف سے۔ جو غلط فہمی مجھ کو ہو گئی تھی انہوں نے اس کی صفائی بھی کی۔ درحقیقت وہ بہت صاف اور کھرے اور بے لاگ مسلمان ہیں۔ سرحدی عموماً ایسے ہی ہوتے ہیں۔

مولانا نے بعض اشخاص کے مخفی حالات بھی سنائے جن کو سن کر مجھے بہت عبرت ہوئی۔ مولانا کے درجہ میں محمد مسیح نام کے ایک گورے چٹے مسلمان نوجوان ہیں۔ مجھ سے تعارف ہوا تو میں نے کہا یہ تیسرے جواہر لال ہیں۔ جواہر لال سے صورت میں مشابہ انبہٹہ کے ایک کانگریسی مسلمان دیکھے تھے۔ آج تیسرے جواہر لال کو اور دیکھا۔ یہ برہمن بچہ جب جنم لیتا ہے مسلمان کے گھر میں جنم لیتا ہے کاش آج کل علی حزیں زندہ ہوتا۔

محمد مسیح گاتے بھی خوب ہیں۔ کھدر پوش تھے۔ بڑے سخت کانگریسی ہیں۔ مولانا عرفان نے کہا دیکھئے آگ پانی ایک جگہ جمع ہیں۔ میں نے کہا مولانا تم بھی دل کے اندر کانگریسی ہو اور تمہارے علی برادران بھی۔ موجودہ حالت تو محض چند روزہ عارضی ہے۔

شام کو ناک کا خون زیادہ آیا اور اس کی وجہ سے چکر آنے لگے۔ یکایک ایسا معلوم ہوا کہ موت کا وقت آگیا۔ میں چت لیٹ گیا۔ کلمہ پڑھا۔ نبض کو دیکھا۔ چل رہی تھی۔ مگر دم نکلتا معلوم ہوتا تھا۔ خیال آیا تنہائی میں کا مرنا بہت دشوار ہے۔ یکایک تصور میں ایک خوبصورت عورت سامنے آئی اور تصور اتنا بڑھا کہ وہ صورت مجسم ہو کر قریب آگئی۔ اس کے حسن کے منظر سے دل پر اچھا اثر ہوا۔ خیال آیا موت کے فرشتے نے عورت کی شکل اختیار کی ہے۔

دل نے کہا اگر اس کی صورت بری ہوتی تو شائد گھبرا کر میری جان بدن سے نکل جاتی۔ فرشتہ اچھی صورت میں آیا ہے میں تو ابھی اپنی روح اس کے حوالہ نہ کروں گا۔

چکر بڑھے تو غشی کی سی حالت ہوگئی اور خیال و تصور کے مناظر نیست ہوگئے۔ پندرہ منٹ کے بعد ہوش درست ہوگیا۔ ریل بہت تیز چلتی ہے اور بہت ہلتی ہے۔ اس کی وجہ سے بھی دماغ چکر میں تھا۔

آٹھ بجے رات کو انگریزی کھانا ڈائننگ کار سے آیا۔ خوب کھایا۔ چکر جاتے رہے کمزوری بھی ان چکروں کا ایک سبب تھی۔

نو بجے رتلام آگیا۔ مولانا محمد عرفان صاحب اور محمد مسیح صاحب سے رخصت ہوا۔ جاورہ کی چھوٹی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ اس میں گیا۔ بھیڑ بہت تھی۔ لوگ اجمیر شریف اسی ٹرین سے جاتے ہیں۔ مجبوراً فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیا۔ محمود حسین صاحب ایک نوجوان کبھی دہلی میں مجھ سے ملے تھے انھوں نے بہت خدمت کی ٹکٹ لائے۔ پانی پلایا۔ دہلوی کی باتیں کیں۔ سوا دس بجے ٹرین چلی اس عرصہ میں بہت لوگ ملنے آتے رہے۔

گیارہ بجے ٹرین جاورہ پہنچی۔ میر منشی کفایت اللہ صاحب نواب صاحب کی طرف سے خیر مقدم کے لئے موجود تھے۔ موٹر بھی تھی۔ سوار ہوکر پہلے قیام گاہ پر گیا جو ایک بلند پہاڑی پر نہایت خوبصورت اور آراستہ بنگلہ ہے برقی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔

چند منٹ قیام کرکے پھر روانہ ہوا اور نواب صاحب کے محل میں گیا۔ جہاں قوالی کی مجلس تھی۔ آج ریاست میں رجب کا پہلا چاند دیکھا تھا۔ اسی حساب سے یہاں بھی پہلی مجلس ہے نواب صاحب سالہا سال سے حضور خواجہ صاحب اجمیریؒ کا سالانہ عرس بہت دھوم سے کرتے ہیں۔

میں نواب صاحب سے کبھی نہیں ملا نہ ان کو کبھی دیکھا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں ایک دفعہ جاورہ آیا تھا جبکہ فخر الدین نظامی میرے ایک مرید یہاں انجینیر تھے اور میں مدینہ شریف جارہا تھا۔ اس وقت بھی نواب صاحب کو نہیں دیکھا تھا۔

مجلس کے اندر گیا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ قوالی ہورہی تھی۔ برقی روشنی خوب تیز تھی۔ نواب صاحب مسند سے اٹھ کر استقبال کے لئے بڑھے۔ مصافحہ کیا میرے ہاتھ اپنے سر پر رکھے۔ قوالی بہت ہی پرکیف تھی۔ سید بنے میاں شاہ صاحب نظامی نیازی شریک محفل تھے۔ وہ میرے بیس سال کے ملنے والے ہیں۔ خوبصورت اور نیک سیرت اور بچپن سے درویش ہیں۔ عمر کا بڑا حصہ جاورہ میں گذارا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں بھی یہاں ملے تھے۔ اسرار سماع کو خوب سمجھتے ہیں اس لئے ان کے کیف میں دوسروں کو بھی کیفیت آتی ہے۔

مجلس میں نواب صاحب کا حسن ادب حسن اعتقاد اور حسن انتظام ہر جگہ موجود تھا۔ ایک جگہ زریں شامیانہ کے نیچے زریں مخملی مسند پر سیاہ کمبل کا خرقہ رکھا تھا اور اس پر پھولوں کا ڈھیر تھا۔ سامنے دو چوبدار سنہری چوبیں لئے ادب سے کھڑے تھے۔ یہ خرقہ نواب صاحب کے پیر حضرت جہانگیر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خلافت کے ساتھ نواب صاحب کو دیا تھا اور نواب صاحب بہت عزت و عظمت کے ساتھ اس کو رکھتے ہیں۔

ڈھائی بجے قوالی ختم ہوئی۔ اس کے بعد نیاز ہوئی پہلا شجرہ صابریہ پڑھا گیا جو حضرت جہانگیر شاہ صاحب کا تھا۔ دوسرا شجرہ نظامیہ پڑھا گیا جو حضرت مذاقؒ بدایونی کا تھا۔ نواب صاحب کے والد حضرت مذاقؒ کے مرید تھے۔

آخر میں نواب صاحب نے اپنا سر خرقہ شریف کے سامنے زمین پر رکھا اور خرقہ کو بوسہ دیا اور مجلس برخاست ہوگئی۔ تین بجے کے بعد قیام گاہ پر آیا۔ دل پر آج کی مجلس کا بہت ہی زیادہ اثر تھا کیونکہ

اس میں اخوان زمان مکان کی سب شرائط موجود تھیں۔

ختم مجلس کے بعد ایک خاص منظر اور بھی دیکھا جس کا میرے دل پر بے حد اثر ہوا کہ بہت سے غریب جن کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور ظاہری حالت ایسی خراب تھی کہ ان کو کسی رئیس کی محفل میں جوتیوں کے قریب بھی آنے کی اجازت نہ ملتی آگے بڑھے اور نواب صاحب سے گلے ملنے لگے۔

میں نے حیرت سے دیکھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

نواب صاحب نے فوراً مجھ سے کہا یہ میرے پیر بھائی ہیں۔

یہ جواب سن کر میرے قلب میں وجد کی حالت پیدا ہوگئی اس چودھویں اور بیسویں صدی کے فرعونی ایام غرور میں ایسے نواب بھی ہیں جو غریب اور شکستہ حال بھائیوں کو مجمع عام میں گلے سے اور سینہ سے لگاتے ہیں اور فخر کرتے ہیں کہ یہ میرے پیر بھائی ہیں۔

یہ میری زندگی کی بہت بڑی رات تھی جبکہ میں نے ایک بڑے فرمانروا مسلمان کو اس شان کی اسلامی مساوات پر عمل کرتے دیکھا۔

رات کو سویا تو خواب میں بھی اس فردوسی نظارہ کو دیکھتا رہا۔ کیونکہ قلب و دماغ پر اس کا بہت اثر ہوا تھا۔

یہاں سردی کم ہے۔ نیند خوب آئی مگر مرض کا اثر موجود ہے۔

یکم رجب ۱۳۴۹ھ/ ۲۳ نومبر ۱۹۳۰ء
یکشنبہ۔ جاورہ

ذاتی } رات کو چار بجے سویا تھا۔ اس لئے سات بجے تک آنکھ نہ کھلی۔ بخار بہت خفیف ہے۔ ناک سے خون آرہا ہے۔ ساڑھے سات بجے غسل کرکے ناشتہ کیا۔ پھر دھوپ میں چہل قدمی کی۔ اس کے بعد پھر لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا تاکہ بہشت کا لطف حاصل کروں کیونکہ نہایت عمدہ محل ہے بہت اچھا نظارہ ہے۔ جاورہ کی آبادی اور دور تک پہاڑوں اور جنگلوں کا نظارہ اس کوٹھی سے ہوتا ہے۔ ہوا نہایت عمدہ ہے اور ملنے والوں کا ہجوم بھی نہیں ہے۔ سکون اور سکوت اعلیٰ نعمت موجود ہے اور اسی کا نام بہشت ہے۔

میر منشی کفایت اللہ صاحب نہایت عمدہ پان بنوا کر لائے۔ میں نے بے تکلفی سے خوابگاہ میں بلا لیا اور لیٹے لیٹے باتیں کیں۔ حکیم محب نبی صاحب بھی تشریف لاتے۔ دہلی کے تعلیم یافتہ ہیں۔ یہاں کے سب سے بڑے لائق طبیب مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے مرض کے حالات دریافت کرکے دوائیں تجویز کیں۔

دوپہر کو کھانا کھا کر چہل قدمی کی اور ظہر کے بعد سو گیا۔ دو گھنٹے سویا۔ اس کے بعد ہز ہائی نس نواب صاحب تشریف لائے۔ اشفاق احمد صاحب زاہدی دہلوی اور بنے میاں شاہ صاحب وغیرہ اصحاب بھی ہمراہ تھے۔ نواب صاحب سے بہت دیر تک بزرگان دین کی باتیں ہوئیں۔ نواب صاحب کا دل و دماغ تصوف کے مضامین کے لئے اس قدر موزوں ہے کہ مہاراجہ سرکشن پرشاد صدر اعظم حیدرآباد کے بعد اپنی زندگی میں نواب صاحب جاورہ کے سوا اور کسی شخص کو میں نے ایسا نہیں دیکھا ان کو صابریہ سلسلہ کی خلافت حضرت جہانگیر شاہ صاحب سے ملی ہے اور نظامیہ سلسلہ کی خلافت جناب سید ایثار علی شاہ صاحب بدایونی سے ملی ہے اور وہ یقیناً ان دونوں خلافتوں کے اہل اور مستحق ہیں بنے میاں شاہ صاحب نیازیہ سلسلہ کے درویش ہیں۔ ان کی صحبت اور ہم نشینی بھی نواب صاحب کے موجودہ کیف روحانیت کا ایک سبب ہے۔

ایک گھنٹہ باتیں کرنے کے بعد نواب صاحب مجھ کو ہمراہ لے کر سیر کرنے گئے۔ بنے میاں شاہ صاحب اور سید نرالے میاں صاحب بھی ہمراہ تھے۔ نواب

صاحب خود موٹر چلا رہے تھے۔ میں نے کہا مرکب بھی
اچھا ہے اور اس مرکب کا رہنما (ڈرائیور) بھی اچھا ہے۔
راستہ میں جو ہندو مسلمان ملتے تھے نہایت ادب سے
سر جھکا کر نواب صاحب کو سلام کرتے تھے۔ وہ اپنی
تمام رعایا کے محبوب ہیں جاورہ سے زیادہ آجکل غالباً
کسی ریاست کی رعایا اپنے حکمراں کی اتنی شیفتہ اور
فریفتہ نہ ہوگی افتخار علی خاں فرمانروا جاورہ حاکم بھی
ہیں۔ سپاہی بھی ہیں۔ درویش بھی ہیں اور متقی فقیہ
بھی ہیں اور ایک اعلیٰ پالیٹیشن بھی ہیں جو انگریزی
پالٹکس اور ہندوستانی پالٹکس کو بہت خوب
سمجھتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ وہ مجسم دل ہیں اور اپنے
دل سے اپنے دماغ پر حکومت کرتے ہیں۔ اسی لئے آج
میں نے کہا کہ وہ دل شاہ ہیں۔

جاورہ کی آبادی سے کئی میل باہر جاکر جنگل میں
مغرب کی نماز پڑھی۔ بہت پرلطف جماعت تھی نماز کے
بعد واپسی ہوئی۔ نواب صاحب اپنے پیرومرشد
حضرت جہانگیر شاہ صاحب کے حالات سناتے رہے
اور انھوں نے چند اور محدود خیال درویشوں کا بھی
تذکرہ کیا۔ آج حکیم صاحب کی دوا استعمال کی۔ فائدہ
معلوم ہوتا ہے۔ بخار بھی نہیں ہے اور ناک کے خون
میں بھی کمی ہے۔ جس بنگلہ میں میرا قیام ہوا ہے اس کو
پہاڑ کی چھوٹی کوٹھی کہتے ہیں۔ اسی کے قریب ایک اور
بڑی کوٹھی ہے۔ جس میں نواب صاحب کے بچے ایک
انگریز اتالیق کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس کوٹھی کا نام
پہاڑ کی بڑی کوٹھی ہے۔ میں نے کہا بڑی کوٹھی نواب
صاحب کے پیر کے نام پر جہانگیر منزل ہے اور چھوٹی کوٹھی
نواب صاحب کے والد کے پیر کے نام پر مذاق منزل
ہے کیونکہ وہ حضرت مذاق بدایونی کے مرید تھے۔ اور
سلسلہ کے لحاظ سے پہلی کوٹھی صابریہ اور دوسری
کوٹھی نظامیہ ہے اور میں اتفاق سے نظامیہ کوٹھی
میں ٹھہرا ہوں۔

جاورہ کی ریاست نئی ہے۔ نواب امیر خاں بانی
ریاست ٹونک کے رفیقوں میں نواب غفور خاں صاحب
تھے۔ انھوں نے یہ ریاست حاصل کی تھی۔ نواب غفور
خاں کے صاحبزادہ نواب غوث محمد خاں ہوئے اور
ان کے فرزند نواب اسمٰعیل خاں ہوئے اور ان کے
صاحبزادہ نواب افتخار علی خاں موجود فرمانروا ہیں۔
پچاس کے قریب عمر ہے۔ مگر بالکل نوعمر جوان معلوم
ہوتے ہیں۔ ورزشی جسم ہے۔ نہایت خوبصورت
ہیں۔ رنگ بہت گورا ہے۔ انگریزی لباس پہن لیں تو
بالکل انگریز معلوم ہوں۔ صوبہ سرحد کے مقام صوات بیر
سے ان کا خاندان آیا تھا۔ سنتے تھے پٹھان ولی نہیں ہوتے
مگر نواب افتخار علی خاں اپنی عمدہ صفات اور اچھے اعمال
اور پابندی اسلام اور رعایا نوازی کی وجہ سے پورے
ولی ہیں۔ آج راستہ میں ایک صاحب کا ذکر آیا۔ نواب
صاحب دو لفظ کہنے کے بعد چپکے ہوگئے۔ پھر کہا ایسا
نہ ہو غیبت ہو جائے۔ کسی کے پیٹھ پیچھے کچھ کہنا غیبت
ہے۔ میرے دل پر اس بات کا بہت اثر ہوا۔ جو مسلمان
غیبت سے احتیاط کرتا ہو وہ یقیناً ولی ہے۔ خدا نے
ان کو اولاد بھی بہت اچھی دی ہے۔ پیارے صاحب
عثمان علی خاں ولی عہد ہیں۔ ان سے چھوٹے مرتضیٰ علی
خاں چندہ صاحب اور احتشام علی خاں اچھن صاحب ہیں
ان سے چھوٹے منور علی خاں منا صاحب ہیں۔ ان سے
چھوٹے ناصر علی خاں آج کل ولایت میں تعلیم پا رہے ہیں۔

رات کو بنگلہ میں کھانا کھا کر زاہدی صاحب دہلوی
سے باتیں کیں وہ میرے دوست منصف نثار احمد صاحب
کے چھوٹے بھائی ہیں۔ دہلی کے اعلیٰ خاندان میں ہیں۔
انھوں نے ہاتھ باچھنے کی ایک بہت عمدہ کتاب لکھی ہے
جو تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ عرصہ دراز سے
جاورہ میں رہتے ہیں۔ نہایت دانشمند اور مردم شناس
نوجوان ہیں۔ انھوں نے کہا اور بالکل ٹھیک کہا کہ موجودہ
نواب صاحب ہر لحاظ سے ایک مکمل حکمراں ہیں اور ان

صفات کا کوئی حکمران ہندوستان میں موجود نہیں ہے۔ دس بجے نواب صاحب کے محل میں گیا۔ میر منشی کفایت اللہ صاحب نے محفل خانے کے سب حصے دکھلائے اور بھی بہت سے عہدہ داروں سے ملاقات ہوئی۔ ظہیر الدین صاحب بھی ملے جن سے نواب صاحب کی صاحبزادی کی نسبت ہوئی ہے۔ سورت کے نواب صاحب کے خاندان میں ہیں۔ محمد عیسیٰ نرالے میاں صاحب دہلی کے سادات نومحلہ میں ہیں اور نواب صاحب کے مصاحب ہیں۔ شجاع الدین خاں صاحب بھی ایڈی سی ہیں۔ میر منشی کفایت اللہ صاحب نے اپنے عزیز ممتاز علی خاں صاحب انجینیئر سے بھی ملاقات کرائی۔ ٹھیک گیارہ بجے نیاز ہوئی۔ دودھ کے آبخوروں پر نیاز دی گئی۔ اس کے بعد قوالی شروع ہوئی۔ بخشا قوال کی چوکی بھی آگئی ہے۔ نواب صاحب نے اس چوکی کے دس آدمیوں کو کمخواب کی پوشاک عطا فرمائی ہے۔ وہ بخشا قوال پر بہت مہربانی فرماتے ہیں۔ آج کی مجلس بھی بہت پر کیف تھی۔ جے پور اور جاورہ کی چوکیاں بھی خوب گائیں اور اجمیر شریف کی چوکی نے بھی جو نواب صاحب کے ہاں ملازم ہے اپنے کمالات کا ثبوت دیا۔ بخشا کا رنگ بھی خوب جما محفل کے سب حاضرین نواب صاحب کے ہاتھ سے قوالوں کو نذر دلواتے تھے۔ نواب صاحب نے بھی اشرفیاں قوالوں کو میرے اور ننھے میاں صاحب کے ہاتھ سے دلوائیں۔ حسب معمول ڈھائی بجے محفل ختم ہوئی اور پھر کل کی طرح نیاز دی گئی۔ یہ طریقہ بھی چشتیہ خاندان کا قدیمی طریقہ ہے کہ سماع سے پہلے بھی قرآن شریف پڑھا جاتا اور آخر میں بھی۔

تین بجے کے بعد بنگلہ پر گیا۔ طبیعت درست ہے بخار بہت کم ہو گیا ہے۔ نزلہ کی تکلیف بھی ہلکی ہو گئی ہے۔

۲ رجب ۱۳۴۹ھ ۲۴ نومبر ۱۹۳۰ء
دوشنبہ۔ جاورہ

ذاتی } پچھلی رات کو جب سویا تو صادق شہید کو بار بار خواب میں دیکھا۔ وہم ہوا کہ گھر میں کوئی بیمار ہے۔ یا صادق شہید کے بچوں کو کچھ تکلیف ہے۔ آٹھ بجے دھوپ میں ناشتہ کے بعد چہل قدمی کی۔ پھر کچھ تحریری کام کیا۔ میر منشی کفایت اللہ صاحب پان لائے۔ اور نواب صاحب اور ان کے عہدہ داروں کی تعریف بیان کرتے رہے۔ اصغر حسین صاحب سول جج اور سرفراز علی خاں صاحب بہادر چیف سکریٹری اور صاحبزادہ شیر علی خاں صاحب کمانڈنگ آفیسر ملٹری سکریٹری اور مسعود علی خاں صاحب کوتوال اور سراج الرحمان صاحب بیرسٹر چیف جج وغیرہ اصحاب کا تذکرہ رہا۔ ننھے میاں صاحب کی بھی بہت تعریف کی گئی۔ میں نے کہا وہ میرے بیس برس کے ملنے والے ہیں اور میں ان کی خوبیوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ کھانے کے بعد کچھ دیر سویا۔ پھر نواب صاحب تشریف لائے اور آج بھی ان سے خوب باتیں ہوئیں۔ میں آج کپور تھلہ جانے والا ہوں نواب صاحب نے فرمایا۔ میں نے رتلام تک موٹر کا انتظام کر دیا ہے۔ زاہدی صاحب آپ کو رتلام تک پہنچانے جائیں گے۔ رخصت کے وقت خوب معانقہ ہوا اور جب میں نے ان کو گلے لگایا تو ان کے قلب کی عجیب کیفیت میرے قلب پر ہوئی۔

ننھے میاں شاہ صاحب بھی ملنے آئے تھے اور نذر بھی لائے تھے۔ رات کو کھانا کھا کر زاہدی صاحب سے دس بجے تک باتیں کیں۔ پھر نواب صاحب کے خاصہ کی موٹر آئی اور اس میں زاہدی صاحب کے ہمراہ روانہ ہوا۔ راستہ بہت سنسان تھا۔ چاروں طرف پہاڑیاں اور جنگل ہے۔ ایک گھنٹہ میں رتلام پہنچ گیا۔ بارہ بجے بمبئی سے فرنٹیئر میل آیا۔ جگہ نہ ملی۔ مجبوراً انٹر میں بیٹھ گیا۔ مگر زاہدی صاحب کی کوشش سے تھوڑی سی کش مکش کے بعد سکنڈ میں جگہ مل گئی مگر اسباب انٹر میں رہ گیا تھا۔ دو بجے کے بعد اسباب سیکنڈ میں آیا۔ تب میں سویا۔

سردی کی وجہ سے ہلکا سا بخار ہوگیا ہے۔ لیکن نیند اچھی آگئی۔ جاورہ میں سردی بہت کم ہے اور تندرستی کے لئے یہ مقام مجھے بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔

۳ رجب ۱۳۴۹ھ ۲۵ نومبر ۱۹۳۰ء سہ شنبہ۔ سفر کپورتھلہ

ذاتی} سات بجے بیدار ہوا۔ ڈائننگ کار سے ناشتہ منگایا۔ ایک انگریز اور ایک ہندو ساتھی ہیں ہندو صاحب ولایت سے تعلیم پاکر آتے ہیں۔ دونوں لاہور جا رہے ہیں۔ بارہ بجے دہلی پہنچا۔ سید ابن عربی اور واحدی صاحب اور جمالی صاحب اور مستری عشقی نظامی اور مولانا عبداللہ سیفی اور انور علی نظامی اور زید پاشا موجود تھے۔ گھر سے کھانا بھی آیا تھا۔ اور ڈاک بھی آئی تھی۔ سب احباب سے ملا۔ آدھ گھنٹہ کے بعد گاڑی روانہ ہوئی۔ ڈاک اور اخبار پڑھتا رہا۔ شام کو سوا سات بجے جالندھر چھاؤنی پر پہنچا۔ کپورتھلہ کے اہلکار موٹریں لئے ہوئے موجود تھے۔ کپورتھلہ یہاں سے اٹھارہ میل ہے۔ اسباب لاری میں رکھا۔ میاں عزیز بھی لاری میں آئے۔ اور میں موٹر میں کپورتھلہ آدھ گھنٹہ میں پہنچ گیا۔ کیپٹن مودی پارسی اور مسٹر نرسنگھ داس مہاراج کی طرف سے گیسٹ ہاؤس میں منتظر تھے۔ یہ گیسٹ ہاؤس یورپ کے اعلیٰ ہوٹلوں کے نمونہ پر آراستہ کیا گیا ہے۔ غسل خانوں میں بھی نہایت قیمتی قالین ہیں۔ ٹھنڈا گرم پانی الگ الگ نلوں میں موجود ہے۔ نہایت قیمتی اور تاریخی تصویروں سے سب کمرے آراستہ ہیں۔ معلوم ہوا مہاراج خود میرے کمرہ کو دیکھنے آتے تھے۔ اور ضرورت کے سب سامانوں کو ملاحظہ کیا تھا۔ تاکہ مجھے کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ دیسی کھانے کا انتظام بھی تھا۔ حالانکہ اس گیسٹ ہاؤس میں انگریز ٹھہرتے ہیں اس لئے کھانا بھی انگریزی ہوتا ہے۔ مسٹر مودی اور نرسنگھ داس صاحب سب انتظامات

دیکھ کر واپس چلے گئے تو تاج محمد خاں صاحب عہدہ دار آئے۔ جو کھانے کے منتظم ہیں۔ کھانا کھا کر میں نے عشاء کی نماز پڑھی پھر کتاب پڑھتا رہا۔ دس بجے سو یا۔ میرے پلنگ کے سرہانے ایک برہنہ عورت کی تصویر تھی۔ یہ بھی۔ یورپ کا فیشن ہے۔ مجھ کو تو تمام دنیا کے وہ انسان برہنہ نظر آتے ہیں۔ جن کو اخلاقی لباس میسّر نہیں ہے۔ اور جنھوں نے کسی ایک تہذیب کو خواہ مشرقی ہو خواہ مغربی مکمل طور سے حاصل نہیں کیا یہ تصویر ان لوگوں کے جذبات کے لئے مضر یا مفید ہوسکتی ہے۔ جو اپنے جذبات کے حاکم نہیں ہیں مگر مجھے خدا نے جذبات کی حکومت عطا فرمائی ہے اور میں اس تصویر کو اپنے لئے نہ مضر سمجھتا ہوں نہ مفید۔

بقیہ ص۱۰

محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سرتاج صوفیا ہیں ان کا کیا کہنا کہ وہ تو اللہ کے ایسے نور ہیں جو بلا وساطت اللہ ہی سے حاصل ہے۔

سوال یہ ہے یہ اصطلاحات جو صوفیاء میں رائج ہیں کہاں سے آئی ہیں بات ویسی ہی ہے کہ جیسے زبان تو رائج ہوتی ہی ہے لیکن قواعد نحو صرف و بلاغت بعد کو مرتب ہوتے ہیں اور اصطلاحیں بعد کو وضع ہوتی ہیں صوفیا تو ہمیشہ سے ہیں لیکن ان کا نام ان کے مرتبے ان کے طریقہ کار کے سلسلہ کی اصطلاحیں بعد کو وضع کی گئی ہیں۔ آخری بات پھر وہی کہنا ہے کہ سب تعریف تو اللہ یا ایشور کی ہے جو سارے جگتوں کا پالن ہار ہے جس کا کوئی ساجھی نہیں ہے۔ جو نہایت رحم کرنے والا مہربان ہے جس کے سپرد ہم سب ہیں لیکن احساس کے ساتھ ہمیں اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دینا چاہیے اسی میں انسانیت کی بقا ہے اور بندے کی معراج ہے۔

(لکھنؤ میں منعقد ہونے والے سمینار میں پڑھا گیا)۔

مدیر
خواجہ حسن ثانی نظامی
معاونِ مدیر
خواجہ مہدی نظامی

بارگاہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ سے
ایمان اور امن کی ندا دینے والا
اور اُن کے جانشین
امام المشائخ شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی یادگار

ماہنامہ

منادی

نئی دہلی

منادی ۱۹۲۶ء سے جاری ہے یہ اٹھترویں جلد ۱۹۹۹ء کا دسواں شمارہ ہے

— درگاہ —
شریف اور منادی کے بارے میں
خط و کتابت کرنے اور قیمت
جمع کرانے کا پتہ
خواجہ حسن ثانی نظامی
ڈاکخانہ حضرت نظام الدین اولیاء
نئی دہلی ۱۳-۱۱

فہرست

سالانہ قیمت
ہندوستان میں
پچاس روپے
غیر ممالک سے
دس ڈالر
فی پرچہ
پانچ روپے

پرنٹر پبلشر خواجہ حسن ثانی نظامی نے خواجہ پریس جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ سے شائع کیا۔

ہدایت القلوب

ملفوظات حضرت خواجہ شاہ زین الدین داؤد حسین شیرازی قدس سرہٗ

(۲)

ترجمہ وتلخیص : پروفیسر نثار احمد فاروقی

وقت کی قدر

فرمایا : جہاں بھی رہو باخدا ہو کر رہو اور وقت کو غنیمت جانو ۔
شعر

نصیحت ہمین است جانِ برادر
کہ اوقات ضائع مکن تا توانی

(ترجمہ : جانِ برادر، بس ہماری نصیحت یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنے اوقات ضائع مت کرو)

روزے کہ میرود شمر جز وَرائے عمر
الا ہماں قدر کہ پرستی خدائے را

(ترجمہ : جو دن گذرتا ہے اُسے عمر میں سے گیا ہوا ہی سمجھو عمر بس وہی ہے جس میں تم نے خدا کی عبادت کرلی) ۔

جب اِس حقیر بندے نے قصبے سے آکر حضرت کے قدموں میں سر رکھا تو عرض کیا: "مخدومی میری نیت یہ ہے کہ گھر بار کو چھوڑ دوں اور کسی مسجد میں گوشہ نشین ہو جاؤں، ہر ہفتہ بندگی مخدوم سے ملاقات کی سعادت حاصل کیا کروں۔" آپ نے ملاقات ہوتے ہی فرمایا :

"خدا کے بعض بندے اگرچہ بازار میں تجارت کرتے ہیں، خرید و فروخت میں مشغول رہتے ہیں، مگر وہ اللہ کی یاد سے غافل نہیں رہتے۔

رِجالٌ لَا تُلهِيهِم تِجارةٌ وَلَا بَيعٌ عَن ذِكرِ اللہ (النور، ۳۷)

(کچھ لوگ ہیں جنھیں خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی اور کچھ وہ ہیں کہ مسجد میں رہتے ہیں مگر یادِ حق سے محروم ہیں) ۔

لہٰذا جہاں کہیں بھی رہو، اللہ کی یاد رکھنی چاہیئے، چاہے گھر میں رہو، یا بازار میں ۔ شعر :

در کعبہ جوئی یار، یا بتخانہ یابی سجدہ جا
ور بُت پرستی باصفا، کعبہ ثناخوان آیدت

(ترجمہ : خواہ تم کعبہ میں یار کو ڈھونڈو، یا بت خانے میں سجدہ کرو۔
اگر تم سچے بت پرست ہو تو کعبہ بھی تمہاری تعریف کرے گا۔)
ہو سکتا ہے کہ بُت پرستی چلی جائے اور اِخلاص باقی رہ جائے ۔"

بس ایک ہی غم رکھو

فرمایا : فراغ (اطمینان) کو اللہ تعالیٰ ہی بخشتا ہے ۔ یہ بہت سے مال سے، یا آسایش کے سامان سے نہیں ملتا ۔ گوشے میں بیٹھ جاؤ اور ایک سے ہی دل لگاؤ، باقی سب سے توجہ ہٹالو، تو فراغ حاصل ہو جائے گا۔"

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

مَن اَصبَحَ وَ ھَمُّہٗ وَاحِدٌ کَفَاہُ اللہ تَعَالیٰ ھُمُومَ الدّنیا وَالآخِرَۃِ وَمَن تَشَعَّبَت ھُمُومُہٗ لَم یُبَالِ اللہ فِی اَیِّ وَادٍ اَھلَکَہٗ ۔ (۱)

جو شخص صبح کو اٹھتا ہے اور اُسے بس ایک ہی (آخرت کا) غم ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی دنیا اور آخرت کے غموں کا کفیل ہو جاتا ہے اور جس نے بہت سے غم (بکھیڑے) پال لیے تو اللہ کو اِس کی پروا نہیں کہ وہ اُسے کون سی وادی میں ہلاک کرے گا۔"

---

(۱) ابن ماجہ میں یہ حدیث قدرے اختلاف لفظی کے ساتھ درج ہوئی ہے۔

ہلاکت کی وادیاں

اور یہ وادیاں چار ہیں : نفس اور شیطان دنیا اور خلق۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ بڑے غم (یعنی دین کے غم) کو اختیار کرے تا کہ دنیا اور آخرت کے دوسرے تمام غموں سے نجات مل جائے۔

خواجہ سعید فرماتے ہیں :

الحمد للہ کہ دلم صید غمے شد
وز خوردن غم ہائے پراگندہ برستم

(اللہ کا احسان ہے کہ میرا دل ایک ہی غم کا شکار ہو گیا اور میں نے دوسرے حاجت حاجت کے غموں سے چھٹکارا پالیا۔)

یک دوست بسندہ کن کہ یکدل داری
گر مذہب مردان عاقل داری

(تمھارے پاس ایک دل ہے تو ایک ہی دوست کو اختیار کرو اگر عقلمند لوگوں کا سا مذہب رکھتے ہو۔)

لہذا فراغ ترک دنیا کے سوا کسی شے سے نہیں مل سکتا۔ جتنے (دنیا کے) اسباب زیادہ ہوں گے اُتنا ہی اطمینان ناپید ہو گا۔ بے غمی اگر بادشاہوں کی خدمت میں رہ کر ملتی تو سارے پیغمبر اور سب نیک لوگ یہی راستہ اختیار کرتے اس لیے کہ پیغمبروں کے وقت میں بھی ملوک وامراء تو ہوا کرتے تھے۔

سب کا حاصل ایک

ایک شخص ابو بکر شبلیؒ کے پاس آیا کہ میں نے کچھ مال خرچ کیا ہے اور کچھ اسباب خریدا ہے ذرا اس کا حساب کر دیجیے۔

ابو بکرؒ نے کہا لکھواؤ۔ ایک بار یہ دوسری بار وہ پھر یہ پھر وہ اس طرح اس نے سارا حساب لکھوا دیا پھر پوچھا : "کل میزان کیا ہوئی ؟"

ابو بکرؒ نے کہا : "ایک۔" وہ کہنے لگا : "خواجہ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ آخر یہ کون سا حساب ہوا جو آپ نے کیا ہے ؟"

ابو بکرؒ نے کہا : "تمھیں شرم نہیں آتی کہ "ایک" کے سوا بھی حساب میں کچھ گنتے ہو؟"

اُس شخص نے ایک آہ بھری اور کہا : "آپ نے ایسا تیر مارا ہے جو میری جان میں پیوست ہو گیا۔ اسی وقت توبہ کی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو گیا۔

لہذا یہ چاہیے کہ سب کو بھول جاؤ بس ایک کو یاد رکھو تا کہ تمھارے دین و دنیا کے سارے کام سنور جائیں۔

اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ میرے پاس بیل بھی ہوں گھوڑے بھی اسباب بھی ہو باندیاں بھی غلام بھی اور ساتھ ہی توکل اور فراغت بھی ہو تو یہ نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل کی کہ اے داؤد میں نے چھ چیزوں کو چھ چیزوں میں رکھ دیا ہے لوگ انھیں ان سے باہر ڈھونڈتے ہیں تو وہ بھلا کیسے مل سکتی ہیں ؟

میں نے حکمت (دانائی) کو بھوک میں رکھا ہے لوگ بھرے پیٹ میں تلاش کرتے ہیں۔ میں نے راحت کو جنت میں رکھا ہے لوگ اُسے دنیا میں ڈھونڈتے ہیں میں نے عزت کو شب بیداری میں رکھا ہے یہ لوگ اُسے بادشاہوں کی ڈیوڑھی میں تلاش کرتے ہیں میں نے رفعت کو تواضع میں رکھا ہے یہ لوگ اُسے تکبر (گھمنڈ) میں تلاش کرتے ہیں۔ میں نے تونگری کو قناعت میں رکھا ہے لوگ اُسے دولت کی کثرت میں تلاش کرتے ہیں میں نے دعا کی قبولیت کو حلال روزی میں رکھا ہے یہ لوگ اُسے لقمہ حرام میں ڈھونڈتے ہیں۔ بھلا کیسے پا سکتے ہیں ؟

دل کا بوجھ اتر جائے گا

فرمایا : جب بندہ کسی کام میں سخت عاجز ہو جائے اور کشاد گی کی کوئی صورت نظر نہ آئے تو (اس کام کو) خدا کے حوالے کر دے کہ یا اللہ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے تو اپنے کرم سے اسے آسان کر دے۔ اُس کو اللہ کے حوالے کرتے ہی فوراً اُس کے دل سے تو بوجھ اُتر جائے گا۔ اُس کے بعد اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ وہ اُس مشکل کو آسان کر دے۔

یہاں کوئی خدا بھی ہے

ایک بار ایک مقطع (تحصیلی) ہندوستان کی طرف گیا اور اُس نے علاقے کے چودھری کے پاس ایک سپاہی کو بھیجا کہ میں راجد حانی (دولت آباد) سے آیا ہوں تمھیں چاہیے کہ جو مال تم

پر واجب ہے وہ دوگنا دو اور فوراً رقم بھیجو ورنہ میں لشکر کشی کروں گا اور (سب مال) لوٹ لوں گا۔ اُس نے سپاہی کو یہ بھی تاکید کر دی کہ اگر وہ فوراً دوگنا مال دے تو لے آنا اور اگر دیر لگائے تو ہرگز ترکش اپنی کمر سے مت کھولنا اور کھانا بھی مت کھانا نہ کہیں قیام کرنا۔

چونکہ وہ سپاہی اُس مقطع کے ظلم سے واقف تھا، گیا اور جس طرح اُس سے کہا گیا تھا ویسے ہی پیغام پہنچایا۔ چودھری نے کہا کہ ذرا دم لے لو۔ اُس نے کہا: "یہ میں نہیں کر سکتا مجھے ایسا ہی حکم دیا گیا ہے اگر تمھیں دینا ہے تو دو ورنہ میں جاتا ہوں۔"

اُس نے کہا: "خواجہ روپیہ تو اِس وقت میرے پاس نہیں ہے، وہ رعایا کے پاس ہے۔ رعایا سے ظلم اور سختی کر کے وصول کروں گا۔ اگر دوگنی رقم حاصل ہو گئی تو اتنی بھیج دوں گا، تم ذرا ٹھہر تو جاؤ، کچھ آرام کر لو۔" سپاہی نے کہا: "یہ نہیں ہو سکتا میں اپنی موت کو خود دعوت نہیں دے سکتا اگر تمھیں روپیہ بھیجنا ہے تو دے دو ورنہ میں جا رہا ہوں۔"

چودھری نے تھوڑی دیر سوچا اور کہا امیر سے کہہ دینا کہ روپیہ تو موجود تھا، تھیلیاں سینے اور روپیہ گن کر رکھنے اور اُسے لدوانے کے لیے کم سے کم دس دن چاہییں۔ امیر کا یہ فرمان مناسب نہیں ہے اور یہ بھی کہہ دینا کہ اِس ملک میں کوئی خدا بھی ہے یا نہیں؟ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ خدا نہیں ہے تو آؤ جو جی میں آتی ہے کر لو، میں نے تو خدا سے دل لگا لیا ہے دیکھیں وہ کیا کرتا ہے۔"

سپاہی فوراً واپس ہو گیا اور امیر کو جا کر خبر دی۔ امیر نے اُسی وقت اپنے خیمے کھنچوانے، اور فوج کو باہر نکالا۔ جب آدھی رات گذری تو ناگاہ ایک شخص آیا اور اُس نے امیر کی بارگاہ (خیمے) کی طنابوں کو کاٹنا شروع کیا۔ نوبت والے (چوکیدار) جاگ رہے تھے اُنھوں نے امیر کو اطلاع دی۔ وہ بہت حیران ہوا اور بہت تدبیر و خوشامد سے اُس شخص کو اندر طلب کیا۔ پوچھا: کیا بات ہے؟ اُس نے کہا۔ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم فوراً سوار ہو کر رابعہ حافی کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ وہ امیر خواہی نخواہی فوراً روانہ ہو گیا اور وہ لشکر کشی کا ارادہ فسخ کر دیا۔

چودھری نے اللہ پر جو بھروسا کیا تھا اُسے اللہ تعالیٰ نے سچ کر دکھایا۔

یہ سمجھ لو کہ سخت سے سخت کام بھی اگر سچے دل سے خدا کے حوالے کر دیے جائیں تو خدا ہر بات کی قدرت رکھتا ہے وہ اُنھیں بڑی خوبی سے انجام تک پہنچا سکتا ہے۔

پہلی منزل

فرمایا: درویشی کی پہلی منزل ترکِ دنیا ہے اِس کے بعد دوسرے مقامات ہیں۔ اگر کوئی درویشی کی پہلی منزل میں ہی قدم نہ رکھ سکا تو دوسرے مقامات تک کیا پہنچ سکتا ہے؟

جب سالک دنیا ترک کرتا ہے تو دنیا بھی طرح طرح کے فریب دینے کے لیے اُس کے سامنے آتی ہے اگر وہ اس فریب کے چکر میں آ گیا تو بس وہیں اٹک کر رہ جاتا ہے۔

امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ دنیا ایک مُردار ہے اور سالک کی مثال عُقاب کی سی ہے، جب عقاب اپنی پرواز کی بلندی سے اُس مردار کی طرف قصد کرے گا تو لامحالہ وہ اپنی بلندی سے نیچے کی طرف اُترے گا۔

لہٰذا بعض اہلِ دل تو دنیا کو قبول ہی نہیں کرتے اور بعضے وہ ہیں جو اُس کی طرف التفات نہیں کرتے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ (دنیا) ایک نہر کی طرح ہے جو ایک طرف سے آ رہی ہے اور دوسری طرف کو جا رہی ہے۔

مشقت کا ثمرہ

ایک بار ایک بادشاہ کو کچھ بیماری ہو گئی، کسی دوا سے فائدہ نہ ہوتا تھا، جتنے بھی طبیب اور حکیم تھے کوئی اُس مرض کو دور نہ کر سکا۔ کسی شخص نے کہا کہ اِس شہر میں ایک درویش صاحبِ کرامات ہے اگر اُسے بلوایا جائے تو ہو سکتا ہے کہ اُس کی دعا سے بیماری میں کمی ہو جائے۔ اُس درویش کو لایا گیا اُس نے دعا پڑھی اور بادشاہ پر اپنا ہاتھ پھیرا۔ بادشاہ کو فوراً صحت ہو گئی۔ اب سونے کے سکوں سے بھری ہوئی تھالی درویش کے سامنے لائی گئی۔ درویش نے اُسے قبول نہیں کیا اور اپنے ٹھکانے پر واپس آ گیا۔ چند روز کے بعد ایک دوست درویش کی خدمت میں آیا تو اُس نے دیکھا کہ درویش کے گھر میں خرچ کی بہت تنگی ہے۔ پوچھا کیا حال ہے؟

اُس نے کہا۔ "درویشی ہے اِس لیے (تنگی کی طرف) التفات بھی نہیں"۔ اُس شخص نے کہا "اگر آپ اُس روز بادشاہ کا نذرانہ قبول کر لیتے تو کچھ ہمیں بھی دے دیتے۔ آپ کا اور ہمارا کچھ وقت اچھا گزر جاتا۔"

درویش نے کہا کہ "اے بھائی اللہ تعالیٰ جو ہماری دعا قبول کر لیتا ہے وہ اِسی بھوک اور مفلسی اور محنت و مشقت کا ثمرہ ہے۔ اگر ہم دنیا اور اُس کی راحتوں کی طلب میں لگ جائیں تو ہماری دعا ہرگز قبول نہ ہو گی"۔

جائے بزرگاں

فرمایا جس جگہ درویش کے قدم پڑتے ہیں بے شک اُس جگہ میں بھی خیر و برکت ہو جاتی ہے۔ ایک بار ایک درویش کسی شہر میں گئے اُنھیں بتایا گیا کہ اِس شہر میں ایک درویش کا انتقال ہو گیا ہے، جب اُس کا جنازہ باہر لے کر آنے تو اُس مسافر (درویش) نے روک دیا کہ خبردار اِسے ہرگز شہر سے باہر لے کر نہ جاؤ لوگوں نے کہا : کیوں؟ اِنھوں نے کہا کہ ایک عذاب (شہر پر) مقرر ہو چکا ہے اگر اِس کو (شہر سے) باہر لے جائیں گے، تو شہر پر وہ عذاب نازل ہو جائے گا۔ اُس درویش کو اس کے گھر میں ہی دفن کر دیا گیا۔ حق تعالیٰ نے اُس شہر کو بچا لیا۔ جان لینا چاہیئے کہ مردانِ خدا کی وفات کے بعد بھی اُن کی برکت باقی رہتی ہے۔

فرمایا۔ ایک شخص تھا وہ کسی درویش کے پاس گیا اور کہا کہ میں اولیاء اللہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ درویش نے کہا "اگر تم چاہتے ہو کہ اولیاء اللہ کو دیکھو تو ڈھائی سال تک متواتر وضو کی حالت میں رہو اور تھوڑی سی پاکیزہ غذا کھاؤ۔" وہ شخص چھ مہینے تک یہ کر سکا، اس کے بعد کچھ خلل واقع ہو گیا، تو وہ پھر درویش کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس عمل میں خلل پڑ جانے کا حال اُسے بتایا۔ درویش نے کہا کہ اب یہ عمل نئے سرے سے شروع کرو۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ رات دن باوضو رہتا تھا، وضو ٹوٹ جاتا تو نیند سے بیدار ہو کر اُسی وقت نیا وضو کرتا تھا۔ اس طرح پورے ڈھائی سال بیت گئے۔ اب یہ اُس درویش کی خدمت میں آیا اور کہا کہ مدت پوری ہو گئی۔ درویش نے کہا : "جاؤ۔ فلاں پہاڑ میں جا کر بیٹھو وہاں تم دو سو مردانِ خدا کو دیکھو گے"

وہ شخص وہاں گیا اور آ کر کہا کہ میں نے وہاں ایک سو نوّے (۱۹۰) لوگوں کو دیکھا باقی کو نہیں دیکھا۔"

درویش نے کچھ سوچ کر جواب دیا کہ ہاں دس درویش فلاں جزیرے میں تعینات کر دیے گئے ہیں، کیوں کہ وہاں فساد اور رہزنی بہت ہوا کرتی تھی۔ تا کہ اُن کے قدموں کی برکت سے وہ شر دور ہو جائے۔ اگر تم اُن کو بھی دیکھنا چاہتے ہو تو وہاں جانا ہو گا۔ وہ شخص اُس جزیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک کشتی میں سوار ہوا، جب جزیرے کے قریب پہنچا تو کشتی والوں نے اُدھر جانے سے پہلو بچانا چاہا، اُس شخص نے اُنھیں بتایا کہ اب وہاں فتنہ و فساد نہیں ہے اِس لیے کہ وہاں کچھ مردانِ خدا تعینات کر دیے گئے ہیں، تم بے کھٹکے اُدھر جاؤ۔

الغرض یہ سب اُس جزیرے میں گئے۔ وہ شخص کشتی سے اُترا اور ایک پہاڑ پر گیا، وہاں دس درویشوں کو دیکھا کہ ایک جگہ [illegible] ہوئے ہیں۔ اُس نے ہر ایک درویش کے ہاتھ چومے اور تین دن رات مسلسل وہاں رہا۔ ہر روز افطار کے وقت گیارہ روٹیاں اور پانی کے گیارہ کوزے آتے تھے۔ اُس کو اچانک دھیان آیا کہ کشتی میں تھوڑا سا گیہوں کا آٹا بھی رکھا ہوا تھا نہ جانے اُس کا کیا ہوا ہو گا۔ اُن دس درویشوں میں سے ایک نے سر اوپر اٹھایا اور کہا کہ "جس شخص کو آٹے کی فکر ہو اُس کا ہمارے درمیان کیا کام ہے"؟ اب تم خیریت سے واپس ہو جاؤ۔ دوسرے درویش نے ایک درخت کی شاخ اُسے دی اور کہا کہ یہ رکھ لو تمھارے کام آئے گی۔ اُس شخص کو وداع کر دیا، وہ واپس آ کر کشتی میں سوار ہو گیا اور درخت کی شاخ اپنے بیٹے کے حوالے کر دی کہ اسے حفاظت سے رکھو۔ وہاں سے چلے اور ایک جگہ خشکی میں اُترے چند روز کے بعد اُن کا زادِ راہ ختم ہو گیا اور سخت عاجز ہو گئے۔ بیٹے سے مشورہ کیا کہ اب کیا کریں؟ پاس

ہیں تو کسی سے قرض بھی نہیں مل سکتا۔ بیٹے نے کہا کہ اُس سونے کی ٹہنی کو خرچ کیوں نہیں کرتے؟ اُس نے کہا۔ "کون سی ٹہنی؟"

بیٹے نے کہا "کہ جب آپ جزیرے سے چلے تھے اور ایک شاخ مجھے یہ کہہ کر دی تھی کہ اسے اچھی طرح حفاظت سے رکھو"۔
اس شخص نے غور سے دیکھا تو وہ سونے کی شاخ تھی اُسے فروخت کر کے اپنا خرچ چلایا۔

فرمایا کہ جہاں کہیں مردانِ خدا ہوتے ہیں وہ جگہ بلاؤں اور مصیبتوں سے محفوظ رہتی ہے۔

کولھو کا بیل

فرمایا: چرس کا بیل رات بھر چل کر تڑکے میں آنکھ کھولتا ہے تو دیکھتا ہے جہاں تھا وہیں کا وہیں کھڑا ہے۔ جو لوگ دنیا کی طلب میں ہوا و ہوس کے پیچھے بھاگتے ہیں وہ بھی کولھو کے بیل کی طرح ہی ہیں کہ سارا دن بھاگ دوڑ کرتے ہیں اور اپنی جان کھپاتے ہیں' آخر وقت خود کو وہیں پاتے ہیں جہاں تھے۔ یہ کیا ہے؟ غفلت کے پردے اُن کی آنکھوں پر اور دل پر ڈال دیے گئے ہیں' تاکہ کچھ دیکھ نہ سکیں۔ اور یہ سمجھیں کہ ہم نے بہت راستہ طے کر لیا ہے۔ جب اچانک اُن کی آنکھوں سے پٹی ہٹائی جاتی ہے تو اپنے آپ کو پہلے قدم پر ہی پاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے
قُلْ ھَلْ نُنَبِّئُکُم بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُم فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَھُم یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُم یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (الکھف ۱۰۳-۱۰۴)
(کہہ دیجیے کیا میں اُن لوگوں کے بارے میں تمھیں بتاؤں جو اپنے اعمال میں گھاٹے میں رہ گئے' دنیا کی زندگی میں جن کی ساری کوشش رائیگاں ہو گئی اور وہ سمجھتے رہے کہ ہم بہت اچھے کام کر رہے ہیں)

فرمایا:

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے
حاصلش لیکن بجز پندار نیست

(خواجہ سمجھ رہا ہے کہ اُسے آمدنی ہو رہی ہے حالانکہ اُس کو سوائے پندار و وہم کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا)۔

پھر کیا کرنا چاہیے؟ دل کو ساری باتوں سے فارغ کر کے اور کسی بڑے کام میں لگ جائے' ورنہ اگر یہ سوچے گا کہ آج گھوڑا خریدوں گا' کل اُس کی قیمت ادا کروں گا' پرسوں کو بیل خریدوں گا' میرے پاس فلاں چیز ہونی چاہیے' فلاں چیز نہیں ہونی چاہیے' تو یہ سب پریشانی کی باتیں ہیں' ایک دل میں دو چیزیں ہرگز جمع نہیں ہو سکتیں۔
مَاجَعَلَ اللہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ (اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں رکھے) اے خواجہ اگر غم ہی کھانا ہے تو دنیا کا غم مت کھاؤ۔

کارِ حق

کچھ لوگ ایک بزرگ کے پاس گئے' اُنھوں نے ہر ایک سے پوچھا کہ تم کیا کام کرتے ہو؟ کسی نے کہا میں پیشہ ور ہوں' کسی نے کہا۔ کسان ہوں' کسی نے کہا۔ لشکر میں نوکری کرتا ہوں۔ اُن بزرگ نے کہا کہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اِن کاموں کے لیے پیدا نہیں کیا بلکہ دوسرے ہی کاموں کے لیے ہی بنایا ہے' اور میں نہیں جانتا وہ کام کیا ہیں؟ کاش کوئی مجھے اُن سے واقف کرا دے۔ یہاں تک کہ وہ حضرت جنیدؒ کی خدمت میں گئے اور جنیدؒ نے اُنھیں کاملوں میں سے ایک بنا دیا۔ تو یہ سمجھ لو کہ جسے کارِ حق کے لیے پیدا کیا گیا ہے اُس کی فطرت میں حق تعالیٰ کی طلب ڈال دی جاتی ہے۔

بیہودہ کشاکش

ایک بار ایک شخص نے ایک غلام خریدا اور اُسے پانی بھرنے کا کام سپرد کیا' وہ روزانہ پانی بھر کر لاتا تھا ایک دن اُس کا مالک گھر سے نکل کر آیا تو دیکھا کہ وہ غلام بہت رنجیدہ بیٹھا ہوا ہے۔ اُس نے کہا۔ کیا بات ہے کیوں غمگین بیٹھے ہو؟ غلام نے کہا اے خواجہ غمگین کیسے نہ رہوں آپ نے ایسا کام میرے سپرد کیا ہے کہ روز دریائے دجلہ سے پانی بھر کر لاتا ہوں اور حویلی میں پہنچاتا ہوں' نہ تو دجلہ میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے اور نہ پینے والے سیر ہوتے ہیں' خبر نہیں میں اِس بیہودہ کشاکش میں کب تک مبتلا رہوں گا۔ آقا نے سمجھ لیا کہ اِس کی لَو اللہ سے لگی ہوئی ہے اُسی وقت اُسے آزاد کر دیا۔

سماع کے آداب

فرمایا: کچھ لوگ رقص میں ایک ہی جگہ تھمے رہتے ہیں اور دوسروں کو زحمت نہیں دیتے، بعض بہت بے قابو ہو جاتے ہیں اور شور کرتے ہیں، خود کو چاروں طرف دے دے مارتے ہیں۔ البتہ اگر جگہ تھوڑی بھی ہو تب بھی بیس تیس صوفیہ (سماع میں) ایسے رقص کرتے ہیں کہ ایک درویش دوسرے کو زحمت نہیں دیتا۔ سماع سے پہلے ہلکی غذا کھانی چاہیئے مثلاً چاول ہوں یا شوربا ہو۔ سماع کے بعد اگر کوئی نان گوشت اور حلوا بھی بھر کر کھائے تو کچھ حرج نہیں، مگر شروع میں پیٹ خالی ہو تو سماع کے ذوق کا اثر زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ غذا دو قسم کی ہوتی ہے۔ روحانی اور جسمانی۔ جسمانی غذا تو کھانا پینا اور چین سے سونا ہے۔ روحانی غذا بھوک پیاس، جاگنا، ذکر و فکر اور ایسی ہی باتوں میں ہے۔ سماع بھی روحانی ذوق ہے اگر کوئی جسمانی غذا چھک کر کھائے گا تو یقیناً اُسے روحانی ذوق اتنا نہیں مل سکتا۔

حضرت غریبؒ کا معمول

خدمت شیخ الاسلام برہان الدین قدس اللہ سرّہ العزیز اگر کسی سے سن لیتے تھے کہ رات کو کسی جگہ سماع ہے تو اُس دن کھانا ہرگز نہ کھاتے تھے، اور صاحبِ سماع کے گھر پر بھی سماع سے پہلے کچھ نہیں کھاتے تھے، یا محض دوسروں کا ساتھ دینے کے لیے چند لقمے لے لیتے تھے، اور سماع کے بعد اگر کھانا ہلکا پھلکا ہوتا تھا جیسے شوربا اور چاول، تو تھوڑا سا کھا لیتے تھے۔ اگر نان گوشت ہوتا تھا، تو وہاں سے بھوکے ہی اُٹھ کر گھر آجاتے تھے اور فرماتے تھے": شوربا لاؤ یا گوشت کی یخنی"۔ وہ پی لیتے تھے۔

بادشاہ و درویش کا فرق

فرمایا کہ درویش تمام بلاؤں سے اور دنیا کی مشقتوں سے محفوظ ہوتا ہے، ہر درویش کو بادشاہ وغیرہ یاد کرتے ہیں۔ درویشوں کو جو بھی یاد کرتا ہے نیکی اور لطف و شفقت و رحمت سے یاد کرتا ہے: مگر بادشاہ اور ملوک وغیرہ دنیا کی الجھنوں اور تکلیفوں میں غرق ہوتے ہیں اور انھیں کوئی بھی نیکی سے یاد نہیں کرتا۔

فرمایا: کہ اخلاص بزرگوں کے اوصاف میں سے ہے مگر وہ آہستہ آہستہ اور سکون کے ساتھ ایک ایک چیز کو دفع کرتے ہیں جن کے سر میں دنیا اور اسباب دنیا کی طلب ہوتی ہے اگر وہ ان چیزوں کا خیال اپنے سر سے نکالنا چاہیں تو بہت محنت درکار ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ وہ اُنھیں اخلاص بھی بخش دے۔

قدرِ نعمت

ایک شخص شیخ الاسلام برہان الدین قدس اللہ سرہ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ مخدوم میرے پاس ایک گھوڑا ہے وہ مجھے بہت پریشان کرتا ہے، یہ چاہتا ہوں کہ کسی طرح اُسے الگ کر دوں۔ خدمتِ شیخ نے فرمایا۔ "بابا، عیسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک گدھا تھا، اور ایک پالان تھی۔ صالح علیہ السلام او نٹنی رکھتے تھے، حق تعالیٰ نے تمھیں گھوڑا دیا ہے اُسے ہرگز الگ مت کرو، جب وقت آئے گا اللہ تعالیٰ خود اُسے الگ کر دے گا"۔ کچھ زمانے کے بعد اُسے گھوڑے نے پریشان کرنا چھوڑ دیا اور فراغت نصیب ہو گئی۔ اِسی طرح اگر کسی کو علم دین حاصل کرنے یا عبادت کرنے کی طلب ہو تو اُسے طرح طرح کی رکاوٹیں پیش آتی ہیں، مثلاً سفر اور نکاح یا دنیا کی حاجات اور وہ اس سعادت سے محروم رہ جاتا ہے۔ آج یہی ہوا کہ روضہ[1] کی طرف شیخ کی خدمت میں جانا ہوا تھا نمازِ عصر کے اوراد فوت ہو گئے۔ باقی کو اِسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

فریب نفس

فرمایا: ایک بزرگ کے سر میں جہاد کرنے کا سودا سمایا۔ اُنھوں نے غور کیا کہ اس خواہش میں نفس کی مکاری کیا ہے؟ حق تعالیٰ کہتا ہے۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ (یوسف ۵۳) (نفس تو برائی کا حکم دینے والا ہے مگر یہ کہ جو میرا رب رحم فرمادے)

نفس تو نیکی کا حکم ہرگز نہیں دے سکتا، پھر کیا سبب ہے کہ یہ جہاد پر اُکسا رہا ہے؟ میں اللہ تعالیٰ کے قول کی صداقت مانتا ہوں

---

[1] خلد آباد کا قدیم نام روضہ تھا۔

اور نفس کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔
کہنے لگے : "اے نفس کیا تو روزہ رکھنے سے عاجز آگیا ہے اور کھانے پینے کی طرف راغب ہے؟ نفس نے قبول کیا کہ میں روزہ ہرگز نہیں توڑوں گا۔ پھر انھوں نے پوچھا تو کیا نوافل و اوراد سے تنگ آچکا ہے؟ نفس نے یہ بات بھی تسلیم نہ کی۔ غرض طاعات و عبادات میں سے جو باتیں بھی کہیں اُس نے سب سے انکار کیا۔ پھر اُن بزرگ نے آسمان کی طرف رخ کیا اور کہا۔ "خداوندا میں تو نفس کے مکر سے واقف نہ ہو سکا تو مجھے اپنے کرم سے آگاہی بخش دے"۔ حق تعالیٰ نے اپنے کرم سے الہام کیا کہ نفس چاہتا ہے جہاد میں مارے جانے کے بعد نام کی شہرت ہو کہ فلاں شخص راہِ حق میں شہید ہو گیا۔ یہ بزرگ رونے لگے کہ اے نفس تو مرنے کے بعد بھی نقصان پہنچانے سے باز نہیں رہتا۔ جہاد کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

ایک بزرگ تھے وہ تیس برس تک ایک مسجد میں پہلی صف میں حاضر ہوتے رہے، ایک دن ذرا دیر سے پہنچے، پہلی صف میں جگہ نہ ملی تو آخری صف میں شریک ہو گئے اور یہ سوچنے لگے کہ لوگ کیا کہیں گے آج فلاں شخص پہلی صف میں نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں سمجھایا کہ تم نے تیس سال تک یہ نماز ریاکاری کے ساتھ ادا کی ہے۔ یہ رونے لگے اور وہ تیس برس کی نمازیں قضا کیں۔

شیطان کی راہیں

فرمایا : ایک پیر نے اپنے مرید سے کہا کہ اب تم ایسے مقام تک پہنچ چکے ہو کہ شیطان بدی کی راہ سے تمہارے اندر داخل نہیں ہو سکتا، البتہ نیکی کے راستے سے کبھی گھسنے کی کوشش کرے گا، اور شیطان انسانوں پر دو راستوں سے آتا ہے عوام پر بدی کی راہ سے آتا ہے، شراب، زنا، دشمنی اور ایسی ہی باتوں کا حکم دیتا ہے۔ اولیأ و انبیاء پر نیکی کے راستے سے چھاپہ مارتا ہے۔ چنانچہ ایک بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور کہا۔ "اے عیسیٰ کہیئے : "لاالہ الااللہ"۔ حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ جو تو کہتا ہے وہ ٹھیک ہے مگر تیرے کہنے سے نہیں پڑھوں گا کیونکہ تو میرا دشمن ہے۔ تیرا اس میں بھی کچھ فریب چھپا ہوا ہو گا جسے میں نہیں جانتا۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کے پاس بھی آیا اُن سے کہا۔
هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (طہ ۲۰)
(کیا میں تمھیں جنت کا درخت دکھاؤں اور ایسا ملک جو کبھی فرسودہ نہ ہو گا۔) حضرت آدم نے کہا کہ حق تعالیٰ نے مجھے اس سے روک دیا ہے۔ شیطان نے کہا۔
مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ
(الاعراف ۲۰)
(تمھارے رب نے تم دونوں کو اس درخت سے اس لیے روکا ہے کہ تم دونوں فرشتے بن جاؤ گے اور یہاں ہمیشہ رہو گے)
حضرت آدم فرشتہ بننے اور جنت میں ہمیشہ رہنے کے خیال سے ڈگمگا گئے، اب اس پر ابلیس نے اضافہ کیا کہ قسم کھا کر کہنے لگا میں تمھارا خیر خواہ ہوں:
وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ (الاعراف ۲۱۔۲۲)
(اور ان دونوں سے قسم کھا کر کہا کہ میں تمھارا بھلا چاہنے والا ہوں پھر اُنھیں گمراہی کی طرف دھکیل دیا)
حضرت آدم سے قسم کھا کر کہا گیا جس سے وہ جنّت سے دور جا پڑے اور یہ سب خیر خواہی کے بہانے سے ہوا۔
حضرت آدم سے کہا گیا کہ آپ نے دشمن کی بات کیوں سنی؟ اُنھوں نے کہا کہ مجھے پتا نہیں تھا کہ کوئی جھوٹی قسم بھی کھاتا ہے یا کھا سکتا ہے۔

ایمان کی امان

فرمایا . جو کوئی فرض نماز کے بعد یہ دعا پڑھے۔
لا الٰہ الا اللہ ایمانا" باللہ۔ لا الٰہ الا اللہ امانا" باللہ۔
لا الٰہ الا اللہ امانۃ من عند اللہ۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اللہ تعالیٰ اُس کے ایمان کو اپنے امان میں رکھے گا۔

روح کی غذا

فرمایا : خواجہ ابراھیم ادہم قدس اللہ سرہ بادشاہی چھوڑنے کے بعد ایک جگہ پہنچے اور ایک مسجد میں اُترے۔ روزے سے

تے جب رات ہوئی تو کہنے لگے اے اللہ اگر آج تو مجھے کچھ چیز نہ بھیجے اور بھوکا سلادے تو چار سو رکعت شکرانے کی نماز ادا کروں گا۔ وضو کر کے نماز میں مشغول ہوگئے۔ رات کو کچھ نہیں ملا' اُنھوں نے چار سو رکعت نماز شکرانہ پڑھی دوسرے دن بھی مسلسل روزہ رکھا جب رات ہوئی تو پھر دعا کی ۔یااللہ اگر آج کی رات بھی میرے لیے تو کچھ نہ بھیجے تو چار سو رکعت نماز شکرانہ پڑھوں گا۔اُس رات کو بھی کچھ نہیں آیا' اُنھوں نے نماز ادا کی اور تیسرے دن بھی لگاتار روزے سے رہے' جب رات ہوئی تو پھر کہا : اے اللہ اگر آج رات کو بھی کچھ نہ ملے تو میں ساری رات نماز شکرانہ پڑھوں ۔اس رات کو بھی کچھ نہ ملا' اور یہ ساری رات نماز پڑھتے رہے جب صبح ہوئی تو خواجہ بہت کمزور ہو چکے تھے سوچا کہ اب ایک روٹی کی ضرورت ہے ۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص آیا اور کہنے لگا خواجہ آپ میرے مہمان ہوں ۔ خواجہ نے کہا . ٹھیک ہے ۔ اُس کے ساتھ اُس شخص کے گھر تک آئے تو دیکھا کہ نہایت بلند اور کشادہ گھر ہے قیمتی قالین بچھے ہوئے ہیں ۔اُس نے کہا "یہاں تشریف رکھیے"۔ خود اندر گیا' تھوڑی دیر کے بعد آیا اور خواجہ کے پیر پکڑ لیے ۔ کہنے لگا یہ گھر آپ کا ہے' میں آپ کا غلام ہوں اور یہ سب مال و اسباب اور املاک آپ کے ہیں ۔ خواجہ نے کہا . وہ کیوں ؟اُس نے کہا . آپ کے والد نے اپنی زندگی میں مجھے تجارت کے لیے بھیجا تھا اور اتنا بہت سا مال مجھے دیا تھا ۔میں نے بعد میں سنا کہ اُن کا انتقال ہو گیا تو میں یہیں رہ پڑا تھا ۔ خواجہ نے کہا میں نے تمھیں آزاد کیا' یہ گھر اور اُس کا سب مال و اسباب تمھیں بخشا ۔اُس شخص نے کہا . اگر ایسا ہے تو میں باہر جا کر کوئی چیز لے کر آؤں ۔ وہ کچھ لانے کے لیے گیا ۔ خواجہ وہاں سے باہر چلے گئے اور کہنے لگے . "یا اللہ میں نے تجھ سے ایک روٹی مانگی تھی تو نے ساری دنیا میری طرف بھیج دی"۔ تو مردانِ خدا نے ایسا کیا ہے' بھوک اور مشقت اختیار کی ہے، کیونکہ یہ خاکی جسم کثیف ہے اس کی مناسب غذا کھانا پانی ہیں ۔ روح ایک لطیف نور ہے اُسے اُس کے مناسب غذا درکار ہے جیسے بھوک اور پیاس ۔

پیغمبر جو خلق کو روزے کی ترغیب دیتے تھے کبھی ایام بیض کے روزے' کبھی دوسرے نفلی روزے' تو یہ اِسی سبب سے تھا کہ ایک دن اپنے اختیار سے نفس کو جسمانی غذاؤں سے محروم رکھا جائے ۔

روایت ہے کہ پیغامبر علیہ السلام جب گھر میں تشریف لاتے تھے تو دریافت فرماتے تھے کچھ ہے ؟ اگر کہا جاتا تھا کہ کچھ نہیں ہے تو فرماتے تھے ' مرحباً (واہ واہ) ۔

شیخ الاسلام نظام الدین قدس اللہ سرّہ کے مطبخ میں جس رات کو کچھ نہ ہوتا تھا تو فرماتے تھے کہ آج ہماری رات حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رات سے مشابہ ہے ۔

مردانِ طریقت و حقیقت نے بھوک اور بے سر و سامانی کو اختیار کیا ہے اور اُسے اپنی جان کے بدلے خریدا ہے ۔

خواجہ سعدیؒ فرماتے ہیں

کوتاہ دیدگان ہمہ راحت طلب کنند

عارف نگر کہ راحتِ او در بلاے اوست

(کوتاہ نظر لوگ راحت کی طلب کرتے ہیں' عارفوں کو دیکھو کہ اُنھیں بلا میں راحت ملتی ہے)

اللہ کا حرم

پیغامبر علیہ السلام نے فرمایا ہے

الاانّ لکلِّ ملکٍ حمیً وَحِمیٰ اللہ محارمہ مَن حامَ حولَ الحمیٰ یُوشک اَن یقعَ فیہِ[1]

(جان لو ہر بادشاہ کا ایک محفوظ علاقہ ہوتا ہے اللہ کا محفوظ علاقہ وہ چیزیں ہیں جو حرام کر دی گئی ہیں جو اُن کے پاس بھٹکے گا اندیشہ ہے کہ اُن میں گرفتار ہو جائے گا)

حمی محفوظ (ممنوع) علاقے کو کہتے ہیں اور یہ وہ جگہ ہوتی ہے جس سے آگے جانے کی اجازت نہ ہو مثلاً بادشاہوں کے ایوانوں میں ایسی حد ہوتی ہے کہ وہاں کوئی سوار ہو کر نہیں گزر سکتا ۔ اللہ تعالیٰ کا حمی وہ باتیں ہیں جو حرام کر دی گئی ہیں' لہذا جو شخص ان باتوں کے پاس بھٹکے گا یعنی ان ممنوع کاموں کے کرنے کی خواہش اس کے دل میں پیدا ہو گی تو وہ بہت جلد اُن حرام افعال میں مبتلا ہو جائے گا ۔ مثلاً عورتیں محرمات میں

---

[1] صحیح البخاری کتاب الایمان و صحیح الترمذی کتاب البیوع و ابن ماجہ کتاب الفتن وغیرہ میں یہ حدیث یوں ہے الاان لکل ملک حمی الا ان حمی اللہ محارمہ

سے ہیں اور من کی طرف خواہش دیکھنے سے، ملنے سے، بوس و کنار یا چھونے سے پیدا ہوتی ہے، پھر جماع کی رغبت ہوتی ہے۔ اسی طرح تمام حرام افعال کی طرف بلانے والی باتیں ہوتی ہیں جو نیک بخت ہیں وہ ان ترغیبات سے بچے رہتے ہیں تاکہ حرام میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

حیلے کا جواز

کچھ تذکرہ حیلے کا ہوا۔ ایک شخص نے پوچھا کہ جس طرح حیلہ کرنا قرآن سے ثابت ہے اسی طرح حیلہ نہ کرنا بھی ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً کسی شر کا دفع کرنا مقصود ہو تو حیلہ کرنا جائز ہے جیسے کسی شخص کو حاکم نے بلایا ہے اور وہ اس سے ملنا نہیں چاہتا، یہ ملاقات طبیعت کے خلاف ہے یا یہ خوف ہے کہ وہاں غیبت کرنی پڑے گی، یا چغلی کھانی ہو گی، یا اور راہ جھوٹ جائیں گے، یا گرفتار کر لیا جائے گا وغیرہ تو وہ شخص کسی سمجھ دار ملازم کو بھیج دے، وہ ملازم باہر جا کر دیوار یا دروازے پر اپنا ہاتھ رکھ کر کے کہ "خواجہ یہاں نہیں ہیں" اور دل میں اشارہ اپنے ہاتھ کی طرف کرے۔ یا خواجہ گھر کے اندر کسی گھوڑے پر بیٹھ جائے اور لوگ جا کر کہہ دیں کہ خواجہ سوار ہو گئے ہیں۔ اور عام طور سے سوار ہونے کا مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے کہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ ایسا حیلہ کرنا جائز ہے۔

البتہ وہ حیلہ جس سے کوئی شر پیدا ہو حرام ہے اور ان دونوں کی نظیریں قرآن کریم میں موجود ہیں جو حیلہ جائز ہے وہ حضرت ایوب علیہ السلام کے قصے میں بیان ہوا ہے۔ وہ قصہ سب کو معلوم ہے کہ اُن کی متعدد بیویاں تھیں اور ایک بیوی حضرت یوسف علیہ السلام کی نسل سے تھی۔ جب حضرت ایوب سخت بیمار ہوئے اور دنیا کی چیزوں میں سے اُن کے پاس کچھ نہ رہا تو دوسری بیویاں اس تنگی کو برداشت نہ کر سکیں اور طلاق لے کر چلی گئیں۔ صرف اُس پیغمبر زادی نے حضرت ایوب کا ساتھ دیا اور ان کی تیمارداری کرتی رہی، وہ ان کے لئے کھانا پانی فراہم کرتی تھی۔ ایک دن کہیں سے کوئی کام نہ مل سکا اور وہ مایوس ہو کر گھر واپس آئی۔ شیطان آدمی کی شکل اختیار کر کے اس کے پاس آیا اور کہا: تم کیوں کڑھتی ہو؟ اُس نے کہا آج مجھے اپنے بیمار شوہر کی خدمت کے لیے کچھ بھی نہیں ملا۔ شیطان نے کہا: "تو کیا ہوا، تم کوئی چیز فروخت کر دو، تاکہ میں تمہیں اسکی قیمت نقد دے دوں"۔ اُس نے کہا کہ میرے پاس بیچنے کے لیے بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ شیطان نے کہا تم اپنے گیسو بیچ دو۔ اُس نے کہا میرا بیمار ان زلفوں کو پکڑ کر اٹھتا ہے۔ شیطان نے کہا خیر اگر تم بیچو تو میں اِن کی قیمت دے سکتا ہوں۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی زوجہ نے سوچا کہ اگر میرا بیمار شوہر آج رات کو بھوکا سویا تو یہ زلفیں میرے کس کام آئیں گی مجبوراً انھیں فروخت کر دیا اور کھانا خرید لیا۔ شیطان نے اس کے آنے سے پہلے ہی حضرت ایوب علیہ السلام کو خبر کر دی کہ فلاں عورت کو بدفعلی میں پکڑ لیا گیا اور اُس کے گیسو کاٹ دیے گئے حضرتِ ایوب نے قسم کھائی کہ اگر اُس کے گیسو موجود دیکھے تو شرعی حد جاری کروں گا۔ جب وہ عورت کھانا لے کر آئی اور کہا کہ تم لیجیے کچھ کھا لیجیے تو حضرت ایوب نے کہا " لاؤ اپنے گیسو میرے ہاتھ میں تھماؤ"۔ اُس نے اپنی اوڑھنی گلے میں ڈال کر کہا کہ اِسے پکڑ لیجیے۔ حضرت ایوب نے پھر گیسو کا مطالبہ کیا، جب دیکھا کہ نہیں ہیں تو فریاد کی اور کہا مَسَّنِیَ الضُّرُّ (مجھے تکلیف پہنچی ہے)۔ مفسّروں کا کہنا ہے کہ جب تک انھیں دنیا کی تکلیفیں پہنچ رہی تھیں، اُنھوں نے فریاد نہیں کی جب دین کی تکلیف دیکھی تو پکار اُٹھے کہ اے اللہ میں دین کا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا حضرت جبریل علیہ السّلام کو بھیجا اور اُن کی بیماری صحت سے بدل گئی۔ اللہ نے حضرتِ ایوب کی طرف وحی بھیجی کہ تمہاری بیوی پاک ہے اور شیطان لعین نے جھوٹ بولا ہے۔ غرض اب اگر حضرت ایوب حد جاری کرتے ہیں تو یہ ظلم ہے، اگر حد جاری نہ کریں تو قسم جھوٹی ہوئی جاتی ہے۔ جبریل نے ایک حیلہ سکھایا اور کہا کہ نیم کی ایک ہری ٹہنی لو جس میں سو (۱۰۰) باریک شاخیں ہوں اور وہ ایک بار مار دو۔ اُنھوں نے ایسا ہی کیا۔ اگر حد جاری کرتے تو یہ ظلم ہوتا اور ظلم بدی ہے اس لیے

یہ حیلہ ایک بدی سے بچنے کے لیے جائز ہوا۔

جو حیلہ ممنوع ہے

لیکن جو حیلہ ممنوع ہے وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے قصے میں آیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی اُمت کو فرمان ہوا کہ سنیچر کے دن مچھلی کا شکار نہ کیا کریں اُس زمانے میں سنیچر (سبت) کا دن عبادت کے لیے مخصوص تھا' جس طرح حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں جمعہ کا دن ہے۔ امت کی آزمائش کے لیے سنیچر کے دن ہی مچھلیاں زیادہ آتی تھیں اور پانی کے اوپر تیرتی تھیں۔ حضرت داؤد کی امت کے ایک گروہ نے سوچا کہ کچھ حیلہ کرنا چاہیے۔ اُنھوں نے یہ کیا کہ جمعہ کے دن گڑھے کھودتے تھے' ہفتے کے دن وہ گڑھے مچھلیوں سے بھر جاتے تھے' اتوار کے دن مچھلیاں نکال لیتے تھے۔ اس معاملے میں ساری امت کے تین گروہ ہو گئے۔ ایک طبقہ تو یہ حیلہ استعمال کرتا تھا' دوسرا طبقہ اُس گروہ کو نصیحت کرتا تھا کہ جس کام سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے وہ نہ کریں۔ تیسرا طبقہ خاموش تھا۔ یہ جو خاموش تھے انھوں نے واعظوں سے کہا تم اِس قوم کو کیا نصیحت کر رہے ہو' اِنھیں اللہ تعالیٰ ہلاک کرے گا یا ان پر عذاب نازل کرے گا۔ واعظوں نے کہا شاید یہ ہمارے کہنے سے رُک جائیں اور توبہ کرلیں ورنہ ہم اللہ کے حضور میں اپنی معذرت پیش کر دیں گے۔ ان لوگوں نے چالیس سال تک وعظ کیا اور ان خطا کاروں نے ایک نہ سنی۔ اللہ تعالیٰ نے ان سرکشوں کے چہرے مسخ کر دیے اور بندر کی سی صورت بنادی۔ خلاصہ یہ کہ اُنھوں نے حیلہ کیا اور اُس کی وجہ سے بدی میں گرفتار ہوئے۔ ایسا حیلہ کرنا ممنوع ہے۔ اور اِس زمانے میں مخلوق کی یہ عادت ہوگئی ہے کہ (سرکاری) گھوڑا بیچتے ہیں اور اسے سقط کہتے ہیں (یعنی کھو گیا' بھاگ گیا) اس معاملے میں ہزار طرح کی مکاری سے کام لیتے ہیں۔ اِس کا نام حیلہ رکھ چھوڑا ہے۔ اس سے حاصل کیا ہے؟ یہ ساری آزمائشیں جو اللہ تعالیٰ نے مقدر کر رکھی ہیں۔

ولنبلونکم بشی من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصابرین (البقرہ۔۱۵۵)

(اور ہم تمھاری آزمائش کریں گے کچھ خوف سے' بھوک سے' مال اور جان اور فصلوں کے نقصان سے اور صبر کرنے والوں کو بشارت دے دیجیے)

اِن آزمائشوں میں بشارت صبر کرنے والوں کے لیے ہے جو بلا پر صبر کریں اور حرام چیزوں سے بچے رہیں۔

خوشحالی کے لیے عبادت

پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ہے: "یہ یقین کی کمزوری ہے کہ کوئی خوشی حاصل کرنے کے لیے اللہ کو یاد کرے۔ دلوں پر تو اللہ کا قبضہ قدرت ہے' وہ خوش کر سکتا ہے مگر نعوذباللہ اگر اللہ کسی پر غضب کرے تو اُسے کون خوشنود کر سکتا ہے؟ اس لیے مسلمان ہونا صورت اور لباس سے نہیں ہے' اسلام تو معاملات میں ہے' جو حق کا پاس رکھے وہی مسلمان ہے"۔

پھر فرمایا۔ پیغمبر علیہ السلام سے روایت ہے کہ دو رکعت نماز استخارہ پڑھیں' اُس کے بعد آیۃ الکرسی خالدون تک پڑھیں اور پھر یہ آیت۔

ربنا آتنا من لدنک رحمۃ وھیٔ لنا من امرنا رشدا (الکھف۔۱۰)

(اے ہمارے رب ہم پر اپنی رحمت بھیج اور ہمیں توفیق دے کہ اپنے کاموں میں سیدھے بچے رہیں)

اس کے بعد گھر سے باہر نکلے' جہاں بھی جائے گا اللہ تعالیٰ اُسے تمام آفات وبلیات سے محفوظ رکھے گا۔

حضرت نظام الدین کا ارشاد

اِس عاجز بندے نے عرض کیا اگر آپ کا حکم ہو تو میں جاگیر چھوڑ دوں' گھوڑا بیچ دوں اور چند مویشی خرید کر کھیتی باڑی اور عبادت میں لگ جاؤں"۔ فرمایا۔ مویشی' کھیتی باڑی' یا تجارت کو بہانہ سمجھنا چاہیے اور کار حق میں لگے رہنا چاہیے۔ اگر اللہ یہ سب چیزیں پیدا نہ کرتا آخر رزق تو جب بھی دیتا۔ ایک شخص شیخ الاسلام نظام الدین قدس اللہ سرہ کی خدمت میں آیا اور کہا: "میں سوچتا ہوں کہ نوکری چھوڑ دوں"۔ خواجہ نے فرمایا: "بابا اگر نوکری چھوڑ دوگے تو کھاؤ گے کیا؟ اُس نے کہا: "اللہ تعالیٰ روزی دے گا"۔ خدمت خواجہ نے فرمایا: "کیا تم اس درجے پر پہنچ گئے ہو کہ خدا سے طلب کرو اور وہ تمھیں دے دے؟ تم کہاں اور وہ مقام کہاں"۔ جو شخص کہ بھی

نفس کے اندھیارے میں پڑا ہو وہ کیا جان سکتا ہے کہ خدا سے کب اور کیسے طلب کرنا چاہیے اور کیا مانگنا چاہیے ۔ یہ مرتبہ تو اُسے ملتا ہے جس پر جاء الحق وزھق الباطل (حق آگیا اور باطل پسپا ہو گیا ۔ الاسراء ۱۷:۸۱) کا ظہور ہو' باطن نورانی ہو جائے اور ظلمتِ نفس جاتی رہے' تب نورِ باطن راستہ دکھاتا ہے کہ کیا کرنا چاہیے ۔ جب تک یہ کیفیت حاصل ہو اُس وقت تک صبر کرو اور نوکری کرتے رہو' جلدی مت کرو ۔ یہ سب غیبی معاملات ہیں انتظار کرو دیکھو غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے ۔ استخارہ بہت زیادہ کیا کرو ۔"

وسیلے کی ضرورت ہے

فرمایا حق سبحانہ و تعالیٰ نے دنیا اور آخرت میں بہت سے کاموں کو وسیلے سے متعلق رکھا ہے مثلاً اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ دنیا میں بادشاہ سے یا امراء سے اپنا ماجرا خود بیان کرے تو کیسے ممکن ہے ؟ بہت سی رکاوٹیں ہیں' چوکیدار پہرے دار ہیں' جب تک اِن سب سے نہ گذرے کا یہ ہو نہیں سکتا ۔ لیکن اگر وہ کسی کے وسیلے سے جائے جسے بادشاہ کا قرب حاصل ہو تو اُس کا مقصد بخوبی حاصل ہو جائے گا ۔

اسی طرح اگر بادشاہ حقیقی (خدا) تک کوئی خود پہنچنا چاہتا ہے یا کوئی حاجت طلب کرتا ہے تو ہرگز نہیں پاسکتا کیونکہ آفات اور رکاوٹیں بے شمار ہیں ۔ لہٰذا اگر وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ میں آجائے تو اس کی ساری حاجتیں پوری ہو جائیں گی ۔ جب تک حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پردے میں ہیں اُن کے نائب اُن کی جگہ کی حفاظت کر رہے ہیں ۔

نائبانِ رسول

مثلاً خواجہ حسن بصریؒ خواجہ اویس قرنیؒ' بایزید بسطامیؒ' خواجہ جنیدؒ بغدادی و حضرت ابو بکر شبلیؒ و حضرت شیخ الاسلام نظام الدین و حضرت شیخ الاسلام برہان الدین (رحمہم اللہ) ان میں سے ہر ایک اپنے زمانے میں نائبِ رسول ہوا ہے اور مخلوق خدا نے ان کی حمایت سے اپنے دینی اور دنیوی مقاصد حاصل کیے ہیں' اس لیے خود کو ایسے بزرگوں کی حمایت میں دے دینا چاہیے تاکہ اُن کے طفیل میں سارے کام بخوبی انجام پا جائیں ۔ البتہ اپنی طرف سے شریعت محمدی میں پوری طرح مستعد ہونا ضروری ہے' تب اُن کی حمایت نصیب ہو گی اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اُن کا قرب اور منزلت بھی حاصل ہو جائے گی ۔ بادشاہ کے خاص بندے بن جاؤ تو کوتوال کے شبہ کرنے سے یا سرکاری افسروں کی پوچھ تاچھ سے دن اور رات محفوظ ہو جاتے ہیں ۔ اس کے بعد آپ نے اس بندۂ کمینہ کو رخصت کیا اور فرمایا ۔

نصیحت ہمین است جان برادر
کہ اوقات ضائع مکن تا توانی

(جان برادر ہماری نصیحت بس یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے وقت کو بیکار مت گنواؤ)

استخارہ بہت کیا کرو' جب یہ نہ ہو تو کلمہ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تسبیح پڑھو' درود و استغفار اور قل ھو اللہ یا جو بھی ممکن ہو اس کا ورد رکھو جب ان سب سے فارغ رہو تو کوئی نظم یا سلوک کی کتاب پڑھو بیکار ہرگز مت بیٹھو ۔

مردان ناقص و کامل

فرمایا اللہ تعالیٰ نے بعض کو کامل پیدا کیا ہے بعض کو ناقص بنایا ہے ۔ جنھیں کامل بنایا ہے وہ کسی تنگی ترشی سے' بے چارگی یا حوادث سے متغیر نہیں ہوتے ۔ اسبابِ دنیا پر بھی گھمنڈ نہیں کرتے ۔ ناقص دو طرح کے ہوتے ہیں ۔ ایک ناقص تو وہ ہے جو کسی کامل کی پناہ میں ہے' وہ بھی اچھا ہے اُس کا نقصان اُس کامل کے اثر سے متغیر نہیں ہوتا ۔ دوسرا ناقص وہ ہے جو پریشان ہو جاتا ہے اور وہ کسی کامل کی پناہ میں نہیں ہے ۔ اسے جب دنیا کا اقبال حاصل ہوتا ہے تو وہ بدل جاتا ہے اور گھمنڈی ہو جاتا ہے ۔ چند روز کی لذّت اور خوشحالی برسات کے پانی کی طرح ہے جب مفلس ہو جاتا ہے یا کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو حیران و پریشان ہو جاتا ہے اس لیے انسان کو چاہیے کہ ہر حال میں مرد قابل و کامل بن کر رہے اور نفسانی خواہشوں سے بچا رہے ۔ شعر :

ناقابل است آنکہ بدولت نمی رسد
ورنہ زمانہ در طلبِ مردِ قابل است

(جو کسی مرتبے تک نہیں پہنچا وہ ناقابل ہے ورنہ زمانہ تو مرد قابل کا طلب گار ہے (جاری ہے)

حضرت سلطان المشائخ اور ان کی تعلیمات

حضرت محمد آیت اللہ جعفری پھلواروی

سلطان المشائخ کی شخصیت پر اب تک بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اسلیے ان کی شخصیت کے کسی نئے گوشے کا انکشاف مشکل ہے۔ سیرت و شخصیت کے کسی نئے پہلو تک محققین اہل قلم ہی کی رسائی ہوسکتی ہے خاکسار اس کا اہل نہیں یہ چند سطریں سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہ سے عقیدت و محبت کے نتیجے میں اور سلسلہ چشتیہ نظامیہ سے تعلق کی بنا پر پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔

آپکی ولادت بدایوں کی مردم خیز زمین میں ماہ صفر کے آخری چہار شنبہ ۱۲۳۸ء کو ہوئی حضرت محبوب الٰہی پانچ سال کے ہونے تو آپ کے والد ماجد نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ کی والدہ ماجدہ جو اپنے وقت کی بڑی عابدہ و صالحہ تھیں انھوں نے نہایت خوش اسلوبی اور بڑے اہتمام و توجہ سے آپکی تربیت فرمائی۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہونے تو شہر بدایوں کے ممتاز علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا آپ کے اساتذہ میں سب سے نمایاں شخصیت حضرت مولانا علاء الدین اصولی کی ہے۔ بدایوں میں تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کرکے باقاعدہ تحصیل و تکمیل کی غرض سے سولہ سال کی عمر میں دہلی تشریف لائے اور دہلی میں رہ کر تعلیم حاصل کرنا شروع کیا آپ بڑے ذہین و فطین تھے ساتھیوں سے خوب علمی مناظر ے کرتے۔ بحث و استدلال میں آپ کا کوئی ہم پلہ نہ تھا اور نہ مقابلہ کی تاب لاسکتا تھا آپ جس علمی مسئلے پر بحث کرتے آپ کے رفقاء لاجواب ہو جاتے۔ زمانہ طالبعلمی میں ہی آپ کے ہم درس آپکے تبحر علمی کا اعتراف کرنے لگے اور آپ کو مولانا نظام الدین بحاث اور مولانا نظام الدین محفل شکن کے لقب سے پکارنے لگے تھے۔

تحصیل علم کے بعد آپ شیخ کامل اور مربی جلیل کی تلاش میں اجودھن تشریف لے گئے۔ بابا فرید الدین گنج شکر قدس اللہ سرہ کی خانقاہ میں تشریف لائے۔ جب آپ حضرت بابا صاحب کے پاس پہنچے تو بابا صاحب نے آپ کو دیکھ کر یہ شعر پڑھا۔

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

آپ نے اپنے پیر و مرشد کی صحبت میں رہ کر مدارج سلوک و تصوف بالخصوص عوارف المعارف کے درس خاص کی تکمیل کرکے خلافت کی سند حاصل کی اور اس کے بعد آپکو دہلی میں قیام کرنے کا حکم ملا۔

آپ کی تعلیمات بکثرت ہیں اور صوفیاء ہند کے متعلق معلومات کا بیش بہا ذخیرہ آپکے ملفوظات میں موجود ہے جنھیں آپکے دو فیض یافتہ اور دست گرفتہ بزرگوں نے جمع کیا ہے۔ خواجہ میر حسن سجزی نے فوائد الفواد کے نام سے اور امیر خرد کرمانی نے سیر الاولیاء کے نام سے ملفوظات مرتب کئے اور انکے مطالعے سے محبوب الٰہی کے تبحر علمی اور وسعت نظر کا حسب بساط اندازہ ہوتا ہے۔ معمولی شرعی مسائل سے لیکر اعلیٰ مقامات تصوف تک آپ نے مختلف اوقات میں نہایت عام فہم انداز میں لوگوں کو سمجھایا۔ ظہر کی نماز کے بعد مجلس منعقد ہوتی

اس میں حضرت علمی نکات بیان کرتے ۔ تفسیر و حدیث اور دوسری کتابوں کا بھی درس ہوتا ۔ حاضرین سر جھکائے آپ کے علمی اقوال سے اس طرح محظوظ ہوتے گویا وہ الہامی باتیں سن رہے ہیں۔۔

حضرت سلطان المشائخ نے اپنے مریدین و معتقدین کی اصلاح و تربیت بڑے اہتمام و توجہ سے فرمائی آپ کے دست گرفتہ و تربیت یافتہ مریدین و مسترشدین نے کبھی دنیا سے دل نہیں لگایا اور فقر و درویشی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور جاہ و جلال کی کسی نمائش کے موقع پر کلمہ حق کہنے سے کبھی باز نہیں رہے ۔یہی حقیقی تصوف کا نتیجہ اور درویشان کامل کا شیوہ ہے حق گوئی و بیباکی کے ایسے نمونے پیش کئے جنکی نظیر ملنی آسان نہیں ۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

سلسلہ چشتیہ کے مشائخ نے بوریا نشینی ،فقر و درویشی اور حکام و سلاطین وقت کی ملاقات سے احتیاط و گریز کو اپنا اصول بنایا تھا اور ان سے نہ صرف یہ کہ دور رہنا پسند کرتے تھے ان کے تحفے اور نذرانے بھی قبول نہیں فرماتے تھے ان کی یہ روش اس بات کی طرف اشارہ تھی کہ سلاطین وقت کی امداد و اعانت سے فقراء اور صوفیہ کا طبقہ مستغنی اور بے نیاز ہے اس جماعت نے اپنے محبوب ازلی اور معشوق حقیقی کے آستانے پر سر رکھ دیا ہے ۔ان کی عزت و شہرت مقبولیت و مرجعیت شاہان عصر کی توجہ و کرم کی مرہون منت نہیں ہے یہ حق پسندوں ، حق پرستوں اور حق گویوں کی غیرت مند جماعت ہے

اہل دول کے ممنون احسان ہو کر یہ حضرات اعلاء کلمہ الحق اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا نہیں کر سکتے ، چنانچہ سلطان المشائخ انہی بزرگوں کے نقش قدم پر تھے ۔ آپ ہمیشہ اشاعت اسلام کے لیے کوشاں رہتے ، آپ یہ سمجھتے تھے کہ محض بہترین تقریر وعظ و نصیحت سے غیر مسلموں کو مسلمان کر لینا آسان نہیں ،ان لوگوں کو موثر اور طویل صحبت کی ضرورت ہے۔

فوائد الفواد میں ہے کہ ایک غلام جو مسلمان تھا حضرت کی مجلس میں حاضر ہوا اسکے ساتھ اسکا ایک ہندو دوست تھا ۔اس نے کہا کہ میرا بھائی ہے ۔حضرت نے اس غلام سے فرمایا کہ تمہارا بھائی کچھ اسلام کی طرف بھی رغبت رکھتا ہے ، غلام نے عرض کیا ،اس کو حضرت کے قدموں میں اس لیے لایا ہوں کہ نظر کیمیا اثر کی برکت سے یہ مسلمان ہو جائے یہ سن کر حضرت کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں فرمایا کہ کسی کے کہنے سننے سے اس قوم کا دل نہیں پھرتا ۔ہاں اگر اسکو کسی نیک بندے کی صحبت میسر ہو تو امید ہے کہ اسکی صحبت کی برکت سے مسلمان ہو جائے۔

چشتی بزرگوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ انھوں نے اصلاح و تزکیہ نفس کے لیے تحریر و تقریر کو ذریعہ نہیں بنایا البتہ اپنے ارشادات و فرمودات اور پند و نصائح کے ذریعہ اصلاح فرماتے تھے اور اس سے زیادہ ان بزرگوں کی بابرکت صحبتیں اور کیمیا اثر لوگوں کے اخلاق و اعمال میں تبدیلی کا سبب ہوتی تھیں۔

سلطان المشائخ اپنی نجی مجلسوں میں ہر طرح کی علمی و دینی گفتگو فرماتے تھے ایک ایک نشست میں بے شمار علمی گتھیاں سلجھتیں ، تصوف و سلوک کے مسائل بیان ہوتے طریقت کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھتا اور بہت سی علمی و عرفانی شخصیتوں کے حالات پر پڑے ہوئے تاریخ کے گرد و غبار صاف ہو جاتے ، آپکی گفتگو کیا تھی رنگارنگ بیانات کا مجموعہ اور حقائق و معارف کا آئینہ تھی ۔ حدیث دیگراں کے پیرائے میں خود اپنی بات بیان فرماتے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان ملفوظات میں سلطان المشائخ کے صحیح خد و خال نمایاں ہوتے ہیں اور آپ کے خیالات و رجحانات کا پتہ چلتا ہے ۔ آپکی پرکشش شخصیت علمی فضل و کمال ،فقر و عرفان اور خلق خدا کے ساتھ شفقت و محبت کے سلوک نے آپ کو عوام و خواص میں ایسا مقبول بنا دیا تھا کہ صبح سے شام تک آپکی خانقاہ میں ایک مرجوعہ رہتا ۔ روزانہ سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں آنے والے آپ کے فیوض و برکات سے مستفیض ہو کر جاتے وہ اگر ایک طرف

آپ کے عرفان وولایت اور اخلاص و للہیت کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہونگے تو دوسری طرف آپکے کلمات طیبات عقیدت کے کانوں سے سنکر انکو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہونگے۔ ظاہر ہے کہ سلطان المشائخ کے احوال واقوال اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتے ہونگے۔ ذوق وشوق اور غایت اعتقاد کا تقاضہ ہے کہ دیکھی اور کانوں سنی باتیں دوسروں تک بھی پہنچادی جائیں۔ سیر الاولیا کی روایت سے یہ قیاس حقیقت سے بہت قریب معلوم ہوتا ہے کہ سلطان المشائخ کو سماع کی محفلوں میں جن اشعار پر کیفیت ہوتی وہ اشعار دہلی کے لوگوں میں مشہور ہو جاتے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپکی تعلیمات کا سلسلہ جاری تھا۔ اور ان کو پھیلانے کا قدرت نے خود انتظام کر رکھا تھا اس لیے یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا ہے کہ جنھوں نے آپکی بیعت کا قلادہ اپنے گردن میں ڈالا اور آپکی صحبت اختیار کی صرف وہی اصلاح پذیر ہوئے بلکہ ان کے علاوہ ان لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں جنھوں نے سلطان المشائخ کے پراثر کلمات سن کر اور ان کی قلبی کیفیات کا حال جان کر اپنی زندگی کا رخ بدل لیا ہو۔

آپکے نزدیک تزکیہ، نفس کا حصول بیعت طریقت اور صحبت شیخ پر موقوف تھا اسی لیے اصلاح وارشاد کے لیے آپنے یہی راہ اختیار فرمائی۔

ملفوظات میں نسبتاً تصوف و سلوک کے مسائل زیادہ ہیں۔ طریقت کے آداب و شرائط بیشتر مجلسوں میں بیان فرمائے ہیں گفتگو کے ضمن میں پیران سلسلہ چشتیہ و دیگر بزرگوں کے واقعات بطور استشہاد بیان فرمائے ہیں جس سے ارشادات میں بڑی تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ اثر انگیز واقعات سے کبھی کبھی خود بدولت بھی رو پڑتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ حضرت شیخ ابو سعید ابو الخیر کا واقعہ بیان فرمایا کہ وہ ایک مرتبہ کتاب کا مطالعہ کرنے لگے اس پر ہاتف نے آواز دی اے ابو سعید ہمارا معاہدہ لوٹا دو کیونکہ تم کسی دوسری چیز میں مشغول ہوگئے ہو۔ یہاں تک پہنچ کر آپ رونے لگے اور زبان مبارک سے یہ شعر پڑھا

تو سایہ دشمنی کجا در گنجی
جائی کہ خیال دوست زحمت باشد

فوائد الفواد کی ساتویں مجلس میں ایک مرتبہ ترک دنیا کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ترک دنیا یہ نہیں ہے کوئی شخص کپڑے اتار کر برہنہ ہوجائے مثلاً لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائے۔ ترک دنیا یہ ہے کہ لباس بھی پہنے کھانا بھی کھائے البتہ اس کے پاس جو کچھ آئے اسے خرچ کرتا رہے جمع نہ کرے اس کی طرف دل راغب نہ ہو اور دل کو کسی چیز سے وابستہ نہ کرے۔

ایک دوسرے موقع پر دنیا اور لذتوں کو ترک کے بارے میں اس طرح افادہ فرمایا کہ ہمت بلند رکھنی چاہیے۔ دنیا کی آلائش میں مشغول نہیں ہونا چاہیے اور خواہشات نفسانی سے دست کش رہنا چاہیے پھر یہ شعر پڑھا

یک لحظ زشہوت کہ داری برخیز
تا بنشیند ہزار شاہد بہشت

اس ہوس سے جو تمہارے اندر پیدا ہوگئی ہے ایک لحظہ سے دست کش ہوکر اٹھ کھڑے ہو تا کہ ہزار معشوق تمہارے سامنے آبیٹھیں۔

فوائد الفواد کی تیرھویں مجلس میں طاعت الٰہی کا ذکر کرتے ہوئے نکتہ بیان فرمایا ایک طاعت لازمی اور ایک طاعت متعدی۔ لازمی طاعت وہ ہے جس کا فائدہ صرف طاعت کرنے والے ہی کے نفس تک رہے اور یہ طاعت ہے نماز۔ حج۔ اوراد و ظائف تسبیحات اور انھیں کی مانند دوسری چیزیں متعدی طاعت وہ ہے کہ اس سے دوسرے کو منفعت اور راحت پہنچے انفاقاً خواہ از راہ شفقت، پھر جسے یہ راحت پہنچے وہ دوسرے پر لطف و کرم کرے اسے متعدی طاعت کہتے ہیں اس کا ثواب بے حد و حساب ہے لازمی طاعت میں اخلاص چاہیے البتہ متعدی طاعت جس صورت میں کی جائے اس کا ثواب ملے گا۔

آجکل فہم قرآن پر بہت زور دیا جارہا ہے قرآن کی تفسیریں بیان کی جاتی ہیں درس قرآن کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں

لیکن اس کے باوجود اعتقاد و اعمال کا بگاڑ اخلاق و کردار کی خرابی اپنی جگہ پر ہے علماء اور دانشوروں کی باتیں آپ سنتے ہی رہتے ہیں۔ حضرت محبوب الٰہی کی زبان وحی ترجمان سے بھی تلاوت قرآن کے آداب سماعت فرمائیے۔ فرماتے ہیں کہ تلاوت قرآن مجید کے مراتب کی آٹھ قسمیں ہیں۔ پھر پانچ قسموں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا پہلی قسم یہ ہے کہ قرآن پڑھنے والے کے دل کا خدائے تعالیٰ سے تعلق ہو اگر یہ میسر نہ ہو تو چاہیے جو کچھ پڑھے اس کے معنی اس کے دل کے اندر اتریں اگر یہ بھی میسر نہ ہو تو چاہیے کہ قرآن پڑھتے وقت خدا تعالیٰ کی عظمت و جلال کا تصور دل کے اندر اترے مرتبہ چہارم کے بارے میں فرمایا کہ تلاوت کرتے وقت تلاوت کرنے والے پر یہ احساس غالب ہونا چاہیے کہ قرآن کی اس دولت کے لائق میں کہاں ہوں اور اس دولت کا میں کہاں سے اہل ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو تلاوت کرنے والے کو جاننا چاہیے کہ قرآن کی تلاوت کا اجر دینے والا خدائے تعالیٰ ہے (فوائد الفواد بانسویں مجلس)

قرآن پڑھنے کا تعلق اگر خدا سے نہ ہو اور معنی قرآن اس کے دل کے اندر نہ اترے تو ایسا پڑھنے سے کیا فائدہ۔

حضرت محبوب الٰہی کے ارشاد میں بڑی معنویت ہے بقول علامہ اقبال۔

تیرے ضمیر پہ جبتک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

بیعت طریقت کا اصول بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا کہ بعض لوگ بیعت کا طریقہ نہیں جانتے ہیں ایک سے بیعت کرتے ہیں پھر دوسرے سے وابستہ ہوجاتے ہیں بعض لوگ مشائخ کے مزاروں سے بیعت کرتے ہیں حسن سجزی جامع ملفوظات نے عرض کیا کہ بعض مشائخ کے مزاروں کا قصد کرتے ہیں اس کے پاس جیٹھ کر سر منڈاتے ہیں کیا یہ بیعت جائز ہے جواب میں اپنے پیر و مرشد سے متعلق ایک واقعہ بیان فرمایا کہ شیخ الاسلام بابا فریدالدین کے ایک صاحب زادے شیخ الاسلام قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کے پائنتی میں گئے وہاں سر منڈایا لوگوں نے یہ خبر حضرت باباصاحب کو دی آپ نے فرمایا کہ شیخ قطب الدین ہمارے آقا و مخدوم ہیں لیکن اس بیعت کو صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا ارادت و بیعت یہ ہے کہ کسی شیخ و مرشد کا ہاتھ پکڑ لیا جائے (چوبیسویں مجلس فوائد الفواد)

حضرات صوفیاء کے بتائے ہوئے اوراد واشغال پر آج بڑے اعتراضات ہیں ان کو غیر شرعی قرار دیا جارہا ہے حالانکہ سلطان المشائخ کا ارشاد ہے کہ کسی صاحب نعمت کے نفس کی بدولت حاصل ہونے والی عبادت اور وظائف کو ادا کرنے کی راحت ہی کچھ اور ہے پھر فرمایا کہ بعض ورد ہیں جنھیں میں نے خود اپنے اوپر لازم کیا ہے اور بعض ورد ہیں جنھیں میں نے اپنے پیر و مرشد سے حاصل کیا ہے ان دونوں ورد کے ادا کرتے وقت جو راحت حاصل ہوتی ہے ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے (مجلس چودہ فوائد الفواد)

سلطان المشائخ کا وصال ۱۸۔ربیع الثانی ۷۲۵ھ میں ہوا اسی دن دوپہر میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ حضرت شیخ رکن الدین ملتانی اور حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی نے آپ کے جسد اطہر کو قبر میں اتارا اور آپ کے پیر و مرشد کے تبرکات آپ کے شامل کئے گئے۔

صدیاں گزر گئیں لیکن آج بھی آپ کے فیضان سے کتنے قلوب بہرہ ور ہورہے ہیں اور کتنے انسانوں کو دل و نگاہ کی پاکیزگی حاصل ہے۔ آپ کا فیض جاری ہے اور جاری رہے۔

الٰہی تابود خورشید و ماہی
چراغ چشتیاں را روشنائی

(حضرت محبوب الٰہی کے عرس کے موقع پر یہ مضمون پڑھا گیا۔)

قوام العقاید ـــــ ایک تعارف

ڈاکٹر شریف حسین قاسمی

خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب اور دیگر منتظمین سیمنار کا ممنون ہوں کہ مجھے یہ موقع دیا کہ اس مبارک محفل میں قوام العقاید کے مختصر تعارف کی سعادت حاصل کروں۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات پر مشتمل فوائد الفواد کو جو دائمی شہرت، محبوبیت اور درجہ اعتبار حاصل ہے وہ صاحبان نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس کی ایک لازمی وجہ یہ ہے کہ یہ کتاب محبوب الہی کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ و مطالب پر حاوی ہے۔ اس کی عبارات کو خود محبوب الہی نے بہ نظر اصلاح و ترمیم اور تصدیق دیکھا تھا، اس کا مطالعہ کیا تھا۔ گویا کہ فوائد الفواد محبوب الہی کی تصنیف و تالیف ہے جسے صفحہ قرطاس پر پیش کرنے کی عظیم سعادت حسن علاء سنجری دہلوی کو نصیب ہوئی تھی۔

فوائد الفواد اپنی نوعیت کی غالباً سب سے پہلی کتاب ہے جو فارسی میں ہندوستان میں ترتیب دی گئی۔ محبوب الہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی طرح یہ کتاب بھی ایسی بابرکت ثابت ہوئی کہ اس کے بعد نہایت وقیع و وسیع ملفوظ ادب ہندوستان کے گوشے گوشے میں ترتیب دیا گیا۔

محبوب الہی کی زبردست علمی شخصیت، نہایت بلند عرفانی مقام اور عام روحانی فیض رسانی نے صرف سارے شہر دہلی ہی کو نہیں جہاں آپ قیام فرما رہے، بلکہ تمام ہندوستان اور حتی ہندوستان سے باہر بھی عرفا و مشائخ، علما و فضلا، ادبا و شعرا اور عام لوگوں کو آپ کا دل سے گرویدہ بنالیا تھا۔ آپ کی زبان سے نکلنے والے الفاظ و عبارات میں وہ کشش، جاذبیت اور اثر تھا کہ آپ کے احوال واقوال صرف آپ کے اپنے چشتی سلسلہ تصوف سے وابستہ بزرگوں ہی میں مقبول و معتبر نہیں تھے، بلکہ ان کی گونج دیگر عرفانی سلسلوں کی مجالس میں بھی سنی جا سکتی تھی۔

محبوب الہی سے ان کے وابستگان نے والہانہ محبت کی۔ ان حضرات نے پیہم کوشش کی کہ آپ کی تعلیمات عام ہوں اور اس طرح آپ کے سلسلہ تصوف کا صحیح اور مناسب تعارف کرایا جاتا رہے۔ آپ کے خلفاء سارے ہندوستان میں پھیل گئے۔ انھوں نے خانقاہیں تعمیر کیں اور خدمت خلق کے ذریعے اسلام اور اپنے طریقہ تصوف کی تبلیغ و ترویج کی اور ایک صالح سماج کی تشکیل میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔

محبوب الہی کے خلفا جہاں بھی گئے محبوب الہی کی یاد انھیں تڑپاتی رہی اور وہ اپنی مجلسوں میں آپ کے احوال واقوال اپنے اپنے وابستگان کو سنا کر اپنے اور اپنے سامعین کے دل و دماغ کو روحانی غذا بہم پہنچاتے رہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور یہ سیمنار اس کا ایک ناقابل انکار ثبوت۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے خلفا اور مریدوں نے آپ کے ملفوظات متعدد ناموں سے جمع کئے ہیں۔ محبوب الہی کے احوال واقوال پر مشتمل درج ذیل کتابوں کو کلیدی اہمیت حاصل ہے: امیر حسن علاء سجزی دہلوی کی فراہم کردہ فوائد الفواد، درر نظامی مولفہ علی بن محمود جاندار، قوام العقاید جس پر بعد میں نسبتاً تفصیل سے گفتگو کی جائے گی، سید محمد بن مبارک علوی معروف بہ امیر خرد کرمانی کی سیر الاولیا فی محبت الحق جل و علا، خواجہ سید محمد امام کی انوار المجالس، تحفۃ الابرار و کرامۃ الاخیار

تالیف خواجہ عزیز الدین صوفی ابو بکر مصلی دار کے صاحبزادے خواجہ عزیز الدین کی مجموع الفواید، شمس الدین دھاروی کی "ملفوظات سلطان المشائخ" مولانا علی شاہ جاندار کی عربی میں خلاصۃ اللطائف، ان کے علاوہ خیر المجالس، احسن الاقوال، غرائب الکرامات نفائس الانفاس، شمایل الاتقیا، بقیۃ الغرائب وغیرہ وہ کتابیں ہیں جن سے ہمیں حضرت محبوب الہی کے حالات کمالات و تعلیمات پر نہایت قیمتی مواد ملتا ہے۔ ان میں سے بہت سی کتابیں آج دستیاب نہیں جو دستیاب ہیں ان میں سے اکثر شائع نہیں ہوسکی ہیں اور خطی نسخوں کی شکل میں مختلف کتابخانوں اور علمی اداروں میں موجود ہیں محبوب الہی کی شخصیت اور علمی و روحانی مقام کے مکمل افہام و تفہیم کے لیے یہ تمام کتابیں ناگزیر اور ایک دوسرے کا تتمہ و تکملہ ہیں اس لیے کہ ان میں سے ہر کتاب سے آپ کی شخصیت اور تعلیمات کے بارے میں کسی نہ کسی نئے گوشے پر روشنی پڑتی ہے۔ اس وجہ سے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ حضرت محبوب الہی کی شخصیت کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ان تمام کتابوں کی باقاعدہ اشاعت اور بالاستیعاب مطالعہ لازمی ہے۔

جناب پروفیسر نثار احمد صاحب فاروقی قابل مبارکباد ہیں کہ آپ نے قوام العقاید کا فارسی متن اپنی روایتی علمی مہارت اور تصحیح و ترتیب کے جملہ جدید اصول و ضوابط کے مطابق مرتب کیا اور اسے "قند پارسی" رسالے میں شائع کرنے کی اس طالب علم کو اجازت دی۔ فاروقی صاحب کے علمی تبحر وسیع مطالعے معارف اسلامی اور خاص طور پر تصوف و عرفان پر ان کی گہری نظر اور چشتی سلسلہ تصوف سے ان کی ذہنی و قلبی وابستگی عربی فارسی اردو اور انگریزی زبانوں پر ان کا عبور اور ان امتیازات کی بنیاد پر آپ کی علمی ادبی، تحقیقی اور تاریخی کاوشوں سے ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ لہٰذا اس مجلس میں پروفیسر فاروقی صاحب کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ عرض کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔

محمد جمال قوام نبیرہ شمس العارفین، مرید و خلیفہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی تصنیف، قوام العقاید کو حضرت محبوب الہی کے احوال و اقوال کے ضمن میں کلیدی اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔ اس کتاب کو ترتیب زمانی کے لحاظ سے فوائد الفواد کے بعد رکھا جائے گا۔ یہ ۷۵۵ھ / ۱۳۵۴ء میں دولت آباد میں تالیف ہوئی۔ جو واقعات و مطالب اس میں درج ہیں، وہ محبوب الہی کے مرید و خلیفہ حضرت قوام الدین معروف بہ شمس العارفین نے روایت کیے ہیں، انھوں نے بیشتر مطالب خود حضرت محبوب الہی سے سماعت کیے تھے۔

شمس العارفین کے بارے میں ہماری معلومات نسبتاً کم ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ آپ رجب ۷۰۸ھ میں محبوب الہی کے مرید ہوئے۔ اسی سال سے مختلف مجالس کی روداد فوائد الفواد میں ترتیب دینی شروع کی گئی تھی۔ مرید ہونے سے پہلے، آپ نے کچھ عرصے تک فوج میں ملازمت کی جسے ترک کرنے کے بعد محبوب الہی سے بیعت ہوئے اور انہی کے رنگ میں رنگ گئے۔ عبادت و ریاضت کو اپنا شیوہ بنالیا۔ ۷۲۷ھ / ۱۳۲۷ء میں سلطان محمد بن تغلق کے دور حکومت (۷۲۵ - ۷۵۲) میں بے شمار دہلی والوں اور محبوب الہی کے دوسرے خلفا اور مریدوں کے ہمراہ دہلی سے دولت آباد ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی بابرکت صحبتیں اور جماعت خانہ، شیخ کے انوار و برکات کو بڑی حسرت سے یاد کیا کرتے تھے۔ فاروقی صاحب کے بقول "اسی حنین وطن" (nostalgia) کا ثمرہ یہ کتاب قوام العقاید ہے۔

قوام العقاید سے پتا چلتا ہے کہ حضرت شمس العارفین کو سید محمد کرمانی نے بیٹا بنالیا تھا۔ شمس العارفین دولت آباد ہی میں بس گئے تھے۔ آپ نے بہمنی سلطنت کے بانی حسن گنگو بہمنی کا زمانہ (۷۴۸ - ۷۵۹) پایا۔ آپ ۷۰۵ - ۷۲۵ کے درمیانی زمانے میں کھمبایت (گجرات) کے راستے حج پر تشریف لے گئے۔ قوام العقاید کی بعض حکایات میں آپ نے اپنے دریائی سفر، یمن میں قیام، وہاں کے مشائخ کی خدمت میں حاضری، حجاز میں پہنچنا اور حرمین شریفین کی زیارت کا حال بیان کیا ہے۔ ۱۷ - ۱۸ شوال، جمعرات کے دن مدینہ منورہ میں

حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ اسی طرح واپسی کے سفر کی روداد بھی بعض حکایات میں بیان کی گئی ہے آپ نے غالباً دولت آبادہی میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

حضرت شمس العارفین کے پوتے محمد جمال قوام نے محرم ۷۵۵ سے رجب ۷۵۵ تک چھ ماہ کی مدت میں اپنے دادا سے سنی ہوئی روایات کو خود ان کی اجازت اور دیگر وابستگان کے اصرار پر جمع اور قوام العقاید کے نام سے مدون کیا۔ تالیف کتاب کے وقت حضرت شمس العارفین بقید حیات تھے

قوام العقاید کا نام قوام بغیر تشدید کے اور قوام تشدید کے ساتھ دونوں طرح ہوسکتا ہے۔ کتاب کے خطی نسخے کے آخری صفحے پر کاتب نے قوام درویش لکھا ہے یعنی تشدید کے ساتھ۔ یہ بھی امکان ہے کہ کتاب کا نام قوام العقاید (بغیر تشدید) اور مولف کا نام محمد جمال قوام (تشدید کے ساتھ ہو)۔

رکن الدین دبیر کاشانی کی تالیف شمایل الاتقیا میں قوام العقاید سے صرف ایک اقتباس نقل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ اہم نادر اور ہم عصر ماخذ اب تک حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے تذکرہ نگاروں کی دسترس سے دور رہا۔ چند سال قبل غالباً سب سے پہلے خود پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب نے جناب خواجہ حسن ثانی نظامی کی اردو ترجمہ فوائد الفواد کے مبسوط تاریخی اور عالمانہ مقدمے میں اس کتاب کے مشمولات سے بھرپور استفادہ کیا ہے

قوام العقاید نو (۹) ابواب پر مشتمل ہے۔ عنوانات اس لیے پیش خدمت ہیں تاکہ کتاب کی نوعیت کا علم ہوسکے

پہلا باب ۔ شیخ الاسلام (حضرت خواجہ نظام الدین اولیا) کی ولادت کی کیفیت اسی زمانے میں علامات سعادت کا ظہور آپ کا شیخ الاسلام فرید الحق والدین سے بیعت کرنا اور نعمتیں اور ولایت پانا۔

دوسرا باب ۔ شیخ الاسلام (حضرت خواجہ نظام الدین اولیا) سے علما اور ائمہ شہر کا ملنا اور مرید ہونا۔

تیسرا باب ۔ بعض دیگر علما و مشایخ کا بیان جو محبت وصحبت کی خاطر آپ سے وابستہ تھے۔

چوتھا باب ۔ اطراف عالم کے بزرگوں اور مشایخ کا شیخ کی خدمت میں عظمت و کرامت معائنہ کرنے کے بعد التجا کرنا۔

پانچواں باب حضرت شیخ کی کرامتوں کا بیان خود حضرت شیخ اور بعض اصحاب کے معاملات

چھٹا باب سلاطین و شاہزادگان اور ملوک و خانان کا خدمت شیخ سے عقیدت وارادت سے وابستہ ہونے کا بیان۔

ساتواں باب علما خانان اور ملوک و امرا خاص و عام اور اہل سلوک کو شیخ کے عطیات کا بیان

آٹھواں باب فرقہ بیعت اور ارادت کی کیفیت کا بیان

نواں باب شیخ کے ملفوظات اور بعض مشایخ کے اقوال کے بیان میں قدس اللہ ارواحہم

قوام العقاید کے مطالب تمام تر زبانی روایات پر مبنی ہیں۔ صرف ایک جگہ تذکرۃ الاولیا کا حوالہ ملتا ہے جس سے غالبا ایران کے معروف صوفی اور شاعر شیخ فریدالدین عطار کی تصنیف مراد ہے۔ یاد رہے کہ عطار کے بارے میں محبوب الٰہی نے اپنی مختلف مجالس میں نہایت اہم تاریخی اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔

قوام العقاید کی اکثر حکایات میں محبوب الٰہی کے بعض خلفا اور مریدوں کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ گویا یہ حضرات شمس العارفین کے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ ان میں قاضی محی الدین کاشانی شہاب الدین امام مولانا بدر الدین نو لکھا ظہیر الدین کو توال مندہ شرف الدین جیمنگل (یہ علاء الدین خلجی کے بھانجے ملک حسام الدین کے امام تھے) مولانا حجۃ الدین ملتانی مولانا علی شہ جاندار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

قوام العقاید سے بعض ایسی اطلاعات ملتی ہیں جو غالبا کسی دوسرے معتبر ماخذ میں موجود نہیں۔ اسی ماخذ سے علم ہوتا ہے کہ قاضی محی الدین کاشانی کے ایک فرزند تھے جن کا نام عبداللہ تھا۔ یہ بچپن ہی میں فوت ہوگئے تھے۔ اسی کتاب سے یہ علم بھی ہوتا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ قاضی صاحب کے

تعلقات اپنی اہلیہ سے اس درجے کشیدہ ہونے کہ قاضی صاحب نے ان سے علیحدگی اختیار کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اس سلسلے میں جب قاضی صاحب نے حضرت محبوب الہی سے مشورہ کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ علاحدگی نہیں ہوگی تعلقات بہتر ہوجائیں گے اور اس کے بعد اولاد بھی ہوگی ایسا ہی ہوا۔

قاضی صاحب کے بھائی قاضی رفیع الدین کاشانی کا ذکر بھی بعض حکایات میں آیا ہے۔

اسی قدیم اور ہم عصر ماخذ سے یہ پتا بھی چلتا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے والد ماجد کا وصال آپ کی ولادت باسعادت سے کچھ مدت پہلے ہوگیا تھا۔ ۶۶۰ھ میں آپ پہلی بار حضرت بابا فرید کی خدمت مبارک میں حاضری کے لیے اجودھن تشریف لے گئے۔ اس وقت آپ کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی زلیخا حیات تھیں اور ان کی اجازت سے یہ سفر کیا گیا تھا۔

امیر خرد کرمانی کی سیر الاولیا اپنے مطالب و مشتملات کے لحاظ سے ایک اہم تالیف ہے اس کتاب سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے اسلاف و اخلاف کے حالات کا علم ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اگر یہ کتاب موجود نہ ہوتی تو ہندوستان میں چشتی مشائخ کی جلیل القدر خدمات سے ہم تقریباً ناواقف رہتے۔

قوام العقاید سیر الاولیا سے چند سال قبل مکمل ہوئی۔ ان دونوں کتابوں میں بعض مشمولات مشترک ہیں جو اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ دونوں کتابیں ایک دوسرے کے مطالب کی تصدیق و توثیق کرتی ہیں اور اس طرح ان کے مطالب کا درجہ اعتبار بڑھ جاتا ہے۔

قوام العقاید کا واحد خطی نسخہ جس کا فارسی متن پروفیسر نثار فاروقی صاحب نے مرتب کیا ہے اور جو شائع بھی ہو چکا ہے اور جس کے اردو ترجمے کی آج رونمائی کی گئی ہے، عثمانیہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ عبداللہ نام کے ایک کاتب نے اس مخطوطے کی کتابت ۷۹۱ھ میں مکمل کی یعنی تالیف کتاب کے صرف ۳۶ سال بعد۔ یہ خود بڑی اہم بات ہے اس لیے کہ فوائد الفواد اور سیر الاولیا وغیرہ کے قدیم خطی نسخے دستیاب نہیں۔

ہندوستان میں آٹھویں صدی ہجری کے فارسی آثار زیادہ نہیں ملتے۔ اس کتاب کا انکشاف اور اس کی اشاعت ہندوستانی فارسی ادب کے ذخیرے میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ یہ کتاب اپنے دور کی بول چال کی فارسی کا نمونہ بھی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے، آسان زبان اور خوشگوار انداز بیان نے اس کتاب کو اس دور کی فارسی نثر کا اہم نمونہ بنادیا ہے۔ اس کی فارسی نثر میں متعدد ہندوستانی الفاظ کا استعمال اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہاں فارسی کیا شکل و صورت اختیار کررہی تھی اور اس میں لسانی طور پر کیا تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں۔ قوام العقاید کی فارسی نثر میں بھی بہت سی دوسری عرفانی کتابوں کی مانند ایک خاص نوعیت کا جذبہ، حال اور آب و تاب نظر آتا ہے۔ اس کی نثر میں سادگی اور تازگی کے علاوہ وجد و شوق کی ایسی کیفیت ملتی ہے جو کتاب کو ایک خاص قسم کی زیبائش اور جاذبیت عطا کرتی ہے۔

ہندوستان میں فارسی سات صدیوں تک سرکاری زبان رہی ہے۔ علما، ادبا، شعرا وغیرہ نے اسی زبان کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ فارسی ہندوستان میں سب کی زبان تھی۔ اس میں قرآن حکیم بھی منتقل کیا گیا اور مہابھارت و راماین کے ترجمے بھی ہوئے۔ یہاں کے عرفا و مشائخ بھی اکثر اسی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ خانقاہوں میں عام طور پر یہی زبان بولی جاتی تھی۔ مشائخ کے ملفوظات اور دیگر آثار اسی زبان میں مرتب ہوئے ہیں۔ فارسی کا خانقاہوں سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے یہ رابطہ آج بھی برقرار ہے یعنی جو زوال خانقاہی زندگی پر طاری ہے فارسی بھی اسی کا شکار ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب اس صورت حال سے واقف ہیں اسی وجہ سے آپ نے قوام العقاید کو فارسی سے اردو میں منتقل اور اس طرح کے مطالب اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے احوال و تعلیمات سے عام استفادہ کا امکان فراہم کیا ہے۔ (باقی صفحہ ۲۹ پر)

خواجہ حسن نظامیؒ کی "آپ بیتی"

پروفیسر اسلم فرخی

میں نے ایک ایسی کاوش کا آغاز کیا ہے جس کی کوئی نظیر موجود نہیں۔ مکمل ہونے کے بعد اس کی تقلید بھی نہ ہو سکے گی۔ میرا مقصد اپنی جنس کے سامنے ایک ایسی انسانی شبیہ پیش کرنا ہے جو بہ ہمہ وجوہ فطرت کے عین مطابق ہو۔ میں جس آدمی کی شبیہ پیش کروں گا وہ خود میں ہوں گا۔ "صرف میں"۔

ان الفاظ کے اظہار سے فرانسیسی دانشور روسو نے خود نوشت کو ایک عام انسان کی سطح تک پہنچا دیا۔ روسو سے پہلے خود نوشت کے قدیم مرتبیں میں اس کا مقصد عیسائی عقیدے کی پیروی میں "اعترافات گناہ" یا بہتر مستقبل کے حصول کے لیے ماضی کی ناکامیوں کو ذہن کے سامنے لانا اس کی مثال سینٹ آگسٹائن کے اعترافات ہیں۔ خود نوشت کے سلسلے میں قدیم و جدید کی بحث کرتے ہوئے ایک انگریز نقاد نے بڑا جچتا ہوا فقرہ لکھا ہے کہ "رومانی اور عصر جدید کی خوش نوشتوں میں صرف یہ فرق ہے کہ اول الذکر عیسائی دور عروج کے اعترافات گناہ کی پیرو ہیں اور آخر الذکر سیکولر نقطۂ نظر کی ترجمان۔ اعترافات کا مقصد حصول نجات۔ لیکن خود نوشت کا مقصد انفرادیت کا اظہار ہے" مگر ان مسائل پر غور کرنے سے پہلے کچھ ابتدائی باتیں۔

ہر انسان کے تجربات و مشاہدات دوسرے انسانوں کے لیے دلچسپی، عبرت اور بصیرت کا سبب بنتے ہیں۔ آدمی چھوٹا ہو یا بڑا اس کے پاس دوسروں کے لئے ایک پیغام ضرور ہوتا ہے۔ مگر اکثر و بیشتر یہ پیغام دوسروں تک پہنچ نہیں پاتا کہ ہر انسان میں بیان اور اظہار کا صحیح سلیقہ نہیں ہوتا۔ نیز اپنی شخصیت کے اچھے اور کمزور دونوں پہلوؤں کو انصاف اور دیانت کے تقاضوں کے ساتھ بے نقاب کرنے کا حوصلہ بھی کم ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے قوت تحریر سے نوازا ہے۔ ان میں سے بعض نے اپنی اور بعضوں نے دوسروں کے حالات زندگی مشاہدات اور تجربات کو قلم بند نہیں کیا ہے۔ اپنے حالات زندگی رقم کرنے والوں کی راہ خاصی کٹھن اور دشوار گزار ہوتی ہے۔ مغرب کی بے تکلفانہ فضا میں ناگفتنی بھی گفتنی کے ذیل میں آ کر بیان ہو جاتی ہے اور لکھنے والے کی شخصیت کے نفسیاتی مطالعے نیز سیرت اور کردار کے جائزے میں معاون ہوتی ہے۔ مشرق کے مزاج کا تکلف ناگفتنی تو کیا گفتنی کو بھی منظر عام پر لانا گوارا نہیں کرتا لیکن مغرب ہو یا مشرق قدر مشترک یہ ہے کہ پوری خود نوشت پڑھ جائیے۔ حقیقی انسان سے ملاقات چند ہی لمحوں کے لیے ہوتی ہے باقی سارا وقت تاریخی معاشرتی سیاسی یا علمی مباحث کی نذر ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے بعض معلم نقادوں نے اپنے عہد کی قابل ذکر خود نوشتوں کو تشخص کی تلاش قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں شکایت کی وجہ یہ کہ پوری زندگی میں ہم اپنے آپ سے بھی چند ہی لمحوں کے لیے ملتے ہیں باقی سارا وقت اپنے آپ کی جستجو یا چند فروعی باتوں میں ضائع ہو جاتا ہے۔ بہر حال خود نوشت میں حقیقی انسان سے ملاقات ہو یا اس کے عمومی منظر نامے سے۔ یہ ملاقات ہوتی بڑی دلچسپ ہے شاید اسی وجہ سے اردو زبان ہی میں نہیں دنیا کی تمام زبانوں میں خود نوشت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ برصغیر کے حوالے سے بیسوی صدی میں گاندھی جی کی "تلاش حق" اور نہرو کی "آپ بیتی" کو بڑی شہرت ملی۔ عالمی سطح پر ہٹلر کی "میں کیمپف" اور مسولینی کی خود نوشت ایک زمانے میں بڑی مقبول تھیں۔ ایڈورڈ

ہشتم کی "ایک بادشاہ کی کہانی" اور مسز سمن کی "دل کی منطق سب سے الگ ہے" نیز ادبی خود نوشتوں میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی گئیں۔ ادبی خود نوشتوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔

خود احتسابی بڑا مشکل عمل ہے۔ انا گزیدہ ادیب اور قلم کار جب اپنے بارے میں قلم اٹھاتا ہے تو غیر شعوری طور پر اپنے گرد ایک رومانی ہالہ بھی تعمیر کرتا ہے۔ ادیب اور اہل قلم پر کیا منحصر خود کو نمایاں کرنے کا جذبہ ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ جب ہم کسی ایسے واقعے کا تذکرہ کرتے ہیں جس میں ہماری ذات بھی شامل ہو تو بالعموم ہیرو کی حیثیت ہمیں کو حاصل ہوتی ہے۔ ہماری خامیاں بھی ہمارے لیے حسن کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم یا تو ان کے بیان سے گریز کرتے ہیں یا ان پر خوبیوں کا ایک دبیز غلاف چڑھا دیتے ہیں۔ اپنی ذات کا معروضی مطالعہ ممکن بھی نہیں۔ انسان دوسرے انسانوں کو اپنی ذاتی پسند۔ ناپسند کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اپنے مطالعے میں یہ انداز برقرار نہیں رہ سکتا۔ معدودے چند خود نوشتوں کے علاوہ کسی خود نوشت کے مطالعے سے صاحب تحریر کے مزاج اور جذبات و تاثرات کا صحیح اندازہ مشکل ہے۔ خیر و شر کا وہ توازن جس سے انسان عبارت ہے خود نوشتوں میں بے احتیاطی کی وجہ سے برقرار نہیں رہتا۔ بہت ممکن ہے کہ خود نوشت مرتب کرنے والے بے احتیاطی اور اظہار انا سے بچنے کے لیے پس منظر اور ماحول کے تفصیلی بیان پر اسی وجہ سے زور دیتے ہیں۔ بیشتر خود نوشت مرتب کرنے والے اس صنف کا پورا چیلنج قبول نہیں کرتے۔ صرف خارجی عناصر کو تشکیل دیتے ہیں۔ تمنا یہ ہوتی ہے کہ ایک ایسی عام پسند تصویر مرتب ہو جس سے مصنف اور قاری دونوں کی تسکین نفس ہو تاہم ان تمام باتوں کے باوجود انسانی مزاج اور فکر کا بہترین مطالعہ خود نوشت ہی میں نظر آتا ہے۔ ذات کا طلسم نہیں کھلتا ہے چند ہی لمحوں کے لیے سہی مگر کھلتا تو ہے۔

اردو زبان میں خود نوشتوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تاہم محمد جعفر تھانیسری کی "تواریخ عجیب" اور ظہیر دہلوی کی "داستان غدر" سے ڈاکٹر وزیر آغا کی "شام کی منڈیر" اور قدرت اللہ شہاب کے "شہاب نامے تک" ایک پورا سلسلہ ہے۔ خود نوشت قلم بند کرنے والوں میں خواجہ حسن نظامی سر رضا علی۔ چودھری افضل حق، عبد المجید سالک، عبدالماجد دریابادی، حکیم احمد شجاع، نقی محمد خاں خورجوی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، کلیم الدین احمد، احسان دانش، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، مرزا ادیب، شہرت بخاری، ڈاکٹر وزیر آغا، قدرت اللہ شہاب، مسعود حسین خاں، آل احمد سرور اور حمید نسیم کے نام بہت معروف ہیں۔ بعض اہل قلم نے اپنی زندگی کے خاص واقعات یا کسی مخصوص دور کے حالات قلم بند کیے ہیں، پوری زندگی کا جائزہ پیش نہیں کیا۔ مثلاً مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے واقعات بڑے دل چسپ پیرائے میں تحریر کیے ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ کے پس منظر میں "آشفتہ بیانی میری" مرتب کی۔ دیوان سنگھ مفتوں نے اپنی صحافتی زندگی کے اہم واقعات "ناقابل فراموش" میں بیان کیے۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ ساری خود نوشتیں پوری زندگی کی روداد پر محیط ہیں یا محض اہم واقعات کا اظہار لکھنے والوں نے اپنی شخصیت کے مکمل اور بھرپور اظہار سے پہلو بچایا ہے۔ کہیں کہیں یک رخی تصویر بھی پیش کی ہے۔ اس ضمن میں مرزا فرحت اللہ بیگ کی مختصر خود نوشت کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسے پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ محنتی اگر تھے تو مرزا فرحت اللہ۔ سوجھ بوجھ اگر رکھتے تھے تو مرزا فرحت اللہ، معاملہ فہم، حاضر دماغ، نڈر، بیباک اور کھرے اگر تھے تو مرزا فرحت اللہ ان کی قد آور شخصیت کے سامنے باقی تمام لوگ محض بونے تھے۔ اگرچہ یہ انداز عام نہیں ہے۔ عام انداز انکساری اور فروتنی کا ہے حالانکہ یہ بھی خود تشہیری کا ایک منفی انداز ہے۔ مگر اس سے بھی شخصیت کا صرف ایک ہی رخ سامنے آتا ہے۔ خود نوشت میں ہم وہی دیکھتے ہیں جو مصنف ہمیں دکھانا چاہتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ ہماری نگاہ ان گوشوں پر نہ پڑ جائے جو کچھ تاریک ہیں یا جن سے اس کی ذات کی نفی ہوتی ہے۔ سر رضا علی نے اپنی خود نوشت "اعمال نامے" میں حسن و محبت کا ایک پورا باب قائم کیا ہے۔ عنوان سے یہ گمان ہوتا ہے کہ مصنف اس باب میں اپنی داستان محبت بیان کرے گا لیکن عشق و ہوس کی

توضیح کے بعد اردو شاعری میں تصور محبوب کا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے اور اپنی بابت چند جملوں میں ایسا مبہم بیان ملتا ہے جس سے قاری کی حیرت اور الجھن دونوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ سوچتا ہی کہ ایک طولانی بیان اور عشق و ہوس کی بحث کے بغیر بھی شادی کے واقعے کو غیر مبہم انداز میں بیان کرنا بہتر اور مناسب ہوتا۔ یہ صورت حال اس وجہ سے پیش آئی کہ قصد اور ارادے کے باوجود مصنف جرأت رندانہ سے کام نہ لے سکا۔ خود نوشت مرتب کرنے والوں کا مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ تحفظاتی اخفا اور معاشرتی اشرافیت کی قومی کمزوری کے حصار کو توڑنے کی ہمت نہیں کرتے۔

اردو خود نوشتوں کے ذخیرے میں ایک خود نوشت ایسی بھی ہے جس کے مصنف نے ابہام اور گریز پائی کے تمام حیلوں سے انحراف کیا ہے اور اپنی شخصیت کے ایسے گوشوں کی نقاب کشائی بھی کی ہے جنھیں عام طور پر واضح نہیں کیا جاتا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عام طور پر خود نوشت مرتب کرنے والے اس وقت اپنے حالات زندگی قلم بند کرتے ہیں جب زندگی گزارنے کا صحیح ادراک برقرار نہیں رہتا۔ عقاید اور اقدار کے ایک مہیب انتشار میں خود نوشت کو تنظیمی احساس اور باطنی تشخص کے جزوی حصول کے لئے فروغ دیا جاتا ہے مگر ہم جس مصنف کا جائزہ لے رہے ہیں وہ اپنی خود نوشت کی ترتیب کے زمانے میں زندگی کے ادراک سے محروم ہونے کے بجائے زندگی گزارنے کے سلیقے سے بتدریج آگاہ ہو رہا تھا۔ یہ مصنف ہیں خواجہ حسن نظامی' خود نوشت کا نام ہے "آپ بیتی" خواجہ حسن نظامی بیسویں صدی کی عہد ساز شخصیت ہیں۔ قدرت نے انھیں غیر معمولی دل و دماغ سے نوازا تھا۔ انھیں حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کے آستانہ مبارک میں پرورش پانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ خواجہ صاحب کی زندگی جہد مسلسل' حوصلہ مندی' خود اعتمادی۔ بلند نگاہی' خلوص اور یقین محکم کا دلکش' شان دار اور پر تاثیر مرقع ہے۔ ایک بچہ کہ انتہائی غریب لیکن غیرت مند اور بزرگ نسبت والدین کے یہاں آنکھ کھولتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ والدین دولت علم سے محروم ہیں۔ والد وابستگان درگاہ محبوبی میں ہیں لیکن اپنے دوسرے بھائی بندوں کی طرح زائرین کے سامنے دست سوال دراز کرنے کے بجائے کتابوں کی جلدیں باندھ کر رزق حلال حاصل کر رہے ہیں۔

یہ بچہ پیر زادوں کے عام ماحول میں بچپن گزارتا ہے لیکن ان کی خصلتیں اختیار نہیں کرتا۔ باپ بھائی سے صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ علم کا شوق ہے۔ علم حاصل کرتا ہے۔ روزی کمانے میں محنت کرتا ہے' محنت سے شرماتا نہیں۔ کسی محنت کے کام میں عار نہیں۔ آدمی موجود نہیں ہے تو رسالوں کا بھاری بنڈل خود اٹھا کر ڈاک خانے لے جاتا ہے' اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ دیکھنے والے کیا کہیں گے۔ اپنی ذہنی قوتوں کو ترقی دیتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی تحریریں ملک میں مقبول ہوتی ہیں' عقیدت مند اس کے گرد جمع ہوتے جاتے ہیں چالیس کے سن تک پہنچتے پہنچتے اسے ایسی روحانی بزرگی حاصل ہو جاتی ہے کہ ہزاروں انسان اس کے حلقہ ارادت میں داخل ہو جاتے ہیں مگر اسے اپنی پیر زادگی، روحانی بزرگی اور قلمی طاقت پر بھی گھمنڈ نہیں ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہے اور اس میں ان کے بیان کی جرأت بھی موجود ہے۔ اس جرأت سے یہ نفسیاتی نکتہ سامنے آتا ہے کہ جب تک انسان کو اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا احساس رہتا ہے اسی وقت تک وہ اپنی صلاحیتوں کو ترقی دیتا رہتا ہے۔ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ جہاں یہ منزل آگئی کہ "ہم کامل و اکمل ہو گئے" "ہمچو من دیگرے نیست" وہیں ذہنی اور روحانی ترقی کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ خواجہ حسن نظامی زندگی بھر خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہے۔ یہی جستجو ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے اپنی خود نوشت اختصار کے ساتھ لکھی ہے۔ اس لئے کہ یہ کتاب صرف ایک سو چالیس صفحات پر محیط ہے اور اسے بہت قلم روک کے لکھا گیا ہے۔ کتاب میں جا بجا ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جن کا روداد حیات سے راست تعلق نہیں مگر مصنف نے ان کی اہمیت کو محسوس کیا ہے اور خلق خدا کے افادے بالخصوص اپنے مریدوں کی ہدایت کے ———

لیے قلم بند کرنا ضروری سمجھا۔ اگرچہ ان سے خود نوشت کے مجموعی ڈھانچے پر اثر پڑا ہے، تاہم مصنف کے نقطۂ نظر کی توسیع کے لئے شاید یہ ناگریز تھا۔ خواجہ حسن نظامی کا خیال اور ارادہ یہ تھا کہ وہ اس "آپ بیتی" میں گفتنی اور ناگفتنی تمام باتیں لکھیں۔ انھوں نے بہت کچھ لکھا بھی ہے۔ لیکن ان کے بہت سے تعلیم یافتہ مریدوں نے اس آزادانہ قلم بند ہونے والی تحریر کی مخالفت کی اور یہ خدشہ ظاہر کیا کہ آزادہ روی اور آزاد خیالی سے بدگمان خدا کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

خواجہ صاحب کے دو نہایت جاں نثار رفقا ملا واحدی اور بسیا احسان کا خیال تھا کہ سب کچھ لکھا جائے اور کسی بات کو چھپایا نہ جائے "خدا کی مخلوق کے سامنے خواجہ صاحب کی وہی صورت پیش ہو جیسی کہ وہ تھی یا جیسی کہ وہ ہے" مولانا عبد الماجد دریا آبادی بھی اسی خیال کے حامی تھے۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے مریدوں کی مخالفت کے باوجود سارے اچھے برے واقعات لکھ دئے مگر انہوں نے اس سلسلے میں اکبر الہ آبادی سے بھی مشورہ کیا۔ خواجہ صاحب اکبر کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے اور ان کی بزرگی کے بڑے قائل تھے۔ اکبر نے ہر قسم کے واقعات قلم بند کرنے کے خلاف رائے دی۔ اکبر کی اس رائے کے بعد خواجہ صاحب نے ایسے تمام واقعات کتاب سے خارج کر دئے جن سے عام پڑھنے والوں میں غلط فہمی اور بدگمانی پھیل سکتی تھی تاہم بعض ایسے واقعات جنھیں شہرت اور بزرگی کے نصف النہار پر پہنچ جانے والا کوئی انسان بیان کرنا گوارا نہیں کرے گا خواجہ صاحب نے بڑی بے تکلفی سے بیان کر دیئے ہیں۔

خواجہ صاحب کی آپ بیتی اس لحاظ سے بڑی اہم اور قابل توجہ ہے کہ اس کی تالیف ہی کے زمانے میں اس کے بارے میں دو مکاتیب فکر وجود میں آگئے تھے۔ ایک مکتب فکر مشرق کی دیرینہ روایات کا پابند اور ادب آداب کا قائل تھا۔ یہ لوگ بزرگوں کو عام انسانی سطح پر دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہوتے حالانکہ صوفیائے کرام نے اپنی زندگی کے واقعات کو چھپایا نہیں۔ حضرت سلطان المشائخ نے یہ واقعہ خود بیان فرمایا کہ میں نے ایک لحہ شیخ نجیب الدین متوکل سے گزارش کی تھی "حضرت فاتحہ پڑھ دیجیے کہ میں کسی جگہ کا قاضی ہو جاؤں" شیخ نے خاموشی اختیار کی۔ حضرت نے جب دوبارہ گزارش کی تو فرمایا "قاضی مشو چیزے دیگر بشو" یہ ایک طرح کا انتباہ تھا کہ دنیاوی مناصب کے خیال میں مت رہو۔ حضرت نے ایک اور جگہ واضح طور پر فرمایا ہے کہ جب شیخ فرید نے مجھ سے ارشاد کیا کہ دشمنوں کو راضی کرو اور جس کا جو حق ہے ادا کرو تو مجھے یاد آیا کہ دہلی میں ایک بزاز کے بیس جیتل مجھے ادا کرنا ہیں اور ایک شخص سے ایک کتاب مطالعے کے لیے لی تھی وہ کھو گئی۔ اس دوسری کتاب نقل کرا کے اسے دینا چاہیے۔ حضرت نے یہ واقعات بیان کر دیے۔ ان بیانات میں حضرت کو کوئی سبکی نظر نہیں آئی۔ یہ روحانی نشو و نما کی روداد کا ایک حصہ ہیں۔ خواجہ صاحب کو روکنے اور منع کرنے والوں نے اس نقطۂ نظر سے غور نہیں کیا چنانچہ "آپ بیتی" کے ایک دیباچہ نگار بسیاء احسان نے اپنے دیباچے میں برملا لکھا ہے

> "جو لوگ خواجہ صاحب کے ساتھ عرصے سے دوستانہ یا نیاز مندانہ تعلقات رکھتے ہیں وہ بلا تامل یہ کہہ دیں گے کہ حالات مکمل نہیں ہیں اور ان میں کچھ قطع برید بھی ہوئی ہے۔ یہی میرے نزدیک آپ بیتی میں وہ سب سے بڑا نقص ہے جس نے گو اسکی نفع رسانی اور دلچسپی پر شاید زیادہ مضر اثر نہیں ڈالا ہے لیکن اس کے موضوع تالیف یعنی تاریخ کی اہمیت کو یقیناً گھٹا دیا ہے"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر خواجہ صاحب آپ بیتی میں سارے واقعات بے کم و کاست قلم بند کر دیتے تو اس کی حیثیت اور اہمیت کچھ اور ہی ہوتی لیکن اپنی موجودہ شکل میں بھی یہ جراءت اظہار کا ایسا مرقع ہے جس کی کوئی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ بھلا ایسا ہمت کا دھنی کون ہو سکتا ہے جو اپنے عیوب کو برملا بیان کرے اور ان تمام باتوں کو ہانکے پکارے ظاہر کر دے جس کے نام ہی سے لوگ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ چند مثالیں:

"مجھ پر تو آس پاس کی حالتوں نے ایسا اثر ڈالا کہ اپنے خاندان کے دوسرے بچوں کی طرح میں بھی بھیک مانگنے لگا۔ جو کچھ نذر ہو اس غلے میں ڈال دیتے اور دو آنے آتے تو ایک آنہ چرا کر ایک آنہ ظاہر کرنے لگا۔ "میں بھی کبھی کبھی جوتیوں کی رکھوالی کر کے پیسے کماتا تھا۔" سفلی اعمال کا کوئی بد تر سے بد تر طریقہ بھی باقی نہیں چھوڑا اور اس غلیظ کوچے کی ہر گلی کو دیکھا۔"

"میں پندرہ سال کا تھا۔ دہلی میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی ہوئی تھی اور اس کا بہت چرچا تھا۔ یہاں تک کہ سقوں نے اپنی مشکیں اور دھوبیوں نے اپنے بیل فروخت کر کے اس کمپنی کا تماشا دیکھا تھا۔ اس کمپنی کے مالک درگاہ میں آئے تو کچھ مفت کے ٹکٹ دے گئے۔ میں بھی درگاہ والوں کے ساتھ یہ مفت کا تماشا دیکھنے گیا......"

"پہلا تماشا دیکھ کر میں دیوانہ ہو گیا......"

کھانا پینا، سونا، پڑھنا، سب زہر معلوم ہوتا تھا اور تماشے کے سوا کسی چیز کا خیال نہ آتا مگر میرے پاس روپیہ پیسہ نہ تھا جو دوبارہ ٹکٹ لیکر تماشا دیکھتا۔"

اس زمانے میں ایک شخص نے درگاہ کی نذر کے مجھے تین روپے دیے جن سے میں نے بارہ راتیں مسلسل تماشا دیکھا۔ اس زمانے میں ایک عمل پڑھنے کا شوق تھا اور اس کے سبب رات کو درگاہ میں سوتا تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھا کر میں درگاہ میں آتا اور وہاں سے چپ چاپ چار میل طے کر کے دہلی پہنچتا۔ چار آنے کا ٹکٹ لیکر تماشا دیکھتا اور پھر رات کو دو بجے جنگل بیابان اور ڈراؤنے راستے سے گزر کر چار میل کی مکرر مسافت پیدل طے کر کے درگاہ میں آتا اور سو جاتا۔

عمل پڑھنا ترک ہو گیا اور تھیٹر کی تکان کے سبب ہر وقت میری آنکھیں سرخ اور خمار آلود رہتی تھیں اور لوگ سمجھتے تھے کہ میں عبادت اور شب بیداری میں مصروف رہتا ہوں اور بھائی سمیت سب گھر والے میرے بہت معتقد ہو گئے تھے۔

آخری اقتباس اس قدر طویل ہے مگر اس سے خواجہ صاحب کی سیرت کا ایک اہم پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ بظاہر تو یہ جوانی کے ایک شوق کا بیان ہے۔ جوانی دیوانی یونہی تو مشہور نہیں۔ ایک طوفان ہوتی ہے جو اپنی رو میں سب کچھ بہالے جاتی ہے۔ قابل غور بات خواجہ صاحب کی شدت پسندی ہے کہ بارہ راتیں مسلسل دیکھتے رہے۔ شدت پسندی ان کے کردار اور شخصیت کی بڑی اہم خصوصیت ہے مثلاً واحدی صاحب سے ناراض ہوئے اور یہ طے کرلیا کہ سال بھر ان کے یہاں نہیں جائیں گے تو پورا سال ہی گزار کر ان کے یہاں گئے اور اپنے عہد کو نباہ دیا۔ پھر یہ بھی کہ تھیٹر کے شوق کو بے کم و کاست بیان کر دیا۔ انسان ہر نئی چیز میں کشش محسوس کرتا ہے اور اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ بعض شدت پسندی سے کام لیتے ہیں۔ بعض اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔ شدت پسندی حوصلہ اور اعتماد چاہتی ہے۔ حوصلے اور اعتماد کے بغیر شدت پسندی پر قائم رہنا مشکل ہے۔ اعتدال کی راہ نسبتاً آسان ہے۔ مگر یہ عظمت اور بزرگی کی راہ نہیں۔ محبت اور نفرت دونوں کی بنیاد شدت پسندی پر ہے۔ مومن بھی اپنی محبت اور نفرت میں شدید ہوتا ہے۔ بقول اقبال۔ "اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق۔ یہ اشداء علی الکفار" اور رحماء بینھم" کی طرف واضح اشارہ ہے۔

خواجہ صاحب نے ناگفتنی کے ساتھ ساتھ اپنی اچھی بری خصلتیں بھی بیان کی ہیں۔ اچھی خصلتیں تو سبھی بیان کرتے ہیں۔ مزے لے لے کر۔ شان اور تمکنت کے ساتھ۔ بری خصلتوں کا بیان صرف خواجہ صاحب کے یہاں ملتا ہے۔ اپنی خود پسندی، خوشامد پسندی، رائے کی بے استقلالی، ضد، ہٹ دھرمی اور سنگ دلی کو خواجہ صاحب نے خصوصیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بہت کم انسان ایسے ہوں گے جو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ان کے مرتکب نہ ہوئے ہوں مگر اعتراف کون کرتا ہے۔ خود

پسندی کے مظاہر شب و روز ہوتے ہیں۔ ہم انھیں دیکھتے دیکھتے تھکتے نہیں، عادی ہو گئے ہیں۔ موقع محل کی مناسبت سے خود بھی اس پر عمل کر لیتے ہیں۔ ڈینگ ہانکنے اور شیخی بگھارنے میں لطف بھی بہت آتا ہے حالانکہ اپنا قدم بڑھانے کا یہ عمل دراصل اپنی کوتاہ قامتی کا اظہار ہے مگر یہ کہیں جاری ہے، اور جاری رہے گا۔ کبھی ظاہری انکسار کے پردے میں کبھی کوت کے پیرائے میں۔ خوشامد کو سرسید نے دل کی مہلک ترین بیماری سے تعبیر کیا ہے۔ مگر نظیر اکبر آبادی بھی ایک سچا شاعر تھا۔ کہہ گیا ہے "جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے" روزانہ خوشامد، خوشامدی اور خوشامد پسند پر بار بار منت بھیجنے کے باوجود اس فن "فن شریف" کو درجہ کمال تک پہنچانے میں ہم سب کوشاں رہتے ہیں، کاہے سلیقے سے۔ کاہے بھونڈے انداز سے۔ بس اس کا اعتراف نہیں کرتے مگر مجرم ہم سب ضرور ہیں، خواجہ صاحب پر آفریں ہے صاف صاف کہہ دیا۔ "خوشامد میرا دل خوش کر دیتی ہے۔" یہ بڑی بات ہے اور بڑے حوصلے کی بات ہے۔

رائے کی بے استقلالی سے قوت ارادی، قوت فیصلہ کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ ادھر کسی نے چکنی چپڑی باتیں کیں سبز باغ دکھائے یا دلیلوں کا جال بچھایا اور ادھر کمزور ارادے والے کے یہاں تذبذب اور بے یقینی کی کیفیت پیدا ہوئی فوراً رائے بدل دی اور صلاح دینے والے کے مشورے پر عمل پیرا ہو گئے۔ خواجہ صاحب نے اپنی اس کمزوری کو بیان کیا ہے مگر قابل غور یہ نکتہ ہے کہ رائے کی بے استقلالی کے ساتھ ساتھ ان میں ضد اور ہٹ کا مادہ بھی بہت زیادہ تھا انہوں نے خود اپنی اس کیفیت مزاج کو بیان کیا ہے مگر سب ان کی شدت پسندی کے مختلف مظاہر ہیں۔ ایک رائے قائم کی کسی نے تردید کی تو اس کے ہم نوا ہو گئے۔ یہ بھی شدت پسندی کی ایک شکل ہے کہ دوسرے کی رائے سے فوری طور پر متاثر ہونے مگر پھر جو فیصلہ کیا تو ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر فیصلے سے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب رہ گئی سنگ دلی۔ خواجہ صاحب نے جس کیفیت کو اپنی سنگ دلی سے تعبیر کیا ہے وہ در

اصل سنگ دلی نہیں ایک ایسی ارفع ذہنی اور روحانی سطح کا اظہار ہے یہاں شادی و غم کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ غالب نے اس کیفیت کو "غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس" کہا ہے مگر عام آدمی اسے کیا سمجھے۔

یہ ساری خامیاں جو خواجہ صاحب نے اپنی آپ بیتی میں ایک ایک کر کے گنوائی ہیں عام انسانی خامیاں ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی ان سے مبرا نہیں مگر ہماری جھوٹی انا ہمیں ان کے اظہار سے باز رکھتی ہے۔ خواجہ صاحب سچے اور پر عظمت انسان ہیں۔ انہوں نے اپنی کسی خامی کو چھپایا نہیں۔ الم نشرح کیا تا کہ پڑھنے والے پڑھیں اور خود کو ان سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ خود احتسابی کے بارے میں ابتدا ہی میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ خواجہ صاحب کے یہاں یہ عمل بہت واضح ہے اس عمل کی وجہ سے آپ بیتی کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ یہ ایک سچے آدمی کی سرگزشت ہے جو سچے دل سے خلق خدا کی رہنمائی کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے وہ سب سے پہلے خود اپنی ذات ہی کو معرض بحث میں لاتا ہے اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو بیان کر کے ایک مثال قائم کرتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے کے فن میں بھی اور سیرت و کردار انسانی کی افہام و تفہیم میں بھی۔

خواجہ صاحب نے یہ آپ بیتی اکتالیس برس کی عمر میں مرتب کی تھی یہ عمر انسانی ذہن و فکر کے عروج کی عمر ہے مگر ایسی عمر بھی ہے جب انسان اپنے خیالات و نظریات کے اظہار میں بیباک نہیں ہوتا۔ مصلحت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتا ہے کہیں میری حقیقی شخصیت کا آشکار نہ ہو جائے لوگ میری کمزوریوں سے واقف نہ ہو جائیں۔ میری خامیوں سے آگاہ ہو کر میرا مذاق نہ اڑائیں۔ بڑھاپے میں اس قسم کے خدشے عام طور پر لاحق نہیں ہوتے۔ ایک انگریز دانشور ٹامس مان نے صاف صاف لکھا تھا "اب میں عمر کی اس منزل میں ہوں کہ مذہب کے بارے میں اپنے خیالات کے اظہار میں کوئی احتیاط برتنے کی ضرورت نہیں۔ اب مجھے اس سے کوئی نقصان نہیں ہو گا" اکتالیس برس کی عمر میں خواجہ صاحب یقیناً مرحلہ سود و زیاں سے

گزر رہے ہوں گے مگر انہوں نے آپ بیتی میں شہرت کو نقصان پہنچانے والے عناصر کے بیان سے پہلوتہی نہیں کی۔ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے احتیاط برتنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جو لوگ اپنی شخصیت کے گرداگرد تقدس۔ پاکبازی یا عظمت کا ایک مصنوعی ہالا تعمیر کر لیتے ہیں وہ ہمیشہ احتیاط سے کام لیتے ہیں تاکہ ان کے بارے میں غلط فہمی کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ خواجہ صاحب نے کاروباری محاورے کے مطابق "جیسا ہے اور جہاں ہے" کو بنیاد بنایا اور اسی سے اپنی عظمت کے تقدس اجاگر کیے انہیں تقدس کے مصنوعی ہالے کی ضرورت بھی نہیں تھی کہ بزرگی انہیں ورثے میں ملی تھی مگر خواجہ صاحب نے اسے شہرت کا ذریعہ نہیں بنایا۔

عمر کی آخری منزل میں پہنچ جانے والا انسان زندگی کے سلیقے اور ادراک کا اظہار اس طمانیت سے نہیں کر سکتا جو ایک چالیس سالہ انسان کے لیے بہ آسانی ممکن ہے۔ اکثر خود نوشتوں میں اس کیفیت کا احساس ہوتا ہے جب منہ میں دانت اور پیٹ میں آنت سلامت نہ رہے تو زندگی کی ہر لذت ہیچ اور بے معنی معلوم ہوتی ہے اور بفرض محال یہ نہ بھی ہوتا تو اس عمر میں ماضی کا پچھتاوا بذات خود اتنا شدید ہوتا ہے کہ حال کی صحیح تفہیم سے بے بہرہ کر دیتا ہے خواجہ صاحب کی آپ بیتی میں ماضی کے پچھتاوے کا کوئی شائبہ نہیں۔ حال کی آئینہ بندی ہے امنگ اور ولولہ ہے "من نہ کردم شما خود بکنید" والی انتہائی کیفیت نہیں۔ زندگی سے بہرہ ور ہونے کی نوید ہے۔ یہ نوید ایک خاص مسلک کے تابع ہے جسے سرفراز رکھنے کا جذبہ خواجہ صاحب کی پوری زندگی پر محیط ہے بوڑھے آدمی کی لئے مستقبل بالعموم خطرے کا پیغام ہوتا ہے۔ ردعمل مسدود ہوتی ہے۔ قوی میں اعتدال نہیں رہتا۔ قوائے ذہنی و جسمانی مضمحل ہو جاتے ہیں۔ رعنائی خیال مفقود ہو جاتی ہے۔ اس عالم میں خود نوشت مرتب کرنے والے کی ساری توجہ ماضی پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ چھوڑی ہوئی منزلیں آنے والی منزلوں سی زیادہ دل کش اور پر کشش نظر آتی ہیں ساری گو جدا سی ذہنی کیفیت سے شروع ہوتی ہے مگر یہ ایک فطری نفسیاتی عمل ہے۔ اس سے فرار ممکن نہیں۔

خواجہ صاحب آپ بیتی مرتب کرتے وقت آنے والی منزلوں کے منتظر تھے۔ اس حساب سے آپ بیتی مرتب کرنے کے سینتیس، ۲۷ برس بعد ان کا وصال ہوا۔ انہوں نے آنے دور میں اپنی ذاتی اقبال مندی اور کامرانی کو پوری طرح ان کی آپ بیتی میں ذہنی آسودگی اور طمانیت کی ایک غیر معمولی لہر ہر جگہ ملتی ہے۔

خواجہ صاحب کی گہری معنویت اور مقصدیت کا احساس آپ بیتی میں قدم قدم پر ہوتا ہے مگر ان کے یہاں پرکاری سادگی میں ہے۔ مثال کے طور پر یقین کی دولت حاصل کرنے کے لئے شک کی منزل سے گزرنا ضروری ہے۔ خواجہ صاحب نے شک کی منزل سے گزر کر یقین کی دولت تک پہنچنے کی روداد بڑے سیدھے اور سچے طریقے سے بیان کی ہے۔ غور کرنے سے یہ روداد بڑی اہم اور معنی خیز معلوم ہوتی ہے کہ خواجہ صاحب نے اسے بڑے سرسری انداز سے پیش کیا ہے جیسے اس کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو، تحریر فرماتے ہیں۔

"پیروں اور بزرگوں سے عقیدت کے مسئلے کو میں نے جس قدر سوچا اسی قدر موجودہ پیروں اور بزرگوں سے میرا دل بیزار ہوتا گیا کیونکہ جو واقفیت میں نے سیاحت اسلامی دنیا اور سیر ہندوستان میں گدی والے اور نامور بزرگوں کے اندرونی حالات سے حاصل کی تھی وہ بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ میں نے اکثر بزرگوں کو دنیا دار اور دنیاوی جوڑ توڑ میں مبتلا دیکھا تھا اور دل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ تدبیروں اور ظاہری دکھاؤ اور مریدوں کے مشہور کرنے سے یہ لوگ بڑے بنتے ہیں ورنہ درحقیقت یہ کسی عقیدت کے مستحق نہیں ہیں کیونکہ یہ تو دنیا داروں سے بڑھ کر دنیا میں ملوث ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ خیال اتنا بڑھا کہ متقدمین (گذشتہ زمانے کے بزرگوں) کی نسبت بھی شک ہونے لگا کہ ان کو بھی کتابیں لکھنے والوں نے مشہور بنا دیا ہے ورنہ یہ بھی ایسے ہی ہوں گے جیسے یہ ان کے پیر وادر معتقد ہیں۔

اس زمانے میں حضرت اکبر الہ آبادی کا ایک شعر دیکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ تو چراغ کو دیکھ اور اس کی روشنی میں راستہ چل۔ چراغ دکھانے والے کو نہ دیکھ کہ وہ اچھا ہے یا برا ہے

اگر اس کو دیکھے گا تو راستہ نہ چل سکے گا کیونکہ روشنی آگے پڑتی ہے چراغ کے پاس تاریکی رہتی ہے۔

اس شعر نے میرے مشاہدے کے رخ کو بدل دیا اور میں نے بزرگوں کی عقیدت کو ذاتیات سے ہٹا کر اس ارشاد پر متوجہ کر لیا جو ان کی زبان سے ادا ہوتا ہے اور جو ان کے ظاہری اعمال سے صادر ہوتا ہے کیونکہ اسی ارشاد کی بدولت ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی شیرازہ بندی اور اصلاح ہوتی ہے اور وہ ارشاد ہی عقیدت و اطاعت کا مستحق ہے۔

مشاہدے کا رخ بدلتے ہی مجھ کو ان بدنما بزرگوں کے کمالات اور محاسن زیادہ نظر آنے لگے اور ان کے عیب کا اثر دل سے دور ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اب میرا مشاہدہ دلی صداقت سے ان بزرگوں کا ادب کرتا ہے اور ان کی دنیاوی کمزوریوں کو لازمہ بشریت سمجھتا ہے جن سے کوئی آدمی جب تک کہ وہ آدمی ہے پاک ہونے کا دعوا نہیں کر سکتا۔

آخر مشاہدے کی اس تبدیلی سے میں نے یہ بات اصول زندگی کی شان میں لکھ دی کہ کسی کے عیب و ہنر کو دیکھو تو اپنے عیب و ہنر کی عینک لگاؤ "مشاہدے کا رخ بدل جانا معمولی بات نہیں۔ یہی یقین کی منزل ہے۔ ظاہری حالات سے دھوکا کھانا عام بات ہے۔ خواجہ صاحب نے ظاہر سے باطن تک پہنچنے میں جو خون جگر صرف کیا ہوگا قاری کو اس کا احساس نہیں ہو سکتا کہ خواجہ صاحب نے اسے بڑی سادگی اور سہل انداز سے بیان کر دیا ہے۔ یہی ان کی تحریر کا کمال ہے ذہنی انقلاب کو غیر محسوس طریقے سے بیان کرنے کا یہ انداز بڑا انوکھا اور قابل قدر ہے۔

خواجہ صاحب نے "آپ بیتی" میں ہر جگہ اختصار کو مد نظر رکھا ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ تفصیل اور مربوط بیانات کے بجائے یاد داشتوں کا ایک مجموعہ پیش کر رہے ہیں۔ یاد داشتیں بھی وہی ہیں جن کی اشد ضرورت تھی۔ پڑھنے والا کہیں کہیں تشنگی محسوس کرتا ہے۔ خواجہ صاحب نے بہت بڑا کارنامہ یہ انجام دیا ہے کہ ان کے دور نوجوانی میں برصغیر کی بیشتر درگاہوں میں عرس کے موقع پر ارباب نشاط کے رقص و موسیقی

کے جو مظاہرے عام تھے جو بیہودگیاں اور بدعتیں دیکھنے میں آتی تھیں ان کے خلاف پہلی بار موثر طریقے سے آواز بلند کی اس سلسلے میں انہیں اپنے ہی بزرگوں کی مزاحمت اور عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔ یہاں تک کہ انھیں درگاہ اور بستی کی سکونت بھی ترک کرنا پڑی مگر حق حق ہے۔ خواجہ صاحب کے احتجاج کی حقانیت کو سب نے محسوس کیا اور آہستہ آہستہ تمام درگاہوں سے اس قسم کی بیہودگیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی مگر خواجہ صاحب نے اسے بڑے سرسری انداز سے بیان کیا ہے محض ماضی کی ایک یاد داشت کے طور پر۔ خواجہ صاحب نے بالعموم ایسی تفصیل سے گریز کیا ہے جس سے ان کی شخصی عظمت اور کردار کی بڑائی ظاہر ہوتی ہو۔ یہ ان کی سیرت کی خوبی تو ہے مگر اس کی وجہ سے "آپ بیتی" یقیناً متاثر ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کو یہ خیال آیا کہ مریدوں کی صلاح و فلاح کے لیے اپنی زندگی کے واقعات لکھ دیے جائیں۔ چنانچہ کسی کاوش کے بغیر انتہائی اختصار سے واقعات بیان کر دیئے مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے خواجہ صاحب کو انشاپردازی کے فطری سلیقے سے نوازا تھا "مصور فطرت" کا خطاب ان کے لیے نہایت موزوں اور برمحل تھا بات سے بات پیدا کرنا معلوم میں نہ معلوم کے اسرار پیدا کرنا ان کا فن تھا۔ اختصار ان کا مزاج اور ذرہائی استیعاب ان کی خصوصیت تھا "آپ بیتی" میں یہ سارے عناصر موجود ہیں۔ خواجہ صاحب کی انشاپردازی باتیں کرنے سے عبارت ہے۔ باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ فضا، ماحول، منظر، پس منظر، نقطۂ عروج سب باتوں ہی باتوں میں ظاہر ہوتے ہیں "آپ بیتی" میں باتیں ہیں مگر فضا اور ماحول کی نہیں زیادہ تر کام کی باتیں ہیں۔ انشاپردازی کے فطری سلیقے نے انھیں پرکشش اور راست گفتاری نے انھیں پر تاثیر بنا دیا ہے۔ یہاں انکشاف ذات بھی ہے اور خود احتسابی کا مظاہرہ بھی ہے۔ سارے نقوش اپنی جگہ دلکش اور بھرپور ہیں۔ مگر نہ جانے کیوں تصویر مکمل نہیں معلوم ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کچھ رہ گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ خواجہ صاحب نے آپ بیتی کو مکمل بنانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اپنے البیلے انداز میں

جستہ جستہ واقعات کو قلم بند کرنا کافی سمجھا "آپ بیتی" ایک واضح مقصد کے تحت قلم بند کی گئی تھی ۔ خواجہ صاحب کو اس مقصد کے حصول میں پوری کامیابی ہوئی ۔

آپ بیتی ۱۹۱۹ء میں پہلی بار اور ۱۹۲۲ء میں دوسری بار شائع ہوئی ۔ ایک اشاعت لاہور سے بھی ہوئی ۔ خواجہ صاحب کی سوانح عمری ملا واحدی نے ۱۹۵۷ء میں مرتب کی لیکن آپ بیتی اپنے اختصار کے باوجود واحدی صاحب کی مرتب کردہ سوانح عمری کے مقابلے میں بہت زیادہ دلچسپ اور پر اثر ہے ۔ واحدی صاحب دیرینہ رفاقت اور قلبی تعلق کے باوجود خواجہ صاحب کی مذہبی شخصیت کو قلم کی گرفت میں لانے سے قاصر رہے ۔ ان کی شخصیت محض ایک وقائع نگار کی سی ہوگئی ہے ۔ ان کے یہاں بھی غیر ضروری اختصار نے سوانح کے فن کو نقصان پہنچایا ہے " آپ بیتی " ادھوری سرگذشت ہوتے کے باوجود مکمل سرگذشت پر حاوی ہے ۔

واحدی صاحب کے سامنے خواجہ صاحب کی پوری زندگی کا مرقع تھا، ۴۷ سے ۵۵ء تک کے آٹھ برس کے علاوہ وہ ساری زندگی خواجہ صاحب کے انیس و جلیس رہے کوئی بات ان سے ڈھکی چھپی نہیں تھی مگر نہ جانے کیوں ان کی کتاب میں خواجہ صاحب کی پر کشش شخصیت واضح نہ ہوسکی ۔ بعض واقعات تفصیل کے متقاضی تھے ۔ ابتدائی جدوجہد ۔ خاندان والوں سے بگاڑ ۔ بستی سے ترک سکونت ۔ یہ سب ایسے واقعات ہیں جن سے شخصیت کے دور نشو ونما کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ۔ خواجہ صاحب نے بذات خود ان کی تفصیل میں جانا پسند نہیں کیا کہ اس میں خود پسندی کا شائبہ تھا ۔ وہ بقول خود لاکھ خود پسندی کے دلدادہ سہی مگر کتاب میں اس کا مظاہرہ نامناسب ہوتا ۔ واحدی صاحب کے سامنے یہ مجبوری نہیں تھی ۔ وہ کھل کر بات کرسکتے تھے ۔ بہرحال اختصار کے باوجود واحدی صاحب کی مرتب کردہ سوانح کی اہمیت یہ ہے کہ اس کا مرتب محرم راز دروں تھا اس نے بڑے خلوص اور محبت سے اپنے ممدوح کا تذکرہ لکھا ہے ۔

خواجہ صاحب کی " آپ بیتی " سے ان کی اوج اور ندرت فکر کا اظہار ہوتا ہے جس زمانے میں آپ بیتی لکھنے کا تصور عام نہیں ہوا تھا انھوں نے آپ بیتی لکھکر ایک نئی روایت کو فروغ دیا ۔ راست گفتاری بے باکی خود احتسابی اس آپ بیتی کی منفرد خصوصیات ہیں ۔ یہ ایک بہادر باہمت اور دلوں کو مسخر کرلینے والے انسان کی روداد حیات ہے ایک ایسے عالی نسب انسان کی سرگذشت جس نے نسب پر غرور نہیں کیا جس نے پیر زادگی کو پیشہ نہیں بنایا ۔ جس میں نکتہ پردازی اور مضمون آفرینی کا فطری سلیقہ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو کسی خوف اور جھجک کے بغیر دن کو دن اور رات کو رات کہتا تھا ۔ اردو کے سوانحی ادب میں کل بھی یہ کتاب اہم تھی اور کل بھی یہ کتاب اہم ہوگی کیونکہ اس کے ذریعے سے ہم ایک انسان سے ملتے ہیں بھلے اور برے انسان سے ۔ اس انسان سے جو اپنے قاری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر روسو کی طرح کہہ سکتا ہے یہ میں ہوں ۔ صرف میں اور ۔ ع

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

بقیہ صفحہ ۳۰

فاروقی صاحب نے اردو ترجمے میں فارسی نثر کی دلاویزی شیرینی اور سادگی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے ۔ واقف کار جانتے ہیں کہ بعض اوقات فارسی کی فصیح و بلیغ عبارات اور جملوں کو کسی بھی زبان میں منتقل کرنا مشکل محسوس ہوتا ہے ۔ ایسے مواقع پر ترجمہ نہیں کیا جاتا ترجمانی سے کام لینا پڑتا ہے ۔ خود قوام العقاید میں بارہا ایسی عبارات اور جملے نظر آتے ہیں جنکا اردو ترجمہ آسان کام نہیں ۔ فاروقی صاحب نے اپنی خداداد صلاحیت سے ایسی عبارتوں کا مہارت سے بامحاورہ ترجمہ کیا ہے اور مولف کے ذہن کو بڑی خوبی سے اردو زبان میں پیش کیا ہے ۔ میں پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب کو اس علمی اور ادبی کامیابی پر ایک بار پھر مبارکباد پیش کرتا ہوں ۔

اردو گلستاں

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا منتخب روزنامچہ

۴۔ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۲۶۔ نومبر۔۱۹۳۰ء یوم چہار شنبہ مقام کپورتھلہ۔

ذاتی :

صبح نماز کے بعد حفیظ صاحب جالندھری ملنے آئے۔ وہ دوسرے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہیں اور سرکاری مہمان ہیں۔ان کی لڑکی کا غمناک واقعہ سنا جو دادا کو پانی پلانے کے لئے گھر کے کنوئیں سے پانی نکالنے میں کنوئیں کے اندر گری اور چند منٹ میں دنیا سے رخصت ہو گئی۔ بہت ہونہار اور پیاری بچی تھی۔

پھر دھوپ میں چہل قدمی کی۔ نو بجے نرسنگ داس صاحب موٹر لیکر آئے کہ مہاراج نے پوجا کی رسم میں بلایا ہے آج مہاراج کی سالگرہ ہے اور اس تقریب میں مذہبی رسوم ادا ہونگی۔ محل میں گیا سب اہلکار کمخواب کی اچکنیں پہنے ہوئے زرق برق نظر آتے تھے۔ محمد اسمٰعیل نظامی بھی آج چوغہ پہن کر ملنے آئے تھے۔ یہ کپورتھلہ کے مخلص مریدوں میں ہیں مگر اور کسی مرید کو میرے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ بہت سے برہمن پوجا کا سامان لیے ہوئے جمع تھے اور ایک بڑی ترازو بھی کھڑی تھی۔جس کے ایک پلڑے میں سونا چاندی وغیرہ دھاتیں اور ہر قسم کا غلہ رکھا ہوا تھا۔اس کو تلادان کہتے ہیں۔ راجہ کے وزن سے زیادہ تول کر یہ چیزیں خیرات کر دی جاتی ہیں۔سب عہدہ دار پوجا کی جگہ فرش پر بیٹھے تھے اور ہم مہمانوں کے لیے جن میں یورپین عورت مرد بھی تھے۔قریب ہی کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ مہاراج اور ان کے چاروں لڑکے مخملی زرنگار مسندوں پر بیٹھے تھے۔برہمنوں نے مل کر بہت دیر تک سنسکرت کے اشلوک پڑھے اور پوجا کی رسمیں ادا کیں۔ ایک گائے بھی دان دی گئی۔ گلاوہ مہاراج نے اپنے ہاتھ میں پکڑا۔ گائے محل کے باہر کھڑی تھی وہ ڈورا اس گائے تک پہنچایا گیا۔ گائے کے متعلق برہمنوں میں مہاراج کے سامنے ہی جھگڑا ہونے لگا۔جو برہمن گائے کا مستحق تھا وہ کوٹ پتلون پہن کر آیا تھا۔اور سب برہمن قدیمی لباس میں تھے۔ مہاراج نے حکم دیا چونکہ اس برہمن نے اپنا مذہبی لباس جو اس قوم کے لیے بہت ضروری تھا استعمال نہیں کیا اس واسطے اس کو اس مجلس سے ہٹا دیا جائے۔ چنانچہ وہ برہمن فوراً وہاں سے اٹھکر چلا گیا مہاراج انگریزی تمدن رکھتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی تمدن کو بہت پسند کرتے ہیں۔ان کا اصول یہ ہے کہ جب انگریزی بولو تو اس میں دیسی زبانیں نہ ملاؤ اور جب دیسی زبان بولو تو اس میں انگریزی الفاظ شامل نہ کرو اور جب انگریزی لباس پہنو تو دیسی لباس کی آمیزش نہ کرو۔اور جب دیسی لباس پہنو تو اس کے ساتھ انگریزی لباس نہ ملاؤ۔ آج چونکہ مذہبی رسم تھی اس واسطے مہاراج نے مکمل دیسی لباس پہنا تھا۔جس میں وہ بہت اچھے معلوم ہوتے تھے۔ باڈی گارڈ کے مسلح سپاہی نہایت خوبصورت زرق برق وردیوں میں چاروں طرف کھڑے تھے۔ ایک سپاہی کو وردی کی چستی اور دھوپ کی تمازت کی وجہ سے غش آگیا اور وہ گر پڑا۔ مہاراج نے ڈاکٹر اور پرائیوٹ سکریٹری کو اشارہ کیا جو اس سپاہی کو فوراً اٹھا کر علاج کے لیے لے گئے۔

جب مہاراج کو ترازو میں تولنے کے لیے بٹھایا گیا تو بڑا پر لطف منظر تھا۔ سینما کے مصور اور دوسرے فوٹو گرافر مسلسل تصویریں لے رہے تھے۔ یورپین عورتوں کو یہ منظر

نہایت عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ میں اگرچہ ہندوستانی تھا لیکن مجھ پر بھی اس نظارہ کا بہت اثر تھا۔ کیونکہ میں نے زندگی میں پہلی دفعہ یہ چیز دیکھی تھی۔

مسٹر فٹز پٹرک ایجنٹ گورنر جنرل بھی آئے ہیں اور ان کی میم صاحب بھی۔ یہ پنجاب کی ریاستوں کے پولیٹیکل ایجنٹ ہیں۔ آج میری ان کی خوب باتیں ہوئیں کہتے تھے میں نے سنسکرت کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے اور عربی فارسی بھی جانتا ہوں۔ ایران اور عراق عرب میں کانسل جنرل رہ چکا ہوں۔ یہ بہت خوش مزاج اور ہنس مکھ انگریز ہیں۔ ایک آنکھ دبا کر دیکھتے ہیں۔ مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف جو شورش تھی اس کی نسبت انہوں نے ابھی حال میں تحقیقات کر کے پٹیالہ کی موافقت میں فیصلہ کیا ہے جس کی اخباروں میں بہت دھوم ہو چکی ہے۔

پوجا سے فارغ ہو کر مہاراج اور ان کی پارٹی گوردوارہ میں گئی۔ کیونکہ مہاراج سکھ مذہب کے پیرو ہیں۔ ان کے بزرگوں کو نوابی کا خطاب تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ جو اس ریاست کے بانی تھے نواب جسا سنگھ کہلاتے تھے۔ مہاراجہ سکھوں کی طرح بال نہیں رکھتے۔ لیکن عقائد کے اعتبار سے وہ نہایت پکے سکھ ہیں اور درحقیقت تو وہ ایک پکے انسان ہیں۔ ہر مذہب کی عزت کرتے ہیں۔ انہوں نے کپورتھلہ میں سکھوں کے لیے گوردوارہ۔ ہندوؤں کے لیے مندر اور مسلمانوں کے لیے وہ شاندار مسجد بنوائی ہے جس کی تمام ہندوستان میں دھوم ہے۔ ان کے وزیر اعظم بھی ایک مسلمان ہیں جن کا نام میاں عبد الحمید ہے اور ان پر مہاراج پورا اعتماد رکھتے ہیں اور کل دربار کی تقریر میں بھی مہاراج نے ان پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا تھا۔

میں گوردوارہ نہیں گیا بلکہ مسجد میں گیا اور مولانا سید جعفر میاں صاحب پھلواروی پیش امام سے ملا۔ پھر اور چند دوستوں سے ملنے گیا۔ اس کے بعد قیام گاہ پر آیا کپورتھلہ اخبار کے اڈیٹر صاحب ملنے آئے۔ جو یہاں کے بہت خاندانی مسلمان ہیں۔ حکیم نذر محمد صاحب اور مولوی رستم علی صاحب بھی تشریف لائے۔ مولوی رستم علی صاحب نے دو کتابیں بھی اپنی تصنیف کی دیں اور بھی چند صاحب ملنے آئے۔ محبت رائے صاحب پرائیویٹ سکرٹری بھی ملنے آئے۔ حفیظ صاحب کی نظم خوانی سے بہت متاثر ہوئے۔ میں حفیظ صاحب اور سید حبیب صاحب اڈیٹر سیاست سے ملنے ان کے گیسٹ ہاؤس میں گیا۔ وہاں ایک سکھ اڈیٹر صاحب اور ایک ہندو اڈیٹر صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ شام کو چار بجے مذکورہ سب احباب کے ہمراہ دریا پر گیا۔ سرکاری لانچ میں سب سوار ہوئے۔ مولانا سید جعفر میاں صاحب بھی تھے۔ یہ دریا بہت چوڑا نہیں ہے۔ اس کے کناروں پر درختوں کے جھنڈ ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی مثال سمجھانے کے لیے یہ ایک نہر ہے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ جنت کے نیچے کس وضع کی نہریں ہوں گی۔ شام کا وقت حفیظ صاحب اور مولانا جعفر میاں صاحب کی غزل خوانی اور سید حبیب صاحب کی زندہ دلی کی خوب بہار تھی۔ اگر ہم جیسے دوزخی آدمیوں کو دنیا کی ایسی جنت ہر روز مل جایا کرے تو یقیناً ہم لوگ آسمان کی جنت سے غافل ہو جائیں اور ہمارا دوزخی ہونا ہر شخص تسلیم کرے۔ مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ لانچ سے اتر کر راستہ میں مہاراج کے محل کے باغ میں جماعت سے نماز پڑھی۔ موٹریں وہیں آگئیں۔ راستہ میں سید حبیب صاحب نے رہائن کے واقعات پر نہایت عمدہ تقریر کی۔ ہندو اخبار کے ہندو اڈیٹر صاحب راون پرست ہیں۔ وہ رام چندر جی کو نہیں مانتے اور ان کی زندگی میں عیب بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا رام چندر جی نے راون کی بہن کی ناک کاٹی، پھر راون کے ملک پر حملہ کیا اور اپنی پاک دامن بیوی سیتا کو محض ایک دھوبی کے کہنے سے گھر سے نکال دیا۔ وہ بڑے بے درد تھے۔ میں نے کہا بہر حال آج رام چندر جی کی نسبت دوسری قسم کے خیالات بھی میں نے سن لیے اب تک تو میں ان کی تعریف ہی سنتا آیا تھا۔ لوگ تو رام چندر جی کو خدا بھی مانتے ہیں۔ مگر خدا کو بھی برا کہنے والے موجود ہیں۔

گیسٹ ہاؤس میں آیا۔ آٹھ بجے نرسنگھ داس صاحب موٹر لے کر آئے۔ میرے قریب کمرہ میں فوج کے ایک انگریز افسر بھی ٹھہرے ہوئے ہیں جو تمام ریاستوں کی فوجوں کا معائنہ کرتے ہیں۔ ان کے ایک مسلمان کلرک بھی ساتھ ہیں۔ جو

تمام دنیا کی سیر کر چکے ہیں۔ اور بہت پر جوش نوجوان ہیں۔ وہ انگریز بھی میرے ساتھ مہاراج کے محل میں گئے۔

دیسی

مہمانوں میں صرف میں اس انگریزی ڈنر میں شریک تھا۔ بقیہ دیسی مہمانوں کے لیے دیسی کھانے کا علیحدہ انتظام کیا گیا تھا ۔محل کا ڈنر بہت بڑا تھا۔ انگریز اور ہندو اور سکھ اور مسلمان عمائد بہت سے تھے ۔ عورتیں بھی تھیں ۔ میرے برابر راجہ شمشیر سنگھ صاحب بیٹھے تھے جو راجہ سر ہرنام سنگھ صاحب کے صاحبزادہ ہیں اور عیسائی مذہب رکھتے ہیں ۔ بائیں جرمنی داس صاحب کے بڑے بھائی تھے ۔ جو کپور تھلہ کے ایک بڑے عہدہ دار ہیں اور سامنے کے رخ کپور تھلہ کے چیف منسٹر صاحب تھے ۔ شراب کے گلاس بھی ہر ایک کے سامنے تھے ۔ کسی نے پی کسی نے نہ پی ۔ جرمنی داس کے بھائی صاحب نے کہا شیم پین (شراب کا نام) میں کیا حرج ہے یہ تو طاقت دیتی ہے ۔ میں نے کہا میرے لیے پانی سب سے زیادہ مقوی ہے ۔ میری گفتگو چیف منسٹر صاحب اور مہاراج نے بھی سن لی ۔ پوچھا کیا بات ہے ؟ میں نے کہا جناب کوئی بات نہیں ہے ۔

مسلمانوں کو لطف و عیش سے پینے نہیں دیتے
خدا دیتا ہے کھانا مولوی پینے نہیں دیتے۔

یہ شعر سن کر تمام حاضرین ہنسنے لگے ۔ انگریزوں نے بھی اس شعر کا ترجمہ سن کر خوشی کا اظہار کیا ۔ کھانے کے بعد مہاراج نے دیر تک کھڑے کھڑے مجھ سے باتیں کیں ۔ اور میں نے کہا کہ آپ کی بنائی ہوئی مسجد کی تصویر تمام ہندوستان کی بڑی بڑی مسجدوں میں آویزاں ہے اور مسلمان پانچوں وقت کی نمازوں میں اس کو دیکھتے ہیں ۔ اور آپ کے لیے دعاء کرتے ہیں ۔ حالانکہ مسلمان بادشاہ اس بات کے لئے بڑی بڑی لڑائیاں لڑ چکے ہیں کہ آٹھویں دن جمعہ کے خطبہ میں ان کے لیے دعاء کی جائے مگر آپ ایسے خوش نصیب ہیں کہ رات دن میں پانچ دفعہ آپ کے لئے سب چھوٹی بڑی مسجدوں میں مسلمان دعاء کرتے ہیں ۔ مہاراج یہ سن کر خوش ہوئے اور انھوں نے کہا کہ میں اس سال مسجد کے لیے نہایت عمدہ جھاڑ بھی لایا ہوں جو بالکل نئی وضع کے ہیں اور بہت خوبصورت ہیں ۔ دس بجے یہاں سے فارغ ہو کر مہاراج کے ساتھ سنیما دیکھنے گیا ۔ سلطان مرا کو کا جلوس دیکھا اور ٹیگور صاحب کی ایک کہانی کا تماشا دیکھا جو بہت ہی موثر تھی ۔ گیارہ بجے رات کو گیسٹ ہاؤس میں واپس آیا۔

سنا ہے کہ گردوارہ میں آج بہت موثر رسمیں ادا ہوئیں ۔ ڈنر میں سردار کشن سنگھ صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جو مہاراج کی اس ریاست کے منیجر ہیں جو صوبہ اودھ میں ہے ۔ انھوں نے بہرائچ میں آنے کی دعوت بھی دی ۔ کپور تھلہ میں سردی زیادہ ہے یا مجھے زیادہ معلوم ہوتی ہے ۔ مرض کا اثر ابھی بالکل نہیں گیا ہے ۔ ناک سے خون پھر آنے لگا ہے ۔ تاہم رات کو نیند اچھی آ گئی ۔

۵۔ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۲۷۔ نومبر ۱۹۳۰ء یوم پنجشنبہ ۔ سفر دہلی

ذاتی

صبح ناشتہ کے بعد دھوپ میں چہل قدمی کی ۔ بہت سے مسلمان ملنے آئے ۔ انگریز فوجی افسر سے بھی باتیں ہوئیں ۔ خواجہ فیروز الدین صاحب اکاونٹنٹ جنرل کپور تھلہ بھی ملنے آئے ۔ نو بجے نرنگداس صاحب موٹر لیکر آئے اور میں محل میں مہاراج سے ملنے گیا ۔ وہاں ایک سکھ ایڈی کانگ صاحب سے باتیں ہوئیں وہ بڑے روشن خیال اور بے تعصب سکھ ہیں ۔ مہاراج کے سب ہی عہدہ دار وسیع خیال اور بے تعصب ہیں اور ان سب میں ایک اعلیٰ زندگی کا اثر مہاراج کی صحبت سے پیدا ہو گیا ہے ۔ مہاراج سے تخلیہ میں ملاقات ہوئی ۔ میں نے کہا کپور تھلہ میں مسلمانوں کے وہ اسلامی مقدمات جنکا تعلق محض مذہب

سے ... [illegible] ... عام کے ذریعے ... [illegible] ... چاہییں اور
اس کے لیے مولانا سید جعفر میاں صاحب نائب امام جامع مسجد بہت موزوں ہیں۔ مہاراج نے اس تجویز کو پسند کیا اور کہا چیف منسٹر صاحب سے بھی اس کے بارے میں گفتگو کیجیے۔ میں نے کہا لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ یورپ میں زیادہ رہتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا یورپ میں ہر سال جانا ہندوستان کے لیے بہت مفید ہے آپ وہاں جا کر ہندوستان کی اصلی سیرت اور اصلی خوبیاں اپنی زندگی کے نمونے سے یورپ والوں کو دکھاتے ہیں اور یورپ کو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بھی آدمی رہتے ہیں ورنہ وہاں عام طور سے یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ ہندوستان میں سب جنگلی لوگ رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ گول میز کانفرنس میں جب ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈر جمع ہوئے تو ایک بڑے انگریز لیڈر نے کہا ان لوگوں کو انگریزی زبان بھی آتی ہے یا نہیں مگر آپ کے سفر یورپ سے وہ لوگ سمجھتے ہونگے کہ ہندوستان میں ایسے لوگ بھی رہتے ہیں جن کا کیریکٹر اکثر یورپ والوں سے بھی زیادہ اچھا ہے۔ گیارہ بجے مہاراج سے رخصت ہو کر باہر آیا اور چیف منسٹر صاحب سے پرائیویٹ سکریٹری محبت رائے صاحب کی موجودگی میں مذہبی مقدمات کی نسبت گفتگو کی۔ انھوں نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ محل سے نیچے آیا تو لالہ کرپشند صاحب ایڈیٹر پارس سے بھی ملاقات ہوئی۔ گیسٹ ہاؤس میں آ کر کھانا کھایا اور ساڑھے گیارہ بجے کپور تھلہ سے روانہ ہوا۔ بارہ بجے جالندھر سے دہلی کی طرف ریل روانہ ہوتی ہے۔ امید نہیں کہ گاڑی ملے مگر میں نے کوشش کی اور بارہ بجے جالندھر چھاونی پہنچ گیا۔ دہلی کو تار دیا اور سوا بارہ بجے ایکسپریس میں سوار ہوا۔ گاڑی میں بھیڑ زیادہ تھی سہارنپور تک بیٹھا رہا۔ سہارنپور میں کھانا کھایا۔ ایک کتاب خریدی اور اس کو پڑھتا رہا۔ ساڑھے گیارہ بجے دہلی پہنچا۔ سید ابن عربی اور مولانا عبداللہ سندھی موجود تھے۔ ان کے ہمراہ گھر میں آیا۔ سردی خوب تھی۔ فوراً امانت کی ڈاک منگوائی اور دو بجے تک اس کو پڑھا۔ پھر ختم پڑھے۔ گفتگو کی کچھ خواتین مہمان آئی ہیں۔ واحدی منزل میں ٹھہری ہیں تین بجے سویا۔

جمعرات کو بارہ بجے دہلی سے روانہ ہوا تھا۔ جمعہ جالندھر کو ملا میں ہوا۔ ہفتہ ریل میں گزرا۔ اتوار اور پیر جاورہ میں۔ منگل رات اور منگل کا دن ریل میں پھر رات اور بدھ کا دن اور جمعرات کا آدھا دن کپور تھلہ میں اور جمعرات کو آدھی رات کے وقت دہلی پہنچا۔ گویا پورے آٹھ دن کا سفر ہوا۔

آفریں ہے میرے جسم کو کہ اس نے بخار اور زکام کی شدت کے باوجود مسلسل سفر اور شب بیداریاں برداشت کیں اور اب جب کہ گھر میں آ گیا ہوں اس کے اندر ہمت اور مستعدی کی کمی نہیں ہوئی ہے۔ گھر میں سب اچھے ہیں۔ کوثر کو سات روز سے بخار ہے۔ وہ بخار میں مجھ کو بار بار یاد کرتی تھی اور غالباً اسی وجہ سے جاورہ میں صادق شہید کو کئی دفعہ خواب میں دیکھا۔ کیونکہ ان کی روح میرے بچوں سے بہت زیادہ مانوس ہے اور اکثر میرے گھر میں رہتی ہے۔

۶۔ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۲۸۔ نومبر ۱۹۳۰، یوم جمعہ۔ مقام دہلی۔

ذاتی :

صبح نو بجے تک کام کر کے دہلی گیا واحدی صاحب اور بھیا کے ہمراہ کچہری جانا تھا۔ ساڑھے بارہ بجے تک کچہری کے کام ختم کر کے واپس آیا۔ تین بجے تک دفتر میں کام کیا۔ پھر زنانہ میں گیا۔ مہمان خواتین سے ملا۔ پھر بچوں کے ساتھ دہلی گیا۔ ان کو سنیما دکھایا۔ ایک چھوٹے بچے کا فلم تھا۔ بچے بہت خوش ہوئے۔ خصوصاً روحہ بہت خوش ہوئی۔ مغرب کے وقت تک گھر میں واپس آ گیا۔

آج حیدرآباد سے تار آیا ہے کہ مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب کی چھوٹی رانی کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے پرسوں اتوار کو تعزیت کے لیے حیدرآباد جانے کا ارادہ کیا اطلاعیں دے دیں۔ دس بجے تک تحریری کام کرتا رہا۔ پھر سو گیا۔ چار بجے بیدار ہوا۔ بخار کی حرارت پھر ہو گئی۔ ناک سے خون بھی آنے لگا ہے۔ میں اپنے جسم کو مجبور سمجھتا ہوں۔ محنت کی زیادتی اس مرض کا باعث ہے۔ حیدرآباد سے انشاء اللہ ۶ دسمبر کو واپس آجاؤں گا۔ صرف دو روز وہاں قیام ہو گا۔ کوثر کا بخار کم ہے۔

حسن نظامی کو آج بخار ہو گیا تھا - پارہ ۹۹ درجہ پر تھا - حقی بانو اور غزالی بانو مہمان آئی ہوئی ہیں -

۷ - رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۲۹ - نومبر ۱۹۳۰ء یوم شنبہ مقام دہلی -

ذاتی :

دریا کا طوفان جب اتر جاتا ہے تو پانی اس طرح بہتا ہے کہ جس طرح آج کل میری زندگی بہہ رہی ہے - تھکی ہوئی کناروں کی تری اور کیچڑ کو حسرت سے دیکھتی ہوئی گذشتہ تیزی اور روانی اور جوش و خروش کو یاد کرتی ہوئی - ابھی چونکہ سفر ختم نہیں ہوا ہے - کل حیدر آباد دکن جانا ہے اس واسطے روزنامچہ کی مقررہ ترتیب التوا میں ہے - حیدر آباد سے واپس آکر خدا نے چاہا پھر وہی ترتیب جاری ہو جائے گی -

آج کا افسانہ یہ ہے کہ درد سر اور دکھتے ہوئے جسم کو کھینچتا ہو بورڈنگ ہاؤس میں لایا اور تین بجے تک مسلسل تحریری کام کرتا رہا - جسم غنودگی میں تھا - لیکن میں اس ذات کا پرتو ہوں جس کو نیند اور غنودگی نہیں آتی - جسم کو تکیہ کے سہارے لیٹا ہوا دیکھتا تھا اور لکھوا رہا تھا - دیکھا تین بجے سب ہی ضروری کام پورے ہو گئے - ضروری خطوں کے جوابات بھی - مضامین بھی - روزنامچہ بھی -

اجمیر شریف سے واپس آنے والے جوق جوق آرہے ہیں - میرے ہاں بھی بلگام کا ایک بڑا قافلہ آیا ہے - عبدالکریم نظامی اور محمد قاسم نصروی نظامی بھی ان کے ساتھ تھے - عبدالکریم خوشبو کی بتیوں کے تاجر ہیں - میرے واسطے بھی چار بنڈل لائے تھے اکولہ برار سے شیخ حسن نظامی بھی دو رفیقوں کے ہمراہ آئے ہیں - برار کے مشہور قومی و ملکی کام کرنے والے ہیں - پہلے شیخ حسن نام تھا - نظامی ہونے تو میرے ہم نام ہو گئے - برار میں ماسٹر محمد حمزہ خاں جذبی نظامی بہت مشہور اور پر کیف کام کرنے والے ہیں - یہ بھی عرصہ تک ان کے رفیقوں میں رہے ہیں - وزیر آباد سے لالہ چرنجیت لال اینڈ کمپنی اور سبزی منڈی سے لالہ نانک چند صاحب مہاجن اور چند غیر مسلم لاائیز صاحبان بھی ملنے آئے تھے - چار بجے پرنس بدرالدین نظامی کے گھر میں گیا ان کی بیگم صاحبہ بیمار ہیں - ان کو دعا دم کر کے اپنے زنانہ میں گیا - ملا لیبنڈی کی ایک خاتون آئی تھیں - سی پی میں ان کی شادی ہوئی ہے - ان سے بات کر کے پرنس بدرشاہ کے ہمراہ نواب صاحب رامپور سے ملنے گیا جو آجکل دہلی میں آئے ہوئے ہیں - مغرب کے وقت واحدی صاحب کے ہاں پہنچا - بعد مغرب ہفتہ کا کھانا کھایا - پھر سب احباب کے ہمراہ صبا کے مکان پر گیا - وہاں بہت سے اڈیٹر جمع ہوئے - ایک صلح کے معاملہ کی گفتگو ہوئی - بارہ بجے سویا - ڈاکٹر محمد عمر صاحب کی دوا شروع کی ہے - اس سے افاقہ معلوم ہوتا ہے -

۸ - رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۳۰ - نومبر ۱۹۳۰ء یوم یکشنبہ سفر حیدر آباد -

ذاتی :

رات کی آنکھ بند ہوئی - سورج سوتے سوتے جاگا - میں جو آفتاب و شب تاریک سے افضل و اعلیٰ ہوں لحاف سے باہر نکلا -

صبا کا مکان ہے - دہلی شہر ہے - جامع مسجد کا قرب ہے - سامنے ایڈورڈ ہفتم کا گھوڑے سوار بت بھی ہے - عبادت خانے اور بت خانے کے وسط میں میرا قیام ہے کہ حق و باطل کا برزخ کبریٰ ہوں -

کچھ لکھا - آٹھ بجے واحدی صاحب اور ان کا کھانا آیا - صبا نے نہاری بھی منگائی طرح طرح کے کھانے احباب کا مجمع آٹھ دن کے بعد صرف ایک ساعت دلوں کو جمع کرنے کی آئی ہے -

کھانے کے بعد سید ابن عربی موٹر لیکر آئے ان کے ہمراہ حکیم محمد احمد خاں صاحب کو نبض دکھانے گیا اور کہدیا کہ کھانا کھا چکا ہوں - حکیم صاحب نے ہنسکر نبض دیکھی اور دوا بھی خاص الخاص عنایت فرمائی -

پھر ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب تعلیمات دہلی سے ملنے گیا کچھ دیر گفتگو کر کے واپس آیا - بارہ بجے نواب صاحب رامپور سے ملا - چیف منسٹر صاحب بھی موجود تھے - ایک گھنٹہ تک گفتگو ہوئی پھر گھر میں واپس آیا اور تحریری کام شروع کر دیا - خواجہ بانو

سفر کے انتظامات میں مصروف ہیں۔ ملنے والے برابر آ
ہیں۔ جان محمد نظامی بھی پنجاب سے آئے ہیں۔ شیخ
نظامی آج جا رہے ہیں۔ لالہ چرنجیت لال صاحب اور ان
فرزند جتندر لال صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی بھی
آئے۔ میں نے بہ مشکل ساڑھے چار بجے کام ختم کیا۔
پرنس محمد بدرالدین نظامی کی اہلیہ کو دم کرنے گیا۔ پھر گھر
سلان خواتین سے ملا اور بچوں سے رخصت ہو کر صادق
اور اپنے والدین کے مزارات پر فاتحہ پڑھی۔ خاکسار
کے مزار سے بھی رخصت ہوا۔ اور نواب صاحب رامپور
ملنے گیا۔ جنھوں نے چار بجے دوبارہ ملنے کے لئے بلایا تھا
قاضی عبدالغفار صاحب اور حکیم محمد احمد خاں صاحب اور
یٹ سکریٹری صاحب سے بھی باتیں ہوئیں۔

مغرب کے بعد واحدی صاحب کے ہاں پہنچا۔ سید
صاحب اور چند احباب ملنے آئے۔ پھر واحدی کے
صیا کے مکان پر گیا۔ سید ابن عربی موٹر لے کر آ گئے تھے۔
پر گیا۔ حسب ذیل احباب اسٹیشن پر پہنچانے آئے تھے۔

واحدی صاحب اڈیٹر نظام المشائخ و روز نامچہ۔ صیا فقیر
صاحب مینجنگ ڈائرکٹر ایسٹرن لٹریچر کمپنی۔ ملنسار نظامی سابق
رسالہ گرو سیوک دہلی۔ سید احمد صاحب شملہ والے سید حسین
گوالیار والے۔ مستری عشقی نظامی۔ مولانا عبداللہ صاحب
ناظم دینیات نظام الاسلام مڈل اسکول۔ مشتاق احمد صاحب
ایم اے نواسہ حضرت اکبر الہ آبادی۔ رحمت اللہ نظامی دہرہ
والے۔ عبدالرحیم نظامی دہرہ دون والے۔ آغا سید محمود
کر دی' لالہ چرنجیت لال صاحب ایڈوکیٹ۔ نیازی
میرے رفیق تحریر اور سید ابن عربی

وحیدی صاحب دہلی میں میٹرک کا امتحان دینے آئے
ان کی والدہ میری مرید ہیں۔ بہت ہونہار جوان ہیں۔ رحمت
عبدالرحیم نظامی پرسوں اجمیر شریف سے آئے تھے
یں مجھ سے ملے پھر چراغ دہلی کی درگاہ کی زیارت کے
پیدل گئے۔ میں نے کہا جو مرید اس مشقت کو برداشت کر
چراغ دہلی جاتا ہے میں اس کو سچا معتقد خیال کرتا ہوں۔

چراغ دہلی میں پکی سڑک نہیں ہے۔ آغا سید محمود صاحب کردی
گیارہ زبانوں کا امتحان پاس کر چکے ہیں۔ یعنی ترکی جرمنی
انگریزی فرانسیسی روسی۔ عربی۔ فارسی وغیرہ۔ لمبا قد ہے۔
سانولہ رنگ ہے۔ بہت موثر باتیں کرتے ہیں ایسی باتیں جن کا
سلسلہ قائم رہتا ہے اور ٹوٹنے سے انکار کرتا ہے۔ آج میری
ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی کہتے تھے تمام دنیا کے ممالک میں
آپ کے مضامین پڑھتا رہتا تھا۔ اور آپ کی شہرت سنتا تھا۔
اب کوئٹہ بلوچستان میں رہتے ہیں۔

آج محمد نصیر نظامی سالکہ خاتون نظامی کے بھائی بھی
اجمیر شریف سے آئے تھے اور اب میرے ساتھ حیدر آباد جا
رہے ہیں۔ لالہ چرنجیت لال صاحب کے صاحبزادہ بھی میرے
ساتھ حیدر آباد جا رہے ہیں۔ ان کے چچا گروتمل صاحب حیدر آباد
میں پولس کے اعلی افسر ہیں۔

دہلی سے یہ ٹرین سوا آٹھ بجے روانہ ہوتی ہے مگر آج
بیس منٹ لیٹ روانہ ہوئی۔ یہ ناگپور قاضی پیٹھ ہو کر حیدر آباد
جائے گی اور پرسوں منگل کو حیدر آباد پہنچیگی' دن کے بارہ
بجے انچاس روپیہ سکنڈ کلاس کا کرایہ ہے' دہلی سے حیدر آباد کی
گاڑی میں سوار ہوا' گویا اب مجھے اٹارسی یا قاضی پیٹھ پر گاڑی
بدلنی نہیں پڑے گی۔

یہ گاڑی پرانی ہے اور اس میں اکثر باتیں اصلاح طلب
ہیں۔ غسل خانہ کا دروازہ بھی بند نہیں ہوتا۔ نو بجے کھانا کھایا۔
پھر اخبار پڑھے۔ دس بجے سو گیا اور ساری رات خوب بے فکر
اور مطمئن ہو کر سوتا رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ جسم اچھا ہے۔

۹۔ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق یکم دسمبر ۱۹۳۰ء یوم دوشنبہ سفر حیدر آباد
دکن۔

ذاتی :

مسٹر پٹیل سابق صدر اسمبلی بحیثیت قیدی کے میری
ٹرین میں ہیں۔ ان کی وجہ سے ٹرین ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔ وہ
دہلی سے اسی ٹرین میں ہیں۔ مگر دہلی میں کسی کو ان کے سفر کا
علم نہ ہو سکا تھا۔

میں نے صبح روز نامچہ تیار کیا اور بھوپال اسٹیشن سے

دہلی روانہ کر دیا ۔ پھر ٹرین سے دیسی کھانا منگا کر کھایا ہندو باورچی خانہ ہے ۔ آلو کی ترکاری اور چیزے ہونے پھلکے تھے ۔ میرے دل میں طرح طرح کی شوخیاں پیدا ہوئیں اور میں نے اسکول گزٹ کے لئے "تین دستر خوان" ایک مضمون اسی کھانے کو دیکھ کر لکھا ۔

پھر شام تک لکھتا رہا ۔ کچھ دیر سویا بھی ۔ مسٹر جتندر ناتھ بی ۔ اے سے باتیں بھی کیں رات کو آٹھ بجے ناگپور آیا ۔ سید عبد الحمید نظامی اور ان کے بھائی سید عبد الرشید اور ان کے احباب ملنے آئے ۔ ناشتہ اور پان اور پھولوں کا ہار بھی لائے ۔ ناگپور سے اسکول گزٹ کے مضامین دہلی بھیج دیئے ۔

۔ بال دی کم ہے ۔ صحت اچھی ہے ۔ ڈاکٹر محمد عمر صاحب کی دوا پی رہا ہوں ۔ رات کو نیند بھی خوب آئی ۔ پٹیل صاحب غالباً مدراس جا رہے ہیں ۔ ٹرین دو گھنٹہ لیٹ ہو گئی ہے ۔ اب میں ورنگل کے قریب ہوں ورنگل سے یہ ٹرین مدراس جانے کی اور میں حیدر آباد چلا جاؤں گا ۔ غلط قناعت اور صحیح حرص پر مضامین لکھے ۔ شرلاک ہومز کا ناول پڑھا ۔ کائنات کی کتاب پڑھی یعنی راستہ کے جنگلوں پہاڑوں اور غاروں اور سرنگوں کو بہت غور اور عبرت سے دیکھتا رہا ۔

۱۰ ۔ رجب ۱۳۴۹ ھ مطابق ۲ دسمبر ۱۹۳۰ ، یوم سہ شنبہ سفر حیدر آباد دکن ۔

ذاتی ۔

ساڑھے آٹھ بجے صبح قاضی پیٹھ جنکشن پر پہنچا ۔ گاڑی ڈھائی گھنٹے لیٹ ہے ۔ مولانا غازی الدین احمد صاحب سشن جج ورنگل خیر مقدم کے لیے موجود تھے ۔ کھانا بھی لائے تھے ۔ حسن محمد نظامی سوداگر ورنگل بھی نظامی بھائیوں کے ساتھ عطر پھول لیے ہوئے موجود تھے ۔ احمد بی نظامی معلمہ زنانہ اسکول بھی اپنے رفیقوں کے ساتھ آئی تھیں ۔ مولانا ابراہیم حسن صاحب ہسوی وکیل کھمم بھی تھے جو کھمم سے ملنے آئے تھے ۔ مولانا حقانی صاحب صدر مہتمم تعلیمات صوبہ ورنگل بھی اپنے بچوں کے ساتھ ملنے آئے ۔ میں نے مولانا غازی الدین احمد صاحب کا لایا ہوا کھانا کھایا ہاتھ دھونے سے پہلے مولانا نے پان پیش کئے میں نے کہا ذرا ہاتھ دھولوں ہنسنے لگے اور کہا یہ پان ہاتھ دھونے سے پہلے کھانے جاتے ہیں ۔ مجھے حیرت ہوئی ۔ سفید صافی کے اوپر سبز پانوں کی گلوریاں ان میں لونگیں لگی ہوئی ایک پان اٹھا کر منہ میں رکھ لیا ۔ وہ پان نہ تھا بلکہ بادام کا حلوا تھا مگر اس پر پان کا رنگ اور پان کی لکیریں بھی موجود تھیں ۔ معلوم ہوا پان کا عرق حلوہ میں ملا کر پان کی رگوں کا نشان اوپر لگا دیا تھا کوئی شخص بھی اس مصنوعی پان کو شناخت نہیں کر سکتا تھا ۔ میں ۱۲ سال سے حیدر آباد میں آتا ہوں ۔ مگر آج تک میں نے یہ عجیب صنعت نہیں دیکھی تھی ۔ مولانا غازی الدین احمد صاحب میرے کرم فرما نواب عزیز جنگ بہادر مرحوم کے صاحبزادہ ہیں نواب صاحب مرحوم حیدر آباد کے بہت بڑے عابد اور عالم اور مصنف اور فلاسفر مسلمان تھے ۔ ان کے گھر اور اولاد کا انتظام ایک نمونہ کی چیز ہے ۔ جس میں قدیمی تہذیب اور نئی تہذیب کی سب خوبیاں مکمل موجود ہیں

دس بجے کے قریب گاڑی حیدر آباد کی طرف روانہ ہوئی ۔ گھن پور اسٹیشن پر غلام دستگیر صاحب نائک دار اور سید امیر الدین نظامی مدرس ملنے آئے ۔ اور جنگاؤں پر غلام غوث صاحب اور محمد جعفر صاحب وغیرہ ملنے آئے ۔ آلیر پر شرف الدین صاحب موٹر سروس والے اور سید چاند صاحب تاجر چوبینہ اور محمد علی صاحب محرر کرورگیری ملنے آئے ۔ محمد علی صاحب اپنے محکمہ کی بہت اچھی معلومات رکھتے ہیں ۔ اگرچہ محض محرر ہیں لیکن بڑے عہدے داروں کی سی واقفیت رکھتے ہیں مجھے ان سے گفتگو کر کے بہت خوشی ہوئی ۔ بھونگیر اسٹیشن پر محمد یوسف[1] خوش اقبال نظامی اور میر شاہ جہاں نظامی اور میر زار سو صاحب ملے جو حیدر آباد سے یہاں تک خیر مقدم کے لئے آئے ہیں ۔ غلام دستگیر خاں نظامی ملازم کرورگیری بھی بہت سے مسلمانوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر موجود تھے اور پھل بھی لائے تھے ۔ خوش اقبال نظامی نے مولانا اکبر علی صاحب اڈیٹر اخبار صحیفہ حیدر آباد کا خط بھی دیا ۔ مولا علی اسٹیشن پر راجہ لچھمی ریڈی نظامی اور میر جہانگیر علی نظامی اور جناب مولانا نور اللہ حسینی صاحب سجادہ نشین بھی تشریف لائے ۔ سکندر آباد اسٹیشن پر حسینی شاہ

[1] مصنف امراؤ جان ادا ۔

ںظامی اور مولوی محمد یعقوب قرشی نظامی اور رفیق حیات نظامی اور
سد عبد الکریم صاحب شریک معتمد انجمن فیض عام اور مولوی
لام احمد خاں صاحب اول تعلقہ دار و ناظم مردم شماری اور محمد
سمیل حضوری نظامی اور سعید انلی نظامی اور سعید نظامی وغیرہ
باب و برادران سلسلہ موجود تھے ۔ حسینی شاہ صاحب نے خیر مقدم
ں چھپی ہوئی نہایت عمدہ فارسی نظم سب لوگوں کو تقسیم کی۔
میدنظامی نے اپنی مستورات کا خط دیا جس میں میرا ایک پرانا خط
نوف تھا اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں تین روز ان کے مکان
ٹھہروں گا۔ میں نے کہا چونکہ یہ سفر محض تعزیت کے لیے ہے
ر صرف ایک دن ٹھہرنے کا ارادہ ہے اس واسطے اپنے گزشتہ
مدہ کو آیندہ کبھی پورا کروں گا۔

ڈیڑھ بجے ٹرین حیدر آباد اسٹیشن پر پہنچی ۔ فخر اللہ شاہ
نظامی سجادہ نشین درگاہ حضرت سید شاہ اعتبار بخاری اور مولوی مسعود
ں صاحب سابق سشن جج اور نواب عنایت علی خاں صاحب مع
باب و فرزندان اور میر محبوب علی صاحب دہلوی خوشنویس اور
ید محمود صاحب قادری اور محمد عبد اللہ مخلص نظامی اور سید نذیر شاہ
للی نظامی سجادہ نشین درگاہ حضرت کملی شاہ صاحب اور ان کے
رزند سید محمد بشیر نظامی اور صادق الیقین نظامی اور عبد الغفور
نظامی اور حکیم خسرو شاہ نظامی اور سید بشیر نظامی اور مولانا عابدی شاہ
صاحب اور محمد عبد اللہ صاحب اور محمد بشیر الدین صاحب اور میر
سین علی صاحب خلف نواب عابد یار جنگ اور صاحبزادہ محمد فیروز
علی خانصاحب بی ' اے ۔ خلف نواب تلاوت جنگ بہادر اور
ترکی شاہ صاحب کے صاحبزادہ اور محمد حسن صاحب دیوانہ شاہ
نظامی اور عبد الغفور صاحب گتہ دار اور عبد الستار صاحب منیجر
دزیر سلطان سگرٹ کمپنی اور محمود نظامی اور نواب دوست محمد
خان صاحب جاگیر دار اور سید ہمایوں مرزا صاحب بیرسٹر وغیرہ
حباب خیر مقدم کے لیے اسٹیشن پر آئے تھے ۔ نواب مرزا یار
جنگ بہادر چیف جسٹس کے آدمی موٹر لیے ہوئے موجود تھے '
دیوانہ شاہ صاحب نظامی نے خیر مقدم کی نظم جو چھپی ہوئی تھی
نہایت خلوص کے ساتھ پڑھی ۔ ان کی نظم دنیا کے سب شاعروں

سے نرالی ہوتی ہے ۔ یعنی اس میں وزن اور قافیہ اور ردیف کا
لحاظ نہیں رکھا جاتا بلکہ جنون محبت اور جذبات الفت کا اظہار ہوتا
ہے ۔

چیف جسٹس صاحب کچہری میں تھے ان کے
خوبصورت بنگلہ کے بالائی حصہ میں میرے قیام کا انتظام ہوا تھا۔
جو بہت صاف اور بہت خوبصورت جگہ ہے ' حیدر آباد میں آجکل
طاعون کی شدت ہے ۔ کوئی محلہ اس وبا سے محفوظ نہیں ہے ۔
ہزارہا باشندے گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر جنگل میں جا رہے ہیں ۔
اور عارضی چھپروں میں آباد ہو رہے ہیں ۔ جس طرف دیکھو
گھروں کا اسباب جاتا ہوا نظر آتا ہے اور ایک دل خراش منظر دل
پر قیامت ڈھاتا ہے ۔ ظہر سے فارغ ہو کر ان احباب سے باتیں
کیں جو ملنے آرہے تھے ۔ اس کے بعد مہاراجہ سر کشن پرشاد
بہادر صدر اعظم سے ملنے گیا ۔ وہ مولا علی پہاڑ پر ٹھہرے ہوئے
ہیں جو شہر سے چھ سات میل کے فاصلہ پر ہے ۔ ان کی چھوٹی
رانی صاحبہ کا طاعون کے مرض میں انتقال ہو گیا ہے ۔ انھی کی
تعزیت کے لیے میں یہاں آیا ہوں اور مہاراج اپنے سب اہل
وعیال کے ساتھ اس پہاڑ پر ٹھہرے ہوئے ہیں ۔

۔ رانی صاحبہ کے واقعہ کا ان کے دل پر بہت زیادہ اثر ہے ۔ میں
جب پہنچا تو گلے لگ کر دیر تک روتے رہے ۔ میں نے کہا
آپ نے اس زندگی میں بڑے بڑے صدمے اٹھائے ہیں اور
خدا نے آپ کو بڑا صبر کرنے والا دل دیا ہے بے شک حادثہ
غمناک ہے اور زیادہ حسرت خیز ہے ۔ لیکن صبر کے سوا کوئی
چارہ نہیں ہے ۔ مہاراج بہت دیر تک رانی صاحبہ کے آخری
حالات سناتے رہے ۔ معلوم ہوا جو بڑی رانی صاحبہ کے
کمرے میں گرے تھے اور چھوٹی رانی صاحبہ بالاخانہ پر تھیں ' مگر
خدا کی شان ہے ۔ مرض کا اثر بالائی کمرے پر ہوا ۔ جہاں چوہے
گرے تھے وہاں سب لوگ محفوظ رہے ۔ چھوٹی رانی صاحبہ آخر
وقت تک باتیں کرتی رہیں ۔ انتقال سے ایک منٹ پہلے انھوں

نے اپنے پاؤں کو ہاتھ لگا کر کہا یہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ سادہ اس میں
بیوستے علتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان کو دودھ
پلانے کے لیے سہارا دیکر اٹھایا گیا اور وہ علتے علتے ختم ہو گئیں
۔ مہاراج کے جانشین خواجہ پرشاد انھی رانی صاحبہ کے بطن سے
ہیں۔ خواجہ پرشاد بھی ملے۔ ماں کی جدائی میں بہت مغموم تھے
۔ میں نے کہا بابا صبر کرو۔ دنیا میں ہر جگہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔

پانچ بجے واپس آیا۔ راستہ میں عبد الستار صاحب سابق
منیجر وزیر سلطان سگرٹ کمپنی ملے۔ میں ان کی موٹر میں بیٹھ گیا۔
انھوں نے مشیر آباد میں گولکنڈہ سگرٹ فیکٹری قائم کی ہے۔
مشینیں آگئی ہیں۔ پندرہ دن کے بعد اس کارخانہ کا افتتاح
ہوگا۔ اور شاید اس کے لیے مجھے پھر حیدر آباد آنا پڑے
مغرب کی جماعت نواب مرزا یار جنگ بہادر کے بنگلہ پر ہوئی۔
احباب اور برادران سلسلہ جوق جوق ملنے آرہے ہیں۔ سالکہ خاتون
نظامی اور ان کی والدہ رحمت النساء نظامی اور بہن سعید بانو نظامی
اور رقیہ نظامی اور محبوب بانو نظامی اور حبیب بانو نظامی وغیرہ
مستورات بھی ملنے آئیں۔ کیونکہ میں نے کہہ دیا تھا کہ اس سفر
میں قیام صرف ایک دن کا ہے اس لیے میں کسی کے مکان پر
نہیں جاسکوں گا۔ بارہ بجے تک سب لوگ رخصت ہو گئے مخلص
نظامی اور خوش اقبال نظامی میرے ساتھ رہے۔

یہاں سردی کم ہے۔ ابر چھایا ہوا ہے۔ رات کو
صرف گاڑھے کی ایک چادر اوڑھی نیند خوب آئی۔ یعنی چرو
سے محمد مستان علی نظامی ٹھیکیدار بھی ملنے آئے تھے۔ مل کر
رات کو واپس چلے گئے جھندر ناتھ صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ بی
بھی میرے ساتھ اسی بنگلہ میں ٹھہرے ہیں۔

۱۱۔ رجب ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۔ دسمبر ۱۹۲۰ء یوم چہار شنبہ مقام حیدر
آباد دکن۔

ذاتی :

صبح کی نماز کے بعد بالا خانہ سے چمن کے پھولوں اور
فوارہ کو دیکھا۔ سامنے حسین ساگر تالاب کا پانی بھی خوب بہار
دکھاتا تھا۔ مختلف ملاقاتی آرہے ہیں۔ آٹھ بجے مہاراجہ صدر

اعظم بہادر بھی تشریف لائے اور دس بجے واپس چلے گئے
میں نے کھانا کھایا۔ اس کے بعد چہل قدمی کی اور ملنے وال
سے باتیں کیں۔ ایک بجے پھر کھانا کھایا اور دو بجے نواب عث
یار الدولہ بہادر چیف کمانڈر افواج سرکار عالی سے ملنے گیا۔ لا
ہارڈنگ سابق وائسرائے کل حیدر آباد میں آنے والے ہیں۔
کے خیر مقدم کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ نواب صاحب
بہت مصروف تھے مگر انھوں نے اپنے والد کی طرح کما
اخلاق کے ساتھ باتیں کیں۔ پھر نواب فخر یار جنگ بہادر
ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی وہاں سے رخصت ہو کر مہارا
کے پاس گیا راستے میں نواب سالار جنگ بہادر بھی اپنے مکا
پر جو مولا علی پہاڑ پر واقع ہے ٹھہرے ہوئے ہیں ان سے آ
دو بجے ملنے کا وعدہ تھا مگر میں تین بجے کے بعد پہنچا۔ نوا
صاحب انتظار کر کے چلے گئے تھے۔ مہاراج سے ملاقات ہو
اور ان کے بچوں سے بھی۔ بڑی رانی صاحبہ نے چھوٹی را
صاحبہ کے انتقال کے حالات سنائے۔ مہاراج کے نواسہ ر
پرشاد کو بھی دیکھا اور بچہ کے والد سے بھی ملاقات ہوئی۔
بجے واپس آیا۔ مولوی فضل امین صاحب بی۔ اے بھی موجود
ان کو مہاراج سے ملایا۔ نواب اکبر یار جنگ بہادر ہوم سکریٹر
سرکار عالی بھی موجود تھے۔ ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ مغر
کے وقت قیام گاہ پر واپس آیا۔ بہت سے احباب اور برادرا
طریقت آدھی رات تک آتے جاتے رہے داروغہ محمد اسمٰعیل
نظامی اسکول کی امداد کے روپے بھی لائے۔ مستورات بھ
ملنے آئیں۔ میر فرحت علی اور میر نجابت علی صاحب بھی آئے ا
ان کی مستورات بھی آئیں۔ عورتوں اور مردوں نے بیعت بھ
کی۔ حکیم خسرو شاہ نظامی صبح شام آتے ہیں خوش اقبال نظامی ا
مخلص نظامی رات دن ساتھ رہتے ہیں۔ بعلی صاحب کے متد
میں جو صاحب وکیل ہیں وہ بھی رات کو ملنے آئے تھے۔ اپ
پیشہ میں بہت لائق اور ماہر معلوم ہوتے ہیں۔ دیر تک باتیں ہوا
رہیں۔ نواب دوست محمد خان صاحب بھی آئے تھے۔ انھو
نے طاعون کا ٹیکہ لیا ہے۔ سید ہمایوں مرزا صاحب بیرسٹر ب
تشریف لائے تھے اسکول کے متعلق بہت دیر باتیں ہوئیں

بارہ بجے سویا، پانچ بجے بیدار ہوا۔ خدا کے فضل سے صحت اچھی ہے۔ دوا پی رہا ہوں۔۔ نزلہ، بخار بالکل نہیں ہے۔ غذا حسب منشا زود ہضم ملتی ہے اور مکان بھی بہت پر فضا ہے۔ غسل خانہ کے پاٹ نو ایجاد ہیں۔ ان میں کھلے تانبے کے ہیں، میں نے اس ایجاد کو نوٹ بک میں لکھا تا کہ اپنے اسکول میں اس قسم کے پاٹ بنواسکوں۔ صبح ۸ بجے حیدر آباد سے روانہ ہونا ہے اس لئے رات ہی کو روانگی کے سب انتظامات مکمل کر دیئے گئے۔

۴۔رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۴۔ دسمبر ۱۹۳۰ یوم پنجشنبہ حیدر آباد اور ورنگل

ذاتی :

صبح ساڑھے چھ بجے ناشتہ کیا۔ ناشتہ کیا تھا پورا کھانا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر روانہ ہوا۔ گاڑی ساڑھے سات بجے روانہ ہوتی ہے اسٹیشن پر بہت سے احباب اور برادران طریقت جمع تھے۔ معلوم ہوا الاڈ ہارڈنگ کے آنے کی وجہ سے گاڑی لیٹ ہے رکن الدین دانا نظامی کو رخصت کر دیا۔ کیونکہ ان کو نوکری پر جانا تھا اور نواب مرزا یار جنگ بہادر سے بھی کہا جو اسٹیشن تک آئے تھے کہ ان کی میزبانی ختم ہوگئی اب وہ اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ چنانچہ وہ تشریف لے گئے۔ آٹھ بجے کے بعد گاڑی روانہ ہوئی اور سب دوستوں اور بھائیوں سے رخصت ہوا۔ سکندر آباد پر بھی احباب جمع تھے مولوی غلام احمد خاں صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ خوش اقبال نظامی بھی یہاں سے جدا ہو گئے۔ راجہ لکھما ریڈی صاحب اور میر جہانگیر علی نظامی وغیرہ بھائی بھی پھولوں کے ہار لیکر آئے تھے ان سے بھی رخصت ہوا۔ ٹرین میں ایک ہندو دیسکھ صاحب جن کا نام کرشا ریڈی ہے۔ رفیق سفر ہیں۔ بہت ملنسار اور محبت کے آدمی ہیں ان سے زراعت کے متعلق بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ تمباکو اور مرچیں بغیر پانی دیئے بھی آج کل یہاں کاشت کئے جاتے ہیں۔ صرف پودا لگانے کے وقت تھوڑا سا پانی دیا جاتا ہے۔ مگر آخر تک پانی دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ خوبی زمین کے تیار کرنے سے پیدا ہوتی ہے جس کو مدراس کے لوگ جانتے ہیں اور انھوں نے اس ملک میں آکر اس قسم کی زراعت شروع کی ہے۔ بارہ بجے کے بعد قاضی پیٹھ جنکشن پر پہنچا۔ مولانا غازی الدین احمد صاحب اور حسن محمد نظامی وغیرہ احباب موجود تھے۔ مولانا اپنے ساتھ اپنے مکان پر لے گئے اور مجھ سے کہا گرم پانی تیار ہے غسل کر لیجیے۔ میں نے کئی دن کے بعد غسل کیا اور کپڑے بدلے غسل خانہ کا انتظام نہایت عمدہ تھا۔ پانی کا ہر برتن ڈھکنے سے ڈھکا ہوا تھا۔ غسل سے فارغ ہو کر میں نے پوچھا کہ آپ نے سب سے پہلے غسل کے لیے کیوں کہا؟ انھوں نے جواب دیا اس میں دو حکمتیں ہیں ایک مہمان کے لئے مفید ہے، دوسری میزبان کے لئے۔ مہمان کے لیے یہ فائدہ ہے کہ غسل کرنے سے اس کی صحت درست ہو جاتی ہے اور میزبان کے لیے یہ فائدہ ہے کہ اگر مہمان کسی ایسی جگہ سے آیا ہو جہاں متعدی امراض ہوں تو غسل سے متعدی امراض کا اثر جاتا رہتا ہے، اور میزبان بھی اس اثر سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ میں ہمیشہ (انھوں نے کہا) اپنے مہمانوں سے پہلے غسل کرانے کا انتظام کرتا ہوں، میں نے ان دونوں باتوں کو لوح قلب پر لکھ لیا۔ یہ چیز قابل تقلید ہے اور میں بھی اس پر ہمیشہ عمل کروں گا۔

غسل کے بعد حسن محمد نظامی کے ہمراہ ورنگل گیا۔ جج صاحب محلہ صوبیداری میں رہتے ہیں اور ورنگل کی آبادی یہاں سے چھ سات میل کے فاصلہ پر ہے۔ ورنگل میں احمد بی نظامی کے مکان پر قیام ہوا۔ انھوں نے وسیع پیمانہ پر کھانے کا انتظام کیا تھا بہت سے برادران سلسلہ بھی موجود تھے۔ کھانے کے بعد عورتوں اور مردوں نے بیعت کی، جس فرش پر میں بیٹھا تھا وہ سارا فرش احمد بی نے میری نذر کر دیا پہلے یہاں آیا تھا تو حسن محمد نظامی نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ ان سب سے رخصت ہو کر بازار میں گیا اور ورنگل کے بنے ہوئے قالین ایک ہندو دکاندار سے خریدے۔ یہاں بہت اچھے قالین بنتے ہیں اونی بھی اور سوتی بھی اور قیمتیں بھی زیادہ نہیں ہوتیں۔ میں نے آٹھ قالین خریدے۔ دکان دار نے نہایت سلیقہ کے ساتھ خاصدان میں پان پیش کئے۔ اور عطر بھی پیش کیا۔ انھوں نے میرا نام سنا تھا اور صورت دیکھنے کے مشتاق تھے۔ میں نے جس کر کتنا نام

پیدل کے ساتھ سناہو کا گھر پر تاؤ تھہلا بہت اچھا لگا۔ چار بجے جج صاحب کے مکان پر آیا اور ایک گھنٹہ سویا۔ پھر عصر سے فارغ ہو کر باہر آیا۔ جج صاحب کے احباب جمع تھے ان سب سے ملا۔ مغرب کی نماز مسجد میں جا کر پڑھی۔ مولانا غازی الدین احمد صاحب روزانہ چار پانچ میل پیدل پھرتے ہیں۔ نماز اور تہجد کے پابند ہیں۔ چہرہ بہت نورانی ہے۔ آج ورنگل میں ہندو مسلمان جج صاحب کی دیانت داری اور انصاف پسندی کے بہت مداح تھے اور کہتے تھے کہ یہ آدمی نہیں ہے فرشتہ ہے۔ میں نے کہا فرشتہ آدمی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ فرشتوں میں عزرائیل بھی ہوتا ہے جس نے میرے ماں باپ کی روح قبض کر لی اور اب وہ ہر وقت میری فکر میں ہے۔ مولوی غازی الدین احمد کو کامل انسان کہنا چاہیئے۔ ان سے بندگان خدا خوش ہیں تو معلوم ہوا کہ خدا بھی خوش ہے کہ خلقت کی آواز خدا کا نقارہ ہوتی ہے۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر کھانا کھایا۔ مولانا حقانی صاحب صدر مہتمم تعلیمات بھی شریک طعام تھے۔ بہت دل چسپ باتیں ہوئیں۔ آٹھ بجے رات کو اسٹیشن پر آیا۔ ورنگل کے برادران سلسلہ اور احمدی نظامی بھی آئی تھیں حقانی صاحب اور جج صاحب کی کوشش سے جگہ بہت اچھی مل گئی۔ سکندر آباد سے شرما صاحب افسر پولیس بھی اسی ٹرین میں آئے ہیں۔ انھوں نے کہا محمد اسمٰعیل صاحب حضوری نظامی نے مجھے تاکید کر دی تھی کہ خواجہ صاحب کے لیے جگہ کا انتظام کر دیا جائے۔

نو بجے کے بعد گاڑی قاضی پیٹھ سے روانہ ہوئی اور میں نے ورنگل کے احباب اور برادران سلسلہ کو بصد حسرت رخصت کیا۔ یہ لوگ اسلامی اخلاق اور ملنساری کا ایک ایسا نمونہ ہیں جن کی ہر جگہ تقلید ہونی چاہیئے۔ رات بہت اچھی گذری۔ دو ہندو پولس افسر رفیق سفر ہیں ایک بہادر شاہ جائیں گے دوسرے چاندہ سی پی جائیں گے۔ محمد بشیر نظامی بھی قاضی پیٹھ پر ملنے آئے تھے۔ حکیم خسرو شاہ نظامی نے ان کو بھیجا تھا۔ قاضی پیٹھ سے وہ بھی رخصت ہو گئے اور بنس بیچارہ اکیلا ہی سدھارا۔ ورنگل میں بھی سردی کم ہے اور کوئی بیماری نہیں ہے۔ سوائے حیدر آباد شہر۔ اور اس کے اضلاع میں بھی بیماری نہیں ہے۔

منادی ایمانی و الامن

بارگاہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ سے
ایمان اور امن کی ندا دینے والا
اور ان کے جانشین
امام المشائخ شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی یادگار

ماہنامہ منادی نئی دہلی

منادی ۱۹۲۶ء سے جاری ہے یہ اکہترویں جلد (۱۹۹۴ء) کا گیارھواں شمارہ ہے

مدیر
خواجہ حسن ثانی نظامی
معاون مدیر
خواجہ مہدی نظامی

درگاہ شریف اور منادی کے بارے میں خط و کتابت کرنے اور قیمت جمع کرانے کا پتہ
خواجہ حسن ثانی نظامی
ڈاکخانہ حضرت نظام الدین اولیاء
نئی دہلی ۱۳-۱۱

سالانہ قیمت
ہندوستان میں
پچاس روپے
غیر ممالک سے
دس ڈالر
فی پرچہ
پانچ روپے

فہرست

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآن در زبان پہلوی

ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی

رسول مقبول، انسان کامل فخر موجودات اروا حنا فداہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اِنَّ اللّٰهَ تَعَالیٰ خَلَقَ الْمَلٰئِكَةَ وَرَكَّبَ فِيهِمُ الْعَقْلَ وَخَلَقَ الْبَهَائِمَ وَرَكَّبَ فِيهَا الشَّهْوَةَ وَخَلَقَ بَنِي آدَمَ وَرَكَّبَ فِيهِمُ الْعَقْلَ وَالشَّهْوَةَ فَمَنْ غَلَبَ عَقْلُهُ عَلیٰ شَهْوَتِهٖ فَهُوَ اَعْلیٰ مِنَ الْمَلٰئِكَةِ وَمَنْ غَلَبَتْ شَهْوَتُهٗ عَلیٰ عَقْلِهٖ فَهُوَ اَدْنیٰ مِنَ الْبَهَائِمِ ہ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرشتے پیدا فرمائے اور ان میں عقل رکھی اور چوپاؤں کو پیدا فرمایا ان میں شہوت رکھی۔ بنی آدم کو پیدا فرمایا اور ان میں عقل و شہوت دونوں رکھی تو جس کی عقل اس کی شہوت پر غالب آگئی وہ فرشتوں سے بلند اور افضل ہے اور جس کی شہوت عقل پر غالب آگئی وہ چوپایوں سے بھی کمتر ہے۔

عارف کامل مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ کیا خوب ترجمانی فرماتے ہیں:۔

در حدیث آمد کہ یزدانِ مجید
خلقِ عالم را سہ گونہ آفرید

حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ اللہ بزرگ و برتر نے عالم میں تین قسم کی مخلوق پیدا فرمائی۔

یک گروہ را جملہ علم و عقل و جود
آں فرشتہ است و نداند جز سجود

اس نے ایک گروہ کو علم و عقل اور مکمل سخاوت بخشی وہ فرشتہ کہلایا اور سجدہ سجود اس کا کام ٹھہرا۔

نیست اندر عنصرش حرص و ہوا
نورِ مطلق زندہ از عشقِ خدا

اس کی ساخت میں حرص و ہوا کا بالکل دخل نہیں وہ نورِ مطلق سے ہے عشق الٰہی کی بدولت زندہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کے عنصر میں عقل علم اور سخاوت کے سوا کچھ نہ رکھا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا نام فرشتہ رکھا گیا۔ طاعت و عبادت کے سوا اسے کسی چیز سے مطلب نہیں۔ اس سے گناہ اور غلطیاں سرزد نہیں ہوتے۔

یک گروہ دیگر از دانش تہی
ہمچو حیواں از علف در فربہی

دوسرا وہ گروہ بنایا جو عقل سے خالی ہے اور حیوانوں کی طرح چارہ کھا کھا کر اور پیٹ پال کر موٹا ہوتا ہے۔

او نہ بیند جز کہ اصطبل و علف
از شقاوت غافل ست و از شرف

اُسے طویلہ گھاس اور چارہ کے سوا کسی چیز سے مطلب نہیں، شقاوت اور سعادت کی طرف سے وہ غفلت میں ہے یعنی پیٹ پال پال کر اور چارہ کھا کھا کر وہ موٹا ہوتا ہے اس کے سوا کسی چیز سے اسے مطلب نہیں نہ اسے شقاوت کا احساس ہے اور نہ سعادت سے کوئی واسطہ۔

آں سوم ہست آدمی زادہ بشر
از فرشتہ نیمی و نیمش ز خر

تیسری قسم حضرت انسان، اولاد آدم بشر کی ہے جس کو

اُدھا فرشتہ سے حصہ ملا اور آدھا گدھے (حیوان) سے حضرت انسان روح حیوانی اور جسم دونوں کا مجموعہ ہیں۔ روح نیکی کی طرف لے جاتی ہے جو فرشتہ کی خصلت اور سرشت ہے اور اس کا جسم اسے حیوانیت کی جانب کھینچتا ہے جو گدھے پن کی دلیل ہے۔

نیم خر خود مائل سفلی بود
نیم دیگر مائل علوی بود

آدھا حصہ جو گدھے (حیوان) کا ہے اسفل السافلین کی جانب مائل ہوتا ہے (ثُمَّ رَدَدْنَاهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْن پھر ہم اس کو اسفل سافلین کی جانب لوٹاتے ہیں (پستی کی حالت والوں کی پستی سے زیادہ)) اور دوسرا نصف فرشتہ والا حصہ اعلیٰ علیین یعنی عالم بالا کی طرف عروج کرنا چاہتا ہے۔ یعنی جسم ناسوتیات اور دنیوی تقاضوں میں مبتلا رکھتا ہے اور روح ملا اعلیٰ کی جانب مائل رہتی ہے۔ ناسوتی تقاضے حرص و ہوا، شہوت، غصہ، غضب اور دوسرے سفلی میلانات جن میں خود غرضی، نفسانیت، حب جاہ، بے جا نمود و نمائش، رعونت، تکبر وغیرہ شامل ہیں اور روحانی تقاضے عبادات و ریاضات، ذکر و فکر، بے نفسی خدا و رسول ﷺ کی محبت میں استغراق وغیرہ یہاں تک کہ حضرت حق کے عشق میں اس قدر غرق ہو جائے کہ اپنا وجود بالکل معلوم نہ ہو اور وہی وہ رہ جائے یعنی لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ کا مشاہدہ اس کے نقد حال ہو اور وہ جمال مطلق میں مستہلک ہو جائے اور کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ۔ اس پر پوری طرح عیاں ہو جائے

سر سرم جان جاناں من نیسم
من نیسم باللہ یاراں من نیم

تا کدامیں غالب آید در نبرد
زیں دوگانہ تا کدامیں برد نرد

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس جہاد میں کونسا حصہ غالب رہتا ہے اور ان دونوں میں سے کس کی فتح ہوتی ہے کیوں کہ زندگی بھر انسان میں ان دونوں کی کشمکش اور ٹکراؤ رہتے ہیں اب اگر فرشتہ والا حصہ آخرکار غالب رہا تو بس یہی کامیابی ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کلام پاک میں وارد ہوا ہے۔ اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَيْھِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْن۔ (خبردار ہو کہ اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم) انھیں لوگوں کے لیے ارشاد ربانی ہے فَلَھُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْن (ان کے لیے اس قدر اجر ہے جو کبھی بھی ان سے منقطع نہ ہوگا) اور اگر گدھے (حیوان) والا حصہ غالب آگیا تو وہ اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ (وہ جو پایوں جیسے ہیں) کا مصداق ٹھہرا۔

عقل گر غالب شود پس شد فزوں
از ملائک ایں بشر در آزموں

اگر خدا کے فضل و کرم سے اس پر عقل کا غلبہ رہا تو ایسا شخص مرتبہ میں فرشتوں سے آگے بڑھ گیا اور وہ امتحان میں کامیاب رہا

شہوت از غالب شود پس کمتر است
از بہائم ایں بشر زاں کابتر است

اور اگر اس پر کہیں شہوت، حرص و ہوا، غصہ، حب جاہ، خود بینی اور نمود و نمائش وغیرہ کا عنصر غلبہ پا گیا تو ایسا آدمی چوپاؤں سے بھی بدتر ہے۔

آں دو قوم آسودہ از جنگ و حراب
ویں بشر با دو مخالف در عذاب

ان دونوں یعنی فرشتہ اور حیوان میں چوں کہ نیکی اور بدی دونوں قوتیں جمع نہیں کی گئی ہیں بلکہ فرشتہ میں نیکی ہی نیکی ہے اور حیوان میں بدی ہی بدی ہے اس لیے ان کے اندر کسی کشمکش کا تصور نہیں وہ جنگ و راحت سے بے نیاز ہیں لیکن حضرت انسان دونوں عنصروں کے درمیان پڑ کر عذاب میں مبتلا ہیں اور تاوقتیکہ پوری طرح ملکیت غالب نہیں ہو جاتی ہے نجات ناممکن ہے۔

ویں بشر ہم زامتحاں قسمت شدند
آدمی شکل اندو سہ امت شدند

یہ بشر بھی امتحاں کی بدولت تین قسموں میں تقسیم ہو گئے حالاں کہ سب کی شکلیں آدمی کی سی ہیں لیکن ایک دوسرے میں بڑا فرق ہے۔ سورۂ واقعہ میں ان تینوں اقسام کا بیان ہے۔
(۱) وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ o اُولٰئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ o

فِی جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ہ یعنی جو آگے بڑھنے والے ہیں اور اعلیٰ ہیں ان کا کیا کہنا وہ آگے ہی بڑھنے والے ہیں وہی خدا کے مقرب اور نعمتوں کی بہشتوں میں ہیں۔ ایک دوسری جگہ ان کی یوں تعریف کی ہے اور ان کے تقرب اور تعلق مع اللہ کو اس طرح بیان کیا ہے فِی مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ۔

(۲) وَاَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ ہ مَا اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ ہ فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ہ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ہ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ہ وَّمَآءٍ مَّسْکُوْبٍ ہ وَّفَاکِھَۃٍ کَثِیْرَۃٍ ہ یعنی داہنے ہاتھ والے سبحان اللہ داہنے ہاتھ والے کیا ہی عیش میں ہیں بے خار کی بیریوں والے باغوں میں جہاں تہ بتہ کیلے، لمبے لمبے سایے بہتا ہوا پانی اور کثرت سے میوے ہیں۔

(۳) وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۵ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۵ فِیْ سَمُوْمٍ وَّحَمِیْمٍ ۵ وَّظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ ہ لَّا بَارِدٍ وَّلَا کَرِیْمٍ ہ اِنَّھُمْ کَانُوْا قَبْلَ ذٰلِکَ مُتْرَفِیْنَ ہ وَکَانُوْا یُصِرُّوْنَ عَلَی الْحِنْثِ الْعَظِیْمِ ہ اور جو بائیں سمت والے ہیں وہ بائیں سمت والے کیسے برے ہیں وہ لوگ آگ، کھولتے ہوئے پانی میں ہوں گے اور ایسے سیاہ دھوئیں کے سایہ میں جو نہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ فرحت بخش۔ وہ لوگ دنیاوی زندگی میں بڑی خوشحالی میں رہتے تھے اور بڑے بھاری گناہ (یعنی کفر و شرک) پر اصرار کیا کرتے تھے۔

یک گرہ مستغرق مطلق شدہ
ہمچو عیسیٰ با ملک ملحق شدہ

ایک گروہ یعنی والسّٰبقون السّٰبقون وہ ہے جو ذات و صفات خداوندی میں فانی ہوگیا اور حضرت عیسیٰ کی طرح فرشتوں سے مل گیا۔ ؎

من ز تن عریاں شدم او از خیال
می خرامم تا نہایات الوصال
نقش آدم لیک معنی جبرئیل
رستہ از خشم و ہوا و قال و قیل

یہ گروہ حضرت آدم کی شکل پر تو ہے مگر باطناً جبرئیل ہے کیوں کہ غصہ، ہوا و ہوس اور بک بک جھک جھک سے چھٹکارہ پاکر ملکوتی صفات ہوگیا۔

از ریاضت رستہ وز زہد و جہاد
گوئیا از آدمی او خود نزاد

جب وہ ریاضات و مجاہدات کرکے اخلاق ذمیمہ سے چھٹکارا پاگیا اور فرشتوں کے مقام پر پہنچ گیا تب اسے ریاضت، زہد و جہاد کی ضرورت نہ رہی وہ ایسا بلند ہوگیا کہ گویا اس کی پیدائش ہی آدمی سے نہ ہوئی تھی۔

قسم دیگر با خراں ملحق شدند
خشم محض و شہوت مطلق شوند

دوسری قسم گدھوں کے مثل ہے ان کا کام جائز و ناجائز غصہ اور شہوت رانی یعنی خواہشات نفسانی کی غلامی، خودبینی، خودستائی ہوگیا اور نفس امارہ نے اسے بالکل مغلوب کر دیا، اس میں ملکیت نام کو نہ رہی۔

وصف جبرئیلی در ایشاں بود برفت
تنگ بود آں خانہ و آں وصف زفت

چوں کہ وہ ناقص الاستعداد تھے اس لیے ان کی ملکیت رفو چکر ہوگئی۔ وہ اتنی بڑی صفت کا بوجھ نہ برداشت کرسکے اور بجائے اس کے کہ ریاضات و مجاہدات سے اپنی ملکی صفت کو بڑھاتے بڑھاتے اسے حیوانی صفت پر غالب کر دیتے۔ انھوں نے الٹا کیا۔ ملکی صفت کو جو انہیں فطرتاً ملی تھی خواہشات سے مغلوب کر دیا یہاں تک کہ وہ سوخت ہوگئی۔

مردہ گردد شخص کو بے جاں شود
خر شود چوں جان او بے آں شود

جب وہ صفت بے جان ہوگئی تو وہ شخص مردہ ہوگیا اور اس صفت کے بغیر اس کی جان گدھوں کے مثل ہوگئی یعنی وہ خواہش مجسم ہوگیا اور اس کی ملکیت سوخت ہوگئی۔ برخلاف اس کے اگر اس نے کسی شیخ کامل کی نگرانی میں مجاہدہ کرکے اپنی ملکی صفت غالب کرلی ہوتی اور خربیت کا گلا گھونٹ دیا ہوتا تو فرشتوں کے مثل ہو جاتا اور اس کا انجام ابرار کے ساتھ ہوتا لیکن چوں کہ اس اپنے آپ کو دوسری صف میں شامل کر لیا اس لیے اس کا حشر ان کے ساتھ ہوگا۔

زاغ گردد چوں پے زاغاں رود
جسم گردد جان چو او بیجاں شود

اس نے کوے کی پیروی شروع کردی تو کوا بن گیا۔ اس کی روح بھی خواہشات کے بوجھ تلے دب کر کر ورادر ٹھوس جسم بن گئی کیوں کہ اس نے کووں کی طرح مردار خواری شروع کردی اسی لیے شریعت میں عقائد، نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ، اعمال صالحہ اور اوصاف حمیدہ، صدق و اخلاص وغیرہ پر بہت زور دیا گیا ہے تاکہ انسان کو جو روحانیت ودیعت کی گئی ہے مردہ نہ ہونے پائے اور ایک مسلمان یا مومن اصحاب یمین میں شمار ہونے کی وجہ سے جب جزا اور سزا کا وقت آئے تو اس کی نیکیوں کا پلّہ بدی کے پلّہ پر بھاری رہے فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ کے بہ موجب وہ جنت کا مستحق قرار پائے مگر حضرت انسان نے اس وسیع و عریض دنیا میں قدم ناز رکھتے ہی جب دولتوں اور دنیاوی نعمتوں کے انبار دیکھے تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ دونوں ہاتھوں سے سمیٹنے میں لگ گئے اور گویا داغ مجسم بن گئے، تھوڑی بہت جو ملکیت تھی وہ بھی کھو بیٹھے۔ حالاں کہ دولتوں اور آسائشوں کو دے کر اللہ تعالیٰ تو یہ آزماتا ہے کہ کون ہماری یاد میں غرق رہتا ہے اور کون ان میں کھو کر ہمیں بھلا بیٹھتا ہے ؎

خنک آں کس کہ گوئے نیکی برد

زاں کہ جانے کاں ندارد ہست پست
ایں سخن حق ست و صوفی گفتہ است

جس روح میں روح کے خواص نہ رہیں وہ پست ہو جاتی ہے اور یہ بات صدفی صد درست ہے۔ حضرات صوفیہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اسی کے قائل ہیں۔ ان کا منشاء یہ ہے کہ جسمانیت پر کسی طرح روحانیت کو غالب کر دیجیے اور یہ بات جبھی ممکن ہے کہ کسی شیخ کامل کی زیر تربیت ذکر و فکر و مشغولی اور تزکیہ نفس کیجیے اور کم سے کم مرتبہ احسان حاصل کیجیے۔ جو بغیر اس کے ممکن نہیں ؎

ہیچ چیزے خود بہ خود چیزے نہ شد
ہیچ آہن خود بہ خود تیغے نہ شد
مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلامے شمس تبریزی نہ شد

(کوئی چیز خود سے کچھ نہیں بن جاتی جس طرح لوہا آپ ہی آپ تلوار نہیں بن جاتا ہے مولوی اس وقت قطعاً مولائے روم نہ بن سکا جب تک اس نے حضرت شمس تبریزی کی غلامی نہ اختیار کرلی۔

او زحیونہا فزوں تر جاں کند
در جہاں باریک کاریہا کند

وہ اپنی جان کو حیوانوں سے زیادہ ہلکان کر دیتا ہے اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے مشکل سے مشکل کام انجام دیتا ہے۔

مکر و تلبیسے کہ او تاند تنید
آں ز حیوانے دگر ناید پدید

چوں کہ اس میں عقل ہوتی ہے اس لیے وہ عقل و ذہانت کا جا و بیجا استعمال کر کے اپنے مقصد کے حصول کے لیے وہ وہ حیلے کرتا ہے کہ دوسرا حیوان جس میں عقل و ذہانت نہیں ہے کہاں کر سکتا ہے۔

جامہائے زرکشی را بافتن
دُرّہا از قعر دریا یافتن

مثلاً زر دوزی کا کام کپڑوں پر بناتا ہے اور اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر سمندر کی تہ سے موتیوں کے گچھے کے گچھے نکال لاتا ہے۔

خردہ کاریہائے علم ہندسہ
یا نجوم و علم طب و فلسفہ

وہ علم ہندسہ کی باریک سے باریک گتھیوں کو سلجھاتا ہے یا نجوم، علم طب اور فلسفہ کا ماہر بن جاتا ہے۔

کہ تعلق با ہمیں دنیستش
رہ بہ ہفتم آسمان نیستش

وہ تمام وہ کام انجام دیتا ہے جن کا تعلق اسی دنیا کی دولت

کمانے اور عزت حاصل کرنے سے ہے اور ملاء اعلیٰ یا عالم آخرت
جہاں اسے جانا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے کی جانب بالکل توجہ
نہیں کرتا ہے۔

ایں ہمہ علم بنائے آخر ست
کہ عماد بود گاؤ و اشتر ست

کیوں کہ یہ سارے علوم گائے اونٹ وغیرہ باندھنے کے
لیے طویلہ کی بنیاد قائم کرنے کی حیثیت رکھتے ہیں نہ کہ
عالم آخرت میں محل وغیرہ بنانے کے کام آتے ہیں مطلب
یہ ہے کہ توجہ ناسوتیات سے ہٹتی نہیں اور خدا سے لو لگتی
نہیں ہے۔

بہر استبقائے حیواں چند روز
نام ایں کردند گنجان رموز

اپنی چند روزہ حیوانی زندگی کی بقا کے لیے ان احمقوں
نے اس کا نام حکمت اور رموز رکھ لیا ہے۔ مطلب یہ ہے
کہ انسان پیٹ کے دھندے کے لیے کیسے کیسے پاپڑ
بیلتا ہے۔ کس طرح علم و حکمت کو دنیاوی زندگی کے فروغ
کے لیے بیچتا ہے اور جب مر جاتا ہے تو یہ سارے علم و حکمت
اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے اور اپنے ساتھ بداعمالیوں کا ذخیرہ
لے جاتا ہے مولاناؒ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

اَیُّہَا الْقَوْمُ الَّذِیْ فِیْ مَدْرَسَۃ
کُلَّمَا حَصَّلْتُمُوْہُ وَسْوَسَۃ

لوگو! تم نے دنیاوی مدارس میں جو کچھ علم ظاہری
حاصل ہے وہ سب شیطانی وسوسوں کے سوا کچھ نہیں
ہے۔

علم راہِ حق و علم منزلش
صاحب دل داند آں را با دلش

حقیقت یہ ہے کہ سلوک یا اللہ میں واصل ہونے
کے طریقہ کا علم اور ان کے منازل صاحب دل جانتا ہے
یا اس کا دل جس نے سلوک کیا ہو یا کر رہا ہو۔ دوسرا کوئی
نہیں جانتا ہے کیوں کہ شیخ کامل ہی رہبری کرتا ہے۔ سالک
جب راہ حق پر قدم بڑھاتا ہے تو کبھی اسے سانپ سے سابقہ پڑتا
ہے اور کبھی سوز سے یعنی قبض ہوتا ہے اور کبھی بسط۔

پس دریں ترکیب حیواں لطیف
آفرید و کرد با دانش الیف

پس نیکی و بدی کے خمیر سے ترکیب دے کر اللہ تعالیٰ نے
ایک لطیف حیوان پیدا فرمایا اور عقل و دانش سے اُسے نوازا تاکہ
وہ آنکھیں کھول کر چلے اور راہ سے بے راہ نہ ہو۔ دنیا اور اس
کے کھیل تماشوں میں ملوث نہ ہو ورنہ نتیجہ کار بدکار بد ہے۔

نام کالانعام کرد آں قوم را
زاں کہ نسبت کو بہ یقظہ نوم را

یعنی جب وہ ہوا و ہوس کے سمندر میں گلے گلے
ڈوب گیا اور اس کی روح حیوانی مردہ ہو کر رہ گئی تو وہ
حیوان بن گیا اس کا نام "کالانعام" قرار پایا کیوں کہ
اس نے بیداری سے کام نہ لیا اور اپنے مقصد آفرینش "وَمَا
خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ" ای لیعرفون۔
ہم نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ ہماری
عبادت کریں" یا ہماری معرفت حاصل کریں۔ کو بھول گیا
اور زندگی سوتے سوتے گذار دی اگر بیداری سے کام لیتا اور
یہ سمجھتا کہ دنیا اور اس کی نعمتوں کو گوشۂ چشم سے دیکھتے ہوئے
گذر جانا چاہئے کہ یہ سب انبار ہماری آزمائش کے لیے
ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان نعمتوں کی بارش کر کے ہم کو آزماتا اور
دیکھتا ہے کہ کون ان میں مست ہو جاتا ہے اور کون ہماری
یاد و بود میں محو رہتا ہے۔

روح حیوانی نہ دارد غیر نوم
حس ہائے منعکس دارند قوم

روح حیوانی کا کام سوتے رہنا ہے کیوں کہ اس قوم
کے حواس ظاہری سے الٹا دکھائی دیتا ہے۔ جب وہ کسی
شیخ کامل کی رہبری میں ان حواسوں کو سلا دیتا ہے اور
حواس باطنی کو بیدار کر لیتا ہے تب روح حیوانی روح
انسانی ہو جاتی ہے اور اسے صحیح صحیح دکھائی دیتا ہے سچ پوچھئے تو
اتنی سمجھ بھی کس میں ہوتی ہے سوائے اس شخص کے جس پر
اللہ تعالیٰ کا کرم ہوتا ہے اور اس کو شیخ کامل مرحمت فرماتا ہے۔

اب اگر اس نے دل وجان سے اس کی خدمت صدق واخلاص کے ساتھ انجام دی یہ نسخۂ کیمیا حاصل کر لیا تو کیا کہنا۔
ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

یقظ آمد نوم حیوانی نہ ماند
انعکاس حس خود از لوح خواند

جب کسی شیخ کامل، دانائے راز کی تربیت سے حواس باطنی بیدار ہو جاتے ہیں اور ظاہری حواس خوابیدہ ہو جاتے ہیں تو اپنے دل کی تختی کے مطالعہ سے حواسوں کا الٹا پن سمجھ میں آجاتا ہے۔

ہمچو حس آنکہ خواب آں را بود
چوں شد او بیدار عکسش رو نمود

حواس ظاہری کے پھندے میں پھنسے رہنے کی وجہ سے انسان غفلت کا پتلا تھا جب شیخ کی توجہ سے حواس باطنی بیدار ہو گئے تو اس کے برعکس نظر آنے لگا اور وہ الٹا پن سمجھ میں آنے لگا۔

لاجرم اسفل بود از سافلین
ترک او کن لا احب الآفلین

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کم تر سے کم تر مخلوق ہو کر رہ جاتا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ۔ یقیناً ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا پھر ہم اس کو کم تر سے کم تر مخلوق میں لوٹا لائے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس کی صحبت سے دور رہو جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے ستارہ کو ڈوب جانے پر فرمایا تھا کہ میں ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ بہتر ہے کہ تم فانی دنیا کی فانی نعمتوں سے ملوث نہ ہو اور جہاں تک ممکن ہو ترک اختیار کرو۔ اگر شیخ کامل کی توجہ اور تمہاری طلب سے تمہیں ترک حقیقی حاصل ہو گیا تو تم کم تر سے کم تر مخلوق ہونے سے بچ جاؤ گے۔

زاں کہ استعداد تبدیل نبرد
بودش از پستی و آں را فوت کرد

اس لیے کہ جب وہ منصۂ شہود پر آیا اس میں جہاد کرنے کی استعداد و قوت جو اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی تھی موجود تھی مگر اس نے اس استعداد کی ناقدری کی تو اس کی غفلت سے وہ فوت ہو کر رہ گئی۔ اگر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عالی مرتبت شخصیت اور عظیم راہبر نہ ہوتے جنھوں نے لمحہ بہ لمحہ اور قدم بہ قدم صحابہ کرامؓ کی رہنمائی نہ فرمائی ہوتی تو بخدا اصحابہ کرامؓ کی یہ عظیم الشان جماعت ظہور میں نہ آتی اور یہ دنیا کافروں کا گہوارہ ہو کر رہ جاتی۔

باز حیواں را چوں استعداد نیست
عذر او اندر بہیمی روشنست

باقی حیوانوں میں چوں کہ قدرت نے استعداد ہی ودیعت نہیں فرمائی اس لیے وہ بہیمیت اور حیوانیت کی حالت میں رہنے پر مجبور ہیں۔

زو چو استعداد شد کاں رہبر ست
ہر غذائے کو خورد مغز خر ست

اب جب کہ اس کی رہنمائی کرنے والی استعداد ہی ختم ہو گئی تو اس کے کھانے پینے کا مقصد ہی فوت ہو گیا اس لیے کہ صاحب روحانیت جو کچھ نوش فرماتا ہے اس سے اس کی روحانیت میں اضافہ ہوتا ہے اور نفس کا بندہ جو کچھ کھاتا ہے اس سے قوائے بہیمیہ کو طاقت پہنچتی ہے اب جب کہ استعداد ہی سوخت ہو گئی تو وہ جو کچھ کھائیگا اس سے خرسیت میں اضافہ ہی ہوگا۔

گر بلادر خورد او افیون شود
سکتہ و بے عقلیش افزوں شود

اس کے لیے بلادر جو سکتہ اور بے ہوشی کا علاج ہے افیون جو کہ بیہوشی کا کام کرتی ہے کام کرے گا یعنی بلادر سے اس کی سکتہ و بیہوشی استعداد کے نقص کی وجہ سے بڑھے گی۔

ماند یک قسم دگر اندر جہاد
نیم حیواں نیم حی با رشاد

ایک دوسری قسم جس کو قرآن پاک نے اصحاب یمین

باقی ص ۱۸ پر

گزشتہ سے پیوستہ

ہدایت القلوب

ملفوظات حضرت خواجہ زین الدین حسین داؤد شیرازی قدس سرہ

(۳)

ترجمہ و تلخیص: پروفیسر نثار احمد فاروقی

علم و حکمت کے خزانے

کسی زمانے میں دو بہت بڑے بادشاہ تھے۔ ہر ایک کے پاس بہت وسیع علاقہ، بے شمار لشکر، ہاتھی، گھوڑے، غلام اور بے حد دولت و نعمت تھی۔ ان دونوں میں محبت ہوگئی اور دونوں نے اپنے اپنے فرزندوں کے لیے دوسرے کی بیٹی کا رشتہ طلب کیا، شادی ہوگئی۔ وہ اپنی بیٹی کی وجہ سے، اس کی بیٹی کا بہت خیال رکھتا تھا اور اُسے پوچھتا رہتا تھا، یہ اس کی بیٹی کی تعظیم کرتا تھا۔ اب محبت اور بھی گہری ہوگئی۔ ایک دن ان میں سے ایک نے اپنی سلطنت کے بزرگوں اور دانشمندوں سے اس بات پر مشورہ کیا کہ ملک و نعمت اور دولت کسی کے پاس رہنے والی نہیں، یقیناً یا تو ملک کو زوال ہوگا، یا یہ (بادشاہ) فنا ہو جائے گا، جب ایسا ہے تو ہمیں ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ ہمارے بعد ہماری اولاد کو بُرے دن دیکھنے نہ پڑیں۔

دانشمندوں نے کہا کہ اس کی تدبیر یہ ہے کہ زر و جواہر، مروارید، لعل و زمرد، یاقوت وغیرہ جو وزن میں ہلکی ہوں اور قیمت میں گراں ہوں، کسی پوشیدہ جگہ پر دفن کر دیں تاکہ یہ ان (بچوں) کے لیے ذخیرہ رہیں، اور سلطنت کے زوال کے بعد وہ کسی کے محتاج نہ ہوں۔ اس مشورے سے بادشاہ نے اتفاق کیا، اور اس محبت کی بناء پر جو دوسرے بادشاہ سے تھی اسے بھی یہ خط لکھا کہ "جو عقلمند اور مقبول بندے ہوتے ہیں وہ اپنی زندگی میں ایسا کام کرتے ہیں جو ان کی موت کے بعد کارآمد ہو۔ ہم نے اپنی مملکت کے دانشمندوں سے ایسا مشورہ کیا ہے، اگر تم اِسے ٹھیک سمجھتے ہو تو تم بھی ایسا ہی کرو۔"

جب یہ خط اس بادشاہ کے پاس پہنچا اور وہ اس کے مضمون سے آگاہ ہوا، چونکہ وہ زیادہ عقل مند تھا اس نے یہ جواب لکھنے کا حکم دیا کہ "آپ کے خط کے مضمون سے آگاہی ہوئی آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے، مگر اس میں یہ اندیشہ ہے کہ کسی دشمن یا حاسد کو اُن ذخیروں اور دفینوں کا پتا لگ جائے، یا ان پر کوئی آفت آجائے، یا وہ بھی فنا ہو جائیں، اور پھر اولاد تباہ حال ہو جائے۔ کوئی ایسا ذخیرہ کرنا چاہیے کہ جب تک اولاد زندہ رہے (یہ ذخیرہ) ہرگز ضائع نہ ہو۔"

جب یہ خط اس بادشاہ تک پہنچا تو وہ سخت حیران ہوا، اور اس نے پھر لکھا کہ وہ کون سی چیز ہے جسے ہرگز فنا نہیں ہو سکتی؟ اُدھر سے جواب آیا کہ "وہ ذخیرے اور دفینے ادیبوں، عالموں اور فلسفیوں پر خرچ کرو

تاکہ وہ تمہارے فرزندوں کو ادب اور حکمت اور علم سکھائیں، اس صفت کے ساتھ وہ جہاں بھی رہیں گے، ساری مخلوق ان کی محتاج ہوگی وہ کسی کے محتاج نہ ہوں گے۔"

یہ صلاح بادشاہ کو بہت پسند آئی، اس نے ایسا ہی کیا۔ یہ سب اسباب اور املاک عارضی ہیں اور زمانہ گذرنے کے ساتھ فنا ہو جانے والے ہیں، مگر علم وادب کے کمال کو کبھی ہرگز زوال نہیں ہوتا۔

ابوالطیب المتنبیؔ کا قصہ

اسی بارے میں آپ نے ایک اور حکایت بیان فرمائی کہ ایک بادشاہ تھا جس کا نام سیف الدولہ تھا۔ ایک دن وہ تخت سلطنت پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے خادم زر و جواہر اور طرح طرح کا سامان، غلام اور گھوڑے وغیرہ، جو کچھ دنیا جہان میں ہوتا ہے وہ اس کے سامنے سے گذار رہے تھے۔ اس کے دل میں کچھ غرور پیدا ہوا۔ اس کا ایک مصاحب ابوالطیب[لہ] نام تھا اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگا:

"اے ابوالطیبؔ، کیا تم ہماری بادشاہی کی شان وشوکت دیکھ رہے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیسی نعمت اور بزرگی عطا فرمائی ہے۔ اتنی بڑی سلطنت، ایسا لشکر، حکومت کا نظم وضبط، فتح وظفر، دشمنوں پر غلبہ، لوگ ہزاروں چیزیں ہر طرف سے (ہماری خدمت میں) لا رہے ہیں اور ایک عالم نے ہماری بندگی کا طوق اپنی گردن میں ڈال رکھا ہے۔"

ابوالطیب نے کچھ سوچا اور اپنے دل میں کہا کہ یہ بے چارہ کس غلط فہمی میں مبتلا ہے، اس کا کچھ علاج کرنا چاہیئے۔ کہنے لگا: "بادشاہ کے اس سوال کا جواب کسی بہتر موقع پر عرض کروں گا۔"

جب وہ مجلس برخاست ہوئی اور اس پر کچھ مدت گذر گئی، اتفاقاً ایک دن سیف الدولہ نے گرمابہ (حمّام) جانے کی خواہش ظاہر کی۔ ابوالطیبؔ کو اپنے ساتھ لیتا گیا۔ چونکہ اس سے بہت زیادہ محبت اور ملاقات تھی، دوسرے سب اُمراء کو باہر ہی چھوڑ دیا۔ ابوالطیب گرمابہ (حمام) کے اندر گیا یہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ دو خادم دونوں کی خدمت کر رہے تھے ایک حجرے سے گرم پانی لاتا تھا اور دوسرا بیرونی حجرے سے ٹھنڈا پانی ڈالتا تھا، دونوں کو ملاتے تھے اور ان دونوں کے بدن پر ڈالتے تھے۔ ایک ایسے لمحے میں جب دونوں خادم باہر گئے ہوئے تھے، ابوالطیبؔ کو موقع مل گیا، کہنے لگا: "ایک بار بادشاہ نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا اپنی عظمت، سلطنت کی بڑائی، خدم وحشم وغیرہ کا بیان کیا تھا۔ آج میں اس کا جواب عرض کرتا ہوں۔ اے بادشاہ یہ بتائیے کہ آپ اچھے ہیں یا میں؟" بادشاہ کو چنبھا ہوا کہ یہ کیا بات کہی؟۔ ابوالطیبؔ نے کہا: "اس وقت ہم دونوں ننگے ہیں تو آپ اچھے ہیں یا میں؟"۔ بادشاہ کو پھر حیرت ہوئی، کہنے لگا: "میں سمجھا نہیں کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" اس نے کہا: "جس دن تخت سلطنت پر بیٹھ کر بادشاہ اپنے مال واسباب پر ناز کر رہا تھا مجھے بادشاہ کا اس گھمنڈ میں مبتلا ہونا اچھا معلوم نہ ہوا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ کسی مناسب موقع پر اس (غرور کی) بیماری کا علاج کروں گا۔ آج وہ موقع مل گیا ہے کہ بادشاہ بھی ننگا ہے، میں بھی ننگا ہوں۔ وہ اسباب مملکت اور لشکر وغیرہ بھی نزدیک نہیں ہیں تو اس وقت میں اچھا ہوں یا آپ؟"

میری دولت یہاں بھی موجود } بادشاہ حیران

[لہ] عربی کا مشہور اور ممتاز شاعر ابوالطیب احمد بن الحسین بن عبدالصمد الجعفی الکندی ۳۰۳ھ میں پیدا ہوا سیف الدولہ بن حمدان کے دربار سے ۳۳۷ھ میں وابستہ ہوا پھر کافور الاخشیدی کا مصاحب ہوا (۳۴۶ھ) اس کے بعد عضد الدولہ کے دربار میں رہا۔ ۳۵۴ھ میں قتل کر دیا گیا۔ دیوان معروف ہے، عربی شعراء میں اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ (دیکھیے جرجی زیدان جلد ۲/ ۲۸۹ — ۲۸۵، یتیمۃ الدھر جلد ۱/ ۷۸ وغیرہ)

ہوا اور کہنے لگا: "تمھیں کہو۔" (ابو الطیب نے) کہا: "بادشاہ کی عظمت سلطنت اور شان و شوکت سے ہے، وہ اس وقت موجود نہیں۔ میری عظمت میری عقل اور شاعری سے ہے وہ یہاں بھی میرے پاس موجود ہے، لہذا اس وقت میں بادشاہ سے بہتر ہوں۔" بادشاہ کو یہ سن کر غصہ آگیا کہنے لگا: "تم اپنے وہ برے دن بھول گئے؟" ابو الطیب نے جب دیکھا کہ بادشاہ پر بیہودہ اثر نہیں کر رہی ہے تو اس نے بات پلٹ دی اور اس کی مدح و ثنا کرنے لگا۔ پس معلوم ہوا کہ انسان کی سعادت امور دینی میں کمال حاصل کرنے میں اور دنیائے فانی کی طلب ترک کرنے میں ہے۔

فرشتہ اور انسان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "حق تعالٰی نے حیوانوں کو پیدا کیا اور ان میں شہوت رکھی، فرشتوں کو پیدا کیا تو ان میں عقل رکھی۔ انسانوں کو پیدا کیا تو انھیں عقل اور شہوت دونوں کا حصہ دیا۔ اب جس کی شہوت عقل پر غالب آجائے وہ حیوانوں سے بھی بدتر ہے اور جس کی عقل شہوت پر غالب رہے وہ فرشتوں سے بہتر ہے۔"

کھلانا قوت دینا ہے

فرمایا: "قوت (کھانا) دینا کسی کو قوت دینا ہے۔ جو کسی صالح انسان کو کھانا کھلاتا ہے وہ اس کی صلاحیت (نیکی) میں شریک ہوجاتا ہے۔"

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:[1] "جو کسی ایک روزہ دار کو افطار کراتا ہے اسے دو روزوں کا ثواب ملتا ہے۔ اس حساب سے جتنے روزہ داروں کو افطار کرائے گا اتنا ہی (دوگنا) ثواب پائے گا۔" اگر کوئی بغیر طلب کیے ہوئے کوئی چیز لاتا ہے وہ کھا لینی چاہیے۔ اگر وہ اپنی ضرورت سے زیادہ ہے تو کسی اپنے ہم خرقہ (پیر بھائی) کو دے دینی چاہیے یا کسی اور صالح (نیک) شخص کو۔ یا مستحق پڑوسیوں میں تقسیم کر دینی چاہیے۔

اپنی اپنی طلب

دوسری بار فرمایا: بعض لوگوں کے سر میں دنیا کی طلب ہوتی ہے، بعض کو عقبیٰ کی۔ کوئی محل سرا چاہتا ہے کوئی اسباب دنیا کی آرزو کرتا ہے۔ کوئی بھی کسی مطلوب کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو شخص دنیا کا طالب ہے اگر اس کی پانچوں نمازیں فوت ہو جائیں وہ پروا نہیں کرتا، مگر ایک چھدام بھی ضائع ہوجائے تو اسے رنج ہوتا ہے۔ جو آخرت کا طالب ہے اگر اس کا دنیا کا سارا اسباب تلف ہو جائے پروا نہیں کرتا، لیکن اگر نماز کی دو رکعتیں فوت ہو جائیں تو دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیری ہو جاتی ہے لہذا ایسی (ایک دوسرے کی) ضدوں کا ایک جگہ جمع رہنا محال ہے۔ پھر آخر کیا کیا جائے؟

بس اپنے کام کے پیچھے لگے رہنا چاہیے اور ان ایک دوسرے کی مخالف چیزوں سے بچنا چاہیے۔

حضرت شیخ الاسلام برہان الدین اگر کسی کو شاہی دربار کی جانب مائل دیکھتے تھے اسے دور رکھتے تھے، جسے وہ اپنے قریب رکھنا چاہتے تھے اس سے بس اتنا ہی پوچھتے تھے کہ "بابا، افطار کہاں کروگے؟ یہیں رہوگے یا کہیں اور جاؤگے؟" اگر وہ کہتا تھا کہ میں تو یہیں رہوں گا تو اسے روکتے تھے، ورنہ کوئی چیز دلا کر رخصت کر دیتے تھے۔

یہ بھی ظلم ہے

ایک صاحب دل درویش تھے ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ اگر کوئی شخص آتا تھا اس سے پوچھتے تھے: تم کون ہو؟ اگر وہ (طبیعت کے) موافق ہوتا تھا تو دروازہ کھول دیتے تھے ورنہ باہر سے ہی معذرت کر لیتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے کچھ مشغولیت ہے اگر اس کو پہچان لیتے تھے تب بھی واپس کر دیتے تھے۔ ہرگز دروازہ نہ کھولتے تھے۔ ایک رات کو کسی نے ان کے

---

[1] جامع ترمذی، ابن ماجہ، دارمی اور مسند احمد بن حنبل میں حدیث نبوی کے الفاظ یہ ہیں: "من فطّر صائمًا کُتِبَ (کان لہ وکُتِبَ لہ) مثلُ أجرہ، أجر الصائم"۔ جو کسی روزہ دار کو افطار کرائے گا اس کے لیے روزے دار کے اجر کی برابر اجر لکھا جائے گا۔ یہاں دوگنے سے یہی مراد ہے کہ ایک اپنے روزے کا اجر، دوسرے جس کو افطار کرایا اس کا اجر۔

پاس آدھا من جلیبی بھیجی۔ انھوں نے جلیبی لانے والے سے کہا فلاں سے کہہ دینا کہ "تم نے مجھے تکلیف پہنچائی، بہت دکھ دیا ہے۔ اب یہ چاہیے کہ صبح کو سب سے پہلے مجھ سے ملو پھر کہیں اور جانا۔" دوسرے دن وہ جلیبیاں بھیجنے والا آیا اس درویش نے جلیبی والے سے کہا: "اے عقلمند تم نے میرے لیے یہ آدھا من جلیبیاں کیوں بھیجیں؟ میں انھیں اکیلا نہیں کھا سکتا اور دوسرا کوئی کھانے والا یہاں ہے نہیں۔ اگر ان کو رکھتا ہوں تو خراب ہو جائیں گی، لہذا مجھے تو انھیں لے کر پڑوسیوں کے دروازوں پر جاکر تقسیم کرنا پڑے گا۔ اس طرح وہ دوسرے دن کسی اور چیز کے منتظر رہیں گے، اگر نہیں پہنچے گی تو اسے برا سمجھیں گے کہ ہمارے لیے کچھ نہیں بھیجا خود ذخیرہ کرتے رہتے ہوں گے۔ میرے لیے تو ایک سیر بھی بہت ہوتیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ (اتنی زیادہ بھیجنے سے) تمھارا مقصود کیا تھا؟ شاید تم اپنے دوستوں کے جمگھٹ میں بیٹھے تھے وہ تمھارے لیے بہت سی لائے ہوں گے، دوستوں کے سامنے اپنی سخاوت ظاہر کرنے کے لیے تم نے تھوڑی سی نہ بھیجیں۔"

وہ شخص سخت حیران ہوا اور مجبور ہو کر اس نے اقرار کیا کہ جی ہاں ایسا ہی تھا۔

ایک بار فرمایا کہ ایک شخص کی عورت اس سے بہت الجھتی تھی۔ زر و جواہر طلب کرتی تھی وہ کہتا تھا کہ اے بی بی اگر تم جوار کی روٹی، کنوئیں کے پانی اور گاڑھے کے لباس پر قناعت کرو تو میرے ساتھ رہو ورنہ بسم اللہ۔ جو تمھاری مرضی ہو وہ کرو۔

پہلے جال سے نکلو

پھر فرمایا: اگر کوئی شخص اضداد کے درمیان پھنسا ہوا ہو تو اسے یہ چاہیے کہ سب سے پہلے تو خود کو اضداد سے باہر نکالے، پھر اپنے اہل و عیال کو رفتہ رفتہ باہر نکالے، جب اسے استقامت حاصل ہو جائے گی تو اس کے گھر والے بھی، ہنسی خوشی اس کے ساتھ بسر کریں گے اور ہرگز اس سے علیحدگی اختیار نہیں کریں گے۔ دیکھو یہ شہاب الدین ہیں انھیں اگر نکالنا چاہو گے تو مر جائیں گے مگر یہاں سے ہرگز چھوڑ کر نہ جائیں گے۔

اور فرمایا:

بقدر الکدّ تنقسم المعالی
ومن طلب العُلیٰ سهر اللیالی

(ترجمہ: بلندیاں جدّ و جہد کے حساب سے تقسیم ہوتی ہیں، اور جس کسی نے بلندی کی طلب کی ہے اس نے راتیں جاگ کر گذاری ہیں)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس کی تفسیر میں کہ إتّخذ اللہُ إبراهیمَ خلیلاً بإطعامه یظاهرو (..) السلام والصلوة باللیل والناسُ نیامٌ[1]۔

اسلام کے اظہار سے مراد یہ ہے کہ جملہ خلائق اس کے شر سے محفوظ رہیں اور وہ سب سے پسندیدہ اخلاق کے ساتھ ملے۔ یہ بات دو پیغمبروں کے بارے میں بیان کی اس سے قصہ یا افسانہ بیان کرنا مقصود نہیں تھا، بلکہ امت کی ہدایت اور ارشاد مراد تھا، پس جس کسی کو یہ تین باتیں نصیب ہوں وہ بھی خلیل (اللہ کا دوست) ہو سکتا ہے خواہ وہ پیغمبر نہ ہو۔

کسی نے پوچھا: "قیام شب کیسے ہوتا ہے؟ فرمایا: ان دو باتوں میں سے ایک ہوگی کہ یا تو وہ روزہ دار ہوگا یا نہ ہوگا۔ اگر وہ روزہ نہیں رکھتا تو نماز ظہر کے بعد کھانا کھائے عصر کے وقت تک ہلکا پھلکا ہو جائے گا، اب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ رات کو (عبادت میں) مشغول رہے۔ اگر روزہ رکھتا ہے تو صرف شوربے سے افطار کرنے پر اکتفا کرے۔ شوربا قوت بھی دیتا ہے اور ہلکا بھی ہوتا ہے، پھر رات کو مشغول رہے، آخر میں کچھ کھا کر روزہ رکھ لے۔ اگر بھر پیٹ کھا کر رات کو جاگے گا، تو جاگ تو سکتا ہے، مگر اسے (عبادت میں) ذوق نہیں ملے گا پھر آپ نے

---

[1] یہ عبارت اس طرح ہونی چاہیے: "یُظاهرون الاسلام ویُقیمون الصلوة باللیل والناسُ نیامٌ" مگر نسخے کا کاتب بہت ہی کم علم اور نہایت غلط نویس ہے، ایسی غلطیاں کرتا ہے جن کی قیاسی تصحیح بھی سخت دشوار ہے۔ یہ حدیث جامع ترمذی میں اور مسند احمد ۱/۲۶۸ میں ملتی ہے۔

حضرت اوحدالدین کرمانی کا یہ شعر پڑھا۔

اوحد (. . . . .) گرداؤ باش طلب
این عشوہ کت آموخت کہ فرداش طلب
اوحد خواہی کہ مرد مشغول شوی
باید کہ زغیر دوست معزول شوی
آرے چو بدوست می توان شد مشغول[1]

نماز جمعہ کی ترتیب

جمعہ کی نماز میں ترتیب نہیں (آئی) ہے۔ ایک بار اس بندۂ کمینہ نے نماز جمعہ کے بارے میں گذارش کی کہ آپ کس ترتیب سے ادا کرتے ہیں۔ فرمایا: ”چار رکعت سنت جمعہ، خطبے سے پہلے، دو رکعت فرض امام کے پیچھے، اس کے بعد چار رکعت سنت جمعہ، جن پر فقہا، کا اتفاق ہے، پھر دو رکعت سنت مزید جس کے سنت ہونے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ اس کے بعد نماز ظہر کی دس رکعتیں جیسے ہر روز پڑھی جاتی ہیں۔ اس کے لیے اذان کی ضرورت نہیں، مگر فرض کی جماعت میں تکبیر کہنی چاہیئے۔ اور جن مسائل میں اختلاف ہے، ان میں اگر ممکن ہو تو سب کے متفقہ قول پر عمل کرے، مثلاً: امام شافعیؒ کے مسلک میں وضو سَیل (بہنے) کے بغیر نہیں ٹوٹتا، مگر امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک آواز سے ہنسنے، قہقہہ لگانے، نکسیر بہنے اور ایسی ہی باتوں سے ٹوٹ جاتا ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک اِس حالت میں نماز ادا کرنا جائز ہے، مگر امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جائز نہیں۔ اگر نکسیر پھوٹنے یا ایسی ہی کسی حالت میں وضو دوبارہ کرلیں تو امام شافعیؒ اس سے روکتے بھی نہیں، کیونکہ ان کا قول ہے: الوضوءُ علی الوضوءِ نورٌ (وضو پر وضو کرنا نور ہے) پس وضو کرلینے میں دونوں کے قول پر ہو جاتا ہے، اور وضو ترک کرنے میں صرف امام شافعیؒ کے قول پر عمل رہتا ہے۔ لیکن اگر سب کے قول پر عمل کرنا ممکن نہ ہو تو اپنے صاحب مذہب (امام) کے مسلک پر ہی کار بند رہے۔

اس لیے نماز جمعہ کے بعد چھ رکعت سنت ہی ادا کرے تاکہ سب (فقہا) کے قول پر عمل ہو جائے اور جب جمعہ کی نماز ختم ہو جائے تو ظہر کی نماز پڑھ لے۔ اور دن رات کی خیریت کی نیت سے استخارہ کی نماز پڑھے۔ ہر جمعہ کو دو رکعت نماز استخارہ تمام سال کی خیریت کی نیت سے ادا کرے اور ہر سال دونوں عیدوں پر تمام سال خیریت کی نیت سے نماز استخارہ ادا کرے۔ حق تعالیٰ جلّ جلالہٗ اُسے تمام آفات و بلیات سے محفوظ رکھے گا، اور جس چیز میں اس کی بھلائی ہوگی وہی صورت پیدا کر دے گا۔

عرض کیا گیا کہ یہ بندۂ کمینہ نوکر ہے۔ تمام دن بیکاری میں گذرتا ہے، مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتا دیجیے جس میں مشغول رہا کروں۔ فرمایا: ”تمھیں بیکار نہیں چھوڑیں گے اس وقت تک تم درود بہت پڑھا کرو، اور سورۂ اخلاص کا بہت زیادہ ورد رکھو۔“

اُمراء سے تواضع

اس کے بعد بندۂ کمینہ نے عرض کیا کہ بعض تونگروں سے تواضع نہ کی جاتی تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں اور عداوت قائم ہوجا ہے، اگر ان سے تواضع کی جائے تو ان کے تکبر میں اور اضا ہوتا ہے اور وہ ہمیں نظر حقارت سے دیکھنے لگتے ہیں، اِ کی تدبیر کیا ہو؟

فرمایا کہ توریت کے آخر میں پانچ جملے ہیں اور اُن پر توریت ختم ہوتی ہے۔

کلُّ عالمٍ لا یعملُ بعلمِہٖ فھُوَ وَاِبلیسُ سَو وَکلُّ حُرّۃٍ لَا تَجلِسُ فِی بَیتِھَا فَھِیَ وَاللامۃ سَواءٌ وَکلُّ غَنیٍّ لَا یَاکلُ عَن مَالِہٖ فَھُوَ وَالاَجِیرُ سَواءٌ وَکلُّ فَقِیرٍ یَتَضَعضَعُ لِغَنِیٍّ لِغِنَاہُ فَھُوَ وَال سَواءٌ۔

(ترجمہ: جو عالم اپنے علم پر عمل نہ کرے وہ اور شیطا برابر ہیں۔ — جو آزاد عورت اپنے گھر میں نہیں بیٹھتی وہ ا (جس پر تہمت لگی ہو) برابر ہیں — وہ غنی جو اپنے مال کھاتا نہیں، وہ اور ایک مزدور (یا ٹھیکہ دار؟) برابر

---

[1] کتاب میں اس کا دوسرا مصرعہ لکھنے سے رہ گیا ہے۔

جو فقیر کسی دولت مند کے آگے اُس کی دولت کی وجہ سے جھکتا ہے وہ اور کتّا دونوں برابر ہیں۔)

صحبتِ انبیاء پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا تُصَاحِبُوا الْمَوْتٰی، قَالَ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ، مَاالْمَوْتٰی؟ قَالَ: الْاَغْنِیَاءُ۔

(ترجمہ: مُردوں کے پاس مت بیٹھو، کہا: یارسول اللہ مردے کون؟ فرمایا: مال دار لوگ۔)

اور دوسری حدیث میں آیا ہے: مَنْ تَوَاضَعَ الْغَنِیَّ لِغِنَاہُ یَذْھَبُ ثُلُثَا مِنْ دِیْنِہٖ (جو کسی مالدار سے اس کی دولت کی وجہ سے تواضع کرے اس کا ایک تہائی دین برباد ہوجاتا ہے۔)

ایک اور حدیث میں آتا ہے: "اَلتَّکَبُّرُ مَعَ الْمُتَکَبِّرِ صَدَقَۃٌ" (کسی گھمنڈی سے تکبّر کرنا بھی صدقہ ہے)۔

فطری تواضع بندۂ کمینہ نے عرض کیا: اگر تواضع کسی کی فطرت کے اندر ہو، دولت یا اقتدار کے لیے ہی نہ ہو؟ فرمایا: "چند موقعوں پر یہ جائز ہے۔ جہاں کسی کو دین کی ترغیب دینا ہو، یا صلۂ رحم (رشتہ برادری کی حرمت قائم رکھنے) کے لیے ہو، یا کسی کے علیحدہ ہوجانے کا اندیشہ ہو، وہاں (تواضع) جائز ہے مگر نفسانی یا دنیوی غرض اس میں نہ ہونی چاہیئے، مگر ان مواقع میں فرق کرنا بہت مشکل ہے وہی کرسکتا ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتّباع کے کمالات کو پالیا ہو۔ ضِدَّانِ بَیْنَھُمَا اَخَصُّ تَشَابُھًا فَاحْذَرْ بِھٰذَیْنِ تَشَابُہُ الْاَضْدَادِ۔ (دو مختلف چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن میں خاص مشابہت پائی جاتی ہے لہذا اضداد کے تشابہ (ایک جیسا ہونے سے) بچو)

روایت ہے کہ دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُٹھ کر چند قدم آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا، اپنے برابر بٹھایا، اور سر مبارک سے چادر اُتار کر ان کے قدموں کے نیچے بچھادی صحابہ کو بہت غیرت محسوس ہوئی۔ اس کے بعد رسول علیہ السلام نے انھیں (دحیہ کلبی کو) کلمہ توحید کی تلقین فرمائی، وہ مسلمان ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد اصحاب نے عرض کیا: "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آپ جیسا پیغمبر کہ آدمُ وَمَنْ دُوْنَہٗ تَحْتَ لِوَائِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ[1] (آدم اور باقی سب قیامت کے دن میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے) جو خاتم پیغمبراں ہے، اس کے لیے کیا مناسب ہے کہ ایک یہودی کے لیے کھڑا ہو اور اپنی مبارک چادر کو اس کے قدموں میں بچھادے؟

پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس میں ایک حکمت تھی، یہ انھیں (دین اسلام کی) ترغیب دینے کے لیے کیا گیا۔"

نیند بھی عبادت دوسری حدیث میں ہے کہ نَوْمُ الْعُلَمَاءِ عِبَادَۃٌ (عالموں کا سونا بھی عبادت ہے) کیونکہ ان کی نیند بھی حق کے لیے ہے، البتہ جو کچھ حق کے لیے نہیں وہ چاہے نماز ہی کیوں نہ ہو مذموم ہے۔ شعر:

کلیدِ درِ دوزخ است آن نماز
کہ در چشمِ مردم گذاری دراز

(وہ نماز دوزخ کے دروازے کی کنجی ہے جو تم لوگوں کو دکھانے کے لیے لمبی کرکے پڑھو)

پھر فرمایا: حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ (دنیا کی محبت ہر غلط کام کی بنیاد ہے) اسی لیے دین کی محبت ہو تو نیند بھی اچھی ہے، دنیا کی محبت ہو تو نماز، روزہ اور سب عبادتیں بے کار ہیں۔ باری تعالیٰ فرماتا ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ[2] (XVII X : ۲۴) (وہ لوگ جنھیں تجارت اور خرید فروخت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔)

---

[1] جامع ترمذی (کتاب اللباس) ۳۸۔

[1] فمن دونہ تحت لوائی۔ جامع ترمذی مناقب ۱، مسند احمد ۲۸۱/۱۔ [2] سورۃ النور ۲۴۔

اس میں سب نماز پڑھنے والوں کو "رجال" (لوگ) نہیں کہا، ان کو کہا ہے جنھیں تجارت اور خرید فروخت ذکرِالٰہی سے غافل نہیں کرتی۔ اس لیے ذکر کے ساتھ تجارت قرب (الٰہی) کا ذریعہ ہے اور ذکر دنیا کے ساتھ نماز روزہ بھی (حق سے) دوری کا باعث ہیں۔

سب سے اچھی عبادت

پھر فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی صحرا میں جا رہے تھے وہاں ایک شخص کو سویا ہوا دیکھا اس سے کہا: "اُٹھ خدا کی عبادت کر۔" اس نے کہا: "رہنے دیجیے میں نے اس (اللہ) کی سب سے اچھی عبادت کر لی ہے۔" حضرت عیسیٰؑ نے پوچھا: وہ کون سی ہے؟ اُس نے کہا: میں نے دنیا کو دنیا والوں کے لیے تیاگ دیا ہے۔"

حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا: "بس سوتے رہو، تمھارا سونا بھی (دوسروں کی) عبادت سے اچھا ہے۔"

گِردِ اُو گَرد و پادشاہی کن
زانِ اُو باش و ہرچہ خواہی کن

(تم اُس (حق تعالیٰ) کے گرد رہو اور بادشاہت کرو، اس کے بن جاؤ پھر جو جی میں آئے وہ کرو۔)

لہٰذا وہ بندے جنھوں نے اپنی (دنیوی) غرض کو ترک کر دیا ہے وہ جو کچھ بھی کریں ان پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔

فکر و مراقبہ

فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جو کوئی نیا مسلمان ہوتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مواخاۃ (بھائی بندی کا رشتہ) کسی قدیم مسلمان کے ساتھ کر دیتے تھے تاکہ اسے فرماں برداری اور تسلیم (خود کو سونپ دینے) کی عادت پڑ جائے۔ ایک دن ایک بدّو مسلمان ہوا اس کی مواخاۃ حضرت سلمان فارسیؓ سے کر دی۔ سلمان فارسی اُسے اپنے گھر لے گئے۔ عشاء کی نماز پڑھ کر حضرت سلمان بستر پر دراز ہو گئے، اور وہ بدّو رات بھر عبادت کرتا رہا۔ صبح کو حضرت سلمانؓ نے اسی عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی۔ پیغمبرؐ نے بدّو سے دریافت کیا کہ اس نے سلمانؓ کو کیسا پایا؟ بدّو نے عرض کیا: فی اللیل جیفۃٌ وفی النھار بطّال۔ (یعنی ساری رات مردے کی طرح پڑے رہے اور صبح کو بے وضو نماز پڑھی)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ تامّل فرمایا، تو حضرت جبریل یہ آیت لے کر نازل ہوئے:

الذین یذکرون اللہ قیاماً وّقعوداً وّعلٰی جنوبھم ویتفکّرون الخ (آل عمران: ۱۹۱)

اس آیت نے بتایا کہ سلمانؓ ساری رات حالتِ فکر (مراقبے) میں رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تفکّرُ ساعۃٍ خیرٌ من عبادۃِ سنۃٍ (ایک گھڑی فکر کرنا پورے سال عبادت کرنے سے اچھا ہے) ایک روایت میں ستّین سنۃً (ساٹھ سال) بھی آیا ہے۔

پس حاصل کیا نکلا؟ جب اس (اللہ) کے ساتھ رہو گے تو چاہے بستر میں پانو پھیلاؤ، چاہے بازار میں گھومو، خواہ سیر کرو، یہ سب قرب (الٰہی) ہے، اور جو کام حق کے لیے نہ ہو خواہ نمازیں پڑھے یا روزے رکھے یا تواضع کرے یہ سب بُعد (دوری) ہے۔ ان سب باتوں کا ماحصل ایک ہی ہے:

گِرد او گَرد و بادشاہی کن
زانِ اُو باش و ہرچہ خواہی کن

جب تم اس کے ہو گئے تو پھر جو چاہو کرو، کسی کا قابو تم پر نہیں چل سکتا۔

یکسوئی میں خلل

فرمایا: "ایک درویش تھے اُن کے گھر میں بیٹا پیدا ہوا۔ دوست احباب مبارک باد کے لیے آنے لگے، وہ درویش خاموش رہا۔ لوگوں نے کہا: تم خوش کیوں نہیں ہوتے، تمھارے گھر میں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ اُس نے کہا: "آپ لوگ ٹھیک کہتے ہیں، روزی دینے والا تو خدا ہے، مگر درویش کے گھر میں اگر ایک پرندے کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے تو اس کی توجہ بٹ جاتی ہے اور اس کی یکسوئی میں خلل پڑتا ہے۔"

ایک شخص الاسلام برہان الدین رحمۃ اللہ علیہ کا مرید تھا۔ ایک دن حضرت شیخ نے فرمایا: بابا کیا تم شادی نہیں کروگے؟ اس نے عرض کیا: "مخدوم میں تو اپنے گھر میں ایک چڑیا کا بچہ بھی نہیں پالوں گا تاکہ اس کے دانے کی فکر میں میری یکسوئی برباد نہ ہو۔" اس بات پر حضرت شیخ بار بار اس کو شاباش کہتے تھے کہ بہت اچھی بات کہی۔

ترک کی قوت

دیکھو مردانِ خدا ذرہ بھر تعلق (دنیا کا) اپنے ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتے۔ توحید، تجرید اور تفرید کا تو یہ حال ہے، اور سارے عالم کا بوجھ اپنے دل پر لیے رہتے ہیں، اس (ترک) کی قوت سے سب دنیا والے سدا ان کی حمایت میں رہتے ہیں۔

پہلے مرد بنو

ایک بار ایک شخص نے حضرت برہان الدین رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ "حضرت میں نکاح کرنا چاہتا ہوں۔" حضرت نے فرمایا: "بابا پہلے مرد بنو، اس کے بعد اگر نکاح کروگے تو بیوی (تمہارے مشاغل میں) رکاوٹ نہیں بنے گی۔ مگر جب تک دین کے راستے میں مرد نہیں بنتے خود تمہارا نفس ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے، بیوی کے مزاحم ہونے کی تاب کہاں لاسکوگے، البتہ جو شخص مرد (خدا) بن گیا اسے ایک عورت ہو یا چار ہوں، بلکہ اگر کنبے کے ہزار افراد بھی ہوں، راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ ہمارے پیغمبرؐ کی نو بیویاں تھیں اور حضرت داؤدؑ کی سو تھیں، حضرت سلیمانؑ کی ہزار تھیں، لیکن یہ سب شریعت میں ثابت قدم تھے اور دین کے راستے میں مرد تھے، کوئی بھی ان کے لیے رکاوٹ نہ بن سکا۔ بعض لوگ کہتے ہیں ہم کیا کریں، اگر ہمارے پیچھے اتنے کھانے والے نہ ہوں تو ہم راہ حق پر چلیں اور بس اسی کا دھیان رکھیں۔ یہ غلط ہے۔ تم سب کو حق تعالیٰ کے سپرد کردو اور اس کی راہ پکڑو پھر دیکھو کہ وہ سب کو روزی پہنچاتا ہے یا نہیں۔ یہ سب تو بہانے ہیں۔ تم خود اپنے نفس کے قیدی ہو اپنی نفسانی خواہشوں کو کچل دو، اگر سارا عالم بھی تمہارے ذمہ ہو گا تب بھی وہ رکاوٹ نہیں بنے گا ساری مزاحمت تو خود نفس کی ہے۔ أَعْدَىٰ عَدُوِّكَ النَّفْسُ الَّتِي بَيْنَ جَنْبَيْكَ (تمہارا سب سے بڑا دشمن تو نفس ہے جو تمہارے دو پہلوؤں کے درمیان ہے)۔

تم اس پر قابو پالو اور راستے سے پچھاڑ دو تو سب سے چھوٹ جاؤگے۔ کسی بزرگ نے کیا خوب کہا ہے:

لَوْكَانَ الْبَرُّ بِالدَّارِ وَالنَّاسُ كُلُّهُمْ عِيَالِيْ
وَاللّٰهِ لَا أُبَالِيْ (اگر ساری دنیا میرے گھر میں ہو اور ساری مخلوق کی پرورش کا میرا ذمہ ہو جائے تو بھی خدا کی قسم مجھے پروا نہیں ہوگی)۔

ذرا غور کرو کہ کیا بات کہی ہے اور یہ کیسا یقین ہے:

کنگھی کے آداب

فرمایا: شیخ الاسلام برہان الدین رحمۃ اللہ علیہ وضو کرنے کے بعد تین دوگانے پڑھتے تھے ایک تحیت وضو، دوسرا برائے استخارہ اور تیسرا کنگھی کرنے کے لیے۔ تحیت وضو کے بعد یا استخارہ کے بعد یا تینوں دوگانے ادا کرکے کوئی کام شروع کرتے تھے۔ کنگھی کرنے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا، ہر نماز کے بعد کنگھی کیا کرتے تھے، خصوصاً فجر کی نماز پڑھ کر۔ البتہ عصر کی نماز کے بعد کبھی کنگھی کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ کنگھی کھڑے ہو کر یا راستے میں چلتے ہوئے نہیں کرنی چاہیے۔ مگر یہ کہ اس کی ضرورت ہو۔ جو کنگھی استعمال کی جاتی ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں دینی چاہیے یہ کہتے کہ اس سے عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔

وظیفے کے آداب

اور شیخ سے جو وظیفہ (پڑھنے کو) ملے وہ کسی اور کو نہ بتائے، ورنہ نقصان اٹھائے گا اگر کوئی پوچھے کہ شیخ نے تم سے کیا فرمایا ہے؟ تو یوں کہہ دے کہ "کچھ چیز پڑھنے کو بتادی ہے۔" پھر کوئی پوچھے کہ کیا چیز بتائی ہے؟ تو کہہ دے کہ بتانے سے مجھے منع کر دیا ہے۔ بتائی نہیں چاہیے۔ کسی دوسرے کا بتایا ہوا کوئی ورد نہیں کرنا چاہیے اور نہ کسی دوسرے کے کہنے سے شیخ کا بتایا ہوا وظیفہ ترک کرنا چاہیے کوئی (نفلی) روزہ یا نماز یا دعا اپنی طرف سے اختیار نہ کرے، اس راہ (سلوک) میں اپنی پسند بھی حجاب بنتی ہے یوں کہ

اپنی پسند میں نفس اور شیطان کو دخل کرنے کی گنجائش ملتی ہے اور اس سے ظلمت پیدا ہوتی ہے البتہ شیخ کا فرمان بجالانا ضروری ہے، اس میں ظلمت اور نفس اور شیطان کو دخل نہیں ہوتا اور (شیخ کی) فرماں برداری سے نور پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے مرید کو اپنے اختیار سے باہر نکل آنا چاہیئے۔ دوسرے کھانا بغیر وضو کیے نہیں کھانا چاہیئے۔ وضو میں بڑی برکتیں ہیں۔

حضرت غریب کا معمول

کبھی ایسا ہوتا تھا کہ خدام حضرت شیخ کی خدمت عرض کرتے تھے کہ کھانا تیار ہے وہ فرماتے تھے: "بابا مجھے وضو کیے ہوئے بہت دیر ہو گئی" پھر نیا وضو کرتے تھے اور وہ تینوں دوگانے پڑھتے تھے (جن کا پہلے ذکر ہوا) پھر کھانا طلب فرماتے تھے۔ شیخ کی یہ سب باتیں اور اعمال مریدوں کی تربیت کے لیے تھے۔

جماعت کے آداب

اور (نماز کی) جماعت کے پیچھے بھاگنا نہیں چاہیئے، سکون کے ساتھ جائے۔ ایک بار رسول علیہ السلام نے پوری جماعت چھوڑ دی تھی۔ جماعت کے لیے بھاگو نہیں، جتنی مل جائے اس میں شرکت کرلو۔ باقی قضا پڑھ لو۔

نفل روزے کے آداب

اور نفل روزہ کسی کے کہنے سے ہرگز نہ توڑے۔ شیخ کے کہنے سے یا جہاں کھانا مخصوص اُسی کے لیے پکا لیا گیا ہو، یا آنے والا (مہمان) عزیز شخصیت ہو تو اُس کا ساتھ دینے کے لیے افطار کرلے۔ اس میں نیت یہ ہو کہ کسی نیک انسان کے ساتھ کھانے والا بھی بخشا جاتا ہے۔ یا اگر کسی جگہ رنجش اور دشمنی کا اندیشہ ہو چاہے وہ دنیادار ہی کیوں نہ ہو، یا کسی شخص میں طمع اور انانیت ہو اُس کے ساتھ اخلاق برتنا مقصود ہو تاکہ وہ نرم پڑ جائے، جس جگہ یہ جانیں کہ رنجش نہیں ہوگی اور بدخوئی گذرے گی تو وہاں افطار نہ کریں۔

کھانے کی مقدار

بندۂ کمینہ نے پوچھا: کھانا کس مقدار میں کھانا چاہیئے؟ فرمایا: جتنا ایک آدمی کے لئے کافی ہو اور طب میں تو یہ کہا گیا ہے کہ پیٹ کو تین حصّوں میں بانٹ لے، ایک حصّہ کھانے کے لیے دوسرا پانی کے لیے تیسرا حصّہ سانس کے لیے۔ اور بعض حکیموں نے کہا ہے کہ ہر روز غذا کو (تھوڑا تھوڑا) گھٹاتا رہے۔ گیلی لکڑی دو سیر لے لیں اور جس مقدار میں وہ (روزانہ) سوکھتی رہے اُسی نسبت سے غذا کم کرتے جائیں یہاں تک کہ وہ ایک سیر رہ جائے یا اس سے بھی کم۔ پھر اُسی کو معمول بنالے۔

فرمایا: اے فلاں شخص، خاطر جمع رکھو اللہ تعالیٰ جلد ہی شرح صدر فرمائے گا، مگر اس سے ظاہری حالت مضبوط نہیں رہے گی۔

مسواک کے آداب

فرمایا: مسواک کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ نفلی روزے میں بہتر یہ ہے کہ مسواک کرلیں مگر فرض روزے میں مسواک نہ کرنا ہی اچھا ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مسواک کرنا سنت ہے، اختلاف اس میں ہے کہ یہ سنت موکدہ ہے یا غیر موکدہ۔ اس لیے کسی نفلی (کام) کی خاطر سنّت کو ترک نہیں کرنا چاہیئے امام شافعیؒ کے نزدیک مسواک فرض ہے۔

خدمتِ شیخ میں حاضری کے آداب

پھر کچھ بات صحبت (میں حاضری) کی نکلی کہ بعض آنے والے کسی دنیا کے کام سے آتے ہیں اُسے پورا کرتے ہیں اور ضمناً یہ بھی چاہتے ہیں کہ (درویش کی) صحبت بھی میسّر آجائے۔ جو چیز اصل (مقصود) ہے وہ ضمناً کیسے مل سکتی ہے؟ یہ لوگ وقت بے وقت بھی نہیں دیکھتے۔ جو نیا آنے والا ہے جسے (کسی کی) صحبت نہیں ملی ہے وہ تو خیر یہ نہیں سمجھتا، مگر جسے صحبت مل چکی ہے وہ بے وقت کیوں آتا ہے؟

یہ شکستہ (شیخ زین الدینؒ) اپنی ارادت کے ابتدائی دور میں، کہ اس وقت تک (شیخ کی) صحبت نہیں ملی تھی ایک دن فجر کی نماز کے بعد حضرت شیخؒ کے

گھر پہنچ گیا، خادم نے حضرت کو اطلاع دی پھر باہر آکر بتایا کہ حضرت شیخ اشراق کی نماز پڑھنا چاہتے ہیں اور اس کا وقت گذرا جا رہا ہے کیا تم دو گھڑی بیٹھو گے یا کوئی جلدی کا کام ہے؟ اس فقیر نے کہا: بندہ صرف ملاقات کے لیے حاضر ہوا ہے۔ حضرت شیخ فارغ ہو جائیں، اس کے بعد اگر مجھے طلب فرمائیں گے تو حاضر ہو جاؤں گا خادم نے یہی بات حضرت شیخ سے جا کر کہہ دی، وہ خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔

قتلق خاں کا دبیر (منشی) ملک عالم بہت ہی نیک انسان تھا۔ ایک دن وہ حضرت شیخ کے جماعت خانے میں حاضر ہوا۔ خادم نے آپ کو اطلاع دی اور باہر آکر کہا کہ حضرت شیخ فرماتے ہیں میں چاشت کی نماز کے لیے وضو کر رہا ہوں، کیا تمھیں جلدی ہے یا کچھ دیر انتظار کر سکتے ہو؟ کہ میں فارغ ہو جاؤں۔ ملک عالم دبیر نے کہا: یہ بندہ صرف ملاقات کے لیے حاضر ہوا ہے۔ حضرت شیخ چاشت سے، نفلوں سے، اوراد سے، فارغ ہو جائیں مجھے ان کے معمولات میں خلل انداز ہونا نہیں ہے اس کے بعد اگر وہ طلب فرمائیں گے حاضر ہو جاؤں گا ورنہ اس پلید کتے کی گردن پکڑ کر باہر نکال دیں۔ حضرت شیخ اس کتے سے مشورہ کیوں فرما رہے ہیں؟ میرے لیے یہی (فخر) کافی ہے کہ حضرت کے ذہن میں یہ بات آئے کہ فلاں شخص آیا تھا۔

الغرض — فجر کی نماز پڑھیں پھر آئیں، خادم کو اطلاع دیں، اشراق جماعت خانے میں آکر پڑھیں، پھر طلبی کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔ یا ظہر کی نماز سے پہلے آئیں، ظہر جماعت خانے میں پڑھیں۔ اس وقت شیخ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے یہی دو وقت فراغت کے ہوتے ہیں مقصد یہ کہ مشغولی کے اوقات میں اور بے وقت زحمت نہیں دینی چاہیے۔

وسوسوں کا علاج

پھر بندۂ کمینہ نے عرض کیا کہ وسوسے سخت مزاحمت کرتے ہیں۔ فرمایا کہ ہر نماز کے بعد پانچ مرتبہ معوذتین (قل أعوذ برب الفلق اور قل أعوذ برب الناس) پڑھا کرو اور سینے پر ہاتھ پھیر لیا کرو۔ جب کوئی وسوسہ دل میں آئے اس وقت بھی پڑھ لو اور اپنے شیخ کی پناہ طلب کرو اور "وقت پاک شیخ" کثرت سے کہا کرو۔

فرمایا: یہ سب مریدوں کے ہتھیار ہیں۔ سب سے بھاری ہتھیار یہی (وقت پاک شیخ) ہے پھر وتر کے لیے اگر کسی کو بھروسا ہو کہ آخر شب میں ادا کر سکے گا تو جو بھی نوافل و اوراد اس کے معمول ہیں انھیں عشاء کی نماز کے بعد ادا نہ کرے بلکہ سو جائے۔ تاکہ آخر شب میں وہ نوافل اور اوراد ادا کر سکے۔ اگر آخر شب میں بیدار نہیں ہو سکتا تو صرف وتر پڑھ کر سو جائے۔

اتباع سنت کمال اولیاء ہے

کچھ دیر یہ گفتگو ہوئی کہ اولیاء اللہ قیام قیامت تک خلق خدا کی ہدایت و ارشاد کا کام کرتے رہیں گے جیسا کہ اس آیت میں ہے: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ أَدْعُوْ إِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (سورۂ یوسف ۱۰۸)

اس میں لفظ اتبعنی رحمت عام ہے، قیام قیامت تک رسول علیہ السلام کی پیروی کرنے والے اتباع سنت کا کمال حاصل کرتے رہیں گے اور طالبوں کو بصیرت سے دعوت دیتے رہیں گے۔ مگر حق تعالیٰ ان کو ظاہر میں اور ہوا پرست لوگوں کی نظر سے محفوظ اور پوشیدہ رکھے گا۔

خدمت دین

یہ درویش جو (خانقاہوں میں) بیٹھے ہیں، دین کی خدمت کے لیے بیٹھے ہیں تاکہ طالبان حق ان سے ملیں۔ ان کا مقصد لوگوں کو جمع کرنے یا لنگر بانٹنے سے یہ ہوتا ہے کہ کبھی (اسی بھیڑ میں) کوئی شہباز بھی ان کے دام میں آجاتا ہے۔

خاندان غیب

حضرت شیخ (برہان الدین غریب) سے یہ سنا گیا ہے: یا داؤد ی أتِ لی تابِعًا فکُن لہ خادمًا (اے داؤد کوئی میری پیروی کرنے والا لاؤ اور اس کے خادم بن جاؤ)۔ یہ نہیں ہے کہ ہوا پرستوں (خواہش کے بندوں) کی طلب رکھتے ہوں،

انھیں خلعت اور انعام سے نوازیں۔ یہ خاندان تو مستغنی عن الغیر" ہے۔ کسی دن اِن سے مل بھی جاتا ہے کیا ضروری ہے کہ ہر وقت کسی کو طلب کریں اور اسے بخشش دیں، اس کی خواہش کے موافق بنے رہیں۔ یہ کوئی محبت نہیں ہے کہ کپڑا یا نقدی کسی غرض سے دی جاتی ہے۔ کپڑا اور نقدی آخر کب تک؟ محبت تو وہ محبت ہے۔ جو پاکیزہ اخلاق سے ہوتی ہے۔ کسی بزرگ نے کیا خوب کہا ہے: "دوست وہ ہوتا ہے کہ اگر کبھی تم نے اس کی کوئی تکلیف دور کر دی ہے تو بقیہ زندگی میں وہ اسے کبھی فراموش نہ کرے"۔ کبھی ایک محروم فروغ کار ہی میں کچھ پالیتا ہے جس سے اس کا گذارا ہو جاتا ہے۔ فرمایا: جی ہاں، پالیتا ہے، مگر یہ اپنے اختیار سے نہیں ہوتا۔ جو کچھ اس سے کہا جائے وہی کرے کیوں کہ اپنا اختیار اِس (درویشی کی) راہ میں سخت حجاب ہے۔ سارے انبیاء اور اولیاء نے اپنے اختیار کو ترک کرنے کی کوشش کی ہے۔

چار وزیر پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ میرے چار وزیر ہیں۔ دو عالم بالا میں اور دو زمین پر۔ جبریل و میکائیل تو آسمان میں ہیں، باطنی اُمور میں ان سے مشورہ کرتا ہوں، زمین پر ابو بکرؓ اور عمرؓ ہیں، ظاہری اُمور میں ان سے مشورہ کرتا ہوں۔ یہ سب باتیں "ترکِ اختیار" کی ہیں، جب "مشورہ" درمیان میں آگیا، اختیار نہیں رہا۔ شرعی قوانین بھی ترکِ اختیار کے لیے بھیجے گئے ہیں تاکہ خلق کو اُس کے اختیار سے ہٹا کر فرماں برداری کی راہ پر لگایا جائے۔

(جاری ہے)

بقیہ صفحہ

کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ جس میں تمام کلمہ گو شامل ہیں جو نیکی و بدی میں عمر گزارتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں۔ اگر طاقت ہوئی تو حج و زکوٰۃ کی ادائیگی بھی کرتے ہیں مگر نفس کی اصلاح کی طرف ان کی توجہ نہیں ہوتی ہے۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ سے ناواقف ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غصہ، شہوت، غیبت، ریا، سٹے بازی بے ایمانی، فریب جھوٹ اور قتل و زنا وغیرہ کے بھی مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ انسان اور آدھے حیوان ہوتے ہیں اور اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اگر فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ (جس نے اس دنیا میں ذرہ برابر بھی نیکی کی وہ آخرت میں اس کو دیکھ لے گا) کے بموجب ان کی نیکیاں زیادہ ہوئیں تو وہ مزہ میں رہے اور اگر برائیاں زیادہ ہوئیں تو بھگتان کے بعد جنت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

روز و شب در جنگ اندر کشمکش
کردہ چالش اولش با آخرش

ایسا شخص رات و دن نیکی، بدی کی کشمکش میں رہتا ہے۔ روحانیت کے تقاضے سے نیک قدم آگے بڑھاتا ہے پھر نفسانی خواہش جس کو وہ سمجھتا نہیں اس سے ریا، غصہ، عجب، تعصب، چوری، زنا، قتل، بے ایمانی، غیبت، جھوٹ، فریب وغیرہ سرزد کراتی ہے غرض کہ ایک مقابلہ کی سی کیفیت رہتی ہے اس کا قدم کبھی نیکی میں آگے بڑھتا ہے اور کبھی پیچھے ہٹتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے جس کی جانب عارف باللہ لسان الحق مولانا شاہ تراب علی قلندر کاکوروی قدس سرہٗ اشارہ فرماتے ہیں۔

نفس کی اصلاح کر پہلے ریاضت سے تراب
بے شکستِ نفسِ امّارہ ظفر ملتی نہیں

اردو گلستاں

حضرت خواجہ حسن نظامی کا منتخب روزنامچہ

۱۳ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۳۰ء

یوم جمعہ۔ ریل دھلی

ذاتی } صبح چاندہ اسٹیشن پر مسٹر قمر ما بھی رخصت ہوگئے اور میں گاڑی میں اکیلا رہ گیا۔ معلوم ہوا جس درجہ میں میں ہوں وہ عورتوں کا درجہ ہے۔ ایک اسٹیشن پر ایک انگریز اور ایک ہندوستانی میرے درجہ میں آنے لگے اور لیڈیز لکھا ہوا دیکھ کر گھبرا کر پیچھے ہٹے۔ میں نے کہا آجائیے میں بھی عورت اور آپ بھی موجودہ زمانہ کے حالات کے سبب عورت ہی ہیں۔ وہ ہنسنے لگے اور گاڑی میں آگئے۔ میں نے کہا رات بھر اس درجہ میں مردانہ رہا تھا۔ معلوم نہیں قاضی پیٹھ جنکشن پر ہمیں کیوں اس درجہ میں بٹھا دیا گیا۔ انگریز نے کہا رات کو کسی نے خیال نہ کیا ہوگا۔ میں نے کہا مجھ کو دنیا میں دن کے وقت بھی رات کی تاریکی ہی نظر آتی ہے۔ انگریز میری اس بات کو نہیں سمجھا اور اس نے کہا آپ کا کیا مطلب ہے؟ میں نے کہا یہ مطلب ہے کہ اب کہیں یہ زیادہ بھاگنے والی گاڑی کچھ دیر ٹھہرے تو میں مردانہ درجہ میں چلا جاؤں گا۔ زمانہ عورتوں کی آزادی کا ہے وہ اب مردوں سے بھی بڑھ گئی ہیں بلحاظ تعداد و بلحاظ اوصاف مردانگی۔ دہلی میں روز دیکھتا ہوں سینکڑوں عورتیں پولیس کا مقابلہ کرتی ہیں لہٰذا عورتوں کو مردانہ درجہ میں اور مردوں کو زنانہ درجہ میں رہنا چاہیئے کہ اب دونوں کی حالت بدل گئی ہے۔ انگریز یہ بات سن کر بہت ہنسا اور اس نے کہا آپ کون ہیں؟ میں نے کہا۔ سی۔ پی میں ہوں اس لئے گونڈ ہوں اور بھیل ہوں۔ سیکنڈ کلاس میں ہوں اس لئے امیر ہوں۔ زنانہ درجہ میں ہوں اس لئے عورت ہوں اور ایک انگریز سے باتیں کر رہا ہوں اس لئے خیر خواہ سرکار ہوں اور لباس کے اعتبار سے فقیر ہوں۔ عقیدہ اسلامی رکھتا ہوں اور مسلمان ہوں۔ دہلی میں گھر ہے۔ حیدرآباد سے آرہا ہوں۔ وہ انگریز دیر تک دلچسپ باتیں کرتا رہا۔ وہ گیا تو تین چار ہندوستانی پولیس کے افسر آگئے جن میں دو مسلمان تھے اور دو برہمن ایک مسلمان احمد اللہ صاحب مجھ سے بھی واقف تھے۔ اٹارسی تک خوب باتیں ہوئیں۔ اٹارسی پر میں نے زنانہ درجہ چھوڑ دیا اور مردانہ درجہ میں آگیا۔ آج بھی ڈائننگ کار سے ہندو کھانا منگا کر کھایا۔ چھوٹی چھوٹی پیالیوں کا بڑا ہی لطف آیا۔ یہ قوم جب ہندوستان کی بادشاہ ہو جائے گی تب بھی آدھی مرچ سے ایک پھلکا کھایا کرے گی اور دنیا میں یہی گورنمنٹ ایسی ہوگی جس کو کبھی مالی مشکل پیش نہیں آئے گی اور سب سے زیادہ دولتمند گورنمنٹ سمجھی جائے گی۔

تیرتھ رام صاحب فیروز پوری کا ایک ناول جاتے وقت پڑھا تھا۔ ایک ناول قاضی پیٹھ سے لیا تھا وہ اٹارسی تک ختم کیا۔ بھوپال سے ایک اور ناول تیرتھ رام صاحب کا خریدا۔ انھوں نے یورپ کے ناولوں کے بہت اچھے ترجمے کئے ہیں۔

کہیں کہیں پنجابی محاورے ہوتے ہیں۔ لیکن ترجمہ بہت صاف اور سلیس کرتے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یورپ کے طرز تحریر کو اردو میں ظاہر کر دیتے ہیں اور اس سے بڑا لطف آتا ہے۔ میں ان کے ناول ہمیشہ سفر کے زمانہ میں پڑھا کرتا ہوں درجہ میں ایک ایرانی صاحب شیراز کے رہنے والے ہیں جو دہلی جا رہے ہیں اور ایک شاہجہانپوری صاحب ہیں جو عرصہ سے حیدرآباد میں رہتے ہیں وہ آگرہ جا رہے ہیں ریل میں نماز کا بڑا لطف آتا ہے۔ کیونکہ ریل کا قبلہ بدلتا رہتا ہے۔ کھڑے ہوئے مغرب کے رُخ۔ اور ہو گئے تھوڑی دیر میں مشرق کے رُخ۔ شاہجہانپوری صاحب نے اس مشکل کا ذکر کیا۔ میں نے کہا یہ ریل تو شیطان ہے اور بقول قادیانی دجال کا گدھا ہے اس کا خیال نہ کیجئے یہ تو جان بوجھ کر خدا کی طرف سے ہمارا منہ پھیرنا چاہتی ہے مگر یہ نہیں جانتی کہ ہمارا خدا تو ہر سمت موجود ہے اور خود اس نے کہہ دیا ہے کہ تم جس رُخ بھی متوجہ ہو گے خدا اس رُخ موجود ہوگا۔ میں تو شمال و جنوب اور مشرق و مغرب اور تحت و فوق ہر سمت سجدہ کر سکتا ہوں رات کو خوب سویا۔ سردی بڑھ گئی۔

۱۴ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۶ دسمبر ۱۹۳۰ء
یوم شنبہ۔ مقام دہلی

سیاسی } گول میز کانفرنس لندن کا یہ نتیجہ نکلتا معلوم ہوتا ہے کہ گئے۔ ٹھہرے۔ کچھ کھایا۔ کچھ پیا۔ بیٹھے۔ الفاظ کے بادل گرجے۔ لہجہ کے جوش کی بجلیاں چمکیں۔ مگر پانی کی ایک بوند نہ برسی۔ اُٹھ کھڑے ہوئے اور سوکھے کپڑے ساتھ لے کر گھروں کو چلے آئے روٹیاں کھائیں دن بہلائے۔ کپڑے پھٹے گھر کو آئے۔

قومی } ہز ہائی نس نواب صاحب بہاولپور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تشریف لے گئے تھے اور اس سال انجمن حمایت اسلام کی صدارت بھی وہی کریں گے۔ عباسیہ خاندان کی یکتا یادگار ہیں۔ علوم کی سرپرستی ان کا خاندانی ورثہ ہے۔

تلقین حیات } تجارتی مقابلہ سے زندگی اور عمل کا جوش پیدا ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ کامیاب وہ تاجر ہوتا ہے جو اپنی عقل اور دماغ سے تجارت کا نیا میدان پیدا کرے۔

رمنی سقہ } بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں رہتا ہے۔ اس کا باپ بھُریا سقہ میرے گھر میں پانی بھرتا تھا۔ اور میری پیدائش سے جوانی تک وہی پانی بھرتا رہا۔ اب اس کے بعد رمنی پانی بھرتا ہے۔ ۳۰ سال سے زیادہ عمر ہے۔ میرے سامنے چھوٹے سے بڑا ہوا ہے۔ گویا میرے گھر کے متعلقین کا ایک رکن ہے۔ میں نے اس کے باپ بھُریا کی اپنے خانگی متعلقین کے ساتھ تصویر بھی کھنچوائی تھی۔

آپ بیتی } صبح نو بجے دہلی اسٹیشن پر پہنچا۔ سید ابن عربی اور پروفیسر شمشاد علی صاحب موجود تھے سیدھا گھر میں آیا۔ بچوں سے ملا۔ علی کو کئی دن سے بخار ہے۔ ریل میں دو توس کھائے تھے اس لئے کھانا نہیں کھایا۔ سیدھا دفتر میں آیا اور کام شروع کر دیا۔ تین بجے تک بہت سا کام ہو گیا۔ مولانا غلام محمد صاحب تشریف لائے ہوئے تھے ان کے ہمراہ دہلی گیا۔ واحدی صاحب کے ہاں احباب جمع ہوئے۔ پرنس محمد بدر الدین نظامی بھی آئے۔ سب کے ساتھ ہفتہ کی دعوت میں شریک ہوا۔ حیدرآباد کے طاعون کا ذکر آیا۔ میں نے کہا بڑی شدت تھی۔ ہزاروں باشندے جنگل میں پڑے ہوئے ہیں۔ مولوی مظہر اللہ ظہوری نظامی اور ان کی بیوی قمر بانو نظامی بھی جنگل میں ایک چھپر ڈال کر ٹھہرے ہیں۔ میں ان سے ملنے گیا تو چھوٹے چھوٹے بچوں کو جنگل میں دیکھ کر میرا جی بے چین ہو گیا اور میں نے نہایت حضوری اور یکسوئی سے دعا مانگی کہ خدا تعالیٰ اس قہر کو حیدرآباد سے دور کرے۔ مظہر اللہ کے بچے اور وہ خود دونوں میاں بیوی شریک سلسلہ ہونے کے سبب مجھ کو حقیقی اولاد سے زیادہ عزیز ہیں اور ان کی پریشانی گویا میرے بچوں کی پریشانی ہے۔ یہی حال دوسرے انسانوں کا ہے جو جگہ جگہ سڑکوں پر اپنا اسباب اور عورتوں اور بچوں کو لئے ہوئے جنگلوں کو جا رہے تھے۔ ان کی تکلیف کا بھی مجھ پر بہت زیادہ اثر ہوا۔ طاعون سارے ہندوستان

سے جاتا رہا۔ خبر نہیں حیدرآباد سے کیوں نہیں جاتا؟ وہاں ہر سال یہ مصیبت آتی ہے۔

مولوی محمد یعقوب قریشی نظامی کا ذکر ہوا کہ انھوں نے ایک نظامیہ انجمن حیدرآباد میں بنائی ہے۔ مگر کہتے تھے کہ لوگوں کو دلچسپی نہیں ہوتی۔ میں نے کہا بڑے لوگوں کو دلچسپی نہیں ہوگی چھوٹوں سے کام لینا چاہیئے

سالکہ خاتون نظامی نے اپنے بادشاہ اعلیٰحضرت حضور نظام کی سالگرہ کی خوشی میں ایک زنانہ نمائش کا انتظام کیا تھا۔ میں نے اس اچھے کام کی تائید میں ایک تحریر بھی ان کو لکھ کر دی تھی وہ اس نمائش کے ذریعہ نظامیہ خواتین میں اجتماع پیدا کرنا چاہتی ہیں اور میرے اسکول کی امداد بھی مد نظر ہے۔

مولانا عبدالمجید صاحب ناظم انجمن صفوۃ الاسلام کا ذکر بھی آیا۔ میں نے کہا وہ مجھ سے ملنے آئے تھے بہت پر جوش کام کرنے والے ہیں۔

نواب فخر یار جنگ بہادر معتمد فنانس کی نیکی اور تہجد گزاری اور عملی مستعدی کا تذکرہ بھی رہا اور خان فضل محمد خان صاحب ناظم تعلیمات کے محاسن کا ذکر بھی ہوا۔ میں نے کہا وہ کچھ بیمار تھے ان سے ملاقات نہیں ہوسکی۔

پرنس محمد بدر الدین نظامی کی غزل خوانی اور رضاء اللہ صاحب انجینیر کی بذلہ سنجی اور سید شوکت صاحب اور آغا محمد طاہر صاحب کی پرلطف باتوں میں آٹھ بج گئے۔ آٹھ بجے بھیا کے مکان پر گیا وہاں مشتاق احمد صاحب وجدی۔ ایم اے اور ڈاکٹر محمد عمر صاحب اور رحمانی صاحب اور میرزا محبوب بیگ صاحب اور غزالی خاں صاحب وغیرہ احباب جمع ہوئے زیادہ تحریری کام کرنے کی وجہ سے رات کو نیند نہیں آئی۔ دماغ میں خشکی ہوگئی ہے۔ رات کو بمشکل صرف دو گھنٹے سویا۔

۱۵ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۷ دسمبر ۱۹۳۰ء
یوم یکشنبہ۔ مقام دہلی

سیاسی } رات کو بھیا کے مکان پر ایک بہت بڑی آواز سنی تھی۔ صبح معلوم ہوا کہ چاندنی چوک گھنٹہ گھر کے پاس بم پھٹا تھا۔ چند آدمی زخمی بھی ہوئے۔

قومی } ہزہائی نس نواب صاحب جاورہ کا خط آیا ہے۔ میری واپسی کے بعد کی مجلسوں کی کیفیت لکھی ہے اور آخر میں نواب صاحب نے دل شاہ کے نام سے دستخط کئے ہیں۔ یہ خطاب میں نے ان کو دیا تھا۔

تلقین حیات } سردی کے موسم میں تھوڑی دیر سورج کی طرف پشت کرکے دھوپ میں بیٹھنا صحت کے لئے بہت مفید ہے۔

منشی رفیق احمد صاحب } واحدی صاحب کے دفتر میں سالہا سال سے محرری کرتے ہیں۔ دُبلا بدن ہے لمبا قد ہے گندمی رنگ ہے بہت محنتی اور فرض شناس ہیں صبح سے شام تک مسلسل کام میں مصروف رہتے ہیں۔ اتنی محنت صرف پنجابی لوگ کرسکتے ہیں مگر یہ پنجابی نہیں ہیں۔ یوپی کے ہیں جن کی کاہلی کا بہت چرچا رہتا ہے مگر منشی رفیق احمد نے اپنی مستعدی سے پنجابیوں کے سامنے یوپی کا نام روشن کر دیا ہے۔

آپ بیتی } کل رات کو اخبار انقلاب لاہور کے ایک مضمون کا ذکر تھا جو اس نے میرے خلاف شائع کیا ہے اور اس میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے مزار مقدس کی توہین بھی کی ہے۔ سید محمد ہلال صاحب پیرزادہ درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحبؒ ایک بڑا مضمون انقلاب کی تردید میں لکھ کر لائے تھے۔ میں نے کہا میں ان مخالفتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ میری ساری زندگی ایسی ہی گذری ہے مجھے جواب لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پیرزادہ ہلال صاحب نے کہا آپ اپنی ذات کے مختار ہیں۔ مگر اولیاء اللہ کی توہین ہم لوگ برداشت نہیں کرسکتے۔ میں نے کہا اس کو تو میں بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ مگر انقلاب ہمیشہ اولیاء اللہ کے خلاف لکھتا رہتا ہے۔ آپ کو پہلے اس کا خیال کیوں نہیں ہوا؟ آج کیوں خیال ہوا۔ ظاہر ہے کہ میری وجہ سے یہ جوش آیا ہے انھوں نے کہا۔ دہلی کے بہت سے مسلمان ان تحریروں سے ناراض ہیں اور تردید کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ میں نے کہا آپ کو اختیار ہے۔

میں اس جھگڑے میں دخل دینا نہیں چاہتا۔ بشیر احمد صاحب رفیق اخبار انقلاب کے ایڈیٹر کے دوست بھی موجود تھے۔ انھوں نے اس مضمون کے سلسلہ میں میرا ایک بیان لکھا۔ یعنی چند سوالات مجھ سے کئے اور میرے جواب لکھ لئے۔ آج صبح بھی چند حضرات اس سلسلہ میں میرے پاس آئے اور میں نے ان سے یہی کہدیا کہ میں اس کشمکش میں کوئی حصّہ نہیں لے سکتا۔ کیونکہ مجھے اتنی فرصت نہیں ہے۔

دس بجے پرنس محمد بدرالدین نظامی اور ان کی اہلیہ کے ساتھ حکیم محمد احمد خاں صاحب کے ہاں گیا اور گیارہ بجے بھیا کے مکان پر واپس آیا۔ ساڑھے گیارہ بجے ایسٹرن لٹریچر کمپنی کا جلسہ شروع ہوا جو ایک بجے تک ہوتا رہا۔ ڈائرکٹر اور بہت سے حصہ دار جمع تھے۔ اس کے بعد میر انوار احمد صاحب کے ہاں گیا وہاں خان بہادر نواب عبیدالرحمان خاں صاحب شروانی اور حکیم محمد الیاس خاں صاحب اور مولانا سید عبدالرؤف صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ مولانا سید عبدالرؤف صاحب سیب کے قتلے کانٹے سے کھانا ناجائز کہتے تھے۔ خان بہادر نواب صاحب نے ان کو مجبور کر کے کانٹے سے ایک قتلہ کھلایا۔ میں نے کہا اب یہ بات شائع ہو جائے گی کہ اہلحدیث مولانا نے انگریزوں کی طرح کانٹے سے کھایا۔

مغرب سے پہلے گھر میں واپس آگیا۔ بعد مغرب امرناتھ صاحب لاہوری اور ڈیرہ غازی خاں اور صوبہ بہار کے چند اصحاب۔ جو ایم اے کے طالب علم تھے ملنے آئے ان سے دیر تک گفتگو رہی پھر کچھ تحریری کام کیا۔ دس بجے سویا۔ آج بھی نیند اچھی نہیں آئی۔ صبح چھ بجے بورڈنگ ہاؤس میں آیا پارہ ۵۴ درجہ پر تھا۔ ابھی تو سردی ۳۸ درجہ تک بڑھے گی۔ رات کو تیز ہوا چلتی رہی علی کا بخار کم ہے اور سب بچے اچھے ہیں۔

آج چودھری غلام محی الدین صاحب ڈسٹرکٹ انسپکٹر تعلیمات صوبہ دہلی سے ملنے گیا تھا۔ اپنے اسکول کی نسبت دیر تک مشورہ کیا۔ وہ بہت لائق اور مستعد اور تعلیم کے ہمدرد افسر ہیں۔ حیدرآباد میں بھی رہ چکے ہیں وہاں کے حالات بھی دریافت کرتے رہے۔

۱۶ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۸ دسمبر ۱۹۳۰ء
یوم دوشنبہ مقام دہلی

سیاسی } جب کسی قوم کو جوش آجائے تو اس جوش کو ٹھنڈا کرنے کی سیاسی حکمت یہ ہے کہ وقت گزارنے کی باتیں ہونے لگیں۔

قومی } آج فلسطین کے اخبار الشوریٰ میں جو عربی زبان میں شائع ہوتا ہے شوکت علی صاحب اور سپرو صاحب کی اس گفتگو کا ذکر شائع ہوا ہے جو مصر اور فلسطین کے مسلمان لیڈروں سے ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے عرب لیڈروں نے شوکت علی صاحب کو ان کے جدید طرز عمل پر بہت ملامت کی تھی۔ آج اخبار الشوریٰ نے مفصل گفتگو شائع کر دی ہے۔

تلقین حیات } کھانا کھانے کے تھوڑی سی سونف چبالینا معدہ کے لئے بہت مفید ہے اور روحانی محنت کرنے والوں کو اس دوا سے نیند بھی آنے لگتی ہے معمولی دوا ہے لیکن بہت مفید ہے۔

منشی محمد فردوس نظامی } درمیانہ قد ہے۔ دُبلا بدن۔ گورا رنگ۔ کتابی چہرہ۔ چالیس بیالیس سال عمر۔ کتابت کا کام کرتے ہیں۔ منشی محمد دین صاحب مشہور اُستاد کے شاگرد ہیں بچپن سے یہی کام کرتے ہیں۔ اب حال میں میرے مرید بھی ہوگئے ہیں بہت خوش اعتقاد اور نیک آدمی ہیں۔ بہت تیز لکھتے ہیں اور بہت زیادہ لکھتے ہیں ان کے شاگرد بھی بہت سے ہیں۔ میرا کام سالہا سال سے کرتے ہیں۔ جب میرے اخبار جاری نہیں تھے تب میری کتابیں لکھتے تھے۔ اس کے بعد اخبارات اور رسائل لکھتے رہے۔ اب خواجہ اسکول گزٹ لکھتے ہیں۔ حاضر و غائب مخلص ہیں۔ میرے ساتھ بیعت ہونے سے پہلے سے بھی خلوص رکھتے ہیں۔

آپ بیتی } صبح سات بجے سے لے کر ڈیڑھ بجے تک

کام کرتا رہا۔ پنجاب سے امداد علی صاحب آئے ہیں۔ رنگون جا رہے ہیں۔ زید منزل میں ٹھہرے ہیں۔ ایک بچہ بھی ساتھ ہے۔ ڈیڑھ بجے دہلی گیا کچہری اور بینک کے کام کر کے واحدی صاحب کے ہاں آیا۔ آغا طاہر صاحب بیٹھے تھے انہوں نے دہلی کے ایک مشہور شاعر کا ذکر کیا جواب بہت بوڑھے ہوگئے ہیں۔ کمر بھی جھک گئی ہے کہ ایک دن شاعر صاحب آغا طاہر کے پاس آئے کمر جھکی ہوئی لکڑی ٹیکتے ہوئے اور اسی طرح کھڑے کھڑے کہا کہ میں ایک بات کہنے آیا تھا۔ بیٹھنا نہیں ہے ابھی چلا جاؤں گا۔ جو حلال خوری گھر میں کمانے آتی ہے۔ اس کو میں نے آج تک دیکھا نہ تھا۔ گھونگھٹ نکال کر آتی تھی۔ آج گھونگھٹ ہوا سے ہٹ گیا اور میں نے اس کا مکھڑا دیکھ لیا۔ بیقرار ہوگیا اور اس کے قریب جا کر کہا۔ اے بی تم مہترانی ہو یا نور جہاں ہو۔ اس نے ہنس کر منہ پھیر لیا اور کہا دیکھو دادا مجھے نہ چھیڑو۔

یہ حکایت سن کر سب ناظرین ہنسنے لگے۔ ان شاعر صاحب کی جوانی مجھے یاد ہے۔ بہت خوبصورت تھے اور بہت عاشق مزاج تھے اب جسم پر بڑھاپا آگیا ہے۔ لیکن خیال اور شوق اب تک جوان ہے اسی قسم کے شعرا کی شاعری اور باتیں مسلمان قوم کو آوارگی میں مبتلا کر دیتی ہیں اور نوجوان اپنی اخلاقی حالت کو درست نہیں رکھ سکتے۔

چار بجے پرنس محمد بدرالدین نظامی کے ساتھ حکیم محمد احمد خاں صاحب سے ملنے گیا اور مغرب کے وقت گھر میں واپس آگیا۔ علی کو آج بخار نہیں ہوا۔ ایمان خانہ میں جا کر بیٹھا۔

مستری عشقی اپنے چھوٹے لڑکے کو دم کرانے لائے۔ میں نے اس کو آج پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ ساتھ میں تل شکری کی ٹوکری بھی تھی کھانا بھی ایمان خانہ میں کھایا اور تل شکری بھی کھائی۔ اپنے لڑکے حسین سے کہا۔ یہ گول میز کانفرنس والے طرح طرح کے حق مانگ رہے ہیں۔ مجھ سے وزیر اعظم اور وائسرائے دریافت کریں کہ تم کیا چاہتے ہو تو میں تو یہی کہوں گا کہ کھانے کے بعد تل شکری۔ مگر گڑ کی ہو۔ کھانڈ کی نہیں چاہتا۔ کیونکہ کھانڈ گوری ہوتی ہے اور گڑ سانولا ہوتا ہے۔ حضرت اکبر فرما گئے ہیں۔ "گورے کو سالا بھی نہ بنانا" سب ہنسنے لگے۔

نو بجے سویا۔ تین بجے بیدار ہوا۔ لکھنے کا کاغذ نہ تھا معمولی پرچوں پر مضامین لکھے۔ ہمارے بزرگ تو ہڈیوں اور ٹھیکروں پر لکھ لیتے تھے۔ قرآن مجید بھی شروع میں اسی طرح لکھا جاتا تھا۔ سات بجے بدر شاہ کی اہلیہ کو دم کر کے بورڈنگ ہاؤس میں آیا۔ سردی چار درجے بڑھ گئی۔ کل پارہ ۵۴ درجہ پر تھا اور آج ۵۰ درجہ پر ہے۔

میری چھوٹی لڑکی کوثر چلتی ہے تو ہر قدم پر بسم اللہ کہتی جاتی ہے۔ شاید اس کو اپنی حفاظت کا بہت فکر ہے۔ اس کی زبان سے بسم اللہ سنتا ہوں تو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ آج پچھلی رات کو سوتے سوتے بھی اس کی زبان سے بسم اللہ نکلی۔

۱۷ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۹ دسمبر ۱۹۳۰ء
یوم سہ شنبہ۔ مقام دہلی

سیاسی } آج خبر آئی ہے کہ ہندوستان کا وائسرائے کسی والیٔ ریاست کو بنانے کی تجویز ہو رہی ہے اگر ایسا ہوا تو تاریخ میں انگریزوں کی سب سے بڑی غلطی ہوگی کیونکہ ہندوستان کے والیان ریاست ذاتی اعتبار سے کیسے ہی اچھے اور کیسے ہی برے ہوں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے۔ جو ہندوستان کے موجودہ جذبات جمہوریت کی تسلی یا رہنمائی کی قابلیت رکھتا ہو۔ مگر گورنمنٹ نوشتۂ تقدیر کے سامنے عاجز ہے۔

قومی } رنگون سے ایک روزانہ اخبار تیر شائع ہوتا ہے برما کے پایہ تخت میں اردو زبان کا روزانہ اخبار قوم کی ایک سب سے بڑی خدمت ہے۔ جن لوگوں نے یہ اخبار کثیر روپیہ خرچ کر کے جاری کیا ہے وہ تمام قوم کے شکریہ اور امداد کے مستحق ہیں۔ آج اس اخبار میں مہر جی کا ایک بیان شائع ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان درویش خدا پرستی کے جذبات میں سرشار ہو کر

اپنے مریدوں کے سامنے ایک تقریر کر رہا ہے۔

تلقین حیات } ہندوستان میں بہت سے لوگ میز کرسی اور قالین اور چاندنی دونوں تہذیبوں کی چیزیں اپنے گھروں میں رکھتے ہیں۔ ایک مفلس اور محکوم قوم کے لئے یہ دوہرا خرچ کسی طرح مناسب نہیں ہے اور اس سے مفلسی ترقی کرتی ہے۔

جری صاحب } سید عین الحسن جری امروہہ کے رہنے والے ہیں۔ شیعہ عقاید رکھتے ہیں۔ سادات مشائخ کی اولاد میں ہیں۔ دہلی میں سالہا سال سے رہتے ہیں۔ میانہ قد ہے۔ سانولہ رنگ ہے۔ دُبلا بدن ہے۔ اُردو اور عربی دونوں خط بہت اچھے لکھتے ہیں۔ دہلی میں اوّل درجہ کے خوشنویس کاتب مانے جاتے ہیں۔ نقاشی اور مصوری بھی جانتے ہیں۔ عربی اور انگریزی سے بھی کچھ واقف ہیں۔ میری کتابوں اور اخباروں اور رسالوں اور پوسٹروں وغیرہ کا کام شروع سے آج تک کرتے رہتے ہیں۔ ایک اخبار بنی فاطمہ بھی جاری کیا تھا اور ایک ظریف اخبار بھی شائع کر چکے ہیں۔ ان کے ایک مرحوم بھائی قوی صاحب ان سے بھی زیادہ صاحب کمال تھے۔ افسوس ان کی عمر نے وفا نہ کی۔

آپ بیتی } دو بجے تک کام کر کے دہلی گیا۔ سید ابن عربی اور روجہ اور زید بھی ساتھ گئے۔ مغرب کے بعد گھر میں واپس آیا۔ سارا وقت واحدی صاحب کے ہاں گزرا۔ خدا کے فضل سے اب سب بچے تندرست ہیں۔ میری صحت بھی اچھی ہے۔ آج دھولپور سے ملک غلام ربانی خاں صاحب ٹوانہ ملنے آئے تھے۔ کچھ دیر ٹھہر کر چلے گئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ خوشحال احمد وکیل جو میرے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے دھولپور میں جا کر مرتد ہو گئے ہیں۔ دس بجے سویا تین بجے بیدار ہوا۔ سردی ایک درجہ اور بڑھی۔ پارہ آج ۴۹ درجہ پر ہے۔

---

۱۸ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۰ دسمبر ۱۹۳۰ء
یوم چہار شنبہ۔ مقام دہلی

سیاسی } اخبار مدینہ بجنور اور الجمعیۃ دہلی نے مسٹر محمد علی کے سفر لندن کے خلاف اور ان کی موجودہ اور گزشتہ سیاسی زندگی کی نسبت ایک بڑا مضمون شائع کیا ہے۔ ابھی حال میں جو تقریر مسٹر محمد علی نے لندن کانفرنس میں کی تھی بعض لوگ اس کی ادبی خوبی کے مداح ہیں لیکن سیاسی طبقہ مذاق اڑاتا ہے کہ سوائے الفاظ کے اور بادشاہ اور وزیر اعظم اور وائسرائے اور راجہ نوابوں کی تعریف کے اس میں ہندوستانی موافقت کے سیاسی دلائل نہیں ہیں۔ یہ کہہ دینا کہ اگر ہندوستان کو آزادی نہ ملی تو میری قبر لندن میں بنائے گی کوئی سیاسی دلیل نہیں ہے۔

بنگال کے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کو تین بنگالیوں نے قتل کر کے خودکشی کر لی۔ انقلابی تحریک میں قاتلوں کا خودکشی کرنا تاریخ کا پہلا واقعہ ہے۔

قومی } اخبار انقلاب لاہور نے مجھ پر بہتان لگایا ہے کہ میں نے دہلی کی پرانی مسجدوں کو ارون اسپتال دہلی میں ملا دینے کا ایک مضمون ریاست اخبار میں شائع کرایا ہے۔ یہ بالکل جھوٹا بیان ہے میں نے کوئی مضمون اخبار ریاست میں مسجدوں کے موافق یا مخالف نہیں لکھا بلکہ چیف کمشنر دہلی سے زبانی کہہ کر ان مسجدوں کو سرکاری خرچ سے بنوا دینے اور ان کو نماز کے لئے آزاد رکھنے کا فیصلہ کرایا تھا۔ یہ اخبار چونکہ وہابی ہے اس واسطے اس کو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ممکن ہو مجھے بدنام کر کے وہابیوں کی نظروں میں سرخرو ہو۔

تلقین حیات } دماغ کی قوتیں جسم کی طرح ورزش چاہتی ہیں اور دماغ کی ورزش یہ ہے کہ اس سے کام لیا جائے بیکار اور معطل چھوڑ دینے سے جسم کی طرح دماغ بھی کمزور ہو جاتا ہے۔

محمد سعید نظامی } منشی فردوس نظامی کے شاگرد ہیں۔ میرے مرید ہیں۔

میانہ قد۔ جوان عمر۔ کتابی چہرہ۔ خاموش اور سنجیدہ اور نیک جوان ہیں۔ خوشنویسی معاش کا پیشہ ہے۔ درگاہوں کے حاضر باش ہیں۔

آپ بیتی } صبح کام شروع کرنے سے پہلے میرے استاد مولانا حکیم رضی الحسن صاحب تشریف لائے ان سے گفتگو ختم ہوئی تو ایک اور عالم و درویش دوست دہلی سے آگئے اور ایک گھنٹہ تک تخلیہ میں باتیں کیں وہ تشریف لے گئے تو حافظ محمد حلیم صاحب ممبر کونسل آف اسٹیٹ کانپور سے تشریف لائے۔ ان کی باتوں میں ساڑھے گیارہ بج گئے وہ تشریف لے گئے تو کھانا کھا کر بارہ بجے کام شروع کیا۔ تین بجے دہلی گیا۔ سید امداد علی صاحب بھی آج رنگون چلے گئے۔ بینک کے کام سے فارغ ہو کر واحدی صاحب اور ان کے بچوں کے ساتھ بازار گیا۔ پھر نئی دہلی میں میاں سر فضل حسین صاحب سے ملنے گیا۔ چند ضروری معاملات پر گفتگو کرکے بعد مغرب گھر میں واپس آیا۔ بورڈنگ کے طلبا کے ہمراہ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد بچوں سے ذہنی سوالات کئے۔ میں نے کہا جب انسان گھوڑے سے اترتا ہے تو اس کو عروج ہوتا ہے یا زوال؟ سب بچوں نے کہا نیچے اترنا زوال ہے۔ مولانا سیفی نے کہا زوال نہیں ہے۔ وہ دوسرے دن پھر گھوڑے پر چڑھے گا۔ میں نے کہا اس سوال کا جواب یہ ہے کہ انسان گھوڑے سے اسی وقت اترتا ہے جب منزل پر پہنچ جاتا ہے اور منزل پر پہنچنا عروج ہے اور سفر کا حاصل مقصد ہے۔

نو بجے سویا۔ خواب میں دیکھا کہ جواہر لال صاحب نہرو۔ بمبئی کے ایک مکان میں ہیں جو بہت شکستہ اور مرطوب ہے اور وہاں ایک کرسی پر کوئی بت بھی رکھا ہے۔ نہرو صاحب اس بت کو ہٹا کر کرسی پر بیٹھ گئے اور مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا یہ مکان تندرستی کے لئے اچھا نہیں ہے اس میں ہوا اور سورج کی روشنی نہیں آتی۔ انھوں نے ہنس کر میرے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔ اور کہا یہاں تو میں کام کرنے آیا تھا۔ میرے رہنے کی جگہ دوسری ہے۔ اس کے بعد وہ مجھے ایک عالیشان مکان میں لے گئے جہاں بہت لوگ جمع تھے اور وہاں جا کر وہ مجھ سے بالکل بے توجہ ہو گئے۔ آنکھ کھل گئی گیارہ بجے تھے۔ پھر بارہ بجے تک نیند نہ آئی۔ اس کے بعد چار بجے تک سویا۔ پارہ آج ۸۴ درجہ پر ہے۔ سردی ایک درجہ اور بڑھی۔

آج زید پاشا مسہری کے نیچے چھپ گیا۔ خواجہ بانو اور بوا کریماّ اور گھر کی سب عورتوں نے گھر میں جگہ جگہ تلاش کیا نہ ملا تو پھر باہر کے سب مکانوں میں اور بستی میں تلاش شروع ہوئی۔ حور بانو گھبرا کر اپنی سسرال سے آگئیں۔ بوا کریمانے باؤلی میں جا کر دیکھا کہ یہاں نہ ڈوب گیا ہو۔ وہ پانی کے بلبلوں کو دیکھتی تھیں کہ آدمی کے ڈوبنے سے بلبلے اٹھا کرتے ہیں۔ غرض کہ ایک گھنٹہ کی سخت پریشانی کے بعد حلال خوری نے دیکھا کہ زید مسہری کے نیچے لیٹا ہے۔ میں نے یہ بات سنی تو زید کو بہت نصیحت کی کہ آیندہ ایسی شرارت نہ کرنا۔

۱۹ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۱ دسمبر ۱۹۳۰ء
یوم پنجشنبہ۔ مقام دہلی

سیاسی } طاعون۔ انفلوئنزا۔ ہیضہ تین مشہور متعدی امراض ہیں۔ لیکن سیاست ان تینوں سے زیادہ متعدی اور تباہ کن اور خوفناک بیماری ہے اس میں یورپ کے بڑے بڑے آدمی مبتلا ہوتے ہیں۔ اس مرض سے جسم نہیں مرتے۔ ارواح مرجاتی ہیں روح کو موت نہیں آتی۔ اخلاق حسنہ مرجاتے ہیں۔ خود غرضی بے رحمی ریاکاری جھوٹ اس مرض کی علامات ہیں۔

قومی } ہندوستان میں آٹھ کروڑ مسلمان رہتے ہیں مگر وہ سب لیڈر ہیں۔ سارے ملک میں قوم کہیں نظر نہیں آتی۔

تلقین جبات } جو دوسروں کا عیب تمہارے سامنے بیان کرتا ہے وہ دوسروں کے آگے تمہارا عیب بھی بیان کرتا ہوگا۔ شیخ سعدیؒ نے یہ فلسفہ بتایا تھا اور میں نے اس کو تجربہ سے بالکل ٹھیک پایا۔

منشی محمد جان صاحب } خوشنویس ہیں۔ دہلی کے باہر کے رہنے والے ہیں۔ لمبا قد ہے گنجان ڈاڑھی ہے۔ دیکھنے والے کو خیال ہوتا ہوگا کہ بڑی عمر کے آدمی ہیں۔ مگر عمر زیادہ نہیں ہے۔ کم سخن ہیں۔ عرصہ دراز سے واحدی صاحب کے ہاں کتابت کرتے ہیں اور اب روزنامچہ اخبار بھی وہی لکھتے ہیں۔

آپ بیتی } مجھے سردی ستاتی ہے مگر میں اس کی شکایت نہیں کرتا کیونکہ یہ بڑی قاتلہ ہے اس نے ارب درارب اور کھرب درکھرب جانوں کو ہلاک کر ڈالا۔ مکھیاں۔ مچھر۔ کیڑے پتنگے سب ہی اس کے ہاتھوں نیست و نابود ہو گئے۔ آج صبح دو توس کھا کر بچوں کے ساتھ ہوا خوری کو گیا۔ مولانا سیفی بھی ساتھ تھے۔ سات چکر عیسےٰ خاں کے باغ میں لگائے۔ آٹھ بجے سے ایک بجے تک کام کیا۔ پھر دہلی گیا۔ وہاں احباب سے ملا۔ پروفیسر سید عباس علی صاحب ایم، اے اور بیکانیر کے نبی بخش صاحب وغیرہ ملنے آئے۔ شام کو میاں سر فضل حسین صاحب سے ملنے گیا اور رات کو آٹھ بجے واپس آکر بچوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر سب بچوں کی شرکت میں اخبار پڑھے۔ گاؤ زبان پی۔ کیونکہ کئی رات سے نیند صاف نہیں آتی۔ نو بجے سویا اور صبح چار بجے تک گاؤ زبان کی تاثیر سے مسلسل نیند آئی۔ گاؤ ایسا جانور ہے جو ہزاروں برس سے انسانوں کی نیند کو باہمی لڑائی سے برباد کر رہا ہے لیکن زبان سے ملتا ہے تو گاؤ زبان بن کر نیند بڑھا دیتا ہے۔ میں تو اس گاؤ زبان کو ماتا کہنا چاہتا ہوں۔ آج سردی نے ترقی نہیں کی۔ صبح پارہ ۴۸ درجہ پر تھا۔

تصوّف کا عصری مفہوم

ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی

تصوف نہ کوئی فلسفہ ہے نہ سائنس، وہ نہ کوئی مفروضہ ہے نہ حکایت اور خواب جس کی تعبیریں اور مفہوم زمانوں کے ساتھ تغیر پذیر ہوتے ہوں۔ وہ ایک حقیقت ہے، ایک ناقابل تردید حقیقت۔ ایک طرز حیات ہے ایک مکمل دستور زندگی ہے جس کو اپنا کر آدمی انسانیت کی قبائے زرافشاں زیب تن کرتا ہے۔ تو آئیے سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ اس کا اصلی مفہوم کیا ہے۔

ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں تو سورہ بینہ کی آیۃ کریمۃ وَمَا اُمِرُوا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَاءَ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ ہ اس کا جواب دیتی ہے یعنی ان لوگوں کو صرف اور صرف اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خاطر یکسوئی و بے غرضی کے ساتھ صرف اسی کی عبادت کریں الخ مگر جنت وجہنم کے تصور سے بالا ہو کر۔ نہ اس خیال سے گناہوں سے بچیں کہ جہنم سے نجات ملے گی اور نہ اس بنا پر اچھے اچھے نیک کام انجام دیں کہ ان کے بدلہ جنت الفردوس میں جگہ ملے گی۔ یعنی عبادت و ریاضت اور حسن معاملت سے اجر اور ثواب کا تصور بھی ختم ہو جائے۔

حضرت رابعہ بصریہؒ کا مشہور واقعہ ہے کہ کیفیت میں ایک ہاتھ میں آگ اور دوسرے میں پانی لیے جا رہی تھیں حضرت حسن بصریؒ نے پوچھا رابعہ! کیا ارادہ ہے۔ بولیں سوچتی ہوں کہ جنت کو جلا کر راکھ کر دوں اور دوزخ کو بجھا ڈالوں کیونکہ جسے دیکھو جنت کے لالچ میں نیک کام کر رہا ہے اور دوزخ کے خوف سے گناہوں سے بچ رہا ہے۔ مولا کی خوشی کے لیے کوئی کچھ نہیں کر رہا ہے۔ یعنی جنت و دوزخ اخلاص کے منافی ہیں۔

مرزا غالبؔ نے ٹھیک ہی تو کہا ہے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدُوا اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ احسان یہی ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو یہ یقین کرو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

اسی سے ہمارے قول و فعل کا تضاد اور فرق ختم ہوتا ہے اور فکر و عمل میں اخلاص وللّٰہیت پیدا ہوتے ہیں۔ یہی احسان تصوّف ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے تھے کہ تصوف یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ بلا علاقہ رہو اور وہ تم کو تمہاری خودی سے مردہ اور اپنی خودی سے زندہ کر دے نیز تصوف خیالات کی صحت کا نام ہے یعنی اپنے دل کو نفسانی خواہشات سے پاک و صاف رکھا جائے اور بے جا تمناؤں اور آرزوؤں کو اس میں گھر نہ کرنے دیا جائے کیوں کہ یہ چیز قلب انسانی کو خراب کرتی ہے ؎

دل کو خراب آرزوئے نفس نے کیا
دل صاف وہ ہے جس میں کوئی آرزو نہ ہو

بے جا خواہشات اور تمناؤں کی دل سے رخصت ہی اصل چیز ہے ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

تصوف اللہ کے سوا غیر سے تعلق توڑنے کا نام ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان بے عمل، ترک دنیا اور رہبانیت کی زندگی اختیار کرلے۔ وہ دنیا میں رہے مگر اس میں اس درجہ ڈوب نہ جائے کہ حرام و حلال کی تمیز اُٹھ جائے اور دنیا اور اس کے اسباب کی محبت دل میں بیٹھ جائے۔ عارف رومیؒ فرماتے ہیں ؎

چیست دنیا از خدا غافل بُدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

دنیا تو اللہ تعالیٰ سے غافل ہونے کا نام ہے نہ کہ لباس وزر و جواہر اور اہل وعیال سے۔ انسان کھائے پیئے بھی، دنیاوی لوازم سے بھی کنارہ کش نہ ہو، اہل وعیال سے بھی بے توجہی و بے تعلقی نہ کرے، دنیا سے راہ فرار نہ اختیار کرے مگر اپنے قلب کو ان بکھیڑوں میں الجھائے نہیں۔ اور حضرات صوفیہ کے بقول دل بیار و دست بکار پر عمل کرے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

بگیر رسم تعلق دِلا زمرغابی
کہ او ز آب چو برخاست خشک پر برخاست

اے دل تعلق کی رسم و ریت اگر تجھے سیکھنا ہے تو مرغابی سے سیکھ کر پانی میں رہنے کے باوجود جب وہ پانی سے اُڑتی ہے تو ایک قطرہ پانی کا اثر بھی اس کے پروں پر نہیں ہوتا ہے۔

بیٹھے ہر محفل میں لیکن جھاڑ کے اٹھے اپنا دامن

تصوف یہ بھی ہے کہ انسان ہر وقت اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے اور ایک لمحہ بھی اس سے غافل نہ ہو۔ اسی لیے صوفیہ اپنی ہر ہر سانس کا حساب رکھتے ہیں کیوں کہ بعض اوقات ایک پل کی غفلت نہ جانے کہاں لے جاتی ہے ؎

رفتم کہ خار از پاکشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

میں اپنے پیر سے کانٹا نکالنے کو جھکا ہی تھا کہ محبوب کا کجاوہ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا میں تو ایک ہی لمحہ غافل ہوا تھا مگر یہاں تو سیکڑوں سال کی مسافت سے دور ہوگیا۔ تصوف اپنے میں اخلاق الٰہی پیدا کرنے کا نام ہے۔

تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللّٰہ۔ اپنی ذات میں اخلاق الٰہی کو رچا بسالو۔ اس کا اصول تجلیہ یہی ہے کہ اپنے کو اچھے اخلاق و عادات سے آراستہ کرنا۔ وہ ظاہر و باطن میں اخلاق و اخلاص کا یہ سبق دیتا ہے کہ انسان دوسروں سے اپنے کو کمتر سمجھے، خدمت خلق کو اپنا شعار بنائے، مذہبی رواداری، آپسی میل محبت، وضعداری اور صلح جوئی کی فضا قائم کرے دوسروں کی تکلیف، پریشانی اور مصیبت کو اپنی تکلیف و پریشانی سمجھے، دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ گردانے اور ایثار و ہمدردی کو اپنا نصب العین بنائے اسی وجہ سے صوفی طبقاتی اور نسلی تقسیم سے بہت دُور ہوتا ہے وہ تمام مخلوق کو وحدت او راکائی میں باندھتا ہے اور نیرنگیوں میں یک رنگی کا متلاشی رہتا ہے ؎

نیک و بد سب ہیں ترا اب اس کے ظہور اسماء
مجھ کو یک رنگ نظر چاہیے ہر فرد کے ساتھ

جس طرح موجیں دریا سے الگ نہیں ویسے ہی اس کی نگاہ میں تمام عالم عین حق ہے غیر حق نہیں ؎

جیسے موجیں عین دریا ہیں حقیقت میں تراب
ویسے عالم عین حق ہے غیر حق عالم نہیں

تصوف کا مفہوم یہ بھی ہے کہ انسان ہر اچھی صفت کو اختیار کرے اور بری صفت سے دُور ہوجائے۔ مخلوق کے ساتھ بلاتفریق مذہب و ملت اچھے سے اچھا برتاؤ کرے اور اپنے دشمنوں تک کے لیے ہمیشہ دعائے خیر کرتا رہے سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اکثر یہ اشعار پڑھتے تھے ؎

ہر کہ مارا یار نبود ایزد او را یار باد
و انکہ مارا رنجہ دارد راحتش بسیار باد
ہر کہ او خارے نہد در راہ ما از دشمنی
ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

جو کوئی ہمارا دوست نہ ہو اے اللہ تو اس کا بھی دوست ہو اور جو ہم کو ایذا پہنچائے اس کے بدلے اس کو مزید آرام و آسائش عطا ہو ہم سے دشمنی کی خاطر جو کوئی ہمارے راستے میں کانٹے بچھائے تو اس کی زندگی کے باغ کا ہر پھول بے خار ہوجائے۔

حدیث شریف ہے لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ

لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ ۔ تم میں سے کوئی اس وقت تک اللہ پر مکمل ایمان والا ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ دوسروں کے لیے وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے چنانچہ سیر الاولیاء میں ہے انچہ بر خود روا نداری بر غیرے مدار

جو اپنے لیے نہ پسند کرو وہ دوسروں کے لیے بھی نہ پسند کرو۔

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ تصوف اخلاقی سرفرازی، روحانی بلندی، سراپا تہذیب وشائستگی اور ادب کا نام ہے اس کی بنیادی تعلیمات تواضع وانکسار، خوش خلقی وملنساری اخلاص وللّٰہیت خود شناسی وخدا شناسی، علم باعمل، دوسروں کے عیوب کی پردہ پوشی، اپنے کردار وعمل اور محبت سے دوسروں کو اپنا بنانا اللہ تعالیٰ اور ساتھ ہی دوسرے انسانوں سے بہتر رشتے قائم کرنا وغیرہ ہیں۔

ہر دور میں تصوف کا مفہوم، اس کی معنویت وافادیت اور اہمیت ایک سی رہی ہیں مگر عصر حاضر کے مسائل وحالات، انسانیت کش ماحول، باہمی منافرت وتعصب طبقاتی تقسیم، نسلی وقومی اختلافات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تصوف ہی وہ نسخہ اکسیر ہے۔ جو ہر زخم کے لیے مرہم اور ہر بیماری کا مداوا ہے ان پاک طینت صوفیوں کی پاکیزہ زندگیوں کے مطالعہ اور ان کی تعلیمات کے اثرات کو محسوس کرنے کے بعد یہ یقین ہو جاتا ہے کہ تصوف صرف ذکر وفکر، مراقبہ ومجاہدہ، کشف وکرامات اور کیفیت کا ہی نام نہیں ہے بلکہ وہ ہر دور کے لیے حیات نو کا پیغام ہے اور یہی اس کا عصری مفہوم ہے۔

آج اگر ہم تصوف کے مفہوم کو سمجھ کر اسے اپنی زندگی کا حصہ بنالیں ان پاک طینت صوفیوں کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں تو ہمارے سارے دکھ دور ہو کر ہماری زندگیاں نکھر سنور جائیں۔

ہو اگر آج براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

فوائد الفواد

سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہیؒ

کے شہرۂ آفاق

ملفوظات وتعلیمات کا مجموعہ

نوشتہ

حضرت خواجہ حسن علاء سجزی دہلویؒ

ترجمہ

خواجہ حسن ثانی نظامی

شائع کردہ

اردو اکیڈمی دہلی

کے نئے ایڈیشن کا ہدیہ غالباً ڈھائی سو روپے ہوگا

پرانے ایڈیشن کی چند جلدیں

ابھی باقی ہیں

ختم ہونے سے پہلے حاصل کر لیجئے

اس کا ہدیہ صرف

چھیاسی روپے ہے

بے مثل اور منتخب مطبوعات

کتاب	قیمت
ہندی ترجمہ قرآن نصف آخر (از حضرت خواجہ حسن نظامیؒ)	پچاس ۵۰ روپے
ہندی پارۂ عم	دس ۱۰ روپے
میلاد نامہ اور رسولؐ بیتی	پندرہ ۱۵ روپے
قرآنی بول چال (مجلد)	دس ۱۰ روپے
تعلیم القرآن	پانچ روپے
اسلام کے ضروری عقائد	ایک روپیہ
اسلامی توحید	ایک روپیہ
آسان سبق کی پہلی	ایک روپیہ
یزید نامہ	بیس ۲۰ روپے
طمانچہ برخسار یزید	دس ۱۰ روپے
بیوی کی تعلیم	دس ۱۰ روپے
اولاد کی شادی	دس ۱۰ روپے
اعمال حزب البحر حصہ اوّل	بارہ ۱۲ روپے
اعمال حزب البحر حصہ دوم	چار ۴ روپے
مرشد کو سجدۂ تعظیم	تین ۳ روپے
اسرار کلام اللہ اور اسم اعظم	پندرہ ۱۵ روپے
تاریخ سلاطین عباسیہ حصہ دوم	چھ ۶ روپے
دہلی کی آخری شمع	پندرہ روپے
نظامی بنسری	ساٹھ روپے
منادی حضرت بابا فریدؒ نمبر	پندرہ روپے
منادی حضرت امیر خسروؒ نمبر	دس روپے

کتاب	قیمت
منادی حضرت خواجہ حسن نظامیؒ سیمینار نمبر	دس روپے
فائل منادی ۱۹۶۵ء ۱۹۶۶ء	بارہ ۱۲ روپے
تذکرۂ نظامی	پانچ ۵ روپے
تذکرۂ حضرت نظام الدین اولیاءؒ	پندرہ ۱۵ روپے
پریم سنگم (مہاراجہ کشن پرشاد اور اکبر الٰہ آبادی کے خطوط)	پانچ روپے
خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامیؒ	پندرہ ۱۵ روپے
دی ریلیجن آف پیس	پندرہ ۱۵ روپے
درس مادر	ایک روپیہ
اردو سبق با تصویر	ایک روپیہ
اتالیق خطوط نویسی	دس ۱۰ روپے
شیخ نظام الدین اولیاءؒ (انگریزی) پروفیسر خلیق احمد نظامی)	تین سو ۳۰۰ روپے
شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ (انگریزی) " "	دو سو پچاس ۲۵۰ روپے
حضرت خواجہ حسن نظامی حیات و کارنامے	انتیس ۲۹ روپے
طب کی تاریخ	پانچ ۵ روپے
لڑائی کا گھر	دو ۲ روپے
خواجہ حسن نظامیؒ (کتاب نما کا خصوصی شمارہ)	پچھتر ۷۵ روپے
سفرنامہ مصر و شام و فلسطین و حجاز	پندرہ ۱۵ روپے
سفرنامہ پاکستان	چھ ۶ روپے
گائے کی جان بچانے کا بیان	تین ۳ روپے
کائنات بیتی	پانچ روپے
ایڈورڈ ڈائری (انگریزی)	دس روپے

کتاب	قیمت
مفلسی کا مجرب علاج	ایک روپیہ
ترکیب نماز	ایک روپیہ
تعلیم اسرار تصوف	پانچ ۵ روپے
دہلی کی جاں کنی	بیس ۲۰ روپے
بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ	بیس ۲۰ روپے
فیوچر آف اسلام	دس روپے
دیوان حافظ مترجم	باون ۵۲ روپے
مثنوی مولانا روم (مکمل سیٹ)	تین سو ۳۰۰ روپے
قصیدہ بردہ خورد	دس روپے
قصیدہ بردہ کلاں	تیس روپے
تاریخ مشائخ چشت (از پروفیسر خلیق احمد نظامی)	ایک سو بیس ۱۲۰ روپے
خطبات غوثیہ	بیس ۲۰ روپے
موطا امام مالکؒ	چودہ ۱۴ روپے
انتخاب صحاح ستہ	اٹھارہ ۱۸ روپے
مشکوٰۃ شریف کامل (اردو)	چالیس ۴۰ روپے
تجرید صحیح بخاری شریف کامل (اردو)	پچیس ۲۵ روپے
صحیح مسلم شریف کامل (اردو)	تیس ۳۰ روپے
ترمذی شریف کامل (اردو)	پینتالیس ۴۵ روپے
اسلامی تعلیم (از مفتی محمود الوری)	تین ۳ روپے
اسرار شریانیہ (کمالات حکیم نابینا)	پندرہ ۱۵ روپے
حکومت اورنگ زیب کی اصلی تاریخ	دس روپے
مبادیات اسلام	تین ۳ روپے
تائید اسلام اور تردید الزام	دو ۲ روپے
سوانح عمری خواجہ حسن نظامیؒ از ملا واحدی	دس روپے
قرآن مجید کے معجزات	دو ۲ روپے
القول الجلی ملفوظات حضرت شاہ ولی اللہ رح	ایک سو پچاس ۱۵۰ روپے
تذکرۂ غازی بالے میاں	ایک روپیہ
وسائل معاش	دس روپے

کتاب	قیمت
فن انجینیری	دس روپے
معلومات تجارت	پانچ ۵ روپے
مرغی انڈے کا بیوپار	پانچ ۵ روپے
امت کی مائیں	چار ۴ روپے
الزہرا (ناول)	چار ۴ روپے
حضرت محمد اور اسلام	چار ۴ روپے
بصائر	تین ۳ روپے
مقدمہ شعر و شاعری از مولانا حالی	دس روپے
عمر بڑھانے کے طریقے	چار ۴ روپے
مرقع کلیمی: از حضرت شیخ کلیم اللہ ولیؒ	آٹھ ۸ روپے
کشکول " " " "	آٹھ ۸ روپے
سواء السبیل	دس روپے
عشرۂ کاملہ	دس روپے
مالابد کلیمی فی التصوف	پانچ ۵ روپے
مخدوم صابری کلیریؒ	بارہ ۱۲ روپے
فوائد الفواد	چھیاسی ۸۶ روپے

خواجہ اولاد کتاب گھر
ڈاکخانہ حضرت نظام الدین
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

القول الجلی فی ذکر آثار الولی کا معرکۃ الآراء
مقدمہ اور اختتامیہ
از
حضرت مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی مجددی
قیمت تین روپے

منادیا ینادی للایمان

بارگاہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ سے
ایمان اور امن کی ندا دینے والا
اور ان کے جانشین
امام المشائخ شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی یادگار

منادی ۱۹۲۶ء سے جاری ہے یہ انہترویں جلد (۱۹۹۴ء) کا بارہواں شمارہ ہے

مدیر
خواجہ حسن ثانی نظامی
معاونِ مدیر
خواجہ مہدی نظامی

— درگاہ —
شریف اور منادی کے بارے میں
خط و کتابت کرنے اور قیمت
جمع کرانے کا پتہ
خواجہ حسن ثانی نظامی
ڈاکخانہ حضرت نظام الدین اولیاء
نئی دہلی ۱۳-۱۱

سالانہ قیمت
ہندوستان میں
پچاس روپے
غیر ممالک سے
دس ڈالر
فی پرچہ
پانچ روپے

فہرست

ناظرین منادی کو
نیا سال مبارک
اللہ تعالیٰ اسے خوشیوں اور خیر و خوبی کا سال رکھے۔

پرنٹر پبلشر خواجہ حسن ثانی نظامی نے خواجہ پریس جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نئی دہلی ۱۳-۱۱ سے شائع کیا۔

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ

کی منہ بولی بہن

حضرت بی بی فاطمہ سام علیہا الرحمت

اور

شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی رحؒ کی اہلیہ

حضرت سیّدہ محمودہ خواجہ بانو علیہا الرحمت

کا سالانہ عرس مبارک

بعنوان

فہم قرآن مجید

انشاء اللہ بتاریخ ۱۷ ر شعبان ۱۴۱۵ ہجری
خواجہ ہال بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ
میں منعقد ہوگا

مقالہ نگار و مقرر: پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی، حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی
جلسے کے بعد طعام لنگر پیش کیا جائے گا۔

۱۸ ر شعبان کو حضرت بی بی فاطمہ سامؒ کی درگاہ واقع کاکا نگر نئی دہلی
میں محفل قل منعقد ہوگی۔ انشاء اللہ

اسلام ۲۱ ویں صدی میں

پروفیسر نثار احمد فاروقی

اکیسویں صدی دروازے پر دستک دے رہی ہے اور اہل سیاست نے ہمیں بہلانے کو ایک اور کھلونا دے دیا ہے جیسے ایک مفلس ماں اپنے بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کو تسلی دینے کے لیے خالی ہانڈی چولہے پر چڑھا کر کہہ دے کہ بس اب کھانا پک جائے گا تو تمھیں کھلائیں گے۔

پہلے یہ سوچیے کہ اکیسویں صدی ہے کیا؟ اس کا سیدھا سا مطلب تو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی ولادت کو دو ہزار سال پورے ہو جائیں گے۔ یہ مغربی تہذیب سے ہماری مغلوبیت کی علامت ہے کہ ہم تاریخ، تہذیب، سیاست، معاشرت، ہر شعبۂ زندگی کو، ان کے آغاز و انجام کو مغرب کے حوالے کر چکے ہیں۔ تاریخ کو محض یاد رکھنے کے لئے کسی بڑے حادثے یا واقعے سے جوڑ دیا جاتا ہے جیسے کعبے پر ابرہہ کے حملے کا سال عام الفیل کہلاتا ہے، اسلام سے پہلے عام الفیل کو ایک نقطۂ آغاز سمجھ کر تاریخ کا حساب کیا جاتا تھا، مثلاً یوں کہتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت عام الفیل کے آغاز سے ۴۰ دن بعد ہوئی تھی۔ یا ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکے سے مدینے کو ہجرت ایک تاریخ ساز واقعہ تھا اُسے نقطہ آغاز مان کر ہجری تقویم بنالی گئی۔ بعض مقامی حوادث بھی مرکزی نقطہ بن جاتے ہیں جیسے ایک حیدرآبادی بزرگ نے کہا کہ رود موسیٰ میں طغیانی آئی تو میں آٹھ برس کا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور بھی ایک نہایت اہم اور دور رس نتائج پیدا کرنے والا

واقعہ ہے مگر ساری دنیا کی، ہر ملک اور ہر قوم کی سیاست اور معاشرت یا اس کی خوش حالی اور بدحالی اس واقعے سے جڑی ہوئی نہیں ہے یہ صرف وقت کو ناپنے کا ایک پیمانہ ہے۔ دنیا کے حوادث یا قدرت کا کارخانہ کیلنڈر دیکھ کر نہیں چلتا۔

اب یہ دیکھیے کہ وقت یا زمان یا دہر کیا ہے؟ یہ ازل سے ابد تک ایک اکائی ہے انسان نے اپنی سہولت کے لیے اسے خانوں میں بانٹ لیا ہے اس نے دیکھا کہ دن اور رات کا تعلق سورج کے نکلنے اور غروب ہونے سے ہے تو رات اور دن کا تعین کر لیا اور اسے ۲۴ گھنٹوں میں بانٹ لیا، پھر گھنٹوں کے منٹ اور منٹوں کے سکنڈ بنالیے ورنہ اسی زمین پر وہ علاقے بھی ہیں جہاں چھ مہینے دن رہتا ہے چھ مہینے رات رہتی ہے زمین پر جو کچھ ہو رہا ہے اس کی تصویریں فضا میں محفوظ ہوتی ہیں اگر کبھی انسان اتنی نازک اور حساس مشینیں ایجاد کر سکا کہ ان تصویروں کو اپنی گرفت میں لے آئے تو ہم سو پچاس کیا لاکھ دو لاکھ سال پہلے کی انسانی حرکتوں کو بھی اسکرین پر اسی طرح دیکھ سکیں گے جیسے آج ٹی وی دیکھتے ہیں شریعت کی زبان میں اسی بات کو یوں کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن انسانوں کے اعضاء ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔

زمانے کو ہم نے ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم کر رکھا ہے مگر قدیم فلاسفہ بھی یہ کہتے ہیں کہ حال کوئی زمانہ نہیں ہے۔ ہر لمحہ مستقبل سے آرہا ہے اور ماضی کے ظلمات میں گم ہو رہا ہے۔ ہم نہ ماضی کو زندہ کر سکتے ہیں نہ مستقبل پر

قابو پاسکتے ہیں یعنی جو کچھ ہوگیا اُسے کالعدم نہیں کرسکتے اور جو ہونے والا ہے اُسے وقت مقرر سے پہلے وجود میں نہیں لاسکتے۔ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ کا ایک مفہوم یہ بھی ہے ہمارے لیے ماضی اور مستقبل دونوں ہی غیب ہیں۔ غالب نے کہا تھا:

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں؟

جب ہم دو غیبوں کے درمیان لٹکے ہوئے ہیں تو سوچیے کہ شہود کہاں ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟

یہ تو فلسفیانہ بات ہوئی اب یہ دیکھیے کہ اسلام میں وقت کا تصور کیا ہے؟

قرآن کریم میں ایک سورۃ کا نام ہی الدھر ہے، دہر زمان و مکان دونوں کو جامع ہے اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا - (الدھر ۲۸)

ان کو ہم نے ہی پیدا کیا ہے اور ان کے بندھن مضبوط باندھ دیے ہیں، اور جب ہم چاہیں ان کی جگہ پر ان جیسے دوسرے لے آئیں گے۔

اسی کو فلاسفہ تجدد امثال کا نظریہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک دوسری بحث ہے۔

پھر قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ -
(آل عمران ۱۴۰)

اور یہ ایام زمانہ ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔

پھر ایک اور موقع پر قدرے وضاحت سے کہا:

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ٥ (سورہ الانعام ۶)

کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی ایسی قوموں کو ہلاک کر دیا جنھیں زمین پر اقتدار دیا تھا، ایسا اقتدار جو تمھیں بھی نہیں دیا۔ ہم نے آسمان سے ان پر خوب بارشیں برسائیں کہ ان کے نیچے نہریں جاری ہوگئیں۔ پھر ان کے گناہوں کی پاداش میں انھیں ہلاک کر دیا اور ان کی جگہ پر دوسری قومیں کو لا کر بٹھا دیا۔

یہ اور ایسی دوسری متعدد آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گردش ایام خود موثر نہیں ہے، زمانے کی الٹ پھیر اور نشیب و فراز سے حالات کی تشکیل نہیں ہوتی، اللہ ہی فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ہے، وہی موثر حقیقی ہے۔ بقول شاعر:

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

ترمذی کی ایک حدیث میں صاف لفظوں میں کہا گیا ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَسُبُّ اَحَدُكُمُ الدَّهْرَ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی زمانے کو برا نہ کہے کیونکہ حقیقت میں اللہ ہی زمانہ ہے۔

اِس مختصر گفتگو کے بعد موضوعِ گفتگو پر آتا ہوں:

"اسلام ۲۱ ویں صدی میں"

یہاں یہ غور کرنا ہوگا کہ اسلام کیا ہے؟ وہ کوئی جامد اور منجمد شے ہے یا متحرک اور تغیر پسند نظریہ ہے۔ آج کل اغیار نے اسلام پر چاروں طرف سے یورش کر رکھی ہے یہ ایک انتقامی ذہن کام کر رہا ہے۔ جو ذرائع ابلاغ پر قبضہ کرکے عام لوگوں کو یہ سبق پڑھا رہا ہے کہ اسلام فرسودہ مذہب ہے اس کے احکام ظالمانہ ہیں، یہ کٹھ ملاؤں کا دین ہے وغیرہ۔ اس انتقامی کارروائی کا نام رکھا ہے بنیاد پرستی۔ یہ نئی اصطلاحیں گھڑنے ان سے کھلواڑ کرنے اور ان میں اُلجھا کر عوام کو گمراہ کرنے یا جاہل بنانے کا بڑا نظر فریب طلسم ہے۔ ہر مذہب کیا، ہر علم اور ہر فن کی ایک بنیاد ہوتی ہے اس کی پابندی اور پیروی کرکے ہی وہ علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔

ہمارے ملک میں فن موسیقی کے بڑے بڑے تیس مار خاں قسم کے استاد پڑے ہوئے ہیں ان کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ موسیقی کی بنیاد یعنی سارے گاما پا دھانی سے کترا کر دو منٹ گا کر دکھا دیں۔ اگر نہیں گا سکتے تو اسلام پر ہی بنیاد پرستی کا لیبل کیوں لگایا جا رہا ہے۔ موسیقی کی مثال تو محض شرافت کو ملحوظ رکھ کر دی ہے ورنہ ان الزام لگانے والوں کی مذہبی بنیاد پرستی پر بھی عمل جراحی خوب ہو سکتا ہے، مگر کیا کریں:

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

خیر، میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسلام کا جو ہر ہے قرآن اور اس کے اعراض ہیں حدیث، فقہ، تفسیر، سیرۃ وغیرہ بنیاد بہرحال قرآن ہے وہ جس دن پہلی آیت نازل ہوئی تھی کہ

اقرأ باسم ربك الذي خلق خلق الانسان من علق۔ پڑھیے۔ اپنے رب کا نام لے کر جس نے پیدا کیا ہے۔ جس نے انسان کو ایک لوتھڑے سے بنا دیا ہے۔

اس دن سے آج تک وہی قرآن ہے، اس کی حفاظت خود اللہ کر رہا ہے اور اس نے کہہ دیا ہے کہ اس میں آگے پیچھے سے کہیں باطل گھس بیٹھ کر سکتا ہے نہ کوئی اس جیسا دوسرا لکھ سکتا ہے۔ اسلام کا شعار کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے دنیا کا سب سے پہلا مسلمان بھی یہی الفاظ ادا کر کے حلقۂ اسلام میں شامل ہوا تھا اور دنیا کا آخری مسلمان بھی یہی شہادت دے کر مسلمان ہو سکے گا۔

اس اعتبار سے ہمیں ذرہ بھر شرم کیے بغیر ڈنکے کی چوٹ پر یہ کہنا چاہیے کہ اسلام سخت جامد و منجمد غیر تغیر پذیر اور راسخ مذہب ہے اس میں کسی کی مروت یا لحاظ سے، کسی خوف یا لالچ سے، کسی دباؤ یا مصلحت سے کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی اکیسویں صدی کیا دو کروڑویں صدی اگر آئے گی تو وہ بھی اسلام کو ایسا اور اتنا ہی پائے گی۔ اللہ اس دین کی تکمیل کر چکا ہے:

اليوم اكملت لكم دينكم۔

آج ہم نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا۔

تکمیل کے بعد اس میں شاخسانے پیدا کرنا ایسا ہی ہے کہ کوئی ڈاکٹر سارے ٹسٹ (TEST) کرنے اور مریض کی پچھلی پوری ہسٹری پڑھنے کے بعد اس کے لیے نسخہ تجویز کرے اور مریض اس میں اپنی طرف سے ایک دوا اور بڑھا لے جو ڈاکٹر کی لکھی ہوئی دواؤں کو بھی بے اثر بنا دے۔ کیا ایسے مریض کو آپ عقلمند سمجھیں گے یا پاگل کہیں گے؟

اس بات پر مخالف تو مطمئن ہوں گے کہ لو ہماری تائید ہو گئی۔ یہ خود کہہ رہے ہیں کہ اسلام جامد مذہب ہے یہ ٹس سے مس ہونا نہیں جانتا، ممکن ہے ہمارے بعض مسلمان بھائیوں کو بھی یہ خیال ہضم نہ ہو سکے اس لیے اب میں اس کا دوسرا پہلو لیتا ہوں۔

اسلام ایک قوت ہے، یہ ہر جمود کو توڑنے والی، انقلاب پیدا کرنے والی، زندگی بخشنے والی حرکت و عمل پیدا کرنے والی قوت ہے۔ اس کی تفصیل میں جاؤں تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ نہایت اختصار کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام وہ ہے جو ایک یتیم و یسیر بچے، ایک بے سہارا انسان (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعے سے آیا، ہر طرح کی تکلیف، ایذا اور قربانیوں کے باوجود زندہ رہا، جلا وطن کیا گیا، نئے شہر مدینہ منورہ کو گیارہ سال میں کایا پلٹ دی، سارے جزیرہ نمائے عرب کو اپنا مطیع بنا لیا، آدھی صدی گذری تھی کہ جزیرہ نما سے نکل کر ایران اور مصر پہنچ گیا، ایک صدی میں دنیا کے تین براعظموں پر چھا گیا جس نے سماج کی ہزاروں برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ ایک سو سال میں لاکھوں حافظ، قاری، محدث، مفسر، فقیہ، مورخ، جغرافیہ داں، فلسفی، منطقی، ریاضی داں، ماہر فلکیات طبیب اور سائنس داں پیدا کر دیے، ہزاروں مدرسے قائم ہو گئے، صدہا کتابیں تالیف ہو گئیں دوسری زبانوں سے علوم اخذ کر کے انھیں بھی محفوظ کر دیا۔ ایک ایسا معاشرہ بنا دیا جس میں تعلیم و تربیت شاذ و نادر ہی چلتے تھے۔ ہمارے قدماء کی زندگیوں کا خوب گہری نگاہ سے جائزہ لے لیجیے ان میں ایسے آبرو باختہ اور بدمعاش لوگ شاید ہی ملیں جیسے آج کی علمی دنیا میں بغیر ڈھونڈے مل جاتے ہیں۔ تاریخ اسلام کا ایک ایک صفحہ پلٹ کر دیکھ لیجیے خودکشی کا کوئی واقعہ شاذ و نادر ہی مل سکے گا۔

اس کے مقابلے میں تاریخ اخلاق یورپ پڑھ لیجیے جہاں اجتماعی خودکشی کے سیکڑوں واقعات مل جائیں گے یا اپنے وطن عزیز کی تاریخ کا جائزہ لے لیجیے، پھر یہ دیکھیے کہ پچھلے ۱۴ سو سال میں جہاں اسلامی حکومت رہی ہے وہاں ۱۴ فرقہ وارانہ فسادات بھی نہیں ہوئے۔ کیا اتنی بڑی اور نمایاں تبدیلیاں کسی ایسے مذہب کے ذریعے آسکتی تھیں جس میں روح انقلاب کا فقدان ہو، جو لکیر کا فقیر بن کر جینا سکھاتا ہو، جس میں ہر ظالمانہ و جابرانہ نظام سے لڑنے کی قوت نہ ہو، جو اپنے پیروؤں کو توہمات اور خرافات کا اسیر بنانے والا ہو؟

آپ دنیا کے کسی مذہب کی تاریخ کا جائزہ لے لیجیے کسی نے اتنی تھوڑی مدت میں، زمین کے اتنے بڑے رقبے پر اور مختلف نسلی، تہذیبی، معاشرتی گروہوں پر اتنا فوری اور ایسا دیرپا اثر نہیں ڈالا جیسا آپ اسلام کے اثرات کا مطالعہ کرتے ہوئے پائیں گے۔ صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا، گاندھی جی ہوں یا ڈاکٹر امبیڈکر یا ہمارے عہد کے دوسرے مفکرین اور مصلحین سب یہ کہتے رہے ہیں، لکھتے رہے ہیں کہ چھوت چھات برتنا گناہ ہے، سب انسان برابر ہیں، سب کے حقوق برابر ہیں، اس کے خلاف تو آواز کسی نے بھی نہیں اٹھائی۔ پھر قانون بھی بنا دیا گیا۔ آپ کسی انسان سے یہ کہہ دیجیے کہ تم ذلیل نسل کے ہو، پولیس پکڑ کر بند کر دے گی۔ مگر اپنے ماحول پر نگاہ ڈال کر غور سے دیکھیے کیا واقعی چھوت چھات ختم ہو گئی؟ کیا سچ مچ سب انسان برابر ہو گئے؟ کیا ہر ایک کو اس کا حق مل گیا؟ کیا ایک برہمن کسی خاکروب کے ساتھ بیٹھ کر کھانے پینے لگا؟ اس کے ساتھ دھیان سے وہ آواز بھی سنیے جو میدان عرفات میں جبل رحمت سے آرہی ہے:

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لأحمر علی أسود إلا بالتقوی کلکم من آدم وآدم من تراب۔ کسی عرب کو کسی غیر عرب پر، کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی برتری حاصل نہیں، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔ برتری کا معیار صرف تقوی ہے۔

کیا اس اعلان کے بعد اسلامی معاشرت میں کوئی نسلی تفریق اور ایسی نفرت نظر آئی جیسی آج بھی یورپ اور امریکا میں کالے اور گورے انسانوں کے درمیان دیکھی جا سکتی ہے؟

یہ ہے اسلام کی انقلاب آفریں قوت، یہ ہے اس کا قوت و حرکت سے بھرپور اثر۔ اگر میں نے یہ کہا کہ اسلام ایک جامد و منجمد نظریہ ہے جو علی الاطلاق ہر زمان و مکان کے لیے یکساں ہے، پھر یہ کہا کہ اس میں روح انقلاب ہے، تاثیر اور قوت ہے تو ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں۔ دیکھیے سورج غیر متحرک ہے، اپنی جگہ ثابت ہے، مگر سارے نظام پر اثر انداز ہو رہا ہے اسی کی حرارت اور روشنی سے زندگی کی گہما گہمی اور چہل پہل قائم ہے۔ اسی کی تاثیر ذرا سے بیج کو چھتنار درخت بناتی ہے، وہی پھول کھلاتی ہے، فصلیں پکاتی ہے، باران رحمت بن کر چھا جاتی ہے اللہ نے اس کی جوڑ توڑ مقرر کر دی ہے وہ نہایت وفاداری سے انجام دے رہا ہے۔ اگر خود سورج میں تغیر نہیں پائیں گے تو کیا آپ اس کی عالمگیر تاثیر اور انقلاب آفریں قوت کے منکر ہو جائیں گے؟

اصل میں ہم ایک بڑے مغالطے میں مبتلا ہیں جب تک وہ دور نہیں ہو گا بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ انسانی معاشرت کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے ہم اسلام اور مسلم معاشرت کو ایک سمجھ لیتے ہیں حالانکہ دونوں کی جداگانہ حیثیت ہے۔ جمود اگر دور کرنا ہے، اصلاح اگر کرنی ہے، تو موضوع بحث اسلام نہیں، مسلم معاشرت ہونا چاہیے۔ فرسودگی مسلمان کے ذہن میں ہو سکتی ہے، پستی اس کے انداز فکر و نظر میں ہو سکتی ہے، خرابی مسلمانوں کے سماج میں ہو سکتی ہے اور ہے۔ میں پھر یہ کہوں گا کہ بہت سی خرابیاں اس لیے آگئی ہیں کہ مسلمان بنیاد پرست نہیں رہا، اس لیے جو اس کی خوبی ہوتی وہی طعنہ بن گئی ہے۔ مسند احمد بن حنبل، نسائی اور دارمی کی روایت ہے:

خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لهم خطاً ثم قال: هذا سبيل الله ثم خط خطوطا عن يمينه وعن شماله وقال: هذه سبل على كل سبيل منها شيطان

یدعوالیہ، وقرأ إن ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السُّبُل فتفرق بکم عن سبیلہ ۔ (مسند احمد، نسائی)

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا: یہ اللہ کا راستہ ہے۔ پھر اس لکیر کے دائیں بائیں جانب کچھ اور خطوط کھینچے اور فرمایا: یہ سب دوسرے راستے ہیں ان میں سے ہر راستے پر ایک شیطان بیٹھا ہے اور تمھیں بلاتا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس پر چلو اور مختلف راستوں کے پیچھے مت بھاگو ورنہ تم راہ راست سے بھٹک جاؤگے۔

وہ زمانہ جسے تاریخ اسلام میں خیر القرون کہا گیا ہے عہد رسالت تھا، پھر خلافت راشدہ کا دور آیا پھر تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ۔ اس وقت اسلام تاریخ، تہذیب معاشرت، غرض زندگی کے ہر پہلو پر حاوی تھا اور سب کچھ اس کے زیرنگیں تھا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ زمانہ آتا گیا کہ مختلف تہذیبیں اور معاشرتیں اسلامی سوسائٹی پر اثر انداز ہونے لگیں۔ اب تو یہ حال ہے کہ بقول اکبر الٰہ آبادی:

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے
صرف تعویذ اور گنڈا ہے
کیا دھرا ہے جناب قبلۂ من
کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے
سو وہ ڈنڈا بھی اب ہے ضبط پولیس
ہے زباں گرم، قلب ٹھنڈا ہے

(۲)

اب تک کی گفتگو سے یہ مسئلہ تو واضح ہوگیا ہوگا کہ اکیسویں صدی میں اسلام کی نوعیت کیا ہوگی یہ موضوع بحث نہیں ہو سکتا، البتہ مسلم سماج کے مستقبل پر رائے زنی کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے یہ غور فرمالیں کہ ۲۱ ویں صدی کا نعرہ دینے میں سیاسی مصلحت کیا ہے۔ ؟ اس وقت اقتصادی اور صنعتی و تکنیکی اعتبار سے دنیا تین خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔

کچھ ممالک ترقی یافتہ ہیں جیسے امریکا، جاپان، فرانس وغیرہ، کچھ وہ ہیں جو ترقی پذیر کہے جاسکتے ہیں کسی پر ترقی کا اثر کم کسی پر زیادہ نظر آتا ہے اس فہرست میں آپ کوریا، مشرقی یوروپ کے ممالک اسرائیل وغیرہ کو شامل کرسکتے ہیں۔ تیسری دنیا وہ ہے جس نے ابھی شاہراہ ترقی پر قدم رکھا ہے اور ان کی منزل مراد ابھی کوسوں دور ہے۔ ہندستان بھی اسی راہ پر چل رہا ہے اگرچہ اپنی تسلی کے لیے وہ خود کو "ترقی پذیر" یعنی DEVELOPING COUNTRIES میں گنتا ہے، مگر حقیقت میں UNDER DEVELOPED جس ملک کی ۸۰ فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہو، جہاں ساڑھے پانچ لاکھ سے زیادہ گاؤں ہوں، جن تک پکی سڑک بھی نہ جاتی ہو، جہاں زیادہ سے زیادہ ۳۶ فی صد آبادی حرف شناس ہو، جہاں پچھلے پلان تک صرف ۱۴ روپے سالانہ فی کس تعلیم پر خرچ کیے گئے ہوں، جہاں کل آبادی کا ۴۰ فی صد حصہ خط افلاس یعنی POVERTY لائن سے نیچے زندگی بسر کر رہا ہو، جس کی ۲۰ فی صد آبادی خود کو پس ماندہ یا دلت کہتی ہو، اور اتنی ہی دوسری اقلیتیں بہت سے حقوق سے محروم رکھی گئی ہوں، اس ملک کو ترقی پذیر کہنا اپنے نفس کو دھوکا دینا ہے۔ معاشی حالت یہ ہے کہ ۴۰ فی صد خط افلاس سے نیچے ہے اور ۴۰ فیصد اس خط کے اوپر ہے جسے انگریزی محاورے میں HAND TO MOUTH ہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی طرح جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھے ہوئے ہے۔ تقریباً ۲۰ فی صد آبادی کو ہر طرح کی آسودگی میسر ہے اور ملک کی معیشت پر اس کا جابرانہ اقتدار ہے۔ اس طبقے کے پاس بے حساب دولت ہے سائنس اور ٹکنالوجی کی جدید ترین ایجادوں سے یہی طبقہ فائدہ اٹھا رہا ہے، اس کی دولت، اس کا طرز زندگی اور اسلوب حیات ہر اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک جیسا بلکہ بعض صورتوں میں اس سے بھی بہتر ہے۔ اکیسویں صدی کا مطلب یہ ہوگا کہ ترقی یافتہ دنیا میں آسائش اور تعیش کی جو فراوانی ہے وہ سب ہندستان کے اس بمشکل ۲۰ فیصد طبقے کو میسر ہوگی اس کی بنیاد پر فیصلہ

کرنا کہ ہندستان بھی ترقی کر گیا ہے جنت الحمقاء میں رہنا ہے یا جان بوجھ کر خود کو فریب میں مبتلا رکھنا ہے۔ اس ملک میں آج بھی لاکھوں انسان بھیک مانگ رہے ہیں، لاکھوں ہیں جو کتّے بلّی سے بدتر زندگی گذار رہے ہیں، لاکھوں ہیں جو سڑک کی پٹری پر راتیں گذارتے ہیں، لاکھوں ہیں جن کو پڑھنا نصیب نہیں ہوا، جنھوں نے پڑھ لیا انھیں کوئی روزگار نصیب نہیں ہو سکا۔ جواہر روزگار یوجنا جیسی کتنی اسکیمیں جتنی کاغذ پر تکمیل پا چکی ہیں اتنی آپ بچشم سر نہیں دیکھ سکتے۔

غرض یہ بڑی طویل داستان درد ہے۔ اب غیر ملکی سرمایہ آئے گا وہ متوسط طبقے کو اور مفلس بنائے گا اس لیے کہ وہ بنیادی ضرورت کی اشیاء کم پیدا کرے گا، بیوٹی کریم، اسکاچ وسکی اور کوکا کولا جیسی چیزیں زیادہ بنائے گا۔ جو بھی سرمایہ کاری کرے گا وہ اپنی خوش حالی اور معاشی اقتدار قائم کرنے کے لیے کرے گا، میرے آپ کے دلدّر دور کرنے کے لیے نہیں۔

یہ مختصر سا نقشہ ہے اس اکیسویں صدی کا جس کے آنے میں پانچ برس اور رہ گئے ہیں۔ اس میں مسلم سماج کا حال کیا ہوگا؟ ساری دنیا کے مسلمانوں کا سماج ایک جیسا نہیں ہے، تقاضے اور ضرورتیں بھی یکساں نہیں ہیں ترقی یافتہ دنیا کے مسلمان زیادہ تر مہاجر ہیں اور مختلف قومیتوں سے تعلق رکھتے ہیں ترقی پذیر ممالک میں مسلمانوں سے نسلی تعصب برتا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے بھی خود کو اپنے ملک کے لیے ASSET نہیں بنایا LIABLITY بنے ہوئے ہیں۔

اب رہے تیسری شق کے ممالک ان میں بھی مسلمانوں کی پوزیشن ایک جیسی نہیں ہے۔ کہیں وہ اکثریت میں ہیں اور ان کی اپنی حکومت ہے مگر وہ امریکہ کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں، کہیں وہ اقلیت میں ہیں اور اس ملک کی بڑی صنعتوں میں ان کا کوئی نمایاں حصہ نہیں ہے۔ ہر ملک کی صورت حال اتنی مختلف ہے کہ ہم اکیسویں صدی میں ساری دنیا کے مسلم سماج کے بارے میں کوئی پیشین گوئی نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ ہندستان کے مسلمانوں کے مستقبل پر قیاس آرائی کر سکتے ہیں۔

ہندستانی مسلمانوں کا حال یہ ہے جیسے کسی مریض کو متعدد امراض نے بیک وقت نشانہ بنا لیا ہو اور طبیب کی عقل بھی کام نہ کرے کہ پہلے کس مرض کا علاج کیا جائے۔

ضروریات دین سے بے خبری عام ہے، اس لیے اپنے کلچر اور ثقافت سے رشتہ ٹوٹ رہا ہے، اس سے زبان و ادب کو بھی خطرہ ہے۔ جب اپنی حقیقت سے انسان بے خبر ہو تو خود اپنی نگاہ میں بے وقعت ہو جاتا ہے۔ بعض مسائل ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہیں، منطق کی اصطلاح میں دَور لازم آگیا ہے وہ جو غالب خستہ نے کہا تھا بس وہی آج کے مسلمان کا حال ہے کہ:

پیچھے ڈالی ہے سر رشتہ تقدیر میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بن ناخن تدبیر میں کیل

مسلمان تعلیم میں اتنا پچھڑ گیا ہے کہ اپنی پوری تاریخ میں کبھی اتنا پس ماندہ نہیں رہا، تعلیمی پس ماندگی سے اقتصادی بدحالی جڑی ہوئی ہے اور ان دونوں کا ثمرہ ہے سیاست میں بے شعور اور غیر موثر ہونا۔ سیاست میں بے اثر ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ برادرِ وطن سے سیاسی اور سماجی تعلقات میں استواری نہیں ہوتی۔ سیاست داد و ستد کا کھیل ہے، اس سے فرقہ وارانہ مسائل پیدا ہوتے ہیں اور اسی بے خبری نے بشریت عامہ کے بین الاقوامی مسائل سے مسلمانوں کو بے تعلق سا کر دیا ہے اِن کے نام نہاد رہنما اردو، مسلم یونیورسٹی، اوقاف، پرسنل لا جیسے چند مسائل سے آگے سوچتے ہی نہیں یا شاید انھیں سوچنے کی فرصت نہیں دی جاتی۔ ہندستانی مسلمانوں نے اپنے حصار میں خود کو بند کر لیا ہے۔ بڑے قومی اور بین الاقوامی مسائل پر ہندستانی پارلیمنٹ میں مسلمان ممبروں کی آواز کبھی نہیں گونجتی۔ اس ملک کی سماجی اقتصادیات میں مسلمانوں کا حصہ کم سے کمتر ہو گیا ہے۔

قوموں کی سیادت کو ناپنے کا اصل پیمانہ ان کے نظریات و افکار ہوتے ہیں مسلمانوں میں تعلیم کی کمی نے ایک طرف بلند ہمتی اور بلند خیالی سے عاری کر دیا ہے دوسری طرف

انھیں زود حس اور زود رنج بنا دیا ہے ان کے ایک دم بھڑک اٹھنے کا سبب بے بسی کا غیر شعوری اور شعوری احساس بھی ہے۔

بہت سے لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر وہ پراگندہ اور سراسیمہ ہیں اور ان کی طاقت تھوڑی ہے اس لیے وہ دل شکستہ رہتے ہیں، جن کے جذبات زیادہ شورانگیز ہیں وہ بے بسی کے احساس میں زیادہ مبتلا ہیں ایسے لوگوں کے لیے یاس اور شکستہ خاطری کے سبب سے نفسیاتی اور روحانی طور پر ناکارہ ہو جانے کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جب قوت نفاذ ہمارے پاس نہ ہو تو ہوش مندی اور تحمل کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے ورنہ

کون سنتا ہے فغانِ درویش
قہر درویش بہ جانِ درویش

ہم نہ کسی بڑی جنگ کو روک سکتے ہیں نہ برسرِ پیکار حکومتوں سے ان کے ہتھیار چھین سکتے ہیں نہ انھیں ضائع کر سکتے ہیں نہ ممالک کے باہمی جھگڑے ختم کر سکتے ہیں نہ تعلیمی نظام میں انقلاب لاسکتے ہیں صرف اس کی خرابیوں پر کڑھ سکتے ہیں، انھیں بھگت سکتے ہیں، اس لیے ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ حکومت غلط انداز فکر سے چل رہی ہے، اس انداز فکر کو بدلے بغیر نجات ممکن نہیں اور یہ تبدیلی ایک دن میں نہیں آتی، یہ دھرنوں اور مظاہروں، نعروں اور جلسوں سے بھی نہیں آتی۔ یہ اس طرح آتی ہے کہ ہم صبر و تحمل، ہمت اور برداشت، دور اندیشی اور نظم و ضبط کے ساتھ ایسے خیالات کی پرورش کریں اور تبلیغ کریں جو سب انسانوں کو ترغیب دیں، ان کی کاہلی اور کسل مندی اور شکستہ خاطری کو انقلاب آفریں حوصلے میں بدل دیں۔

اپنے معاشرے میں جو تبدیلی ہم دیکھنا چاہتے ہیں اس کا واضح نقشہ ذہن میں ہونا ضروری ہے جس نظام کو اکھاڑ پھینکنا ہے اس کی جگہ لینے والا متبادل نظام پہلے سوچنا ہوگا۔ انقلابی فکر کا یہ خاصہ ہے کہ اگر اس میں وضاحت ہو تو قوت اور تاثیر بھی اسی نسبت سے ہوتی ہے۔ اسلام ایک واضح نظام فکر تھا کہ قرآن کے لفظوں میں قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔ دیکھ لیجیے کیسی برق رفتاری سے سارے عالم پر چھا گیا تھا۔ یہ سمجھنا کہ ہم کیا ہماری فکر کیا؟ چہ پدّی چہ پدّی کا شوربا — یہ صحیح نہیں۔ دنیا کا ہر بڑا انقلابی نظریہ کسی فرد واحد کے ذہن میں پیدا ہوا ہے وہ سارے نظام جنھوں نے پورے عالم بشریت کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے کسی ایک شخص کے ذہن میں پہلے پہل اُبھرے ہیں۔ اس کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں مگر پھر آپ کارل مارکس اور روسو کو یاد کر لیجیے۔ دنیا کے پاس کتنے ہی ایٹم بم اور ہائڈروجن بم ہوا کریں مگر آخر کار غلبہ انقلابی فکر کو ہی حاصل ہوتا ہے عام انسان کی بہبود کے لیے جو حل سوچا جائے گا وہ بھلے ہی ہماری زندگی میں برگ و بار نہ لائے مگر ایک دن اسی کا دور دورہ ہوگا۔ تاریخ میں اب تک ایسا ہی ہوا ہے۔ بڑے افکار جان سے بھی زیادہ پیارے ہو جاتے ہیں اسی لیے انسانیت کی تاریخ میں جتنی قربانیاں دی گئی ہیں وہ نظریے کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے ہی تھیں عربی شاعر کہتا ہے:

قِفْ دُوْنَ رَأْیِکَ فِی الْحَیَاۃِ مُجَاھِدًا
اِنَّ الْحَیَاۃَ عَقِیْدَۃٌ وَجِھَادُ

زندگی میں اپنے اعلیٰ نصب العین پر جہاد کرتے ہوئے جمے رہو، زندگی اسی کا نام ہے کہ ایک مضبوط عقیدہ ہو اور اس کے لیے جہاد کیا جائے۔ عقیدے کی حفاظت اس طرح کرنی پڑتی ہے جیسے حکومتیں اپنی سرحدوں کی نگرانی کرتی ہیں۔ مگر یہ دفاعی کوشش باطل عقائد اور مخالف قوتوں سے عقیدۂ حقہ کو بچائے رکھنے کے لیے ہوتی ہے، خود باطل عقیدہ جہاد سے بھی قائم نہیں رہتا البتہ سماج میں بگاڑ اور فساد نفرت اور عناد ضرور پیدا کر دیتا ہے جس کی مثال میں بابری مسجد کے قضیے کو یاد کر لیجیے۔

مگر سیاسی اعتبار سے اس قضیے میں مسلمانوں کا موقف کمزور رہا، ڈپلومیسی تو یہ ہوتی کہ قضیہ حکومت اور رجعت پرست جماعتوں کے درمیان رہتا، مسلمان صرف تماشائی بن جاتے۔ مگر کیا کہیں اور کس سے کہیں؟ ابن ابی الحقیق مدینہ کے یہودیوں میں بڑا شاعر تھا، جب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے کے قبائل کو ان کے ظلم اور استحصال سے نجات دلائی اور انھیں یثرب سے بے دخل کر دیا، اس وقت ابن ابی الحقیق نے اپنی قوم کے بارے میں کچھ اشعار لکھے تھے اور عبرت کا مقام ہے کہ آج وہ اشعار خود مسلمانوں پر صادق آرہے ہیں، اس نے کہا تھا:

سَئِمتُ وَأَمسَيتُ رِهنَ الفِراشِ
مِنْ جُرْمِ قَومِي وَمِنْ مَغْرَمِ
وَمِنْ سَفَهِ الرَّأيِ بعدَ التَّنَهِّي
وَعَيبِ الرَّشَادِ وَلَم يُفْهَمِ
فَلَو أَنَّ قَومِي أَطَاعُوا الحَلِيمَ
لَم يَتَعَدَّوا وَلَمْ يُظلَمِ
وَلَكِنَّ قَومِي أَطَاعُوا الغُوَاةَ
حَتّى تَعَكَّسَ أَهلُ الدَّمِ

(ترجمہ: اپنی قوم کے جرم سے اور اس جرم کے بوجھ سے
میں تھک چکا ہوں اور بستر سے لگ گیا ہوں۔
سمجھانے کے باوجود ان کی رائے کی پستی سے، کہ
انھوں نے نصیحت میں بھی عیب نکالے اور بات کو
سمجھ کر ہی نہ دیا۔
اگر میری قوم دانشمندوں کا کہا مان لیتی تو اس
پر یہ ظلم نہ ہوتا۔
مگر میری قوم نے تو بہکانے والوں کی پیروی کی۔
انجام یہ ہوا کہ مخالفوں نے ہمیں ڈس لیا!)

دیمک، شہد کی مکھی اور چیونٹی جیسی حقیر مخلوقات بھی فطرت کے قوانین کی پابندی کرتی ہیں۔ تنظیم، اتحاد اور سخت اجتماعی محنت ان کے امتیازات ہیں، ہم اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اگر ان حشرات الارض سے بھی گئے گذرے ہوں تو یہ محض "اپنے منہ میاں مٹھو" والی بات ہے۔ شہد کی مکھی کو تنظیم کا درس اللہ نے پوشیدہ طور سے دیا ہے: وَاَوحىٰ رَبُّكَ اِلَى النَّحلِ ہم سے تو ہماری زبان میں اور کھلے لفظوں میں کہا ہے: وَاعتَصِمُوا بِحَبلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا۔ مگر ہم نے سنت الٰہیہ کی خلاف ورزی کو اپنا شعار بنا لیا اور بکھرتے چلے گئے۔ یہی ہمارے زوال وانحطاط کا سبب ہے۔ زوال کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ افراد ہوں یا قومیں جب زوال میں مبتلا ہوتی ہیں تو انھیں اسباب زوال سے محبت ہو جاتی ہے اسی لیے وہ زوال کے بھنور سے نکل نہیں سکتیں۔ ہمیں یہ غور کرنا ہوگا کہ ہمارے اسباب زوال کیا ہیں؟ اور کیا ہمیں ان سے محبت ہو گئی ہے؟ اسلام نے ان سب باتوں کو حرام کر دیا تھا جو امت کے زوال کا سبب ہو سکتی ہیں اور جن کی محبت ہمیں راہ راست سے بھٹکا سکتی ہے۔ اخوت مساوات تنظیم و اتحاد تعلیمات اسلامی کی روح ہیں، یہ روح نکل جائے تو ہمارا اسلام کھوکھلا اور بے جان رہ جاتا ہے۔ یہ روح اسلام کی قوت ہی ہے کہ اتنا بکھرنے پر بھی مسلم سماج میں ایک اجتماعی رشتہ موجود ہے۔ پروفیسر کینٹ ویل اسمتھ نے لکھا ہے:

MUSLIM SOCIETY HAS A
REMARKABLE SOLIDARITY THAT
THE LOYALTY AND COHESION OF
ITS MEMBERS ARE INTENSE. THE
RELIGIOUS CONVICTION OF A
MUSLIM IMPLIES PARTICIPATION
IN THE GROUR.
(ISLAM IN MODERN HISTORY
P. 18

(۳)

مسلمانوں کے مسائل۔ خصوصاً ہندستان کے مسلم سماج کے حال اور مستقبل پر گفتگو کرنا ایسا ہے جیسے بھڑوں کا چھتا چھیڑ دیا جائے یا مینڈکوں کو ترازوں میں تولنے کی کوشش کی جائے، اس لیے میں بھی موضوع سے کچھ دور نکل گیا۔ دراصل جو لوگ ان مسائل پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں ان کے ذہنی اور روحانی کرب کا کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔ عربی زبان کے شاعر احمد زکی ابوشادی نے کہا تھا:

وَغُرْبَةُ الفِكْرِ فِي دَارٍ يُمَجِّدُهَا
أَقْسَى عَلَى الحُرِّ مِنْ فِقْدَانِ نَاظِرِهِ

(ایک آزاد انسان جس ملک کی عظمت کے ترانے گاتا ہو، وہاں اُس کے افکار کا اجنبی ہو جانا، اس انسان کے اندھا ہو جانے سے بھی بڑی مصیبت ہے)

آج سائنس اور ٹکنالوجی نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ ہم اپنی آواز لاکھوں میل تک چند سکنڈ میں پہنچا سکتے ہیں مگر انسان کے کانوں سے اس کے دل کا فاصلہ ایک بالشت سے زیادہ نہیں ہے، وہاں تک اپنی بات پہنچا دینا کبھی کبھی پیغمبروں سے بھی ممکن نہ ہو سکا۔

اگر مسلم سماج میں تبدیلی، تغیّر، تجدّد یا انقلاب کی بات کی جائے تو چند باتوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ پہلی بات تو یہ کہ تغیّر اور تجدید قانونِ فطرت ہے، سُنّت الٰہیہ ہے، اِسی پر نظامِ کائنات کا دار و مدار ہے۔ بقول اقبال:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

خود انسان کی پیدائش کے مرحلوں پر شروع سے آخر تک غور کر لیجیے، نباتات کو دیکھ لیجیے فطرت ان کے اوراق بھی بلٹتی رہتی ہے، موسموں کو دیکھ لیجیے، ستاروں کا مشاہدہ کر لیجیے۔ یہی نظر آئے گا کہ

آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آینہ دائم نقاب میں

اسی طرح ہر تہذیب اور مذہب اپنے ماضی اور مبہم مستقبل کے درمیان دبا ہوا ہے۔ تہذیبیں بھی پھلتی پھولتی ہیں، زور پکڑتی ہیں، پھر افسردہ ہوتی ہیں، آخر مردہ ہو جاتی ہیں۔ اب تک کی معلوم ہسٹری میں دنیا کی ۲۸ بڑی تہذیبیں فنا ہو چکی ہیں۔ سماجی انقلاب اور تجدّد کا تعلق بھی مذہب سے نہیں تہذیب سے ہے۔ اس لیے تجدّد اور تغیر کا انکار یا اس سے چشم پوشی خود قوموں کے حق میں زہر ہو جاتی ہے۔ مگر معاشرت کا تعلق جغرافیہ سے بھی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو جس نشأۃ ثانیہ کی ضرورت ہے، ہو سکتا ہے وہ ملیشیا یا مراکو کے مسلم سماج کی ضرورت نہ ہو۔

دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ تجدّد اور انقلاب میں ڈگری کا فرق ہے۔ انقلاب ہر پرانی روایت کی نفی کر دیتا ہے اور دوسرا نظام لے آتا ہے، تجدّد اسی رائج نظام کی شریانوں میں نیا خون دوڑانے کا نام ہے۔ تجدّد کے نام سے بھڑکنے کی ضرورت نہیں البتہ اس کی حدود اور نوعیت کو متعین کرنا ضروری ہے۔

تیسری بات یہ کہ تجدّد اور اصلاح کی نوعیت کو جانچنے کے دو پیمانے ہیں، مثلاً مسلم معاشرت میں تبدیلی کا ایک اسلامی نقطۂ نظر ہوگا، دوسرا غیر اسلامی۔ غیر مسلم حلقوں سے بھی اگر اصلاحِ معاشرہ کی کوئی آواز آتی ہے تو اس پر دھیان ضرور دینا چاہیئے۔ ہماری کمزوریاں اکثر خود ہمیں نظر نہیں آتیں مخالف کی آنکھ پہلے کمزوریوں پر ہی پڑتی ہے۔ پھر، ایک ایسے سماج میں جہاں بھانت بھانت کی زبانیں، مختلف کلچر، رنگا رنگ رسمیں اور مذاہب ہوں، کسی تہذیب کو پھلنے پھولنے کے لیے مفاہمت، رواداری اور تفاعل INTERACTION کے بغیر چارہ نہیں۔ وہ دنیا جس میں دوسری تہذیب اور مذہب کو نظر انداز کر کے زندہ رہ سکتے تھے ختم ہو چکی ہے، آج زمین کی طنابیں کھنچ چکی ہیں، دنیا بھر کی قوموں اور ملکوں کا ایک دوسرے پر انحصار بڑھ گیا ہے اس لیے دوسروں کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنا اور ان سے سمجھوتا کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ علم بھی اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ اگر ہم دوسرے مذاہب اور تہذیبوں سے باخبر نہ ہوں تو آج کی دنیا کے معیار سے جاہل کہلائیں گے۔

اب آخر میں، درازنفسی اور سمع خراشی کی معذرت کے ساتھ، دو باتیں اور عرض کروں گا ایک تو یہ آنے والی صدی کے مسائل کیا ہوں گے؟ دوسرے یہ کہ ان حالات میں ہندوستان کے مسلم سماج کو کیا کرنا ہوگا۔

مسائل تو، یہ ہیں کہ سرمایہ بڑھے گا، کچھ مالک اپنی اقتصادی بالادستی میں اور زیادہ مضبوط ہو سکتے ہیں آسایش کا معمولی سامان جیسے موٹر، ٹیلی وژن، ویڈیو وغیرہ

خوش حال ملکوں کے تقریباً ہر گھر میں موجود ہے، اس لیے ان چیزوں کی کھپت انھیں پیدا کرنے والے ملکوں میں کم ہوتی جارہی ہے اور یہ سامان ترقی پذیر ملکوں میں بھی گھر گھر پہنچ چکا ہوگا، غیر ترقی یافتہ ممالک میں ان کے خریدار زیادہ ہوں گے اس لیے ان کی عوامی اقتصادیات کا ایک حصہ اس ذریعے سے صنعتی ملکوں کو ملے گا ترقی یافتہ ممالک اپنی اقتصادی حالت مضبوط رکھنے کے لیے بھاری مشینیں اور جنگ میں کام آنے والے زیادہ سے زیادہ مہلک اسلحہ بنائیں گے۔ جو ممالک انھیں خریدیں گے وہ کبھی نہ کبھی ان کا استعمال بھی کریں گے۔ ایٹمی اور کیمیائی ہتھیاروں کی تعداد و مقدار بھی آج سے کئی گنا زیادہ ہوگی آبادی بھی اس صدی کے وسط تک دوگنی ہو سکتی ہے۔ بہت زیادہ اندیشے اس بات کے ہیں کہ تیسری عالمگیر جنگ چھڑ جائے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد LEAGUE OF NATIONS کا قیام عمل میں آیا تھا، دوسری جنگ عظیم کے بطن سے U N O کا جنم ہوا، اب جو تیسری عالمگیر جنگ ہوگی وہ دنیائے واحد یعنی ONE-WORLD GOVT کے لیے بڑی حد تک راستہ صاف کر سکتی ہے دنیائے واحد میں بھی محروموں اور مسکینوں کو کون پوچھے گا وہ بھی ان ملکوں کا اقتدار ہوگا جو سرمایہ دار ہوں گے، طاقت ور ہوں گے اور صنعتی پیداوار جن کے قبضۂ قدرت میں ہوگی۔

اکیسویں صدی میں GLOBE کے رنگ بہت کچھ بدل جائیں گے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے قدم اور آگے بڑھ چکے ہوں گے، ممکن ہے کسی دوسرے سیارے میں نوآبادیاتی نظام کی بنیاد پڑ جائے۔ STAR WAR کا بھی خطرہ ہے۔

معاشرتی سطح پر آزادی نسواں میں اضافہ ہوگا۔ جو ملک آج پس ماندہ ہیں ان میں بھی اباحتی معاشرہ یا PERMISSIVE سوسائٹی تیز رفتاری سے بڑھے گی۔ اخلاقیات صرف یونیورسٹی میں تحقیق کا ایک DISCIPLINE بن کر رہ جائے گی۔

جنسی سطح پر اباحتی سماج کو بے باپ کے بچے بھی زیادہ ملیں گے۔ ایڈز AIDS کی بیماری اور پھیلے گی، طلاق کے واقعات میں اضافہ ہوگا، کیمیاوی کھادوں، ہتھیاروں اور دوسری جراثیم کش داؤں سے کینسر اور بلڈ پریشر بڑھے گا۔ اعصابی تناؤ بھی آج سے زیادہ ہوگا۔ ہمارے اس عہد کو بھی لوگ "سنہرا زمانہ" کہہ کر یاد کریں گے!

آنے والی صدی تناؤ، تحیّر اور CONFUSION کی صدی ہوگی۔ اس ماحول میں اسلام بہت اہم رول ادا کر سکتا ہے بہ شرطیکہ مسلمان خود کو اس رول کے لیے تیار کر لیں۔ اس نئی صدی میں اجتہاد کا دروازہ کھولے بغیر کام نہیں چلے گا۔ اور اس کے لیے ہمارے علماء و فقہاء کو اپنا رویہ حالات کی رعایت سے نرم اور لچکیلا بنانا ہوگا۔ اب تک مسلم معاشرت دوسری تہذیبوں کے اثرات قبول کرتی رہی ہے، نئی صدی میں دوسری معاشرتیں مسلمانوں سے کچھ سیکھ سکتی ہیں۔ اس دور کے مسائل معاشرتی سطح پر MATERIALISM VS SPIRITUALITY مادّیت بنام روحانیت اور GENERAL HUMAN ETHICS VS PERMISSIVENESS یعنی اباحت بنام انسانی اخلاقیات ہوں گے۔ زندگی پر مادّیت کی گرفت سخت ہو جانے پر شدید روحانی پیاس پیدا ہوگی اس کا علاج اسلامی تصوف کے پاس موجود ہے بہ شرطیکہ اسے صحیح ڈھنگ سے اور اخلاص کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ ہمارے علماء اور اہل خانقاہ اگر رواج زمانہ کے مطابق عصری مسائل سے آگاہ رہ کر یورپ، امریکا، مشرق بعید وغیرہ میں خاموش مصلحانہ تبلیغ کے لیے نکلیں گے تو انھیں دوسروں کے مقابلے میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

برنارڈ شا کا یہ قول تو بہت مشہور ہے کہ مستقبل کے انسان کا مذہب اسلام ہے۔ دنیا کے سامنے اسلام کو جس ڈھنگ سے پیش کرنا چاہیے تھا وہ ہم نے نہیں کیا ورنہ شا کے اس قول کی صداقت ظاہر ہونے لگتی۔ اسلام میں دنیا کے ہر انسان کو متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

PROF. پروفیسر ولفرڈ کینٹول اسمتھ

WILFRED CANTWEL SMITH نے صحیح لکھا ہے:

" MANIFESTLY ISLAM COULD NEVER HAVE BECOME ACROSS THE CENTURIES ONE OF THE FOUR OR FIVE GREAT WORLD RELIGIONS HAD IT NOT, LIKE THE OTHERS, HAD THE QUALITY OF HAVING SOMETHING PROFOUND AND RELEVANT AND PERSONAL TO SAY DIRECTLY TO ALL SORTS AND CONDITIONS OF MEN OF EVERY STATUS, BACKGROUND, CAPACITY, TEMPERAMENT AND ASPIRATION. "
(ISLAM IN MODERN HISTORY
PAGE: 9

اسلام دنیا کو عظمت انسان کا تصور دیتا ہے اس سے EXPLOITATION پر روک لگتی ہے جنس کے معاملات میں ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت دیتا ہے، مگر جنس کو اخلاق اور شریعت دونوں کی شدید نگرانی میں رکھتا ہے اس سے AIDS جیسا خطرہ کم ہو سکتا ہے۔ مغربی فکر نے کائنات کو ایک خودکار AUTOMATIC MACHINE سمجھ لیا ہے جو بے مقصد خود بخود چل رہی ہے اس سے اس نفس کا انکار لازم آتا ہے جس پر مادّے کی حقیقت منکشف ہو رہی ہے۔ اگر روح بے حقیقت ہے تو جو کچھ اس پر منکشف ہو رہا ہے اس کی حقیقت کیا ہو سکتی ہے؟ اسلام ہمیں عرفان نفس کی راہ دکھاتا ہے اور انفس کا رشتہ آفاق سے جوڑتا ہے، وہ روح کو امرِ ربّ کہتا ہے اور مادّے کے بارے میں کہتا ہے کہ اللہ نے کُنْ (ہوجا) کہا اور یہ کائنات پیدا ہو گئی (فیکون) اس طرح مادّہ بھی امرِ ربّ ہوا۔ مادّہ اور روح دونوں کا درجہ برابر ہو گا۔ پھر نفس یعنی (روح) کے لیے حدیث میں کہا گیا: مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا، اس طرح نفس کی حقیقت اعلیٰ ہو گئی۔ نئی صدی میں تصوف کی اہمیت خصوصاً دوسری اقوام کے لیے بہت زیادہ ہو گی اور اس کے ذریعے سے انھیں اسلام کی آفاقی اقدار اور تعلیمات کی طرف لایا جا سکے گا۔

مستقبل سے مایوس تو نہیں ہونا چاہیے، مگر کسی تیاری اور مجاہدے کے بغیر خوش آیند مستقبل کے خواب دیکھنا حماقت ہے۔ سب سے پہلا، نہایت اہم، نہایت ضروری کام یہ ہے کہ امت اپنے سارے فضول خرچ بند کر کے اپنی بساط بھر پورا سرمایہ اور ساری کوشش تعلیم کے فروغ میں لگا دے ورنہ اگلی صدی میں بھی اس کا حصہ دُور کا جلوہ ہی ہو گا۔ ہم تو خیر قید حیات و بند غم سے چھوٹ چکے ہوں گے اور شاید ایک حسرت و حرمان بھرا دل، زخمی احساس اور کرب آگیں روح اپنے سامان سفر میں لے جائیں گے۔

اگر ماضی منور تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر
جو مستقبل کبھی ہو گا درخشاں ہم نہیں ہوں گے

(یہ خطبہ مجلس تعمیر ملت حیدرآباد کے ایک جلسے میں پڑھا گیا ۱۹۹۴ء)

اردو گلستاں

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا منتخب روزنامچہ

۲۰ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۲ دسمبر ۱۹۳۰ء
یوم جمعہ ۔ مقام دھلی

سیاسی } سیاست میں جھوٹ بولنا پڑتا ہے کہ پبلک جھوٹ سے خوش ہوتی ہے۔ مگر خدا جھوٹ سے ناراض ہوتا ہے۔ جھوٹ بولیں تو پبلک خوش ہو۔ سچ بولیں تو خدا خوش ہو اور سچ بولیں تو پبلک ناخوش ہو اور جھوٹ بولیں تو خدا ناخوش ہو۔ اس دشواری کے باوجود سیاست ہر قوم اور ہر فرد کے لئے زندگی ہے جو سیاست سے علیحدہ ہوا مر گیا۔

قومی } انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ اور نواب صاحب بھاولپور کی صدارت کے نہایت دلچسپ اور جدت مآب پوسٹر اخبار "حمایت اسلام" لاہور اور اخبار "شیر" رنگون میں شائع ہو رہے ہیں۔

تلقین حیات } نرم الفاظ کو سخت لہجہ میں ادا کرنا اور سخت الفاظ کو نرم لہجہ میں ادا کرنا زندگی کے مقاصد کو جلدی پورا کر دیتا ہے اور لوگ ایسے حکمت والے شخص سے ناراض نہیں ہوتے۔

شاہ سید ضمان الرحمان } مودودی پیرزادہ ہیں۔ درویش صفت ہیں۔ سند یافتہ طبیب ہیں۔ علمیت بھی اچھی ہے مگر خوشنویسی اور کتابت کر کے گذر اوقات کرتے ہیں۔ لمبا قد ہے۔ دبلا بدن۔ ڈاڑھی اور سر کے بال بڑے۔ بہت کم سخن اور نیک آدمی ہیں۔ عربی اور اردو خط بہت اچھا ہے۔ عرصہ دراز سے میرے ہاں کام کرتے ہیں اور مودودی ہونے کی وجہ سے میں ان کو اپنا پیرزادہ سمجھتا ہوں۔

آپ بیتی } صبح پرنس بدرالدین نظامی کی بیگم صاحبہ کو دم کرنے گیا آج اُن کا دورہ سخت تھا۔ کہنے لگیں۔ میرا آخری وقت ہے۔ یٰسین سنائیے اور میرے بچوں کی تعلیم کا خیال رکھئے۔ میں نے تسلی دی۔ پھر چہل قدمی کے لیے بچوں کے ساتھ گیا۔ اس کے بعد تین بجے تک کام کیا۔ پھر بچوں کے ساتھ دہلی گیا۔ صادقہ اور کوثر اور زید بھی گئے۔ ساڑھے پانچ بجے واپس آیا۔ اور میاں سر فضل حسین صاحب سے ملنے گیا۔ اور ان سے گفتگو کر کے دہلی گیا۔ سات بجے واپس آیا۔ کھانا کھایا۔ ڈاک پڑھی۔ اخبار پڑھے۔ نو بجے کے بعد سویا۔ گاؤزبان پی کر سویا تھا۔ نیند خوب آئی۔ چار ماشہ گاؤزبان ایک تولہ مصری ہلکا سا جوش دیکر چاء کی طرح پی لیتا ہوں۔ نیند کے لئے یہ نسخہ اکسیر ہے۔ صبح چار بجے تک نہایت بے خبری کی نیند آئی۔ زید آج شام کو بہت رویا۔ کہتا تھا موٹر کا کھلونہ دلوادو۔ میں نے کہا گھر میں موٹروں کے بہت سے کھلونے موجود ہیں۔ ولایت والوں کی اصلی موٹروں نے ہم کو اور نقلی موٹروں نے ہمارے بچوں کو پریشان کر دیا ہے۔ پارہ آج ۵۱ درجہ

پر تھا۔ گرمی ۳ درجے بڑھ گئی۔

۲۱؍رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۳؍دسمبر ۱۹۳۰ء
یوم شنبہ۔ مقام دھلی

سیاسی } سیاست ایک پان ہے جس میں کتھ رنگ کا ایک پردہ ہے۔ تو چونہ کی تیزی کو اس کی شکل بدل کر مخفی کر لیتا ہے اور چھالیہ ایک حکمت عملی ہے جو جبڑہ اور دانتوں کو متحرک کرتی ہے اور تمباکو ایک ڈپلومیسی ہے جس کے ہم لوگ شکار ہو جاتے ہیں۔

قومی } قوم لیڈر کے لئے ایک ایسی جائداد ہے جس پر ہاؤس ٹیکس نہیں لگ سکتا۔

تلقین حیات } نیند ایک بیداری ہے جو کام کرنے والے اعضاء کو اپنے عمل سے زندہ رکھتی ہے۔

عبدالرحیم } ایک لڑکا ہے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر۔ واحدی صاحب کے ہاں خدمت گاری کرتا ہے۔ بہت ہونہار اور ذہین ہے۔ واحدی صاحب کی تربیت اس کے سلیقہ کو سنوار رہی ہے۔

آپ بیتی } نو بجے تک کام کر کے چیف کمشنر صاحب سے ملنے گیا۔ جنھوں نے آج دس بجے ملاقات مقرر کی تھی۔ وہاں مسٹر ہسز اہن مجسٹریٹ و سکریٹری میونسپل کمیٹی نئی دہلی اور پنڈت رام نراین صاحب اور مسٹر محمد سلیمان اکزیکٹو انجینیر نئی دہلی سے بھی ملاقات ہوئی۔ میونسپل کمیٹی نئی دہلی نے وائسرائے کے گورنمنٹ ہاؤس پر ہاؤس ٹیکس یکم دسمبر سے لگایا ہے۔ مسٹر محمد سلیمان وائسرائے کی طرف سے یہ کہتے ہیں کہ گورنمنٹ ہاؤس کا استعمال بہت بعد میں شروع ہوا ہے۔ گیارہ سو روپے کمیٹی کو چھوڑنے چاہئیں۔ اس کا اپیل چیف کمشنر صاحب کے ہاں آیا ہے۔ قانون کی مساوات اس کو کہتے ہیں۔ اس کی زد سے وائسرائے بھی محفوظ نہیں ہیں۔

چیف کمشنر صاحب سے آدھ گھنٹے باتیں کر کے واپس آیا۔ دفتر میں کام کیا۔ ایک بجے کھانا کھایا۔ پھر ایک مہمان سے باتیں کیں وہ چہرہ سے بہت شریف اور تعلیم یافتہ اور بڑے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنے بچوں کے خط دکھائے جن میں ذکر تھا کہ وہ گھر کا سامان فروخت کر کے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لکھا تھا جب کچھ سامان نہ رہا تو گھر کے قفل فروخت کر کے چنے خریدے اور سات دن تک چنے کھائے اور اب تین وقت سے فاقہ ہے۔

میں نے سب خطوط اور حالات پر پورے شبہ کے ساتھ غور کیا اور آخر مجھ کو ان واقعات کا یقین ہو گیا تو جو کچھ میری جیب میں تھا کل کے سفر کا خرچ بچا کر سب ان کی نذر کر دیا اور دو سفارشی خط بھی ان کو دئے۔ دل پر اتنا زیادہ اثر ہوا تھا کہ پھر کچھ کام نہ کر سکا۔ زنانہ میں گیا اور اور اسباب لے کر دہلی گیا۔ واحدی صاحب اور ان کے بچوں کے ہمراہ حکیم ذکی احمد صاحب کے پاس گیا۔ وہ واحدی صاحب کی لڑکی رابعہ کے بخار کا علاج کر رہے ہیں اور اس سے رابعہ کو بہت فائدہ ہے۔

پھر واحدی صاحب کے ہاں آیا۔ سنا بقائی صاحب درد قولنج میں مبتلا ہیں۔ سب دوستوں کے ہمراہ ان کو دیکھنے گیا۔ بہت تکلیف میں تھے۔ دعا دم کر کے واپس آیا۔ احباب کے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر ڈاکٹر محمد عمر صاحب کے ہاں گیا۔ جہاں آج رات کو رہنا ہے۔ خواجہ فضل احمد صاحب شیدا۔ قاری عباس حسین صاحب۔ رضاء اللہ صاحب بی۔ اے انجینیر۔ جمالی صاحب۔ واحدی صاحب غزالی صاحب ساتھ گئے۔ مشتاق احمد صاحب وجدی ایم۔ اے اور میرزا محبوب بیگ صاحب بھی آگئے احباب کی بڑی اچھی مجلس تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے سب کو انگریزی ترازو میں تولا بھیا احسان فقیر عشقی صاحب بھی تھے۔ سید شوکت صاحب نظامی بھی تھے۔ سب سے کم وزن سید شوکت صاحب کا تھا۔ اور سب سے زیادہ وزن جمالی صاحب کا تھا۔ میرا وزن ایک من دس سیر تھا۔ کپڑوں کا وزن کاٹنے کے بعد

گویا ایک مہینہ میں میرا وزن ۲ پونڈ (ایک سیر) بڑھ گیا۔
رات کو بارہ بجے سویا۔ واحدی صاحب کے ہاں مرغ کا قورمہ کھایا تھا۔ خشکی کی وجہ سے نیند نہیں آئی۔ ڈاکٹر صاحب کا مکان مشرق و مغرب کی آرائش کا ایک عجائب گھر ہے۔

۲۲ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۴ دسمبر ۱۹۳۰ء
یوم یکشنبہ۔ سفر کاندھلہ

سیاسی } کل ۱۳ دسمبر لارڈ ہارڈنگ سابق وائسرائے پر بم کا گولہ پھینکنے کی تاریخ تھی اس گولہ سے لارڈ موصوف زخمی ہوگئے تھے اور ان کی لیڈی صاحبہ نے میرا تعویذ بھی ان کی صحت کے لئے استعمال کیا تھا۔ آج کل لارڈ موصوف بھی ہندوستان کی سیاحت کے لئے آئے ہوئے ہیں۔

قومی } مسٹر محمد علی کی تقریر کے بقیہ حصے آج پھر دلی کے اخبارات میں شائع ہوئے ہیں انگریزی طرز ادا کی اس تقریر میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ لیکن ذاتی اوصاف کا ذکر اتنا زیادہ ہے کہ انگریز ان کو سن کر دل ہی دل میں ہنستے ہوں گے۔ ایک بات یہ بھی اس تقریر میں ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کو اپنا سابق سکریٹری کہا گیا ہے۔ اگر یہ بھی کہدیتے کہ ڈاکٹر مونجے ایک معمولی ڈسپنسری کے مالک ہیں اور ان کی ڈاکٹری نہیں چلتی اور ایک دفعہ میں نے اپنے پاؤں کے زخم کے ڈریسنگ کے لئے ایک معمولی کمپونڈر کی طرح فیس دیکر ان کو بلایا تھا تو مسٹر محمد علی کی عزت اور اہمیت بہت بڑھ جاتی۔ جواہر لال نہرو کانگریس کے سکریٹری تھے جبکہ مسٹر محمد علی کانگریس کے صدر تھے۔ وہ مسٹر محمد علی کے ذاتی سکریٹری ہرگز نہ تھے اور نہرو صاحب کو سکریٹری لکھنا نہایت مغالطہ آمیز خودستائی ہے۔ ناواقف خیال کریں گے کہ مسٹر محمد علی اتنے بڑے آدمی رہ چکے ہیں کہ جواہر لال نہرو ان کے نوکر تھے۔ حالانکہ یہ سراسر جھوٹ ہے۔

تلقین حیات } تقریر اور تحریر میں ریاکاری کے بہروپ اور بناوٹی شکلیں بنانے کے بہت سے سامان پوشیدہ رہتے ہیں۔

مولینا حکیم رضی الحسن صاحب } کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے ہیں۔ ساٹھ سے زیادہ عمر ہے۔ بھاری جسم ہے۔ لمبی اور گنجان ڈاڑھی ہے۔ میرے استاد ہیں۔ پچیس تیس سال پہلے میں نے ان سے ایک عربی کتاب پڑھی تھی۔ بہت عابد اور ملنسار پابند وضع بزرگ ہیں۔ مزاج میں اب تک شگفتگی ہے۔ کاندھلہ میں طبابت کرتے ہیں۔ گھر کی زمینداری بھی ہے۔

آپ بیتی } ڈاکٹر محمد عمر صاحب کے مکان پر ہوں ڈاکٹر صاحب نے بہت پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا ہے۔ میری ان کی شرط یہ تھی کہ کھانے میں سادگی ہو مگر ڈاکٹر بانو نے کھانے کے اقسام میں بہت تکلف کر دیا۔

رات کو ملنسار نظامی بھی ملنے آئے تھے مگر صبح کے کھانے میں شریک نہ ہوسکے کیونکہ یہ وقت ان کی نوکری کا ہے۔ واحدی صاحب۔ بھیا فقیر عشقی صاحب۔ جمالی صاحب وجدی صاحب۔ غزالی صاحب وغیرہ احباب شریک طعام تھے۔ منشی قربان علی صاحب اور منشی نذیر حسین صاحب بھی ملنے آئے۔ منشی نذیر حسین صاحب نے سفرنامہ ابن بطوطہ کا پہلا حصہ اردو میں ترجمہ کرا کے شائع کیا ہے۔ بڑے سائز کی کتاب ہے پانسو صفحے سے زیادہ ضخامت ہے۔ ایک جلد میرے لئے بھی لائے تھے۔ میں نے اس کو راستہ میں پڑھا۔

ڈاکٹر صاحب کے ہاں صبح کے وقت بیماروں کا بہت زیادہ ہجوم ہوتا ہے مگر اسی حالت میں وہ مدارات اور مہمان نوازی کے فرائض بھی ادا کر رہے تھے۔ میرے ایک دوست نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ خواجہ صاحب کو مجھ سے چھیننا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہ میری سولہ برس کی کمائی ہیں۔

مجھے سوائے عزرائیل کے اور کوئی نہیں چھین سکتا۔

اور میں اس دائی کی کمائی ہوں جس نے مجھے ماں کے پیٹ سے جنایا تھا اور جس کا نام کرامت تھا۔

پونے نو بجے سید ابن عربی موٹر لے کر آئے اور نو بجے ان کے اور واحدی صاحب اور جمالی صاحب کے ہمراہ موٹر میں شاہدرہ گیا۔ جو دہلی سے تین میل کے فاصلہ پر ہے یہاں سے کاندھلہ سہارنپور کو چھوٹی لائن جاتی ہے۔ مولوی احتشام الحسن صاحب بھی میرے ساتھ کاندھلہ جا رہے ہیں جو میرے استاد مولانا رضی الحسن صاحب کے قرابتدار ہیں اور درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی بستی میں تجارت کتب کرتے ہیں۔

اسٹیشن پر میرٹھ کے عبدالکریم صاحب سے ملاقات ہوئی جو اسی ریل میں گارڈ ہیں۔ ہاپوڑ کے ایک نوجوان ٹکٹ چیکر سے بھی ملاقات ہوئی۔

دس بجے ٹرین روانہ ہوئی واحدی صاحب اور سید ابن عربی واپس چلے گئے۔ میں نے تازہ اخبارات پڑھے۔ پھر کچھ سویا۔ ڈیڑھ بجے کاندھلہ آگیا۔ میرے مرحوم استاد مولانا محمد یحیی صاحب کے صاحبزادہ مولانا ذکریا صاحب بھی پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ سہارنپور جا رہے تھے۔ مولوی اکرام الحسن صاحب بی۔ اے۔ ال۔ ال بی مجھے لینے آئے تھے یہ مولانا حکیم رضی الحسن صاحب کے فرزند ہیں کاندھلہ میں وکالت کرتے ہیں۔

میں کاندھلہ میں مولانا محمد یحیی صاحب مرحوم کے ساتھ ۱۳۱۷ھ یعنی ایک صدی پہلے ۱۸۹۶ء میں آیا تھا اور نمبردار کے مکان میں ٹھہرا تھا۔ گویا آج پورے ۴۲ برس کے بعد یہاں آیا ہوں مولانا حکیم رضی الحسن صاحب میرے آنے سے بہت خوش ہوئے۔ اور فرمایا آخر تم آہی گئے اتنے دن سے آنے آنے کا وعدہ کر رہے تھے آج اس کو پورا کر دیا۔

مولانا کا مکان بہت خوبصورت اور وسیع ہے آسائش کا سب سامان موجود ہے۔ اس مکان کے سامنے وہ مسجد بھی ہے جہاں ۳۲ برس پہلے نماز پڑھا کرتا تھا۔ میں نے امیر سقہ کو دریافت کیا جو میرے زمانہ میں پانی بھرتا تھا اور حافظ قرآن تھا معلوم ہوا دکان کر لی ہے۔ کاندھلہ سے جب گنگوہ پڑھنے کے لئے گیا تو راستہ میں بڑولی قصبہ میں ٹھہرا تھا اور وہاں کے ایک زمیندار حکیم عبدالحمید صاحب کے ہاں کھانا کھایا تھا۔ میں نے ان کو بھی دریافت کیا معلوم ہوا کہ کاندھلہ میں موجود ہیں۔ کیونکہ بڑولی قصبہ جمنا دریا میں غرق آب ہو گیا۔

ظہیر الحسن صاحب ایم۔ اے کچہری چھوڑ کر ملنے آئے۔ اسی خاندان میں ہیں اور بہت زندہ دل اور علم دوست نوجوان ہیں۔ حکیم مولوی عبدالحمید صاحب رئیس بڑولی بھی آئے بوڑھے معلوم ہوتے ہیں۔ ۳۲ برس پہلے بالکل جوان تھے اور بہت خوبصورت تھے۔ اب بھی اُن کے چہرہ پر نورانی ڈاڑھی ہے اور بہت موثر چہرہ ہے۔

محمد یونس صاحب بھی ملنے آئے جن کے لڑکے سے میرے استاد مولانا محمد یحیی صاحب مرحوم کی لڑکی منسوب ہوئی ہیں۔ چہرہ پر تہجد کے آثار تھے۔

ضیاء الاسلام صاحب بھی ملنے آئے۔ جو یہاں کے تعلیم یافتہ رئیسوں میں ہیں اور میرے قدیمی ملنے والے ہیں اور بھی چند ممتاز حضرات ملنے آئے۔

مغرب کے بعد ایک معقول جماعت کے ساتھ کھانا کھانا مولانا حکیم رضی الحسن صاحب نے کھانے میں بہت تکلف کیا تھا وہ میرے روزنامچہ کو عرصہ سے پڑھتے ہیں اور سال میں ایک دفعہ دہلی جاتے ہیں تو مجھ سے بھی ملتے ہیں۔ ایک جینی ہندو منگل سین بھی رات کو ملنے آئے۔ ان کی اہلیہ کچھ بیمار ہیں۔

یہاں علمائے دیوبند کا بہت اثر ہے۔ خیالات اور معاشرت اور عمل ہر چیز میں دیوبندی رنگ موجود ہے۔ دیوبندی لوگ پابند اسلام اور متقی ہوتے ہیں۔ نماز روزہ کی پابندی بھی ان میں بہت ہوتی ہے۔ مگر ایک طرح کی محدود خیالی جو علمائے قدیم کا خاصہ ہے ان میں بھی پائی جاتی ہے

میرے قدیمی استاد حضرت مولانا محمد اسمعیل صاحب بھی کاندھلہ کے رہنے والے تھے جن سے میں نے ابتدائی کتابیں مشکوٰۃ شریف اور جلالین تک پڑھی تھیں اور جن کا مزار بھی

میرے ہاں درگاہ کے قریب ہے اور ان کے بڑے فرزند حضرت
مولانا میاں محمد صاحب بھی میرے استاد تھے۔ اور ان کا مزار
بھی اپنے والد کے برابر ہے اور ان کے دوسرے فرزند حضرت مولانا
محمد یحییٰ صاحب مرحوم سہارنپور میں دفن ہیں۔ جو مجھ کو کاندھلہ
لائے تھے۔ اور پھر گنگوہ میں لے جاکر رکھا تھا اور جہاں میں
ان سے پڑھتا تھا۔ جبکہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب
محدث گنگوہ بھی زندہ تھے۔

اس خاندان میں انگریزی تعلیم بھی ہے اور کئی افراد
گراجویٹ ہیں اور اعلیٰ عہدوں پر ہیں۔

رات کو ساڑھے نو بجے تک مولانا حکیم رضی الحسن صاحب
سے باتیں کرتا رہا۔ وہ اپنی اولاد کی طرح مجھ سے محبت فرماتے
ہیں۔ انھوں نے نہایت بلیغ اور سنجیدہ اشارہ میں مجھ کو
سینما اور تھیٹر دیکھنے سے منع کیا۔ مجھے رمز کی اس ہدایت
میں بہت لطف آیا اور میری سعادت میں اس نصیحت سے
اضافہ ہوا مگر جو نیت میری سینما دیکھنے میں ہے وہ میرے
ضمیر کو مطمئن رکھتی ہے

رات کو نیند خوب آئی۔ میرے استاد قریب کے کمرے
میں تھے۔ وہ بہت چپکے چپکے تہجد کے لئے بیدار ہوئے مگر
میں جاگ رہا تھا۔ لحاف میں پڑا رہا۔ پانچ بجے اٹھ کر وضو
کیا اور تحریری کام میں مصروف ہوگیا۔

موسم اچھا ہے اور خدا کے فضل سے صحت بھی اچھی
ہے۔ ایک صدی کے بعد آیا ہوں اس خیال کا بھی لطف ہے۔
اپنے بزرگوں میں آیا ہوں اس کا بھی گھمنڈ ہے اور محبت کرنے والے
بزرگوں میں ہوں اس سے بھی روح مسرور ہے۔

کاندھلہ آتے وقت جب میں ریل میں سو رہا تھا
انوار الحسن صاحب ہاپوڑ والے ٹکٹ چیکر درجہ میں آئے
اور مولوی احتشام الحسن صاحب سے پوچھا آپ ان کے مرید ہیں
انھوں نے کہا نہیں ان کا مرید ہوں اور نہ معتقد ہوں بلکہ ایک تعلق ان سے رکھتا ہوں۔
میں جاگ رہا تھا۔ تعلق کے لفظ میں بہت بلاغت
تھی اور مریدی و اعتقاد کے انکار کی صداقت کے بعد
ایک اصلی چیز کا اظہار بھی تھا۔ درحقیقت تعلق ہی ہر چیز کی
بنیاد ہے۔ جو ہماری زندگی کی دنیا میں ہم کو ملتی ہے۔ مولوی
احتشام الحسن صاحب بچپن سے درگاہ کے قریب مسجد بنگلہ میں
بغرض تعلیم رہتے تھے اور میری ان کی خوب آزادانہ گفتگو ہوا
کرتی ہے وہ مصر و شام کی عربی کتب اور اردو فارسی عربی کی
درسی وغیرہ درسی کتب کی تجارت کرتے ہیں اور ان کی کوشش
ہے کہ مدارس عربیہ کی ضرورت کی سب کتابیں ان کے ہاں
دستیاب ہوسکیں۔

مولانا کا ملازم امام الدین بہت خاموش اور
مستعد کام کرنے والا ہے۔

مولانا کا نواسہ سعید الرحمٰن بہت پیارا بچہ ہے۔
اپنے نانا کو آبا کہتا ہے۔ چہرہ سے بہت ہونہار معلوم ہوتا
ہے۔ اس کی آنکھوں اور پیشانی میں آثار عروج مکتوب و مرقوم ہیں۔

۲۳۔ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۵ دسمبر ۱۹۳۰ء

یوم دوشنبہ مقام کاندھلہ

ذاتی } صبح نماز کے بعد روزنامچہ لکھا۔ پھر ناشتہ کیا۔
ڈپٹی مظہر الحق صاحب کل بھی تشریف لائے
تھے اور آج بھی تشریف لائے۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب مرحوم
کے خسر جناب حافظ محمد یوسف صاحب بھی تشریف
لائے۔ میرے استاد کے بڑے بھائی مولوی عزیز الحسن صاحب وکیل بھی تشریف لائے
یہ میری قیام گاہ کے برابر دوسرے کمرہ میں رہتے
ہیں۔ تہجد گزار ہیں؟ پچھلی رات سے تلاوت میں مصروف
تھے بہت خاموش اور پرانے زمانہ کے مسلمانوں کا
نمونہ ہیں۔ مولوی احتشام الحسن صاحب کے ہمراہ عیدگاہ
دیکھنے گیا۔ جو تیس سال پہلے بننی شروع ہوئی تھی اور
جب میں یہاں آیا تھا تو اس کی ابتدائی تعمیر دیکھی تھی۔ اس
کا ایک مینار بن گیا تھا۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب مرحوم پاٹ بندھے
ہوئے مینار پر چڑھے اور مجھ سے فرمایا تو بھی یہاں آجا۔
میں نے کہا میں آسکتا ہوں مگر واپس نہ آسکوں گا۔ کیونکہ مجھے
اونچی جگہ جاکر چکر آنے لگتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا۔ حدیث
میں آیا ہے۔ قدم الخروج قبل الولوج۔ داخل ہونے

سے پہلے نکلنے کا راستہ سوچ لو۔ یہ عیدگاہ ۱۳۱۷ھ میں بنی تھی۔ بہت شاندار ہے۔ اتنی بڑی عیدگاہ میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ عیدگاہ کے شمال میں ایک قبرستان ہے جہاں حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب کا مزار بھی ہے۔ مفتی صاحب غدر سے پہلے بہت مشہور عالم تھے اور انھوں نے مثنوی مولانا روم کا آخری دفتر لکھا تھا جو ان کی ایک بہت بڑی یادگار ہے اور بھی بہت سی کتابیں ان کی تصنیف ہیں۔ ان کا مزار بہت شکستہ ہے اور ایک عبرت ناک منظر دکھاتا ہے۔ مجھے علماء کی اس روش سے سخت اختلاف ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے مزارات کو بنواتے نہیں۔ واپس آکر میں نے اپنے استاد حضرت مولانا رضی الحسن صاحب سے اس کے متعلق گفتگو کی کہ جس ملک میں ہم رہتے ہیں وہاں اپنی مسجدوں اور قبروں کو پکا بنوانا سیاسی مصلحت سے بیحد ضروری ہے۔ مولانا اس کے متعلق دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ انھوں نے مصلحت کی ضرورت کو تسلیم فرمایا۔ لیکن شاید وہ اس پر عمل نہیں کریں گے کیونکہ وہ قبروں کا پکا بنوانا جائز نہیں سمجھتے۔

قبرستان سے واپسی میں مولوی عبدالحمید صاحب رئیس بڑولی سے ملنے گیا۔ ان کے بھائی نے مکہ معظمہ میں صولتیہ مدرسہ جاری کر رکھا ہے جس کو تمام ہندوستان والے جانتے ہیں۔ ان سے رخصت ہو کر منگل سین صاحب جینی کی بیمار اہلیہ کو دیکھنے گیا۔ پھر قیام گاہ پر واپس آیا اور اس مکان کو جا کر دیکھا جہاں بتیس برس پہلے میرا قیام ہوا تھا۔ مسعود احمد صاحب ملنے آئے جو پہلے میرے ہاں بنگلہ کی مسجد میں پڑھتے تھے۔ آج معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب جھنجھانہ کے رہنے والے تھے کاندھلہ کے نہیں تھے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کاندھلہ سلطان محمد تغلق کے زمانہ سے آباد ہے ضیاء الاسلام صاحب مجسٹریٹ درجہ اول و رئیس کاندھلہ سے بھی ملنے گیا اور کچھ دیر وہاں بیٹھا۔ انھوں نے مکلف ناشتہ بھی کرایا۔ حافظ ظہیر الحسن صاحب ایم۔ اے سے باتیں ہوئیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ وہ میرے استاد مولانا میاں محمد صاحب مرحوم کے حقیقی نواسہ ہیں۔ آج ان کی فلسفیانہ باتوں کا بڑا لطف رہا اور انہوں نے تعلیمی مسئلہ پر بہت اچھی گفتگو کی اور مختلف قوموں اور ملکوں کے مقصد تعلیم کو بیان کیا اور اس سلسلہ میں روح اور دماغ اور جسم کے فلسفہ تعلیم پر بہت عالمانہ باتیں کیں۔ برناڈ شا انگریز فلاسفر کا ذکر بھی آیا۔ جو آج کل انگریزوں میں بہت مشہور ہے اور اس کی ایک دلچسپ مثال سے میرے قلب پر بہت اثر ہوا۔ میرے استاد کے پوتے حافظ انعام الحسن بھی ملے جو میرے ہاں بنگلہ کی مسجد میں مولانا محمد الیاس صاحب سے پڑھتے ہیں۔

ساڑھے دس بجے کے بعد کھانا کھایا۔ آج بھی ممتاز حضرات شریک طعام تھے۔ گیارہ بجے رخصت ہوا۔ حکیم عبدالحمید صاحب نے دور تک ساتھ دیا اور اکرام الحسن صاحب بی۔ اے اور مولوی احتشام الحسن صاحب اور حافظ انعام الحسن صاحب ریل تک پہنچانے آئے۔ سوا بارہ بجے گاڑی روانہ ہوئی۔ راستہ میں اخبارات پڑھے۔ اخبار اتحاد میں پرنس آف ویلز کی خبر پڑھی کہ ان کو ناچ کا بہت شوق ہے اور وہ لندن کے ایک شخص کے گھر میں رات بھر محفل رقص میں شریک رہے پونے چار بجے شاہدرہ اسٹیشن پر پہنچا۔ سید ابن عربی اور رواحدی صاحب اور انور علی نظامی اور سید نثار علی نظامی اور زید پاشا اور رابعہ پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ ان سب کے ساتھ موٹر میں دہلی پہنچا اور مغرب کے وقت گھر میں آ گیا۔ غسل کیا۔ ڈاک پڑھی مولانا عبدالماجد صاحب دہلوی مہسانہ کے ایک شاہ صاحب اور اپنے چچا کے ساتھ ملنے آئے۔ رات کو سردار اشرف علی خاں صاحب تشریف لائے۔ زید منزل میں ٹھہرے ہیں۔ یہ پرنس محمد بدر الدین نظامی کے خسر ہیں۔ پرنس ممدوح کی اہلیہ کا مزاج بہت زیادہ ناساز ہو گیا ہے اور ان کو وکٹوریہ اسپتال میں داخل کیا گیا ہے اور پرنس دہلی حمید منزل میں چلے گئے ہیں۔ کچھ دیر روحہ اور حور بانو سے باتیں کیں۔ روحہ نے کہا۔ میرا گڈا اپنی بیوی کے پاس حیدرآباد گیا ہوا ہے۔ روحہ کے گڈے کی شادی مہرجہاں کی گڑیا سے ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔ بیٹی تم اپنے بیٹے کو اور اس کی بیوی کو دلی بلا لو۔ کب تک

لڑکی اپنے میکہ میں رہے گی۔ روحہ نے کہا۔ میری دوسری بیٹی یہ گرشیا یہاں موجود ہے۔ اس کے لئے میں نے روئی کی کمری سلوائی ہے۔ میں نے کہا بہت اچھا کیا۔ تمہارے پاس روئی کی کمری نہ ہو تو حرج نہیں۔ تمہاری بیٹی کے پاس ہونی چاہئے نو بجے سو یا تین بجے بیدار ہوا۔ صبح تک کام کیا۔ کیونکہ کل صبح رامپور جانا ہے۔ اور اسی لئے روزنامچہ کے مقررہ عنوان پھر تبدیل ہو گئے ہیں۔

۲۴۔ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۶۔ دسمبر ۱۹۳۰ء

یوم سہ شنبہ۔ سفر رام پور

ذاتی } آج رام پور جانا ہے۔ اس لئے نو بجے تک۔ بورڈنگ ہاؤس میں بیٹھ کر ضروری کام پورے کئے پھر گھر میں جاکر کھانا کھایا اور سردار اشرف علی خاں صاحب کے ہمراہ دہلی گیا۔ سردار صاحب سابق بادشاہ کابل امیر شیر علی خاں کی اولاد میں ہیں اور ان کی لڑکی پرنس محمد بدرالدین نظامی سے منسوب ہیں۔

پرنس بدرشاہ کی اہلیہ کو وکٹوریہ زنانہ اسپتال میں دیکھا اب ان کو نیند آنے لگی ہے۔ اُن کی حالت جنون کی سی ہو گئی تھی مگر آج انھوں نے مجھ سے اور اپنے والد سے بہت ہوش کی باتیں کیں۔ پرنس بدرشاہ کی حقیقی بہن فاطمہ صدیقہ نظامی ریاست مانا ودر کاٹھیاواڑ کی فرماں روا ہیں آج ان کا تار آیا ہے کہ انھوں نے اپنے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر ولی محمد مومن کو بدرشاہ کی امداد کے لئے دہلی روانہ کر دیا ہے۔

ریل پر گیا۔ سید نثار علی نظامی حور بانو کے شوہر ریل تک پہنچانے گئے۔ گاڑی پونے گیارہ بجے دہلی سے روانہ ہوئی۔ سارے درجہ میں اکیلا ہوں۔ آج کل سیکنڈ اور فرسٹ میں بہت کم مسافر ہوتے ہیں۔ کیونکہ مالی پریشانی ہندوستان میں بہت بڑھ گئی ہے۔

میں نے راستہ میں ڈاکٹر جعفر حسین صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی کتاب پڑھی جو انھوں نے ہندی اشعار پر لکھی ہے ان کی اُردو بہت آسان اور دلچسپ اور موثر ہے اور ہندی کلام پر جیسا عمدہ تبصرہ انھوں نے کیا ہے ایسا تبصرہ آج تک میں نے کہیں نہیں پڑھا تھا۔ تبصرہ کیا ہے ہندوستان کی سیاست اور معاشرت اور علوم و فنون پر ایک سبق نامہ ہے جس میں ہر چیز کا فلسفہ ایسی خوبی اور احتیاط سے بیان کیا ہے کہ بچے بھی اس کو سمجھ کر ذہن نشین کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔ کاغذ اور لکھائی عمدہ ہے البتہ غلطیاں کتابت اور طباعت کی رہ گئی ہیں۔ جلد بندی بھی نفیس ہے۔

سفرنامہ ابن بطوطہ کی پہلی جلد بھی پڑھی جو منشی نذیر حسین صاحب دہلوی نے اردو ترجمہ کرکے شائع کی ہے۔

پونے چار بجے مراد آباد پہنچا۔ اسباب میاں عزیز محمد خاں حسن پوری کے سپرد کرکے شہر میں گیا۔ کیونکہ رام پور کی گاڑی ساڑھے چھ بجے جائے گی۔

پہلے مسافر خانے کو دیکھا جو اسٹیشن مراد آباد کے سامنے محمد یونس صاحب نے بنایا ہے۔ اور مسلمانوں کے چندہ سے بنا ہے۔ اس سے مسافروں کو بہت آرام ہو گیا ہے۔ ابھی یہ مسافر خانہ مکمل نہیں ہوا ہے۔ روپیہ کی کمی معلوم ہوتی ہے۔

مسافر خانہ کو اچھی طرح دیکھ کر اپنے بیس سالہ قدیمی دوست محمد سعید خاں صاحب تاجر ظروف سے ملنے گیا۔ بیس سال پہلے مراد آباد میں انہی کے مکان پر ٹھہرا کرتا تھا۔ یہ مراد آباد کے بڑے سوداگر اعلیٰ ظروف کے ہیں۔ یورپ والے اور امراء انہی کی دکان سے ظروف خریدتے ہیں۔

محمد سعید خاں صاحب دکان پر نہ تھے۔ واپس ہوا تو راستہ میں اپنے لڑکوں کی دکان پر مل گئے۔ خوب معانقہ ہوا۔ دس سال کے بعد ملا تھا۔ بہت خوشی ہوئی۔ میرے ان کے عقاید میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ مگر ذاتی محبت الگ چیز ہے۔ کہنے لگے بڈھے ہو گئے۔ میں نے کہا دانت سب مضبوط ہیں بال سب کالے ہیں۔ میں بڈھا کیونکر ہوا۔ بڈھے تو تم ہو گئے۔ ڈاڑھی سفید دانت غائب۔ پان کھایا پھر آنے کا

وعدہ کیا اور رخصت ہو کر مولانا محمد یعقوب صاحب کے مکان پر گیا۔ وہ موجود نہ تھے روانہ ہو کر بھائی سید محمد صاحب کے مکان پر گیا۔ ملے اور ناگہاں آجانے سے بہت خوش ہوئے۔ ان کے بھانجہ کا لڑکا دلن صاحب زینہ سے چھوٹا ہے۔ سامنے آیا۔ میں نے کہا جانتے ہو میں کون ہوں۔ ہنس کر بولا آپ خواجہ صاحب ہیں۔ میں نے کہا تم شیعہ ہو یا سنی۔ کہنے لگا میں تو جناب سید ہوں۔ شیعہ سنی نہیں ہوں۔ گھر سے مستورات نے مٹھائی کا ناشتہ بھیجا۔ کچھ دیر ٹھہر کر سید محمد صاحب کے ساتھ مولوی محمد یعقوب صاحب کے ہاں آیا۔ ملاقات ہوئی۔ اور خوب باتیں ہوئیں۔ رخصت ہو کر تانگہ میں سوار ہونے لگا تو مولانا نے تانگہ والے سے کہا کہ مصر کے کامل پاشا جب کسی کرایہ کی سواری میں سوار ہوتے تھے اور سواری والے کو معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ کامل پاشا ہیں تو وہ کرایہ نہ لیتا تھا۔ تم کو بھی معلوم ہو جائے کہ تمہارے تانگہ میں خواجہ حسن نظامی ہیں تو تم بھی کرایہ نہ لو۔

بھائی سید محمد صاحب کے ہمراہ ریل پر آیا۔ ساڑھے چھ بجے رام پور کی گاڑی روانہ ہوئی۔ ایک انگریز۔ ایک سکھ۔ ایک ہندو رفیق سفر ہیں۔ گاڑی جگہ جگہ ٹھہرتی ہے۔ انگریز نے مذاق سے کہا رام پور تو چلا گیا۔ اب تو بریلی آنے والی ہے۔ میں نے کہا مجھے بریلی میں بھی پاگل خانہ دیکھنا ہے۔ رام پور اگر چلا گیا تو کچھ حرج نہیں۔ سب ہنسنے لگے۔ اور انگریز نے پھر مجھ سے مذاق نہیں کیا۔

مرادآباد سے رامپور اٹھارہ میل ہے۔ مگر گاڑی پونے دو گھنٹے میں پہنچی۔ خوب سردی اور خوب بھوک۔ رامپور پر اترا۔ نواب صاحب رامپور کے آدمی موٹر لئے ہوئے موجود تھے۔ انھوں نے کہا نواب صاحب رامپور سے ۲۲ میل دور جنگل میں ہیں۔ جہاں آجکل فوجی قواعد ہو رہی ہے اور آپ کو اسی وقت فوجی کیمپ میں بلایا ہے۔ جہاں آپ کے لئے خیمہ کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ میں نے کہا اس سردی اور رات میں کچی سڑک پر ۲۲ میل کا سفر کرنا مجھ بیمار کے لیے مشکل ہے۔ کل جاؤں گا۔ آج رات کو تو رامپور میں ٹھہروں گا۔ چنانچہ سرکاری مہمان خانہ میں گیا۔ کھانا کھایا نماز پڑھی اور دس بجے کے بعد سو گیا۔

یہاں دہلی کی نسبت سردی بہت زیادہ ہے۔ کمرہ میں آگ جلائی۔ جب نیند آئی۔ معلوم ہوا فوجی کیمپ میں ایسی سردی ہے کہ پانی جم جاتا ہے۔ کیونکہ نینی تال پہاڑ کے دامن میں وہ جگہ ہے۔

نیند خدا کے فضل سے اچھی آئی۔ صبح چار بجے بیدار ہو کر تحریری کام پورا کیا۔

۲۵۔ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۷۔ دسمبر ۱۹۳۰ء

یوم چہار شنبہ۔ سفر پیپلی رامپور

ذاتی } رام پور کے مہمانخانہ میں ناشتہ کیا۔ اسباب لاری میں میاں عزیز کے ساتھ پیپلی بھیج دیا جو ایک جنگل ہے اور جہاں شیر اور ہر قسم کے درندے اور شکار کے قابل جانور رہتے ہیں۔

میں نو بجے موٹر میں روانہ ہوا۔ ریاست مالیر کوٹلہ کے پرائیویٹ سکریٹری صاحب بھی آج ہی آئے ہیں وہ بھی میرے ساتھ نواب صاحب سے ملنے پیپلی جا رہے ہیں۔ راستہ میں اُن کے سفر مصر و یورپ کی بہت سی مفید اور دلچسپ باتیں سنیں۔ چھ میل پکی سڑک ہے۔ اس کے بعد کچا راستہ ہے گڑھے بہت زیادہ ہیں۔ موٹر ڈرائیور دہلی کا ہے۔ مانگی لال نام ہے۔ سڑک پر ہولے ڈال دیئے ہیں تاکہ گرد نہ اڑے اور ہر میل پر چوکی دار وردیاں پہنے سڑک کی حفاظت کے لئے موجود ہیں۔

سوا دس بجے پیپلی پہنچا۔ نواب صاحب اسی وقت فوجی پریڈ سے آئے تھے۔ کھڑے کھڑے ملاقات ہوئی خوب باتیں ہوئیں۔ وہ فوجی وردی میں بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے اسی وقت چیف منسٹر صاحب کو حکم دیا کہ خواجہ صاحب کو بارہ بجے فوجی پریڈ دکھانے لے جائیے گا۔

کرنل دولہا صاحبزادہ حسن رضا خاں صاحب

ملٹری سکریٹری اور منجو صاحب سوز خواں اور مولانا صاحب سابق ایڈیٹر سیارہ وحدت وحال واعظ خاص نواب صاحب اور ممتاز صاحب مستاجر وغیرہ احباب مل گئے۔ ۸ نمبر کے آرام دہ اور ایک بڑے خیمہ میں آیا جو میرے قیام کے لئے مقرر ہوا ہے۔ مذکورہ احباب بھی یہاں جمع ہو گئے۔ پھر سب کے ساتھ کھانا کھایا۔ احمد شاہ صاحب اے۔ ڈی سی۔ جو مشائخ کے خاندان میں ایک خوبصورت جوان ہیں ملے۔ بارہ بجے چیف منسٹر صاحب کے ساتھ پریڈ دیکھنے گیا۔ نواب صاحب بھی تشریف لے آئے۔ وہ اپنی فوج سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ہر فوج کے کھانے کو خود جا کر دیکھا کہ ٹھیک ہے یا نہیں اور جس فوج کا کھانا اچھا ہوتا تھا۔ اس کی خوب تعریف کرتے تھے۔ ساری فوج کو کھانا نواب صاحب دیتے ہیں۔ کھانے بہت مکلف ہوتے ہیں۔ پلاؤ۔ زردہ۔ قورمہ وغیرہ عمدہ کھانے ملتے ہیں۔

ایک سپاہی بیمار ہو گیا تھا۔ نواب صاحب خود اس کو دیکھنے گئے اور علاج کے حالات دریافت کر کے مزید احتیاط کے حکم دیئے۔ پکانے اور رکھانے کی ہر جگہ کو دیکھا اور مجھے بھی دکھایا۔

فوج میں ہندو مسلمان دونوں ہیں اور سب نواب صاحب کے سلوک سے خوش ہیں۔ ان کو علاوہ کھانے کے نقدی بھی بطور بھتہ کے ملتی ہے۔ سپاہی کو ایک روپیہ روز اور افسروں کو اس سے زیادہ۔ رات کو سب افسر نواب صاحب کے ساتھ میز پر کھانا کھاتے ہیں۔

ایک بجے پریڈ سے واپسی ہوئی۔ میں لیٹ گیا۔ بہت تھک گیا تھا۔ چند منٹ کے بعد نواب صاحب نے ملاقات کے لئے بلایا۔ تخلیہ میں باتیں کیں۔ پھر چیف منسٹر صاحب سے ملا۔ اس کے بعد ظہر سے فارغ ہو کر احباب سے باتیں کیں۔

چار بجے ملٹری سکریٹری صاحب کے ہمراہ فوج کے کھیل دیکھنے گیا نواب صاحب خود اپنی فوج کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ انگریزی دوڑ کا کھیل تھا۔ راؤنڈر اس کا نام تھا۔ نواب صاحب خوب دوڑتے ہیں اور ان کی مساوات کے برتاؤ سے فوجی بہت ہی خوش ہوتے ہیں۔ فوج کے جنرل صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ ایک مسلمان ہیں اور نواب صاحب کے خاندان میں ہیں۔ پانچ بجے کھیل ختم ہوا۔ اور واپس آکر عصر پڑھی۔ پھر نواب صاحب سے ملنے گیا۔ ان کے سامنے کاغذات کا انبار تھا اور وہ ان پر دستخط کر رہے تھے۔ میں نے کہا وہ رزم تھی اور یہ بزم ہے۔

مغرب کی نماز نواب صاحب کے باڈی گارڈ کے ساتھ پڑھی۔ میں نے نماز پڑھائی۔ یہاں ہر فوج کی مسجد بھی بنی ہوئی ہیں۔ یعنی اس جنگل میں عارضی مسجدیں بنائی ہیں جو سب آباد ہیں۔

آج ایک باڈی گارڈ کا سپاہی دل کی حرکت بند ہونے سے یکایک مر گیا۔ اس کو پہلے سے دل کا عارضہ تھا بعد مغرب پھر نواب سے ملا۔ اس کے بعد خیمہ میں آیا۔ احباب جمع ہو گئے خوب باتیں ہوئیں۔

آٹھ بجے کھانے کے خیمہ میں گیا نواب صاحب اور سب فوجی اور سول افسر موجود تھے۔ چیف منسٹر صاحب کے ساتھ میز پر جگہ ملی۔ کھانا دیسی تھا۔ میز کی آرائش انگریزی تھی۔ مولانا واعظ صاحب نے فرمایا کہ میز کا رواج مسلمانوں میں قدیمی ہے اس لئے میزبان لفظ بولتے ہیں۔

کھانے کے بعد خیمہ میں آیا۔ مولانا واعظ صاحب اور آغا طباطبائی صاحب ملنے آئے۔ آغا صاحب نے اپنی کتاب بزم ایران عنایت کی اور ہندوستانی معاملات اور اسلامی معاملات پر ان کی فلسفیانہ باتوں کا میرے دل پر بہت ہی اثر ہوا وہ ایک تجربہ کار لیڈر سے زیادہ اچھی رائے زنی کر سکتے ہیں۔ بڑے عالم اور دانا سفر ہیں۔ رات کو بہت سردی تھی مگر نیند آگئی۔ آگ بھی جلائی۔

۲۶۔ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۸۔ دسمبر ۱۹۳۰ء

یوم پنجشنبہ مقام پیپلی رام پلور

ذاتی } صبح آٹھ بجے تک تحریری کام کیا اور ڈاک

سرکاری افسروں کے ذریعہ رام پور بھیج دی۔ وہاں سے دہلی روانہ ہو جائے گی۔ پھر ملٹری سکریٹری صاحب کے ہمراہ فوجی پریڈ میں گیا۔ نواب صاحب بھی تشریف لے آئے۔ جھنڈیوں اور آئینوں کے ذریعہ نامہ و پیام کا کام دیکھا۔ نواب صاحب کو اس میں بھی خوب مہارت ہے۔ پھر اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی فوجی قواعد دیکھی جن میں بی۔ اے اور ایم اے نوجوان بھی تھے اور نواب صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری اچھن صاحب بھی تھے۔ اور نواب صاحب خود ان لوگوں کو قواعد سکھا رہے تھے فوج کے جنرل صاحب بھی پاس کھڑے تھے وہ نواب صاحب کے خاندان میں ہیں اور لارڈ رابرٹ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر نواب صاحب کی فوجی قابلیت جنرل صاحب سے بھی فائق معلوم ہوتی تھی۔ نواب صاحب کو فوجی کام سے ایک عشق سا ہے۔ میں نے کہا یہ بہت اچھا شوق ہے بعض رئیسوں کو شراب خواری اور عیاشی وغیرہ برے کاموں کا شوق ہوتا ہے۔ مگر نواب صاحب ان سب عیبوں سے پاک ہیں۔ ایک بیوی کے سوا دوسری بیوی بھی نہیں ہے اور شراب سے بے حد نفرت کرتے ہیں ان کی عمر ۲۴ سال کے قریب ہے ایک تو جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ دوسرے دولت تیسرے حکومت۔ چوتھے خود مختاری پانچویں پاس والوں کی ترغیبات۔ بڑے بڑے مضبوط آدمی ان سے پگھل جاتے ہیں اور ہندوستانی والیان ریاست کی خرابی کا راز انہی چیزوں میں پوشیدہ ہے۔ مگر نواب صاحب رام پور کا فوجی شوق ان سب خرابیوں کے لئے سد سکندری بن جائے گا۔ کیونکہ فوجی شوق سے جفاکشی۔ مستعدی۔ وقت کی پابندی صبر و ضبط کی صفتیں پیدا ہوتی ہیں۔

قواعد کے وقت جب باجے بجتے ہیں اور بانسلیوں کی سریلی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور ان کے سروں پر فوجیں حرکت کرتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رومؒ کی مثنوی جنگل بیابان میں پڑھی جا رہی ہے اور فوجی وردیاں پہنے ہوئے درویش باجوں کے سروں پر وجد اور رقص کر رہے ہیں۔ میرے اندر کئی دفعہ یہ کیفیت پیدا ہوئی کہ فوجوں کے ساتھ رقص کرنے لگوں۔ نواب صاحب فوجی وردی میں نہایت ہی حسین معلوم ہوتے تھے۔ میں نے ان کو تاج پوشی کے دن کروڑوں روپئے کے قیمتی جواہرات پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ کیونکہ رامپور میں چار کروڑ روپے کے جواہرات ہیں مگر مجھ پر اس لباس کا اچھا اثر نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ زیور تو عورتوں کے لئے زیبا ہے ہندوستان کے راجہ اور قدیمی بادشاہ زیور پہن کر زنانے بن جاتے تھے۔ مردوں کا لباس تو یہ ہے جو آج نواب رام پور پہنے ہوئے لق و دق جنگل میں پھر رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ایک بہادر سپاہی رزم آرائی کر رہا ہے۔

گیارہ بجے واپس آیا۔ کھانا کھایا۔ مولانا اولاد علی صاحب ملنے آئے۔ جن کو واعظ مولانا کل لکھا تھا۔ یہ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں اخبار "سیارہ" اور "جدت" ان کی ایڈیٹری میں شائع ہوتا تھا۔ مرحوم نواب صاحب کے زمانہ میں رام پور آئے۔ عالم ہیں اور واعظ ہیں۔ اس لئے یہی خدمت سپرد کی گئی۔ موجودہ نواب صاحب کی حمایت میں تکلیفیں اٹھا چکے ہیں۔ اس لئے نواب صاحب کو ان کا خیال ہے اور مجلس میں روزانہ شریک ہوتے ہیں۔ رئیس اپنے مصاحبوں سے اور پیر اپنے مریدوں سے اور استاد اپنے شاگردوں سے اور بادشاہ اپنے رعایا سے پہچانا جاتا ہے نواب صاحب کی مجلس میں بیٹھنے والے سب ہی اچھے لوگ ہیں۔ چیف منسٹر نواب صاحب کے خسر بھی ہیں اور ذاتی اعتبار سے بہت نیک اور پکے مسلمان بھی ہیں۔ ملٹری سکریٹری اور پرائیویٹ سکریٹری بھی بہت لائق اور شریف اور خاندانی لوگ ہیں مسٹر پانڈے ہوم سکریٹری بھی بہت لائق اور کارگزار افسر ہیں آغا طباطبائی صاحب عراق کے رہنے والے اور نہایت ذی علم اور ذی فہم نوجوان ہیں۔ آج میں شام تک ان کی کتاب بزم ایران پڑھتا رہا۔ آج ریاست جوناگڑھ کے اسسٹنٹ پرائیویٹ سکریٹری بھی آئے ہیں۔ شام کو مولانا اولاد علی صاحب اور آغا طباطبائی

صاحب کے ہمراہ نئی نہر کا پل دیکھنے گیا۔ جو کیمپ سے تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ یہ نہر ایک ندی سے نکالی جا رہی ہے۔ انگریزی علاقہ نینی تال کا ضلع بالکل ملا ہوا ہے۔ پل سے پچاس قدم کے فاصلہ پر انگریزی علاقہ تھا۔ پل بہت بڑا ہے اور ابھی ناتمام ہے۔ یہاں پانی بہت قریب ہے چھ سات فٹ زمین کھودنے سے پانی نکل آتا ہے۔ یہ نہر بن جائے گی تو پیپلی کا غیر آباد علاقہ آباد ہو جائے گا۔ پل کے قریب جنگل میں ہندو راجاؤں کے زمانہ کے کچھ آثار قدیم بھی ہیں۔ میں ان کو دیکھنا چاہتا تھا اور کھنڈروں کی دیواریں دور سے نظر آتی تھیں مگر جنگل بہت گھنا تھا اندر نہ جا سکا۔ یہاں سانپ بچھو اور کھنکھجورے بہت زیادہ ہیں۔ میرے خیمہ میں بھی اگرچہ چاروں طرف کی زمین صاف کر دی گئی ہے روزانہ ایک آدھ سانپ اور کھنکھجورہ جاتا ہے اور مجھے جیو ہتیا کرنی پڑتی ہے۔

آج رات کو کھانے کے وقت نواب صاحب موجود نہیں تھے۔ اطلاع آئی کہ سب لوگ کھانا شروع کر دیں۔ چنانچہ کھانا شروع کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر میں نواب صاحب آگئے اور انھوں نے آتے ہی حاضرین سے معذرت کی کہ وہ لکھتے لکھتے ذرا لیٹ گئے تھے اور ان کو نیند آگئی۔ وہ فوراً بیدار ہوئے اور غسل کیا اور کھانے کا لباس بدلا۔ اسی لئے چھ منٹ کی دیر ہو گئی۔ میں نے کہا چھ منٹ میں غسل کرنا اور کپڑے بدلنا یہ بھی ایک کمال ہے۔ مگر سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ نواب صاحب وقت کی قدر کرتے ہیں اور اس تہذیب کو جانتے ہیں کہ منتظر لوگوں سے معذرت کرنی ضروری ہوتی ہے۔ ورنہ والیان ریاست وقت کو اپنا غلام بنانا جانتے ہیں۔ وقت کی اطاعت ان کو بہت ناگوار گزرتی ہے۔ حالانکہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ وقت خدا ہے اور بندہ کو خدا کی اطاعت کرنی چاہئے۔ آج بھی رات کو کھانے کے بعد مولانا اولاد علی صاحب سے باتیں ہوئیں۔ پھر آغا طباطبائی صاحب تشریف لے آئے اور ان سے گیارہ بجے تک فلسفہ تاریخ پر گفتگو ہوتی رہی۔ سردی نے برا حال کر دیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لندن میں ہوں۔ آگ بھی جلاتا ہوں لحاف اور کمبل بھی اوڑھتا ہوں۔ پھر بھی سردی نہیں جاتی۔

۲۷۔ رجب ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۔ دسمبر ۱۹۳۰ء
یوم جمعہ۔ پیپلی رام پور سے واپسی

ذاتی

کل میں نے نواب صاحب سے دہلی جانے کے لئے کہا تھا مگر انھوں نے اجازت نہ دی آج پھر کہا کہ میں رام پور میں جمعہ کی نماز پڑھنی چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ جمعہ کی نماز یہاں بھی ہوگی۔ جمعہ کے بعد جائیے گا۔ اس لئے جمعہ کی نماز پڑھ کر پونے تین بجے کیمپ سے روانہ ہوا۔ موٹر خوب تیز تھی۔ ساڑھے تین بجے رام پور پہنچ گیا۔ ڈاک خانہ سے ڈاک لی۔ گاڑی ٹھیک چار بجے روانہ ہوتی ہے۔ چار میں پانچ منٹ باقی تھے جب اسٹیشن پر پہنچا۔ شجاعت علی صاحب سے ملاقات ہوئی جو سرکاری کتب خانہ کے عہدہ دار ہیں اور علی برادران سے قرابت رکھتے ہیں گاڑی مل گئی اور بیس منٹ میں مراد آباد پہنچ گئی۔ بہت تیز گاڑی ہے۔ آتے وقت مراد آباد سے رام پور تک دو گھنٹے میں پہنچی تھی۔ چونکہ مراد آباد کے احباب سے واپسی میں ملنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اس لئے ارادہ ہوا کہ دہلی کی ریل میں چھ گھنٹے باقی ہیں۔ سب دوستوں سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ مگر سردی اور سفر کی تکان نے بہت افسردہ اور مضمحل کر دیا تھا اس لیے ویٹنگ روم میں لیٹ گیا۔ کھانا بھی وہیں منگا کر کھایا۔ آٹھ بجے دہلی کی ٹرین پلیٹ فارم پر آگئی اس میں جا کر لیٹ رہا۔ گاڑی میں اندھیرا تھا۔ گیارہ بجے تک اندھیرا رہا۔ گیارہ بجے گاڑی مراد آباد سے روانہ ہوئی مگر میں سو گیا تھا۔ میاں عزیز رات بھر بیدار رہے۔ صبح چار بجے دہلی پہنچا۔ اسباب لے کر انکوائری آفس میں آیا اور بابو جوتی سروپ صاحب ایم۔ اے سے دو گھنٹے تک باتیں کیں۔ چھ بجے سید ابن عربی گھر سے موٹر لے کر آئے اور اس میں روانہ ہوا۔ بابو جوتی سروپ صاحب سے آج فلسفہ تصوف اور فلسفہ سیاست پر نہایت عمدہ باتیں ہوئیں وہ بہت نیک اور سنجیدہ اور آزاد خیال ہندو ہیں کائستھ قوم میں ہیں اور میرے پرانے ملنے والے ہیں۔ پارہ ۴۹ درجہ پر ہے۔ گھر میں سب لوگ خیریت سے ہیں۔